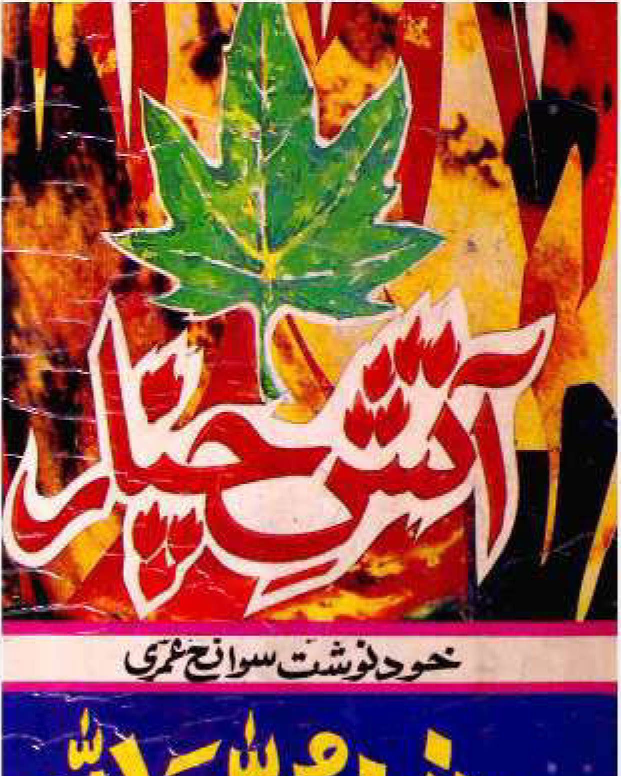


خود نوشت سوانح عمری

شیخ محمد عبداللہ

شیخ محمد عبداللہ

آتشِ چنار

ایک آپ بیتی

ی محمد اینڈ سنز- سری نگر- کشمیر

● طابع وناشر : علی محمد اینڈ سنز۔ سرینگر کشمیر۔
● مطبع : جے۔ کے آفسٹ پرنٹرز۔ جامع مسجد دہلی-۱
● پہلا ایڈیشن : ۱۹۸۶ء
● قیمت : ۱۲۵/= روپے

یہ کتاب "تاج کمپنی، ترکمان گیٹ۔ دہلی" سے بھی مل سکتی ہے۔

اِنتساب

۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کے اُس جاں بہ لب سرفروش کے نام جس نے شہادت سے پہلے آخری ہچکی لیتے ہُوئے راقم سے کہا تھا۔

"شیخ صاحب! ہم اپنا فرض ادا کر چکے...... آگے آپ کی ذمہ داری ہے ...... قوم سے کہیے کہ اپنا فرض...... نہ بھُولے۔"

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلم
اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے

شیخ محمد عبداللہ

سرینگر: ۱۰ر اگست ۱۹۸۲ء

کشمیر جسے رُوحانی خوبیوں سے تو تسخیر کیا جا سکتا ہے......
...... مگر بہ زورِ شمشیر...... ہرگز نہیں۔

کلہن پنڈت "راج ترنگنی" (۱۱۴۹ء)

"کرتل پھٹرم پتہ گرُوس درآتی"
(میں نے تلوار کو توڑ کر اُس سے درانتی ڈھال لی)

نُند ریشیؒ (وفات: ۱۴۳۹ء)

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
مُمکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اقبالؔ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸ء)

کشمیر جسے رُوحانی خوبیوں سے تو تسخیر کیا جا سکتا ہے.....
.... مگر بہ زورِ شمشیر...... ہرگز نہیں۔

کلہن پنڈت "راج ترنگنی" (۱۱۴۹ء)

"کرتلِ پھٹرم پَتہ گُرُوس درآ تی"
(میں نے تلوار کو توڑ کر اُس سے درانتی ڈھال لی)

نُندہ ریشیؒ (وفات: ۱۴۳۹ء)

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اقبالؔ

(۱۸۷۷ — ۱۹۳۸ء)

ترتیب

پیش گفتار

میرے نامور شوہر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم و مغفور نے اپنے آخری برسوں میں اپنی ہنگامہ خیز زندگی کی روئداد قلم بند کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اور جس وقت اُنھیں اپنے معبود کا بلاوا آگیا۔ اُس سے چند یوم پہلے تک وہ اس کے آخری صفحات لکھوا رہے تھے۔ وہ اس سرگذشت کی اشاعت کو اپنی قوم کے تئیں اپنی ایک اور ذمہ داری سے سُبک دوشی خیال کرتے تھے۔ جس قوم کے لیے اُنھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کی تھی اور اپنی عمر کا بہترین حصہ جیل خانوں اور جلاوطنی کی آزمائشوں میں بسر کیا تھا۔ اُنھوں نے ۵ دسمبر ۱۹۸۲ء یعنی اپنی ستترویں سالگرہ کا دن اس کی رونمائی کے لیے مقرر کر دیا تھا اور اُسی حساب سے کتاب کی خطاطی وغیرہ کے مراحل طے کیے جا رہے تھے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اُن کا سانحہ ارتحال پوری قوم کے ساتھ ساتھ ہم سب کے لیے اس قدر ہوش رُبا تھا کہ کچھ مدت تک ہمیں اپنی سُدھ بُدھ ہی نہیں رہی۔ اِس کتاب کی اشاعت کی طرف بھی توجہ نہیں کی جا سکی۔ یہ مسودہ شیرِ کشمیر کی رحلت کے وقت عزیزم محمد یوسف ٹینگ

کی تحویل میں تھا۔ جو سرگذشت کی تحریر میں مرحوم رہنما کا ہاتھ بٹاتے آئے تھے۔ اُنھوں نے شیر کشمیر کی وفات حسرت آیات کے دوسرے تیسرے ہی روز یہ امانت میرے حوالے کی۔ اِس میں اکثر حصہ کتابت شدہ تھا اور صرف چند ابواب کی کتابت باقی تھی۔ سارا مسودہ کتابت اور غیر کتابت شدہ ہم سب کے سامنے شیر کشمیر کی نظر سے گذر چکا تھا اور وہ اسے شرفِ منظوری عطا فرما چکے تھے۔ چنانچہ میں نے اِسے ایک متاعِ عزیز کی طرح سنبھالے رکھا۔ پھر حالات نے جو عجیب کروٹیں لیں، وہ تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ اِن کی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی۔ اِس دوران بہت سے کرم فرماؤں نے اپنی عادت کے مطابق طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے۔ اِس دستاویز کی قومی اور تاریخی اہمیت و افادیت کے پیش نظر کسی حد تک یہ بات ناگزیر بھی تھی۔ بہر حال اِن سب حاشیہ آرائیوں کا مسکت جواب کتاب کی اِشاعت ہی تھی۔ چنانچہ ضروری مراحل پورا کرنے کے بعد اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ الحمد للہ۔

ہماری خواہش تھی کہ کتاب بیک وقت اُردو اور انگریزی میں شائع ہو لیکن انگریزی ترجمے میں کچھ دشواریاں حائل ہوتی گئیں۔ اُدھر موت و حیات کے پُراسرار معاملے اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور اُن کے بارے میں پیش قیاسی نہیں کی جاسکتی۔ اِس لیے میں یہ اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ اپنے سرتاج اور قوم کے سردار کی اِس امانت کو جلد از جلد قوم اور آنے والی نسلوں کے سپرد کر کے اپنا وہ فریضۂ خداوندی انجام دوں جو اُن کی رفیقۂ حیات ہونے کی حیثیت سے میرے ذِمّے واجب الادا ہے۔

میں یہ بات پورے وثوق سے کہنا چاہتی ہوں کہ اس کتاب کو بالکل اُسی صورت اور اُنہی الفاظ میں شائع کیا جارہا ہے۔ جن کی میرے مرحوم شوہر نے منظوری دی تھی اور جو ہمارے پاس مقدس امانت کی طرح محفوظ رہی۔ جیسا کہ سارا زمانہ جانتا ہے کہ وہ بے حد جری، راست باز اور بے باک شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اِقبال کے اس قول کے قائل تھے ؏

"کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق"

اُنھوں نے اِس کتاب میں بھی اپنا یہ شعار پوری شان کے ساتھ نبھایا ہے اور واقعات و شخصیات کے بارے میں اپنی رائے صاف الفاظ اور دوٹوک لہجے میں بیان کی ہے۔ یہ آراء خود اُن کی تاریخ ساز زندگی کی طرح متنازعہ فیہ CONTROVERSIAL ہو سکتی ہیں۔ مگر اس بارے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ یہ شیر کشمیر کے خیالات و نظریات کا آئینہ ہیں اور اُنھوں نے اِنہیں لفظ بہ لفظ اِسی صورت میں شائع کرنے کی منظوری عطا فرمائی تھی۔ اِس کے متن کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ ایک بدترین خیانت کا اِرتکاب کرنے کے مترادف ہوتی۔ جس کا راقم الحروف اور شیر کشمیر کے قومی جانشین ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا شیر کشمیر کی دلاویز یاد کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مرتبے کی قومی امانت میں تحریف کرنے کا گناہ کبیرہ بھی ہوتا۔

شیر کشمیر نے ان یادداشتوں میں کتنی صداقت شعاری سے کام لیا ہے۔ اُس کا ایک اندازہ کرنے کے لیے صرف اِس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ۱۹۵۳ء میں اُن کی زندگی کی ایک بڑی آزمائش میں اُن کے سیاسی حریفوں



ڈاکٹر کرن سنگھ اور سید میر قاسم نے حال ہی میں اپنی جو سرگذشتیں شائع کی ہیں۔ اُن میں شیرِ کشمیر کے VERSION کی بڑی حد تک تائید کی گئی ہے۔

میں اپنی دُختر ثریا جان اور فرزندِ نسبتی ڈاکٹر محمد علی متو کی بے حد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے کتاب کے مسودے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اِس کی اِشاعت میں تعجیل کروانے میں گہری دلچسپی لی۔ عزیزم شیخ نذیر احمد نے تصاویر کے اِنتخاب وغیرہ میں بڑی محنت کی۔ محمد یوسف ٹینگ صاحب کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے۔ اُنھوں نے بسیار مشکلات کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی عرق ریزی سے کام لیا اور اپنے آپ کو اُس اعتماد کے اہل ثابت کیا جو بابائے قوم نے اُنھیں اِس قومی فریضے کے لیے چن کر اُن پر کیا تھا۔

اِس کتاب کی اِشاعت سے میں ایک بہت بڑے بوجھ کو اُتارنے کی مسرور انگیز کیفیت محسوس کرتی ہوں۔ اور اب عاقبت میں اپنے باوقار شوہر کے ساتھ کسی شرمندگی کے بغیر آنکھیں چار کر سکوں گی۔ اِنشاءاللہ۔

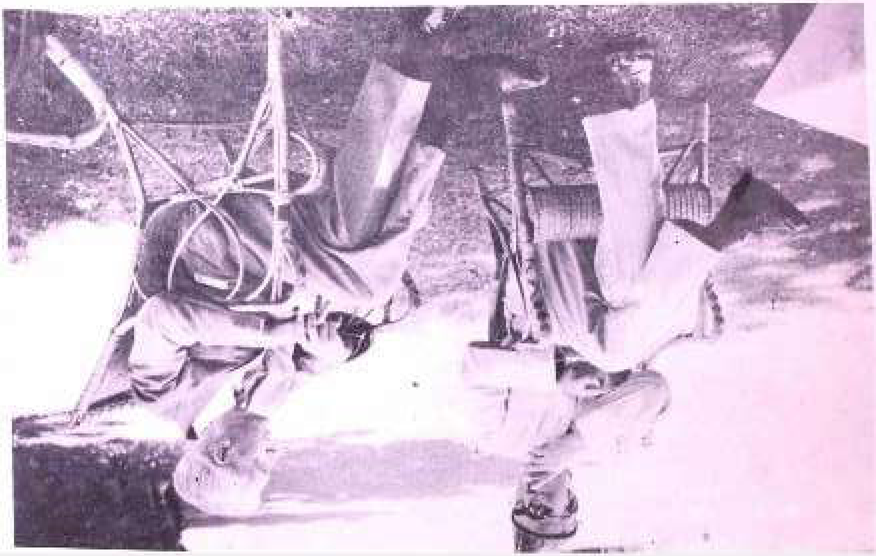
بابائے قوم نے یہ کتاب بڑی دِلسوزی اور دردمندی سے قلم بند کی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق ثابت ہوگی ع

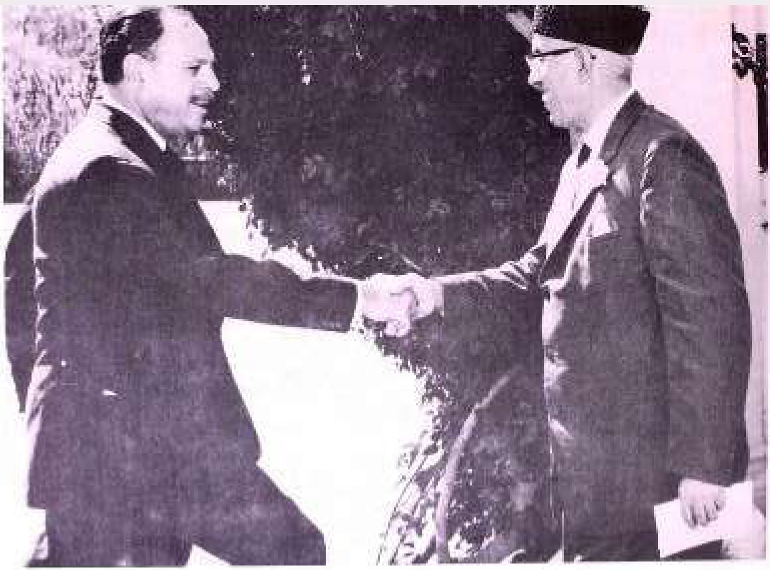
اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

سالومن ہائیٹس*
سرینگر
۱۱ر نومبر ۱۹۸۵ء

(بیگم اکبر جہاں شیخ محمد عبداللہ)

اقوام متحدہ کے نمائندے سر اوون ڈکسن کے ساتھ





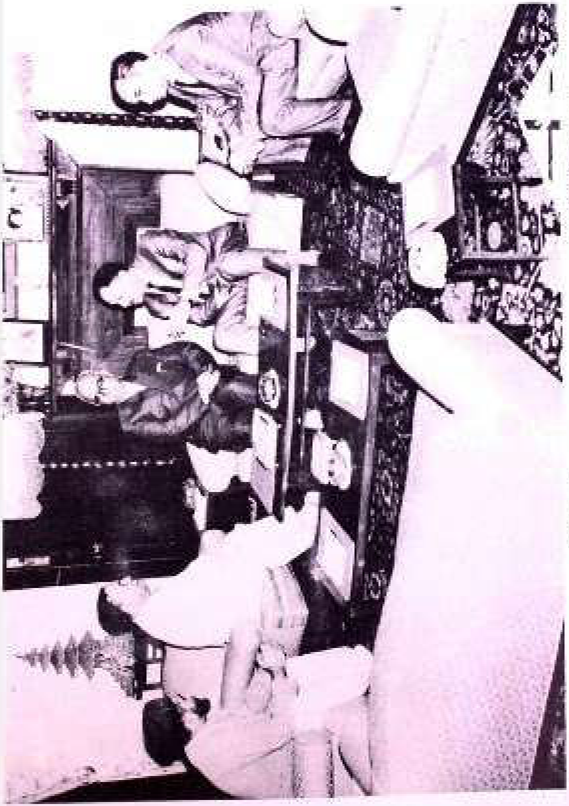
راولپنڈی ۱۹۶۴ء صدر ایوب خاں شیخ صاحب کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہوئے

پیش لفظ

جن لوگوں نے شیخ محمد عبداللہ کو اُن کے آخری دِنوں میں دیکھا۔ اُنھیں معلوم ہے کہ وہ تقریباً گھوڑے کی زین پر سوار رہتے ہوئے اِس دُنیا سے اُٹھ گئے۔ وہ اِستعارے کے مطابق اپنی آخری سانس تک زرہ بکتر پہنے رزم گاہِ جدوجہد میں صف آرا تھے۔ اور ایک اور بڑے معرکے کے لیے جست لگانے کے لیے پھڑپھڑا رہے تھے۔ لیکن اجل سے کس کو مفر ہے؟ وہ بھی رزم خیر و شر میں تقریباً دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آئے۔ اُن کی وفات سے کچھ ہی عرصے قبل دلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار نے لکھا:

"شیخ عبداللہ جوں جوں بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ چنار کے درخت کی مانند نظر آتے ہیں۔ جس کے سر پر برف کا تاج سجا ہوا ہو"

اپنے دوسرے معرکوں کی طرح وہ آخری وقت تک اپنی اس سرگذشت پر کام کر رہے تھے۔ میری اُن سے آخری ملاقات اگست ۸۲ء کے تیسرے ہفتے میں اُن کی خواب گاہ میں ہوئی اور اُس دن بھی وہ اپنی تیزی سے بگڑتی ہوئی صحت اور نقاہت کے باوجود کتاب کا اختتامی باب EPILOGUE لکھواتے رہے۔ وہ اپنے بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ لیکن اُن کی آنکھوں میں



راولپنڈی ۱۹۶۴ء: صدر ایوب خاں اور وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ایک ملاقات

ایک معروفِ جنگ سورما کی سی دل دہلا دینے والی چمک تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بوڑھا شیر اپنے دُنیاوی صیّادوں کی طرح قانونِ قدرت کا شکنجہ توڑ کر میدانِ عمل میں آخری بار جھپٹنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد اُن کے شہپر قضا کے ہاتھوں میں آگئے اور پھر انھیں اِس باب کو مربوط صورت میں قلم بند دیکھ کر منظور کرنے کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لاالٰہ الا اللہ

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ میں مولانا آزاد روڈ والی کوٹھی میں اُن سے ملنے گیا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور سورج ڈھلنے کا وقت۔ شیخ صاحب اپنے دلکش چمن زار میں تشریف فرما تھے۔ اُس وقت اُن کا مزاج معمول سے زیادہ ہی شگفتہ تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اپنے دل میں مدّتوں سے مچلنے والی ایک آرزو کو ڈرتے ڈرتے زبان پر لانے کی جرأت کی۔

"شیخ صاحب۔ خدا آپ کا سایۂ ہما قوم پر بہت دیر تک قایم رکھے۔ لیکن میری حقیر رائے میں آپ پر آئندہ نسلوں کا ایک قرض باقی ہے۔"

شیخ صاحب نے اپنا بلند قہقہہ لگا کر میری بات کاٹی "ساری عمر تو قرض ادا کرتے ہی گذار دی۔ اب تم مجھے پھر بقایاداروں میں شامل کر رہے ہو۔ بولو کیا قرض ہے؟"

میں نے اپنا سارا حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا "آپ کو اپنی شاندار زندگی کی سرگذشت قلم بند کرنی چاہیے........ ہماری تحریک اور تاریخ کو اِس کے بانی اور سالارِ کارواں کی زندگی میں ہی سرحد کے اُس پار اور اِس پار مسخ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں........ فضلِ ایزدی سے تحریک کے

رہنمائے اعظم اور دانائے راز کی حیثیت سے آپ اس سرگذشت کو اصل تناظر میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کے دوسرے تاریخ ساز کارناموں سے زیادہ آئندہ نسلوں کے لیے فیضان کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔"

شیخ صاحب اپنے وجیہہ چہرے کو اپنی ہتھیلی سے سہارا دیے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں جو مجھے نیلی لگتی تھیں، مجھے بڑی تمکنت سے تاک رہی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی اور میں موہوم اندیشوں میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں میں نے کوئی بے ادبی تو نہیں کی ہے؟ اُن کے چہرے پر اُن کی دلنواز مسکراہٹ جیسے سمٹ کر رہ گئی اور غور و فکر کے آثار رونما ہو گئے۔ کچھ ثانیوں کے لیے، جو مجھے شبِ ہجر کی طرح بہت طویل لگے وہ بڑی آہستگی اور نرمی سے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگے:

"اِس میں میرے ساتھ محنت کون کرے گا...... یہ بڑی مشقت کا کام ہے۔"

میری جان میں جان آئی اور جرأت کر کے جواب دیا۔

"اگر مجھے کسی قابل سمجھیں تو میں اِسے اپنی سعادت مندی سمجھوں گا۔"

شیخ صاحب کے ہونٹوں پر پھر تبسّم کی روپہلی کرن طلوع ہو گئی۔ انھوں نے مجھے جواب دینے کی بجائے ذرا دور بیٹھی ہوئی اپنی صاحب زادی ثُریّا جان کو ہاتھ کے اشارے سے بُلایا اور اُن سے کہا۔

"وہ نیلے جلد کی دو نوٹ بک تمھارے پاس ہیں انھیں لے آؤ۔"

ثُریّا جان نے جواب دیا۔ "کون سی۔ وہ دہلی والی؟"

شیخ صاحب نے جواب دیا "ہاں وہی۔ وہی۔" ثُریّا جان اندر چلی گئیں

اور جب اُن کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو کہنے لگے "شاید وہ بھی کھو گئی ہیں۔۔ انا للہ۔۔۔۔۔"

اتنے میں ثریا جی نوٹ بک لے کر آ گئیں۔ شیخ صاحب نے اُنھیں کھولنے کے بغیر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "انھیں دیکھ لو۔۔۔۔۔ یہ میں نے کوٹلہ لین دہلی میں نظربندی کے زمانے میں لکھوائی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بتا دینا کہ تمھاری کیا رائے ہے؟"

مجھے جیسے ایک گنجِ بے بہا مل گیا تھا۔ میں سیدھے گھر گیا۔ اِن کی ورق گردانی صبح تک کرتا رہا اور پھر سویرے اُن سے ملنے گیا۔ جب اُنھوں نے اِستفسار کیا تو میں نے اُن سے عرض کی کہ "یہ تو بہت اچھی ہے۔۔۔۔۔ البتہ کہیں کہیں تاریخوں، سنوں وغیرہ کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔" میں نے چند غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔

وہ ہمیشہ صحیح بات چاہے وہ چھوٹا آدمی بھی کرے، مان لیتے تھے۔ اپنی اِس معقول روش کا اِظہار کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

"بھئی۔ میری زندگی اتنے طوفانوں اور بحرانوں سے گذری ہے۔۔۔۔ ساری چیزیں کہاں سے یاد رہیں گی اور پھر بات میں سے بات نکلتی ہے۔۔۔۔ اب اِس عمر میں تو حافظہ بھی ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔"

میں نے عرض کی کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ آپ اپنے تاثرات DICTATE کرواتے جائیں۔ تاریخوں اور ناموں وغیرہ کے حوالے ڈھونڈھنا ایک منشی کا کام ہے۔۔۔۔۔ یہ میں کروں گا۔"

بات میرے دل سے نکلی تھی اِس لیے مستجاب ہو گئی۔ دوسرے دِن اتوار تھا شیخ صاحب نے مجھے آنے کو کہا۔ اُس دن ہم دن بھر کام کرتے رہے اور اُنھوں نے مجھے ازراہِ شفقت اپنے ساتھ لنچ میں بھی شریک ہونے کا اعزاز بخشا۔ وہ

تین دن کے بعد جب میں اُن اوراق کو صاف کر کے اُن کے پاس لے گیا۔ تو اُنھوں نے اپنی عادت کے مطابق اُنھیں بڑے غور سے پڑھا۔ جس وقت وہ پڑھ رہے تھے۔ میں اس عظیم شخصیت کے پُرجلال چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا مشتاقانہ جائزہ لے رہا تھا۔ جس کی جھریوں میں ہماری تاریخ اور تقدیر کے کتنے ہی اسرار و رموز چھپے ہوئے تھے۔ اور ایک طالبِ علم کی گھبراہٹ کے ساتھ اِمتحان کا نتیجہ سننے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پڑھ کر فارغ ہوئے۔ اپنا چشمہ اُتارا اور ازراہِ کرم فرمایا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جس آدمی کی مجھے تلاش تھی۔ وہ تم ہی ہو۔ تم نے اچھی کوشش کی ہے۔ اب اس سلسلے کو آگے بڑھانا ہوگا۔ لیکن بات یاد رکھنا کہ میں بہت سے مخمصوں میں مشغول رہتا ہوں۔ تم پیچھا کرو گے۔ تبھی یہ کام پورا ہو سکے گا۔۔۔۔۔ اگر کسی وقت میں نے جلدی میں تمھیں جھڑک بھی دیا تو حوصلہ نہ ہارنا۔۔۔۔۔ آج سے میرے گھر کے دروازے صبح و شام تمھارے لیے کھلے رہیں گے۔"

وہ اپنا قول نبھاتے رہے اور بعض اوقات ضروری مصروفیات کو چھوڑ کر اور اہم شخصیات کو ٹال کر میرے ساتھ نکل جاتے وہ کہتے کہ گھر میں رہے تو یہاں کچھ بھی نہ کرنے دیں گے۔۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ اُنھوں نے ایک شام مجھے کل اتوار کو صبح ٹھیک نو بجے آنے کے لیے کہا تھا۔ میں اپنی تساہلی کی وجہ سے ذرا دیر سے پہنچا اور پانچ دس منٹ تک باغ میں اِنتظار کرتا رہا تاکہ میری تاخیر اسی میں چھپ جائے۔ شیخ صاحب کچھ دیر کے بعد نکلے تو اُن کے ماتھے پر بل تھے۔ وہ ذرا سختی سے بولے "تم نو بجے کیوں نہیں آئے؟"

میں نے ڈر کے مارے چالاکی سے کام لینا چاہا "جناب میں تو نو بجے پانچ منٹ پہنچ گیا تھا۔"

شیخ صاحب ایک ستم ظریفانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے "دیکھو میں اپنی خوابگاہ کی کھڑکی سے باغ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تم ساڑھے نو بجے کے بعد آئے۔"

بہر کیف۔ ہم اُن کی رہائش گاہ کے علاوہ چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس اور داچھی گام بھی جا کر کام کرتے رہے۔ اور جاڑوں میں جموں میں اُن کی سرکاری رہائش گاہ کے علاوہ ایک دن باغ باہو کے بنگلے میں بھی مصروف رہے۔ وہ ڈکٹیشن دیتے اور پھر باب ختم ہونے کے بعد مجھے وہیں پڑھنے کے لیے کہتے۔ اُس وقت بھی وہ کچھ جملے وغیرہ تبدیل کروا لیتے۔ پھر دوسری نشست میں صاف کیے ہوئے باب اُن کو دکھاتا۔ وہ اُس کا غور سے ملاحظہ کرتے اور بعض اوقات جملوں پر ہی نہیں الگ الگ الفاظ پر بھی بحث کرتے تھے۔ وہ بڑے سخت HARD TASK MASTER تھے۔ چنانچہ ایک دِن جب "یار پرستی" اور "احباب نوازی" کی ترکیبات پر بڑی دیر تک بحث ہوئی تو میرے کمزور اعصاب ایک لمحے کے لیے جواب دینے لگے اور میں نے زِچ ہو کر کہا:

"جناب۔ یہ الفاظ تو ہم معنی ہیں۔"

کہنے لگے۔ "نہیں۔ ہر لفظ کا اپنا محل اور مقامِ استعمال ہوتا ہے۔ اِسی لیے زبانوں میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں۔ ورنہ کسی خاص چیز یا کیفیت کے لیے ایک ہی لفظ ہوتا...... لفظ کا موزون اِستعمال ہی سب کچھ ہے۔"

میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ وہ ایک شاعر کی سی لطافتِ احساس کے ساتھ اِتنی گہری بات کہہ گئے تھے۔ بہر حال۔ پچھلے باب سے اُن کی پوری تشفی ہوتی تو پھر ہی آگے جانے کی نوبت آتی۔

ایک بار ہم داچھی گام کے سبزہ زار میں بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے میں نے اُن سے کہا "سر۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں پانی پی کر آ جاؤں۔"

وہ ایک باپ کی سی شفقت کے ساتھ کہنے لگے "پانی تو یہیں منگوا لیں گے۔ لیکن تم نے ایسا پہلی بار کہا ہے۔ لگتا ہے تم تھک گئے ہو...... لہٰذا آج کام بند" اُس کے بعد انھوں نے بیرے سے کہا عمدہ سی کافی پلواؤ" اور ہم سبزہ زار میں ٹہلنے لگے۔ وہ مجھے جواہر لال نہرو، مولانا آزاد وغیرہ سے وابستہ اِس جگہ کی کچھ یادیں سنانے لگے۔

شیخ صاحب نے بعد میں بہ حیثیت وزیر اعلیٰ مجھے سٹیٹ آرکائیوز میں ۱۹۲۵ء کے بعد کا وہ سرکاری ریکارڈ دیکھنے کی اجازت بھی دلوائی۔ جو ابھی تک عام مطالعے کے لیے کھلا نہیں ہے۔ میں شاید ڈاکٹر کرن سنگھ کے بعد دوسرا شخص تھا۔ جس نے اِن محفوظ دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ میں نے اپنے مطالعے پر تقریباً ہر اہم فائل میں شیخ صاحب ہی شیخ صاحب کا ذکر دیکھا یعنی ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

میں نے کتابوں کے حوالے بھی نکالے۔ اور اِتراتا ہوا یہ سارا دفتر اُن کی خدمت میں لے آیا۔

شیخ محمد عبداللہ ہر کام کے علمی پہلو کا گہرا احساس رکھتے تھے میرے حوالوں کو دیکھا بھالا اور پھر میرا دل رکھنے کو کہا:

"محنت تو بہت کی ہے۔ اور محنت کرنا مجھے بہت پسند ہے میں اپنی طالب علمی سے ہی بڑی محنت سے کام کرتا رہا ہوں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ کچھ لمحوں کے بعد وہ بڑے ملایم لہجے میں فہمائش کے انداز میں کہنے لگے۔

"دیکھو.... کتابوں اور فائلوں میں ہی میری تلاش کرتے پھرو گے تو کھو جاؤ گے..... میری زندگی تو ایک سمندر ہے۔ اس کو کوئی ایک ہی شخص ٹٹول نہیں سکتا۔ تم تو پیر و مرشد کے سلسلے کے قایل نہیں ہو۔ لیکن اس بارے میں مجھے ہی اپنا گورو مانو۔ اور میرے پیچھے پیچھے چل کر اپنی تلاش کا دائرہ مختصر کر لو۔"

قصہ مختصر یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک برابر جاری رہا۔ اُنھوں نے میری درخواست پر اُس مسودے کو جو ۹ جولائی ۱۹۸۱ء تک دوسری بار اُن کے وزیر اعلیٰ کے حلف لینے پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ اُستاذی آلِ احمد سرور کو بھیجا۔ جنھوں نے ازراہِ عنایت زبان کی حد تک اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے اُس کے کچھ جملوں یا الفاظ میں تبدیلی کی۔

جب مئی ۱۹۸۲ء میں دفاتر جموں سے سرینگر آ گئے تو اُنھوں نے کہا کہ کتاب کو جلد از جلد شائع ہونا چاہیے۔ وہ پبلشرز سے پہلے ہی اقرار نامے پر دستخط کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم نے مسودے کا بیشتر حصہ کتابت کے لیے دیدیا۔ لیکن ایک دن میں نے اُن سے عرض کی،

"سر۔ کتاب کا بیانیہ صرف ۱۹۸۱ء تک پہنچا ہے۔ اسے تو مکمل اور UP-TO-DATE .... کرنا پڑے گا۔"

بولے "اس کے بعد کون کون سے اہم واقعات ہوئے ہیں۔؟"

میں نے جواب دیا "بیگ صاحب کی علیحدگی...."

میں جملہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ وہ بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو اور کوئی بات؟"

میں نے کہا کہ "جناب کا EPILOGUE جس میں آپ اپنے تجربات کی روشنی میں آئندہ نسلوں کے لیے اپنے پیغام کا نچوڑ پیش کریں گے۔"

چنانچہ چند دنوں کے بعد کام پھر شروع ہو گیا۔ لیکن وہ جون کے پہلے ہفتے میں ڈوڈہ کے دورے پر تشریف لے گئے جہاں وہ ڈاکٹروں اور ہیلی کوپٹر پائلٹ کے مشورے مسترد کر کے ساڑھے بارہ ہزار فٹ بلندی پر واقع ایک پہاڑی گاؤں لال درمن بھی گئے۔ نتیجہ ظاہر تھا وہ وہاں سے ہی بیمار ہو کر آ گئے۔ میں ۸ جون کو حاضری دینے گیا۔ تو مجھے بتایا گیا کہ وہ بہت علیل ہیں۔ آج کسی سے نہیں ملیں گے۔"

دوسرے روز یعنی ۹ جون کو مرزا محمد افضل بیگ کی وفات کے دن میں اُن کے پاس چلا گیا۔ اُس دن رسائی ہو گئی۔ وہ بہت اُداس اور نحیف لگ رہے تھے۔۔۔۔ کتاب کی بات ہی نہ ہو سکی۔

چند دنوں کے بعد جب اُن کی طبیعت ذرا سنبھالا لینے لگی تو ڈکٹیشن کا سلسلہ شروع ہونے لگا۔ ایک دن اُنھوں نے کہا کہ کتاب کا انتساب لکھو۔ میں نے عرض کی کہ یہ تو بعد میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اُن پر آنے والے حادثات کی پرچھائیں جیسے پڑھ چکی تھی۔ کہنے لگے "ایک ایک لمحہ غنیمت ہے۔ کتاب چاہے ۵ دسمبر کو ہی کیوں نہ نکلے یہ پہلے ہی چھپ کر آ جانی چاہیے۔"

میرا کلیجہ یہ سُن کر دھک سے رہ گیا۔ اُنھوں نے انتساب لکھوا کر منظور کر لیا۔

اُس کے بعد اُن کی صحت بہت تیزی سے بگڑنے لگی۔ میں نے ان ابواب کو صاف کر کے لکھا۔ تو مقدر نے اُنھیں یہ دیکھنے اور منظور کرنے کی فرصت نہیں دی اور بقولِ میر ع۔

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

اس لیے دیانت کے تقاضوں کے تحت اِن ابواب کو اِس کتاب میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی شیخ صاحب کبھی کبھی ڈکٹیشن DICTATION دیتے وقت .... مجھ سے کچھ تفصیلات وغیرہ کا ذکر کرتے۔ لیکن ساتھ ہی کہتے کہ کتاب کو چونکہ میری زندگی میں چھپنا ہے۔ اس لیے انھیں اس میں درج نہ کرنا۔ یہ تفصیلات ایک عظیم اور کارکشاد کارساز شخصیت کی زندگی پر بصیرت افروز روشنی ڈالتی ہیں۔ اِنشاءاللہ انھیں بھی کبھی پیش کرنے کی باری آجائے گی۔

شیرِ کشمیر کی خواہش تھی کہ اس کتاب کی اُردو اصل اور انگریزی ترجمہ ایک ساتھ چھپیں اور یہ بالکل صحیح بات تھی کیوں کہ اُردو کا دائرہ محدود ہے اور اُن کے مدّاح اور مشتاق ساری دنیا میں موجود ہیں۔ انگریزی ترجمہ اُن کی ضرورت بھی پوری کر لیتا۔ اس سلسلے میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر رالف رسل سے بھی رابطہ قایم کیا گیا تھا۔ لیکن اُس زمانے میں رسل صاحب کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ کشمیر نہ آسکتے تھے۔ بعد میں کشمیر یونیورسٹی میں سنٹرل ایشیاء انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ پروفیسر مقبول احمدؒ نے کچھ ابواب کا ترجمہ کیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ شیخ صاحب نے ملک کے مشہور طباعتی ادارے وِکاس سے اقرار نامے پر دستخط کر لیے اور اُن کو ترجمے کا کام سونپا۔ لیکن جب چند ابواب کا ترجمہ اُن کے پاس نمونے کے طور پر آگیا۔ تو شیخ صاحب نے اپنی مخصوص تجزرسی سے اُن کو پڑھا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ الفاظ اور واقعات کے EMPHASIS میں فرق

سے نفسِ مضمون متاثر ہوگیا ہے اور مترجم کشمیر کی سیاسی اور تہذیبی فضا کو پوری طرح اُبھار نہیں سکا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ وِکاس کا مترجم راقم السطور کے ساتھ بیٹھ کر ترجمہ کیا کرے۔ وِکاس والوں نے تحریری طور اس انتظام پر رضامندی کا اظہار کی تھی۔ لیکن بعد میں شیخ صاحب کی علالت اور انتقال سے بہت سے دوسرے منصوبوں کی طرح یہ معاملہ بھی رہ گیا۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اُن کے سرگذشت لکھنے کا معاملہ اخباروں میں آگیا تو ہندی۔ ملیالم۔ تلگو اور کنڑ زبانوں کے پبلشروں نے بھی حقوق حاصل کرنے کے لیے اُن کو خط لکھے جو میرے پاس محفوظ ہیں۔

اِس سرگذشت کے بارے میں اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے تاریخ کی کسی کتابی کتاب کی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ یہ کسی METHODOLOGY کی قید میں اسیر نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم انسان کے مالا مال ذہن کی آزادانہ پرواز ہے۔ جس میں کئی بار شعور کی رو STREAM OF CONCIOUSNESS کا سا ماجرا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی اِبتداء میں ہی بعد کے واقعات کا ذکر چھیڑتے ہیں اور پھر کبھی بہت بعد کا ماجرا بیان کرتے ہوئے ابتدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کتابی تواریخ دان اِسے شاید تکرار قرار دیں۔ لیکن اِس سے اس معرکتہ الآرا شخصیت کی ذہنی کیمسٹری کی ترکیب پر روشنی پڑتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کن واقعات و شخصیات، نظریات و تاثرات نے اُن کے ذہن پر اتنے گہرے نقوش ثبت کیے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک بڑے بلند مرتبت تاریخ ساز تھے۔ کتابی مؤرخ نہ تھے ؏

نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

شیخ محمد عبداللہ کا طرزِ بیان اُن کے جری کردار کی طرح بہت بے لوث اور بے باک ہے اور اقبالؔ کے اِس شعر کی تفسیر ہے

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جب کبھی راقم السطور نے ان کی توجہ بعض کم خوشگوار تاثرات کی طرف دِلانے کی جسارت کی تو وہ ایک خود آگاہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے یہ کہہ کر آب آب کرتے رہے۔

"تم تو ایک مددگار (AID) ہو۔ ان بکھیڑوں میں کیوں دخل دیتے ہو؟ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ وہ چپ چاپ کر کے لکھو۔"

لیکن قارئین خود اندازہ کر پائیں گے کہ انھوں نے اپنے سخت ترین سیاسی رقیبوں اور حریفوں کے بارے میں بھی بہت ملائم اور مہذب انداز میں تبصرے کیے ہیں۔ وہ بہت ہی شائستہ بزرگ تھے۔ اگرچہ اُن کے مشہورِ زمانہ جلال سے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ لیکن کسی نے اُس جلالی عالم میں بھی اُن کی زبان سے کوئی غیر شائستہ بات نہیں سنی اِس تحریر میں وہ اور زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ تاثرات کی برجستگی کو مجروح کرنے کے حق میں نہ تھے لیکن اُن کا اندازِ بیان بہر حال تہذیب و تمیز کی اعلیٰ سطح پر ہی رہتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین کی تنقید کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کی توصیف میں بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ محمد علی جناحؔ، جواہر لالؔ نہرو اور بخشی غلام محمد جیسے حریفوں کی صفات اور اچھے کاموں کو اُبھارنے میں وہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ جناح صاحب کے بارے میں وہ بار بار کہتے تھے کہ مزاج میں لچک نہ تھی اور وہ بہت کم کسی کی رائے کو خاطر

میں لاتے تھے۔ اگرچہ ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن کی ذاتی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی اور انھیں کسی قیمت پر خریدا نہ جا سکتا تھا۔"

ول دوراں (WILL DURANT) نے لکھا ہے کہ عظیم ہستیاں اقوام کے باطن میں چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کے ڈھکن کھول دیتی ہیں اور اس قوت کو تاریخ کا رُخ متعین کرنے اور اُسے نئی شکل وصورت عطا کرنے میں خرچ کرتی ہیں۔ اُس کا کہنا ہے کہ کسی شخصیت کی عظمت کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ وہ عام روش کو کس طرح بہاؤ کے خلاف جا کر بدل دیتا ہے واقعات اُس کی معرفت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور وہ قومی اعتقادات اور اجتماعی آرزوؤں کی علامت بن جاتا ہے۔ ایسے بڑے آدمی بے شمار وجوہات کا اثر اور بے شمار اثرات کی وجہ بنتے ہیں۔[1] کشمیر کی طویل اور واقعات سے بھری پڑی تواریخ میں شیخ محمد عبداللہ کی عزت و عظمت کی بہت ہی کم شخصیات نظر آتی ہیں۔ وہ ماضی کی جڑوں سے نمو پاتے ہیں۔ حال کو تسخیر کرتے ہیں اور مستقبل پر اپنی پرچھائیاں ڈال رہے ہیں۔ جب تک کشمیر کی شادابی قایم اور اس کے عوام کا وجود دایم ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کشمیریوں کے اجتماعی شعور و لاشعور میں زندہ جاوید رہیں گے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ذات کا حصار توڑ کر ابدیت اور اسطور کے بقائے دوام میں داخل ہو گئے تھے اور تاریخ کا حصہ بننے کے بعد بھی ہماری شناخت کے پرچم اور علامت کے طور پہ ہماری نفسیات پر چھائے رہیں گے۔

LESSONS OF HISTORY SIMON & SCHUSTER NEW YARK



تبسم آمیز چہرہ۔

شیخ محمد عبداللہ کی زندگی گذشتہ نصف صدی میں کشمیر کی تواریخ ہے اور تقریباً ہر اہم دستاویز اُن کے ساتھ منسلک ہے۔ اِن دستاویزات کو ضمیموں کی شکل میں درج کیا جاتا تو یہ کتاب ضخامت کا بوجھ نہ سنبھال سکتی۔

یہ کتاب اُس عظیم الشان کشمیری کی آپ بیتی کے لحاظ سے ایک شاندار دستاویز کے طور پر توجہ اور حوالے کا مرکز اور محور بنی رہے گی۔ ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہماری تاریخ اور تقدیر کا دھارا موڑنے والی اس بلند قامت ہستی نے واقعات و حوادث میں اپنی دروں بینی INSIGHT کی کرنیں ڈال کر اُن میں نئے مفہوم اور تازہ معنی پیدا کیے ہیں۔ اُن کے ساتھ اختلافات کی گنجائش تو رہے گی۔ لیکن اُن کو کسی صورت میں نظرانداز BY PASS نہیں کیا جاسکے گا۔ ع

خودی سے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں!

(اقبال)

محمد یوسف ٹینگ

۳۴۷۔ جواہر نگر۔ سرینگر
۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء





اپنی شریکِ حیات کے ساتھ



وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ۔

”وہ نہرِ خوں جو میری صدا ہے“

(فیض)

پہلی بات

میری زندگی میں دھوپ اور چھاؤں ایک دوسرے کا اس تواتر، تسلسل اور تیزی سے پیچھا کرتے رہے ہیں کہ مجھے سستانے کی فرصت بہت کم نصیب ہوئی۔ یہ ایک عاشق اور ایک سپاہی کی زندگی کا تانا بانا ہے۔ جو بظاہر دو مختلف رنگوں سے بنا ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے پر ان میں ایک باطنی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ میری زندگی میں رومان پرست اور سپاہی کی یہ آویزش میری جستجو کی نوعیت میں ہی مضمر تھی۔ اپنے وطنِ عزیز کی تقدیر سنوارنے کے خواب دیکھنا بھی اسی بندۂ عاجز کا مقدر ہو چکا تھا۔ اور اُن خوابوں میں رنگ بھرنے کا قرعۂ فال بھی "من دیوانہ[1]" کے نام ہی نکالا گیا تھا۔ اگر میری جدوجہد کو میرے عشق نے اذنِ عمل عطا کیا تو میرے عشق کو میری جدوجہد سنبھالا دیتی اور بھڑکاتی رہی۔ بارہا ایسا ہوا کہ میری صبح ایک ایسے میدان کارزار میں پھوٹی جہاں میں جوش اور جستجو سے سرشار اپنے ہمسروں کے کندھوں سے کندھا ملائے

---

[1] حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

تھا۔ لیکن ٹینگ صاحب کے اِلتماس میں خلوص تھا یا حُسنِ قبول کی ساعت تھی۔ میں فوراً ہی آمادہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کام میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ ازغیب نکل آیا ہے۔ یہ سلسلہ سرینگر اور جموں دونوں جگہ جاری رہا۔ کبھی کبھی میری مصروفیات اس کی پیش قدمی میں حائل ہو جاتیں۔ مگر ٹینگ صاحب ان یادداشتوں کو ترتیب سے لکھ کر لاتے۔ وہ کچھ اس لگن سے میرا پیچھا کرتے رہے کہ سلسلہ جاری رہا۔ اِس عمل میں کوئی دو سال کے قریب لگ گئے اور ایک اچھی خاصی کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا۔ ٹینگ صاحب کشمیر کی قدیم اور معاصر تواریخ پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تاریخی حوالوں، سنین وغیرہ کی جانچ پڑتال اور ترتیب میں بڑی محنت سے میرا ہاتھ بٹایا۔ اور مسودے کی شیرازہ بندی کی۔ حق یہ ہے کہ اُن کے شوق اور ریاض کے بغیر یہ کتاب مکمل نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے آخری مرحلے پر مسودات کو دیکھا بھالا اور اُن کی مناسب دُرستی کی۔ میری خواہش اور ٹینگ صاحب کے مشورے پر اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر کے ڈائریکٹر اور اُردو کے مستند اُستاد پروفیسر آل احمد سرور نے بھی مسودات کو ایک نظر دیکھا اور کچھ مناسب مشورے دیئے۔ اِن مراحل سے گذر کر اب کتاب آپ کے سامنے ہے۔

ایک اور بات جس کا ذکر ضروری ہے یہ ہے کہ میں جب وطنِ عزیز سے پلٹے ہوئے غلامی اور ظلم کے عفریتوں سے پنجہ آزمائی میں مصروف تھا۔ اُس وقت میری ساری توجہ میرے وطن کی سلامتی اور سربلندی کے مقصد پر مرکوز تھی۔ اُن کڑے کوسوں میں اِس جان لیوا جدوجہد کی کہانی بیان کرنے کا

خیال ذہنی عیاشی کے برابر ہی سمجھا جاتا۔ بہر کیف ہمیں اُس وقت قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں نئی راہیں نکالنی تھیں۔ چنانچہ صحیفہ نگاری کے فن کو بھی ہم فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری تحریک کا مقصد آزادیٔ تقریر کے ساتھ ساتھ آزادیٔ تحریر بھی تھا۔ اِسی شوق میں، میں ریاست کے کچھ اوّلین جریدوں اور اخباروں کا بانی اور معمار بھی بنا۔ صحافت سے میرا براہِ راست تعلق رہا۔ لیکن میں نے کبھی اپنی یادداشتوں کا کوئی روزنامچہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اِس لیے میں یہ اوراق محض اپنی یادداشت کے سہارے لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس تحریکِ حریت کی کچھ نادر اور نایاب دستاویزات تھیں۔ اور مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، جناح صاحب اور برِّصغیر کی کچھ اہم ترین ہم عصر شخصیات سے خط و کتابت کا ریکارڈ بھی، لیکن میری بار بار کی گرفتاریوں کے بعد پولیس کے طوفانی چھاپوں میں سب سے پہلی شامت اِنہی کاغذات کی آجاتی۔ چنانچہ وہ ساری دستاویزات اب وقت کے اندھے کنوئیں میں ڈوب کر گم ہو چکی ہیں۔ مجاہد منزل ہماری تحریک کا دل رہ چکا ہے۔ وہاں بھی قومی دستاویزات کا ایک بیش بہا گنجینہ موجود تھا۔ مگر ۱۹۵۳ء کے بعد مجاہد منزل کو بھی قیدی بنا لیا گیا۔ اور یہ بے بہا دستاویزات یا تو ضائع کر دی گئیں یا تحریک کی جڑوں اور قربانیوں سے بے خبر لاں بجھکڑوں نے اُنھیں بیچ باچ کر محفلِ سرود و سرور آراستہ کرنے پر خرچ کر دیا۔ اِس طرح سے ہمارے لیے حوالے کی اصل دستاویزات سے اِستفادہ ناممکن بن گیا۔

ظاہر ہے کہ اس عالم میں مجھے اپنے حافظے پر ہی زور ڈالنا پڑا۔ میری عمر کو پہنچ کر حافظے کا چراغ بھی ٹمٹمانے لگتا ہے۔ چنانچہ بہت سے واقعات کے

مختلف پہلو یا تو طاقِ نسیاں میں رہ گئے ہیں۔ ورنہ اُنھیں طوالتِ کلام کے خیال سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے شعار کے مُطابق مختلف واقعات و شخصیات کے متعلق صاف گوئی سے کام لیا ہے اور میرا مقصد صرف واقعات کا صحیح پہلو پیش کرنا ہے۔ کسی کی دلآزاری کرنا نہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ستر بہتر برس کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے اِس بیان کو چند سو صفحات میں سمیٹ لینے کی کوشش میں اُس گرم نفس اور شرربار کیفیت کی بازیافت ناممکن ہے جس نے ہمیں تحریک کے مختلف مرحلوں میں آمادۂ پیکار رکھا۔ اُس ولولہ انگیز فضا کو بھی اُجاگر کرنا بہت مشکل ہے جس کی کوکھ میں یہ واقعات پیش آئے اور تواریخ کی لامتناہی زنجیر کی کڑیاں جوڑتے گئے۔ کشمیر کی تواریخ اگرچہ بے حد درخشاں رہی ہے لیکن ہمارے زمانے تک پہنچتے پہنچتے خود کشمیر تواریخ کے اِن کھنڈروں کے نیچے پڑا ہانپ رہا تھا جو صدیوں کی غلامی نے وجود میں لائے تھے۔ زمانے نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میں نے اِس کو اندھی صدیوں کے اس ملبے سے باہر نکالا۔ اِس کتاب میں ایک عظیم قوم کی اپنی شخصیت اور شناخت کے لیے جستجو اور کشمکش کا ماجرا دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ خیال کسی حد تک تسکین دیتا ہے کہ اس ننگ و تاز کا دامن کشمیر کی تواریخ سے پیوست ہے۔ ہماری تحریک کی بہت سی سرگذشتیں، تفسیریں اور تاویلیں لکھی گئی ہیں اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ بھی اس کی بے شمار روئیدادیں اور تعبیریں لکھی جائیں گی۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ اُن سبھی بیانوں میں اِس بندۂ عاجز کے روز و شب بھی تاک جھانک کرتے رہیں گے۔ کیونکہ میرا تو اقبال کے الفاظ

میں کچھ وہی ماجرا ہے ؏

اُڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

سچ پوچھیے تو یہ کتاب پیش کرنے سے میرا مقصد اپنی کہانی سنانا نہیں بلکہ اپنی قوم کے تئیں اپنی ایک اور ذمہ داری سے سُبکدوش ہو جانا ہے تاکہ آئندہ نسلیں میرے تجربے کی روشنی میں اپنی سمت سنوارتی رہیں۔ اِس کے علاوہ مجھے اِس بات کا خیال بے قرار کرتا ہے کہ میں اپنے اَن گنت ساتھیوں اور تحریکِ حریّت کے کچھ شاندار مجاہدوں کے نام اور کام کا اس کتاب میں یا تو ذکر ہی نہیں کر سکا یا ایسا کرتے ہوئے مجھے صرف اشاروں پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اِس معذوری کا تعلق بھی بیانیے کے بہاؤ، اختصار کے تقاضوں اور کچھ صورتوں میں حافظے کی کوتاہیوں سے ہے اور اس سے ان عاشقانِ پاک طینت کے نام اور کام پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیئے۔ مجھے توقع ہے کہ جب بہتر اوقات میں ہماری قوم اپنے شعور کی مشعل جلا کر تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی مفصل اور معتبر تواریخ مرتب کرنے کا بیڑا اٹھائے گی تو اس کہکشاں کے سبھی چاند سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ ہمارے قومی مطلع پر جگمگانے لگیں گے۔ مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ یہ کتاب کشمیر کے تواریخی لٹریچر کی سرحدوں میں توسیع کرتی ہے۔

تواریخی فہم و بصیرت کشمیریوں کی قومی روایات کا حصّہ ہے۔ بقول جواہر لال نہرو ہندوستان کو کشمیر نے ہی تواریخ نویسی کا فن سکھایا۔ چنانچہ ہندوستان میں سب سے پہلی اور مستند تاریخ کشمیر کے فرزند کلہن پنڈت نے رکھی ہے۔ اسی

تواریخی عرفان و ادراک نے سُلطان زین العابدین کو بھی اِس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے درباری مؤرخوں کے ذریعے واقعات کو اپنے زمانے تک قلمبند کروائے۔ اس کے بعد آج تک کی تواریخ کے متعلق کشمیر میں بہت اعلیٰ اور معیاری کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک ناچیز بندہ ہوں مگر قدرت نے مجھے ایک تقدیر ساز اور انقلاب آفرین تحریک کی ساربانی اور حُدی خوانی کا شرف عطا فرمایا۔ اِس لحاظ سے میری کہانی میرے عہد میں کشمیر کی آپ بیتی بن جاتی ہے۔ اور ہماری عظیم تواریخ کا ایک حصّہ۔ فرد اور قوم کے تعلق پر کوئی سخن سرائی کیے بغیر میں غالبؔ کے اِس شعر میں پوشیدہ رمز کے ساتھ یہ کتاب آپ اور کشمیر کی آئندہ نسلوں کو سونپ دیتا ہوں۔ ؏

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچّوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

میں نے اس کتاب کا نام علامہ اقبال کے مشہور شعر سے مستعار لیا ہے۔ آگ زندگی جوش اور حرارت کی علامت اور چنار کشمیر کی شناخت ہے۔ اس شعر میں کشمیر کے مستقبل کے متعلق خوش امیدی کی بشارت دہک رہی ہے اور میرا یقین کامل ہے کہ ارجمندی میرے خوبصورت وطن کا مقدر ہے۔ اِس طرح "آتشِ چنار" کی ترکیب میری ترجمان بن گئی ہے۔

جموں ۸ر جنوری ۱۹۸۲ء

شیخ محمد عبداللہ
(شیخ محمد عبداللہ)

۱

بچپن اور ابتدائی تعلیم

میری پیدائش وادیٔ کشمیر کے ایک ایسے مقام پر ہوئی جو اس کی راجدھانی سرینگر اور نواحی دیہات کے سنگم پر واقع ہے۔ صورہ نامی یہ چھوٹا سا محلہ ہری پربت پہاڑی کے شمال میں ایک پُر فضا جگہ پر آباد ہے۔ یہ آنچار کی دلدلی جھیل کے مشرقی کنارے پر بسا ہوا ہے اور اس سے تھوڑی ہی دور کشمیر کی سب سے خوبصورت جھیل ڈل واقع ہے۔ صورہ ایک قدیم بستی ہے۔ حال ہی میں ایک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی تعمیر کے سلسلے میں ہونے والی کھُدائی کے دوران یہاں پرانے زمانے کی کچھ خوبصورت مورتیاں، مٹی کے ظروف اور دوسرے آثار ملے ہیں۔ صورہ کے بالکل نواح میں وہ مشہور جگہ بھی موجود ہے، جس کا کشمیر کے مشہور ریشی اور زاہد مرتاض حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی زندگی میں ذکر آتا ہے۔ روایت کے مطابق حضرتؒ کی پاکباز زندگی سے خار کھا کر اس وقت کے فرعونوں نے اُن کا زُہد توڑنے کے لئے ایک چال سوچی۔ ایک مستِ شباب نازنین عرف یادَنْ مرّی کو سولہ سنگار کرکے اُن کے پاس بھیج دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخؒ نے اپنے مراقبے سے سر اُٹھایا اور ایک غضب آلود نگاہ اس خوبصورت جاسوس پر ڈالی تو چشم زدن

میں اُس کا حلیہ ہی تبدیل ہوگیا۔ اُس کے چاند جیسے چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں اُبھر آئیں اور اُس کی کالی زلفیں روئی کے گالوں کی طرح سفید ہوگئیں۔ چنانچہ اس کرامت سے متاثر ہوکر وہ حضرتؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئی۔ صورہ کا گرد و پیش بھی تاریخ کے وزن و وقار سے گراں قدر نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے بالائی محلے نوشہرہ میں وہ تاریخی جگہ واقع ہے۔ جہاں کشمیر کے دانشمند عوام دوست اور دُور اندیش بادشاہ سُلطان زین العابدین بڈشاہ نے اپنا دارالخلافہ تعمیر کیا تھا۔ مؤرخین کے مطابق اُس نے یہاں "رازہ دآنی" کے نام سے اپنا محل تعمیر کیا تھا جو خالص لکڑی کا بنا تھا اور کشمیر کے طرزِ تعمیر کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس محل کے بارہ طبقے تھے اور اس لئے اس کو موجودہ دور کے فلک پیماؤں SKY SCRAPERS کا پیش رو اور دُنیا کا پہلا فلک نما کہا گیا ہے۔ یہ شاندار عمارت جب بڈشاہ کے بعد خانہ جنگی کے دنوں میں جل کر تباہ ہوئی تو ایک سال تک اس کے کھنڈرات سے دھواں اُٹھتا رہا، کشمیر میں یہ روایت اب بھی عام ہے کہ اُس سال کے دوران اگر کسی کو انگاروں کی ضرورت ہوتی تو وہ اس جگہ کی خاکستر سے اُنہیں چُن لیتا تھا۔ مورخ حسن کے مطابق مُغل دور میں صورہ اپنے ثمر بار باغات کے لئے بھی مشہور تھا۔

صورہ لداخ جانے والی شاہراہ پر واقع ہے اور اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے، جو میرے بچپن میں یا تو محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے تھے یا چھوٹی موٹی دستکاریوں سے روزی روٹی کماتے تھے۔ چند ایک گھرانے زراعت پیشہ بھی تھے۔

میرے خاندان کے متعلق مشہور تواریخ "کشمیر" کے مصنّف نے لکھا ہے کہ انھوں

کے زمانے میں ایک کشمیری برہمن نے اسلام قبول کر لیا اور شیخ محمد عبداللہ کا اسلامی نام اختیار کیا۔ صُوفی کے کہنے کے مطابق یہ واقعہ ۱۷۲۲ء میں پیش آیا اور شیخ محمد عبداللہ اوّل نے میر عبدالرشید بیہقی کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لیا۔ اُس کے آبا و اجداد علاقہ لاجوار سے آئے تھے۔ لیکن ایک اور تحقیق کے مطابق وہ ایک کشمیری الاصل دتاتریہ کول برہمن تھے اور اُن کا اصل نام راگھو رام تھا۔ شیخ غلام رسول یعنی میرے دادا اِن ہی کی اولاد تھے۔ ہمارا خاندان پشمینے کی تجارت کرتا تھا۔ اور کشمیری شال دوشالے اپنے چھوٹے سے کارخانے میں تیار کروا کے بازار میں فروخت کرتا تھا۔ کشمیری شال دوشالے ساری دُنیا میں اپنی نفاست اور عُمدگی کے لئے مشہور تھے۔ مُورخین نے لکھا ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب نپولین بوناپارٹ برطانیہ کے اُبھرتے ہوئے سامراج کو چیلنج کر رہا تھا تو ٹیپو سلطان شہیدؒ اس سامراج کو شکست دینے کے لئے ایک عالمی اِتحاد کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ٹیپو نے اُس کو اپنا اِتحادی بنانے کے لئے پیغامات بھیجے اور سفارت کے ساتھ ایک کشمیری شال بھی سوغات کے طور پر اُس کی خدمت میں روانہ کی۔ نپولین کو یہ شال اس قدر پسند آئی کہ اُس نے اِسے اپنی محبوب ملکہ جوزیفائن کی نذر کر دیا*۔ ڈوگرہ راج کی ابتداء میں ہی اس تجارت پر سرکاری نگرانی کا کڑا پہرہ بٹھایا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور اُس کی اولاد ایک معمولی حیثیت سے اُٹھے تھے اور زیادہ تر اپنی سازشی سیاست کی وجہ سے ایک بڑی سلطنت کے مالک بن بیٹھے تھے۔ پھر اُنہوں نے وادیٔ کشمیر کو خریدنے کے لئے پچھتر لاکھ روپے کی رقم انگریزوں کو ادا کی تھی۔ لہٰذا وہ جلد از جلد اس رقم کو واپس بٹورنے کے لئے اور اپنی حرصِ زر کو پُورا کرنے کے

---

* کہا جاتا ہے کہ جوزیفائن کے پاس [illegible] کشمیری شالیں جمع ہو گئے تھے۔ نپولین [illegible] کا معمول [illegible] پسند کرتا تھا۔ چنانچہ [illegible] شال کو آگ میں پھینک دیتا۔ جوزیفائن [illegible] سے اپنی [illegible] دوسرا شال [illegible] اور اس طرح یہ [illegible] جاری رہی۔

لئے کشمیری عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ ان نودولتیوں نے شالبافوں اور شال بیوپاریوں سے بھی بے تحاشا محصولات وصول کرنا شروع کر دیے۔ اِس غرض کے لئے ایک الگ محکمہ "داغِ شال" کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ محکمہ ہر بنی ہوئی شال پر سرکاری مُہر داغ دیتا تھا تاکہ محصول سے فرار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ چنانچہ پنڈت راجہ کاک در نے "داغِ شال" کے ٹھیکیدار کی حیثیت سے صرف ڈوگروں کا شاہی خزانہ ہی مالا مال نہیں کیا بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کے لئے بھی عیش و عشرت کے سامان مُہیّا کر لیے۔ شال بُننے والے کاریگروں کو معمولی سا معاوضہ جنس کی صُورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن اُنہیں اس کام کے سوا کوئی اور دھندا کرنے کی اِجازت نہ تھی۔ اس پابندی کا مُدعا یہی تھا کہ شالبافوں کو ٹیکس کی تجوریاں بھرنے والی مشینیں بنا دیا جائے تاکہ حکمرانوں کے لئے اُن کے خون پسینے کی کمائی رنگ و رامش کے سامان بہم کرتی رہے۔ خود بیچارے شالباف نہایت تنگدستی اور افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اِس حقیقت کا مُشاہدہ کشمیری قوم کے غم گسار اور دردمند شاعر علامہ اقبالؒ نے بھی اُس وقت کیا جب وہ اِس صدی کی اِبتدا میں کشمیر آئے اور اسی مُشاہدے نے اُن سے یہ شعر کہلوایا ؎

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

اُن کا یہ احساس اِتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اُنہوں نے اُردو میں بھی اِس مضمون کی تکرار کی ؎

سرما کی ہواؤں میں عُریاں ہے بدن اُس کا
دیتا ہے ہُنر جس کا امیروں کو دوشالہ

میرے والد شیخ محمد ابراہیم اسی تجارت سے وابستہ تھے۔ پہلے پہلے تو انہوں نے چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا۔ لیکن اپنی محنت، دیانت اور لیاقت سے جلد ہی ایک درمیانی درجے کے کارخانہ دار کی حیثیت تک پہونچ گئے۔ ہمارے کنبے کی مالی حالت ایک اوسط درجے کے گھرانے کی جیسی تھی۔ نہ بہت زیادہ ٹھاٹھ تھے اور نہ ہی عُسرت کی زندگی۔ کشمیری شال اگرچہ ایک وقت یُورپ کی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے لیکن نپولینی جنگوں کے نتیجے میں جب فرانس کی، جو یورپ کے رؤسا کا مرکز اور فیشن کا راہ نما تھا، مالی حالت کمزور ہوگئی تو کشمیری شال کی مانگ ماند پڑ گئی۔ پھر صنعتی انقلاب کے زیرِ اثر خود فرانس میں کشمیری شالوں کے چربے مشینی کرگھوں پر تیار ہونے لگے تو کشمیری شال کی تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ اس کے بعد مصر میں کشمیری شال کی مانگ بڑھ گئی۔ یہ ایک خاص نقشے اور بناوٹ کا شال ہوتا تھا اور مصری چھینٹ کہلاتا تھا۔ اس نے کلاسیکی کانی شال کی جگہ لے لی۔ لیکن پھر اس کی مانگ بھی کم ہوتی گئی۔ اب رفل اور سوزن کاری شال کا ستارہ چمکنے لگا۔ اور امرتسر اس تجارت کا دساور بن گیا۔ اس کی مانگ کچھ اتنی بڑھی کہ کشمیر کے شہر اور گاؤں میں رفل شال تیار ہونے لگے۔ زمانے کے چلن کے مطابق ہمارے خاندان نے بھی رفل شال کی تجارت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ امرتسر کے بیوپاریوں سے خام مال لے کر اسے شہر و دیہات کے کاریگروں میں بانٹتے اور ان کو مختلف نقشوں کے مشابہ ڈیزائن اُبھارنے کی تلقین کرتے۔ مال تیار ہو جاتا تو کام کی نوعیت کے مطابق کاریگروں کو اجرت ادا کی جاتی۔

میرے والد میری پیدائش سے کوئی پندرہ دن پہلے وفات پا گئے تھے۔ اور

اس طرح میں نے ایک یتیم کی حیثیت سے دُنیا میں آنکھ کھولی۔ اُن کے بعد کنبے اور کاروبار کی دیکھ بھال کا بوجھ میرے ایک بڑے بھائی شیخ محمد خلیل کے کندھوں پر آن پڑا۔ میرے والد نے تین نکاح کئے تھے۔ پہلی بیوی کسی عارضے سے وفات پاگئیں۔ لیکن اُن کے بطن سے ایک بیٹی زندہ تھیں۔ والد مرحوم نے دُوسری شادی کی اور اس نکاح سے تین فرزند اور ایک دُختر رہ گئے تھے۔ فرزندوں میں شیخ محمد خلیل، شیخ عبدالکبیر، اور شیخ عبدالغفار تھے اور ایک بیٹی کا نام خدیجہ تھا۔ دُوسری بیوی بھی چل بسیں تو والد صاحب کو گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے اور بچوں کو سنبھالنے کے لئے تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ اسی نکاح سے میرے دو بڑے بھائی شیخ محمد مقبول، شیخ غلام محی الدین اور ایک بہن جان بیگم پیدا ہوئے۔ میں اپنے والدین کی آخری اولاد تھا۔ میری والدہ کا نام خیر النسا تھا۔ اُن کا مائکہ یعنی میری ننھیال جامع مسجد کے قریب واقع تھی اور میرے ماموں پیشے کے اعتبار سے زرگر تھے۔ جو اُن دنوں خاصا معزز پیشہ شمار کیا جاتا تھا۔

میرے والد کی وفات کے وقت میری والدہ کے بطن سے پیدا ہوئے میرے دو بڑے بھائی بھی خاصی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس لئے یتیم بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی ساری ذمہ داری ہماری والدہ کو ہی سنبھالنا پڑی۔ دیگ دان (چولہا) چونکہ مشترک تھا، لہٰذا اس بڑے کنبے میں ہماری پرورش ایک سوتیلے ماحول میں ہوئی۔ اُن دنوں کشمیر صحیح معنوں میں اندھیر نگری تھا، نہ بجلی کی روشنی تھی نہ سرکاری نلکوں کا پانی۔ دھان کوٹنے یا کنوئیں سے پانی لانے کا کام گھر کی عورتوں کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ شاذ و نادر کوئی با استعداد گھرانا ان کاموں کے لئے نوکر رکھ لیتا تھا۔ میری والدہ ہمارے کھانے پینے اور پرورش کی دُوسری ضروریات کے لئے اپنے سوتیلے بیٹوں کی

محتاج تھیں۔ جو گھر کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ میری والدہ رسمی طور تو پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن وہ کافی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست رکھنے والی خاتون تھیں۔ وہ چھوٹی موٹی باتوں اور رنجشوں کو بھلا دیتیں اور گھر میں ایک شفیق ماں کی طرح پاسبانی کرتیں۔ اُن کی سلیقہ مندی اور تدبّر کا ہی فیض تھا کہ اُن کے سوتیلے بیٹے بھی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور گھر کے انتظامات میں اُن کی رائے کو وزن دیتے تھے ______

______ لیکن میری والدہ کی اپنی اولاد ابھی کمانے کے قابل نہ تھی۔ اُلٹا اُن کی دیکھ ریکھ اور پڑھائی پر خرچہ آتا تھا۔ اس لئے اُنہیں اپنے سوتیلے بیٹوں کے طعنے اور کبھی کبھار جھڑکیاں بھی سہنا پڑتی تھیں۔ بیچاری کو کبھی کبھار ذہنی کوفت کے علاوہ جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں لیکن وہ توکّل اور صبر و شکر کے ساتھ یہ سب کچھ سہتی رہیں۔ لیکن گھر کے شیرازے کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اسی اثنا ہم نے کچھ کچھ ہوش سنبھالا تو ہم سے بیچاری والدہ اور خود اپنی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم اکثر اماں جان کی حالت دیکھ کر اُنہیں مشورہ دیتے کہ ہم اپنے بڑے بھائیوں سے الگ ہو کر اپنا دیگ دان شروع کریں گے۔ اُس صورت میں ہمیں محنت مزدوری تو کرنا پڑے گی لیکن روز کی چخ چخ سے نجات مل جائے گی۔ اماں بڑی حوصلے والی اور دُور اندیش خاتون تھیں وہ ہماری دلجوئی کر کے معاملے کو ٹال جاتیں لیکن خاندان کا بٹوارہ پسند نہ کرتیں۔ غالباً اُنہیں اپنے تجربے کی بنا پر اس قسم کے بٹوارے کے عواقب کا ہم سے بہتر اندازہ تھا۔ لیکن ہم عمر میں بڑھتے گئے اور آہستہ آہستہ اس ناروا سلوک کے خلاف ڈٹتے چلے گئے۔ ہمارے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر بھائی صاحبان کا سلوک کچھ کچھ سُدھرنے بھی لگا مگر جب تک والدہ زندہ رہیں ہمارا دیگ دان مشترکہ ہی رہا۔

اس قسم کے ماحول میں ہماری تعلیم و تربیت کا جو حال ہو سکتا تھا اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ میری والدہ کی بڑی آرزو تھی کہ ہم لوگ لکھیں پڑھیں اور اچھی تعلیم سے آراستہ ہوں۔ لیکن گھر کی ناسازگار فضا کی وجہ سے میرے بڑے بھائی شیخ محمد مقبول انٹرالیف۔ اے۔ سے آگے نہ پڑھ سکے۔ انہوں نے ہمدانیہ مڈل سکول کی ہیڈ ماسٹری سنبھال لی اور اُن کا مُشاہرہ نوّے روپے فی ماہ مقرر ہوا۔ جو اُن دنوں بڑی بات تھی۔ میرے دوسرے بھائی شیخ غلام محی الدین چوتھی پانچویں سے آگے نہ بڑھ سکے اور اُن کو گھر میں ہی رفوگری کے کارخانے میں کام پر لگا دیا گیا تاکہ وہ بھی کچھ کما سکیں۔

اُن دنوں مسلمانوں میں مدرسے کی تعلیم حاصل کرنے کا رواج بہت کم تھا۔ اُن کو اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے دلچسپی بھی نہ تھی۔ جس کا بڑا کارن مسلمانوں کی غریبی اور اُن کے تئیں حکومتِ وقت کی حوصلہ شکنی اور بے نیازی تھی۔ اگر کوئی کھاتا پیتا گھرانا اپنے بچوں کو پڑھانے کی طرف مائل بھی ہو جاتا تو پہلے پہل اُن کو مکتب بھیجنا لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ جہاں اُنہیں عربی اور فارسی کی لکھائی اور پڑھائی سکھائی جاتی تھی۔ چنانچہ مجھے اور میرے بڑے بھائی شیخ عبدالکبیر کے فرزند شیخ غلام نبی کو، جو میرا ہم سن تھا، ۱۹۰۹ء میں محلّے کے مکتب میں قرآنِ مجید پڑھنے کے لئے داخل کیا گیا۔ ہمارے اُستاد کا نام آخون مبارک شاہ تھا۔ وہ ایک صوفی منش اور مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ ہم سے محبت کرتے اور ایک شفیق باپ کی طرح ہمیں پیار اور نرمی سے پڑھایا کرتے۔ آخون صاحب کی اہلیہ اوتن جی کہلاتیں۔ وہ ہم کو ایک شفیق ماں کی طرح پالتی پوستیں اور کھلاتیں پلاتیں۔ اس طریقۂ تعلیم میں یہ خوبی بے نظیر تھی کہ شاگرد کو اولاد کی طرح رکھا جاتا اور اُس کو پیار، محبت اور اُنس و اُلفت کے رشتے میں باندھ کر اس

دِل میں تعلیم کی لگن پیدا کی جاتی۔ اس طرح سے اُستاد اور شاگرد کے درمیان وہ فاصلہ اور بے اعتمادی پیدا ہونے کی نوبت نہ آتی جو آج کے طرزِ تعلیم کا خاصہ اور اس کی بہت سی غلطیوں کا سبب ہے۔

یہیں سے کلامِ پاک سے میرے والہانہ عشق کی ابتدا ہوئی۔ جو بحمداللہ آج تک پوری طرح سرسبز و شاداب ہے۔ آخون صاحب ہم کو تاکید کرتے کہ ہم قرآن بہ آوازِ بلند اور لحن کے ساتھ پڑھیں۔ جس کے نتیجے میں اُن دنوں میں ہی یہ سُراغ ملا کہ قُدرت نے میرے لحن میں ایک دلنواز سحاس اور کشش ودیعت کی ہے۔ ختمِ قرآن شریف کے بعد ہم نے شاہ صاحب سے فارسی کی نصابی کتابوں کریما نامِ حق، گلستان، بوستان، پند نامہ، بدائع منظوم وغیرہ کا درس لیا۔ اس کے علاوہ مکتب میں ارکانِ اسلام کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ بعد میں گھر کے بزرگ ہمیں مسجد میں اپنے ساتھ لے جایا کرتے اور یہیں سے نماز میرے معمول کا لازمی جزو بن گئی۔ اقتدار کا ایوان ہو یا زندان کی خلوت، ہر مقام پر نماز نے مجھے سہارا اور سکون دیا ہے۔ گھر میں اُن دنوں صبح ایک آدھ پارہ قرآن کی اونچی آواز سے تلاوت بھی لازمی تھی اور بچپن کے اسی آمیزے میں جب میرا ذہن و ضمیر کچی مٹی کی طرح نرم تھا، قرآن کی لازوال اور سرمدی آیات میرے حافظے پر نقش ہوگئیں اور پھر زندگی بھر کڑے کوسوں میں مجھے اپنی قوتِ شفا سے بہرہ ور کرتی رہیں۔ الحمدللہ۔

مکتب سے فارغ ہونے کے بعد ہم کو ایک پرائمری سکول میں داخل کر دیا گیا جو انجمن نُصرت الاسلام کے انتظام میں چلتا تھا۔ یہ ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے۔ یہ سکول ہمارے محلے کے نواح میں نوشہرہ کی بستی میں قائم تھا۔ لیکن یہاں کے انتظام اور طریقۂ تعلیم سے مایوس ہو کر میں نے اپنی بستی کے نزدیک تر محلے وچار ناگ میں منتقل ہونا چاہا۔

نوشہرہ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کیا اور میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کرنا خُدا کا ایسا ہوا کہ یہ احتجاج میری عمر کی طویل جدوجہد کا پہلا پتھر ثابت ہوا۔ میں نے اس نامعقول روش کے خلاف نُصرت الاسلام کے ذمہ دار اراکین بلکہ انسپکٹر سکولز سے جو نُصرت الاسلام کے سکولوں پر بھی اختیار رکھتا تھا، فریاد کی۔ لیکن انصاف حاصل کرنے کی یہ جسارت آمیز کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ پھر کسی نہ کسی طرح وچارنگ سکول کے ہیڈ ماسٹر میرے آڑے آئے اور میرا شوق دیکھ کر اُنہوں نے مجھے سرٹیفکیٹ کے بغیر اپنے سکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ اس مہربان اُستاد کا نام حسام الدین تھا اور یہ تول، سرینگر کے باشندے تھے۔ اسی اثنا میں جبکہ ہم نے پرائمری سکول کی صرف دو جماعتیں پاس کی تھیں، میرے بڑے بھائیوں نے مجھے اور میرے بھتیجے غلام نبی کو سکول جانے سے روک دیا۔ ہمیں زور زبردستی سے رفوگری کے کارخانے میں بٹھا دیا گیا اور ہمارے ہاتھ میں قلم کی بجائے رفوگری کی سوئی تھما دی گئی۔ اس دوران مجھے پنساری کی دوکان پر بھی بٹھا دیا گیا۔ جہاں میں سودا سلف بیچتا تھا۔ اُن دنوں کا ایک واقعہ میرے صفحۂ ذہن پر تازہ ہے۔ میں دوکان میں اپنی نشست پر بیٹھا قرآن شریف کی ایک سورۃ لحن کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ میں اپنی دُھن میں محو اور مست تھا۔ لیکن جب تلاوت ختم کرنے کے بعد اپنی نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ گاندربل علاقہ کے کچھ گوجر جو اس طرف سے گزر رہے تھے میری میٹھی آواز میں کلام اللہ سُن کر رُک گئے تھے اور اس کی تاثیر سے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ بعد میں اُنہوں نے مجھے دُعائیں دیں اور اپنا راستہ لیا۔ کچھ مُدت یوں ہی گزر گئی۔ لیکن پھر ہمارے کُنبے کے دانشمند اور جہاں دیدہ نائی نے، جس کا نام محمد رمضان تھا، غلام نبی کے والد اور میرے چچا شیخ عبدالکبیر کو جو خود بھی پڑھے لکھے



سرپلّی رادھا کرشنن کے ساتھ۔

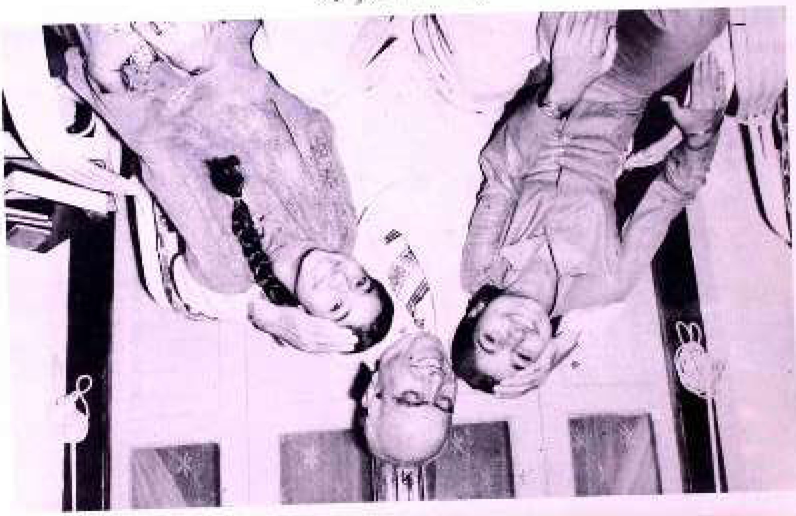


جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے کے ساتھ۔



شمشیر و سناں اول......

بچے اُن کی پہلی محبت تھے۔





سلامتی کونسل کے صدر کینیڈا کے نمائندے جنرل میکناٹن کے ساتھ

پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ





شیر کشمیر اپنی مشتاق قوم کے ساتھ۔



تھے، ہم دونوں کو مدرسے بھیجنے پر راضی کر لیا۔ چنانچہ میں نے پانچویں جماعت کا امتحان وچار ناگ کے پرائمری سکول سے پاس کر لیا اور گورنمنٹ ہائی سکول دلاور خان باغ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں حاجی محمد اسمٰعیل نامی ایک بڑے نیک خصال اور پارسا بزرگ میرے پہلے فارم ماسٹر تھے۔ میں نے نصاب کے مضامین کے علاوہ سائنس اور ڈرائینگ اختیاری مضامین کے طور پر لے لیے۔ اُدھر میرے دو بڑے بھائی شیخ محمد مقبول اور شیخ غلام محی الدین کاروبار میں ہاتھ بٹانے اور گھر کی آمدنی میں اپنا حصہ ادا کرنے لگے تھے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تعلیم جاری رکھنے میں کوئی اُلجھن نہیں ہوئی۔ مجھے فخر کہ دل میں واقع اپنے سکول تک کوئی دس میل کا فاصلہ آتے جاتے ہوئے روزانہ طے کرنا پڑتا تھا۔ لیکن سکول میں تعلیم پانے کا تصور ہی ایک ایسا انعام تھا کہ اس مشقت کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس بات کا خیال کر کے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی کہ پیدل چلنے کی مشق میں جو وقت صرف ہوتا تھا اُس کی وجہ سے مجھے سکول کے کھیل کود میں حصہ لینے کا موقع نہ ملتا تھا۔ گو میں لڑکپن میں کبڈی اور گلی ڈنڈا قسم کے کچھ کھیل کبھی کبھار کھیلا کرتا تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے لڑکپن کے مصائب و مسائل نے مجھے اس قسم کے شغل اختیار کرنے کی کم ہی مہلت دی۔ بہرکیف۔ دل کے یہ داغ سینے میں چھپائے ہوئے ہی میں نے ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے جو ۱۹۴۸ء تک میرے اقتدار سنبھالنے تک کشمیر میں امتحانات منعقد کرنے کا مجاز ادارہ تھا، میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب میری حکومت نے کشمیر یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی تب کہیں جا کر اس صورت حال کا خاتمہ ہوا۔ میٹرک کے بعد سرینگر کے سری پرتاپ کالج میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ میرا ارادہ میڈیکل تعلیم حاصل کرنے اور ایک ڈاکٹر بننے کا تھا اس لئے

مضامین بھی اسی مناسبت سے چن لئے۔ اب میرے روزانہ پیدل چلنے کی مشق میں دو تین میل اور بڑھ گئے۔ کیونکہ ایس۔ پی کالج اور دور واقع تھا۔ میں صبح تڑکے گھر سے نکلتا اور دن بھر کی اعصابی محنت کے بعد منہ اندھیرے گھر لوٹتا۔ یہ بالکل کشمیری محاورے کی صورت تھی یعنی اذان کے وقت روانہ ہونا اور چراغ جلنے کے وقت واپس آنا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا یعنی کہ کچھ ہی دیر بعد اس مشقت سے میرے دل پر بوجھ پڑنے لگا اور مجھے دل بڑھنے کا عارضہ لگ گیا۔ یہ میری دوسری شدید بیماری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے بچپن کی سب سے پہلی یاد بیماری سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ جب میری عمر تین چار سال ہی کی تھی تو مجھ پر چیچک کا حملہ ہوا تھا۔ اُن دنوں اس کے ٹیکے کا چلن بھی نہ تھا۔ ہزاروں بچے اس بلائے بے درمان کے بھینٹ چڑھ جاتے تھے لیکن میں کسی طرح سے بچ ہی نکلا۔ کیوں اور کیسے۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ بہرکیف دل بڑھنے کی شکایت پر مجھے ڈرگجن، سرینگر کے مشن ہسپتال میں ایک عام بیمار کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا۔ اُن دنوں وہاں میرے ایک بھتیجے غلام حسن بھی زیر علاج تھے۔ جن کی ٹانگ میں درد تھا۔ ڈاکٹر ارنسٹ ایف نیو اور اُن کے برادر اس ہسپتال کو چلا رہے تھے اور اُن کے طبی کمال اور انسان دوستی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ہسپتال تخت سلیمان کی پہاڑی جس پر ڈوگرہ حکمرانوں نے شنکر آچاریؒ[1] کا نام چپکا دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی

---

[1] پُرانی فارسی اور سنسکرت تاریخوں میں شنکر اچاریہ کا نام کہیں پر نہیں آیا ہے۔ اس پہاڑی کو کلہن پنڈت (۴۲۹ء) گوپادری کے نام سے "راج ترنگنی" میں درج کرتا ہے۔ فارسی تاریخوں میں اس کے لئے تخت سلیمان کا نام استعمال کیا گیا ہے۔ ڈوگرہ مہاراجا گلاب سنگھ (۱۸۵۷ء – ۱۸۰۲ء) نے کشمیری ناموں کو بگاڑنے کا جو سلسلہ شروع کیا اُس کے تحت اس پہاڑی کا نام شنکر اچاریہ اور اسلام آباد کا اننت ناگ رکھ دیا گیا۔

پر واقع ہے اور یہاں شہر کا بڑا خوبصورت منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اِس ہسپتال کو ۱۹۴۸ء میں، جب میں نے حکومت کی عنان سنبھالی، سرکار کی نگرانی میں لیا گیا اور اب یہ امراضِ سینہ کے علاج کے لئے مخصوص ہے۔ کچھ دیر ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد میری تندرستی بحال ہوگئی۔ لیکن اِس تلخ تجربے کی روشنی میں میرے بڑے بھائی شیخ محمد مقبول نے مجھے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ وہ بورڈنگ کا خرچ اور کالج کی فیس اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں ایک آئرش باشندے مسٹر میکڈرمٹ ایس۔ پی کالج کے پرنسپل تھے۔ سُندر داس فزکس کے پروفیسر تھے۔ اِن کے بیٹے جنرل ملہوترا حال ہی میں ملک کی مُسلح افواج کے کمانڈر انچیف رہ چکے ہیں۔ سردار بہادر سنگھ علم نباتات BOTANY کے۔ مسٹر داس انگریزی کے۔ مولوی ابراہیم عربی کے۔ عثمانی صاحب فارسی کے پروفیسر تھے۔ برج کِشن مدن بڑی آن بان والے اُستاد تھے جن کا کھیلوں رُمباحثوں میں خوب جی لگتا تھا۔ ہمارے بورڈنگ کے سُپرنٹنڈنٹ ایک سندھی اُستاد دستگیر ملّانی تھے۔ دو سال تک زیرِ تعلیم رہنے کے بعد میں نے ۱۹۲۴ء میں کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ بچپن کے دن عام طور پر لڑکوں کے لئے بے فکری اور خوش وقتی کے ہوتے ہیں لیکن کچھ تو اُس وقت کے کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات اور کچھ میرے خانوادے کے خاص معاملات کے سبب میرا لڑکپن خاصا سخت رہا۔ میں بھی عام طور پر تضیعِ اوقات کے بجائے محنت و مُطالعے کا عادی تھا۔ اور اپنے سبق سے لو لگاتا تھا۔ اُن دنوں کی ایک یاد میرے حافظے پر نقش ہے، ایک دن میرا ایک بڑا بھائی پٹواری سے ہمارے کنبے کی زمینوں کا خسرہ لے آیا۔ میں اب پڑھ لکھ سکتا تھا۔ میں نے یونہی ایک نظر گوشوارے پر

ڈالی۔ جہاں میرے بھائیوں کے نام درج تھے۔ میرے نام کا کوئی اندراج نہ تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اپنے بھائی کی توجہ اس طرف دلائی۔ میری حیرت کی اُس وقت انتہا نہ رہی جب بھائی صاحب آگ بگولہ ہوگئے اور اُنہوں نے زور سے ایک تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا۔ اُس تھپڑ کی چنگاریاں میرے حافظے میں ابھی تک بھڑک رہی ہیں۔ پھر میں نے کبھی اِس موضوع کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ پٹواری کے کاغذات میں وہ صُورت اب بھی جوں کی توں ہوگی۔

میری ایک اوّلین یاد میری والدہ کی عبادت گُزاری سے مُتعلق ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن پھر بھی نماز اور روزے کی بڑی پابند تھیں۔ میں اُن کو خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتے اور دُعا مانگتے دیکھتا تو میرے دل میں اُن کی پیروی کرنے کا شوق لہریں مارنے لگتا۔ وہ نماز ادا کرتے وقت کتنی معصوم اور کتنی پاک باز لگتیں۔ رات کو نماز کے بعد کبھی کبھی مجھے بادشاہوں اور پریوں کے قصّے سُنایا کرتیں اور میرا چھوٹا سا ذہن نہ معلوم کن کن دنیاؤں کی سیر کرتا اور مزے اُٹھاتا تھا۔

▲▲▲

۲

ابتدائی آزمائشیں

ایف ۔ ایس ۔ سی پاس کرنے کے بعد میں اپنی جگہ مطمئن بیٹھا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں چونکہ یہ مضامین بہت کم لڑکے اختیار کرتے ہیں اس لئے حکومت مجھے ڈاکٹری کی تربیت حاصل کرنے کے لئے نامزد کرے گی لیکن بہت جلد میری یہ خوش فہمی حقائق کے ایک ہی طمانچے سے کافور ہو کر رہ گئی ۔ میں نے نامزدگی حاصل کرنے کے لئے حسب ضابطہ درخواست دی لیکن میرا نام بائیس اُمیدواروں کی اُس فہرست میں شامل کرنے کے لائق نہیں سمجھا گیا جو مہاراجا ہری سنگھ کے پاس منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی ۔ مہاراجا ہری سنگھ نئے نئے گدی نشین ہوئے تھے ۔ اس لئے وہ اپنے نام نہاد مذہب "انصاف" کی تشہیر کرنے میں بڑے چاق و چوبند تھے ۔ اُنہوں نے اس فہرست کو اس لئے شرف منظوری عطا نہیں کیا کیونکہ اس میں دکھاوے کے لئے بھی ایک مسلمان کا نام موجود نہ تھا ۔ جب یہ فہرست واپس آ گئی تو میں نے پھر قسمت آزمائی شروع کی ۔ نہ معلوم میری گردن کی رگوں میں بچپن سے ہی کیا ایسی خاصیت ہے کہ مجھے آسانی سے گردن جھکانے کا فن نہیں آتا ۔ قدرت نے چاپلوسی اور خوشامد کے کارگر ہتھیاروں سے بھی مجھے لیس نہیں

کیا ہے ۔ اُن دنوں بھی جب کسی حاکم کی دہلیز پر ماتھا ٹیکنے کو خوش تمیزی کی علامت سمجھا جاتا تھا ۔ جب کسی حاکم کے پاس جانے کا مجھے اتفاق ہوتا تھا تو میں نہ تو اُس کے آگے ہاتھ جوڑتا اور نہ گڑگڑا کر بات کرتا ۔ اُلٹا اپنے حق کی تان چھیڑ دیتا ۔ جو اُن دنوں کھلی بدتمیزی اور سرکشی کے برابر سمجھا جاتا تھا ۔ اس طور طریقے کا مجھے یوں خمیازہ اُٹھانا پڑا کہ کوئی افسر مجھے منہ نہ لگاتا ۔ اس بات کی بھنک میرے بھائی صاحبان کے کانوں میں بھی پڑ گئی ۔ وہ بیچارے میرا بھلا چاہتے تھے ۔ اس لئے میری اس روش سے اُنہیں پریشانی ہونے لگی ۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مقبول صاحب نے ، جو دُنیا کے چلن سے واقف ہو گئے تھے ، مجھے ایک مرتبہ ڈانٹ بھی پلائی کہ یہ "حق حق" کی رٹ لگاتے رہے تو عمر بھر جھک مارتے رہو گے اور آگے بڑھنے کا موقع کبھی نہ ملے گا ...... ہونہار اور ہوشیار لڑکے افسروں وغیرہ کی اکڑ تحفے تحائف پیش کر کے نرم کرتے ہیں ۔ تم اپنے گھر سے شال دوشالے لے کر افسروں کو رام کر لو ۔ پھر دیکھو تمہارا کام کس طرح ہو جاتا ہے ۔ میرے بھائی صاحب میرے محسن بھی تھے ۔ اور میں اُن کی بڑی تعظیم کرتا تھا ۔ مگر نہ معلوم کس طاقت نے مجھ سے کہلوا لیا کہ چاہے میرا کام بنے یا نہ بنے ، مجھ سے نہ کسی کی جھوٹی خوشامد ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی مٹھی گرم کرنے کا گر مجھے آتا ہے ۔ بھائی صاحب میری اس دُنیا ناشناسی پر مایوس ہوئے اور اُنہوں نے معاملے کو وہیں پر چھوڑ دیا ۔ اس کے بعد نتیجہ معلوم تھا ۔ فہرست مہاراجا کے پاس واپس بھیج دی گئی ۔ اس میں وزنِ شعر کے لئے ایک مسلمان اُمیدوار غلام محسن کا نام شامل کیا گیا ۔ بیچارے نے نہ معلوم کیا کیا پاپڑ بیل کر اس فہرست میں جگہ پائی تھی ۔ میں اور میرے ایک اور ہم جماعت ڈاکٹر شفیع محی الدین ، جو اب لندن میں سکونت پذیر ہیں ، رہ گئے ۔ اس فہرست میں ڈاکٹر

گوانشی لال کا نام بھی بھیجا گیا تھا۔ جو بعد میں کشمیر کے ایک ممتاز معالج بن کر مشہور ہوئے۔ مفتی محی الدین کے والد مفتی صدر الدین پنجاب میں رہتے تھے اُن کا وہاں اثر و رسوخ تھا۔ پنجاب گورنمنٹ نے مفتی محی الدین کو میڈیکل کالج میں داخلہ دے دیا۔ کشمیر گورنمنٹ نے محی الدین پر اعتراض کیا کہ چونکہ وہ دُبلا پتلا اور لاغر ہے اس لئے تربیت حاصل کرنے کے نااہل ہے۔ پنجاب میں سر فضل حسین کا زمانہ تھا۔ وہاں محی الدین کو داخلہ مل گیا۔ اور جب سند لے کر آیا تو کشمیر میں ہیلتھ آفیسر بن گیا۔ بعد میں کشمیر گورنمنٹ کے مسلم کش رویے سے تنگ آکر لندن چلا گیا اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔

ادھر مجھے اپنی زندگی کا پہلا عظیم صدمہ اُٹھانا پڑا۔ میری والدہ ہم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چل بسیں۔ والدہ کی شفقت کے طفیل ہی میری اور میرے بھائیوں کی پرورش ہوئی تھی اور اُنہوں نے ہمیں یہ احساس تک نہ ہونے دیا تھا کہ ہمارے والد دُنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اُن کی دانشمندی کے صدقے والد مرحوم کے بعد ہمارے کنبے کا اتحاد قائم رہ سکا تھا اور ہماری لاج رہ گئی تھی۔ اور اُن کی دور اندیشی کے طفیل ہی میری تعلیم و تربیت کا سلسلہ آگے بڑھا تھا۔ وہ دن میرے اور میرے بھائیوں کے لئے بڑی آزمائش اور جدوجہد کے دن تھے۔ ہم عام طور پر گھر سے باہر ہی رہا کرتے۔ مقبول صاحب ملازمت کے سلسلے میں شہر میں رہتے۔ محی الدین صاحب تجارت کے سلسلے میں امرتسر وغیرہ میں ہوتے اور میں گھر سے دُور شہر کے بورڈنگ ہاؤس میں۔ ۹ ذی الحجہ یعنی بقر عید کے عرفے کا دن تھا۔ گھر میں عید الاضحیٰ منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس لئے سبھی لوگ وہیں پر موجود تھے۔ والدہ کو یوں تو کوئی خاص تکلیف نہیں رہی تھی۔ وہ اچانک باتیں کرتے کرتے چکرا گئیں اور گر پڑیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے

اُن کی پاک رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ وہ دماغ کی نس پھٹ جانے سے انتقال کر گئیں تھیں۔ دُوسرے روز ساری دُنیا عید کی مسرتوں سے سرشار تھی۔ لیکن ہم اپنی سب سے پیاری متاع کے لُٹ جانے پر آنسو بہا رہے تھے۔ میں تو خاص طور پر بہت بے حال ہو کر رہ گیا۔ ہفتوں تک والدہ کے ہی خیال میں گم سم بیٹھا رہا۔ یوں تو صبر و شکر کر کے خاموش تھا لیکن آنکھیں نہ جانے کیسے ساون کی گھٹاؤں کی طرح جھڑی برسانے لگتیں۔ مجھے بار بار علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آتے تھے ۔

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دُعائے نیم شب میں میں کسے یاد آؤں گا

والدہ نے اپنے آخری برسوں میں بڑی مشکلوں کا سامنا کیا لیکن اُن کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا۔ میں اُن کی آخری اولاد تھا۔ اس لئے قاعدے کے مطابق اُنہیں مجھ سے خاص اُنس تھا۔ زندگی میں میں نے بعد میں بڑی اُونچ نیچ دیکھی۔ لیکن وہ صبح کی شبنم کی طرح پاکیزہ اور راحت فزا شفقت پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شاید دُنیا میں ماں کی ممتا سے بڑی نعمتِ خداوندی کا تصوّر کیا بھی نہیں جا سکتا۔

اس صدمے کے بعد دُنیا کے کاروبار نے پھر اپنی طرف متوجہ کیا۔ ڈاکٹر بننے کی ہوس پُوری تو نہ ہو سکی۔ اس لئے میں پھر آگے پڑھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ کشمیر میں بی۔ ایس۔ سی کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ لیکن جموں کے پرنس آف ویلز کالج میں یہ نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ میں جموں گیا اور کالج میں داخلہ لینے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ

کی۔ کالج کے پرنسپل ایک مسٹر شوری ہوا کرتے تھے۔ جب میں نے داخلہ لینے کے سلسلے میں ان سے ملاقات کی تو وہ بڑی بے رُخی سے پیش آئے۔ اور سخت سُست الفاظ کہہ کر مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ جموں میں ان دنوں انجمنِ اسلامیہ نام کی ایک جماعت کام کر رہی تھی۔ میں بے چارگی کے عالم میں صدرِ انجمن جنرل سمندر خان کے پاس گیا اور اُن کے سامنے سارا ماجرا بیان کیا۔ جنرل صاحب نے اپنے چند ساتھیوں سمیت میرے ساتھ پرنسپل کے پاس چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن عین وقت پر میرے مزاج کی عجیب اُفتاد نے کام بگاڑ دیا۔ میں شوری صاحب کے سامنے گڑگڑا نہیں سکا اور میرے مُنہ سے "حق" کا لفظ سُن کر انہوں نے میرا مُقدمہ اپیل اور دلیل کے بغیر خارج کر دیا۔ پرنسپل کے دفتر سے بے نیل و مرام نکلے تو جنرل سمندر خان نے میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا کہ "بھئی تمہارا کام نہ ہونے کا مجھے بہت افسوس ہے، مگر تمہارا حوصلہ قابلِ داد ہے۔ بد قسمتی سے کشمیری مُسلمانوں کا داخلہ فوج میں ممنوع ہے ورنہ تمہاری جرأت تو ایسی ہے کہ تم فوجی ملازمت میں نام پیدا کر لیتے۔ اگر تم شوری کی ذرا سی خوشامد کر لیتے تو تمہارا کام ہو جاتا لیکن تم اپنے حق اور مُسلمانوں کی مظلومی کی بات کر کے اُس کی دُکھتی رگ چھیڑتے رہے۔"

جموں سے خالی ہاتھ لوٹنے کے بعد مجھے اپنا تعلیمی شوق پورا کرنے کے لئے ریاست سے باہر جانے کے لئے رختِ سفر باندھنا پڑا۔ میں نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ اُن دنوں عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل تھے۔ بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لینے کی کوشش مجھے مہاراجہ کے وزیروں کی کونسل کے سینیئر ممبر ٹھاکر جنک سنگھ کے وعدے کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں بی۔ ایس۔ سی کر لوں تو وہ وعدہ کرتے ہیں کہ مجھے ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرکاری خرچے پر باہر بھجوا دیں گے۔ لیکن یہ بھی ایک وعدۂ معشوق ہی ثابت ہوا کیونکہ جب بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے پھر حکومت کے دروازے کھٹکھٹائے تو انہیں کسی کنجوس کی تجوری کی طرح بند ہی پایا۔ کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ یہ سفر اب تقریباً بے مقصد دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا ارادہ اکٹھے سائنس اور قانون کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ لیکن یونیورسٹی حکام نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں نے ایم۔ ایس۔ سی کے لئے کیمسٹری کو چُن لیا۔ اُن دنوں حکومت کی طرف سے ان مضامین میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے لئے کچھ وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ جو تقریباً ابدی طور پر غیر مُسلموں کو ہی ملتے تھے۔ میں نے اس وظیفے کے لئے درخواست کی۔ اُن دنوں آغا سید حسین رضوی ریاست کے وزیرِ تعلیم تھے۔ جب اُن کے پاس درخواست پہنچی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس طلب کر لیا۔ اور بڑی لجاجت کے ساتھ اپنی بے بسی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ تو مسلمانوں کی نمائندگی کے نام پر یہاں مامور ہیں۔ آپ کو اُن کے حقوق کی پاسبانی کرنی چاہیے۔ انہوں نے منہ بنا کر جواب دیا کہ "میری مثال تو ایک گراموفون مشین کی سی ہے اس پر جو ریکارڈ لگے گا وہی بجے گا۔ میری اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔" اُن کے اس استدلال پر میں بھڑک اٹھا اور میں نے جواب دیا کہ "اس صورت میں تو آپ کو یہ کرسی چھوڑ دینی چاہیے۔ کوئی گنگا رام یا جمنا داس آپ کی جگہ آئے گا تو میں اس سے نپٹ لوں گا۔" بیچارے آغا صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ لیکن نہ ہی کرسی چھوڑ سکے اور نہ میری کچھ مدد کر سکے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سید

احمد خاں کے لائق پوتے سراس مسعود تھے۔ اور ان کی شخصیت کی چھاپ ہر جگہ نظر آتی تھی۔ علی گڑھ اُس وقت مسلمانوں کے ذہنی تلاطم کا اعصابی مرکز بن گیا تھا۔ پروفیسر ایم۔ ایم شریف قائمقام وائس چانسلر تھے۔ اور ڈاکٹر ہنیز شعبۂ کیمیا کے صدر۔

یہ ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے پُرجوش اُبھار کے بعد اس کی ناکامی کا وقت تھا۔ اور اس لئے ہندوستانی مسلمان مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ لیکن ملک کی آزادی کے لئے ایک نئی بیداری کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ میرے لئے بھی اس تناؤ سے بھری ہوئی اور جذبات انگیز فضا سے لاتعلق رہنا ممکن نہ تھا۔ میں ملک کے حالات سے کبھی کبھی جوش میں آجاتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے باطنی تلاطم پر ضبط کا باندھ باندھے رکھا اور ایم۔ ایس۔ سی، کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ میرے ہم جماعت حکیم غلام مرتضیٰ مرحوم نے بھی میرے ہی ساتھ امتحان پاس کر لیا۔ ہم ۱۲ اپریل ۱۹۳۰ء کو علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشمیر جا پہونچے۔ میں پہلا کشمیری مسلمان تھا جس نے سائنس میں ایم۔ ایس۔ سی، کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ میں نے وطن آکر اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے ولایت جانے کے لئے درخواستیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن حکومت نے ولایت جانے کے لئے چوبیس سال کی زیادہ سے زیادہ عمر کی جو حد مقرر کی تھی ہم اُس کو پھاند چکے تھے۔ اس لئے ہماری درخواستیں سرسری سماعت کے بعد ہی ٹھکانے لگا دی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چوبیس سال کی یہ حد کمال چالاکی سے مقرر کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے محروم رکھنا تھا۔ وہ بچارے یا تو تعلیمی اداروں کا رُخ ہی اختیار نہ کرتے تھے، اگر جاتے بھی تو عمر کی اُس حد کو کبھی پا نہ سکتے اور اس طرح حکومت اُن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنے

پسندیدہ اُمیدواروں کی جھولیاں بھر دیتی۔ میں اب اپنی مسلسل ناکامیوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس نظام سے کسی انصاف کی اُمید رکھنا پتھر سے دودھ مانگنے کے برابر ہے۔ رفتہ رفتہ میں اپنی انفرادی ناکامی کو ایک قوم کی اجتماعی ٹریجڈی سے جوڑنے لگا۔ اُس دام کے ہلکے ہلکے خدوخال میرے ذہن پر آشکارا ہو رہے تھے۔ جو بڑی عیاری سے ہم رنگِ زمین بنا کر بچھا دیا گیا تھا۔ تاکہ ہماری قوم اس کے پھندے میں گرفتار بھی ہو لیکن فریاد اور دادرسی کے لئے پھڑپھڑانے کی فُرصت بھی حاصل نہ کر سکے۔

یہ بات ۱۹۳۰ء کے پُرآشوب سال کی ہے۔ مجھے اُس وقت کیا معلوم تھا کہ میں ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوں۔ ایک قوم کی صدیوں سے کچلی ہوئی اُمنگیں اپنے اظہار کے لئے پر تول کر اندر ہی اندر مچل رہی تھیں۔ اور قُدرت اس آتش فشاں کا دہانہ کھولنے کے لئے میرے دل میں ایک مقدس الاؤ بھڑکا رہی تھی۔ بہت جلد وادیٔ گل و لالہ میں اس آگ کے شُعلے روشن ہونے والے تھے۔

▲▲▲

۳

طوفانِ حوادث

میں نے پچھلے دو ابواب میں مدرسے کی رسمی تعلیم کا ذکر کیا ہے لیکن میرا شعور اندر ہی اندر ایک دُوسرے مکتب سے اپنا اصل درس لے رہا تھا۔ اور میرے ذہن کا خمیر گوندھ رہا تھا۔ یہ مکتب میرے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع مگر شدائد سے پُر زندگی کا تھا۔ غالب نے شاید اسی مکتب کے درسِ عبرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ اُستاد نہیں

مشاہدہ ہے کہ صبح پھوٹنے سے پہلے اندھیارے کا احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے ۱۹۴۷ء میں کشمیر کے جیالے فرزندوں کے جوان اور چوڑے چکلے سینوں سے صبح کی شفق کی جولاں دھارا پھوٹ بہی اُس سے قبل ظلمت کی گھنگھور گھٹائیں کس طرح دامِ بلا کی طرح چھائی ہوئی تھیں اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں اس زمانے کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

گھر سے باہر میرا سارا ماحول محنت کشوں اور مزدوروں کا تھا۔ میرے پڑوس میں

پچھم کی طرف شالباف رہتے تھے۔ شمال کی طرف شانہ سازوں اور محنت پیشہ لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ اور مشرق میں تیلی اور رفوگر گذر بسر کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں کے بچوں بالکوں کے ساتھ میں نے اپنا بچپن گذارا۔ یہ مُفلسی، تباہی اور مسکینی کا ماحول تھا۔ میرے گھر کی کچی دیواریں مجھے غم واندوہ کی اُن لہروں سے دُور نہیں رکھ سکتی تھیں۔ جو چاروں طرف موجیں مار رہی تھیں۔ میں یہ لکھ رہا ہوں اور میری یادداشت کے پردے پر ایک دل گداز سانحے کا نقش ایسے تازہ ہوگیا ہے کہ میرے دل کی وہ چوٹ پھر ہری ہوگئی ہے۔ جو کوئی پون صدی قبل لگی تھی۔ ہمارے گھر میں رفوگری کا جو کارخانہ تھا اُس میں پڑوسی تیلیوں کا ایک لڑکا عبدالاحد بھی میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ ایک پُرکشش اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اور اپنی غریبی کے باوجود نفاست پسند اور سلیقہ مند مزاج کا مالک تھا۔ وہ چند دن کارخانے سے غیر حاضر رہا۔ اور یہ بتادیا گیا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ایک دن اچانک اُس کے فوت ہوجانے کی خبر ملی۔ جس کو سُن کر میں سکتے میں آگیا۔ میں نمناک آنکھوں سے اُس کے گھر ماتم پُرسی کے لئے گیا۔ اور وہاں باتوں باتوں میں اُس کے والدین سے اس ناگہانی موت کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے جگر سوز آہیں بھر کر جو ماجرا سُنایا اُس نے میرے سارے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا۔ بات یہ تھی کہ اُن کا گھر ایک ساہوکار کا مقروض تھا۔ جو ہر صبح اُن کے دروازے پر سود بیاج کی رقم وصول کرنے کے لئے آن دھمکتا تھا۔ چونکہ اُن کے پاس ادائیگی کا ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے انہیں سُود خوار کی جلی کٹی سُننا پڑتی۔ میرا ساتھی بڑے حسّاس مزاج کا نوجوان تھا۔ وہ اس روز روز کی بے عزتی سے بچنے کے لئے گھر کے خرچے میں ہر ممکن بچت کرتا رہتا۔ جو تھوڑے بہت چاول یا روکھی سوکھی روٹی ملتی اُس کو بچا کر اپنی دو چھوٹی بہنوں کے پیٹ کی آگ بُجھاتا تھا۔ اور خود اکثر و بیشتر چاول کے چھلکے پر گذر اوقات کرلیتا۔ جو دراصل چوپایوں کی خوراک

ہے۔ نتیجہ معلوم تھا۔ اُس کی صحت برابر بگڑتی گئی۔ وہ بچارا غیرت کے مارے اندر ہی اندر گھلتا رہا۔ اور آخر کار اس کا کام تمام ہوگیا۔ یہ واقعہ سُن کر مجھے جھرجھری سی آگئی اور میں سناٹے میں آگیا۔ میرے ذہن وضمیر نے اس کا بڑا گہرا اثر قبول کرلیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ ایک طرف تو میں ہوں کہ دو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہوں اور دوسری طرف خود میرے ہی گھر کے آنگن میں میرا ہمسایہ ہے۔ جو محنت مزدوری کرنے کے باوجود بھوسہ کھاکر اپنی بھوک مٹانے پر مجبور ہوجاتا ہے حالانکہ اُس کے لڑکے کی محنت کی وجہ سے ہمارے کنبے کی خوشحالی کا چراغ روشن رکھنے کی سبیل پیدا ہوگئی تھی۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ میرے حافظے کی لوح پر محفوظ ہے۔ میں سِن بلوغ کو پہنچ گیا تھا۔ اور میرے بھائی مجھ سے گھر کے چھوٹے بڑے کام کرواتے رہتے تھے۔ جب شال کی تجارت میں مندا پڑگیا تو ہماری بڑی بڑی رقمیں کاریگروں کے پاس واجب الادا رہیں۔ اور ہمیں ان کی وصولی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ گاندربل تحصیل کے ڈب دوگاؤں کے ایک کاریگر کے پاس بھی ہماری کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ عدالت نے ہمیں اس رقم کی وصولی کے لئے ڈگری دیدی گھر والوں نے مجھے بقایا دار کی منقولہ جائداد کی قُرقی کے لئے متعلقہ سرکاری کارندوں کے ساتھ بھیجا۔ اُس بچارے کے گھر میں ہمیں چند پھٹی پُرانی چٹائیوں اور ٹھیکری کے کچھ گھریلو استعمال کے برتنوں کے سوا اور کوئی چیز ہی نہیں ملی۔ میں نے یہ حال دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میرا ضمیر جیسے زبان حال سے مجھے پکارنے لگا کہ ایسے ہی کاریگروں کی ہنرمندی کے طفیل تو تم خوشحال زندگی گذارتے ہو۔ اب اگر شال کے بیوپار میں مندا پڑگیا ہے تو اس بچارے کا قصور کیا ہے؟ ایک بپتا تو اُس پر یہ پڑی کہ اِس غریب کی کمائی کا ذریعہ چھن گیا ہے اور یہ ہمارے سہارے کا کچھ اور محتاج ہوگیا ہے۔

لیکن ہم اُلٹا اس کی رہی سہی پونجی سے اُسے محروم کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا اور کیسا انصاف ہے؟ اُس کے معصوم بچوں اور اہل وعیال کا کیا ہوگا؟ اس احساس سے مجھ پر ایسی جذباتی کیفیت طاری ہوگئی کہ میں نے سارے دعوی نامے اور قُرقی کے کاغذات کاریگر کے سامنے ہی راکھ کرڈالے۔ اور بڑے اُداس من کے ساتھ خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ جب میرے بھائیوں نے وصولی کی رقم مانگی تو میں نے اُن کے سامنے اپنا دل کھول ڈالا۔ وہ مجھ سے ناراض تو ہوئے لیکن میری باتوں کا کوئی جواب اُن سے نہ بن پڑا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ایک اور دن کا ذکر ہے کہ میں صبح سویرے اپنے محلے کے بازار کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چُنگی وصول کرنے والا سرکاری کارندہ ایک دیہاتی کو بڑی بے دردی سے پیٹ رہا ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اور یہ کم نصیب دیہاتی جنگل سے ایندھن اکٹھا کرکے ان لکڑیوں کو ٹٹوؤں پر لاد کر شہر میں بیچنے کے لئے جا رہا تھا۔ کسٹم کی چوکی پر مُقررہ چونگی ادا کرنے کے بعد جب وہ چلنے لگا تو چُنگی کے کارندے نے اُس کے بوجھ کی سب سے موٹی لکڑی کا تقاضا کیا۔ ٹٹوبان جانتا تھا کہ یہ لکڑی گئی تو اُس کے مال کا آدھا مول اُترجائے گا۔ اس لئے وہ ہچکچانے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ چونگی کے کارندے نے اُس پر دوہتڑ برسانا شروع کردیئے۔ اور غریب دیہاتی پٹائی سے تڑپ کر چیخنے چلانے لگا۔ میں موقع پر پہونچ کر بیچ بچاؤ کرنے لگا اور میں نے اس مارکٹائی کا سبب جاننا چاہا۔ بے چارا لکڑہارا رو رو کر کہنے لگا کہ اُس نے چُنگی ادا کرنے کے علاوہ کئی لکڑیاں کارندے کو مُفت دی تھیں لیکن کارندے کا پیٹ پھر بھی نہ بھرا اور وہ موٹی موٹی لکڑیاں ہتھیانے لگا۔ لکڑہارے نے کہا کہ اگر یہ لکڑیاں چلی گئیں تو اُس کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اس کھُلی ہوئی زبردستی

کو دیکھ کر میری جوان رگوں میں خون کھولنے لگا۔ میں چُنگی کے اہلکار سے کہنے لگا کہ اُس کو چُنگی کے پیسوں کے علاوہ کوئی اور چیز طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اہلکار نے میرے بگڑتے تیور دیکھ کر لکڑہارے کو تو چھوڑ دیا لیکن مجھے دھمکی دی کہ وہ مجھے اس مداخلت کا مزہ اعلیٰ افسروں کے پاس شکایت کر کے چکھوائے گا۔ اور ہوا یُوں کہ چند دنوں کے بعد میری پیشی کسٹم کے ڈپٹی انسپکٹر کے سامنے ہوئی۔ جب میں نے اُس کے سامنے تمام واقعات رکھے تو شاید وہ میرے لہجے کی درد مندی اور خلوص سے مُتاثر ہو گیا اور ہلکی سی سرزنش کرنے کے بعد اُس سے میری جان چھوٹی۔

کشمیر کی وادی میں غذائی صورتحال بس اتّفاق پر مُنحصر رہتی ہے اور موسم کے ماتھے پر ہلکی سی تیوری کیا پڑی کہ کشمیر میں بھیانک قحط رونما ہو گئے۔ چنانچہ ہماری ساری تاریخ اِس قسم کے خوفناک قحطوں سے بھری پڑی ہے۔ جن میں گھروں کے گھر اُجڑ گئے اور خاندانوں کے خاندان اُکھڑ گئے۔ اِس نازک صورت کے پیشِ نظر حکومت پہلے سے ہی سرینگر شہر کے باشندوں کے لئے اناج کی فراہمی کا بندوبست کرتی آئی ہے۔ میرے بچپن میں حکومت نے کسانوں سے زمین کے مالیہ کا بیشتر حصّہ جنس کی صورت میں وصول کرنا شروع کیا جس کو مُجوزہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ دیہات میں غلّہ وصول کر کے اِس کو کشتیوں وغیرہ کے ذریعے سرینگر پہونچایا جاتا تھا۔ جہاں اِس کا ذخیرہ کرنے کے لئے بڑے بڑے گودام تعمیر کئے گئے۔ اِس طرح سے فوڈ کنٹرول کے سلسلے کی داغ بیل پڑی۔ میونسپلٹی کی حدود میں رہنے والے لوگوں کو ہر ماہ چندی پر اناج دیا جاتا تھا۔ ہمارا محلہ میونسپلٹی کی حدوں سے باہر تھا اِس لئے ہمیں راشن لینے کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔ محلّے والوں نے چندیاں حاصل کرنے کے لئے محلّے کے حاکموں کے پاس دُہائی دی۔ جس کے نتیجے میں محلّے کا ایک افسر پرسش

احوال کے لئے موقع پر آیا۔ اُس کو اپنی بپتا سُنانے کے لئے محلّے کے کچھ لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرے برادرِ اکبر شیخ محمّد خلیل بھی موقع پر موجود تھے۔ محلّے والے اُن کی کافی عزّت اور تعظیم کرتے تھے۔ افسر مذکورہ نے سب سے پہلے پوچھا کہ "افسر محلّہ" کون ہے؟ لوگوں نے یک زبان ہو کر میرے برادرِ اکبر کی طرف اِشارہ کیا۔ محلّے کے افسر نے یہ سُنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور کسی اِشتعال کے بغیر ایک زور کا چانٹا بھائی صاحب کے گال پر مارا۔ یہ سب کچھ اس قدر حیران کُن تھا کہ مجمع پر سنّاٹا چھا گیا۔ میں خود یہ ماجرا دیکھ کر چند ثانیوں کے لئے ہکّا بکّا رہ گیا۔ افسر مذکورہ نے کوئی قصور بتائے بغیر محلّے کے سب سے مُعزز شخص کے ساتھ یہ ناروا اور ناشائستہ سلوک کیوں کیا۔ اِس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ دراصل اُن دنوں حاکم لوگ اسی زبان میں اپنی رعایا کی دادرسی کرنے کے عادی تھے۔ اور اِس طرح سے دوسرے لوگوں پر دھونس بھی جما دیتے تھے۔ تاکہ اُنہیں فریاد کرنے کا یارا ہی نہ رہے۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد افسر مذکور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے گھر آ کر میرے بھائی صاحب کی ڈھارس بندھائی۔ لیکن اِس کے گھونسے سے میرے اپنے دل و دماغ کے تار جس شدّت سے جھنجھنا اُٹھے تھے اُس کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اندر ہی اندر کُڑھنے لگا کہ آخر ہم مسلمانوں نے ایسا کیا گناہ کیا ہے کہ ہمارے ساتھ اس قسم کا دل آزار سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ریاست میں سب سے زیادہ آبادی اُن کی، سرکاری خزانے کو بھرنے والے وہ، پھر اُن پر مظالم کی یہ تابڑ توڑ یلغار کیوں اور کب تک؟

سرکاری کارندوں کی بھاری اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ چھوٹی سطح کے ملازمین کی اکثریت کشمیری پنڈت صاحبان کی تھی اور عوام کا براہِ راست واسطہ

ان سے ہی پڑتا تھا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلم اکثریت کے ساتھ اُن کے اِس سلوک کی بنیادی وجہ مذہبی امتیاز اور تعصب تھا۔ یہ اگرچہ ایک ادھوری حقیقت تھی لیکن ماضی کی تاریخ پر نظر ڈال کر اس کو تقویت ملتی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے عجیب سوالات اودھم مچا رہے تھے۔ چنانچہ ایک دن میں نے اپنی والدہ سے سوال کر ڈالا۔ "ہم پر کون حکومت کرتا ہے؟" والدہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا "کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اصل حاکم ہے"۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی کیوں ہوتی ہے؟"

والدہ بھلا اس منطقی بحث کا کیا جواب دیتیں۔ زچ ہو کر انہوں نے میرے گال پر ہلکا سا تھپڑ مارا اور مجھے خاموش کر دیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات آہستہ آہستہ ایک زنجیر کی طرح آپس میں جڑتے جا رہے تھے۔ اور میری زندگی کی ڈگر متعین کر رہے تھے۔ میرے باطن میں غیر محسوس طور پر کھولنے والی بھاپ کا ایک مخزن اکٹھا ہو رہا تھا۔ جو مجھے نئی سمتوں کی طرف دھکیل رہا تھا۔ تقدیر میرے سفر کو کشمیر کے مستقبل کا ہم رکاب بنا رہی تھی۔

قدرت کا پُراسرار ہاتھ کیسے آنے والے حوادث کی نقاب کشائی کرنے والا تھا۔ اُس کا تو کسی کو اندازہ نہ تھا۔ لیکن خیال و خواب کی دُنیا پر انگریزی محاورے کے مطابق رُونما ہونے والے واقعات اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے ایک رات ایک بڑا ہی عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری ایک بھتیجی عروسی کے سبز اور شاندار جوڑے میں ملبوس اپنے مکان کی بالائی منزل کی بارہ دری، جس کو کشمیری زبان میں "کانی" کہتے ہیں، میں ایک مخملی مسند پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کی پیشانی پر ایک قیمتی ہیرا چمک رہا تھا۔ جس کی کرنیں اِس قدر جگمگ جگمگ کر رہی تھیں

کہ نہ صرف ساری بارہ دری بقعۂ نور بنی ہوئی تھی بلکہ روشنی کھڑکیوں سے چھن چھن کر باہر ٹپک رہی تھی۔ اور ہر چیز کو چمکا رہی تھی۔ میری بھتیجی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی کہ میں سیدھا اُس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اُس کی پیشانی سے یہ ہیرا اُتار کر اپنی مٹھی میں لے لیا اور میری مٹھی بھی اس کی چمک دمک سے روشن ہونے لگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ساتھ والے مکان کی طرف چلنے لگا۔ میرا بھتیجا بھی میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اتنے میں مجھے یوں لگا کہ میرے بھائی صاحب ہمارا پیچھا اس غرض سے کر رہے ہیں کہ اس ہیرے کو میرے ہاتھ سے چھین لیں۔ میں تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا دُوسرے مکان میں جا پہنچا۔ اور جلدی جلدی ہیرے کو چٹائی کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن یہ چٹائی بھی اس کی روشنی سے چمکنے لگی۔ میرے بھتیجے نے یہ عالم دیکھ کر مجھ سے یہ ہیرا مانگ لیا۔ میں نے اس ہیرے کو اُٹھا کر اپنے بھتیجے کے حوالے کیا۔ قدرت کی کارسازی ملاحظہ ہو کہ میرے بھتیجے کی ہتھیلی میں پہنچتے ہی روشنی جیسے غائب ہو گئی۔ اور اُس کے ہاتھ میں ایک بے نور کنکر رہ گیا۔ میں حیران ہو گیا اور اپنے بھتیجے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اُس نے اس جوہر کو کیا سے کیا بنا دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ بھتیجے میاں کھسیانے سے ہو گئے اور اُنہوں نے یہ پارۂ سنگ پھر مجھے لوٹا دیا۔ میرے ہاتھ پر پڑنے کی دیر تھی کہ یہ پتھر پھر تاباں ہو گیا۔ میں نے اپنے بھتیجے سے کہا "اب دیکھ لیا نا کہ یہ تاثیر پتھر میں نہیں ہے بلکہ میرے ہاتھ میں ہے"۔ ابھی میں اس جوہر کو تھامے ہی ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اس خواب کی تعبیر یہ سمجھی کہ میں حکومت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں نے اس کی تعبیر ایک سن رسیدہ ہیڈ ماسٹر سے، جو خوابوں کی تعبیر بتانے میں شہرت رکھتا تھا، پوچھی۔ تو اُس نے کہا کہ وظیفہ تو چھوٹی بات ہے تم دنیا میں اس قدر شہرت حاصل کرو گے کہ

دوست دشمن سبھی دنگ رہ جائیں گے۔ میں اس تعبیر پر قہقہہ مار کر ہنس پڑا کیونکہ بظاہر اُس وقت اِس قسم کی خوش فہمی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو اقبالؔ کے اس شعر کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے ؎

رازہے رازہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

▲▲▲

---

(۴)

ساحل سے سمندر کی جانب

اپنی ذات اور خانوادے کے گنوئیں سے مجھے کبھی کبھی جب نظر اُٹھانے کا موقع مِلتا تھا تو مجھے ظالم اور مظلوم کی ایک بے رحم کشمکش نظر آجاتی۔ اچانک میرے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی کہ میں ذات کا حصار توڑ کر اس کشمکش میں کود پڑوں۔ مظلوم کی پاسداری کروں اور اگر اُس کو ظلم سے نجات نہ دلا سکوں تو اسی کشمکش میں جان دے دوں۔

۱۹۲۳ء کے موسمِ بہار کی بات ہے کہ ریشم خانہ کے مزدوروں نے کارخانے کے اندر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ پہلی بار منظم ہوئے اور انہوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے جدوجہد کی۔ وہ حضوری باغ میں جمع ہو گئے۔ حکومت نے رسالہ فوج کو، جو ننگے نیزے لئے ہوئے تھی، اُن پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔ اور اس طرح بہت سے مزدور زخمی ہو گئے۔ شہر میں شاید ہی کوئی محلہ ایسا رہا ہو، جہاں کا کوئی باشندہ اِس زد میں نہ آیا ہو۔ اِس پر شہر میں سخت اِضطراب پھیلا اور مزدوروں نے ایک بھاری جلوس نکالا۔ جس میں اُن کی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ حکومت کی زیادتیوں کی دُہائی دے رہے تھے۔ اور شہر کے مختلف بازاروں سے گذر رہے تھے۔ یہ اس قسم کا پہلا احتجاجی جلوس تھا، جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اِس کی

وجہ سے شہر میں سنسنی پیدا ہوگئی اور میں نے بھی اس کا بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ میرے اندر کوئی قوت جیسے بند توڑ کر باہر آنے کے لئے تڑپ اٹھی۔

ایک اور واقعہ جس کا میرے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑا، انہی دنوں پیش آیا۔ ہند کے برطانوی وائسرائے لارڈ ریڈنگ اپنی بیگم سمیت کشمیر کے دورے پر آنے والے تھے۔ یہ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔ اُن دنوں کشمیری مسلمانوں میں ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف زبردست ناراضگی پیدا ہوگئی تھی۔ اور اُن کو دادرسی کا ایک ہی راستہ نظر آیا۔ کسی طرح مہاراجہ کے انگریز آقاؤں تک فریاد پہنچادی جائے۔ شاید وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ کر مہاراجا کو اصلاحِ احوال کی صلاح دے۔ چنانچہ سرینگر کے چند مسلمان معززین چوری چھپے ملے اور انہوں نے طے کیا کہ جب وائسرائے کی آمد پر اُس کا دریائی جلوس جہلم میں سے گذرے تو کناروں پر جمع لوگ سیاہ جھنڈیاں دکھا کر وائسرائے کی توجہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی طرف دلائیں۔ انہوں نے اپنی شکایات کو انتہائی رازدارانہ طریقے سے ایک یادداشت کی صورت دی۔ حکومت کے شک وشبہ سے بچنے کے لئے اُن کی مشورت قبرستانوں کی تنہائیوں میں ہوئی تھی۔ یادداشت پر خواجہ سعدالدین شال، خواجہ حسن شاہ نقشبندی، میر واعظ کشمیر مولوی احمد اللہ ہمدانی، آغا سید حسین جلالی، مفتی شریف الدین اور دوسرے اصحاب نے دستخط کئے تھے۔ اور اس میں مسلمانانِ کشمیر کی حالتِ زار کا نقشہ اعداد وشمار کی مدد سے کھینچتے ہوئے وائسرائے سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اُن شکایات کی تحقیقات کروا کر اُن کے ازالہ کی تدبیر کریں۔ یادداشت میں کل سترہ نکات درج تھے اور خاص طور پر کسانوں کو زمین کے حقِ ملکیت کی واپسی کا سوال اٹھایا گیا تھا۔ جو حکومت نے چھین لیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں

میں اُن کی جائز نمائندگی کا سوال اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا گیا تھا کہ جہاں وادیٔ کشمیر میں غیر مسلم گزیٹڈ آفیسروں کی تعداد چار سو اکیس ہے جو ساڑھے سولہ لاکھ روپے سے زائد کا مشاہرہ پاتے ہیں، وہاں مسلمانوں گزیٹڈ آفیسروں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں جو ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی سہولیات، بیگار کے خاتمے، مسجدوں اور دیگر مقامات کی واگذاری کے مطالبات بھی درج کیے گئے تھے۔ یہ ساری روئداد صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی۔ وائسرائے کے ساتھ اُن کی میم ایلیس بھی تھیں۔ اُن کا دریائی جلوس جب شاہی شان وشوکت کے ساتھ خانقاہ معلّی کے سامنے سے گذرا تو کنارے پر جمع مسلمانوں نے اچانک سیاہ جھنڈیاں لہرائیں اور "فریاد۔ فریاد، بیداد۔ بیداد" کے نعرے زور زور سے بلند کئے۔ یہ شوروغل مچا تو وائسرائے، اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہاراجا کشمیر اور دیگر عمائدین سلطنت کی توجہ اس طرف کو ہوگئی۔ اور ہجوم نے کسی طرح عرضداشت کا مسودہ، جو منشی سراج الدین، سیت کشمیر ریذیڈنسی کے چند مقامی اہلکاروں کی مدد سے ترتیب اور ٹائپ کیا گیا تھا، وائسرائے تک پہنچا دیا۔ اس کارروائی سے سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ وائسرائے نے اپنی سامراجی روایات کے مطابق عرضداشت مہاراجا کے پاس بھیجدی جس نے اپنے ماتحت تین افسروں کی ایک کمیٹی کے ذریعے، جس میں اُن کے ایک قریبی رشتے دار رائے بہادر جنگ سنگھ بھی شامل تھے، تحقیقات کا ڈھونگ رچا کر اسے داخل دفتر کر دیا۔ لیکن جن مسلمان معززین نے اس پر دستخط کر دیے تھے اُن کا سراغ لگا کر اُن سے نپٹنا شروع کر دیا۔ خواجہ سعدالدین شال کو، جو سرینگر کے ایک رئیس خاندان کے چشم وچراغ تھے، گرفتار کر لیا گیا اور ان کے ریاست میں

داخلے پر پابندی عاید کر کے انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ خواجہ حسن شاہ نقشبندی کے صاحبزادے خواجہ نور شاہ نقشبندی کو، جو تحصیلدار تھے، مُلازمت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ آغا سید حسین جلالی کو ذیلداری کے منصب سے ہٹا دیا گیا اور جلا وطن کر دیا گیا۔ جاگیر بھی ضبط کی گئی۔ میر واعظ کو درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا اور انہیں تنبیہہ کی گئی۔ باقی دستخط کنندگان کو ہلکی سی سرزنش کی گئی۔ کیونکہ انہوں نے معذرت چاہی اور چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اگرچہ یہ واقعہ بجائے خود بے حد اہم تھا لیکن اس سے مُسلمان عوام بے تعلق ہی رہے۔ کیونکہ اس ساری کارروائی کو عوام سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ نہ تو اُن کو اعتماد میں لینے کی کوئی کوشش کی گئی تھی اور نہ ہی اُن کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارا ڈرامہ اوپر ہی اوپر کھیلا گیا اور سماج کے بڑے قلزم میں کوئی لہر پیدا نہ کر سکا۔ لیکن میرے لئے اس واقعہ کی صدائے بازگشت بہت دنوں تک موجود رہی۔

بات یوں ہے کہ جب کچھ ہی عرصے کے بعد میں نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ حاصل کر لیا تو کشمیر کے واقعات کی گونج وہاں بھی پہنچنے لگی تھی۔ خواجہ سعدالدین شال اور خواجہ نور شاہ نقشبندی لاہور میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔ یہ دونوں بزرگ لاہور میں ایک پُرانے معزز کشمیری خاندان کے فرد میاں نظام الدین کے یہاں رہتے تھے۔ میرے لئے یہ گھر سے باہر رہنے کا پہلا موقع تھا۔ اس لئے پہلے پہل گھر اور اپنوں کی یاد بہت ستاتی رہی لیکن جلد ہی میں پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ البتہ کبھی کبھار فرصت ملتی تو میاں نظام الدین کے یہاں شال صاحب اور خواجہ نور شاہ سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے چلا جایا کرتا۔ ایک دن کا ذکر

ہے کہ میاں صاحب کے دیوان خانے میں محفلِ سخن آراستہ تھی۔ باتوں باتوں میں شال صاحب اور نور شاہ صاحب نے اِس بات کا گلہ کرتے ہوئے اپنے رنج کا اظہار کیا کہ کشمیری عوام نے اُن کی جلاوطنی پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیں بالکل بھلا دیا ہے اور ہم ہیں کہ اُن کی خاطر مصائب اُٹھا رہے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ انہی دنوں مہاراجا ہری سنگھ ایک عید پر مُسلمانوں کو کھلونے دے کر بہلانے کے لئے سرینگر کی عیدگاہ چلا گیا تھا اور مُسلمانوں کے تئیں خیرسگالی ظاہر کی تھی۔ خواجہ صاحبان کا شکوہ یہ تھا کہ مُسلمانوں کو اُس وقت مہاراجہ کے پاس فریاد بیداد کرنی چاہیئے تھی اور اُنہیں خاموشی سے رُخصت نہ ہونے دینا چاہیئے تھا۔ میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اپنے مُنہ پھٹ انداز میں اِس خیال سے اِختلاف کیا۔ میں نے کہا یادداشت پیش کرنے والوں نے عوام کو اپنے عندیے اور ارادے سے قطعی طور پر بے خبر رکھا تھا۔ اِس لئے جب آپ لوگوں کو جلا وطن کر دیا گیا تو کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اگر عوام کو اعتماد میں لینے کے لئے میدان پہلے سے ہموار کیا گیا ہوتا تو حکومت کو یہ اِقدام کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ میاں نظام الدین صاحب، میاں امیر الدین اور اُن کے کچھ اور ہم نشین احباب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ میرے بُزرگ خواجہ صاحبان سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ برہم ہونے لگے۔ اور للکار کے لہجے میں مجھ سے کہنے لگے "اب دیکھتے ہیں کہ تم کیا کر دِکھاؤ گے۔" میں نے جواباً عرض کیا "انشاء اللہ وقت آنے پر دکھائیں گے ہم سے کیا ہو سکتا ہے۔" بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن جیسے میرے ذہن و ضمیر میں ایک نئے عزم کی چنگاری سُلگ اُٹھی۔ غریب الوطنی میں اِنسان کے حُبِ وطن کی حِس کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتی ہے۔

بقولِ اقبالؒ

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں

لاہور کے قیام نے مجھے کچھ اور وجوہات پر ٹھوکے دے دے کے بیدار کیا اور ایک روحانی کرب سے آشنا کر دیا۔ میں نے کشمیری مسلمانوں کو بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں اپنے خوبصورت وطن سے پنجاب کے چٹیل اور سنگلاخ میدانوں کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ لوگ اپنی سرزمین سے روزی نہ پاکر اس کی تلاش میں پنجاب کا رُخ کرتے تھے۔ یہ حیرت ناک بات تھی کہ زرخیز شاداب سرزمین اُن کے پیٹ کی آگ بجھانے کے سلسلے میں کسی بانجھ کی کوکھ کی طرح خشک ہو گئی تھی۔ جس سے اُگنے والی گھاس بھی زعفران بن جاتی ہے۔ حالانکہ عرفی جیسے شاعر نے اس کی تعریف میں کہا تھا کہ اگر کوئی جھلسا ہوا پرندہ بھی کشمیر پہنچ جائے تو اُس میں نئی زندگی پیدا ہو گی اور اُس کے بال و پر از سرِ نو اُگ آئیں گے۔ اِن مزدوروں کو بانہال اور مری جیسے برفانی کوہستان پیدل طے کرنا پڑتے تھے اور یہ ہزار دقتیں برداشت کر کے آگے بڑھتے۔ ہر ایک کے ساتھ کھانے پینے کی کچھ اشیا اور مٹی کے چند ٹوٹے پھوٹے برتن ہوتے تھے۔ جہاں شام ہو گئی وہیں ڈیرا جما دیا۔ ننگی زمین اُن کا فرش اور کھلا آسمان سایہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات پہاڑوں کی چوٹیاں عبور کرتے ہوئے وہ برفانی طوفانوں کی نذر ہو جاتے۔ نہ کفن دفن کی نوبت آتی تھی اور نہ جنازے اور فاتحہ کی باری۔ اُن کی بے گور و کفن لاشیں گدھ اور دوسرے آدم خور جانوروں کا لُقمہ بن جاتی تھیں۔ کچھ نصیبوں کے مارے سخت جان پنجاب کے شہروں میں پہنچ جاتے تو وہاں بھی غم و الم کے سائے اُن پر منڈلاتے ہی رہتے۔ دن بھر گلی کوچوں

میں مزدوری کی تلاش میں خاک چھانتے۔ کوئی لکڑہارے کا دھندا کرتا تھا کوئی اپنے شانوں پر بھاری بھرکم بوجھ ڈھوتا تھا۔ کوئی کسی دوکاندار کی خدمت گاری اختیار کرتا۔ تو کوئی چکی پیسنے کا کام کرتا۔ دن بھر خون پسینہ ایک کر کے چند ٹکے کما لیتے تھے جن میں اکثر روکھی سوکھی سے شکم پُری کرنے میں اُٹھ جاتے۔ رات کسی مسجد یا سرائے میں گذارتے اور وہاں بھی اُن کو بے زبان مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا۔ کئی بار میں نے کچھ کشمیری مزدوروں کو روٹی کے لئے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ مجھے شرم سی محسوس ہوئی۔ اور میں نے ایک مزدور سے پوچھا "کیا تم مزدوری نہیں کرتے کہ بھیک کی نوبت آگئی ہے۔" مزدور نے جواب دیا کہ "جی ہاں۔ ہم مزدوری ضرور کرتے ہیں۔ بہت ہوا تو دن میں بارہ سولہ آنے کما لئے۔ لیکن ہم اِس پونجی کو جمع کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر سرکاری مالیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ بال بچوں کے لئے کچھ کپڑے لتے بنانے پڑتے ہیں۔ اور کچھ چائے، نمک ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اگر ہم اِس پیسے کو اپنا پیٹ پالنے پر ہی خرچ کر ڈالیں تو یہ سب اخراجات کہاں سے ادا کریں گے۔" مزدور نے یہ لفظ کچھ اِس بے ساختگی اور سادگی سے کہے کہ میں اس جواب سے تڑپ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کشمیر کے مہاراجا اور اُس کے مصاحبوں کا جاہ و حشم اور ٹھاٹ باٹ ان مزدوروں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کا صدقہ ہے لیکن خود بیچارے یہ جانوروں کی طرح دیارِ غیر میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ میرے دل کے زخم اُس وقت اور بھی شدت سے رِسنے لگے جب میں نے لاہور کے گلی کوچوں میں کشمیری مزدوروں کی لاشیں پڑی ہوئی دیکھیں۔ راہ گیر اُن پر ایک نظر ڈال کر ایسے کنّی کاٹ کر نکل جاتے تھے جیسے یہ انسانوں کے جسم نہ ہوں بلکہ ناسُور کے ڈھیر ہوں۔ ان کے کفن دفن کا انتظام کرنے کی فکر بھی کون کرتا۔ ان لاشوں کی بے گو

کھلی آنکھیں گویا صدائے دو جہاں سے فریاد کرتی اور غالب کا یہ شعر پڑھتی نظر آتیں ؎

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

ان بدنصیبوں کو جیتے جی زندگی کی کوئی راحت تو نصیب نہیں تھی۔ لیکن مرتے ہوئے اپنی مادرِ وطن کے مٹیالے آنچل کی ٹھنڈک سے بھی محروم رہتے۔ چونکہ کوئی دعویدار نہ ہوتا اس لئے انہیں ہسپتالوں میں زیرِ تربیت طلباء کی چیر پھاڑ کا تختۂ مشق بننا پڑتا۔ زندہ کشمیریوں کی حمیّت اور غیرت پر توہین اور ہتک کے تازیانے برسائے جاتے تھے۔ انہیں "ہتو" کے ہتک آمیز عرف سے پکارا جاتا۔ عام مزدور کی بات چھوڑ دیجئے۔ خود مجھے کئی بار اپنے پنجابی دوستوں کے اس حقارت آمیز سلوک کا شکار بننا پڑا۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ اِس نفرت انگیز ذہنیت کی ضرب کتنی کاری ہوتی ہے۔ اور کیسے حمیّت اور غیرت کے سرچشموں میں اُبال پیدا کر دیتی ہے۔ میرے لئے اس قسم کے مناظر ہمیشہ بے حد صبر آزما ہوتے تھے۔ اور یہ میری رگوں میں اس انداز سے خون بلیوں اُچھال دیتے کہ اگر میرا بس چلتا تو میں اسی وقت اس اہانت کا بدلہ چکا دیتا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں اُن دنوں پروفیسر دل محمد کا بڑا شہرہ تھا۔ ڈاکٹر احمد فزکس کے پروفیسر تھے۔ یہ صاحب کچھ عرصہ تک کالج کے قائمقام پرنسپل بھی رہے۔ میں ریواز (REWAZ) ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اُن دنوں وہاں شیخ عبدالقادر ادبی بلکہ سماجی محفلوں پر چھائے ہوئے تھے۔ اور اُن کا رسالہ "مخزن" مرغوبِ عام و خاص تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم۔ لالہ لاجپت رائے۔ سر سکندر حیات خاں۔ سر محمد شفیع۔ وغیرہ کا سیاسی دنیا میں دبدبہ تھا۔ خواتین میں بیگم شاہ نواز کا خوب

چرچا تھا۔ لاہور میں کشمیری برادری کا بھی کا ایک الگ دائرہ تھا۔ لاہور بلکہ پنجاب میں بسنے والے کشمیریوں میں اُن دنوں رواج تھا کہ وہ اپنی برادری میں ہی رشتے ناطے کرتے۔ محمد دین فوق صاحب اپنے کشمیری اخبار میں کبھی کبھی نحیف سی لَے میں کشمیریوں کی مظلومیت کا کوئی اشارہ محتاط سے انداز میں کرتے تھے۔ میاں امیر الدین۔ سید محسن شاہ وغیرہ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور کشمیری گاما پہلوان کے رستمِ زماں ہونے کا ذکر بڑے فخر سے کرتے۔ ہم نے بھی اس عظیم پہلوان کو کئی بار اکھاڑے میں داؤ پیچ کا مظاہرہ اور اپنی شہ زوری کا دھاک بٹھاتے دیکھا۔

لاہور کے قیام میں ہی میں نے سب سے پہلی سینما دیکھی۔ اُن دنوں فلموں میں مکالمے وغیرہ نہ ہوتے تھے اور یہ خاموش فلمیں کہلاتی تھیں۔

لاہور میں اپنے زمانۂ قیام میں، میں نے ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کی شہرت بھی سُنی، اُن کے کلام سے میں پہلے ہی آشنا ہو چکا تھا اور کئی نظمیں تو مجھے ازبر تھیں۔ میں نے لاہور میں کئی کشمیری دوستوں سے سُنا کہ علامہ کشمیر کے معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار سے وہ شدید ذہنی اور روحانی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ میں نے علامہ کو پہلی بار انجمنِ حمایتِ الاسلام کے ایک جلسے میں دیکھا۔ جہاں اُنہوں نے اپنی نظم بڑی اثر آفرین لحن میں سُنائی۔ اُن کے کلام کا مفہوم اور پھر اُن کی آواز کا جادو۔ میرا وجود مومی شمع کی طرح ٹپ ٹپ پگھلنے لگا اور میں تاثیر کی کسی اور ہی دُنیا میں پہونچ گیا۔ اُس وقت مجھے ایک موہوم سا اندازہ ہوا کہ میٹھا لحن کس طرح سوتے ہوئے دلوں کو صورِ اسرافیل کی طرح بیدار کر سکتا ہے۔ اور کس طرح پتھروں کو موم بنا سکتا ہے۔ اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گلے کو بھی خدائے لایزال نے اپنی نعمتِ بے پایاں

کے ایک قطرے سے سرشار کر دیا ہے اور اس کی آواز ایک دن کشمیر کے دشت و جبل میں گونج کر اس کے ماتھے پر جمی ہوئی غلامی اور فلاکت کی برف کو پگھلانے میں کارگر ثابت ہوگی۔ بعد میں کچھ دوستوں کے ساتھ علامہ کے حضور بھی حاضری دینے لگا لیکن ہم سب اُن کی کوہ وقار شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ بہت دنوں تک صرف سُنتے رہے اور اپنی طرف سے مجالِ سخن نہ لا سکے۔ لیکن آہستہ آہستہ خود علامہ کے الفاظ میں ہی ع

کرتے ہیں خطاب آخر، آتے ہیں جواب آخر

ہماری بے تکلفی بڑھنے لگی۔ لیکن اِس کی تفصیل بعد میں۔

لاہور کے قیام میں ہی میں نے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کی بہتے ہوئے آبشار جیسی تقریر کی روانی کو دیکھا۔ اُنہوں نے ہمارے کالج میں تقریر کی اور میں اُن کے اندازِ بیان اور گرمیٔ گفتار پر عش عش کر اُٹھا۔ اُن دنوں لاہور میں مولینا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار کا بڑا شہرہ تھا۔ اُس کی چٹ پٹی سُرخیاں اور جوشیلی مگر سنگلاخ نظمیں بڑی پسند کی جاتی تھیں۔ میں بھی اس کے بے باک اندازِ نگارش کا قائل ہوگیا۔ ہندو اخبارات میں ملاپ اور پرتاپ کا طوطی بولتا تھا اور اُن کی اپنے مسلمان معاصروں سے خوب چشمک رہتی تھی۔ پنجابی سیاست کا سارا رنگ اِن اخبارات میں جھلکتا تھا۔ اور انگریزی میں ٹریبون اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کا سکّہ چلتا تھا۔ اسی دوران میری ملاقات مولینا محمد علی لاہوری سے ہوئی جو آزاد خیال احمدی تھے اور مرزا غلام احمد کو نبی کی بجائے صرف مجدّد مانتے تھے۔ وہ بڑے نستعلیق بزرگ تھے اور مذہبی امور پر اُن کی نظر گہری تھی۔ بعد میں میں نے اُن کی تفسیرِ قرآن مجید بھی دیکھی اور مولینا ابوالکلام کے ترجمان القرآن کے بعد اِس تفسیر سے میں خاصا متاثر ہوا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں قیام کے دوران مجھے مہاتما گاندھی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مہاتما گاندھی وہاں طلباء کی دعوت پر آئے ہوئے تھے۔ اُن دنوں اُنہوں نے ملک میں آزادی کی ایک نئی جوالا سُلگادی تھی اور ہم اُن کو بڑے شوق کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ کوئی شعلۂ بیان مقرر تو نہیں تھے لیکن اُن کی قلندرانہ ادائیں ایسی تھیں کہ دور سے دیکھنے والے کا دل چھین لیتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی شخصیت میں تسخیرِ قلوب کی جو قوّت موجود تھی اُس کا فوراً اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہر مستند مقناطیس کی خاصیت یہی ہوتی ہے۔

قیامِ علی گڑھ کا وہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا جو ہمارے اُستاد ایم ایم شریف[1] کی ذات سے وابستہ ہے۔ اُنہوں نے ایک بار طلباء سے خطاب کیا اور اُس کے دوران انہیں نصیحت کی کہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ ہمت اور حوصلے سے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اُن کی آواز میں ایک رعد کی سی کیفیت تھی۔ یہ بات اُن کی زبان سے نکلی اور میرے دل میں ترازو ہو کر رہ گئی۔ میرے ارادوں میں اس سے ایک نئی تازگی پیدا ہوئی اور میں نے زندگی کے مشکل مرحلوں پر اسے یاد کیا ہے۔

میرے علی گڑھ کے قیام میں وہاں تین وائس چانسلر بدلے۔ جب میں گیا۔ تو ڈاکٹر ضیاالدین تھے لیکن اُن کی تقرری کے سلسلے میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ کچھ دیر کے

---

[1] ایم ایم شریف علی گڑھ میں فلسفے کے اُستاد تھے۔ وہ پرووسٹ بھی رہے اور قائمقام وائس چانسلر بھی۔ پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما میاں افتخارالدین کے والد نسبتی تھے۔ اُنہوں نے اقبال کی جمالیات اور ثقافتِ اسلامیہ پر وسیع کام کیا ہے۔ اُن کا اِنتقال تقسیم کے بعد لاہور میں ہوا۔

لے ایم ایم شریف قائم مقام وائس چانسلر رہے اور جب میں علی گڑھ چھوڑ رہا تھا تو اُس وقت سر راس مسعود اس منصب پر فائز تھے۔ میرا علی گڑھ میں حیدری منزل اور آفتاب ہوسٹل میں قیام رہا۔ میرے ساتھ اور بھی کشمیری طلباء علی گڑھ میں زیرِ قیام تھے۔ جن میں سے مجھے اِس وقت مرتضٰی مرحوم کے علاوہ محمد رجب، غلام الدین، اور غلام احمد مختار کے نام یاد آرہے ہیں۔ یہ بھی تقریباً میرے ہی ساتھ فارغ التحصیل ہوکر آگئے۔

▲▲▲

دائل کی شہ پر وفادارانِ ازلی یعنی آغا سید حسین وزیر تعلیم، جنرل صمد خان، کرنل غلام علی شاہ، مرزا غلام مصطفیٰ وغیرہ ایک جوابی بیان شایع کیا۔ جس میں سرایکبین کی حق گوئی کو جھٹلانے کی تمسخر آمیز کوشش کی گئی۔ اُن کے تردیدی بیان کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ریاستی مسلمان نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی نسبت خوش حال اور فارغ البال ہیں۔ جب میں نے علی گڑھ میں سُنا کہ کچھ زرخرید اور جاہ پرست مسلمان اپنے ضمیر کو گروی رکھ کر یہ بیان دے رہے ہیں تو میں جھلا اٹھا۔ میرا پیمانۂ صبر چھلک گیا اور میں نے ایک خط لاہور کے اخبار "مسلم آؤٹ لک" میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ جس میں میں نے کشمیر دربار کی اس ناپاک حرکت کو طشت ازبام کردیا۔ اُس وقت پنجاب کے ہندو اخبارات سرایکبین کے بیان کا اثر زائل کرنے کے لئے طرح طرح کی حکایتیں تراش رہے تھے۔ میرے بیان نے تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آگیا۔ سیاسی میدان میں کھلے بندوں قدم رکھنے کی یہ میری پہلی کوشش تھی جب میرا یہ خط شایع ہوا تو مجھے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ جیسے میرے گلے میں بند ایک چیخ باہر نکل گئی تھی۔ اس چیخ کا میرے گرد و نواح پر تو واجبی سا ہی اثر پڑا لیکن اِس نے میری نفسیات کی بیڑیاں جیسے توڑ کر رکھ دیں۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ عمل اور آزادی کی وادیوں میں پہونچ گیا۔ میرے حوصلوں میں نئی جوانی اور میرے ولولوں میں نئی جوانی آنے لگی اور میں نے اپنے آپ کو آنیوالی جدوجہد کے لئے پر تولتے ہوئے پایا۔

اُدھر علی گڑھ میں ہماری تعلیم کا زمانہ ختم ہوگیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں حکیم غلام مرتضیٰ، وغیرہ کے ساتھ واپس وطن روانہ ہوگیا۔ اور ۱۲ اپریل ۱۹۳۰ء کو سرینگر

پہونچ گیا۔ لیکن فضا میں ایلیین بنرجی کے نعرۂ حق کی گونج باقی تھی۔ اور کشمیر دربار نے اس کے اثرات کو زائل کرنے اور اس کی آواز کو بھنگ کرنے کے لئے چند وظائف کا اعلان کیا تھا۔ جن کے لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے عرضیاں مانگی گئی تھیں۔ اس وقت جو چند مسلمان مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے، ان میں، میں بھی تھا اور میں نے بھی ایک درخواست داغ دی۔ لیکن نتیجہ معلوم۔

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ کشمیر دربار نے ایک حکم کی رُو سے ملازم بھرتی کرنے کے لئے ایک سِول سروس ریکروٹمنٹ بورڈ قایم کیا۔ ملازمت کے حصول کے لئے ہر امیدوار کو ایک کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ عرضی گزارنے والے کے تعلیمی معیار، اس کے مضامین کی نوعیت اور اس کی عمر کے بارے میں بھی استفسار کئے جاتے تھے۔ حکومت کے ساتھ ہمارا جو سابقہ رہا تھا اس کی وجہ سے ہمیں اس اقدام کی دال میں بھی کچھ کالا نظر آیا۔ ہم نے حکومت کی اس نوازش پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ آج تک حکومت مسلمان ملازموں کی قلت کا یہ جواز پیش کرتی تھی کہ تعلیم یافتہ مسلمان نہیں ملتے۔ لیکن اب تعلیم یافتہ مسلمان خاصی تعداد میں سامنے آرہے ہیں تو حکومت کے پرانے شکاری ان کا راستہ روکنے کے لئے یہ نیا جال لے کر آئے ہیں۔ امتحان لینے والے، پرچے مرتب کرنے والے، اور نتائج ترتیب دینے والے سب کے سب غیر مسلم تھے اور اسی لئے ہمیں کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا۔

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

ہمارے اندیشوں کی وجوہات بڑی واضح تھیں۔ ان امتحانات میں جہاں ہندی

اور سنسکرت کو اختیاری زبانوں کا درجہ دیا گیا تھا وہاں اُردو، فارسی اور عربی کو یکسر ٹکسال باہر کر دیا گیا تھا۔ ساٹھ فیصدی اسامیاں حکومت بورڈ کی طرف رجوع کئے بغیر بھرتی کر سکتی تھی۔ باقی چالیس فیصد اسامیوں کے لئے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ اُمیدوار اپنی اعلیٰ نسبی کی سند پیش کرے۔ اگر کوئی مسلمان ان تمام رکاوٹوں کو پار کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو اُس سے نپٹنے کے لئے حکومت نے ایک اور تلوار اپنے پاس محفوظ رکھی تھی۔ یعنی وہ کسی اُمیدوار کو وجہ بتائے بغیر مسترد کر سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ حکومت نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو، جن کی عمر بہرحال بائیس سال سے زیادہ تھی، رسوم اور ظاہرداریوں کی اوٹ میں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ ہم لوگ اس چال کو بھانپ گئے اور اس کا توڑ کرنے کے لئے میں نے اپنے قبیل کے مسلمان نوجوانوں سے رابطہ قائم کرنا مناسب خیال کیا۔

اس سے کچھ عرصہ قبل ہم نے فتح کدل میں منشی ضیاء الدین صاحب کے مکان پر ایک دارالمطالعہ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ ریڈنگ روم کا تو دراصل بہانہ تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اس کی اوٹ میں ہمیں آپس میں مل بیٹھنے اور تبادلہ خیال کا موقع میسر ہو سکے۔ ان محفلوں میں ہم ملازمت اور شخصی معاملات کے علاوہ ملکی معاملات پر بھی گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور کشمیر کی حالت زار پر بھی آنسو بہاتے تھے۔ ریڈنگ روم میں بہت سے ساتھی آنے لگے تھے۔ ہم نے اس کو منظم بنیادوں پر چلانے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی۔ جس کا صدر محمد رجب کو اور جنرل سیکریٹری راقم الحروف کو چنا گیا۔ کمیٹی کے ممبروں میں حکیم علی، پیرزادہ غلام رسول، پیرزادہ احمد شاہ فاضلی، حکیم غلام مرتضیٰ اور مفتی جلال الدین شامل تھے۔

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ ہم نے کشمیریوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں

کے ابتر حالات کے متعلق دُنیا کو باخبر کرنے کے لئے ابتدائی کوششوں کا آغاز کیا۔ ہم نے لاہور سے چھپنے والے اُردو اخبارات کو مراسلے بھیجے اور اس کے علاوہ لندن سے شایع ہونے والے روشن خیال جریدے "انڈین سٹیٹس" کے مدیر رجنی پام دت سے بھی رابطہ قایم کر لیا۔ اور پہلی بار کشمیر کے حالات کا تاریک پہلو دُنیا کے سامنے آگیا۔ اُن دنوں ایک ممتاز مہمان جو ہمارے ریڈنگ روم میں تشریف لائے، کلکتہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا آزاد سبحانی تھے۔ مولینا حرّیت پسند تھے اور حرّیت نواز بھی۔ اُنھوں نے ہماری مشورت کو سراہا اور ہمیں ایک عوامی تحریک شروع کرنے کی ترغیب دی۔ جب حکومت کے کانوں میں اس رابطے کی بھنک پڑی، تو اُس نے مولانا کی تلاش شروع کردی۔ لیکن اُس وقت وہ ریاست کی حدود سے باہر جا چکے تھے۔ البتہ اُس نے حکومت کو ریڈنگ روم پارٹی کی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھنے پر اکسایا۔

ریڈنگ روم پارٹی کی ایک ایسی ہی نشست میں، میں نے اپنے ساتھی نوجوانوں کی توجہ ملازموں کی بھرتی کے تازہ قواعد کی طرف دلائی اور اس بات پر زور دیا کہ ان کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ باہمی مشورے سے طے پایا کہ ریجنسی کونسل کو، جو مہاراجا ہری سنگھ کی ولایت یاترا کے دوران ریاست کے سیاہ وسفید کی مالک ومختار تھی، ایک یادداشت پیش کی جائے۔ یہ طے پایا کہ یادداشت میں قواعد کی ناانصافیوں اور کوتاہیوں کی وضاحت کرکے ان میں متناسب ترمیم کی استدعا کی جائے۔ یہ فیصلہ ہوا تو دوسرا سوال پیدا ہوا کہ میمورنڈم کا مسودہ کون مناسب الفاظ اور پیرائے میں تیار کرے۔ اُس وقت خواجہ غلام احمد صاحب عشائی کشمیری مسلمانوں میں سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بلا کے ذہین بھی تھے۔ حکومت نے انہیں اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر تعینات کیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ



کے بعد کچھ من گھڑت الزامات کی بنا پر انہیں قلیل پنشن پر نکال باہر کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں بیکاری اور خستہ نوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم اُن کے پاس چلے گئے اور اُنہیں اپنی بپتا سُنائی۔ عثمانی صاحب کی قومی حمیّت کی رگ پھڑکی اور اُنہوں نے یادداشت مُرتّب کرنے کی حامی بھر لی۔ میمورنڈم تیار ہوا تو ہم نے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے اِس پر دستخط لینے کی مہم شروع کر دی۔ بہت سے دوستوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ لیکن کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو ڈر کے مارے دستخط کرنے سے مُنکر ہو گئے۔ اُدھر ہمارا روزانہ کا میل جول اور دوڑ دھوپ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔ چنانچہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا سلسلہ کچھ اور کڑا ہو تا گیا۔ محکمہ جاسوسی کے دو انسپکٹروں حکیم حبیب اللہ اور عبدالکریم کو خصوصیت کے ساتھ یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ لیکن ہمیں جد و جہد کا چٹخارہ لگ چکا تھا۔

بھلا یہ رُکاوٹیں ہمیں کہاں ڈرانے والی تھیں ؂

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

▲▲▲

۶

کڑکے میں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

یادداشت پر دستخط ثبت کروا کے ہم نے اِسے وزارتی کونسل کے صدر مسٹر ویک فیلڈ کی خدمت میں روانہ کیا۔ سچ پوچھیے تو اس بات کی ہمیں کم ہی اُمید تھی کہ کونسل میں اس کی کوئی شنوائی ہوگی۔ لیکن اُس وقت ہم لوگوں کو ایک خوشگوار اچنبھا ہوا۔ جب کونسل کی طرف سے میرے نام ایک خط آیا۔ یک نہ شد دو شد۔ خط میں صرف میمورنڈم وصول ہونے کی اطلاع ہی درج نہ تھی بلکہ ہدایت کی گئی تھی کہ ہم اپنے دو نمائندوں کو کونسل کے سامنے پیش ہونے اور گفتگو کرنے کیلئے بھیج دیں۔ اِس واقعے سے صرف ریڈنگ روم پارٹی ہی میں تہلکہ نہیں مچا بلکہ کشمیری مسلمانوں کے سارے تعلیم یافتہ طبقے میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ معاملے پر غور کرنے کے لئے عثمانی صاحب کے گھر پر بہت سارے تعلیم یافتہ مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ جن میں کچھ سرکاری ملازم بھی تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد مجھے اور میرے ایک اور ساتھی عبدالعزیز فاضلی کو، جو علی گڑھ سے قانون کا امتحان پاس کر کے لوٹے تھے، کونسل کے سامنے پیش ہونے کی ہدایت کی گئی اور ہمیں مناسب ہدایات اور دعاؤں کے ساتھ رُخصت کیا گیا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جب میمورنڈم بھیجنے کی خبر پھیلی تو حکومت کے نمک خواروں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور اُنہوں نے اپنے آپ کو بادشاہ

سے زیادہ وفادار ثابت کرنے کے لیے اس اقدام کی مذمت کی اور حکومت کو تجویز پیش کی کہ ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ یہ مشورہ دینے والوں میں منشی اسد اللہ وکیل، مفتی شریف الدین، مرزا غلام مصطفےٰ اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے جیسے بزرگ شامل تھے۔ جب ہم سیکریٹریٹ پہنچے تو ہمیں ایک بیرونی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کونسل کے ممبران مسٹر ویک فیلڈ (چیرمین)، ٹھاکر کرتار سنگھ (سیکریٹری)، پی کے واتل وزیر خزانہ جنرل جنک سنگھ مشیر مال اندر کے کمرے میں مشورے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر کے بعد وزیر تعلیم آغا سید حسین صاحب کو کونسل کی میٹنگ میں طلب کیا گیا۔ اُن کو ہمارے کمرے سے ہی گذرنا تھا۔ چنانچہ ہم سے اُن کی علیک سلیک بھی ہوئی۔ اندر جا کر کونسل کے ارکان اور اُن کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اُس کا تو ہمیں علم نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب وہ کچھ دیر کے بعد باہر جاتے ہوئے پھر ہمارے درمیان سے گذرے تو اُن کے چہرے پر ہلکی سی "مسکراہٹ" تھی۔ ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے ہمیں حوصلہ دیا کہ ہمیں کسی گھبراہٹ یا خوف کے بغیر اپنی شکایات کونسل کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ جاتے جاتے انہوں نے ہم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تاکہ ہم اُن کو کونسل کے روبرو ہونے والا ماجرا سنا سکیں۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے بلاوا آیا اور ہم ممبران کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم نے مناسب آداب وغیرہ بجا لائے تو ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ اور کونسل کے ارکان نے ہم پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اگرچہ یہ اس قسم کا پہلا موقع تھا لیکن خدائے بزرگ نے ہمیں جس ہمت کے ساتھ اس نفسیاتی دھاوے کا مقابلہ کرنے کی توفیق دی اُس کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی گذاری ہوگی۔

پہلے تو مسٹر ویک فیلڈ اور مسٹر واتل نے ہمیں بتایا کہ مہاراجا کی حکومت کشمیری

مسلمانوں پر کس قدر "مہربان" ہے اور مسلمان اس کی مخالفت کر کے کس طرح "نمک حرامی" کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مسٹر واتل نے حکومت کی دریا دلی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے حال ہی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں دو تین مسلمان ملازموں کو بھرتی کر لیا ہے۔ میں نے سارا حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا کہ واقعات پر نظر ڈالی جائے تو حکومت کے تازہ اقدامات کا منشا اُن مسلمان نوجوانوں کو ملازمتوں سے دور رکھنا ہے، جو حال ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آ گئے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مسلمان کسی بے جا رعایت کے طالب نہیں بلکہ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ بات خود حکومت کے کام کاج اور نیک نامی کے لئے ضروری ہے کہ ان کو مطمئن کیا جائے۔ چونکہ میں اعداد و شمار سے لیس ہو کر گیا تھا اس لئے میرے دلائل کا توڑ آسان نہ تھا۔ مگر کونسل کے ارکان خاص طور سے مسٹر واتل نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی اور گرج کر کہا اس قسم کی سرگرمیوں کا مزا چکھایا جائے گا۔ میں نے بڑے ادب لیکن مضبوط آواز میں جواب دیا کہ حکومت نے اگر اس وقت ہماری آواز کو نظر انداز کر کے ملازمتوں کی بھرتی کے طریقہ کار میں اصلاح نہ کی تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ میرے اس اظہار پر ارکان کونسل کو تاؤ آ گیا اور انہوں نے سلسلۂ کلام توڑ دیا۔ وہ ان الفاظ کو ایک دل جلے نوجوان کی فریاد سمجھے اور اسے پس پشت ڈال دیا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ الفاظ دراصل اُن شعلوں کے بیج ہیں جو جلد ہی کشمیر کی سرزمین کو لاوے کا سمندر بنانے والے تھے۔

کونسل سے فارغ ہونے کے بعد ہم دونوں آغا سید حسین کے ارشاد کے مطابق اُن کے گھر پہنچے اور ساری کیفیت اُن کو سنا دی۔ میں تمتمایا ہوا تو تھا ہی۔ اُن کے گھر میں اُن سے شکوہ کیا کہ اگرچہ کابینہ میں مسلمانوں کے نمائندے تصور کئے جاتے ہیں۔

لیکن آپ اُن کی بھلائی کے لئے کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ آغا صاحب میرے سوال سے تھوڑا سا جھینپ گئے اور اپنی مشکلات کا دفتر کھولنے لگے۔ مگر اُن کے جواب سے کوئی بات نہیں بنی۔ میں نے تقریباً گستاخانہ لہجے میں عرض کی کہ جہاں تک مسلمانوں کے نام پر ذاتی مفادات بٹورنے کا تعلق ہے اُس میں تو آپ کافی ہوشیار ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن قوم کی بگڑتی ہوئی حالت کو آپ بڑی آسانی کے ساتھ فراموش کر رہے ہیں۔ انہوں نے میری باتوں کا تو ضرور بُرا منایا ہوگا لیکن ہمیں اخلاق سے رخصت کر دیا۔ بعد میں ہم نے اپنے ساتھیوں اور ہم خیالوں کو سارا ماجرا سُنایا۔ اُن پر تھوڑی سی مایوسی چھا گئی۔ اور ہم نے معاملے کو فی الحال جوں کا توں رہنے دیا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ خبر سُن کر ہماری کچھ ڈھارس بندھی کہ کونسل کے چیف منسٹر ویک فیلڈ صاحب ہمارے جوابات سے کافی متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے اس تاثر کا اظہار بھی کیا تھا۔ اُنہوں نے یہ تذکرہ اپنے پرسنل اسسٹنٹ خلیفہ عبدالرحیم سے کیا تھا۔ یہ صاحب جمّوں کے باشندے تھے۔ اور اُنہوں نے یہ خبر جمّوں کے چند مُسلم نوجوانوں تک پہونچائی تھی۔ صوبہ جمّوں حکمران خاندان کا وطن تھا۔ یہ حکمران وہاں کے لوگوں کو کشمیریوں سے بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہاں کشمیر جیسی پابندیاں بھی نہیں تھیں۔ اور چند مُسلم نوجوانوں نے انجمن اسلامیہ کی پاسبانی میں وہاں ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن نام کی ایک انجمن بنائی تھی جس کے سرکردہ کارکنوں میں چودھری غلام عباس، مستری یعقوب علی سردار گوہر رحمان، اللہ رکھا ساغر، غلام حیدر غوری، عبدالمجید قرشی، مولوی محمد حسین وغیرہ شامل تھے۔ یہ انجمن کبھی کبھی جلسے وغیرہ بھی بُلاتی تھی۔ جن میں مسلمانوں کی شکایات کا اظہار اور اُن کے ازالے کی مانگ بھی کی جاتی تھی۔ حق بات یہ ہے کہ اُس دور میں احمدی فرقے کے لوگ شعور کے لحاظ سے آگے

تھے اور وہ مُسلمانوں میں احساس ملّی اُجاگر کرنے میں پیش پیش تھے۔ جمّوں کے ان دوستوں میں مستری یعقوب علی نے جو احمدی تھے، کافی بیداری پیدا کی تھی۔ کشمیر میں اس قسم کی سرگرمی کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ بہرکیف جمّوں کے نوجوانوں تک یہ ہلچل اور ویک فیلڈ صاحب پر اُس کے اثر کی خبر پہونچی تو اُنہوں نے ہم سے رابطہ قایم کرنا مناسب خیال کیا اور اپنے ایک نمائندے عبدالمجید صاحب قرشی کو ہمارے پاس بھیج دیا۔

ہمارے میمورنڈم پیش کرنے کا کوئی فوری نتیجہ تو نہیں نکلا۔ لیکن ہمارے نعرۂ مستانہ نے کچھ دنوں کے لئے حکومت کے خاموش ایوانوں میں کھلبلی ضرور پیدا کر دی۔ اُدھر ہم نے اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت کو اور زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس آواز کی نشر و اشاعت کے لئے کیا ذرایع اختیار کئے جائیں۔ اُس زمانے میں تحریر و تقریر کی آزادی ایک خیالی چیز کے برابر تھی۔ ریاست سے مسلمانوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا۔ البتہ جمّوں سے ایک ہندو اخبار "رنبیر" چھپتا تھا۔ جو مہاراجا کی قصیدہ خوانی اور اس کے ظالمانہ نظام کی تعریف کر کے اپنے وجود کو قائم رکھنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اِس کے علاوہ لاہور سے "ملاپ"، "پرتاپ"، "ٹربیون" اور کچھ دوسرے ہندو اخبارات ریاست کے ہندو مہاراجا اور ہندو مفادات کی حفاظت کے لئے اُن کے جائز یا ناجائز اقدامات کی حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔ لاہور سے کچھ ایسے اخبارات بھی ضرور شائع ہوتے تھے جن کے مدیر مسلمان تھے۔ لیکن اگر وہ دربارِ کشمیر کے خلاف ذرا سا مُنہ کھولتے تو اُن کا ریاست میں فوراً داخلہ بند کر دیا جاتا۔ ایک کشمیری نژاد بزرگ محمد الدین فوق، جنہوں نے بعد میں کشمیر کے بارے میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھنے کے سلسلے میں خاصا نام کمایا، ایک ہفتہ وار اخبار لاہور

سے ہی نکالا کرتے، جو کبھی کبھی نحیف سی آواز میں کشمیری مسلمانوں کی شکایات کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتا رہتا تھا۔ دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کی صدائے مجبوری بلند کرنے کے لئے تقریر کا کوئی پلیٹ فارم بھی موجود نہ تھا۔ ریاست سے ہجرت کرنے والے کچھ دردمند مسلمانوں نے اس صدی کے آغاز میں کشمیری کانفرنس کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ اس جماعت کے بانیوں میں ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ بھی شامل تھے۔ اور ہی کے ایک اجلاس میں انہوں نے یہ ولولہ انگیز قطعہ پڑھا تھا ؎

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اُس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

اس کانفرنس کی اصل غرض و غایت تو یہ تھی کہ پنجاب گئے ہوئے کشمیریوں کی محرومیوں کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ چنانچہ اسی کی کوششوں سے پنجابی کشمیریوں پر فوج میں ملازمت کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ یاد رہے کہ کشمیر میں غیر ملکی حکمرانوں نے اُن کی بہادری سے سہم کر ان پر فوج میں بھرتی کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اور یہ سایہ کشمیر سے ہجرت کرنے والے کشمیریوں کا تعاقب کرتے ہوئے پنجاب بھی پہنچ گیا تھا۔ یہ جماعت کبھی کبھی خون کے رشتے کے زیرِ اثر اپنے اُن بدنصیب کشمیری بھائیوں کے لئے بھی بے قرار رہتی تھی۔ جو پیر پنجال کا گھیرا توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کے سیکریٹری سید محسن شاہ تھے۔ یہ جماعت محتاج کشمیری طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے قرضِ حسنہ بھی دیا کرتی تھی۔

میں ولایت جانے کے لئے سرکاری وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا

لیکن میرے سینے میں اب ایک جوالا روشن ہو چکی تھی۔ میں اپنی فراغت کا وقت حکومت کے مختلف محکموں میں مسلمانوں کے تناسب کے اعداد و شمار جمع کرنے میں صرف کرتا۔ میں نے اس سلسلے کا آغاز اکوٹنٹ جنرل کے محکمے کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے سے کیا۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھتے ہوئے میں مرحوم غلام احمد عشائی صاحب کی مدد سے اخباروں کے لئے مضامین مرتب کرتا رہتا تھا۔ اور اس دریچے کے ذریعے دُنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کرتا تھا کہ کشمیریوں کو کس بے دردی سے کچلا جا رہا ہے۔ مضمون تیار ہوتا تو اُس کی ایک ٹائپ شدہ نقل جموں عبدالمجید قرشی کے پاس، جن سے سرینگر میں ربط قایم ہو گیا تھا، بھیجا کرتا تھا تاکہ وہ اس کا ترجمہ کرکے لاہور کے مشہور اخبار روزنامہ "انقلاب" میں شائع کرنے کے لئے روانہ کر دیں۔ "انقلاب" کے مالک و مدیر اُردو کے دو مشہور ادیب اور مسلمانوں کے حقوق کے جری علمبردار مولانا غلام رسول مہرؔ اور جناب عبدالمجید سالکؔ تھے۔ ان حضرات سے قرشی صاحب نے پہلے ہی معاملہ طے کر رکھا تھا۔ بلکہ احتیاطاً کچھ اور ناموں پر اخبار جاری کرنے کے اجازت نامے بھی حاصل کر رکھے گئے تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا تھا کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ حکومت "انقلاب" کی حق گوئی کی تاب نہ لا سکے گی اور اس کا داخلہ کشمیر میں بند کر دے گی۔ اس لئے پیش بندی کے طور پر مختلف ناموں پر ڈیکلریشن حاصل کئے گئے تھے۔ تاکہ ایک اخبار کا داخلہ بند ہو تو دوسرے نام سے حرفِ حق کی شمع فروزاں کی جائے۔ اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ "انقلاب" کے صاحب نظر مدیران نے بڑی توجہ، دردمندی اور بے باکی کے ساتھ ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اور اپنے طاقتور قلم کی کرنوں سے ہماری شکایات میں جان ڈال دی۔ جب اس شعلۂ نوا نے قندیل کی صورت اختیار کرنا شروع کی تو کشمیر دربار کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ ہمارا اندیشہ

درست ثابت ہوا۔ "انقلاب" میں تفصیل سے کشمیری مسلمانوں کی مظلومیت کے متعلق دو ایک مراسلے بھی شائع ہوتے ہوں گے کہ اِس کا داخلہ کشمیر میں ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن ادارۂ "انقلاب" بھی تیار بیٹھا تھا اُس نے "کشمیر" کے نام سے ایک اور اخبار جاری کر دیا، اور اس کو کشمیریوں کی مظلومیت کا نقیب بنا دیا۔ حکومتِ کشمیر اس نئے اخبار کی تاب نہ لا سکی اور اس پر پابندی عاید کر دی گئی۔ لیکن ادارہ "انقلاب" نے ایک تیسرا پرچہ "مظلوم کشمیر" نکالنے میں ہماری مدد کی۔ ان اخبارات کے لئے حقائق کی فراہمی کی ذمہ داری میری تھی۔ میرا اُن دنوں معمول تھا کہ دن بھر مختلف سرکاری محکموں کی خاک چھانتا۔ لوگوں کی منت سماجت کر کے اعداد و شمار جمع کرتا۔ شام کو عشائی صاحب کے دیوان خانے میں حاضری دیتا۔ اُن سے مضمون کے لئے اشارات وغیرہ حاصل کرتا۔ اِس کے بعد اِس کے ٹائپ کروانے کا اِنتظام کرتا اور پھر جموں کسی نہ کسی ذریعے سے عبدالمجید قرشی کے پاس بھجواتا۔ یہ ساری کارروائی میں اکیلے انجام دیتا۔

مجھے یاد ہے کہ جب اخبار "کشمیر" کا بنڈل میرے نام عشائی صاحب کی معرفت آیا تو وہ بہت ہی جز بز ہو گئے۔ اُنہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ ہو نہ ہو اُن پر کوئی آنچ آ جائے گی اور وہ سرکاری عتاب کا نشانہ بن جائیں گے۔ عشائی صاحب کا غصہ بڑا طوفانی ہوا کرتا تھا۔ جب یہ چڑھی ہوئی آندھی کچھ اُتر گئی تو میں نے انہیں یقین دلایا کہ بنڈل میرے مشورے کے بغیر ہی اُن کی معرفت بھیجا گیا ہے اور آئندہ اِس غلطی کو نہ دہرایا جائے گا۔ اس پر وہ کچھ ٹھنڈے پڑے۔ اب ایک اور مرحلہ اِن پرچوں کی تقسیم کا تھا۔ میں اپنے ایک اور بے روزگار ساتھی محمد رجب کے ہمراہ جو علی گڑھ میں میرے ساتھ زیرِ تعلیم تھے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لینے کے بعد اب مارے مارے پھر رہے تھے، اِسلامیہ ہائی اسکول پہونچا۔ اخبار کا بنڈل میری بغل میں چھپا ہوا تھا۔ ہم نے اسکول

میں اِن پرچوں کو اُستادوں اور لڑکوں میں مُفت تقسیم کر دیا۔ پرچوں کا عوام میں پہونچنا تھا کہ شہر میں ایک عجیب سنسنی سی پھیل گئی اور ہر طرف سے اخبار کے لئے تقاضے آنا شروع ہو گئے۔ اب لوگ ہفتہ بھر اخبار کے نئے شمارے کے لئے آنکھیں بچھائے بیٹھے رہتے تھے اور اِس بات کا اِنتظار کرتے تھے کہ دیکھیں نئے شمارے میں کس محکمے کا کچا چٹھا کھولا جاتا ہے۔ پرچے کی قیمت یوں تو ایک پیسہ رکھی گئی تھی لیکن وہ دو دو روپے میں بھی دستیاب نہ ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ دیر یوں ہی چلتا رہا اور اِس نے بیداری کی لَو کو اونچا کرنے میں یقینی طور پر بڑا اہم رول ادا کیا۔ جہاں زبانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے وہاں قلم کی نوک سے شرارے پھوٹ رہے تھے اور ظلمت کی شبِ تار پر اُجالے کے تیر برس رہے تھے۔

▲▲▲

٧

مِیدانِ جنگ میں

مہاراجہ ہری سنگھ کی تعلیم و تربیت یورپی ماحول میں ہوئی تھی لیکن اُنہوں نے مغرب کی دانشمندی کی بجائے اُس کی زرق برق کو زیادہ اپنایا۔ وہ عیش و عشرت کے بڑے رسیا تھے۔ جب وہ تخت نشین ہوئے تو صرف اُن کی سواری کے گھوڑے کو سات لاکھ روپے کے ہیرے جواہرات سے سجایا گیا تھا۔ اُس کے بعد اُن کے رہن سہن میں عیش پسندی کا خاصا دخل رہا اور خاص طور پر وہ رقص و رامش کے بڑے دلدادہ تھے۔ اُن کا اکثر وقت یورپ کی تفریح گاہوں میں ہی صرف ہوتا۔ لندن کے مسٹر آے کی حیثیت سے تو خیر ان کے قصے زبان زد عام رہے لیکن کشمیر میں بھی اُن کے فرصت کے اوقات رقص و نغمے میں گذر رہے تھے۔ مشہور مغنیہ ملکہ پکھراج نے اُن کے دربار سے ایک خاص نسبت حاصل کر لی جس کا بڑا چرچا رہا۔ ۱۹۳۱ء کی ابتداء میں وہ تیسری گول میز کانفرنس، جو برطانوی حکومت نے بلائی تھی، میں شمولیت کے بہانے یورپ گئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی مہارانی تارا دیوی بھی تھیں۔ وہیں فرانس کے شہر کینس میں اُن کے ولی عہد کرن سنگھ کا جنم ہوا۔ تارا دیوی مہاراجہ کی چوتھی بیوی تھیں۔ مہاراجہ کی پچھلی شادیوں سے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی تھی۔ تارا دیوی سے اُن کی شادی ۱۹۲۳ء میں ہوئی تھی مگر پہلی اولاد منتیں مانگ کر اب کہیں چوتھے

سال میں ہوئی تھی۔ مہاراجہ کے بے چراغ خاندان میں ولی عہد کی پیدائش ایک بے حد خوشگوار واقعہ تھی۔ مہاراجہ کے نمک خواروں اور وفاداروں میں بھی اس خبر سے دھوم مچ گئی اور اُنہوں نے مہاراجہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ریاست میں ایک طرف تو سرکاری طور پر جشن منایا گیا اور سرینگر میں زبردست چراغاں کیا گیا دوسری طرف جاگیرداروں نے سرینگر میں ایک میٹنگ بلائی جس میں مہاراجا کی ولایت سے واپسی پر اُن کو ایک استقبالیہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ میٹنگ در خاندان کے پیر مغاں اور وزیر وزارت پنڈت بل کاک در نے بلائی تھی۔ در صاحب اس طرح اپنے آپ کو مہاراجا کی نظروں میں اُبھارنا چاہتے تھے جس کے ساتھ اُن کی بہت سی مراعات وغیرہ جڑی ہوئی تھیں۔ میٹنگ میں بل کاک در کو استقبالیہ کا صدر چُن لیا گیا۔

یہ فیصلہ چند مسلمان جاگیرداروں کو ناگوار گذرا۔ جن میں خواجہ نور شاہ نقشبندی، پیش پیش تھے۔ اس چپقلش کے پیچھے منصب اور جاہ حاصل کرنے کی رقابتیں بھی شامل تھیں لیکن اس کا ایک سبب مسلمان جاگیرداروں کا یہ احساس بھی تھا کہ اکثریتی فرقے سے تعلق رکھنے کے ناطے مہاراجا کو استقبالیہ ایڈریس پیش کرنے کے لئے وہ زیادہ موزوں لوگ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بل کاک در کی کمیٹی سے علٰحدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مسلمان جاگیردار اور رئیس مہاراجا کو الگ استقبالیہ پیش کریں گے۔ اس غرض کے لئے جو اخراجات ضروری تھے اُن کو پورا کرنے کے لئے خاص خاص اشخاص سے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ سارے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے رئیس حضرات کو چند تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خواجہ غلام احمد عشائی نے مجھے بھی اس کام میں گانٹھ لیا۔ میر مقبول گیلانی

درگاہ خانیار کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن مزاج اور خیالات کے لحاظ سے وہ نئے زمانے کے تقاضے بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں مسلم معززین کا ایک جلسہ طلب کرنے کی اجازت عنایت کی اور حسنِ اتفاق سے مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دیدی گئی۔ کوئی دو ڈھائی سو کے قریب خواص جمع تھے۔ اور یہ میرا اُن سے پہلا تعارف تھا۔ اللہ نے میرے گلے میں مٹھاس کی جو نعمت عطا کی ہے اُس سے کام لے کر میں نے کلام مجید کی تلاوت کی۔ جس سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ کلام الٰہی کی تاثیر سے دلوں کی مہریں کھل گئیں تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلائی۔ چونکہ چوٹ میرے دل پر براہِ راست لگی تھی اس لئے جگ بیتی میں آپ بیتی کا مزا پیدا ہوگیا۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کی حالتِ زار کا علاج قربانیوں کا چڑھاوا پیش کرنے سے ہی ہوگا۔ جب تک جیل خانوں اور عذاب وعتاب کا ڈر دلوں کو ڈراتا رہے گا۔ مسلمانوں کی مصیبتوں کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آزمائش کے پہلے مرحلے کے لئے میں اپنے آپ کو سب سے پہلے پیش کرتا ہوں اور انشاء اللہ جسم وجان کی کسی قربانی میں میرے قدم کبھی ڈگمگائیں گے نہیں۔ تقریر تو میں نے کر ڈالی اور اس سے مجھ میں زندگی کی ایک لہر بھی پیدا ہوگئی۔ لیکن جاگیرداروں اور حکومت کے ٹکڑے توڑنے والوں کے اوسان خطا ہونے لگے۔ شاید وہ پچھتا رہے تھے کہ انہوں نے کیوں ایک نوآموز کو دعوت دے کر یہ بلا مول لی۔ بہرحال انہوں نے مجھ پر زور ڈالا کہ میں اپنے الفاظ واپس لے لوں لیکن میں نے جواب دیا کہ میں صداقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔

اگرچہ دوسری طرف سے کافی شور مچا میں اپنی بات پر اڑا رہا اور کسی طرح بات ٹل گئی مگر بقول اقبال ؒ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اس بات کے بھی پر لگ گئے اور اس کا چرچا عام لوگوں تک پہونچ گیا وہ میری ذات میں دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ مجھے مسلمان رؤسا کی کمیٹی کا کنوینر منتخب کیا گیا اور ہم نے مہاراجہ سے تار کے ذریعے استقبالیہ پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ لیکن اُس نے دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے استقبالیوں میں شمولیت سے معذوری ظاہر کی اور یہ معاملہ نپٹ گیا۔

اُن ہی دنوں کشمیر کے میرواعظ مولانا احمد اللہ صاحب کا انتقال ہوا۔ مولانا ایک خدا ترس عالم دین، مجذوب صفت بزرگ اور بہت اچھے واعظ تھے۔ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اُن کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اُن کے جنازے کے لئے مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوگیا۔ اتنے بڑے اجتماع کی نظیر ہم نے پہلے نہیں دیکھی تھی میں نے اس موقعے پر جلوس کی تنظیم وغیرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عوام کے ساتھ میری شناسائی کا دائرہ کچھ اور وسعت پذیر ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد نئے میرواعظ کی حیثیت سے مولوی عتیق اللہ کی دستار بندی کی تقریب جامع مسجد میں منعقد ہوئی۔ مجھے بھی اس موقع پر تقریر کرنے کے لئے کہا گیا اور میں نے پہلی مرتبہ جمیع مسلمین کو خطاب کیا۔

کچھ ہی دنوں بعد اسلامیہ ہائی سکول میں مرحوم میرواعظ کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ میں نے وہاں بھی تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں نے اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے چند ارکان کی نکتہ چینی کی تو اُن میں سے ایک صاحب خواجہ غلام محمد ملک مجھے ٹوکنے لگے۔ بس پھر کیا تھا۔ حاضرین کی ایک بڑی تعداد اٹھ کھڑی ہوئی اور انہوں نے ملک صاحب پر برسنا شروع کیا۔ وہ بیچارے اس خلافِ توقع واردات پر بوکھلا کر

بیٹھ گئے لیکن میری ہمت بندھ گئی کہ اہلِ وطن اب مجھ کو اپنا ہمدم اور دمساز سمجھنے لگے ہیں بقولِ اقبال ؎

ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

یہ میری زندگی کا عجیب زمانہ تھا۔ میں صبح سویرے اپنی سائیکل پر گھر سے نکلتا۔ دن بھر سرکاری محکموں کے چکر لگا کر کچھ کام کی باتیں جمع کرتا۔ کبھی کبھی عشائی صاحب کھانے کے لئے کہتے۔ لیکن بسا اوقات خالی پیٹ ہی بسر کرنا پڑتی بہت ہوا تو بازار سے ایک آدھ نانِ خشک خرید کر دن بتا لیتا۔ رات کو چراغ جلے پرندے بھی گھونسلوں کا رُخ کرتے اور میں بھی گھر واپس لوٹتا۔ اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ اُدھر گھر والے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کسی سرکاری محکمہ میں ملازم ہو کر اُن کا بوجھ ہلکا کروں گا اِدھر میرے دل میں یہ عزم کہ جس مظلوم قوم کو جھنجھوڑنے کا علم اُٹھایا ہے اُسے نہ چھوڑوں۔ اُس وقت ظُلم کا قلعہ اس قدر سنگلاخ اور مضبوط نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی شگاف پڑنا محال نظر آتا لیکن میں بھی اسی ترنگ میں تھا کہ یا تو اس قوم کو کھویا ہوا وقار واپس دلانے میں کامیاب ہو جاؤں یا اسی جدوجہد میں اپنا سر پٹخ پٹخ کر جان دیدوں۔ اُس وقت واقعی قوم کی حالتِ زار گویا ہم سے یوں ہم کلام ہو رہی تھی ؏

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
ایک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

فرق یہ تھا کہ قوم کی مظلومیت نے میرے پاؤں میں ہی نہیں، میری رُوح میں بھی آبلے پیدا کر دیے تھے۔

لیکن بہت کم دوست میری اس حالت کو سمجھ پاتے تھے۔ میں اپنے بھائی

صاحبان سے کہا کرتا کہ میں قوم کی خدمت کے لئے وقت صرف کرتا ہوں تو آپ ناراض نہ ہونا چاہئے کیونکہ قوم کا بھلا ہوگا تو ہمارا بھی بھلا ہوگا۔ لیکن کچھ تو یہ بات اُس زمانے کے شعور میں سمانے والی نہ تھی اور کچھ حقائق کے تند تھپیڑے بھی مجھے ہراساں کر رہے تھے۔ جو چھوٹا موٹا قومی کام میں کرتا رہتا تھا اُس کے لئے بھی کچھ اخراجات کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور خود اپنے جسم و جان کا رشتہ پیوست رکھنے کے لئے بھی۔ اس کے علاوہ جو سرگرمیاں ہم کر رہے تھے اُن کے لئے بھی کچھ کم سے کم اخراجات کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر مل بیٹھنے کے لئے کوئی کمرہ یا پیٹ پالنے کے لئے چند روپے۔ چنانچہ کچھ خرچے کا انتظام کرنے کے لئے میں نے آخر کار ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور محکمۂ تعلیم میں نوکری حاصل کرنے کے لئے عرضی پیش کی۔ مجھے گورنمنٹ ہائی سکول باغ دلاور خان میں ساٹھ روپے ماہانہ مشاہرے پر بطور سائنس ماسٹر کے متعین کیا گیا۔ تنخواہ کے علاوہ بیس روپے کی رقم الاؤنس کے طور پر بھی ملتی تھی۔ گویا کُل ملا کے اسّی روپے ماہوار کی آمدنی ہو گئی میں نے نوکری کی یہ زنجیر تو پہن لی لیکن بہت جلد واقعات نے دکھا دیا کہ اگرچہ زنجیر کے ساتھ میرا رشتہ عمر بھر استوار رہنے کو تھا لیکن نوکری کی زنجیر میرے پاؤں کو جکڑنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ بقولِ شاعر ؎

گلوئے عشق کو دار و رسن پہونچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

▲▲▲

٨

شکستِ زنجیر

میرا گھر شہر سے چھ میل دور تھا۔ میں مُلازمت کرنے کے لئے مشکل سے گھر آ جا سکتا تھا۔ لیکن اِس طرح میرے دل کی مراد بر نہیں آسکتی تھی۔ مجھے قومی کام کا جو چسکہ پڑ گیا تھا۔ اُس کے لئے ضروری تھا کہ شہر میں ہی رہوں تاکہ یار دوست میرے پاس آتے رہیں اور روزمرّہ مسائل پر گفتگو ہوتی رہے۔ اِس لئے میں نے سکونت کے لئے شہر میں ہی ایک کمرہ لیا۔ میری یہ رہائش گاہ ایک گیراج کے اوپر تھی جو خواجہ غلام احمد جیولر کی ملکیت تھا۔ خود جیولر صاحب بھی میری رہائش گاہ کے قریب نج کدل میں ہی رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے مجھے یہ کمرہ کسی کرائے کے بغیر ہی رہنے کے لئے عطا کیا میرا اسکول چونکہ متصل ہی تھا اس لئے مجھے سرکاری اوقات سے پہلے اور بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملنے جُلنے کے کافی مواقع ملتے تھے۔ چونکہ گھر میں خانہ داری کا جھمیلہ بھی نہ تھا لہٰذا گفتگو وغیرہ میں بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس چھوٹے کمرے میں نوجوانوں کا ہجوم رہنے لگا۔

اِن نوجوانوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو مولوی عبداللہ وکیل کے درس و تدریس سے متاثر ہوکر اب قومی کاموں کے نشے میں سرشار رہنے لگے تھے مولوی عبداللہ صاحب کا مکان میرے پڑوس میں ہی واقع تھا۔ وہ تھے تو ایک مذہبی عالم

لیکن اپنے مکان میں وہ جو درس دیتے تھے اُس میں ملّی اور قومی مضامین کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ اور اُن کا دِلکش اندازِ بیان دِلوں میں چھپے ہوئے قومی ولولوں کو ہمیز کرتا تھا۔ اُن کے درس سے قومی شعور کی چنگاریاں بھی نِکلتی تھیں جو دِلوں میں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد شعلوں کی نشوونما کرنے لگیں۔ میں بھی کئی مرتبہ اُن کی درس گاہ میں گیا اور ان کے طرزِ کلام سے لُطف اندوز ہوا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب ایک دردمند شخصیت کے مالک تھے اور اپنی مظلوم قوم کی نجات کے لئے کافی جذبہ رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں میرا اُن کے فرزند مولوی عبدالرحیم سے تعارف ہوا۔ جو لکھنؤ یونیورسٹی میں قانون کی اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں جلد ہی دوست بن گئے اور تحریک کی ابتدائی منزلوں میں سنگ سنگ رہے۔

اسی اثنا میں جموں صوبے میں چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے وہاں کے مُسلمانوں کی دلآزاری ہوئی اور اُن میں غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی واردات یہ ہوئی کہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو جو عید کا دن تھا میونسپل کمیٹی کے ایک باغ میں نمازِ عید ادا کی گئی نماز کے بعد امام صاحب نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ امام صاحب جن کا نام منشی محمد اسحاق تھا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک ڈوگرہ سب انسپکٹر بابو کھیم چند ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس چودھری رام چند کی ہدایت سے آگے بڑھا اور اس نے بڑی رعونت سے امام صاحب کو خطبہ بند کرنے کے لئے کہا۔ پولیس آفیسر کے مطابق خطبہ نماز کا خطبہ نہ تھا بلکہ حکومت کے خلاف کوئی تقریر تھی۔ یہ سراسر دینی امور میں مداخلت تھی۔ اور اِس پر مسلمانوں میں غیض و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جموں میں مسلمانوں کے کئی اجتماعات میں اس نامناسب حرکت کی مذمت کی گئی۔ ابھی یہ زخم ہرا ہی تھا کہ جموں کی پولیس لائن میں ایک ہیڈ کانسٹبل لبھو رام نے ایک دوسرے مسلمان

کانسٹبل کے سامان سے رجب وہ پی ٹی کرنے میں مصروف تھا۔ قرآن پاک چھین کر اُس کی بے حرمتی کی۔ اس واقعہ کی خبر باہر پھیلی تو زخموں پر نمک پڑ گیا۔ اُدھر جموں سے پندرہ میل دور موضع ڈگھور میں ڈوگرہ شاہی کے کارندوں کی مدد سے مسلمانوں کو نمازِ جمعہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ دینی حمیت مسلمانوں کی دُکھتی ہوئی رگ ہے۔ سرکار اس رگ کو چھیڑ کر آگ سے کھیل رہی تھی۔ چنانچہ دلوں میں بے اطمینانی کا جولا وا اندر ہی اندر پک رہا تھا، ان واقعات کی نشتر زنی سے پھوٹ پڑا۔ جموں ینگ مینز ایسوسی ایشن نے مذہبی جذبات کے ساتھ اس چھیڑ خانی کے خلاف ایک بڑا پوسٹر چھاپ کر اسے ساری ریاست میں مشتہر کرنے کے لئے پھیلا دیا۔ پوسٹر میں ان واقعات کے خلاف شدید احتجاج کرنے کے علاوہ مسلمانوں سے اُٹھ کھڑے ہونے اور جلوس جلسے اور ہڑتال کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ ہمارے پاس بھی ایک بڑا سا بنڈل اِن اِشتہاروں کا بھیج دیا گیا۔ اب ان پوسٹروں کو شہر میں چسپاں کرنے کی نوبت آئی تو ہم نے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ شہر کے ہر محلے میں دو دو نوجوان یہ کام کریں۔ اور اگر اُن میں سے کسی کو گرفتار کر لیا گیا تو دوسرا ساتھی فوراً میرے پاس اس کی اطلاع لے کر آئے۔ قدرت کا کرنا کہ ایک نوجوان محمد اسماعیل نامی کو، جس کو اُس محلے میں پوسٹر چسپاں کرنا تھے، جہاں میں رہتا تھا، پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کر لیا۔ یہ ہماری تحریک کا سب سے پہلا سیاسی قیدی تھا۔ پولیس نے اُس کو پوسٹر چپاں کرتے ہوئے گرفتار کر لیا اور اس کی کلائیوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اُس کو زینہ کدل تھانے میں لے جاتے ہوئے جب وہ میری رہائش گاہ کے سامنے سے گذرنے لگے تو میں شور سُن کر کھڑکی سے جھانکنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جا رہا ہے۔ جب عوام نے

مجھے دیکھا تو اُنہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر لیا۔ اُس دن میں سکول سے رُخصت پر تھا۔ چند لمحوں کے لئے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مگر بالآخر جلوس کے ساتھ میں بھی تھانے کی طرف روانہ ہوا۔ جب ہم لوگ تھانے پر پہونچے تو لوگوں کی تعداد اور تیور دیکھ کر تھانے والے ڈر گئے اور اُنہوں نے محمد اسماعیل کو چھوڑ دیا۔ اس سے لوگوں کو کچھ اور حوصلہ مِل گیا۔ اور وہ آسے جلوس کی شکل میں جامع مسجد کی طرف لے جانے لگے۔ راستے میں ہجوم اور بڑھتا گیا۔ جامع مسجد پہونچتے پہونچتے کوئی پندرہ ہزار کی گنتی ہو گئی۔ میرے ساتھ مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار بھی تھے۔ چنانچہ ہم لوگوں سے خطاب کرنے لگے۔ جلسہ جاری تھا کہ سی آئی ڈی کے دو انسپکٹر حبیب اللہ اور عبدالکریم پوری وردی میں مسجد میں داخل ہو گئے۔

لوگوں کی نظریں ان باوردی افسروں پر پڑیں تو اُن میں رفتاً بھگدڑ مچ گئی۔ اور وہ ہر طرف سے بھاگنے لگے۔ کسی نے اپنے پیچھے اپنا جوتا چھوڑا تو کسی نے اپنی چادر۔ مشکل سے دو تین سو لوگ اپنی جگہ جمے رہے۔ وردی پوش سپاہی یا کانسٹبل کو دیکھ کر جو دہشت ہوتی تھی اُس کے پیشِ نظر یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ مگر یہ بات حیرانی کی ضرور تھی کہ میں اور میرے دو اور ساتھی نہ صرف اپنی جگہوں پر ڈٹے رہے بلکہ ہم نے بھاگتے ہوئے لوگوں کو واپس آنے کے لئے پکارا۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ دو پولیس والے کسی کو گرفتار کرنے کے لئے نہیں بلکہ جلسے کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے آئے تھے۔ اُنہوں نے بھی بھاگتے ہوئے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ گرفتاری کے لئے نہیں آئے ہیں۔ تب کہیں جلسہ پھر جم گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ کھُلی جگہ پر عوام سے خطاب کیا۔ میں نے اپنی تقریر آغا حشر کاشمیری کی نظم سے

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے

نہایت درد انگیز لحن میں سنانے سے شروع کی میں نے دیکھا کہ اس نوحے نے دلوں پر مضراب کا کام کیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت لَوْ اَنْزَلْنَا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ کی تلاوت شروع کردی تو ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور لوگوں پر رقت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا:

"جب تک حکومت قرآنِ کریم کی توہین کرنے والوں کو سزا نہیں دے گی ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے اور جب تک مسلمانوں کو حقوق نہیں دیے جاتے تعلیم یافتہ مسلمان ایجی ٹیشن سے باز نہیں آئیں گے۔"

یہ تقریر بھی ایک بجلی کا کڑکا تھی۔ جس نے کشمیر کی زمین کو ہلا کے رکھ دیا۔ سارے شہر میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ گویا شہر خموشاں کے نوبت پہاڑ پر سینکڑوں نقاروں پر چوٹ پڑگئی ہو اور وہ ایک ساتھ بجنے لگے ہوں۔ عوام کے سادہ مگر پُرخلوص اجتماعی ذہن نے عجیب عجیب چہ میگوئیوں کو جنم دیا۔ مثلاً یہ کہ صورہ کا ایک دُبلا پتلا جسمانی لحاظ سے نحیف ونزار نوجوان ماسٹر عبداللہ جو سرکاری مدرسے میں اُستاد بھی ہے حاکم اعلیٰ کے خلاف تقریر کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ رستم کشمیر میں پیدا ہوا ہے تو کسی نے کہا کہ آسمان سے فرشتہ اُتر آیا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں ایک بڑی قوت کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا تنکا تھا اور میری حالت وہی تھی۔

مقام گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے

بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لئے کچھ کام بھی کر گئی۔ چنانچہ جلسہ ختم ہونے پر

دس پندرہ ہزار کا مجمع اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتا ہوا میرے ساتھ آگیا۔ میں اپنی رہائش گاہ پر پہونچا تو مجھ سے ایک اور بار تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ میں اُن کے اصرار پر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہوکر بولا۔ اُن دنوں لاؤڈ اسپیکر وغیرہ تو رائج نہیں تھے اس لئے سارا زور گلے پر ہی ڈالنا پڑتا تھا اس طرح سے یہ دن گذر گیا اور دُوسرے روز میں اسکول اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا۔ اس دوران میر واعظ محمد یوسف شاہ مرحوم دیو بند سے فارغ التحصیل ہوکر آئے تھے اور اُن پر بھی نئے خیالات کی پرچھائیں پڑگئی تھی۔ اُنہوں نے دیو بند کے کچھ جلیل القدر عالم مجاہدوں کی آنکھیں بھی دیکھی تھیں اور تحریکِ خلافت کے جوش وجنون نے بھی اُن کو متاثر کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ دن پہلے متعارف ہوئے تھے۔ میری خوش الحانی اور جرأت کے قائل ہوگئے تھے۔ جلال الدین صاحب کے گھر میں انہوں نے ریڈنگ روم پارٹی کے ساتھیوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مجھے اپنا لیڈر چنیں کہ اس طرح سے اُن کے کام میں قرینہ پیدا ہوگا۔ بعد میں نئے میرواعظ صاحب نے ازراہِ کرم مجھے جامع مسجد کے ایک اِجتماع میں "میرا لیڈر" کہہ کر متعارف کرایا اور لوگوں سے کہا کہ جو کچھ یہ کہیں وہ میرے ہی خیالات سمجھے جائیں۔ میرواعظ کو اُن دنوں کشمیری مسلمانوں کی اِجتماعی زندگی میں جو مقام حاصل تھا اُس کی وجہ سے اُن کا یہ تعارف ایک بہت ہی بڑا سرمایہ ثابت ہوا۔ اور لوگ مجھے اپنے ذہنوں کے ساتھ اپنے سینوں میں بھی جگہ دینے لگے۔

اِدھر اب ہر جمعہ کو جامع مسجد میں میرواعظ کے وعظ کے بعد اجتماع ایک جلسے کی صورت اختیار کرتا تھا۔ جن میں تلاوتِ قرآن پاک اور نعت خوانی کے بعد تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ میری تلاوت ان جلسوں میں خاص طور پر پسند کی

جاتی تھی۔ اور سامعین پر کلام ایزدی کی تاثیر سے رقت طاری ہوتی تھی۔ یہیں میں نے علامہ اقبالؔ کے حیات پرور اور حیات آفرین کلام کو بھی پیش کرنا شروع کیا۔ یہ کلام سیدھے عوام کے دلوں میں ترازو ہو جاتا تھا اور جلسہ ایک متلاطم سمندر کی طرح موجیں مارنے لگتا تھا۔ تقریروں میں ہم کشمیریوں کی زبوں حالی اُبھار کر انہیں جدوجہد پر اکسایا کرتے تھے میرے دو ساتھی مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار بھی میرے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ ہر جلسے کے اختتام کے بعد عوام کا ہجوم پھر جلوس کی صورت میں نعرے بلند کرتا ہوا میری رہائش گاہ تک مجھے چھوڑنے کے لئے آتا تھا۔

یہ صورت حال حکومت کب تک برداشت کرتی۔ آخر کار اُس کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کا تدارک شروع کر دیا۔ اُن دنوں کشمیر کے گورنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رائے زادہ ترلوک چند تھے۔ انہوں نے شہر کے چند معززین کو جن میں خان صاحب مرزا غلام مصطفےٰ، خواجہ سعد الدین شال، منشی اسد اللہ وکیل، مولوی محمد عبداللہ وکیل، خواجہ غلام محی الدین گنگو، خواجہ غلام محی الدین کاوسہ، میر مقبول گیلانی، خواجہ عبدالرحیم بانڈے اور مفتی شریف الدین شامل تھے، کو اپنے دفتر میں بُلا کر مشورہ دیا کہ وہ تقاریر کا سلسلہ شروع کرنے والے ان سرپھرے نوجوانوں کو سمجھا بجھا کر اسے بند کروائیں کیونکہ ان تقاریر کے ذریعے عوام میں حکومت کے خلاف بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ مرزا غلام مصطفےٰ، مفتی شریف الدین اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ نوجوانوں کو قید کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن باقی اکابرینِ شہر نے، جن میں مولوی عبداللہ وکیل پیش پیش تھے، اِس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ جب لوگوں تک معاملہ پہنچا تو قید کا مشورہ دینے والے چار اصحاب کے خلاف سخت بیزاری پھیل گئی اور اُن پر پھبتیاں کسی گئیں۔ اُدھر حکومت نے جامع مسجد کے دروازے پر یہ نوٹس

چسپاں کروائی کہ کوئی شخص ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر مسجد میں جلسہ یا تقریر نہ کرے۔ اُس زمانے میں جامع مسجد کا انتظام ایک سرکاری کمیٹی کے ہاتھ میں تھا۔ جس کے چیرمین گورنر ہوا کرتے تھے۔ گورنر نے شہر کے چار برگزیدہ اشخاص مرزا غلام مصطفےٰ، مفتی شریف الدین، خواجہ عبدالرحیم بانڈے اور منشی اسد اللہ وکیل کی اعانت سے حضرت بل میں ایک جمعہ کو ایک عوامی جلسہ بُلایا۔ حکومت کا خیال تھا کہ اُن کے چار مصاحبین کا عوام میں خاصا اثر و رسوخ ہوگا۔ لہٰذا وہ اُن کے ذریعے نوجوانوں کی اس سرکش ٹولی کا منہ بند کروائیں گے۔ ہم کو اس کارروائی کی اِطلاع ملی تو میں اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ اُس دن نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے جامع مسجد کی بجائے درگاہ حضرت بل پہونچ گیا۔ مسجد کے اندر میں نے پہل کر کے عوام کو خبردار کیا کہ سرکاری وفاداروں نے جلسہ کیوں بُلایا ہے اور اس لئے اس میں شرکت کرنے سے اِجتناب کیوں ضروری ہے؟ لیکن جلسہ شروع ہوا تو بہت سے تماشائی اکٹھا ہو گئے۔ جوں ہی گورنر صاحب تقریر کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو ہمارے نوجوانوں نے اُن پر ایسے سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی جن کے جوابات اُن کے پاس نہ تھے۔ گورنر لاجواب ہو کر دھمکیوں پر اُتر آئے اور نوجوانوں کو گرفتار کرنے لگے۔ اُدھر حاضرین میں جوش پیدا ہونے لگا۔ اور ہجوم کی طرف سے اسٹیج پر پتھر پھینکنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گورنر صاحب سرکاری جاہ و حشم میں رہنے والے حاکم تھے، اس بلائے ناگہانی سے گھبرا گئے اور اپنے چار نمک خواروں کے ہمراہ دُم دبا کر بھاگ نکلے اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے کے گھر میں، جو قریب ہی واقع ہے، پناہ گزین ہو گئے۔ دوسری جانب ایک انبوہ کثیر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم نے سیدھے جامع مسجد کا رُخ کیا اور گورنر کی نوٹس کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے وہاں

جلسہ کیا اور معمول سے کچھ زیادہ ہی تند و تیز تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں حکومت کے چار نمک خواروں کی بھی مذمت ہوئی۔ اُن کی رہی سہی عوامی ساکھ اس طور مٹی میں مل گئی کہ پھر وہ یہ دھبّہ کبھی نہ مٹا سکے۔ حکومت نے اس محاذ پر مُنہ کی کھائی تو وہ ہمارے پیٹھ پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ میر واعظ صاحبان کشمیر کی مذہبی اور مجلسی زندگی میں اہم مقام رکھتے تھے اور دربار میں بھی اُن کی پذیرائی تھی۔ چنانچہ حکومت نے میر واعظ مولوی یوسف شاہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ جامع مسجد میں ہمیں جلسہ کرنے کی اجازت نہ دیں اور اپنے وعظ میں ہماری مخالفت کریں۔ لیکن مولوی یوسف شاہ اس تقاضے کو ٹالتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خواجہ غلام احمد عشائی نے اس نازک موقع پر میر واعظ خاندان کی ہمدردیاں تحریک کے حق میں حاصل کرنے کے لئے نمایاں کام کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میر واعظ عتیق اللہ اُن دنوں علالت کے سبب ڈرگن کے مشن ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ میں اور عشائی صاحب اُن کی مزاج پرسی کے لئے وہاں چلے گئے اور ساتھ ہی عرض گزاری کہ ہمیں اُن کی ہمدردیوں کی بدستور ضرورت ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے بڑی منکسر مزاجی سے ہمیں دلاسا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اُس وقت میر واعظ حکومت کے جھانسے میں آکر ہماری مخالفت پر اُتر آتے تو ہماری مشکلات دوچند ہو جاتیں۔

اُدھر سرپھروں کے "سرغنے" کے طور پر میرا نام حکومت کی دستاویزات میں درج ہو چکا تھا۔ چنانچہ عتاب کے لئے بھی بقولِ شاعر؎

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

حاکمانِ وقت کو اندازہ ہو چکا تھا کہ بجلی میرے ارد گرد بھنور کی طرح حرکت کر رہی ہے۔ میرے نام پر مجمعے جمع بھی ہوتے تھے اور جوش میں بھی آجاتے

تھے۔ "ماسٹر عبداللہ" کو دیکھنے کے لئے لوگ میری رہائش گاہ کے پاس کھڑا رہا کرتے اور جب میں نکلتا تھا تو بڑی مُشتاقانہ نگاہوں سے مجھے تاکا کرتے۔ میں ان نگاہوں میں چھپی ہوئی محبت تو محسوس کرتا تھا لیکن کبھی کبھی مجھے حجاب بھی آتا تھا۔ اور میں دل ہی دل میں کُڑھتا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے جو باتیں منسوب کرتے ہیں کیا میں اُن کا حق نبھا بھی سکوں گا؟ لوگ میرے بال نوچتے کہ یادگار کے طور پر ساتھ لے جائیں۔ اُنہیں شاید اپنی بے کسی نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے معجزوں کی توقع رکھیں۔ میں ایک عام انسان تھا اور ان توقعات سے اور بھی بوجھ محسوس کرتا۔ حکومت تحریک پر بھرپور وار کرنے کے لئے اندر اندر سے تیاریاں کر رہی تھی۔ اور جب وہ مستعد ہو گئی تو اس نے پہلی کاری ضرب لگانے کے ارادے سے مجھے مظفر آباد تبدیل کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ حکومت کا خیال تھا کہ میں سرینگر سے دور چلا گیا تو اس شورش کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔

اُس وقت ریاست کے ناظمِ تعلیمات ایک آئرش انگریز مسٹر میکڈرمٹ تھے۔ یہ ایس۔پی کالج میں میری زمانۂ طالب علمی کے دوران پرنسپل تھے۔ ذاتی طور پر وہ بڑے شریف النفس اور ہمدرد تھے اور مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ اُنہوں نے مجھے بُلا بھیجا اور جب میں اُن کے دفتر پہونچا تو میرے مظفر آباد نہ جانے کی وجوہات پوچھیں۔ میں نے اپنا سینہ کھول کر اُن کے سامنے دل کا ماجرا بیان کیا۔ مسلمانوں کی حالتِ زار کا ذکر سنایا اور کشمیریوں کی زبوں حالی کی تصویر کھینچ دی۔ جب میں یہ درد بھری داستان بیان کر رہا تھا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور آنسو چھلک پڑے۔ نیک دل انگریز بھی میرے کرب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ سرکاری ملازمت سے روپیہ کمانا میرا

مقصدِ حیات نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندہ رہنے کے اسباب کی تلاش کے لئے ہے۔ میرا اصل مقصد تو اپنی مظلوم قوم کو ذلّت و ادبار سے نکالنے کے لئے جدو جہد کرنا ہے میں نے اپنے خدا سے یہ عہد کیا ہے کہ یا تو میں اس مظلوم قوم کو اپنا کھویا ہوا وقار اور انسانی حقوق واپس دِلانے میں کامیابی حاصل کروں گا یا اسی جدوجہد میں جان کی بازی لگادوں گا۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلّق ہے میں اپنے منصب کے فرض کو بھی بہ خوبی انجام دے رہا ہوں۔ دس بجے سے چار بجے تک باقاعدگی سے اسکول حاضر رہ کر اپنا کام کرتا ہوں۔ میرے زیرِ تعلیم طلبا کے نتائج سے ظاہر ہے کہ میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برت رہا ہوں۔ لیکن مدرسے سے واپس آنے کے بعد میرے اوقات پر میری قوم کا حق ہے۔ میں نے سرکاری ملازم ہوکر چند ٹکوں کے لئے اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا ہے اور نہ کبھی ایسا کرسکتا ہوں۔ حکامِ متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ میرا کام دیکھیں اور اِس بات کا خیال رکھیں کہ میں وقت پر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہوں یا نہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی اخلاقی تمدّنی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کے لئے کوشش کرے۔ اگر حکومت میری اس فرض شناسی کا بُرا مناتی ہے تو میرا استعفیٰ منظور کرلے۔ انگریز ناظمِ تعلیمات نے غور سے میری باتوں کو سُنا۔ پھر کہا کہ حکومت کے قواعد کے مطابق میں جو بیں گھنٹے حکومت کا ملازم ہوں۔ اِس کی منشا کے برخلاف کوئی کام نہیں کرسکتا۔ میں نے جواباً کہا کہ ایسی صورت میں میں اِستعفیٰ دینے پر مجبور ہوں۔ مسٹر میکڈورنٹ نے مجھے رُخصت کرتے ہوئے جب آنسو بہاتے دیکھا تو اُن کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ اُنہوں نے مجھے دعائیں دیں اور جاتے جاتے پھر ایک مرتبہ اپنے فیصلے پر غور کرنے کا مشورہ دیا۔ کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ تعلیم کے وزیر نواب خسرو جنگ کے

یہاں میری طلبی ہوئی۔ غالباً ناظمِ تعلیمات نے اُن کو ساری روئداد سُنادی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے شفقت بھرے لہجے میں اندر بُلالیا اور نصیحتاً مجھے اپنے ارادے سے باز آنے کے لئے کہا۔ مجھ پر پھر جذبات غالب آنے لگے۔ اور میں نے اُنہیں اپنی بپتا سُنانی شروع کردی۔ مختصراً میں نے اُن کو اس بارے میں کسی شبہے میں نہیں رکھا کہ جس کام کو میں نے اپنا مقصدِ حیات بنالیا ہے اُس کو میں کسی تحریص یا تنبیہہ میں آکر ترک نہیں کرسکتا۔ وہاں سے میں رُخصت ہوکر آیا تو چند دنوں کے اندر وزیرِ موصوف نے میری برطرفی کا حکم نامہ بھجوادیا۔ حکومت کو قواعد کے ماتحت میرا استعفیٰ منظور کرنا چاہئے تھا مگر اُس نے میری برطرفی کا حکم نامہ بھجوادیا۔ حالانکہ نتیجہ دونوں کا ایک ہوتا۔ لیکن حکومت کے دِل میں میرے خلاف کدورت کا غبار بھرا ہوا تھا۔ اُس کا اظہار اِس اِنتہائی اِقدام کی صورت میں سامنے آگیا۔ بہرحال میں نے اسے مولانا حالیؔ کا یہ شعر یاد کرتے ہوئے قبول کرلیا ؎

تعزیرِ جُرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

جب میں مُلازمت کی بیڑیوں کو کاٹ کر آزاد ہوگیا تو اس کا جشن منانے کے لئے میرے ساتھیوں نے خانقاہِ مُعلّیٰ میں ایک جلسہ طلب کرلیا۔ میں خانقاہِ مُعلّیٰ پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عظیم اجتماع جمع ہوگیا ہے۔ مجھے دیکھ کر مجمع بے قرار ہوگیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اپنے اِستعفیٰ کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اور اس کی وجوہات بیان کرتے کرتے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار پھوٹ نکلی پُرخلوص نالے میں تسخیرِ قلوب کی قوت ہوتی ہے۔ میرے موڈ کا مجمع پر بھی اثر ہوا اور وہاں بھی ایک انتہائی جذباتی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جس

مقصد کے لئے میں کفن بردوش ہوکر نکلا ہوں اس کے لئے ملازمت کی قربانی تو ایک ادنیٰ سی قُربانی ہے۔ اگر میری جان کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ بھی پیش کردونگا۔ اس پر جلسے میں جوش وخروش کا سیلاب آگیا۔ جب جلسے کے اِختتام پر میں گھر کی جانب روانہ ہوا تو عوام نے ازراہِ محبّت مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شاید اسی جلسے کی روئداد بیان کرتے ہوئے لاہور کے اخبار "اِنقلاب" نے میرے نام کے ساتھ "شیرِ کشمیر" کا لقب بھی جوڑ دیا۔ جو بعد میں ہماری تحریکِ حُرّیت کا طبلِ جنگ اور شناختی پرچم بن گیا۔ اُس پیمان کی یاد آتی ہے تو مجھے کبھی کبھی میر تقی میرؔ کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

موسم آیا تو شاخِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور کا ہی بار آیا

▲▲▲

۹

پیمانِ اوّل

"ملازمت کے بندھن توڑ کر میں نے آزادی کے رقصِ شرر میں اپنے آپ کو مکمل طور پر جھونک دیا۔ اب ہم نے شہر کے اطراف و اکناف میں جلسے کرنے شروع کردیے۔ جن میں ہزارہا مرد وزن شریک ہوا کرتے تھے۔ ان میں ہمارے علاوہ عبدالصمد درزی نام کا ایک کارکن بھی تقریر کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو حاضری پچاس ہزار تک پہونچ جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ایک سوئی ہوئی قوم کسی مست ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی اُٹھی ہے اور جو طوفان ہجوم کے اُٹھتے ہیں وہ تنکوں سے ٹالے نہیں جاتے۔ میرے گلے میں رعد کی سی گرج پیدا ہوگئی تھی۔ میں اقبالؔ سے کافی متاثر تھا اور اُس کا انقلاب انگیز کلام کچھ ایسی کیفیت سے پیش کرتا تھا کہ عوام کے منجمد خون میں اُبال آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ آغا حشر کی کچھ ملی نظمیں بھی پیش کرتا تھا۔ حکومت ہم پر ہاتھ ڈالتی تو کیسے؟ کیونکہ عوام کا ایسا پارہ چڑھا ہوا تھا کہ اس موقع پر کوئی مداخلت خون خرابے کا باعث ہوتی۔ اسی دوران مہاراجہ ہری سنگھ بھی ولایت سے واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے ملک کی یہ حالت دیکھی تو ایک بیان جاری کردیا جس میں درپردہ انداز سے پولیس اور عدالت کے استعمال کا اِشارہ دیا گیا تھا۔ لیکن فی الحال حکومت نے گفتگو کی اوٹ سے شکار

کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ مہاراجا نے اپنے سیاسی معاملات کے وزیر جی، ای، سی ویکفیلڈ کے مشورہ پر ریاستی مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد طلب کیا۔ جو اُن کے پاس اپنی شکایات اور مطالبات پیش کرے۔ جموں کے مسلمانوں کی طرف سے وہاں کی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے مندرجہ ذیل چار افراد کو اپنے نمائندوں کے طور پر نامزد کیا۔

۱۔ مستری یعقوب علی ۔ ۲۔ سردار گوہر رحمان ۔ ۳۔ چودھری غلام عباس خان۔
۴۔ شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ ۔

جموں کے مسلمان نمائندگان کا انتخاب ایک چھوٹی سی میٹنگ میں ہوا تھا۔ لیکن ہم نے کشمیر میں اس انتخاب کو رائے عامہ بیدار کرنے اور اُن کی قوت کا مظاہرہ کرنے کے موقعے میں تبدیل کر لیا۔ میرے ذہن میں اُس میمورنڈم کا حشر موجود تھا جو خواجہ سعدالدین شال اور اُن کے ساتھیوں نے لارڈ ریڈنگ کو پیش کیا تھا۔ اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ اُن کی جلا وطنی پر اُن کو اپنے ہم وطنوں کی سرد مہری اور بے نیازی کے کتنے شکوے گلے تھے۔ میری رائے میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ________ اُس وقت عوام کو اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اور نہ ہی عوامی قوت کے بے پناہ مخزن POWER HOUSE کو تحریک کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ کشمیر کے سات نمائندگان کو ایک بھرے جلسے میں عوام خود چُن لیں۔ اس طرح ایک تو ان نمائندگان کی نمائندہ حیثیت شک وشبہ سے بالاتر ہو جائے گی اور دوسری طرف حکومت بھی اُن کی آواز کے وزن اور وقار کو نظرانداز نہ کر سکے گی۔ خوش قسمتی سے میرے دوسرے ساتھی میرے ہم خیال تھے۔

انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ہم کشمیری مسلمانوں

کے باہمی تفرقات پس پُشت ڈال کر انہیں بڑے مقاصد کے لئے ایک اسٹیج پر جمع کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ایک غلام قوم کا مقسوم ہوتا ہے۔ اُس وقت کشمیری مسلمان طرح طرح کے تفرقوں اور گھٹ بندیوں میں اُلجھ کر رہ گئے تھے۔ وہ نہایت غیرضروری امور پر باہم دست وگریباں تھے۔ اور اُن کے بڑے مفادات اِس آڑ میں اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے تھے۔ حنفی، اہلِ حدیث، احمدی، اہلِ سُنّت، شیعہ، سُنّی وغیرہ کے باہمی مناقشات نے مسلمانوں کا جماعتی شیرازہ پارہ پارہ کر دیا تھا۔ خود حنفی مسلک کے لوگ "ژیکہ" اور "کوٹہ" کے ذیلی گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ کشمیر کے مسلمان اقبال کے اس شعر کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔

یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

میرواعظ یوسف شاہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے میرواعظ صاحبان کو میرواعظ کلاں کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا اور اُن کے پیروکار "کوٹہ" کہلاتے تھے۔ میرواعظ کے خاندان کی ایک اور شاخ سے متعلق میرواعظ ہمدانی چھوٹے میرواعظ کہلاتے تھے۔ اُن کے پیروکار کو "ژیکہ" کہتے تھے۔ یہ تعداد اور شمار میں میرواعظ کلاں کے پیروؤں سے بہت کم تھے۔ مگر دونوں گروہ شہر کے دل میں اکثر برسرپیکار رہتے تھے۔ اور ان کی کدورت نے مسلمانوں میں بڑا انتشار پیدا کیا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہمیں اجتماعی حقوق کے لئے بڑی لڑائی لڑنی ہے تو پہلے مسلمانوں کو ایک متحدہ محاذ میں پرو دیا جانا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے ان متحارب گروہوں کو گفت و شنید اور صلح وصفائی کے ذرائع استعمال کرکے ایک جگہ پر جمع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ حق یہ ہے کہ اس نازک کام کا بیڑا اٹھانے میں خواجہ غلام احمد عشائی

اور خواجہ سعدالدین شال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۲۱ / جون ۱۹۳۱ء کو ہماری دعوت پر لبیک کہتے ہوئے فرزندانِ کشمیر کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر خانقاہِ معلّٰی کے صحن پاک میں جمع ہوا۔ اِس اجتماع کو کشمیر کی تحریکِ آزادی کا رسمی اِفتتاح اور اصلی آغاز سمجھنا چاہیئے۔ کتنی موزوں اور برمحل بات تھی کہ تحریکِ آزادی کی بنیاد اس خانقاہِ فیض پناہ کے پُرسطوت کنگروں کے سائے میں ڈال دی جائے۔ جو امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدانؒ کے نام سے منسوب ہے۔ شاہ ہمدانؒ نے چھ سَو سال قبل اسی جگہ اسلام کے نور کی شعل فروزاں کی تھی۔ جس نے چودھویں صدی عیسوی میں جنگ و جدل، فتنہ و فساد اور بد حالی اور پائمالی سے خستہ حال کشمیریوں کے لئے امن اور آشتی کا راستہ روشن کیا تھا۔ انھوں نے ایک زوال آمادہ تہذیب کے کھنڈروں پر اُمید کا چراغ جلایا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے لئے اِسلام کا دینی تحفہ ہی نہیں لائے بلکہ اُنھوں نے ایک ترقی پذیر تمدّن اور اس کے علوم و فنون بھی اپنے ساتھ لائے۔ جن میں قالین بافی، پیپر ماشی، کاغذ سازی اور اسی قسم کی بیسیوں حرفتیں شامل ہیں۔ شاہ ہمدانؒ صرف ماضی کے ہی نہیں بلکہ مستقبل کے نقیب اور صرف دین ہی کے نہیں دانش کے علمبردار بھی تھے۔ اور اِسی لئے علّامہ اِقبالؔ نے اپنے آسمانی سفر یعنی "جاوید نامہ" میں اُن کو کشمیر کی آزادی کا نشان قرار دیا اور اُن کو ان تعریفانی الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا ؎

خطّہ را آں شاہِ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایرانِ صغیر
با ہنرہائے غریب و دلپذیر

اِس عظیم اجتماع کے سامنے اسٹیج پر کشمیری مسلمانوں کے نمائندے برسوں کے اِفتراق و اِنتشار کے بعد گلے مِل رہے تھے۔ اِسی موقع پر میر واعظ یوسف شاہ نے اپنے حریف میر واعظ احمد اللہ ہمدانی کو اخوت کے جذبے کے تحت گلے لگا لیا۔ اور مولوی عبداللہ وکیل کے ساتھ، جو اُس وقت احمدی مسلک کے علم بردار تھے، مصافحہ کیا۔ حالانکہ دونوں اپنے مذہبی مسالک میں بعدالمشرقین اور اجتماعِ ضدین تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ "خیمہ ہائے ما جُدا دِلہا یکے است" والا محاورہ حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے۔ اِن ڈرامائی واقعات نے مجمعے میں آگ لگا دی۔ میں بھی موقع کی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور تلاوتِ کلام پاک کے بعد میں نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ اپنی تقدیر کو بدل ڈالنے کے لیے کروٹ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ اب غفلت کا زمانہ گذر گیا۔ اب یا تو ہم اپنا حق حاصل کر کے دم لیں گے یا اس جدوجہد میں سربکف ہو کر جان کی بازی لگا دیں گے۔ اس اجتماع میں میں نے یہ نظم ترنم سے سنائی ؎

اے خدا دے زورِ دست و بازوئے حیدرؓ ہمیں
پھر اُٹھانا ہے صفِ کُفر و درِ خیبر ہمیں

اِس موقع پر میری تلاوتِ قرآن سے ایک عجیب عالم طاری ہو گیا اور ایک کشمیری شاعر نے مولینا روم کا یہ شعر اس موقع کی مناسبت سے میرے حق میں اِستعمال کیا ؎

ایں ہمہ آوازہا از شاہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مجمع کے ساتھ ہم سب نے قرآنِ مقدس کو شاہد بنا کر یہ پیمان کیا کہ ہم کبھی

قوم کے تئیں اپنی وفاداری میں متزلزل نہ ہوں گے۔ جب مجمع پلّی اور قومی نعروں سے گونج اُٹھا تو میں نے سات نمائندوں کے نام ایک ایک کرکے جمہور کی منظوری کے لئے پیش کئے۔ اور عوام فلک شگاف نعروں سے اُن کی تائید کرتے گئے۔ خواجہ غلام احمد عشائی بڑے ذہین شخص تھے لیکن کسی وجہ سے عوام میں اُن کے تئیں زیادہ حسنِ ظن نہ تھا۔ اس لئے اُن کے نام کی تائید ایک لاکھ کے اس بھاری اجتماع سے حاصل کرنے میں مجھے اپنا سارا زورِ بیان صرف کرنا پڑا۔ بہرحال عوام نے کچھ تامل کے بعد اُن کے نام کی بھی منظوری دیدی اور اس طرح سے مندرجہ ذیل عمائدینِ مسلمانانِ کشمیر کے معتبر نمائندوں کی حیثیت سے چن لیے گئے۔

۱۔ میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ۔ ۲۔ میرواعظ احمد اللہ ہمدانی۔ ۳۔ آغا سید حسین جلالی۔ ۴۔ خواجہ غلام احمد عشائی۔ ۵۔ منشی شہاب الدین۔ ۶۔ خواجہ سعد الدین شال۔ ۷۔ راقم الحروف شیخ محمد عبداللہ۔

جلسہ ختم ہوا تو عوام کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ نمائندگان اور جلسہ منظم کرنے والے قریب ہی واقع ہمدانیہ مڈل سکول میں چائے نوشی اور گفتگو کے لئے چلے گئے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے پیچھے ایک ایسی چنگاری چھٹکے گی جو کشمیر کے صدیوں سے پکنے والے مجوالا مکھی کا دہانہ کھول دینے کا سبب بنے گی۔

عبدالقدیر ایک غیر معروف شخص تھا۔ جس نے بارود کے اس ڈھیر میں چنگاری لگادی۔ پشاور میں تعینات یورک شائر رجمنٹ کے انگریز میجر بٹ کے ساتھ خانساماں کی حیثیت سے کشمیر آیا ہوا تھا۔ میجر تعطیل منانے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اور اُس نے نسیم باغ میں ایک ہاؤس بوٹ میں رہائش اختیار کی تھی۔ عبدالقدیر حضرت بل نماز کے لئے آیا کرتا اور کبھی کبھی نماز کے بعد وہاں مسلمانوں کی مظلومیت کے بارے

میں تقریریں بھی کرتا تھا۔ عبدالقدیر فرصت کے اوقات میں ہمارے جلسوں وغیرہ میں بھی شرکت کرتا تھا۔ یہیں آ سے مسلمانوں کی حالتِ زار نے متاثر کیا۔ اس دن سے کچھ ہفتے قبل وہ جامع مسجد کے ایک جلسے میں مجھ سے ملا تھا اور اُس نے ہماری تحریک سے گہری وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ایک ان پڑھ غیر ریاستی باشندے کے اس جذبے کی تعریف بھی کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ خانقاہِ معلیٰ کے اس جلسے میں وہ بھی موجود تھا۔ جب ہم چائے نوشی کے لیے چلے گئے، تو اُس نے اپنا دفتر کھول دیا چونکہ عوام جوش کے عالم میں تھے۔ لہٰذا اُس کے اردگرد ایک جھرمٹ لگ گیا۔ اُس کی تقریر کی رپورٹ سرکار کی سی، آئی، ڈی نے یوں قلم بند کی ہے۔

"مسلمانو! اب وقت آگیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ یادداشتوں اور گذارشوں سے ظلم و ستم میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور نہ توہینِ قرآن کا مسئلہ حل ہوگا۔ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم کے خلاف لڑو۔" عبدالقدیر نے راج محل کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا اس کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔"

ہم اس واقعے سے بے خبر اپنی حکمتِ عملی بنانے میں مصروف تھے۔ اُن دنوں عوام میں عجیب غریب ولولہ پیدا ہوگیا تھا۔ میرے لیے گھر سے نکلنا دشوار ہوگیا تھا۔ ہر طرف "شیرِ کشمیر زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یہ نعرہ اب تحریک کا پرچم اور شناختی علامت بن گیا تھا۔ اور اُن کی کشمیری قومیت کا پہلا اظہار ASSERTION بن کر سامنے آیا تھا۔ ہم تقریباً روزانہ شام کو مختلف جگہوں پر جلسے منعقد کرتے تھے۔ جہاں لوگ تقریریں سننے کے علاوہ تحریک کو

آگے بڑھانے کے لیے نقدی اور زیورات بھی پیش کرتے تھے۔ کچھ دِن بعد افواہ پھیلی کہ شہر میں گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔ ہم یہ سمجھے کہ شاید ہمیں گرفتار کیا جائے گا۔ اس لئے میں، مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار رات کو ایک پڑوسی کے مکان میں شب باشی کے لیے چلے گئے۔ صبح معلوم ہوا کہ پولیس نسیم باغ کے ایک ہاؤس بوٹ سے کسی عبدالقدیر کو گرفتار کرکے لے گئی ہے۔ اس وقت تو ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ لیکن بعد میں اِس معاملے کی تفصیلات سے آگاہی ہوئی۔ عبدالقدیر کے خلاف رنبیر پینل کوڈ کی دفعہ ۱۲۴ (الف) اور ۱۵۳ کے تحت بغاوت اور غداری کا مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ چونکہ اُس کو ہماری تحریک سے ہمدردی کی پاداش میں دھر لیا گیا تھا۔ اِس لیے ہم نے مقدمے کی پیروی کا فیصلہ کرلیا۔ پہلے تو کچھ دنوں اُس کو سنٹرل جیل سے سیشن جج پنڈت کشن لال کچلو کی عدالت میں سماعت کے لئے ہانکا جاتا تھا۔ لیکن جب لوگ اُس کے اردگرد جمع ہونے لگے تو حکومت نے سنٹرل جیل میں ہی مقدمے کی سماعت کا حکم صادر کیا۔

اُدھر ہمارے جلسوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو گاؤکدل میں ایک بڑا عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں میرے علاوہ مولوی عبدالرحیم اور گلکار صاحب نے بھی تقریریں کیں۔ ہم نے عبدالقدیر کے مقدمے کی بند کوٹھری میں سماعت کرنے کی مذمت کی اور عوام کو قربانیوں کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی۔ جلسہ کوئی آدھی رات تک جاری رہا اور ہم تھکے ماندے رات گئے گھروں کو لوٹے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے دن کشمیر کی پیاسی دھرتی پر ہمارے نوجوانوں کے لال لال لہو کی گرم دھارا صبح کے شفق کی طرح پھوٹ

نکلے گی اور ہماری تقدیر کا ایک نیا عنوان جیالے کشمیری سپوتوں کے مقدس خون سے رقم ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ عبدالقدیر کی نسبت سے یہ خونیں واقعہ ہماری تحریکِ آزادی کے سوکھے چراغ میں طلسماتی روغن ڈال دینے کا باعث بنے گا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہماری تحریک کی ابتداء میں ہی ہم اُس خونیں موڑ پر پہنچ جائیں گے جس موڑ پر پہونچنے کے لئے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو بیسیوں برس انتظار کرنا پڑا۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کا حادثہ ہماری تحریک میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تواریخ میں ۱۹۱۹ء میں رُونما ہونے والا جلیان والا باغ کا سانحہ رکھتا ہے۔

▲▲▲

۱۰

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا ربّ!

ہم نے گاؤکدل کے جلسے میں عوام سے درخواست کی تھی کہ وہ دوسرے روز یعنی ۱۳ ، جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل نہ جائیں ۔ جہاں عبدالقدیر کے مقدمے کی پیشی مقرر تھی ۔ جیل میں اجازت کے بغیر کسی کا داخلہ ممنوع تھا ۔ اور ہم خون خرابے کو روکنے کے روادار تھے ۔ لیکن یا تو سبھی لوگوں تک ہماری بات نہیں پہونچی یا جذبات اِس قدر مشتعل تھے کہ اُٹھے ہوئے قدم نہ رُک سکے ۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو سیّد منصور نہ تھی ، سیّد محی الدین اندرابی اور محمد یحییٰ رفیقی صاحب نے وہاں جانے کی ترغیب دی تھی ۔ ہم نے مولوی عبداللہ وکیل کو عبدالقدیر کا وکیل صفائی مقرر کیا تھا ۔ جب ۱۳ ، جولائی کو مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو عدالت کے باہر ہزاروں کا جمگھٹا لگ گیا ۔ جو عبدالقدیر زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا ۔ جونہی وکیل صفائی مولوی عبداللہ وکیل جیل کے اندر جانے لگے تو عوام کا ایک ریلا اُن کے ساتھ اندر گھس گیا ۔ جیل کے حکّام کی سٹّی گُم ہوگئی ۔ لیکن وکیلِ صفائی نے ہماری ہدایات کے پیشِ نظر لوگوں کو سمجھا بجھا کر جیل کے احاطے سے باہر جانے پر راضی کر لیا ۔ اُنہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ اُن میں چند آدمیوں کو عدالت کی کارروائی سننے کے لئے اندر

بُلوایا جائے گا ۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا اور لوگ باغ میں نماز ادا کرنے کے لئے صفیں باندھنے لگے ۔ اسی اثنا میں جیل کے اہلکاروں نے گورنر راے زادہ ترلوک چند کو معاملے کی اِطلاع کر دی ۔ اور وہ مسلّح پولیس کے ایک دستے کے ساتھ موقع پر پہونچ گئے ۔ پہلے تو اُس نے جیل کے ملازموں کو اس بات پر لتاڑا کہ انہوں نے کس طرح ہجوم کو جیل میں گھسنے دیا تھا ۔ اِس کے بعد اُس نے جیل کے باہر کھڑے پُرامن لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا ۔ پولیس نے اندھا دُھند گرفتاریاں شروع کر دیں تو ہجوم بھی طیش میں آگیا ۔ اور اُس نے جواب میں پتھراؤ شروع کر دیا ۔ گورنر نے اپنی کوتاہ اندیشی میں پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا ۔ بندوقوں کے دہانے اُن لوگوں کی طرف کر دیے گئے ۔ جو باغ میں نماز کے لیے صف بستہ تھے ۔ ایک مسلمان دیوار کی بلندی سے اذان دے رہا تھا ۔ پولیس کی گولی سے وہیں ڈھیر ہوگیا ۔ جوش و جنون کا یہ عالم تھا کہ اُس کی جگہ فوراً دوسرے آدمی نے لی اور وہ اذان کو جاری رکھنے لگا ۔ اُس کا سینہ بھی بھون ڈالا گیا ۔ اس طرح بائیس سرفروش جامِ شہادت نوش کر گئے ۔ زخمیوں کی تعداد تو سینکڑوں تھی ۔ ظالم کا ہاتھ اس سفّاکی سے اُٹھا تو مظلوم بھی مرنے مارنے پر تُل گئے ۔ اُنہوں نے جیل کی پولیس لائن میں آگ لگا دی اور اس کے ساز و سامان کو خاکستر کر ڈالا ۔ انہوں نے ایک شہید کا کُرتا اُٹھا لیا ، جو اُس کے خونِ ناحق سے نقشِ فریادی بنا ہوا تھا ، اور اس خونیں پرچم کے نیچے زخمیوں اور شہداء کو چارپائیوں پہ لِٹا کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے ۔ شہدائے کشمیر کی سُرخ روئی کا اِس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ مسٹر ویکفیلڈ نے بعد میں اعتراف کیا کہ " سارے شہیدوں کے زخم اُن کے سینوں پہ تھے پُشت پر نہیں ۔ "

یہ اتفاق بھی عجیب ہے کہ ۱۹۳۱ء میں جولائی کی ۱۴ تاریخ کو پیرس کے

باشندوں نے باسطائیل کے زندان پر دھاوا بول کر فرانس کے عوامی انقلاب کی ابتدا کر دی جس نے بعد میں ساری دُنیا میں آزادی کے بے شمار الاؤ روشن کر دیے۔ کشمیر کے باشندے بھی صدیوں کے مظالم اور جبر و تشدد کے میناروں کو اپنے خون کی موجوں سے خستہ و خراب بنا رہے تھے اور اُس دن بھی جولائی کی تیرہویں تاریخ تھی۔

میں اُن دنوں فتح کدل والے کمرے سے نواب بازار کے ایک مکان میں آ گیا تھا۔ اُدھر تحریک کا اُبھار جوں جوں بڑھتا جاتا تھا۔ میرے کمرے میں آمد و رفت کا سلسلہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ گیراج کے مالک بھی مجھے اب اس کے اوپر والے کمرے میں ٹھہرانے کے روادار نہیں تھے۔ اغلب ہے کہ اُن پر حکومت کی طرف سے مجھے بے دخل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ بہر حال ۱۳ر جولائی کو میں اِس نئے مکان میں جو نواب بازار پل کے بالکل پاس نالہ کے کنارے پر بے مقیم تھا۔ مشیت کو جو منظور تھا اُس کا اشارہ اُس دن کے موسم سے ملا۔ کوئی دوپہر کے وقت ایسی آندھی چلی کہ خدا کی پناہ۔ اور چار بجے کے قریب تو بالکل اندھیرا چھا گیا۔ یہ سماں اتنا غیر معمولی تھا کہ شیکسپیئر کے اُن ابیات کی یاد آ جاتی تھی جو اُس نے "جولیس سیزر" میں لکھے ہیں:

BUT NEVER TILL TO NIGHT, NEVER TILL NOW,
DID I GO THROUGH A TEMPEST DROPPING FIRE
EITHER THERE IS A CIVIL STRIFE IN HEAVEN
OR ELSE THE WORLD TOO SAUCY WITH THE GODS,
INCENSES THEM TO SEND DESTRUCTION.

ترجمہ: "میں نے اس سے پہلے (ایسی)
کوئی شعلہ بار آندھی نہیں دیکھی

یا تو آسمان میں کوئی ہاہاکار مچی ہے
یا دُنیا، دیوتاؤں سے بیزار ہو کر،
اُنہیں تباہی نازل کرنے پر اُکسا رہی ہے۔"

میں اس ماجرے سے حیران تھا کہ ایک نوجوان ہانپتے کانپتے میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ اِس لیے اُس کے بیان میں ربط نہ تھا۔ اُس نے کہا کہ جیل میں "مارشل لا" ہو گیا ہے اور گولیوں سے بہت آدمی مارے گئے ہیں۔ میں نے پہلے یہ خیال کیا کہ یہ نوجوان مارشل لا کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ ممکن ہے جیل میں کچھ گرفتاریاں ہوئی ہوں۔ جس کو یہ مارشل لا کا نام دے رہا ہے۔ لیکن جب نوجوان تھوڑا سا سنبھل گیا تو اُس نے یہ اطلاع دی کہ عوام کا ہجوم لاشوں اور زخمیوں کو لے کر ایک جلوس کی صورت میں شہر کی طرف آ رہا ہے۔ اس خبر سے مجھے سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ ایک تو قیمتی جانوں کے اتلاف کا صدمہ تھا۔ دوسری یہ فکر تھی کہ کہیں معاملہ بگڑ کر فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار نہ کرے۔ مولوی عبد الرحیم اتفاق سے میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کو فوراً یہ ہدایت دے کر روانہ کر دیا کہ وہ عوام کو جامع مسجد سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ اور شہداء کے جسد اور زخمیوں کو جامع مسجد میں ہی روک رکھیں۔ تھوڑی دیر بعد مولوی عبد الرحیم واپس آ گئے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو سمجھانے بجھانے کی اُن کی تمام کوششیں اکارت گئی تھیں۔ اور لوگ زخمیوں کو لے کر مہاراج گنج کے شفا خانے کی طرف چل پڑے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ خبر دی کہ لوگ سخت مشتعل ہیں اور زینہ کدل و بہوری کدل میں لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ یہ دہشت انگیز خبر سن کر میں خود بھی جائے واردات کی طرف چل پڑا۔ پوچھ تاچھ سے پتہ چلا کہ

لوٹ مار کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ چند مسلمان ایک شہید کا جسد لے کر اُس کے مکان واقع وازہ پورہ کی طرف جا رہے تھے اور ایک اور زخمی کو دوسری چارپائی پر طبی امداد کے لیے مہاراج گنج ہسپتال لا رہے تھے۔ جب یہ مہاراج گنج پہونچے تو پنجاب کے ہندو دوکانداروں نے، جو مہاراج گنج میں بیٹھ کر کشمیر کی ساری تجارت پر پنجہ جمائے ہوئے تھے، اُن کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا تھا۔ جب غمزدہ مسلمانوں نے کھتری دوکانداروں کو انسانی ہمدردی کے طور پر اس خونِ ناحق پر دوکان بند کرنے کو کہا تو ان سیٹھ ساہوکاروں نے دِلاسا دینے کی بجائے انھیں کوسنا شروع کر دیا۔ اس پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چند مسلمانوں نے کچھ ہندو دوکانداروں پر حملہ بول دیا اور اُن کا مال و اسباب اِدھر اُدھر پھینک ڈالا۔ ایسے موقعوں پر بدمعاشوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر لوٹ کا مال اپنے گھروں میں بھی چھپایا مگر جب حالات معمول پر آ گئے تو پولیس کی تلاشی کے دوران نہ صرف یہ مال برآمد کیا گیا بلکہ اُن کے ذاتی اثاثے پر بھی ہاتھ صاف کر لیا گیا۔

میں جب زینہ کدل بازار سے گذر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمی کپڑے کے تھان اُٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ بہر حال میری منزل جامع مسجد تھی وہاں میں نے قتلِ عام کا یہ سفاکانہ منظر دیکھا تو میرے آنسو چھلک پڑے۔ لیکن یہ گریہ و زاری کا موقع نہ تھا۔ میں نے شہداء کی لاشوں کو ایک قطار میں چارپائیوں پر رکھوایا۔ ہماری کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے، کوئی وسیلہ بہم نہ تھا۔ حکومت ان کی خبرگیری کے بدلے اپنی سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اُدھر ہم زخمیوں کی دیکھ بھال کی تدابیر کر رہے تھے اُدھر حکومت نے (CARALRY) رسالہ فوج کا ایک دستہ مہاراج گنج کی طرف روانہ کیا۔ نیزوں سے مسلح گھوڑ سوار سپاہیوں نے مار پیٹ اور بے حُرمتی کا طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔ اور مسلمانوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ کسی نہ کسی طرح نمائندگان میں سے چند اصحاب جامع مسجد پہونچ گئے۔ جن میں میرواعظ محمد یوسف شاہ، خواجہ غلام احمد عشائی اور خواجہ سعدالدین شال کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جامع مسجد کے اندر چاروں طرف آہ و بکا کا شور برپا تھا۔ شہیدوں اور زخمیوں کے عزیز و اقارب اُن کی چارپائیوں کے ارد گرد دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اور ہم بہ صد جبر اپنے دل کے زخموں کو چھپائے اُن کو دِلاسا دے رہے تھے۔ اِتنے میں ایک زخمی نے، جو جان کنی کی حالت میں تھا، مجھے اِشارے سے اپنے پاس بُلا لیا۔ اور اپنی نحیف آواز میں مجھ سے یوں مخاطب ہوا "شیخ صاحب! ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے، اب آپ کی ذمہ داری ہے، قوم سے کہیے کہ وہ اپنا فرض نہ بھولیں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہی اُس نے آخری ہچکی لی اور اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ کچھ دیر کے بعد نواب خسرو جنگ فوجی وردی زیب تن کئے ہوئے جامع مسجد میں آئے۔ اُن کے چہرے بشرے پر پشیمانی تھی۔ لیکن جب اُنھوں نے ہمیں بہلانے کے لئے زبان کھولی تو میں نے شہداء کی خون سے لت پت لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ اس قتلِ عام کے بعد محض زبانی جمع خرچ سے مسلمانوں کے دلوں پر پھاہا رکھنا مشکل ہے۔ ہم ان شہداء کے خون کا بدلہ لے کر رہیں گے اور قوم کے کھوئے ہوئے حقوق کی، جو امانت اُنھوں نے ہمارے سپرد کی ہے اُس کو واپس حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

رات ہونے لگی تو ہم نے مسجد کے چاروں دروازے بند کروا دیے تاکہ حکومت کے کارندے تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر قزاق بن کر نہ آئیں اور شہیدوں کی لاشوں کو اُٹھا کر نہ لے جائیں۔ ہم نے جوانوں کی ایک ٹولی کو رات بھر لاشوں پر

پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے سمیت مسجد کے نواح میں ایک مکان میں رات بسر کرنے کے لیے چلا گیا۔ نیند تو خیر کیا آتی۔ اختر شماری کرتے رہے۔ رات کو میں حالات کا جائزہ لینے کے لئے باہر آیا تو ایک گڑھے میں گر پڑا۔ کچھ زخم لگے۔ مرہم پٹی کروانی پڑی۔ لیکن اُس وقت میرے زخموں کی اہمیت ثانوی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس شام کو شہر میں کسی مسلمان گھر میں نہ چولہا جلا اور نہ خورد و نوش ہوا بلکہ سارے شہر میں ایک قومی ماتم کا سماں چھا گیا۔ ۱۴ر جولائی کی صبح ڈوگرہ فوج نے جامع مسجد کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔ جگہ جگہ مشین گن نصب کر دیے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی غنیم پر چڑھائی کی جا رہی ہے۔ مہاراجا کی فوجوں کے سربراہ ایک انگریز بریگیڈیر سدرلینڈ تھے۔ وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر گوپال تھاپا کے ساتھ موقع پر پہونچ گئے۔ میں مسجد کے اندر تھا۔ لیکن جب میں نے سُنا کہ میری گرفتاری کا حکم ہے تو مسجد سے باہر آیا۔ سدرلینڈ کی مجھ سے مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے اچانک میرا نام پوچھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میرا ہی نام عبداللہ ہے تو اس نے تھاپا کو حکم دیا کہ مجھے اُسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔ تھاپا نے فوراً میرا بازو پکڑ لیا۔ لیکن میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا کہ میں اپنی مرضی سے گرفتار ہونے کو تیار ہوں۔ مجھے فوراً حراست میں لے کر ایک پولیس گاڑی میں بادامی باغ کی چھاؤنی کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں مجھے میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ تانگے پر سوار تھے میں نے اُنہیں بآوازِ بلند پکارا، اپنی گرفتاری سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ اب صورتِ حال کو سنبھالیں۔ چھاؤنی پہونچا کر مجھے ایک کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ رات کو میرے ساتھیوں مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار کو بھی گرفتار کر کے

میرے پاس پہونچا دیا گیا۔

جموں شہر سے جو چار نمائندے چُن لیے گئے تھے وہ چند دن پہلے سرینگر پہونچ گئے تھے۔ ہم نے اُن سے رابطہ قایم کر لیا تھا اور گاؤ کدل کے نزدیک ایک ہاؤس بوٹ میں اُن کے قیام و طعام کا بندوبست کیا تھا۔ ۱۳ر جولائی کو حالات بگڑ گئے تو اُن میں سے تین نمائندوں، چودھری غلام عباس، سردار گوہر رحمان، اور مستری یعقوب علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر معنی خیز طور پہ شیخ عبدالحمید ایڈوکیٹ پر ہاتھ نہ ڈالا گیا۔ یہ نمائندے ہم سے پہلے ہی بادامی باغ کے دوسرے کوارٹر گارڈ میں پہونچا دیے گئے تھے۔ ہماری گرفتاری کے بعد تحریک کی باگ ڈور میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ، خواجہ غلام احمد عشائی، خواجہ سعدالدین شال اور باقی نمایندگان کے ہاتھ میں رہی۔ اُن کے سامنے اوّلین مسئلہ شہداء کی تجہیز و تکفین کا تھا۔ حکومت اس سلسلہ میں نمازِ جنازہ یا کسی جلوس کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اِس موقع پر خواجہ نور شاہ نقشبندی کو یہ خیال آیا کہ اِن شہیدوں کو کسی جگہ ایک ساتھ دفن کر دینا چاہیے۔ تاکہ یہ مقدس یادگار قوم کی اُمنگیں جگاتی رہے۔ اُنھوں نے حکومت کے اہلکاروں کے حواس پر خاک ڈالتے ہوئے کہا کہ درگاہ نقشبندیہ کے مزار میں اِن کو اکٹھے دفن کرنے کی اِجازت دی جائے۔ تاکہ شہیدوں کو اپنے اپنے محلے کے قبرستان میں لے جانے کی نوبت نہ آنے پائے۔ جس سے ہجوم جمع ہو سکتے ہیں۔ نواب خسرو جنگ اِس تجویز کے دور رس عواقب کا یا تو اندازہ نہیں کر سکے۔ یا وقتی مصلحت کا پاس کرتے ہوئے اِس پر آمادہ ہو گئے اور اِس طرح سے شہیدوں کو اس خانقاہ کے صحنِ پاک میں ابدی نیند سُلا دیا گیا۔ اور اُس وقت سے لے کر یہ جگہ ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کا اُفق بن گئی ہے۔ ہر سال ۱۳ر جولائی کو یہ مزار برادرانِ وطن

کی آہوں سے معطر اور اشکوں سے منور ہو جاتا ہے ۔ جب تک کشمیریوں کے دل میں قومی غیرت کا چراغ روشن ہے یہ قومی یادگار شاداب اور بارونق رہے گی ۔ اور وہ اس الاؤ سے خلوص، اعتقاد اور جدوجہد کے شرارے چنتے رہیں گے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

▲▲▲

٭

۱۱

جس کشمیر کو خون سے سینچا...

کشمیری جانبازوں کے سینوں کی فصیل چیر کر خون کی ندیاں بہانے والی ڈوگرہ سرکار گھبراہٹ میں اپنے بدترین ہتھکنڈوں پر اُتر آئی اور مضافات میں مارشل لاء نافذ کر کے دہشت کا عالم پیدا کیا گیا۔ ہر طرف فوج پھیلا دی گئی ۔ اور گھوڑ سوار نیزہ بردار سپاہی سڑکوں پر گشت کرتے رہے ۔ لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا اور سینکڑوں لوگوں کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ فوج اور پولیس کے بل بوتے پر مسلمانوں پر اُن علاقوں میں جہاں اُن کی تعداد زیادہ نہ تھی، حملے کیے گئے ۔ اُن کی جائدادیں لوٹی گئیں اور انہیں بے عزت کر دیا گیا۔ لوگوں سے بندوق کی نوک پر مہاراجا کی جے کے نعرے لگوائے جاتے تھے ۔ لیکن شہر میں مکمل احتجاجی ہڑتال رہی اور حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود دوکان داروں نے دوکانیں کھولنے سے انکار کر دیا۔ ساری وادی میں زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی اور لوگوں نے اپنا کاروبار بھی چھوڑ دیا۔

اُدھر میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ بادامی باغ کے کوارٹر گارڈ میں پڑا سڑ رہا تھا۔ ہم باہر کے حالات سے متعلق ناواقف تھے ۔ ایک رات یوں ہوا کہ اچانک کوارٹر گارڈ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہمیں باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ اب ہم چند

پولیس آفیسروں کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ہتھکڑیاں ہمارے ہاتھوں میں ڈالنے کے لیے جھنجھنائیں۔ گلکار صاحب نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی دونوں ہتھیلیاں پیش کرتے ہوئے کہا "لو پہناؤ! ہمارے لیے یہ لوہے کی زنجیریں نہیں بلکہ سونے کے کنگن ہیں۔" ہم کو ایک لاری میں سوار کرکے کڑے فوجی پہرے میں بٹھا دیا گیا۔ لاری میں فوجیوں کی بڑی تعداد بندوقیں تانے بٹھا دی گئی تھی۔ پہلے تو ہم اس خیال میں رہے کہ ہمیں کشمیر سے باہر کسی مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ لیکن تھوڑی دور چلنے کے بعد گاڑی کا رُخ شمال کی طرف ہوا تو ہم سمجھے کہ ہمیں سنٹرل جیل لے جایا جا رہا ہے۔ رات کا سناٹا تھا لیکن ناکوں پر فوج پہرہ دے رہی تھی اور ہر موڑ پر مشین گن چڑھا دیے گئے تھے۔ ہماری گاڑی سنٹرل جیل جانے کی بجائے کاٹھی دروازے میں مُڑ گئی۔ ہماری منزل اب صاف طور پر ہری پربت کا قلعہ تھا۔ مندر کے قریب ہمیں لاری سے اُترنے کے لئے کہا گیا۔ ہم کو پگڈنڈی سے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے کہا گیا۔ جس کے اُوپر قلعہ واقع ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہمیں دو دو کمبل ساتھ اُٹھانے کے لئے بھی کہا گیا۔ یہ بالکل محال تھا کیونکہ ہمارے دونوں بازو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہم نے کمبل اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے تو وہاں کھڑے ایک فوجی دستے نے، جو بندوقیں تانے ہوئے تھے، ہمیں گھیر لیا۔ قلعے کا دروازہ کھلا تو ہمیں ایک اور فوجی دستہ کھڑا نظر آیا۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ "تم میں سے پہلے کون اس کوٹھری میں جائے گا؟" ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ہماری آخری گھڑی آن پہنچی ہے اور ہمیں اس کال کوٹھری کے اندر لے جا کر کسی اندھے کنویں میں دھکیل دیا جائے گا۔ ڈوگرہ شاہی ابتدا سے ہی اس قلعے میں اپنے باغیوں اور سرکشوں کو تہ تیغ

کرتی رہی تھی اور اس کا ذکر ہم نے بھی سُن رکھا تھا۔ اب ہم موت کے اس کنویں کے آمنے سامنے تھے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہم ڈرنے کی بجائے ایک اور کشمکش میں لگ گئے۔ ہم تینوں میں سے ہر ایک سب سے پہلے اندر جا کر شہادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گلکار صاحب تو بالکل ہی مچل رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہو کر خاصی بلند آواز میں کہا کہ آپ لوگ مجھے اپنا لیڈر تسلیم کر چکے ہیں۔ لہذا مجھے ہی پہلے اندر جانے کی سعادت بخشو۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب ہماری قوم کو ہماری غیر موجودگی میں تحریک کو زندہ رکھنا ہوگا۔ ویسے بھی مومن کی نگاہ دُنیا سے زیادہ آخرت پر ہوتی ہے۔ ہماری جُدائی عارضی ہوگی اور ہم دوسری دنیا میں پھر گلے ملیں گے۔" فوجی چُپ چاپ میری اس گفتگو کو سُن رہے تھے اور کچھ تو خاصے مُتاثر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب لوگ ڈوگرے تھے۔ اور ایک ظالم سرکار نے انہیں یہ ناخوشگوار کام سونپ دیا تھا۔ ورنہ من حیث القوم تو یہ بڑے بھولے بھالے اور شریف ہوتے ہیں۔ میرے دو ساتھی بھی میرے اصرار کے آگے بے بس ہو گئے۔ میں اپنے دو کمبل لے کر کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف قبر کا سا گھُپ اندھیرا تھا۔ کسی کھڑکی اور روزن وغیرہ کا نشان تک نہ تھا۔ زمین ننگ دھڑنگ اور نم آلود تھی۔ میں کھڑا رہا۔ باری باری میرے دو ساتھی بھی اندر آ گئے۔ اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ناٹک ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے رچایا گیا تھا۔ بہر حال ہم چند کمبل بچھا کر پڑے رہے۔ اور اس اُدھیڑ بن میں پڑ گئے کہ بیرونی دنیا سے کیسے رابطہ قایم کریں؟ غلام نبی گلکار کا دماغ ایسی اسکیموں کے لیے بڑا چلتا پُرزہ تھا۔ انہوں نے اپنا کوڈ تجویز کر لیا۔ اب اس بات کی تلاش ہوئی کہ کس ذریعے سے اپنا پیغام باہر اپنے ساتھیوں تک پہنچائیں۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب

ڈاکٹر عبدالقادر نامی ایک صاحب ہمارا ملاحظہ کرنے کے لئے آتے۔ مجھے رات کو سردی لگنے سے ہلکا سا نمونیا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کوٹھری کی حالت دیکھی تو سپاہیوں سے سفارش کر دی کہ ہمیں دن میں دھوپ میں بیٹھنے کی اِجازت دی جائے۔ چنانچہ جب باہر آئے تو دیکھا کہ قلعہ کے نچلے طبقے میں چودھری غلام عباس، مستری یعقوب علی، اور سردار گوہر رحمان کو زیرِ حراست رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے کھانے وغیرہ کے متعلق ہدایات دے کر رخصت ہو گئے۔ اِس کے بعد روزانہ وہ قلعہ کے اندر آتے رہے۔ سلام و دعا کے بعد وہ "اَل آن کما کان" دُہراتے تھے۔ جس سے یہ اِشارہ مقصود ہوتا تھا کہ باہر کے حالات جوں کے توں ہیں۔ باورچی، نائی وغیرہ فوجی پہرے میں آتے جاتے تھے۔ لہٰذا وہ ہمارے ایلچی نہ بن سکتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ پہرے دار ہی ہمارے دوست بن گئے اور ہم اُن سے ہی شہر کی خبریں سُننے لگے۔ شہر میں پورے اکیس۲۱ دن تک مکمل ہڑتال رہی۔ وہ ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے لیڈروں کو رہا کرو۔ فوج نے بڑی کوشش کی تھی کہ ہڑتال ٹوٹ جائے لیکن لوگ بڑے ظلم و تشدد کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اُنہیں توڑنے کے لئے عوام کو ہر پُل پر ایک ٹانگ پر کھڑا کر کے چلنے کو کہا جاتا اور مہاراجہ بہادر کی جے کا نعرہ لگانا پڑتا تھا۔ سڑکوں پر عوام کو پیٹ کے بل رینگنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ جب یہ حربے بھی ناکام ہو گئے تو فوج نے شہر میں روٹ مارچ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر گلیوں میں دھما چوکڑی مچا دیتے تھے اور لوگوں کو اپنے جنگی سامانِ ہلاکت کا مظاہرہ کر کے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بالآخر زِچ ہو کر حکومت نے عشائی صاحب، میر واعظ محمد یوسف شاہ، مولوی عبداللہ وکیل اور خواجہ نور شاہ نقشبندی کو ہمارے پاس بھیجا کہ سمجھوتے کی کوئی

سبیل پیدا ہو اور زندگی پھر معمول پر آ سکے۔ حکومت کا منشا تھا کہ ہمیں گرفتار شدگان کی طرف سے تحریری ضمانت مِل جائے کہ آئندہ ہم باغیانہ تقریریں نہیں کریں گے۔ ہم نے ایسا کرنے سے اِنکار کر دیا۔ ہم نے یہ دلیل پیش کی ہم اپنے حقوق اور انصاف چاہتے ہیں۔ اِس میں بغاوت کا کیا سوال ہے؟" ہم نے نہ بغاوت کی ہے اور نہ کریں گے۔ حکومت تنگ آ چکی تھی۔ اِس لئے اِتنی ہی یقین دہانی کافی سمجھی اور اکیس۲۱ دن کے بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔

ہماری رہائی سے ماحول میں یک لخت تبدیلی پیدا ہو گئی۔ عوام کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ رہا۔ لوگ اس رہائی کو اپنی فتح کی نوید سمجھنے لگے۔ چند دِن کے بعد میں نے جامع مسجد کے ایک اِستقبالیہ جلسے میں تقریر کی اور عوام کو عزم و ہمت سے کام لینے کی تلقین کی۔ اور یہ بھی کہا کہ مکمل فتح منزل انشاءاللہ ہماری ہو گی۔

کشمیر میں جو تقدیر ساز واقعات رونما ہو رہے تھے اُن کی گونج کشمیر کے باہر اور خاص طور پر پنجاب میں زور و شور سے سُنائی دینے لگی۔ بدقسمتی سے وہاں کے ہندو پریس نے اس ہل چل کو ظالم اور مظلوم کی کش مکش کے روپ میں دیکھنے کی بجائے تعصب کی عینک لگا کر دیکھنا پسند کیا اور اس تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ بعد میں ہماری تحریک کے ہر اہم اُتار چڑھاؤ پر اخبارات نے اسی روش کو اپنا مسلک بنایا۔ اُن دنوں لاہور کے تین روزنامے "ملاپ" "پرتاپ" اور "ٹریبیون" خاص طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ اور وہی کشمیر کی تحریک کے متعلق شوشہ بازی کرنے میں پیش پیش تھے۔ دراصل پردے کے پیچھے کشمیر کے ایک ہندو وزیر مسٹر پی۔ کے۔ وائل تار ہلا رہے تھے۔ مسٹر ویکفیلڈ مہاراجہ ہری سنگھ کے منظورِ نظر تھے۔ اور اُس نے اُن کو ریجنسی کونسل کا چیئرمین مقرر کر دیا تھا۔ مسٹر وائل کو یہ بات

ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اور وہ ویکفیلڈ صاحب کا پتّہ کاٹ کر خود وزیرِاعظم بننا چاہتے تھے۔ لہٰذا مسٹر واتل کی شہ پر ہندو پریس نے مسٹر ویکفیلڈ پر بھانت بھانت کے الزام عائد کر دیے اور آخر کار مہاراجا نے اُن کو بڑی بے عزتی کے ساتھ نکال باہر کر دیا۔ اُدھر واتل صاحب بھی اپنا مُنہ لے کر رہ گئے۔ کیونکہ وہ ایک تو وزیرِاعظم نہ بن سکے اور دوسرے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ مہاراجہ نے راجہ ہری کرشن کول کو وزیرِاعظم مقرر کیا۔ جو تھے تو پنجاب کے رہنے والے لیکن کشمیر کی سرزمین سے بھی رشتہ جتاتے تھے۔ اور یہاں اُن کی جاگیریں بھی تھیں۔ اس کے برعکس غیر جانبدار اخبارات اور مسلم پریس نے تحریک کی حمایت اور کشمیر کی سخت گیرانہ پالیسی کی شدید نکتہ چینی کی۔ اخبار "انقلاب" لاہور کے مدیران مولانا مہر اور مولانا سالک نے جو ابتدا سے ہی ہماری پیٹھ ٹھونک رہے تھے، اپنا سارا زورِ قلم صرف کر کے ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم کو بے نقاب کر دیا۔ کشمیر کے حالات نے جو کروٹ لی تھی اس نے پنجاب کے باضمیر لوگوں کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ ان میں بہت سے لوگوں کی رگوں میں کشمیری خون دوڑ رہا تھا۔ کیونکہ اُن کے آبا گذشتہ صدیوں میں کشمیر میں رُونما شدہ ابتری سے گھبرا کر ہجرت کر گئے تھے۔

علامہ اقبال اسی معزز صف کے میرِ کارواں تھے۔ اور انہوں نے اپنے قابلِ لحاظ اثر کو استعمال میں لا کر کشمیریوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ ۲۴ جولائی کو میاں فضلِ حسین نے مسلمانوں کا ایک جلسہ کُل ہند بنیادوں پر طلب کیا۔ یہ جلسہ سر ذوالفقار علی خان کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ اور اس میں چند سرآوردہ اصحاب نے شرکت کی۔ اجلاس میں کشمیری مسلمانوں کی موثر امداد کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کیا گیا اور کشمیر کمیٹی کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جماعت قادیان کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کمیٹی کے صدر اور مسٹر عبدالرحیم درد اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ہم

ابھی قلعہ ہری پربت میں ہی بند تھے کہ کمیٹی کا ایک وفد حالات کا جائزہ لینے کے لئے خواجہ عبدالرحیم کی صدارت میں کشمیر پہنچ چکا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو کشمیر کمیٹی کی ہدایت پر سارے ہندوستان اور ریاست کے اندر زور و شور سے "یومِ کشمیر" منایا گیا۔ جس کا مقصد کشمیر کے حالات کی طرف دُنیا کی توجہ مبذول کرنا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے مقامات پر جلسے ہوئے اور قراردادیں پاس کی گئیں۔ سرینگر میں اُس دن عدیم النظیر ہڑتال رہی۔ مزارِ شہداء پر ایک عظیم اجتماع منعقد ہوا۔ جس میں ہزاروں کے قریب دُختران کشمیر نے بھی شرکت کی۔ مجمع اُس وقت زار و قطار گریہ کرنے لگا جب ڈوگرہ فوج کی گولیوں سے شہید ہونے والے نوجوانوں کے بچے اسٹیج پر آئے۔ وہ شہیدوں کے خون میں لت پت کپڑے بھی ساتھ لائے تھے۔ میں نے اِس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ شہیدوں نے اپنی جان قربان کر کے کشمیر کی نجات کی راہ روشن کی ہے اور اب ہمیں صبر و استقلال کے ساتھ اُن کے دکھائے ہوئے راستے پر گامزن رہنا چاہیئے۔ مولوی محمد یوسف شاہ اور کچھ دُوسرے ساتھیوں نے بھی تقریریں کیں۔

اُدھر راجا ہری کرشن کول بھانپ گئے تھے کہ مسلمانوں کے رہنماؤں سے رابطہ قایم کئے بغیر حالات پر قابو پانا مشکل ہے۔ مسٹر ویکفیلڈ جو ایک تجربہ کار افسر تھے، کو ایجی ٹیشن کی حوصلہ افزائی کے الزام پر نکال باہر کیا گیا تھا۔ اور اس وقت راجہ ہری کرشن کول نے مہاراجا کو یقین دلایا تھا کہ وہ تین ہفتے کے اندر بغاوت کی سرکوبی کریں گے لیکن اب حالات اُن کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ راجہ ہری کرشن کول نے مسلم رہنماؤں سے رابطہ قایم کرنے کے لئے ایک شطرنج کی سی چال چلی۔

نواب سر مہر شاہ پنجاب کے بڑے گدی نشین پیر صاحب کے صاحبزادے

تھے۔ اُن کے والد نے حزب اللہ نام کی ایک جماعت بنائی تھی۔ پنجاب میں اُن کا خاصا اثر رسوخ تھا۔ ایک تو مُریدوں کی حمایت حاصل تھی دوسرے حکومتِ ہند بھی اُن پر بڑی مہربان تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پنجاب میں راجہ صاحب نے شاہ صاحب کے خاندان کے ساتھ کافی پینگیں بڑھائی تھیں اور اب وہ اُنہیں کشمیر میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

پنجاب انگریزوں کے نُقطہ نظر سے بڑی اہمیت کا صوبہ تھا۔ اِس صوبے سے انگریز اپنی فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کرتے تھے۔ اس لیے اُنہیں یہاں کبھی سیاسی افراتفری کا اُبھار ہرگز پسند نہ تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند نے کافی تدابیر اختیار کی تھیں۔ مثلاً صوبے میں صنعت اور کارخانوں کو فروغ دینے کی بجائے زراعت پر زور دیا جاتا تھا۔ تاکہ محنت کشوں کی مرکزیت کی سبیل پیدا نہ ہو۔ زمین کے بڑے بڑے رقبے فوجی خدمات کے عوض تقسیم کیے جاتے تھے۔ اس طرح حکومت نے اپنے وفاداروں کے ذریعے دیہی زندگی پر گرفت کر رکھی تھی۔ دوسری طرف پیر پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو عام کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، پیروں اور گدی نشینوں کی سرپرستی کر کے اُن کے دائرۂ رسوخ کو وسیع کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اور پھر اُن کے ذریعے اپنے راج کی کھونٹیاں مضبوط کروائی جاتی تھیں۔ قادیان میں مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی جماعت کا ایک بڑا مرکز قایم کیا تھا اور اُنہیں انگریزوں کی واضح سرپرستی حاصل تھی۔ اس طرح پیر جماعت علی شاہ بھی ایک بڑے سجادہ نشین تھے۔ اور اُن کے عقیدتمندوں کی تعداد لاکھوں کے شمار میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران یہ فوجی بھرتی کو کامیاب بنانے کے لیے لوگوں کو تعویذ گنڈے یہ کہہ کر دیتے تھے کہ اگر وہ اِنہیں باندھ لیں تو ان کی برکت سے اُنہیں جنگ میں گولی نہیں لگے گی۔ سید مہر شاہ صاحب نے شاید نواب کا خطاب ایسی ہی خدمات کے صلے میں حاصل کیا تھا۔ بہرکیف سید مہر شاہ نے سرینگر آکر مسلم نمائندگان اور حکومت کے درمیان رابطے کا کام انجام دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک سمجھوتہ طے ہوا۔ جس پر مسلمانوں کی طرف سے اُن کے نمائندوں نے دستخط کیے اور حکومت کی طرف سے راجہ ہری کرشن کول وزیرِ اعظم نے۔

یہ سمجھوتہ وزیرِ اعظم کی رہائش گاہ پر طے پایا۔ اور اِس کی شرائط طے کرنے میں مولوی یوسف شاہ، مولوی عبداللہ وکیل اور خواجہ سعد الدین شال نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ عثمانی صاحب کسی مصروفیت کی وجہ سے شریک بحث نہ ہو سکے۔ اِس لیے اُن کو رات گئے ایک سرکاری گاڑی بھیج کر بلایا گیا۔ آتے ہی اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا سب نمائندگان نے سمجھوتے پر دستخط کر لیے ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُنہوں نے کہا کہ لایئے پھر میں بھی دستخط کر دوں۔ اور کسی تامّل کے بغیر اپنے دستخط کر دیے۔

مجھے سمجھوتے کے متن سے زیادہ اس کے سیاسی اور نفسیاتی عواقب پر اطمینان تھا۔ اور اِس لحاظ سے یہ ہماری فتح کے برابر تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ پہلا سمجھوتہ تھا جس پر مسلمان نمائندگان کے بالمقابل ریاست کے وزیرِ اعظم نے اپنے دستخط کیے تھے۔ اور اِس طرح سے ہمیں برابر کا فریق تسلیم کر لیا تھا۔ دوئم ہمیں حالات کا جائزہ لینے اور اپنی صفوں کی ترتیب کے لیے کچھ وقفے کی ضرورت تھی۔ جو اس سمجھوتے کی بدولت ہمیں ہاتھ آ رہا تھا۔ ۱۳ جولائی کا سانحہ ایک دھماکے کی صورت میں رونما ہوا تھا۔ اور اِس کے بعد حالات تیزی کے ساتھ کروٹیں لے رہے تھے۔ ہمیں اِس نئی تبدیلی کے امکانات پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ ہماری

تحریک عام طور پر ابھی شہر سرینگر تک ہی محدود تھی۔ مضافات میں عوام واقعات کی اصل نوعیت سے واقف نہ تھے۔ میرے نام کا تو اب ڈنکا بجنے لگا تھا۔ خوش اعتقادوں نے درختوں کے پتوں پر "شیرِ کشمیر" کے حروف کے رقم ہونے کی شہرت کر دی تھی۔ اس بات کا اتنا چرچا ہوا کہ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے راج محل میں ایسے پتوں کو بچشم خود ملاحظہ کرنے کیلئے طلب کر لیا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ میری شکل سے ابھی ناآشنا تھے۔ ہم نے سمجھوتے کی ایک شرط کے تحت یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ ہم وادی کے اہم قصبوں کا دورہ کر کے عوام کو صبر و سکون سے رہنے کی تلقین کریں گے۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے ہمارے لیے ٹرانسپورٹ مہیا کرنے کی بھی ذمہ داری لی تھی۔ اور میں اسے تحریک کو وسعت دینے اور اس کی عوامی بنیاد وسیع کرنے کا سنہری موقع خیال کرتا تھا۔

▲▲▲

١٢

غلط فہمی اور اس کا ازالہ

ہم نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے وادی کے اہم قصبوں کا دورہ کرنے کا آغاز کر دیا۔ اب پہلی بار تحریک اپنے قلب سے باہر پھیل رہی تھی۔ ہم نے اسلام آباد، سوپور وغیرہ میں بھاری جلسے منعقد کیے۔ وہاں ہمارا بڑے اشتیاق سے استقبال ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری وادی ایک لمبی نیند سے انگڑائی لے کر اٹھی ہے اور ایک نئی صبح سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ اور ہم نوجوانوں کی قسمت میں بقولِ اقبال قدرت نے یہ سعادت رکھی ہے ؏

ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا

ہم نے ان کمیٹیوں کے نام پر اپنی تنظیم کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑا کیا۔ اور ایک فائدہ اس سمجھوتے کا یہ ہوا کہ حکومت نے پہلے ہی وار میں جن سینکڑوں افراد کو فرضی جرائم میں کال کوٹھڑیوں میں دھکیل دیا تھا اور بہت سے ملازمین کو معطل یا برطرف کیا گیا تھا اُن کی نجات کی بھی سبیل نکل آئی اور میں اس کو ایک اہم کامیابی تصور کرتا تھا۔ کیونکہ اس طرح سے عوام کا حوصلہ بنے رہنے کی تدبیر ہو گئی تھی۔ اگرچہ ذاتی طور پر میں جانتا تھا کہ وزیرِ اعظم اپنے اقرار کا پابند نہیں رہے گا لیکن میں حکومت کے ساتھ بڑی شکر

کے لیے منصوبہ تیار کرنے کی مہلت چاہتا تھا اور اس سمجھوتے نے اِس کی راہ ہموار کر دی تھی۔

لیکن سمجھوتے کا اعلان ہونا تھا کہ اس کی نسبت زبردست بدگمانیاں پیدا کی گئیں۔ عوام پر اس قدر اثر ڈالا گیا کہ انہوں نے ہمیں ہی کوسنا شروع کر دیا۔ حکومت کے ایجنٹ میدان میں تھے اور انہوں نے عوامی ہمدردی کی نقاب پہن کر عوامی غیظ و غضب کا رُخ ہماری جانب پھیرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ہم پر غداری کا الزام عائد کیا گیا۔ رات کو مشتعل نوجوانوں کا ایک گروہ چھریاں لے کر میری رہائش گاہ پر پہنچا۔ مگر اتفاق سے میں وہاں پر موجود نہ تھا۔ اور اِس طرح بلا ٹل گئی۔ بعد میں مجھے یہ چونکا دینے والی اطلاع ملی کہ مولوی محمد عبداللہ وکیل نے انہیں میرے خلاف اکسایا تھا۔ حالانکہ یہ بزرگ سمجھوتے پر دستخط کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ مجھے آج تک اُن کے اِس اِقدام کی وجوہات سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔ بہرحال۔ ہم نے ایک بڑی ہی کشیدہ صورتحال میں نمائندوں کی ایک خاص میٹنگ مولوی یوسف شاہ صاحب کے گھر پر بلائی۔ اُدھر ہم حالات کا جائزہ لے رہے تھے اِدھر میرواعظ منزل کے باہر مشتعل مسلمانوں کا ایک بھاری ہجوم جمع ہو گیا۔ اُن کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا قائل کر دیا گیا تھا کہ نمائندگان حکومت کے ہاتھوں میں بِک گئے ہیں۔ خود میٹنگ کے اندر مولوی یوسف شاہ کے چھوٹے بھائی مولوی یحییٰ بڑے بگڑے ہوئے تھے۔ وہ سمجھوتے کا سارا الزام عشائی صاحب کو دے رہے تھے۔ عشائی صاحب بھی بڑے زود اِشتعال تھے۔ دونوں کے درمیان تو تو میں میں کی نوبت آگئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے مولوی یحییٰ کو بتایا کہ عشائی صاحب کو موردِ الزام ٹھہرانا سراسر زیادتی ہے۔ کیونکہ وہ تو سمجھوتے پر پہلا دستخط ثبت ہونے کے وقت تک وہاں

پر موجود ہی نہ تھے۔ لیکن یحییٰ صاحب بدستور غضب ناک رہے۔ وہ ضد کرتے رہے کہ عشائی صاحب مجلسِ نمائندگان سے اِستعفیٰ دے کر نکل جائیں۔ عشائی صاحب بھی ترنگ میں آ کر مائل ہونے لگے۔ اس مرحلے پر میں نے اپنا لہجہ بلند کر کے اِنتباہ دیا کہ عشائی صاحب کو استعفیٰ کی اِجازت دی گئی تو میں بھی اُن کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ ایک بے گناہ ساتھی کو عوام کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے قربانی کا بکرا بنانا انصاف کا خون ہو گا۔ سچائی کا تقاضا ہے کہ ہم جرأت اور ہمت کے ساتھ سمجھوتے کی ذمہ داری قبول کریں۔ عوام کے سامنے جائیں اور انہیں اس کی افادیت پر قائل کریں۔ میرواعظ یوسف شاہ کی سادہ لوحی کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ وہ مجھے ایک طرف اُٹھا کر لے گئے اور پوچھنے لگے کہ کہیں عشائی صاحب نے واقعی ہم لوگوں کو تو چکمہ نہیں دیا؟ میں نے حیران ہو کر اُن سے پوچھا کہ یہ باتیں آپ کہہ رہے ہیں؟ سمجھوتے کی شرائط طے کرتے وقت آپ وزیرِ اعظم سے ہم کلام تھے۔ بچارے عشائی صاحب تو وہاں موجود ہی نہ تھے۔ پھر چکمہ دینے کا سوال کہاں سے آیا؟ اور اگر سمجھوتہ کرنا واقعی غلط تھا تو اس کی ذمہ داری ہم سب کو قبول کرنی چاہیے۔ عشائی صاحب تو اس کے سب سے کم ذمہ دار ہیں۔ بالآخر طے پایا کہ جامع مسجد میں جلسہ بُلا کر عوام کے سامنے ساری صورتِ حال پیش کی جائے۔

اُدھر ہم میٹنگ میں مصروف اس سنجیدہ صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اِدھر میرواعظ منزل کے باہر عوام کا ایک بپھرا ہوا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اور ہمارے خلاف جذبات کے عالم میں شور و غوغا مچانے لگا۔ میٹنگ میں سناٹے کی سی کیفیت چھا گئی۔ اور میزبان حضرات تو سٹپٹانے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں کھڑکی سے لگ کر ایستادہ ہو گیا۔ میں نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے عوام سے کہا کہ وہ قومی قیادت کو ٹھنڈے دل و دماغ اور سکون کے ماحول میں سوچنے سمجھنے کا موقع دیں اور دیں

بے قابو ہوکر ہمیں کسی غلط اقدام کے لئے مجبور نہ کریں ۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا کہ ہم دباؤ میں آکر کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے ۔ جس سے قومی مقصد کو گزند پہونچنے کا احتمال ہو۔ چنانچہ عوام نظریں جھکائے مگر کچھ بڑبڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے ۔ اور میزبان صاحبان کی جان میں جان آئی ۔

چنانچہ سمجھوتے کے دو دن بعد یعنی ۲۸ اگست ۱۹۳۱ء کو جامع مسجد میں جلسہ ہوا ۔ شہر کی تقریباً ساری مرد آبادی اُمڈ آئی تھی ۔ مولوی یوسف شاہ نے معاہدے کی شرائط لوگوں کو سنائیں اور اس کا پس منظر بھی لوگوں کو سمجھایا ۔ میں نے اپنی تقریر میں سمجھوتے کے فوائد اجاگر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ کیا یہ ہماری جیت نہیں ہے کہ ایک مطلق العنان حکومت عوام کے نمائندوں سے برابری کی سطح پر اتر آئی ہے ؟ اگر حکومت ہم سے بغل گیر ہونا چاہتی ہے تو ہمیں اسے ایک موقع دینا چاہیئے ۔ اگر دو ماہ کی مقررہ میعاد میں اس نے اپنے وعدے پورے نہ کیے تو میں پہلا شخص ہوں گا جو کفن بردوش ہو کر صدائے احتجاج بلند کرے گا ۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ ہم پر اعتماد کرے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بڑی حد تک مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے ۔ کچھ لوگ تو جاتے وقت زار و قطار آنسو بہا رہے تھے ۔ کچھ دن بعد میں خواجہ سعد الدین شال اور عثمانی صاحب بارہمولہ ، سوپور ، اسلام آباد وغیرہ گئے ۔ سوپور میں کچھ لوگوں نے اُس وقت اسٹیج کی طرف جوتے پھینکے جب خواجہ سعد الدین تقریر فرما رہے تھے ۔ لیکن جب اُن کو ہم نے حقیقتِ حال سے روشناس کیا تو اُن کی غلط فہمی دور ہو گئی ۔ دونوں اطراف سے شرائط کی پابندی کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی کا اعلان ہوا ۔ جس میں صوفی محمد اکبر ، مولوی محمد یاسین ، حاجی رحیم ڈار ، اور محمد رجب بخش کو بطور ممبر چن لیا گیا ۔ اسی طرح بجبہاڑہ اور بارہمولہ میں بھی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ۔ اسلام آباد میں جو کمیٹی بنی اس میں منشی امیر الدین ،

خواجہ غلام محمد زندہ دل اور محی الدین ریشی کو بطور ممبر چن لیا گیا ۔

انہی ایام کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد کرنل ہاکسر کی معیت میں کشمیر آئے ۔ وہ کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے آئے تھے ۔ میں نے مولانا سے نواب خسرو جنگ کی کوٹھی میں ملاقات کی ، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے ۔ میں نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور اُنہوں نے تحریک کے مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے کچھ نصیحت آموز مشورے دیے ۔ بعد میں کوئی بائیس برس بعد مولانا صاحب نے اپنے ۹ جولائی ۱۹۵۳ء کے خط میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے لکھا تھا :

" میرے عزیز عبداللہ ! میرا آپ کے ساتھ ایک دوگانہ تعلق ہے ۔ ایک تو مسئلہ کشمیر کی نسبت ہے جو آپ کے ساتھ میری عوامی وابستگی کا نشان ہے ۔ دوسرے ذاتی اور نجی ۔ ۱۹۳۱ء سے آپ کو ایک عزیز دوست کی نظروں سے دیکھتا رہا ہوں ۔"

سرینگر میں انجمن نصرۃ الاسلام کے تحت ایک ہائی اسکول چل رہا تھا ۔ اس کی بنیاد میر واعظ رسول شاہ نے اس صدی کی کروٹ پر ڈالی تھی ۔ اس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا ۔ اس اسکول کے لیے میں نے شہر میں چندے کی مہم شروع کی تھی ۔ جہاں جہاں میں جاتا تھا ، لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے ۔ میں نے اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے اب حکومت کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا ۔ میں نے حکومت کو چیتاونی دی کہ اگر اس نے مقررہ وقت تک اپنے وعدے پورے نہ کیے تو ہم پھر میدان میں کود پڑیں گے ۔ اُدھر راجہ ہری کرشن کول بھی اپنے داؤ پیچ کھیل رہے تھے اور جوں جوں اُن کے داؤ غلط پڑتے جاتے تھے وہ سراسیمہ ہو کر ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے پر تول رہے تھے ۔ چنانچہ انہیں پھر یہی سوجھی کہ مجھے منظر سے ہٹانا ان کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اس طرح سے میری دوسری گرفتاری

کی مکمل تیاری کرلی گئی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کو میں ایک ہاؤس بوٹ میں اسلامیہ اسکول کے لیے چندہ لینے کے لیے داخل ہوا۔ واپس آیا تو مجھے پولیس کا ایک دستہ اِنتظار میں مِلا۔ ڈی، آئی، جی پولیس مسٹر عبدالعزیز خان نے مجھے بنڈ پر وزیر اعظم کے مکان کے عین سامنے گرفتار کرلیا اور سیدھا بادامی باغ چھاؤنی پہونچا دیا۔ میری ذات اب عوامی سمندر کے جوار بھاٹے کے ساتھ جڑ گئی تھی۔ اور مجھ پر ہاتھ ڈالنا اس سمندر کو للکارنے کے برابر تھا۔ یہ خبر بجلی کی سی تیزی سے شہر و دیہات میں پھیل گئی اور پھر سے عوامی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ ہڑتال، جلسے، جلوس، مظاہرے، یہ اب روزمرہ کی باتیں تھیں۔ تحریک کو چلانے کے لئے ایک حزب جنگ (وار کونسل) کے قیام کا اعلان ہوا، جو ہاتھ سے لکھے ہوئے پوسٹروں کے ذریعے، جنہیں رات کے گھپ اندھیرے میں دیواروں اور کھمبوں پر چسپاں کیا جاتا تھا، لوگوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ مفتی جلال الدین خانقاہ مُعلّیٰ کے اسٹیج سے وار کونسل کے پہلے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے عوام کے سامنے آئے۔ وہ کمسن تھے اور مجھے بعد میں بتایا گیا کہ جب وہ اِسٹیج پر آئے تو کانپ رہے تھے۔ لیکن جی کڑا کر کے چار لفظ بول ہی گئے۔ اور اُنہیں گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن لوگوں کا تانتا بندھا ہی رہا۔ اور پچیس ہزار کا مجمع لگ گیا۔ چونکہ مسجد کے باقی دروازے بند تھے اِس لیے صرف مشرقی دروازے پر ساری ریل پیل تھی۔ اُدھر لوگ اس کثرت سے آرہے تھے کہ اندر جانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دفعتاً رسالہ فوج کے چالیس سواروں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور کسی وارننگ کے بغیر مسلمانوں کے جم غفیر پر گھوڑوں پر سوار ہو کر چڑھائی کردی۔ اُن کی اِس سفاکانہ حرکت سے مجمع میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ دروازے کی طرف دوڑنے لگے۔ باہر تو

فوج نِشانہ باندھے کھڑی تھی۔ اُس نے مسجد کے دروازے پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کردی۔ خون کے فوارے چھوٹے اور دروازے کے سامنے انسانی لہو کا دھارا بہنے لگا۔ چار افراد وہیں دم توڑ گئے۔ درجنوں شدید زخمی ہوگئے۔ یہ سب خونی ڈرامہ چند منٹ میں ختم ہوگیا اور رِسالہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اس سارے ناٹک کے ہدایت کار گورنر ٹھاکر کرتار سنگھ تھے۔ اور فوج کا چیف آف اسٹاف سدرلینڈ خون کی اِس ہولی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر رہا تھا۔ اِسی روز گاؤ کدل میں عورتوں اور بچوں کے ایک جلوس پر رسالہ کے نیزہ برداروں نے اپنی تیز دھار نوکیں استعمال کیں۔ بہت ساری معصوم جانیں گھوڑوں کی سموں کے نیچے کچل ڈالی گئیں۔ اور گولیوں سے بہت سی خواتین لہولہان ہوگئیں۔ بسنت باغ میں دُوسرے جلوس پر گولیاں چلانے سے آٹھ مُسلمان جامِ شہادت نوش کرگئے۔ فوج مردہ جسد اور زخمی اپنے ساتھ لے گئی۔ صرف ایک شہید کی لاش عوام کے ہاتھ آئی اور اُس کو اُنہوں نے جامع مسجد پہونچا دیا۔ ظاہر تھا کہ ہری کشن کول اپنی وہ خصلت ظاہر کر رہا تھا۔ جس کا مظاہرہ اُس نے پنجاب کے کچھ اضلاع میں کیا تھا اور جس کی بنا پر مہاراجہ نے اُسے کشمیر کی شورش فرو کرنے کے لئے اپنے آلۂ جبر کے طور پر چن لیا تھا۔ وہ اب اپنی فِطری عیاری کو جلیانوالہ باغ کے جلاد کرنل ڈائر کی سفاکی کے ساتھ مِلا کر اس مہلک آمیزے سے کشمیریوں کو تسخیر کرلینا چاہتا تھا۔ لیکن واقعات نے دکھا دیا کہ عوامی تحریک کی فوج ظفر موج کے ساتھ ٹکرا کر اُس کا سارا غرور پاش پاش ہوگیا۔

اُن دنوں شہر میں جذبات طغیانی پر آئے ہوئے تھے۔ لیکن کشمیری مُسلمانوں نے اپنی رواداری اور شرافتِ نفس کا ثبوت یوں دیا کہ اُنہوں نے کسی غیر مُسلم کو کوئی گزند نہ پہونچائی۔ غیر مسلموں نے اپنے مُسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی دکھائی اور

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے شہر میں شورش سے گھبرا کر کرفیو نافذ کر دیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں آگے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شُعلوں نے سرینگر سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اِسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پر فائر کیے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اُنہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان باستائل کی طرح ہلّہ بول دیا۔ شومئ قسمت سے وہاں ایک پنڈت کانسٹیبل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے بھون ڈالے گئے اور ظلم و بربریت کا ننگا ناچ روا رکھا گیا۔

▲▲▲

۱۳

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آندھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا بگل بج گیا ہے۔ میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہوجائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیس ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کفن بردوش ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شالیمار میں اپنا سجادہ جمایا تھا۔ وہ ایک پارسا اور قلندر صفت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے نکلے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک زرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے رن میں دادِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لاٹھیوں پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نارشو" کہتے ہیں یعنی "نارژو"، لکڑی کے لمبے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھیرے ڈل میں

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے شہر میں شورش سے گھبرا کر کرفیو نافذ کر دیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں آگے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرینگر سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پر فائر کیے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان باسٹایل کی طرح ہلّہ بول دیا۔ شومیٔ قسمت سے وہاں ایک پنڈت کانسٹبل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے بھون ڈالے گئے اور ظلم و بربریت کا ننگا ناچ روا رکھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آندھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کُن جنگ کا بگل بج گیا ہے۔ میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیس ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کفن بردوش ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شالیمار میں اپنا سجادہ جمایا تھا۔ وہ ایک پارسا اور قلندر صفت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے نکلے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک زرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے رن میں دادِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لاٹھیوں پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نارشو" کہتے ہیں یعنی "نارژو"، لکڑی کے لمبے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پچھلے ڈل میں

مچھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعد میں اس کا نام "نارڈوملیٹن" مشہور ہوگیا۔ شہر سرینگر کے دوسرے حصوں سے بھی لوگ کلہاڑیوں، کدالوں، چھریوں اور تلواروں سے مسلح ہوکر نکلے۔ اور محاذ پر پہونچے۔ سرکاری بیان کے مطابق مجمع "تین سو" رائفلوں سے بھی لیس تھا۔ لیکن یہ مبالغہ آمیزی ہے۔ البتہ کچھ پھٹی پرانی شکاری بندوقیں ضرور اُن کے ساتھ تھیں جو حکومت کی نظر میں صریحاً غدر اور بغاوت کے برابر تھا۔ لیکن یہ دراصل ایک عوامی انقلاب تھا۔ بہر کیف۔ عوام کے بگڑے تیور بھانپ کر مہاراجا ہری سنگھ نے بڑا تدبر دکھایا اور اپنی فوج اور پولیس کو حکم دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی بارکوں اور تھانوں سے باہر نہ نکلیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی حرکت کی ہوتی تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سرینگر خون کی طغیانی میں ڈوب جاتا۔ مہاراجہ نے اس کے برعکس نواب خسرو جنگ، چیف آف دی ملٹری اسٹاف، برگیڈیر سدرلینڈ، خواجہ سلام شاہ وغیرہ کو مُسلم نمائندگان کے ساتھ بات چیت کی سلسلہ جنبانی کے لیے بھیجا۔ انہوں نے زیارت دستگیر صاحبؒ پر پہونچ کر خواجہ سعدالدین شال، مولوی محمد یوسف شاہ، مولوی احمد اللہ ہمدانی، مولوی عبداللہ وکیل، آغا سید حسین جلالی، وغیرہ کو مہاراجا سے گفتگو کی دعوت دی اور عوام کے سامنے بھی یہ تجویز دہرائی گئی۔ عوام کے جذبات کی لو اونچی تھی اور وہ نمائندگان کے مہاراجا کے پاس جانے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن انہیں یقین دلایا گیا کہ حالات کو سدھار پر لانے کے لئے اُن کی جو بھی بات چیت مہاراجا کے ساتھ ہوگی، اُسے عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ چنانچہ تین نفوس مولوی یوسف شاہ، خواجہ سعدالدین شال اور مولوی عبداللہ وکیل اُن کے ساتھ راج محل گئے۔ جہاں مہاراجا صاحب نے انہیں انتظار کی تلخی کا خوب مزا چکھا کر بعد میں شرف باریابی سے نوازا۔ مہاراجا بڑے غیض میں تھے۔ اور انہوں نے

کشمیری زبان میں وفد کے ارکان کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ اُن کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑگیا تو نواب خسرو جنگ نے اُن کو یاد دلایا کہ مجمع اُن کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اور بہتر ہے کہ یہ انہیں پُرامن طور پر منتشر ہونے کے لیے کہیں۔ چنانچہ تینوں نمائندگان بے نیل و مرام اور کچھ سہمے ہوئے واپس آئے۔ دیر ہوچکی تھی۔ انہوں نے عوام کو کسی نہ کسی طرح منتشر ہونے پر آمادہ کرلیا۔ لیکن انہیں اصل واقعات بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہیں بتایا گیا کہ آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق ان کو بعد میں اطلاع دی جائے گی۔ اسی رات خواجہ سعدالدین شال کو اپنے گھر سے گرفتار کرکے بادامی باغ چھاؤنی کے ایک کوارٹر گارڈ میں رکھ دیا گیا اور عشائی صاحب اور بخشی غلام محمد کو کوٹھی باغ تھانہ میں پہونچا دیا گیا۔

لیکن دوسری صبح کو صورتحال نے ایک اور پلٹا کھایا۔ شہر میں ۱۹-ایل آرڈیننس نافذ کردیا گیا۔ جو برما کے اُس قانون سے مشابہ تھا جس کو وہاں ۱۹۳۱ء میں مسلح بغاوت کچلنے کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔ حکومت نے اپنی فوجی قوت کا بھرپور مظاہرہ کرکے عوام کو دہشت زدہ کرکے ان کا حوصلہ توڑنے کی منظم کوشش کی۔ لیکن لوگوں نے فوری ردعمل دکھاتے ہوئے اس کا توڑ کیا۔ انہوں نے مہاراجا کے حق میں بلند ہونے والے نعروں کے جواب میں اُس کی مذمت میں نعرے بلند کرنا شروع کیے۔ حکومت سراسیمہ ہوگئی اور اُس نے مارشل لاء کے نفاذ کا اعلان کردیا۔ گرفتاریوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے اپنی لپیٹ میں ساری وادی کو لے لیا۔ طرح طرح کے ستم ایجاد کیے گئے۔ شہر میں چار مرکزوں پر گرفتار شدگان کو لایا جاتا تھا اور ان پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے تھے۔ ان تازیانوں سے بعض لوگوں کے جسمانی نظام پر ہمیشہ کے لیے ایسے اثرات مرتب ہوگئے کہ پھر انہیں ساری زندگی ان کا مداوا

کرتے ہوئے ہی تھی۔ سرینگر کی موجودہ نمائش گاہ کے آگے تازیانہ مارنے کا مرکز قائم کیا گیا۔ جہاں عتاب زدگان کو عوام کی نگاہوں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا اور اُن کے ننگے بدن پر کوڑے لگائے جاتے تھے۔ عوام پر تعزیری جُرمانے عاید کیے گئے اور جائدادوں کی ضبطی کے حکم صادر ہوتے۔ لیکن عوام کے جوش کا عالم بدستور جوں کا توں رہا۔ ظلم وستم کی یہ لہر اس قدر وحشیانہ تھی کہ پہلی مرتبہ ہندوستان کے اُن اخبارات نے جو مہاراجا کے ہر اقدام پر آمنا وصدقنا کہتے تھے اس بربریت کی کڑی نکتہ چینی کی۔

ہندوستان اور پنجاب میں اس ظلم و بربریت کی خبریں پہونچیں تو وہاں بھی ایک جذباتی انقلاب برپا ہوگیا۔ مجلسِ احرار کے تحت مسلمانوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے اور ان کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے جموں کی سرحد کے پاس ریاست میں گھس جانے کے لیے اپنے جتھے بھیجے۔ چونکہ کشمیر کے انقلاب کی لہریں اب جموں میں بھی موجیں مار رہی تھیں۔ لہٰذا سرحد پار سے ان جتھوں کی آمد نے جو "چلو چلو مومنو۔ رُخ کرو کشمیر کا" کا رجز الاپ رہے تھے؛ ڈوگرہ حکومت کو حواس باختہ کر دیا۔ صرف ایک ماہ میں کوئی پانچ ہزار کے قریب احراری رضا کار ریاست کی سرحدوں پر گرفتار کیے گیے۔ اُس کے بعد حکومت نے سرکارِ انگلشیہ سے باضابطہ طور پر فوجی کمک طلب کی۔ ۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کو انگریزی لشکر میرپور پہونچ گیا۔ اور اُس نے صرف جتھوں کے داخلے کے خلاف ہی کارروائی نہیں کی بلکہ میرپور کوٹلی اور راجوری کی تحصیلوں میں غیر مسلم جاگیرداروں کے خلاف مظلوم کسانوں کی بغاوت کو بھی بے دردی سے کچل کر رکھ دیا اور اس سلسلے میں انگریزی بمبار جہازوں کو بھی استعمال کیا گیا۔

جب عوامی غیظ وغضب کا طوفان چاروں طرف سے پھوٹ پڑا تو راجہ ہری کرشن کول اور ٹھاکر کرتار سنگھ نے سازش کے آزمودہ ہتھیار سے اِس کا رُخ موڑ دینا چاہا۔ اس سازش کا اصل مقصد مجھے تختۂ دار تک پہونچانا تھا تاکہ روز روز کا دردِ سر ہی ختم ہو جائے۔ سنگم کا پُل جموں سرینگر شاہراہ پر بجبہاڑہ کے کچھ آگے واقع ہے اور اس سڑک پر نقل وحرکت کے سلسلے میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اِسی پُل کو رات کی تاریکی میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ سازش میں کھنہ بل کے عبدالغنی مکرو، عبداللہ بٹ خانیاری اور دوسرے لوگوں کو ملوث کیا گیا۔ اور اِس کا منشا یہ ظاہر کیا گیا کہ سازشیوں نے میرے اِشارے پر کشمیر کا رِشتہ جموں سے کاٹ دینے کا غدارانہ اقدام کیا ہے۔ واردات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا اور چودھری نیاز احمد سیشن جج کو ٹریبونل کے چیرمین کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ لیکن کسی طرح سے اس نام نہاد سازش کی اصلیت کا سُراغ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود کو مل گیا انہوں نے فوراً وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مہاراجا ہری سنگھ کو دہلی طلب کر لیا گیا۔ حکومت پھر گھبرا گئی اور اُس نے ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ دوسری فتنہ سازیاں اختراع کرنے کا شعار اختیار کیا۔ اس طرح سے پہلی بار تحریک پر باہر کی بجائے اندر سے وار کرنے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو تحریک آزادی کے مختلف مرحلوں میں نور وظلمت کی کشمکش کی طرح ہمارا پیچھا کرتا آیا ہے۔

راجہ ہری کرشن کول ایک جہان دیدہ اور گھاگ قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے میرواعظ یوسف شاہ کو، جن کے ساتھ مہاراجا صاحب میری دوسری گرفتاری کے بعد ہی کچھ پینگیں بڑھانے لگے تھے، مولانا کے ایک معتمد اور اپنے واقف کار خواجہ غلام محمد پنڈت کے ذریعہ اپنی کوٹھی پر بلوایا۔ وہاں چکنی چپڑی باتیں کر کے مولانا

کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ حکومت کو مولانا کے منصب اور پیشوائی کا پورا پورا احترام ہے۔ اور انہیں مہاراجا ہری سنگھ کے بعد ریاست کی سب سے محترم شخصیت تصوّر کرتی ہے۔ حکومت کو مسلمانوں کے مُطالبات سے اِنکار نہیں ہے لیکن اُن پر غور کرنے کے لیے سازگار ماحول کی ضرورت ہے۔ اگر مولانا چاہیں تو شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے اسیروں کو کسی بھی وقت رہا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خود حکومت کی ذمہ داریوں کا احساس کرنا بھی میرواعظ صاحب کی اِنصاف پسندی ہوگی۔ اس طرح سے اُن کی خود نمائی کے جذبے کو خوب تسکین دے کر انہیں نرم کر دیا گیا۔ جب وہ پسیج گئے تو غلام محمد پنڈت کے ذریعے اُن کے حضور ایک خطیر رقم بھی پہنچائی گئی۔ بے چارے میرواعظ اس تابڑ توڑ نفسیاتی حملے کے آگے سپر ڈال گئے اور اُن کی طرف سے ایک دستخطی تار وائسرائے کو بھیج دیا گیا جس کا مفہوم کچھ یُوں تھا کہ یہاں کے حالات پُرسکون ہیں، ہم سب مہاراجا بہادر کے وفادار ہیں اور اُن کے ساتھ مل بیٹھ کر تمام اندرونی مسائل امن اور آشتی کے ساتھ طے کرنا چاہتے ہیں۔ تحریک میں یہ رخنہ پیدا کرنے پر مہاراجہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اُنھوں نے میرواعظ صاحب کے لیے چھ سو روپیہ سالانہ نقد وظیفہ مقرر کیا۔ اِس کے لیے اُن کی خدمت میں ایک خلعتِ فاخرہ بھی پیش کیا گیا۔ خلعت میں نوگز والے وِلایتی مخمل کے دو تھان، چینی ریشم کے چار تھان، ایک دوشالہ پشمینہ کا اور چاندی کی ایک طشتری شامل تھی۔ یہ کارروائی اِنتہائی رازداری سے کی گئی اور اس کا رنج آمیز پہلو یہ بھی تھا کہ مُسلم نوجوانوں میں سے ہمارے ایک ساتھی عبدالعزیز فاضلی کو بھی وزیرِ اعظم اپنے شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ فاضلی صاحب نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے میرواعظ صاحب کو ہم سے برگشتہ اور بدظن کرنے میں اچھا خاصا پارٹ ادا کیا۔

▲▲▲

(۱۴)

دار و رسن کی آزمائش

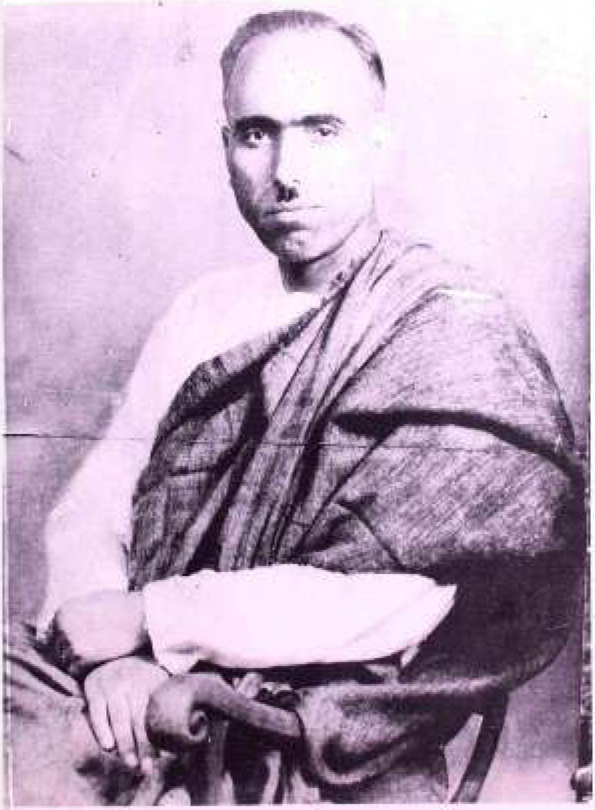
اِدھر یہ شورِ محشر بپا تھا، اُدھر میں بادامی باغ کے کوارٹر گارڈ میں اپنی زندگی کے انتہائی پُرآشوب دن کاٹ رہا تھا۔ میرے کوارٹر گارڈ کے سامنے ایک ٹکٹکی قائم کی گئی اور اُس پر ایک شخص کو باندھ لیا گیا۔ میری نظروں کے سامنے اُس کے ننگے جسم پر کوڑے برسائے گئے۔ مجھے احساس تھا کہ ہری پربت کی تکنیک کا یہ دوسرا رُوپ ہے۔ اور یہ سب کچھ مجھے خوف زدہ کرنے اور میرا حوصلہ توڑنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میں یہ سب کچھ دیکھ کر سہم سا گیا۔ خدا کے سوا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ میں دل ہی میں سوچتا تھا کہ اب سبھوں کے سامنے عُریاں بدنی کا عذاب سہنا ہوگا اور نہ معلوم مجھ پر اور بھی کیا کیا ستم ڈھائے جائیں گے۔ اس کسمپرسی میں میں نے معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کیا۔ ہاتھ منہ دھو کر نماز پڑھی اور اس بلائے بے درماں سے حفاظت کی دُعا کی۔ جب سے مجھے اس فوجی جیل خانے میں لایا گیا تھا نہ مجھے کپڑوں کا دُوسرا جوڑا دیا گیا تھا نہ نہانے دھونے کے لیے پانی مہیا کیا گیا تھا۔ حد یہ ہے کہ حجامت بنانے کے لیے کسی نائی کو بھی نہیں لایا گیا۔ کمرے میں اینٹوں کا فرش تھا۔ رسیوں سے بُنا گیا ایک کھاٹ



تھی۔ اور رفع حاجت کے لیے ایک کنستر رکھا گیا تھا۔ چند پھٹی پرانی کمبلیں اوڑھنے بچھانے کے لیے دی گئیں تھیں۔ صبح اور شام دو وقت کال کوٹھڑی کا دروازہ کھلتا تھا اور ایک لوہے کی تھالی میں کچھ چاول اور دال یا کبھی کبھار سبزی کھانے کو دیتے تھے۔ بیت الخلاء جانے کی ضرورت ہوتی تو ہتھکڑیاں پہنا کر چار مسلح فوجیوں کی حفاظت میں مجھے بیت الخلاء تک لے جایا جاتا تھا اور جب تک میں بیت الخلاء کے اندر رہتا تھا، چار مسلح سپاہی بندوقیں تانے باہر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ میں باہر آجاتا تو مجھے ہتھکڑیوں کے زیور پھر پہنا دیے جاتے تھے اور اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اُس دن نماز ادا کرنے کے بعد چارپائی پر میری آنکھ سی لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نامانوس شخص دُھلے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا لے کر اندر آتا ہے اور مجھ کو پکار کر کہتا ہے۔ "اُٹھو گرم پانی آیا ہے۔ نائی بھی ساتھ ہے، حجامت بنا کر نہا دھو لو، اور کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔" اتنا کہہ کر اجنبی غائب ہو گیا اور جھٹکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایک سکون سا مل گیا کہ شاید کوئی اچھی خبر ملنے والی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کشمیر کا گورنر ٹھاکر کرتار سنگھ میری کال کوٹھڑی کے باہر کھڑا ہے۔ ٹھاکر صاحب نے مجھ کو مخاطب کر کے کہا "سناؤ کیسے مزاج ہیں" میں نے جواب میں کہا "اچھا ہوں!" ٹھاکر صاحب ایک ستم ظریفانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے "تمہارے اندر تین بُرائیاں روشن ہیں۔ تم جوان ہو، تعلیم یافتہ ہو اور پھر لیڈر بھی ہو، اب یہاں تم ذرا ٹھنڈے پڑ جاؤ گے پھر تمہیں عقل آجائے گی۔" اُن کے اس رعونت آمیز لب و لہجے اور گفتگو سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور میں نے تن کر جواب دیا کہ آپ میرے جسم کو پابندِ سلاسل کر سکتے ہیں لیکن میری رُوح آپ کے قبضے میں نہیں آسکتی۔ وہ تمام ریاست میں گھوم پھر رہی ہے۔



نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔



"باغی عبداللہ کی جے" شیخ صاحب کشمیر چھوڑ دو (۴۶-۱۹۴۷ء) کے زمانے میں
جب یہ نعرہ کشمیر کے کوہ و جبل میں گونجتا تھا۔



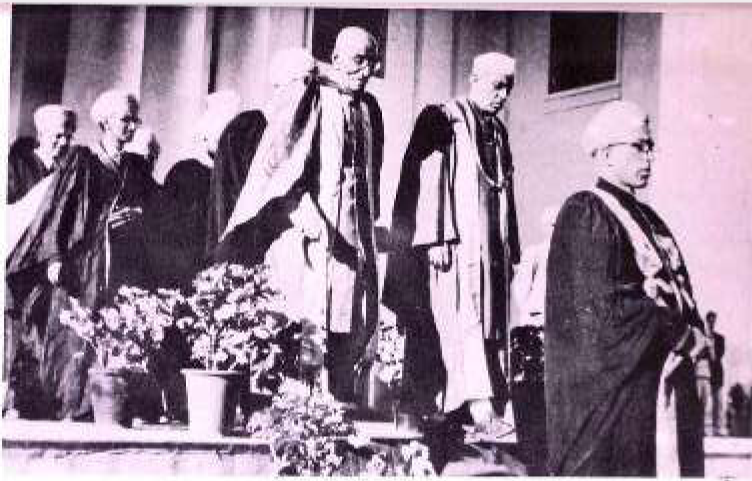
صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ۔



نشاط باغ، جواہر لال نہرو اور بادشاہ خاں کے ساتھ۔



انڈونیشیا کے نائب صدر کے ساتھ۔



کشمیر یونیورسٹی، خواب کی تعبیر، جواہر لال نہرو اور راج گوپال اچاریہ
یونیورسٹی کنووکیشن میں شیخ صاحب کے ساتھ۔

اُمید ہے کہ کبھی آپ کا حکمرانی کا نشہ ہرن ہوگا تو آپ معقول باتیں کریں گے ۔“ یہ ترکی بہ ترکی جواب سُن کر ٹھاکر کرتار سنگھ کھسیانے ہوگئے اور وہاں سے اکڑتے ہوئے چل دیے۔

لیکن میں اُس وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جب سچ مچ ایک سپاہی کپڑوں کا ایک دُھلا ہوا جوڑا اور بالٹی بھر گرم پانی لے آیا۔ اُس کے ساتھ ایک نائی بھی تھا۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا۔ اور نہا دھو کر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ اب آئندہ کیا پیش آئے گا۔ سہ پہر کے قریب وزیرِ اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ دیوان جیون ناتھ کمرے میں داخل ہوگئے ۔ اور مزاج پُرسی کے بعد مجھ سے خوب باتیں کرنے لگے ۔ وہ بڑی ہمدردی کے لہجے میں مجھے سمجھانے لگے کہ میں حکومت کی مخالفت کرنے کی روش چھوڑ دوں۔

لیکن میں مرغے کی ایک ٹانگ کے ہی مصداق اِسی بات پر اڑا رہا کہ حکومت پہلے مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کرنے پر رضامند ہو جائے۔ گھنٹہ بھر خوب چہک چکے تو وہ مجھے اپنے ساتھ ایک بند کار میں لے گئے ۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ اُنہوں نے مجھے اپنے مکان پر پہونچایا وہاں کار سے نکل کر جب میں دالان سے گذرنے لگا تو پیچھے سے اُن کے مالی نے دھیمی سی آواز میں کہا کہ ”ہوشیار رہیے، جو شخص اندر ہے اُس کو خرید اگیا ہے۔“ میری سمجھ میں بات نہیں آئی اور میں سوچ میں پڑگیا۔ لیکن کمرے میں پہونچا تو وہاں میں نے میر واعظ یوسف شاہ اُن کے برادرِ اصغر مولوی یحییٰ شاہ اور خواجہ غلام محمد پنڈت کو موجود پایا۔ علیک سلیک کے بعد جب میں بیٹھنے لگا تو مولوی یوسف شاہ صاحب نے مجھے باہر کے حالات سُنائے۔ اُنھوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ خود اُنھوں نے مُشکل حالات کا کیسے مقابلہ کیا اور بڑھا بڑھا کر اپنی کارکردگی سُنانے لگے ۔جب وہ خودستائی کا اچھا خاصا اظہار کرچکے تو مطلب کی بات پر آگئے۔ اور کہا راجا صاحب (راجا ہری کرشن کول) نے



خاتمہ جاگیرداری کے قانون پر دستخط کرتے ہوئے اس وقت کے مشیرِ مال بیگ صاحب کے ساتھ۔

سارے مطالبات مان لیے ہیں۔ آپ سب کو بہت جلد رہا کیا جا رہا ہے۔ صرف ایک شرط رکھی گئی ہے کہ آئندہ آپ عام جلسوں میں تقریر نہ کریں گے۔ میں نے جواب میں کہا کہ وزیرِ اعظم کے وعدے کے ایفاء کا عملی ثبوت کیا ہے؟ مولوی صاحب نے سیدھا جواب دینے کی بجائے کہا کہ آپ کو اُن کی بات پر یقین کرنا چاہیئے۔ میں نے پوچھا کہ جن مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا ہے اُن کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟ مولوی صاحب بولے کہ اُن کی رہائی کے سوال پر بھی راجہ صاحب نے ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا ہے۔ میں پھر بولا کہ اگر یہ بات درست بھی ہے کہ حکومت مسلمانوں کی تمام شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے تیار ہوگئی ہے تب میری تقریروں پر پابندی لگنے کی کیا تک ہے؟ حکومت کے ساتھ ٹکراؤ اگر ختم بھی ہو جائے تو بھی مسلمانوں کی کردار سازی اور اُن کی سماجی اصلاح کے لیے ہمیں مصروفِ عمل رہنا ہوگا۔ اور اِس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ہم تقریروں کے ذریعے اُنھیں قرآن و حدیث کے احکام سے روشناس کریں۔ کیونکہ اس راہِ مستقیم میں اُن کی نجات کے تمام سامان مُضمر ہیں۔ میری اس گفتگو کی مولوی صاحب تاب نہ لاسکے اور اُنھوں نے ایک طنزیہ انداز میں استفسار کیا کہ کیا تم قرآن و حدیث پر عبور رکھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ قرآن و حدیث جاننا ہر مُسلمان کا فرض ہے اور میں بھی مقدور کے مطابق ان کا علم رکھتا ہوں۔ میرے جواب پر میرواعظ کے چھوٹے بھائی یحییٰ صاحب کو تاؤ آگیا اور وہ تھوڑی سی درشتی کے ساتھ بولے "اگر تم میرواعظ صاحب کی تجویز سے اتفاق نہ کرو گے تو وہ (میرواعظ) تحریک سے کنارہ کش ہوں گے۔" اُن کی گفتگو کے اس پیرایے سے میں چونک پڑا اور دالان میں کہی ہوئی مالی کی بات میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ لیکن حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے میں نے بڑے نرم لہجے میں جواب دیا کہ تقریر بازی میرا پیشہ نہیں ہے۔

اگر میرا چپ سادھے رہنا اور سیاست سے الگ تھلگ رہنا قوم کے مفاد میں ہوگا تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ نمائندگان کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ جو اُن کا فیصلہ ہوگا میں اُس پر کاربند رہوں گا۔" اِس طرح سے گفتگو کا رُخ بدل گیا اور معاملہ ٹل گیا۔ میزبان نے نفیس نمکین چائے اور میوے سے ہماری تواضع کی اور مجھے پھر بند موٹر کار میں واپس اپنی کال کوٹھری میں پہونچا دیا گیا۔ ایک دو روز کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا اور سیدھے مولوی یوسف شاہ صاحب کے گھر پہونچا دیا گیا۔ نمائندگان کی میٹنگ طلب ہوئی اور معاملہ اُن کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جب نمائندگان نے مولوی یوسف شاہ کی تجویز سُنی تو وہ سنّاٹے میں آگئے اور انھوں نے اِس تجویز کو مُسترد کر دیا۔ مولوی صاحب نے پانسہ پلٹتے دیکھا تو اُن کا رنگ فق ہوگیا۔ مجھے اور عشائی صاحب کو سراسیمگی کے عالم میں الگ لے کر کھسیانی آواز میں بولے کہ وہ راجہ ہری کرشن کول کو زبان دے چکے ہیں کہ آئندہ تقریریں نہیں ہوں گی۔ اب وہ اُن کو کون سا منہ دکھائیں گے۔ مولانا کی اس بات کا بھلا کیا جواب تھا۔ بہر حال ہم نے اُن سے کہا کہ فی الحال عام جلسوں میں صرف مولوی صاحب ہی بولیں گے۔ اور اس عرصہ میں ہم دیکھیں گے کہ حکومت اپنے وعدوں پر کہاں تک عمل کرتی ہے۔ معاملہ ٹل گیا۔ لیکن دوسرے جمعہ کو یہ صورت قائم نہ رہ سکی۔ میں اُس دن کسی ناخوشگوار واقعے کو ٹال دینے کی غرض سے جامع مسجد نہیں جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے سیدھا امیرا کدل کا رُخ اختیار کیا۔ مگر حُسنِ اتفاق سے وہاں مجھے احرار لیڈر مولانا مظہر علی اظہر ملے۔ جو اُن دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری بانہوں میں باہیں ڈال کر مجھ سے جامع مسجد ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے عذر تراشا مگر وہ جامع مسجد جانے پر مُصِر رہے۔ اور میرے تامّل کے باوجود بہت مُصر رہے۔ آخر اُن کی بے تابی کے آگے میری

کچھ پیش نہ چلی اور ہم دونوں جامع مسجد میں پہنچ گئے عوام ہجوم دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور مجھے اُن کا اصرار دیکھ کر مُہرِ خاموشی توڑتے ہی بنی۔ میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ میرے بولنے کی نوبت نہ آئے مگر لوگ تھے کہ مسجد سے نکلتے ہی نہ تھے۔ بہر صورت میں نے اپنی تقریر میں سیاسیات کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا۔ اور عوام کو صرف اپنے بچوں کا تعلیم دینے کی تلقین کرتے ہوئے اسلامیہ اسکول کے لیے چندے کی اپیل کی۔ لیکن سرکاری ایجنٹوں نے نہ معلوم مولوی یوسف شاہ کے کان میں کیا پھونک دیا کہ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ کالی مسجد مہاراج کے ایک اجتماع کے سامنے بولتے ہوئے کہا۔ "بغیر داڑھی مونچھ کے ریش تراشیدہ اور انگریزی پوشاک میں ملبوس کچھ لوگ منبروں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ خود تو سنتِ محمدیؐ کی پیروی نہیں کرتے پھر اُنہیں مُسلمانوں کی پیشوائی کا کیا حق ہے؟" مولوی صاحب کے حکومت سے بھی راز و نیاز جاری تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے حضرت بل میں جہاں وہ اُن دنوں وعظ خوانی کے لیے جاتے تھے، بھری ہوئی عوامی تحریک کو یہ لوری سُنا کر سُلانے کی کوشش کی۔ "حقوق اور دُنیاوی آرام و آسائش کا طلب گار ہونا مومن کی شان کے شایان نہیں۔ اگر اللہ ہم پر مہربان ہو جائے اور ہم صحیح مُسلمان بنیں تو حقوق کی کیا بات ہے سلطنتیں ہمارے قدموں میں گریں گی۔ لہٰذا امن و سکون سے رہو اور فتنوں سے دُور رہو۔" مولانا نے اپنی تقریر میں قادیانیوں پر بھی چھینٹے اڑائے اور اشاروں اور کنایوں سے مجھے بھی اُسی زُمرے میں ڈال دیا۔ مولوی صاحب نے عوام کو اشتعال دلاتے ہوئے کہا کہ آئندہ کسی نوجوان کو جامع مسجد میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اور اگر کوئی نوجوان ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اُس کو جوتے مار کر نیچے اُتارنا چاہیے۔" ظاہر تھا کہ مولوی صاحب کھُلم کھُلا ہمارے

خلاف میدان میں اُتر آئے تھے۔ میرے لیے اس چیلنج کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اور میں نے بھی اس فرسودہ قیادت کے آگے ڈٹ جانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ بسنت باغ کی ایک مسجد میں، میں نے ایک زوردار جوابی تقریر کی۔ اور مولوی یوسف شاہ کی پینترے بازیوں کو طشت از بام کر دیا۔ اب سرینگر کے مُسلمان واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف مولوی یوسف شاہ اور ان کے مُعتقدین تھے، جن کا اثر ان کی رہائش گاہ کے آس پاس چند مُحلّوں تک ہی محدود تھا۔ ان میں واڑہ پورہ کے آتشبازوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اِس کے مقابلے میں ہمارے حامیوں کی تعداد سارے شہر میں تھی۔ مولوی یوسف شاہ کے حامی بکرے کہلانے اور ہمارے حامیوں کو "شیرِ کشمیر" کی نسبت سے "شیر" کہہ کر پکارا جانے لگا۔ پہلے پہل تو مولوی صاحب نے اپنی اجارہ داری کو چیلنج دیکھ کر ہمیں طاقت اور ڈنڈے کے زور سے زیر کر لینا چاہا لیکن جب ہمارے حامیوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تو میدان میں پسپا ہو کر رہ گئے۔ اقبال نے شاید اسی موقع کے لیے کہا تھا ؎

میں جانتا ہوں انجام اُس کا
جس معرکے کے مُلّا ہوں غازی

میر واعظ مولانا احمد اللہ ہمدانی اور بیشتر پیرزادوں نے ہمارا ساتھ دیا اور چند جھڑپوں کے بعد مولوی یوسف شاہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اُدھر عوامی تحریک کی کامیابی نے مہاراجا کو اس بات کا قائل کر دیا کہ تیغ و تفنگ سے اس طوفان کو روکا نہیں جا سکتا۔ مناسب یہی ہے کہ اس کا تدارک گفت و شنید اور صلح جوئی سے کیا جائے۔ چنانچہ تین اکتوبر کو مہاراجا نے اپنی ۳۶ ویں سال گرہ پر ایک دربارِ عام بُلایا۔ جس میں جاگیرداروں، ذیلداروں اور دوسرے

وفادارانِ ازلی نے شرکت کی۔ البتہ مسلمان اس دربار سے عام طور پر غیر حاضر رہے۔ مہاراجا نے اس دربار میں کچھ موہوم سے اعلانات کیے اور ریاست کے تمام فرقوں کو دعوت دی کہ اگر وہ اُن کے حضور اپنی شکایات پیش کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو وہ ان پر ہمدردی سے غور کریں گے۔ دراصل ہندوؤں اور سکھوں سے مطالبات طلب کرنا وزنِ شعر قایم رکھنے کے برابر تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی شکایات کا وزن بھی کم کرنا تھا۔ اس لیے ان فرقوں نے جو یادداشتیں پیش کیں اُن میں "غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا" کا سالب و لہجہ کارفرما تھا۔ البتہ جان و مال کی حفاظت اور مضبوط حکومت کے قیام کا راگ الاپ کر انھوں نے درپردہ اکثریتی فرقہ کے خلاف مظالم کی حمایت کی تھی۔ وہ مہاراجا کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ اور اُن کے اوپری طبقے کو مسلم اکثریت پر جو فوقیت حاصل تھی اس کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ سکھ حضرات کا میمورنڈم حسبِ معمول دلچسپی کے سامان فراہم کرتا تھا۔ اگرچہ ریاست میں اُس وقت اُن کی تعداد مشکل سے پچاس ہزار کے قریب تھی لیکن انھوں نے سرکاری ملازمت میں ایک تہائی حصے کا مطالبہ کیا تھا۔ کشمیری پنڈت صاحبان نے اپنے میمورنڈم میں اپنی ہوشیاری اور مسلم آزاری کا ثبوت دیا تھا۔ ہم نے اس کے برعکس ریاست کے عوام کے اجتماعی مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر ٹھوس تجاویز پیش کی تھیں۔ ریاست کے آئندہ آئینی اور اقتصادی ڈھانچے کے متعلق پہلی بار ایک واضح خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اس میں مہاراجا کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی حکومت اور اسمبلی کو نمائندہ بنائیں اور اقتدار میں عوامی نمائندوں کو شریک بنائیں۔ اور یہ دوررس نوعیت کی تجویز تھی۔

مجھے میمورنڈم کے مہاراجا کو پیش کرنے کا سماں اب تک یاد ہے۔ ہم سب نمائندگان کو مہاراجا کے محل واقع چشمہ شاہی بلایا گیا۔ محل کے گلزار میں کرسیاں

لگی ہوئی تھیں۔ ہمارا استقبال وزیرِ اعظم راجہ ہری کرشن کول نے کیا اور اُنھوں نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم کچھ دیر تک مہاراجا کی آمد کا انتظار کرتے رہے اور اس دوران راجہ صاحب ہمارے ساتھ خاصی خوش مزاجی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہے۔ بالآخر مہاراجا صاحب محل سے خراماں خراماں سیدھے ہماری طرف آئے۔ ہم سب دستور کے مطابق تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ راجہ ہری کرشن کول نے باری باری ہمارا تعارف مہاراجا سے کرایا۔ اس کے بعد نمائندگان کی طرف سے خواجہ سعدالدین شال اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے میمورنڈم کو بآوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ یہ میرا اور مہاراجا صاحب کا پہلا سامنا تھا۔ میں مہاراجا کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مہاراجا بھی دزدیدہ نگاہوں سے کبھی کبھی میرے چہرے پر نظر ڈالتا۔ لیکن جب میرے ساتھ اس کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو فوراً اپنی نظروں کا رُخ تبدیل کر لیتا۔ مہاراجا کے لیے میری ذات ایک معمّے سے کم نہ رہی ہوگی۔ اس نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔ حالانکہ اس نے میرے خلاف کافی کچھ سن رکھا تھا۔ شاید وہ بھی غور سے میری شخصیت کا ایک اندازہ کر لینا چاہتا تھا۔ بہرحال شال صاحب میمورنڈم سُنا چکے تو مہاراجا نے ایک بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا کہ میں اِس پر غور کروں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی مزید کوئی رائے ظاہر کیے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔ اور محفل پراگندگی میں برخواست ہو گئی۔

اس یادداشت کی ترتیب اور اس پر دستخط کرنے کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس کو تیار کرنے میں مجلسِ احرار کے نمائندے دوسری دفعہ سرینگر آ گئے تھے۔ اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ وہ عرض داشت کی اس شکل کو پسند نہیں کرتے تھے جس میں وہ مہاراجا کو پیش کی گئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ مکمل ذمہ دار نظامِ حکومت

کا مطالبہ کیا جانا چاہیے۔ مگر کشمیر کمیٹی والے کہتے تھے کہ اس کے لئے ماحول ابھی تیار نہ ہوگا۔ اور نہ ہی حکومتِ ہند کا پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ اس کی تائید کرے گا۔ ہماری جماعت میں سے کچھ نوجوان احرار کے نقطۂ نگاہ سے متفق تھے۔ میرے لیے اب اس اختلاف کو دور کرنا ایک نازک مرحلہ بن گیا۔ میں نے نمائندگان اور تنظیمی کمیٹیوں کے چیدہ چیدہ افراد کی ایک میٹنگ خواجہ سعدالدین شال کے گھر پر بلائی اور میں نے کشمیر کمیٹی، جس پر قادیانیوں کا اثر تھا اور مجلسِ احرار کے نمائندوں کو اپنے اپنے نظریات اجلاس میں پیش کرنے کی دعوت دی۔ اجلاس خواجہ سعدالدین شال کے مکان پر ہوا۔ اور بحث و تمحیص کے بعد کشمیر کمیٹی کا ہی ڈرافٹ معمولی ترمیم کے ساتھ پاس کیا گیا۔

عرض داشت پر سب نمائندوں کے دستخط لینے ضروری تھے۔ شال صاحب کے مکان پر ہونے والے اجلاس میں مولوی یوسف شاہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ لیکن وہ عرض داشت پر دستخط کرنے میں لیت و لعل کر رہے تھے۔ اُن کا اعتراض آزادیٔ تحریر و تقریر کی مانگ پر تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ کوئی مشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال ڈال دیا گیا تھا کہ یہ مطالبہ اُن کی خاندانی اجارہ داری اور ذاتی وقار کو خطرے میں ڈال دے گا۔ کیونکہ ہر ایرے غیرے کو اسٹیج پر آنے کی اجازت مل گئی تو اُن کا امتیاز کہاں باقی رہے گا؟ لیکن خواجہ غلام احمد عشائی اور خواجہ سعدالدین شال نے اس رم خوردہ آہو کو کسی طرح رام کر ہی لیا۔ اور اس طرح اُنھوں نے بھی اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

مولوی یوسف شاہ کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ ایک دو بار تیز کلامی کی نوبت بھی آگئی۔ اُس کے بھائی پیر یحییٰ شاہ نے جو ایک میٹنگ میں

میر واعظ صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ کبر و نخوت سے مجھے خطاب کرتے ہوئے کہا،
"ہمارے خاندان نے ہی تم کو آسمان پر چڑھا لیا۔ اور تم گمنامی سے باہر آکر شیرِ کشمیر بن گئے۔ اب ہم تم کو پھر تمہاری اصل جگہ پر پہنچا دیں گے۔ تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ تم جو کچھ ہو ہمارے دم سے ہو اور تمہاری ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے جواب میں قرآن مجید کی آیت وتعز من تشاء و تذل من تشاء پڑھی اور کہا کہ "عزت عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے ہاتھ میں۔ میری عزت میرے اعمال پر منحصر ہے۔ تمہاری خوشی یا ناراضی پر نہیں۔ تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے ضرور کر گزرو۔"

معاملہ ممکن ہے اور بھی بڑھ جاتا لیکن خواجہ سعدالدین شال اور عشائی صاحب نے بیچ بچاؤ کیا۔ اور بات ٹل گئی۔

▲▲▲

۱۵

آتے ہیں جواب آخر......

حکومت نے عوامی غیض و غضب کے آتش فشاں کو ٹھنڈا کرنے اور کسی حد تک اُن کی اشک شوئی کرنے کے لئے سر برجور دلال، جو ریاست کے چیف جسٹس تھے، کی سرکردگی میں ۱۳ رجولائی کو سرینگر میں گولی چلانے کے واقعات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن کا اعلان کیا۔ مسلمانوں نے یہ کہہ کر اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا کہ جو شخص حکومت کا تنخواہ دار ملازم ہو اُس سے کسی قسم کی غیر جانبداری کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے اور انصاف کی اُمید کی جا سکتی ہے؟ میر واعظ یوسف شاہ کو بھی کمیشن میں مسلم رُکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب بھانپ گئے کہ اس طرح سے کھلے بندوں حکومت کے ساتھ اشتراک اُن کی شاخِ نشیمن کے لئے برقِ بلا خیز بن سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے فیصلے کے پیشِ نظر اُنہوں نے بھی ممبری قبول نہ کرنے میں ہی مصلحت سمجھی۔ دلال کمیشن کے آگے مسلمانوں کی طرف سے کوئی شہادت پیش نہ ہوئی پھر بھی سر برجور نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی جو داخلِ دفتر ہو گئی۔

ہماری عرض داشت کے نتیجے میں مہاراجہ نے ۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء میں مسٹر بی جے

گلینسی کی سرکردگی میں ایک اور کمیشن مقرر کیا۔ عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب "ذکرِ اقبال" میں یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ اس کمیشن کے تقرر میں علامہ اقبالؔ کا بھی دخل تھا۔ اُس کے مطابق بھوپال کے نواب حمید اللہ خان علامہ اقبالؔ کے بڑے قدر دان تھے۔ اور نواب بھوپال کا مہاراجا کشمیر پر بڑا اثر تھا۔ علامہ اقبالؔ نے نواب بھوپال کے ذریعے مہاراجا کو آمادہ کر لیا کہ مسلمانوں کی جائز مانگوں کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کریں اور اس طرح گلینسی کمیشن بنایا گیا۔ کمیشن کے مقاصد کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ ریاست کے مختلف طبقوں اور فرقوں کی شکایات کی تحقیقات کر کے اُن کے ازالہ کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔ گلینسی صاحب ایک انگریز تھے اور پہلے بھی کشمیر دربار کے ملازم کی حیثیت سے مختلف حیثیتوں سے کام کر چکے تھے۔ اُس وقت وہ حکومتِ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مسلمانوں نے کشمیر سے خواجہ غلام احمد عشائی اور جموں سے چودھری غلام عباس خان کو نامزد کیا۔ کشمیری پنڈتوں کی طرف سے پنڈت پریم ناتھ بزاز اور جموں کے ہندوؤں کی طرف سے پنڈت لوک ناتھ شرما نامزد کیے گئے۔

حکومت اور مسلمانوں، دونوں کی خواہش تھی کہ میں بھی کمیشن کے ساتھ وابستہ ہو جاؤں۔ کیونکہ عشائی صاحب کی ذات پر نہ معلوم کیوں زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ جب عشائی صاحب کا نام تجویز ہوا تو مسلمانوں نے مختلف اطراف سے میرے نام احتجاجی تار بھیجے جن میں اِس نامزدگی کی مخالفت کی گئی تھی۔ لیکن میری مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اور میں سمجھتا تھا کہ کمیشن کے ساتھ منسلک ہونے سے زیادہ سود مند بات یہ ہے کہ میں عوام کے ساتھ رابطہ بنائے رکھوں۔ اس کے علاوہ میری اپنی رائے میں عشائی صاحب کی نسبت عوام میں شک و شبہات بڑی حد تک غیر ضروری اور بے بنیاد تھے۔ اُن میں

خامیاں ضرور تھیں لیکن خامیاں کس بشر میں نہیں ہوتیں؟ البتہ وہ تُرش مزاج بہت تھے۔ جس کی وجہ سے دوست بنانے کی بجائے وہ دشمن بنانے میں زیادہ ملکہ رکھتے تھے۔ لیکن وہ قومی احساس سے سرشار تھے۔ اُن کا قومی شعور بہت بیدار تھا۔ اور وہ حتی المقدور قوم کی خدمت انجام دینے میں کبھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ اُدھر اُن کے گھر کی مالی حالت بھی پتلی تھی اور کمیشن کے ساتھ کام کرنے سے کسی حد تک اُن کی مالی امداد ہو سکتی تھی۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہا اور کمیشن میں کام کرنے کے لیے شائق صاحب کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

اسی دوران ۵ر دسمبر کو مہاراجہ نے ایک انگریز آفیسر مسٹر مڈلٹن کی سرکردگی میں ایک اور تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کے ذمے اُن واقعات کی تحقیقات کرنا تھا جو میری دوسری گرفتاری کے بعد سرینگر، اسلام آباد اور شوپیان میں پیش آئے تھے۔ اس کمیشن کے سامنے شہادتیں پیش کرنے کے لیے ہم نے بنڈ پر عدالت کے سامنے اپنا دفتر قایم کیا۔ یہ دفتر محمد اسحٰق صاحب کے مکان میں قایم کیا گیا تھا۔ مکان کے عین سامنے دو ہاؤس بوٹ لگائے گئے۔ جن میں کشمیر کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے وکیل حضرات اور دوسرے دیگر مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ گواہوں کی تلاش، اُن کے بیانات کی ترتیب اور اُن کو کمیشن کے سامنے پیش کرنا ایک بہت بڑی قانونی مشق تھی۔ جس کا کشمیریوں کو کم ہی تجربہ تھا۔ اس کارروائی کو کامیاب بنانے کے لیے پڑھے لکھے نوجوانوں کی بڑی ضرورت تھی اور چونکہ کشمیری مسلمانوں میں تعلیم کی کمی تھی اس لیے تلاش کے باوجود ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ لیکن پھر بھی ہم کسی نہ کسی طرح کام چلاتے رہے۔ ہمارے سامنے ایک پیچیدہ مسئلہ یہ تھا کہ مسٹر مڈلٹن نہ تو کشمیری سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ ہی اُردو سمجھ سکتے تھے۔

اس لئے گواہوں کے بیانات کے انگریزی ترجمے اور جرح کے موقع پر ان کی ترجمانی نہایت اہم مسئلے تھے۔ اُن دنوں ہم نے اننت ناگ کے ایک تیز و طرار نوجوان کے بارے میں سُنا۔ جس نے حال ہی میں بی۔اے پاس کر لیا تھا۔ یہ نوجوان مرزا محمد افضل بیگ تھے۔ اُنھوں نے اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور بڑی قابلیت کے ساتھ اسے سرانجام دیا۔ اُن کے علاوہ خواجہ غلام قادر المعروف شیر گاندربل، محمد یحییٰ رفیقی، مولوی عبدالرحیم، محمد یوسف بی۔اے (علیگ) اور کچھ دوسرے نوجوانوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا۔ کمیشن نے شہر اور قصبوں میں گھوم پھر کر اپنی شہادتیں قلمبند کیں۔ میں نے بھی کمیشن کے سامنے ایک انگریزی بیان پیش کیا جس میں واقعات کی نوعیت کے علاوہ کشمیر کی گتھی کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کے بارے میں بھی اشارات کیے۔ میں نے اپنے بیان میں اُس صورت حال کا تجزیہ بھی پیش کیا جو ۱۳ر جولائی ۳۱ء سے اُس وقت تک پیش آئی تھی۔

▲▲▲

(۱۶)

احرار اور قادیانیوں کی کشمکش

مڈلٹن کمیشن کے سامنے کل ۲۰۳ گواہوں نے اپنے بیانات قلمبند کرائے لیکن مسلمانوں نے اس کمیشن کے ساتھ جو اُمیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ مسٹر مڈلٹن نے حکام کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں غفلت کا مرتکب تو قرار دیا مگر انہوں نے اُن بدترین اقدامات کو سندِ قبول عطا کی جو حکومت نے عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے اُٹھائے تھے۔ اپنے سرکاری کردار کے باوجود مڈلٹن صاحب کے رپورٹ میں کہیں کہیں صداقت کی گونج سُنائی دی۔ مثلاً انہوں نے یہ مانتے ہوئے بھی کہ تحریک مُسلمان چلا رہے ہیں یہ اعتراف کیا کہ یہ کسی لحاظ سے بھی فرقہ وارانہ نوعیت کی تحریک نہیں ہے۔ مڈلٹن کمیشن کا کام ختم ہوا تو ہم گلینسی کی کارروائی کی طرف لگ گئے۔ اور یہاں بھی مسلمانوں کا اپنا کیس پیش کرنے کے لیے محنت اور عرق ریزی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہم حقائق کی دستیابی اور ان کی تنظیم و ترتیب میں لگے رہے اور مناسب شہادتیں بھی قلم بند کرتے رہے۔ خود میری شہادت بھی قلم بند کروائی گئی۔ اسی دوران حکومت نے اپنی نیک نیتی کا اظہار کرنے کے لئے پتھر مسجد کو مسلمانوں کے حق میں واگذار کرنے کا اعلان کیا۔ پتھر مسجد سرینگر کے قلب میں دریائے جہلم کے کنارے

خاص تراشے ہوئے کشمیری پتھروں سے بنائی گئی ایک شاندار عمارت ہے جس کو جہانگیر کی مشہور ملکہ نورجہاں بیگم نے تعمیر کیا۔ کشمیر میں بُدھ اور ہندو حکمرانوں نے پتھر سے بہت سے شاندار معبد تعمیر کیے۔ جن کے کھنڈر آج بھی اپنے معماروں کی چابکدستی اور کاریگری کے گواہ ہیں۔ لیکن مُسلمانوں کی آمد کے بعد عمارتوں میں چوب کاری کا رجحان بڑھ گیا۔ مسلمانوں نے کشمیر میں لکڑی کا پہلا پُل بھی تعمیر کیا۔ اُس سے پہلے کشتیوں کو جوڑ کر عارضی پُل تیار کیے جاتے تھے۔ بہرکیف پتھر مسجد، جسے شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے کشمیر میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ ہے۔ جو سب کی سب پتھروں سے بنائی گئی تھی لیکن یہ مسجد اپنی تعمیر کے بعد بہت دنوں تک نماز کے لیے استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا کرنے کے سلسلے میں بہت سی روایات مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب مسجد بن کر تیار ہوگئی تو کسی نے ملکۂ نورجہاں سے سوال کیا کہ اس کی تعمیر پر کتنا سرمایہ خرچ ہوا ہے۔ نورجہاں نازو ادا اور زنانہ جاذبیت کا مجسمہ تھی۔ اُس نے اپنے غرورِ حُسن میں اپنے شاندار کفش، جس پر لعل و جواہر جڑے ہوئے تھے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جتنی اس جوتے میں سے ایک کی قیمت ہے۔ نورجہاں اس قسم کی آزاد خیالیوں کے لیے مشہور تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ عید رمضان کا چاند نظر آنے پر جہانگیر نے بے ساختہ کہا ؏ ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شُد

نورجہاں نے اس ہلال کے تقدس پر کوئی توجہ نہ دی اور برجستہ گرہ لگادی ؏

کلیدِ میکدہ گم گشتہ بُود پیدا شُد

اسی طرح وہ اپنے پیر و مرشد کے پاس یہ شعر پڑھتی تھی ؏

چہار چیز کہ دل می بَرد کُدام چہار؟

نماز و روزہ تسبیح و توبہ استغفار

ایک طرف تو مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے تھا۔ دوسرے علامہ عنایت اللہ مشرقی کی مجلسِ خاکساران بھی اُن پر بازی لے جا رہی تھی۔ وہ رُوپے کا ایندھن ڈال کر اپنی جماعت کا انجن چالو کرنا چاہتے تھے۔ اور تمام ہندوستان میں پھیل جانا چاہتے تھے۔ اِدھر کشمیر میں راجہ صاحب نے تجوریوں کے مُنہ کھول دیے تھے۔ اس لئے ہر ضرورت مند طالع آزمائی کے لیے سرینگر پہونچ رہا تھا۔ میری ملاقات وفد کے ممبروں سے اُن کے ہاؤس بوٹ میں ہوئی۔ میں نے مُنہ پھٹ بن کر گلہ کیا کہ اُن جیسے اکابرینِ ملّت نے کس طرح سرکاری دعوت پر کشمیر آنا اور پھر حکومت کے ٹکڑے توڑنا گوارا کیا۔ یہی حکومت ایک طرف تو اُن کو ضیافتیں کھلا رہی ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کے خون کی پیاسی بنی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے احراری کرم فرماؤں کو بتایا کہ آپ نے راجہ ہری کرشن کول کا مہمان بن کر غلطی کی ہے، عوام کے مہمان بنتے تو آپکو اسقدر آرام و آسائش حاصل نہ ہوتی۔ لیکن اُن کی میزبانی قبول کر کے آپ اُن مظلوموں کو جو نفسیاتی سہارا دیتے، اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وفد کے لیڈر چودھری افضل حق نے میری اس تلخ گوئی پر تیوری چڑھائی اور پھر اپنے زورِ کلام سے سرکاری مہمان بننے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا دل نہ مانا۔ عوام میں بھی وفد کی نسبت بدگمانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ بہر کیف سرینگر میں ہفتہ دس دن گذارنے کے بعد مجلسِ احرار کے یہ نمائندے واپس چلے گئے۔

میری دوسری گرفتاری کے بعد اکتوبر، نومبر ۳۲ء میں مجلسِ احرار کا یہ وفد پھر سرینگر آیا۔ بدقسمتی سے اِس بار بھی وہ سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ہی آئے۔ اور اُن کے قیام و طعام کا انتظام پھر سرکار کے ذریعے سے ہی کیا گیا۔ البتہ اب کی بار اُن کا ہاؤس بوٹ دریا کے شمالی کنارے عدالت سے ذرا دُور آبی گذر گھاٹ پر

لنگر انداز کر دیا گیا۔ وفد کے ارکان اپنے اوقات کا زیادہ حصہ راجہ ہری کرشن کول کے ساتھ راز و نیاز میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ اس طرح سے عوام اُن کو اپنے ہمدردوں میں شمار کرنے لگے اور اُنہوں نے وفد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ جب میں ایک بار اُن سے ملنے کے لئے گیا تو وفد کے ارکان نے شکوہ کیا کہ "جہاں کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کے پاس عام لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے وہاں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔" میں نے جواب دیا کہ قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ پہلی بار سرکاری مہمان بن کر آئے تو آپ کو علم ہے کہ یہاں لوگوں پر اُس کا ایک اثر ہوا۔ پھر آپ کے ہوتے ہوئے سرکار نے یہاں کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی اور آپ بدستور اس کی بانہوں میں بانہیں حمائل کرتے رہے۔ آپ کو تو شہیدوں کے گھر جا کر زبانی ہمدردی کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ سرکاری موٹریں آپ کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ آپ نے حالات کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لیے معمولی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اب آپ پھر سرکاری مہمان ہیں اور ہاؤس بوٹوں میں سرکاری دستر خوان کے چٹخارے لے رہے ہیں۔ تو بھلا عوام آپ کے پاس آئیں تو کیوں؟ حکومت کی گولیوں سے اُن کے بے گناہ سینے چھلنی ہو چکے ہیں۔ سرکاری تازیانوں نے اُن کے جسم کی کھالیں اُدھیڑ دی ہیں۔ انہیں بھانت بھانت کے فرضی مقدمات میں ماخوذ کر کے پریشان کیا جا رہا ہے۔ اُنہیں علاج و معالجے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے ماہرانہ قانونی مشورے کی ضرورت ہے۔ آپ اِن ضروریات میں کہیں ان کی دست گیری نہیں کر رہے ہیں۔ مگر کشمیر کمیٹی اپنے خرچے پر وکلاء بھیج کر اُن کی امداد کر رہی ہے۔ مِڈلٹن کمیشن کے سامنے اگر کشمیری مسلمان اپنا کیس پیش کریں گے تو کشمیر کمیٹی کی ہی امداد سے۔ اِتنا ہی نہیں، کشمیر کمیٹی کے نمائندے شُہداء اور قیدیوں کے گھروں میں جا کر اپنی بساط کے مطابق نقد و جنس سے اُن کا بوجھ ہلکا

کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر وہ آپ کے دیوان خانے کو بھول کر کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کا دامن پکڑ لیں تو اس میں اچنبھے کی بات کیا ہے؟ ع

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

میرے اِن دلائل کا احرار حضرات کے پاس جواب نہ تھا اس لیے مذاق میں بات کو ٹال گئے۔ لیکن جب وہ لاہور واپس پہونچے تو وہاں اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کشمیر میں رہ کر کیا کر آئے ہیں اور آپ نے وہاں کے عوام کے لیے کیا کیا ہے؟ اِس کا جواب بھلا وہ کیا دیتے۔ لگے بغلیں جھانکنے۔ لیکن اپنی کوتاہیوں اور کوتاہ بینی پر پردہ ڈالنے کے لیے اُنھوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ شیخ محمد عبداللہ احمدی بن گیا ہے اور وہاں اب سنگین مسئلہ اُسی کا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ ان ہی دِنوں مسلم نمائندگان مہاراجے کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کرنے کے لیے ایک عرض داشت مرتب کر رہے تھے۔ مجلسِ احرار کی سیاسی لائن نمائندگان کے اجلاس میں زیرِ بحث آئی اور مسترد ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں یہ عرض داشت کشمیر کمیٹی کے نظریات سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔ احراری حضرات اس بات سے بِدک گئے۔ اور لاہور جاکر انھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہم قادیانیوں کے اثر میں ہیں۔ اور کشمیر کمیٹی کے سربراہ مرزا محمود احمد صاحب، جو احمدی فرقے کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے پوتے تھے، تحریکِ کشمیر کو قادیانی عقیدے کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ احرار صاحبان نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ فتنۂ قادیانیت کے سدِّباب کے لیے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں سے پاک کیا جانا چاہیے۔ اور کسی غیر قادیانی مسلمان کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سونپ دینی چاہیے۔ احراریوں نے قادیانیوں کے خلاف اپنی ساری قوّت میدان میں جھونک دی اور

بالآخر مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کی پیشکش ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کی گئی جسے انھوں نے کشمیر سے اپنے گہرے شغف کی اور کشمیریوں سے دِلی ہمدردی کی بنا پر قبول فرمالیا۔

ذاتی طور پر مجھے مجلسِ احرار کی روش سے اختلاف تھا اور میں اِسے کشمیری مسلمانوں کے مفادات کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ کشمیری مسلمان اسی تفرقہ بازی کا شکار ہو کر کہیں کے نہ رہے تھے۔ ہم نے خدا خدا کر کے انہیں جزوی وفاداریوں کی سطح سے اُوپر اٹھا کر ایک اِجتماعی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن احرار کی روش سے زخموں کے ٹانکے کھلنے کا اِمکان پھر پیدا ہو گیا تھا۔ میں عقیدتاً احمدیت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس فرقے کے بنیادی عقائد کا نہ زیادہ علم ہی تھا اور نہ اُن سے دِلچسپی ہی تھی۔ میری دلچسپی تو مسلمانوں کو شیرازہ بند کرنے سے تھی۔ تاکہ مشترکہ دشمن کا مؤثر طور پر مقابلہ کیا جا سکے لیکن بد قسمتی سے احرار کشمیر میں اپنی ناکامی کا سب سے بڑا کارن مجھے سمجھتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے اُنھوں نے مجھے احمدی قرار دیا اور پنجاب کے مسلمانوں میں مجھے بدنام کرنے کی کافی کوشش کی گئی۔ روزنامہ "زمیندار" لاہور کے شعلہ بیان اور آتش نگار ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان اُن دِنوں "قادیان کی مادیان" پر زوروں سے قلم کے چابک چلا رہے تھے۔ اُنھوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے احرار حضرات کی اچھی خاصی امداد کی۔ اُدھر داخلی محاذ پر مولوی یوسف شاہ صاحب نے اِن حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ کسی اور طریقے سے مجھے نیچا نہ دکھا سکے تو اُنھوں نے بھی مجھ پر احمدی ہونے کا الزام عاید کر دیا۔ کچھ نوجوان بھی مجلسِ احرار کے اثر میں آ گئے۔ جن کی رہنمائی اندر اندر سے مولوی محمد سعید مسعودی، جن کے بارے میں آگے تفصیل سے

ذکر آئے گا، کر رہے تھے۔ خود مولوی سعید کے اپنے نظریات اور طریقِ کار پر احراری مسلک کی گہری چھاپ تھی۔ اور اُن کے کردار کے تجزیے میں اِس امر کو بہرحال ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔

مجلسِ احرار نے تمام پنجاب میں کشمیر کے طلسم نما نام پر اپنی تحریک کی کافی آبیاری کی۔ احراریوں نے مظلومینِ کشمیر کے نام پر کافی رقومات اکٹھا کیں۔ لیکن اِس روپیہ کو کشمیر کے اندر خرچ کرنے کی بجائے اپنی تحریک کو تقویت دینے کے لیے استعمال کرتے رہے۔ البتہ اُنہوں نے کشمیریوں پر ہو رہے مظالم کی طرف دُنیا کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کچھ جتھے ریاست کے اندر ضرور بھیجے۔ چنانچہ اُن کی ایک بھاری جمعیت، مولانا مظہر علی کی قیادت میں سوچیت گڑھ کی سرحد کو عبور کرتے ہوئے ریاست میں داخل ہو گئی۔ ریاستی حکومت نے طاقت کے ذریعے مزاحمت کی تو بہت سارے رضاکاروں نے جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن انہوں نے ریاست میں داخل ہو کر ہی دم لیا۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ احرار نے سوچیت گڑھ میں صرف دو دن کے اندر اندر ایک شاندار مسجد کی تعمیر مکمل کی، جو آج تک مسجدِ احرار کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تو سلسلے کا ایک پہلو تھا۔ بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکارا ہونے لگے۔ اُنہوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشویش محسوس کی اور قادیانی حضرات مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ میری حالت اقبال کے الفاظ میں یوں تھی کہ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مجھے یاد ہے کہ اپنی شادی کے بعد میں، جس کا ذکر آگے آئے گا، لاہور میں اپنے سسرال والوں کی کوٹھی واقع میسن روڈ میں قیام پذیر تھا کہ میں نے احمدیوں کی اس بڑھتی ہوئی روش پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میں کشمیر کمیٹی کے دوسرے سربرآوردہ اشخاص کی مانند مرزا محمود احمد نے بھی شمولیت فرمائی۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس محفل میں شامل تھے۔ میں نے اجلاس میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار کی سب سے بڑی وجہ اُن کا آپسی تفرقہ ہے۔ کسی قومی تنظیم کی تحریک اور نصرت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس تفرقے کو ختم کیا جائے۔ اور تمام مکاتبِ خیال کے مسلمانوں کو ایک ہی محور پر جمع کیا جائے۔ اس مقصد کی کامیابی سے تحریکِ کشمیر کی کامیابی بھی وابستہ ہے۔ یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہر مکتبِ خیال سے وابستہ رہنما یہ طے کر لیں کہ وہ تحریک کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی عقاید کی تبلیغ کی نشرگاہ نہیں بنائیں گے۔ لیکن کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ اگر اس پر روک نہ لگائی گئی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے۔" مرزا صاحب نے میری تقریر صبر و سکون کے ساتھ سُنی اور پھر بولے کہ "احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے۔ ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اِس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی۔ لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا۔ ہمارے لیے مستقل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس پر میں نے دوٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے

اور نہ ممکن۔ کیونکہ اُن کا تحریک کا جزو بن کر تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہنا کانفرنس میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکا سکتا ہے۔ جن میں ہمارا سارا حاصل خاکستر ہوکر رہ جائے گا۔ اُس دن کے بعد ہی سے احمدی جماعت کا رویہ تحریک کے ساتھ پہلے پہل تو سرد مہری کا رہا؛ بعد میں وہ ہماری مخالفت کرتے رہے اور آخر کار کھلم کھلا ہمارے خلاف صف آرا ہوگئے۔ ہماری تحریک سے مولوی عبداللہ وکیل، خواجہ غلام نبی گلکار اور دوسرے کچھ اہم ساتھیوں کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ خواجہ غلام نبی گلکار کی علیحدگی تو ذاتی طور پر میرے لیے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ وہ میرے ہم سن تھے اور میرے اوّلین رفیقوں میں سے ایک۔ پڑھے لکھے بھی تھے لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے باہمت، حوصلہ مند اور جری تھے۔ تھے تو بڑے پُرخلوص لیکن قادیانی عقیدے کی وجہ سے سیاسی مسائل پر اُن کی ہی رہنمائی قبول کرتے تھے۔ ان کو قوم کی زبوں حالی کا بڑا احساس تھا۔ اور ان کا زرخیز دماغ لمبی چوڑی اور دور از کار سکیموں کا تانا بانا بُنتا رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی اپنے وطن مالوف (کشمیر) کے متعلق حکومت پاکستان کی پالیسی سے نالاں رہے۔ وہ جموں وکشمیر کے لیے مکمل آزادی کو بہترین حل سمجھتے تھے۔ آخرکار یہ سرفروش محبِ وطن اپنے دل میں کشمیر کی یاد بسائے پاکستان میں ہی راہیٔ ملکِ بقا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کا جسدِ خاکی لحد میں بھی مادرِ کشمیر کے آنچل میں پہونچنے کے لیے بے قرار ہوگا۔

احمدیوں کے ساتھ کنارہ کشی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ جس سے اُن کی روِش کا اندازہ ہوسکے گا۔ ایک بار ہمیں جماعت احمدیہ نے کسی تقریب کے سلسلے میں بڑے اصرار سے قادیان بُلایا۔ اُن دنوں زین العابدین صاحب اُن کے امورِ خارجہ کے نگران تھے۔ ہم اُن کے مہمان تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں اُنہوں نے کہا کہ غیر احمدی تو احمدی امام کے پیچھے نماز ادا کرسکتے ہیں۔ لیکن احمدیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میں نے جب وجہ جاننا چاہی تو وہ کچھ رازداری کے سے لہجے میں بولے کہ احمدی مرزا غلام احمد صاحب کو بھی نبی مانتے ہیں اور جو اُن پر ایمان نہ لائے اُسے خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کیسے کسی غیر احمدی کے مقتدی بن سکتے ہیں؟ اُن کی اس صاف گوئی سے میری آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا اور ان کی نیّت اور حکمت عملی کا سارا راز فاش ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان راستوں کی علیحدگی ٹالی نہیں جاسکتی تھی۔

▲▲▲

۱۴

زنداں میں شگوفے

احرار کے جتھے جموں صوبے کی سرحدوں کے نزدیک ریاست میں داخل ہو رہے تھے۔ اور اُن کا فوری اثر وہاں کے حالات پر پڑا۔ سارے صوبے میں حکومت مخالف مظاہروں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ صوبہ جموں میں حکومت نے بہت سا خونِ ناحق بہایا۔ لیکن صورتحال اس بات سے اور پیچیدہ ہو گئی کہ وہاں افراتفری نے فرقہ وارانہ فسادات کی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۲ء کو بجوٹ (راجوری) میں وزیر سردار تیرتھ سنگھ اور تحصیلدار امرناتھ کے حکم سے ڈوگرہ فوجیوں نے مسلمانوں کے ایک اجتماع پر، جو نماز ادا کرنے کے لیے جمع ہوا تھا، گولی چلا دی جس سے چھپن مسلمان جاں بحق ہو گئے۔ شورش نے بغاوت کا رنگ اختیار کیا تو سول انتظامیہ کو چلانے کے لئے مہاراجہ نے حکومتِ ہند کے اشارے سے دو انگریز افسروں مسٹر جارڈین اور مسٹر ٹھرکو ان علاقوں کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے مامور کیا۔ اوّل الذکر سول ایڈمنسٹریشن کے مختار بنے اور دوسرے صاحب ریاست کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے۔ صورتحال اتنی خراب ہوئی کہ مہاراجہ نے جن کو انگریزوں

کی طرف سے "اندر مہندر بہادر سپر سلطنتِ انگلشیہ" کا خطاب ملا تھا، پیدل فوج کے علاوہ برطانوی ہوائی بیڑے یعنی رائل ایئر فورس کے جہازوں کو بھی میرپور وغیرہ بھیجنے کی اپیل کی۔ مہاراجا کو انگریزوں نے یہ امداد ۱۸۴۶ء کے اُس بدنام معاہدہ امرتسر کے اقرار کے مطابق فراہم کی۔ جس کے تحت انگریزوں نے کشمیر کو اس کے عوام، پہاڑوں، جھیلوں، میدانوں اور مرغزاروں کے ساتھ پچھتر لاکھ روپے کی حقیر رقم کے عوض بیچ دیا تھا۔ علامہ اقبالؔ نے اسی ننگِ انسانیت معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے لیگ آف نیشنز سے یہ خطاب کیا تھا۔

اے بادِ صبا گر بہ جنیوا گذرے کنی
حرفِ زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

سرینگر میں نسبتاً امن و امان تھا اور ہم مڈلٹن اور گلینسی کمیشن کے معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے۔ لیکن جموں کے حالات نے عوام کے دل و دماغ پر اثر کیا اور اس کی لہریں بے چینی کی صورت میں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ جموں کے واقعات پر احتجاج کرنے کے لیے ہم نے خانقاہ معلّیٰ کے احاطے میں ایک جلسہ طلب کیا جس میں حکومت کے مظالم کی مذمت کی گئی۔ اس جلسے میں پونچھ کے ایک عوامی رہنما مفتی ضیاءالدین پونچھی نے بھی تقریر کی۔ اور خاصے سخت لہجے میں حکومت کی توجہ جموں اور اپنے علاقے کے مسلمانوں کی شکایات کی طرف دلائی۔ حکومت پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ اُس نے مفتی ضیاءالدین کی جلاوطنی کا حکم جاری کر دیا۔ میں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ٹھاکر کرتار سنگھ کشمیر کے گورنر

تھے۔ میں نے اُن کے پاس جاکر جلاوطنی کے اس حکم کو واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ ٹھاکر صاحب شکار کو اپنے پنجے میں آتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ اُن کے دل میں کھوٹ تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ اُن کے تپاک کے پیچھے ایک عیارانہ سازش کارفرما ہے۔ اُنھوں نے مجھے کہا کہ اس معاملے پر آپ خود وزیر اعظم راجہ ہری کرشن کول سے بات کریں۔ اتنا کہہ کر اُنھوں نے جھوٹ موٹ ٹیلی فون کھڑکانے کی کوششیں شروع کیں اور یوں مجھے جھانسہ دے کر دو گھنٹے تک اپنے پاس بِٹھائے رکھا۔ وزیر اعظم کے ساتھ تو کیا بات چیت ہوتی لیکن ان دو گھنٹوں میں مفتی صاحب کو فوج کی حراست میں جموں روانہ کر دیا گیا۔ میں نے مسٹر گلینسی کے پاس جاکر احتجاج کیا اور اُن سے کہا کہ وہ اِس معاملے میں مداخلت کریں۔ تاکہ کشمیر کی روبہ اِصلاح فضا پھر بگڑ نہ جائے۔ اور کمیشن کا کام جاری رہ سکے۔ لیکن اُنھوں نے مداخلت کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ اُنھوں نے مجھے خاموش رہنے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی صلاح دی۔

میں گھر لوٹا ہی تھا کہ مجھے یہ حکم سُنا دیا گیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے، اور میری زبان بند کر دی گئی ہے۔ میں نے فوراً اس حکم کی خلاف ورزی کا عزم کر لیا۔ دوسرے روز یعنی ۲۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے خانقاہِ معلّی کی دوسری منزل سے ایک مجمع کو خطاب کر کے زبان بندی کے اس حکم کے پُرزے فضائے آسمانی میں اُڑا دیے۔ میں نے حکومت کی کارروائی کی مذمت تو کی لیکن عوام کو مشورہ دیا کہ صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اور نہ اِشتعال میں آئیں۔ اُسی رات مجھے ہاؤس بوٹ سے، جہاں میں اُن دنوں قیام پذیر تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ میرے ساتھ ہی ساتھ میرے بہت سے رُفقاء بھی قید کر لیے گئے۔ سرینگر میں دفعہ ۱۹۔ ایل کا وحشیانہ قانون پھر نافذ کر دیا گیا۔ مجھے بادامی باغ چھاؤنی میں لے جایا

گیا اور دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا۔ ایک سرسری سماعت کے بعد مجھے چھ ماہ قید کی سزا سُنائی گئی اور سنٹرل جیل پہونچا دیا گیا۔

سنٹرل جیل کے ساتھ یہ میری پہلی جان پہچان تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں سردی عروج پر تھی۔ اور برف باری بھی ہو رہی تھی۔ اُدھر ٹھاکر کرتار سنگھ نے جو اُس وقت وادی کے مختارِ کُل تھے، کشمیر میں بربریت کا راج قایم کیا۔ سرینگر کے علاوہ ہندواڑہ سوپور، بانڈی پورہ، بارہمولہ، اوڑی، مظفرآباد، شوپیان الغرض جگہ جگہ مسلمانوں پر گولیاں چلا کر اُن کے لہو سے برف کی شفاف سفیدی کو لالہ زار میں تبدیل کر دیا گیا۔ روزانہ سینکڑوں آدمیوں کو گرفتار کر کے جوق در جوق جیل میں دھکیلا جا رہا تھا۔ ورنو لاب سے مشہور عالمِ دین اور محدّث مولانا انور شاہ صاحب کے دو برادران مولانا سلیمان شاہ اور حبیب شاہ کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل پہونچا دیا گیا ہندواڑہ سے حاجی عبدالرحیم داندہ، غلام قادر مسالہ، محمد یوسف گنیل، مولوی عبدالعزیز، سوپور سے مولوی محمد یٰسین، حاجی رحیم ڈار، صوفی محمد اکبر، محمد رجب بخش، مظفرآباد سے پیر حسام الدین، حاجی قلندر شاہ، ماسٹر عبدالعزیز گرفتار کر کے جیل پہونچا دیے گئے۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے ایس پی کالج سے مدرّس کی نوکری ترک کر کے خانقاہِ معلّی کے اسٹیج سے تقریر کی اور سنٹرل جیل پہونچ گئے۔ میری اُن سے جیل میں پہلی ملاقات ہوئی۔ اور بعد میں وہ میرے ایک بڑے قریبی اور قابل رفیقِ کار بنے۔ اکثر سیاسی کارکنوں کو سنٹرل جیل کی بارکوں میں رکھا گیا۔ لیکن حکومت کی نظر میں سرغنہ کارکنوں کو تنہائی کی کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا۔ جسے جیل کی اصطلاح میں سنگین کوٹھری کہتے ہیں۔ مجھے بھی ایک تنگ سی کوٹھری میں بند رکھا گیا جس کا

طول و عرض مشکل سے آٹھ فٹ اور چھ فٹ تھا۔ کوٹھری میں ایک کونے میں آٹا پیسنے کی چکی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بیٹھنے کے لیے ایک چبوترہ سا بنایا ہوا تھا۔ ایک طرف رفع حاجات کے لیے ٹین کا ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ سوت کاتنے کے لیے ایک چرخہ بھی موجود تھا۔ کوٹھری میں آنے جانے کے لیے لوہے کا ایک مضبوط دروازہ تھا۔ جس میں لوہے کی سلاخیں پیوست تھیں۔ دروازے پر چوبیس گھنٹے تالا پڑا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے لوہے کی زنگ آلود تھالی رکھی گئی اور کھانا ٹین کی ایک نلکی کے ذریعے اس میں ڈال دیا جاتا تھا۔ سبزی، دال وغیرہ اندر پہونچانے کے لیے بھی یہی نلی استعمال ہوتی تھی ہر قیدی کو ایک خاص مقدار میں چکی پیسنے کے لیے گندم فراہم کی جاتی تھی۔ پہننے کے لیے ایک موٹا کُرتا اور پاجامہ دیا جاتا تھا۔ میں نے جیل کی وردی پہننے سے انکار کیا اور گندم بھی نہیں پیسی۔ البتہ چرخے پر وقتاً فوقتاً سوت کاتتا رہتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے کے لیے چند میلی کچیلی اور کھُردری سی کمبلیں دی گئی تھیں اور کھانا قیدیوں کے عام لنگر سے آتا رہا۔ کچھ عرصے کے بعد جب یہ صعوبتیں میرے جسمانی نظام کو ناکارہ بنانے لگیں تو میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بہتر سلوک کے مطالبہ پر زور دینے کے لیے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ حکومت ہمارے فیصلے سے گھبرا گئی اور اُس نے ہمارے لیے اسپیشل کلاس منظور کی۔ جس کے تحت ہمارے کھانے پینے کے لیے فی کس روزانہ دس تنے کی رقم خرچ کی جاسکتی تھی۔ سگریٹ، حقہ وغیرہ پینے کی بھی اجازت مل گئی۔ اور ہمارے لیے الگ کھانا بنانے کے لیے سیاسی قیدیوں میں سے عبدالرحیم وازہ کو ہمارے ساتھ لگا دیا گیا۔ ہماری سنگین کوٹھری کے سامنے ایک دیوار چُن دی گئی تاکہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہمارا ملنا جُلنا نہ رہے۔ البتہ دیوار

کے اس طرف ہم آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکتے تھے۔ میری کوٹھری کے بالکل ساتھ دوسرے سنگین میں بارہمولہ کے محمد مقبول گکرو قید تھے۔ ایک رات زبردست اُچھل کود کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میں تھوڑا سا گھبرا گیا۔ لیکن جب کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ گکرو صاحب بہ آوازِ بلند بارہمولہ میں آسودہ ایک اولیاؒ حضرت جانباز ولیؒ سے فریاد کر رہے تھے۔

"وِچھی ییٔ دُشمن چپ وراست رٹھگھ تے ژٹھکھ یا شہہ جانبازؒ"

(ترجمہ: میں چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہوں۔ یا جانبازؒ ان کو نیست نابود کر)۔

گکرو صاحب آواز لگانے کے ساتھ ہی ساتھ اُچھلتے کودتے تھے اور اسی لیے سنگین کے دروازے ہل رہے تھے۔ میری رگِ ظرافت پھڑکی اور میں نے اونچی آواز سے انہیں پکارا کہ آپ کی دُعا قبول ہو گئی ہے۔ اب آپ سو جائیے تاکہ آپ کے ساتھی قیدی بھی آرام کر سکیں۔ گکرو صاحب کو واقعی قرار آگیا اور پھر ہمارے ساتھ وہ بھی رات بھر میٹھی نیند سو گئے۔

اسی دوران عبدالقدیر صاحب سے بھی جن کے مقدمے کے سلسلے میں ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو گولی چلی تھی، دو تین بار چوری چھپے ملاقاتیں ہوئیں انہیں تین سال قید کی سزا ہو گئی تھی۔ اور وہ اپنی سزا کاٹ رہے تھے۔ بعد میں انہیں ریاست کی حدود سے باہر پہنچا کر رہا کر دیا گیا۔

اُن دنوں جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک پنجابی ہندو تھا۔ جس نے جیل میں اپنے دبدبے کی دھاک بٹھا دی تھی۔ ہم نے اُس کے رُعب کا اثر کم کرنے کے لیے اُس سے خوش مذاقیاں شروع کر دیں اور اثر خاطر خواہ رہا۔ ظالم حاکم کے لیے ظرافت کا وار

بڑا کاری ہوتا ہے۔

جاڑا بیت گیا تو بہار کی رعنائیاں رنگ بکھیرنے لگیں۔ سنٹرل جیل سرینگر مغلوں کے بسائے ہوئے ناگر نگر میں بنایا گیا ہے۔ جہاں اکبر نے محلاتِ شاہی بنائے تھے۔ اس میں ایک نگار خانہ بھی تھا۔ جس میں اُس دور کے عظیم مصوّروں کی نہایت حسین و جمیل تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اُس زمانے میں ڈل جھیل کا پانی قلعہ کی دیواروں کو چھوتا تھا۔ اِسی جگہ مغلوں نے اپنے محلات بھی تعمیر کئے تھے اور اپنی فوجوں کو فصیل کے اندر بند کر دیا تھا تاکہ وہ شہر کے عوام کی زندگی میں کوئی خلل نہ ڈال سکیں۔ بے ذوق ڈوگرہ حکمرانوں نے اس خوبصورت جگہ کو زندان بنا دیا۔ فصیل کے اندر ہری پربت پہاڑی پر جو قلعہ بنا ہوا ہے وہ افغان گورنر عطا محمد خان کا تعمیر کیا ہوا ہے اور یہ اس خوبصورت پہاڑی پر ایک تاج کی صورت میں لگا پھندا نظر آتا ہے۔ عطا محمد خان نے ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۳ء تک حکومت کی اور اُس نے کابل کے تسلط سے بغاوت کر کے کشمیر کی آزاد مملکت کا جھنڈا لہرایا۔ اُس نے کشمیر کے محبوب بزرگوں شیخ نورالدین نورانیؒ اور شیخ حمزہ مخدومؒ کے نام پر سکے نکالے اور ہری پربت کے اِس قلعے پر خودمختاری کا پرچم نصب کیا۔ اُس وقت سے دہلی کے لال قلعہ کی طرح یہ قلعہ بھی سرینگر کے سیاسی اقتدار کا مُرغِ باد نُما بن گیا۔ بہرحال اس جیل کے باہر سارا علاقہ بادام کے باغات سے گھرا ہوا ہے۔ بہار آئی تو یہ شگوفہ زار رنگ کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے آئے۔ اور ٹُنڈ مُنڈ درخت گلابی مائل سفید پھولوں کے زیور سے لد پھند گئے۔ سرینگر کے حُسن پرست لوگ ہر اتوار شگوفوں کی بہار لوٹنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے اور سماوار کی بھاپ چاروں طرف بھینی بھینی مہک پھیلا دیتی۔ ہری پربت کا ٹیلہ سنٹرل جیل کے سر پر کھڑا ہے اور وہاں سے جیل کے صحن پر سیدھی نظر

جاتی ہے۔ ایک روز کچھ لوگ ٹیلے پر چڑھے اور اُنہوں نے ہمیں صحن میں دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کرنے لگے تو میں نے تولیہ ہلا کر جواب دیا اور کہا وعلیکم السلام۔ وہ لوگ ہمارے اِشارے سے اور زیادہ جھوم جھوم کر کپڑے ہلانے لگے۔ کسی طرح سے سپاہیوں نے یہ معصومانہ اور خاموش نامہ و پیام تاک لیا۔ اُنہوں نے فوراً رپٹ کر دی کہ ہم لوگ آپس میں سگنل بھیجتے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہنگامہ مچ گیا۔ بڑے بڑے آفیسر جیل میں آنے۔ تحقیقات شروع ہوئی۔ پہاڑی اور جیل کے درمیان سگنل بھیجنے کے تجربے ہوئے۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ یہ محض خوش وقتی کا ایک مُہ تھا۔ لیکن اُن کے دلوں کا چور مطمئن نہ ہوا۔ ہم پر نگرانی کڑی کر دی گئی۔ اور کچھ چھوٹی موٹی پابندیاں بھی عاید کر دی گئیں۔ بہرحال وقت گذرتا گیا۔ کبھی کبھی ہمارے لیے جیل سے باہر بھی کھانا آتا تھا۔ اور ہم آزاد زندگی کی لذتوں کو چکھتے تھے۔ قیدیوں کی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اور کبھی جیل کے حکام کے ساتھ چخ چخ ہوتی رہتی لیکن عام طور پر ہم ہنسی خوشی وقت گذاری کرتے رہے۔ ان آزمائشوں کی چھلنی میں گزرنے کے بعد ہی ہماری تحریک کو منزلِ مُراد کی طرف پیش قدمی کرنا تھی۔ ▲▲▲

۱۸

جموں وکشمیر مُسلم کانفرنس

ہماری تحریک کا دھارا اس وقت تک ایک پہاڑی جھرنے کی طرح پھُوٹ کر مستانہ وار چھلک رہا تھا۔ لیکن اب اس کو ایک شیرازہ بند تنظیم کے کناروں میں خرام کے آداب سکھانے کا موقع آگیا تھا۔ اور قومی مفادات کا تقاضا یہی تھا کہ ایک مستعد جماعت اُن کے مقاصد کا ہراول دستہ بنے۔ میں نے اس غرض کے لئے اپنے ساتھیوں اور دُوسرے بہت سے زعما کے ساتھ گفت وشنید شروع کی۔ میں جموں بھی گیا اور وہاں نئی تنظیم کی داغ بیل ڈالنے کے لئے چودھری غلام عباس، میستری یعقوب علی وغیرہ سے تبادلہ خیال کیا۔ سبھی لوگ ایک ریاست گیر تنظیم بنانے کے حق میں تھے۔ اس غرض کے لئے مسلم نمائندگان کی ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کو نئی جماعت کے دستورِ اساسی کی ترتیب کا کام سونپا گیا تاکہ انہی خطوط پر اجلاس بُلایا جا سکے اور پھر اس مسودے کو مندوبین کے سامنے منظوری کے لئے پیش کردیا جائے۔ کمیٹی نے ایک آئینی دستاویز تیار کی۔ جس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے ریاست کے مسلم نمائندگان کا ایک اجلاس ۱۴۔۱۵۔۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو

پتھر مسجد سرینگر کے تاریخی احاطے میں طلب کیا گیا۔ اجلاس میں شمولیت کے لئے مندوبین کا باضابطہ انتخاب کیا گیا تھا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ صبحِ نشور کا آوازہ سُن کر خاک کے ذروں میں قوتِ پرواز آگئی ہے۔ اس موقع پر آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے ایک نمائندہ وفد بھیجا تھا۔ جس میں مسٹر عبدالرحیم درد، مولانا اسمٰعیل غزنوی اور سید حبیب (ایڈیٹر سیاست) شامل تھے۔ نئی جماعت کا نام آل جموں وکشمیر مُسلم کانفرنس تجویز ہوا تھا۔ اور کارروائی کا آغاز اس کے پرچم کے، جو سبز زمین پر سفید ہلال اور تارے پر مشتمل تھا، لہرانے سے ہُوا۔ مجھے اتفاق رائے سے کانفرنس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور میں نے ہی اجلاس کی صدارت کی۔

میرواعظ یوسف شاہ اگرچہ مجھ سے برگشتہ خاطر تھے اور اُن کے ساتھ ہمارے تعلقات میں بال آگیا تھا لیکن اُنہوں نے بھی اجلاس میں اپنے پیروؤں کے ساتھ شمولیت کی۔ اجلاس شروع ہوتے وقت پتھر مسجد کے احاطے اور اُس احاطے میں، جہاں بعد میں مجاہد منزل کی تعمیر ہوئی، اور جہاں اُس وقت بالن کی منڈی قایم تھی، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پاس ہی بہتے ہوئے دریائے جہلم میں ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں دُور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین اور مہمان مقیم تھے۔ شاہی مسجد کے تین اطراف میں شاندار گیلریاں آراستہ کی گئی تھیں۔ اور ایک طرف بڑا خوبصورت پنڈال بنایا گیا تھا۔ اتنے بڑے اجلاس کی ترتیب وتنظیم اور انصرام واہتمام ایک آزمائش تھی اور میں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ ہمارے کارکن اس آزمائش میں پُورے اُترے ہیں اور اُنہوں نے اپنے حُسنِ انتظام کی دھاک بٹھادی ہے۔ خواجہ غلام محمد صادق

نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں تحریک کے پس منظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا:

"مہاراجا پرتاپ سنگھ کے عہد میں مہا سبھائی ذہنیت کے وزراء نے مسلمانوں کو پیسنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مسلمانوں کو اتنا دبا دیا گیا کہ اس کے نتیجہ میں اُن میں نشاۃ الثانیہ کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے جس کا ثبوت ریشم خانہ کے سانحہ، حالیہ واقعات اور میموریل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومت کے لئے ان واقعات میں عبرت و موعظت کے لاکھوں دفتر موجود تھے۔ مگر وہ اُن سے متنبہ نہ ہوئی بلکہ اُس نے اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط بنانا شروع کیا۔"

"ان ایام میں مسلمانانِ ریاست نے جو قربانیاں پیش کی ہیں اور جس جرأت، بہادری اور دلیری کے ساتھ اپنی جانیں ملت و وطن پر نثار کی ہیں وہ لائقِ صد ستائش و مباہات ہیں۔ اور اس موقع پر اُن کی خدمات میں، میں نہایت ہی خلوص کے ساتھ جذباتِ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔ یہ قربانیاں دراصل امتحان کی پہلی کڑی تھیں۔ مستقبل میں شاید قوم کو اس سے بھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت پڑے گی۔"

میں نے مسلم کانفرنس کی عوامی حیثیت کے بارے میں کہا کہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ریاست کے تمام مظلوموں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اور اس کے وجود سے ریاست کے تمام فرقوں کو برابر کا فائدہ حاصل ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں بتایا:

"ہماری طرف سے بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ تحریکِ کشمیر کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے بلکہ سب جماعتوں کی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے ہے اور میں اپنے

برادرانِ وطن کو خواہ ہندو ہوں، یا سکھ یقین دلاتا ہوں کہ ہم اُن کے دُکھوں کو دُور کرانے کے لئے اسی طرح تیار ہیں جس طرح مسلمانوں کے دُکھوں کو۔ ہمارا ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ہم ایک دُوسرے سے صُلح کے ساتھ رہنا نہ سیکھیں اور وہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ایک دُوسرے کے جائز حقوق کا احترام کریں۔ اور ایک دُوسرے کی تکلیف دُور کرنے کی کوششیں کریں۔ پس تحریکِ کشمیر ہرگز کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔"

میں نے گلینسی کمیشن رپورٹ اور اُس پر کی گئی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جو مطالبات پُورے ہوئے ہیں اُن کے لئے تو حکومت کا شکریہ واجب ہے لیکن ابھی ہمارے بُنیادی مسائل جُوں کے تُوں ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا کہ لیجسلیٹو اسمبلی کا قیام اصولی طور پر حکومت تسلیم کر چکی ہے۔ لیکن اب اس کو ایک سال کے اندر اندر معرضِ وجُود میں لایا جانا چاہیئے۔ میں نے تحریر و تقریر کی آزادی، انجمن سازی کی آزادی، اور ریاست کے پریس ایکٹ کو برطانوی ہند کے ایکٹ سے ہم آہنگ کرنے کا بھی مُطالبہ کیا اور تعلیمِ نسواں، سماج سُدھار، صنعت و حرفت وغیرہ کو فروغ دینے کی اپیل بھی کی۔ میں نے جمّوں کے حالات کا بھی ذکر کیا۔ وہاں کے مُسلمانوں کی زُبوں حالی کی تصویر کھینچی اور مُطالبہ کیا کہ جمّوں کے مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی دی جانی چاہیئے۔ پونچھ کے سوال پر میں نے خاص طور سے دُنیا کی توجّہ مبذول کرتے ہوئے کہا:

"علاقہ پونچھ صوبہ کشمیر کے ایک ضلع کے برابر ہے۔ وہاں کی آبادی چار لاکھ ہے۔ جن میں اٹھانوے فی صدی مُسلمان ہیں اور یہ ساری آبادی نہایت ابتر حالت میں ہے۔ یہ علاقہ ۱۹۵۵ء (ب) کے سرکاری اعلان کے تحت ریاست جموں و کشمیر میں ایک جاگیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے علیحدہ نظم و نسق، علیحدہ قانون اور انتظام

رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس ردعمل کا سدباب کرتے ہوئے پونچھ میں بھی وہی قوانین نافذ ہوں جو ریاست کے دوسرے حصّوں میں جاری ہیں۔ تاکہ جاگیر پونچھ کو کوئی حق نہ رہے کہ وہ اپنے لیے الگ قانون ساخت کرے اور ریاستی اسمبلی میں باشندگانِ پونچھ کے لیے اُن کی نمائندگی کے حق کا فیصلہ کیا جائے تاکہ وہاں کے مظلوم باشندوں کے ظلم وستم سے نجات کا کوئی راستہ مل سکے۔"

کانفرنس زبردست کامیابی سے دوچار ہوئی اور اس میں لاکھوں لوگوں نے میرے اور میرے ساتھیوں کی تقریریں سُنیں۔ اجلاس کچھ اہم قراردادیں پاس کرکے برخاست ہوگیا۔ اجلاس میں شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ کو جماعت کا نائب صدر، چودھری غلام عباس کو اس کا جنرل سیکریٹری اور مولوی عبدالرحیم وکیل کو اس کا سیکریٹری چُن لیا گیا۔

اجلاس نے ایک قرارداد کے ذریعہ صدر آل جموں وکشمیر مُسلم کانفرنس کی حیثیت سے مجھے اِختیار دیا کہ میں چار ماہ کے اندر کانفرنس کی جنرل کونسل کا اجلاس بلاؤں جس میں دیکھا جائے کہ حکومت نے گلینسی کمیشن کی سفارشات پر عمل کیا ہے یا نہیں۔ اگر جواب اطمینان بخش نہ پایا جائے تو کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جاوے جو حکومت کو مجبور کردے کہ وہ مطالبات کو پورا کرے۔ اجلاس کے اِختتامی دن جنرل کونسل میں جموں اور کشمیر کی نمائندگی کے تناسب پر بڑی گرما گرمی ہوئی۔ کشمیر کے مندوبین کا اِستدلال تھا کہ کشمیر میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت بستی ہے لہذا جنرل کونسل میں انہیں آبادی کے تناسب سے حصّہ ملنا چاہیے۔ لیکن جموں کے احباب جن میں چودھری غلام عباس اور اللہ رکھا ساغر پیش پیش تھے یہ منطق جتلانے لگے کہ کشمیریوں میں سیاسی شعور تو ہے نہیں، اس کے مقابلے میں جموں کے مُسلمان سیاسی طور پر بڑے بیدار مغز اور

باشعور ہیں۔ اور اُنہوں نے ہی کشمیر میں بیداری کی لہر درآمد کی ہے۔ لہذا جنرل کونسل میں جموں کو زیادہ حصّہ ملنا چاہیے۔ جموں کے نمائندوں نے جس انداز سے یہ جواب دعویٰ پیش کیا اُس میں کشمیریوں کے تئیں کمتری کا احساس اور حقارت کا جذبہ جھلکتا تھا۔ کشمیر کے کونے کونے سے جو نمائندے آئے تھے وہ مولوی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں دنیا کے کیف وکم کا کم ہی علم تھا اور جو سادہ لوح تھے۔ لیکن جموں کے نمائندوں کا اندازِ تکلم اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ اُن کے جذبات بھی مجروح ہوگئے اور فرطِ حمیت سے اُن کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ خود مجھے بھی اپنے جموں کے دوستوں کا یہ پیرایۂ گفتار قطعاً نہیں بھایا۔ میری رگِ حمیت کو چوٹ لگی۔ چنانچہ میں نے ایک نہایت ہی زوردار تقریر کرڈالی۔ میں نے کہا کہ یہ رنج کا مقام ہے کہ قربانیاں کشمیریوں نے دی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے خون سے سرزمینِ کشمیر کو لالہ زار بنادیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے مال ومتاع کو وطن کی راہ میں لُٹا دیا ہے۔ لیکن جموں کے سبکسارانِ ساحل اُن ہی کو کوس رہے ہیں اور اُن کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر وشر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

افسوس اِس بات کا ہے کہ ہمارے جموں کے ہم جلیس اُسی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں جو ہمارے حکمرانوں کا شعار رہا ہے۔ کشمیریوں کی بیداری اور شعور کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ یہ اجلاس ہے۔ جس کے حُسنِ انتظام پہ ہر کوئی عش عش کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کشمیریوں کو نگاہِ حقارت سے دیکھیں تو یہ بڑی بے انصافی ہے۔ میری تقریر اس قدر زوردار تھی کہ جموں کے دوستوں کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ شرمندہ ہوکر رہ گئے۔ کشمیری احباب نے مجھے اُن کے جذبات کی



ماسٹر عبداللہ سے شیرِ کشمیر
جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے پہلے صدر کی حیثیت سے

صحیح ترجمانی کرنے پر گلے لگایا۔ جب رات کے بارہ بجے کے قریب ہم ہاؤس بوٹ کی جانب جا رہے تھے تو مولوی یوسف شاہ کے برادرِ اصغر مولوی محمد یحییٰ شاہ نے بے اختیار مجھے گلے لگا کر مبارکباد دی اور کہا کہ "آپ واقعی شیرِ کشمیر ہیں میرے دل میں آپ کے متعلق جو بدگمانیاں تھیں وہ اب دور ہو گئی ہیں"۔

اجلاس کے کچھ عرصے کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ اور جلد ہی خواجہ غلام احمد عشائی بھی وہاں آ گئے۔ میں نے صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے ۱۷ دسمبر کو جموں میں مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اجلاس کے اختتام پر ہم نے حکومت کی توجہ اُن مطالبات کی طرف دلائی جو مسلم کانفرنس کے پہلے عام اجلاس میں پیش کیے گئے تھے۔ اور حکومت سے کہا گیا تھا کہ اگر اس نے چار ماہ کے اندر اندر اطمینان بخش اقدامات نہ اٹھائے تو ہم مزید کارروائی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ اجلاس کے بعد میں سرینگر آ گیا اور سیاسی سرگرمیوں میں لگ گیا۔ حکومت ہمارے مطالبات پر ہی نہیں بلکہ اپنی یقین دہانیوں پر عمل کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بہت سی مسلمان عبادت گاہیں واگذار کرنے میں بھی ہچکچاہٹ سے کام لیا جا رہا تھا۔ اسمبلی کے قیام کے سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ اور عوام اس تعطل پر اب بے چین ہونے لگے تھے۔ میں نے ان تمام امور پر غور کرنے کے لیے ۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو سرینگر میں مجلسِ عاملہ کی ایک اور میٹنگ طلب کر لی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ساتھیوں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی۔

خواجہ سعد الدین شال، چودھری غلام عباس، آغا سید حسین شاہ جلالی، مولوی محمد عبداللہ وکیل، پیر حسام الدین گیلانی، خواجہ غلام احمد بٹ، میاں

احمد یار خان، مولوی محمد حسین، منشی عبدالعزیز، اور عبدالمجید قریشی کمیٹی کے ذمہ یہ کام رکھا گیا تھا کہ وہ غیر مسلم نمائندوں کے ساتھ رابطہ قایم کریں اور ایک مشترکہ تنظیم بنانے کے امکانات پر اُن سے گفت و شنید کریں۔ افسوس یہ ہے کہ غیر مسلم لیڈروں نے ہماری اس اپیل کا پھر ایک بار مناسب جواب نہ دیا اور اس طرح سے ایک مشترکہ تنظیم کا قیام پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

اجلاس طلب کرنے کے فوراً بعد میں نے شہر میں عوام سے رابطے کی تجدید کیلئے ایک زوردار مہم شروع کی تاکہ انہیں حالات سے آگاہ کرنے اور سول نافرمانی کیلئے تیار کیا جائے۔ جلد ہی یہ مہم زوردار شکل اختیار کر گئی۔ حکومت کے سامنے ۱۹۳۱ء کے واقعات ناچنے لگے۔ چنانچہ وہ گھبرا گئی۔ وزیر اعظم کالون اپنے وزیر برائے امن و قانون مسٹر وجاہت حسین کے ساتھ سرینگر پہنچ گئے اور مسلم کانفرنس کے نمائندوں سے گفتگو کا آغاز کر لیا۔ اس سلسلے میں کچھ خطوط کا تبادلہ بھی ہوا۔ اسی دوران ۵ مارچ کو پروگرام کے مطابق مجلس عاملہ کی میٹنگ بھی شروع ہو گئی۔ میٹنگ ۸ مارچ تک جاری رہی اور اس دوران حکومت کے ساتھ گفت و شنید بھی جاری رہی۔ جس کے نتیجے کو بعد میں اخبارات کے لیے بھی جاری کر دیا گیا۔

"گورنر کشمیر کی درخواست پر میں نے وزیر اعظم کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ وزیر اعظم نے جواب میں ایک مکتوب تحریر کیا — جس میں خواہش ظاہر کی گئی کہ ہمارے مطالبات کے سلسلے میں مزید مذاکرات کیے جائیں۔ میں نے اس بنا پر اُن سے ملاقات کی۔ جو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ وزیر اعظم نے یہ بات تسلیم کر لی کہ گلینسی رپورٹ کی کچھ سفارشات پر ابھی تک عمل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تاخیر کی وجوہات ان کے قابو سے باہر ہیں۔ وزیر اعظم نے معاملات کو سلجھانے میں اپنی زبردست دلچسپی کا اظہار کیا۔"

کچھ دنوں کے اندر ہم نے وزیر اعظم کو ایک مفصّل یادداشت پیش کی جس میں ایک مطالبہ یہ بھی درج تھا کہ انجمن سازی اور تقریر بازی پر کسی قسم کی پابندی عاید نہ ہو۔ حکومت نے اس یادداشت میں درج تمام سفارشات کو منظور کر لیا۔

▲▲▲

۱۹

گلینسی کمیشن اور اُس کے بعد

میری گرفتاری کے بعد حالات تیزی سے خراب ہونے لگے اور وادی کے بعد ساری ریاست افراتفری کی لپیٹ میں آگئی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو جموں کے مسلم نمائندگان خود مہاراجا کو حالات سے آگاہ کرنے اور اُن کی توجہ میری گرفتاری کی طرف دِلانے کے لیے اُن کے محل میں اُن سے ملے۔ وفد کی قیادت چودھری غلام عباس کر رہے تھے اور اس میں سید محمد امین شاہ سجادہ نشین، مستری یعقوب علی اور شیخ محمد امین بھی شامل تھے۔ وفد نے جب مہاراجہ سے ملاقات کی تو وزیرِ اعظم راجہ ہری کرشن کول بھی موجود تھے۔ وفد کے ارکان نے بڑی تفصیل کے ساتھ مہاراجا کو کشمیر کے تازہ حالات، مسلمانوں کے مطالبات اور سرکاری انتظامیہ کی غفلت شعاری سے آگاہ کیا۔ راجہ ہری کرشن کول اِن کو بیچ بیچ میں ٹوکتے رہے۔ لیکن وفد کے ارکان اور خاص طور پر مستری یعقوب نے مہاراجا کو بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ اُن کے اعلیٰ حکام اُنھیں غلط اطلاعات اور مشورے دے کر اُن کی حکومت کے تئیں بدظنی پیدا کر رہے ہیں۔ مہاراجا ہری سنگھ نے

اس کا بُرا نہیں منایا۔ اگرچہ راجہ صاحب لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ آخر میں چودھری غلام عباس نے میری گرفتاری کا مسئلہ اُٹھایا اور مہاراجا سے کہا کہ اگر وہ حالات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو شیخ محمد عبداللہ کو فوراً رہا کیا جانا چاہیے۔ چودھری غلام عباس نے مہاراجا کو بتایا کہ یہ بات واقعی حیرت ناک ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو اُس وقت گرفتار کیا گیا ——————— جب وہ حالات کو بہتر بنانے کی سعی میں مصروف تھے۔ اور جب اُنھوں نے امن وامان بنائے رکھنے کے لیے کام شروع کیا تھا۔ مہاراجا ہری سنگھ میرے ذکر پر تھوڑا سا بھڑک اُٹھے اور جواب میں کہا "عبداللہ کو کئی بار چھوڑا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے حکومت کو کمزور سمجھا۔" ملاقات ختم ہوئی لیکن اُس کا کچھ نہ کچھ اثر مہاراجا کے ذہن نے ضرور قبول کیا۔

اُدھر حالات بھی بدستور بگڑتے گئے۔ میرپور وغیرہ میں راجا محمد اکبر خان غازی، مستری الٰہی بخش، خواجہ وہاب الدین وغیرہ نے ٹیکس ادا نہ کرنے کی تحریک شروع کی، حکومت تقریباً مفلوج ہوگئی۔ کشمیر میں تو بیسیوں لوگ موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مہاراجا نے یہ حال دیکھا تو اُن کو یقین ہوگیا کہ راجہ ہری کرشن کول نے اُنھیں محض حالات میں سدھار کرنے کے سبز باغ دکھائے تھے۔ لیکن اصل میں اُنھوں نے نظم ونسق کا بیڑا غرق کر دیا ہے اور مہاراجا اور اس کی رعایا کے درمیان خون کا ناقابلِ عبور دریا حائل کر دیا ہے۔ چنانچہ راجہ صاحب کو چلتا کر دیا گیا۔ اور اُن کی جگہ حکومتِ ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک اعلیٰ انگریز آفیسر کرنل اے، جی، ڈی، کالون کو وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا۔ کرنل کالون کی تقرری وائسرائے ہند کے اشارے پر عمل میں لائی

گئی تھی۔ اب انگریز سامراج اپنے پٹھو مہاراجہ کو بچانے اور عوامی تحریک کو کچلنے کے لیے براہ راست سامنے آگیا۔

میں ابھی پابہ جولاں ہی تھا کہ حریفوں نے یہ بے پر کی اُڑائی کہ کرنل کالون انگریزوں کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ کی ایما پر اس غرض کے لیے لائے گئے تھے تاکہ مجھ پر قابو پایا جاسکے اور میں سرکار انگلشیہ کی مرضی کے مطابق تحریک کی رہنمائی کروں۔ اس پروپیگنڈے کے پیچھے اُن عناصر کی شاطرانہ ذہنیت کام کر رہی تھی جو میری بے باکی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مجھے انگریزوں کے ایجنٹ کے روپ میں پیش کر کے میرا اعتبار کم کرا لینا چاہتے تھے۔ اس بہتان کو شہ دینے میں مولوی یوسف شاہ کے علاوہ مجلس احرار اور حکومت کے اراکین بھی پیش پیش تھے۔ یہ سارے مجھ سے الگ الگ وجوہات کی بنا پر بغض رکھتے تھے چونکہ میں کشمیری عوام کی تحریک کا نشان بن گیا تھا۔ اور میرے نام نے ایک اسطوری (LEGENDARY) حیثیت سی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے وہ ہر جائز و ناجائز حربے سے اس چراغِ راہ کو بجھا دینا چاہتے تھے۔ لیکن نہ تو عوام ہی بہکانے میں آسکے اور نہ ہی بعد کے واقعات نے اُن کی اس تہمت طرازی کو صحیح ثابت کیا۔ کرنل کالون کے خلاف میں نے جتنی شدومد سے تحریک چلائی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس طرح سے حریفانِ بادہ پیما کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے شاعر نے کہا تھا ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

گلینسی کمیشن نومبر ۱۹۳۱ء سے ہی اپنے کام میں مصروف تھا۔ اور اُس نے شکایات، یادداشتیں وصول کرنے کی ایک خاص تاریخ بھی مقرر کی۔ کمیشن کا

قیام مسلمانوں کی زبردست تحریک کا نتیجہ تھا۔ اور ریاستی مسلمانوں کا جو خونِ ناحق بہایا گیا تھا اُسی کی مرضی سے اس کے قیام کا حکم صادر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے قیام میں بیرون ریاست کی رائے عامہ کے اُس دباؤ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ریاستی مسلمانوں کی تحریک کے نتیجے میں اُبھر آئی۔ ریاست کے رجعت پسند ہندو اس صورتحال سے خوش نہ تھے۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اکثریتی فرقے کو اگر اُن کے حقوق مل گئے تو ہمارے حقوق پر زد پڑے گی۔ بیرون ریاست کا متعصب ہندو پریس اور کچھ دوسرے فرقہ پرست عناصر اُن شبہات کو ہوا دے رہے تھے۔ اس لیے انتظامیہ کے ساتھ، جس پر اُن کے ہم مذہبوں کا غلبہ تھا، انہوں نے ریاست کے خرمنِ امن میں آگ لگانے کی سازشیں شروع کردیں۔ تاکہ کمیشن کے کام میں روڑے اٹکائے جاسکیں۔ مفتی ضیاء الدین پونچھی کی بلاضرورت گرفتاری اور جلاوطنی اشتعال انگیزی کی اسی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھی۔ لیکن جب کمیشن اس کے باوجود کام کرتا رہا تو دوسری ترپ چال یہ چلی گئی کہ ہندو ممبران کمیشن سے استعفیٰ دیدیں۔ اور اس کے اعتبار و اثر کو زک پہنچائیں۔ جموں کے مسٹر لوک ناتھ شرما نے ہندو تارکینِ مذہب کو وراثتی حقوق دینے کے مسئلے کا بتنگڑ بنایا اور کمیشن سے الگ ہوگئے۔ لیکن پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اس دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کردیا۔ تب پر کشمیری پنڈتوں نے انہیں، اُن ہی کی بنائی ہوئی یوتھ لیگ سے الگ کردیا۔ بزاز صاحب کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی۔ اُن کو جسمانی اذیتیں پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا گیا اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ اُن کے لیے گھر سے نکلنا مشکل بن گیا۔ چنانچہ انہیں زندہ پورہ سے جو پنڈت اکثریت کا علاقہ ہے نقلِ مکانی کرکے آبی گزر کے ایک مکان میں منتقل ہونا پڑا جہاں سے

اُنھوں نے بعد میں وادی کا پہلا روزنامہ اخبار "وِتستا" جاری کیا۔ مہاراجا نے کمیشن کو مسٹر لوک ناتھ شرما کی علٰحدگی کے باوجود کام کرنے کی اجازت دی اور ہندو نوکرشاہی کے دباؤ اور سازشوں کے باوجود کمیشن نے اپنا کام جاری رکھا اور بالآخر ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کو اپنی رپورٹ اپنی سفارشات کے ساتھ مہاراجا کی خدمت میں پیش کر دی۔

کمیشن کی سفارشات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ مسلمانوں کی شکایات کس قدر حق بجانب تھیں۔ یہ ایک نہایت ہی اہم دستاویز تھی۔ اور اس نے حکمرانوں کو بھی قائل کر دیا کہ عوامی شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مہاراجا نے کمیشن کی خاص سفارشات کو منظور کر دیا اور وزیراعظم کالون نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک سرکاری فرمان کے ذریعے ان سفارشات پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک حکم جاری کیا——

اگرچہ مسلمانوں کی شکایات کے ازالے کے لیے یہ سفارشات صرف پہلے قدم کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن ہم نے پھر بھی ان کا خیر مقدم کیا۔ کمیشن کی سفارشات کے مطابق مسلمانوں کی اُن تمام عبادت گاہوں کو جو حکومت کے قبضے میں تھیں، مسلمانوں کے لیے واگذار کر دیا گیا۔ کمیشن نے ریاست میں تعلیم کی ترقی اور خاص طور پر پرائمری سطح پر اس کے پھیلاؤ کی طرف فوری توجہ کی سفارش کی۔ ایک اور سفارش کے ذریعے ملازمتوں اور خاص طور پر اساتذہ کے طور پر مسلمانوں کی بھرتی پر زور دیا گیا۔ اور ایک خاص افسر کو اس بات کی نگرانی کے لیے مقرر کرنے کی سفارش کی گئی جو مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی کا جائزہ لیتا رہے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے سلسلے میں سفارش کی گئی کہ کم سے کم تعلیمی قابلیت غیر ضروری طور پر

زیادہ اونچی نہ رکھی جائے۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ بھرتی کا ایک ایسا سسٹم وجود میں لایا جانا چاہیے جہاں ہر طبقے کو اس کا حق حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اُن سرکاری زمینوں کے جن کو عام لوگ کاشت کرتے ہوں، مالکانہ حقوق منتقل کرنے کی سفارش بھی کی گئی۔ کسانوں کی بہتری کے لیے بہت سی دوسری سفارشات بھی پیش کی گئیں اور بے گار کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ حکومت کے اعلانیے میں بھی کہا گیا کہ "کارِ سرکار کے سلسلے میں باقاعدہ طور پر قواعد کے مطابق اُجرت ادا کی جانی چاہیے۔" بے روزگاری اور صنعتوں کے فروغ کے متعلق اقدامات اُٹھانے پر زور دیا گیا۔ کمیشن کی سفارش تھی کہ صنعتوں کی ترقی کی طرف ریاستی حکام کو فوری توجہ کرنی چاہیے۔ تاکہ بے روزگاری کا مؤثر انسداد ہو سکے۔

گلینسی کمیشن کی رپورٹ اور مہاراجا کی طرف سے اس کی منظوری اُن لوگوں کے منہ پر ایک چپت تھی جو یہ کہتے تھے کہ دراصل ریاستی مسلمانوں کا جھگڑا اپنے ہندو مہاراجے اور ہندو باشندوں کے ساتھ ہے اور وہ اُن کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ جیسا کہ توقع تھی پنڈتوں نے اس رپورٹ کو اپنے لیے ایک مایوس کن دستاویز قرار دیا۔ اور وہ اب کھلے بندوں مہاراجے سے بھی ناراضگی جتلانے لگے۔ شیتل ناتھ کمیشن کی کارروائی کو سبوتاژ کرنے کی خفیہ سازشوں کا گڑھ بننے لگا اور آہستہ آہستہ دلوں کا بخار نفرت انگیز نعرہ بازی کی صورت میں نمودار ہونے لگا۔ وہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندو مہاراجا کے خلاف تحریک شروع کر کے وہ ہندو راج کو زک پہنچائیں گے پھر بھی وہ بہرصورت اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسکولوں اور کالجوں کے پنڈت طلبا۔ کی طرف سے "روٹی ایجی ٹیشن" کا سوانگ رچایا۔ اس ایجی ٹیشن کے دوران اسکولوں اور کالجوں کے ہندو طلبا کسی جگہ پر اکٹھا ہو جاتے تو ایک لڑکا آواز بلند کرتا تھا "بھائیو رے بھائیو" مجمع جواب دیتا تھا

"ہاں بھائی۔ ہاں بھائی" نعرہ باز پھر پکار اٹھتا تھا۔ "کیا چاہتے ہو؟" اور ہجوم جواباً تین مرتبہ آواز دیتا تھا۔ "روٹی۔ روٹی۔ روٹی" ایجی ٹیشن کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا اندازہ اس کے تین مطالبات سے ہو سکتا ہے۔

١۔ کاشت کے لیے آراضیاں مفت دی جائیں۔

٢۔ صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لیے خاص وظیفے دیے جائیں۔

٣۔ کارخانے اور دیگر کام جاری کرنے کے لیے روپے دے کر امداد کی جائے۔

یہ مطالبات عوام کو درپیش اہم ترین معاملات کے مقابلے میں بالکل جزوی تھے۔ لیکن ہم نے گلینسی کمیشن کو جو یادداشت پیش کی تھی اُس کے دائرے میں ان شکایات کا انسداد بھی شامل تھا۔ اور کمیشن کی سفارشات کو منظور کرتے ہوئے حکومت نے جو اعلانیہ شائع کیا تھا اس میں بھی یہ انسداد مضمر تھا۔ لیکن حیلہ گر را بہانہ بسیار۔ اُنھوں نے واقعات کو گڈمڈ کرنے اور اصل شکایات سے توجہ ہٹانے کے لیے یہ ایجی ٹیشن شروع کی۔ پنجاب کے رجعت پسند ہندو پریس نے اس کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور ہندو مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے ایک وفد لے کر مہاراجا ہری سنگھ سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تاکہ انھیں گلینسی کمیشن پر عمل درآمد نہ کرنے کی ترغیب دی جائے۔ لیکن کرنل کالون نے ہُشیاری کا ثبوت دے کر اس بیل کو منڈھے نہ چڑھنے دیا۔ اس ایجی ٹیشن سے ایک نقصان یہ ہوا کہ وادی کے پنڈتوں اور مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ حالانکہ وہ صدیوں سے رواداری اور آشتی کے اُن رشتوں میں بندھ کر بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ جنھیں ہمارے صوفیوں اور سنتوں نے اپنی تعلیمات کا دودھ پلایا تھا۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوئے اور فضا میں بڑی دیر تک تلخی اور کشیدگی چھائی رہی۔

اسی دوران ۴ر جون ۳۳ء کو مجھے جیل سے چھ ماہ کی مدت قید پوری کرنے سے قبل ہی رہا کر دیا گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی تنظیم کی صفوں کو درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اُس وقت تک ریاست کے مسلمانوں کی نمائندگی اُن گیارہ اصحاب کے ہاتھ میں تھی جن کو عوام نے چُنا تھا۔ لیکن اب اِس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ ایک باقاعدہ تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے جس کا اپنا آئین ہو اور جو اس آئین کے تحت مقررہ قواعد و ضوابط کے چوکھٹے میں کام کرے۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ ہم اس تنظیم میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی شامل کر لیں۔ لیکن بدقسمتی سے صورت کچھ ایسی تھی کہ غیر مسلموں کا فعال اور با اثر طبقہ اس بات کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور وہ اس کو ماننے سے گریز کر رہا تھا۔ پنڈت کشپ بندھو، یووک سبھا کے لیڈر کی حیثیت سے کشمیری پنڈتوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ چنانچہ میں اور عشائی صاحب اُن سے عالی کدل کے ایک معزز کشمیری پنڈت رام چند کول بنیکر کے گھر پر ملے۔ کافی دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور بندھو جی نے بھی اصولی طور پر ایک متحدہ تنظیم کے قیام کی حامی بھر لی۔ لیکن اُنھوں نے اعتراف کیا کہ پنڈت جاتی کے لیے یہ فیصلہ قبول کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو گا۔ لیکن ہم نے اُن سے کہا کہ اس کے باوجود ہندو لیڈروں کو ہمارے ساتھ وقتاً فوقتاً مل بیٹھنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح سے دلوں کے فاصلے بڑھنے کی بجائے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ بہرکیف ہم اپنی نئی تنظیم کا تانا بانا بُننے میں مصروف ہو گئے۔ دریں اثنا شہر میں اسلامیہ اسکول کے بچوں کے ایک جلوس پر، جو صفائی کے ہفتے کے سلسلے میں جا رہا تھا، گنپت یار کے پنڈت علاقے میں ایک جانی بوجھی سازش کے تحت حملہ کیا گیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر پیرزادہ

غلام رسول کے تحمّل سے کسی طرح معاملہ ٹل گیا مگر بات پھیل گئی۔ اُدھر پنڈتوں کے ایک سرکردہ لیڈر پنڈت جیالال کلم نے اُن کے مرکز شیتل ناتھ میں ایک بڑی اشتعال انگیز اور زہر آلود تقریر کی۔ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ہندو پہلے ہی مُسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اب بے قابو ہو کر اُن پر جھپٹ پڑے۔ چنانچہ شہر میں جو ابی کارروائیاں بھی شروع ہو گئیں اور فرقہ وارانہ فسادات کا کارزار گرم ہو گیا۔ حالات اس قدر ابتر ہو گئے کہ ۲۴ ستمبر کو مہاراجا ہری سنگھ کی سالگرہ کی تمام تقریبات جو دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں، منسوخ کر دی گئیں۔

اُن ہی دنوں کا ایک المناک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ سرینگر کے ایک محلّے بھوری کدل میں ایک کشمیری پنڈت گوبند رام کی لڑکی کا قدرتی وجوہات سے انتقال ہو گیا۔ شہر میں حالات کشیدہ تھے اس لیے بے چارہ پنڈت تین دن تک ڈر کے مارے لاش کو گھر سے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ اور لاش کے سڑ جانے کا امکان تھا۔ میں اُن دنوں امن و امان بحال کرنے کے لیے شہر کا گشت کر رہا تھا۔ بھوری کدل پہنچا تو اس لرزہ خیز صورتِ حال کی رپورٹ مجھ تک پہنچی۔ میرے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور مجھے اس بات پر سخت افسوس ہوا کہ کشمیر میں اِس قسم کی وارداتوں کی نوبت آ پہنچی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی حفاظت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کشمیری پنڈت کے گھر کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بچارے سہمے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اور لاش کے اردگرد آنسو بہا بہا کر بے حال ہو رہے ہیں۔ میں نے لڑکی کی لاش کو اُٹھوا کر ایک کشتی میں رکھوایا اور چھتہ بل سے نیچے شمشان گھاٹ تک پہنچانے لے گیا۔ میرے ساتھ لڑکی کے کچھ رشتے دار بھی آخری رسومات میں حصہ لینے کے لیے آئے۔ جب ہم دریا سے گزرے تو مسلمانوں نے مجھے کشمیری پنڈتوں کے ساتھ دیکھ لیا۔ مزاج بگڑے ہوئے تو تھے ہی۔ اُن سے دیکھا نہ گیا اور انہوں نے مجھ پر آوازے کسنا شروع کر دیے۔ میں نے اُن کو نظر انداز کر دیا۔ اور اُس وقت تک واپس نہ آیا جب تک چِتا خاموش نہ ہوئی۔ اس واقعے کی خبر بعد میں کشمیری پنڈت حلقوں میں پھیل گئی اور اُس کا بہت اچھا ردِ عمل ہوا۔

اس وقت مسٹر جارڈین امن و قانون کے ذمہ دار تھے۔ میری سرکردگی میں مُسلمانوں کا ایک وفد اُن سے ملا۔ اور اُن کے سامنے فسادات سے متعلق حقائق اور اپنا نقطۂ نظر رکھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ فسادات کی ابتدا کشمیری پنڈتوں نے کی اور وہی اس پر تیل چھڑکتے رہے۔ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ فسادات ہوتے ہی شہر میں ہندو ڈوگرہ فوج پھیل جائے گی اور وہ فوج کے ذریعے مُسلمانوں کا قافیہ تنگ کرائیں گے۔ ہمیں بھی یہی کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم نے جارڈین صاحب سے درخواست کی کہ ہر ناکے پر جو دستے تعینات کیے جائیں اُن میں نصف مسلمان ہوں اور نصف غیر مُسلم۔ تاکہ دونوں فرقوں کو حفاظت کا احساس ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ مُسلم آزار منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ پنڈت صاحبان کے ہتھکنڈے کسی حد تک اُلٹے پڑنے لگے۔ کیوں کہ وہ تین دن تک گھروں سے باہر نہ نکل سکے اور مسلمانوں سے دُودھ، سبزی، ترکاری، گوشت وغیرہ حاصل نہ کر سکے۔ آخر کار وہ صلح و صفائی پر آمادہ ہو گئے۔ اور ہم نے بھی اُن کی اس پہل کا خیر مقدم کرتے ہوئے دوستی کا ہاتھ تھام لیا۔ مُسلم نمائندوں کی طرف سے ہندو مُسلم اِتحاد کی اپیل شائع ہوئی۔ جس پر کشمیری پنڈت راہنماؤں نے بھی دستخط کیے تھے۔ دُوسرے دن میری سرکردگی

میں مسلمان اور پنڈت لیڈروں نے شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ ہم نے جگہ جگہ جلسے منعقد کیے جن میں ہندو مسلم بھائی چارے کے موضوع پر تقریریں کیں۔ خوش قسمتی سے ہماری یہ کوششیں کامیاب ہوگئیں۔ امن و امان قایم ہوگیا اور پنڈت اور مسلمان پھر اپنی روایات کے مطابق ہمدم و دمساز بن کر رہنے لگے۔

▲▲▲

۲۰

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں

مولوی یوسف شاہ اگرچہ ہندو مسلم فسادات کے بعد اُبھرنے والے ماحول میں مسلم کانفرنس کے پہلے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آئے لیکن اُن کا دل اس جماعت میں نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اُن کی خاندانی اجارہ داری پر ضرب پڑی تھی۔ اور اب مسلمانانِ کشمیر اُن کی طرف رہنمائی کے لیے نہ دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس میری ذات لوگوں میں احترام کے زیادہ جذبات پیدا کرتی تھی اور میرے جلسوں میں اُن کے اجتماعات سے زیادہ لوگ شامل ہوتے تھے۔ مولوی صاحب تھے تو ایک سادہ منش اور شریف انسان مگر اُن کو پٹی پڑھانے والے حکومت میں بھی تھے اور ہندوؤں میں بھی۔ یہ لوگ عوامی تحریک کو کمزور کرنے کی ایک ہی تدبیر سمجھتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دی جائے۔ میرواعظ یوسف شاہ صاحب اُن کے کہنے سننے میں آگئے۔ دلوں میں فساد کا بیج پڑ گیا۔ اور بہت جلد برگ و بار لانے لگا۔

میرواعظ صاحب کی چھوٹے میرواعظ یعنی میرواعظ ہمدانی کے ساتھ بھی چشمک رہتی تھی۔ ان کے آبا تو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ لیکن بعد میں انفرادی

مفادات نے انہیں ایک دُوسرے کا رقیب اور حریف بنا دیا تھا۔ میر واعظ کلاں یعنی یوسف شاہ صاحب کے پیرو کوٹہ کہلاتے تھے اور دیو بندی مکتبِ خیال سے زیادہ نسبت رکھتے تھے۔ میر واعظ خورد یعنی ہمدآنی صاحبان کے پیرو ژبجہ کہلاتے تھے اور یہ "فرنگی محل" لکھنؤ کے خیالات سے زیادہ نزدیک تھے۔ عقائد کے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو یہ خوب ہوا دیتے تھے اور اس طرح اپنے اپنے عاشقوں کو کٹ مرواتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ باعثِ تنازعہ تھا کہ مغیرہ جبشیؓ صحابی تھے کہ نہیں۔ درود خضوریہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ نکاح پر کھجوریں اور شیرینی بانٹ دی جانی چاہیے یا پھینک دی جانی چاہیے؟ قربانی کے جانوروں کی ہڈیاں پھینک دی جانی چاہئیں یا دفن کر دینی چاہئیں؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔ انہی غیر ضروری اور غیر اہم باتوں کو اُچھال کر ان کے پیروکار برسرِ پیکار رہتے تھے۔ معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ حکومتِ وقت کو ان دونوں میر واعظوں کے لیے وعظ گاہوں کا بٹوارہ کرنا پڑا۔ جامع مسجد پر بڑے میر واعظ اور خانقاہِ معلّی پر چھوٹے میر واعظ کا حق ناطق تسلیم کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں اہلِ سنّت و اہلِ حدیث جماعت کا جھگڑا بھی کافی زور و شور سے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اہلِ حدیث اہلِ سنت والجماعت کی کسی مسجد میں نماز کے لیے جاتا تھا اور رفع یدین یا آمین بالجہر کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کو مسجد کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا جاتا تھا اور مسجد کی چٹائیوں کو تزکیہ کے طور پر دھو لیا جاتا تھا۔ عدالتوں میں مقدمے دائر ہوتے تھے اور غیر مُسلم ججوں کے سامنے مسلمانوں کی قابلِ تعظیم مذہبی کتابیں مثلاً صحیح بخاری، مشکوٰۃ اور حدیث و فقہ کی کتنی ہی کتابیں پیش کی جاتی تھیں اور اس میں کوئی شرم محسوس نہ کی جاتی تھی۔

احمدی اور غیر احمدی کا جھگڑا تو تھا ہی اور وہ فتنہ و فساد کا بڑا سبب تھا۔ اہلِ تشیع ایک طرف تو سُنیوں سے بیزار تھے اور دُوسری طرف اُن کا آپس میں بھی تضاد تھا۔ اور وہ بھی کئی گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ الغرض مسلمانوں کا شیرازہ بہ حیثیت قوم مکمل طور پر بکھر چکا تھا۔ اور حکومتِ وقت کی اس صورتحال سے چاندی ہی چاندی تھی۔ مسلمانوں کو اپنے حقوق اور اپنی بہبودی کے لیے سوچنے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ اُن کے رہنما آپس میں دست بگریبان رہتے یا قوم کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشی حالت سدھارنے کے پاپڑ بیلتے؟ ان حالات میں اُس وقت تک کسی قومی تحریک کا خیال لانا محال تھا جب تک کہ قوم کے اُن منتشر اجزا کو کسی نہ کسی طریقے سے ایک لڑی میں نہ پرو دیا جاتا۔ چنانچہ ہم نے اسی کام کو ہاتھ میں لیا اور اس میں خواجہ غلام احمد عشائی نے میرا ہاتھ بٹایا۔ عشائی صاحب اُن مُسلم نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے انجمن نصرۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کرکے اعلیٰ سند لی تھی۔ حکومت نے ایک معمولی شکایت پر انہیں تیس روپے ماہوار پنشن پر ریٹائر کر دیا تھا۔ وہ کافی ذہین تھے اور سرینگر کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے اُن کا سرینگر کے طبقۂ اُمراء سے گہرا تعلق تھا۔ تحریک کی ابتدا میں جب ہم نے شہر کی جامع مسجد اور دیگر مقامات پر عام جلسے کرنا شروع کر دیے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہماری تقریریں سُننے کے لیے آنے لگے تو مسلم عوام میں جوش و خروش کی بڑی خوش کُن کیفیت پیدا ہونے لگی۔ قدرت نے مجھے خوش گلوئی کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ میں قرآن مجید کی مقدس آیات اور علامہ اقبال کے دلکش اشعار بہت خوش الحانی سے پیش کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کشمیری ظُلم کھا اپنے سینے میں محبوس آہ و فغان کو باہر لا کر ایک تسکین پا رہے تھے۔ میرا یہ طرز عوام کو

بہت بھاگیا تھا۔ صدیوں کے بعد مسلمانوں کے دبے جذبات ایک نغمہ اور نالہ بن کر بہہ رہے تھے۔ اس لیے میری ذات بہت جلد مقبولِ عام ہوگئی۔ شیرِ کشمیر زندہ باد کے نعرے ہر گلی بلکہ ہر گھر میں بلند ہونے لگے۔ مولوی احمد اللہ کے گذر جانے کے بعد میرواعظ کلاں کے خانوادے میں میرواعظ عتیق اللہ اور اُن کے بعد میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ کا نام آتا تھا۔ اُن کو اپنا ہمنوا بناتے رکھنا ہمارے لیے بہت ضروری تھا کیوں کہ اس خاندان کا کشمیر میں کافی اثر و رسوخ تھا۔ اگر وہ مخالفانہ روش اختیار کرتے تو ہم یقینی طور پر گھاٹے میں رہ جاتے۔ خوش قسمتی سے مولوی یوسف شاہ صاحب نوجوان تھے۔ تحریکِ خلافت کے دوران وہ دیوبند میں طالب علم رہ چکے تھے۔ اور اس تحریک کا اثر قبول کر چکے تھے۔ مولوی یوسف شاہ کو ہماری تحریک سے بھی ہمدردی تھی۔ اور اُس نے اپنے بزرگوں کو ہماری طرف مائل رکھا۔ تحریک زور پکڑتی گئی۔ اور ہم نے حکومت کے کہنے پر گیارہ نمائندے چن لیے۔ نمائندے چنتے وقت یہ حکمتِ عملی ملحوظِ خاطر رہی کہ ہر طبقۂ خیال کے نمائندے شامل کیے جائیں۔ دونوں میرواعظ نمائندوں کی صف میں آ گئے۔ لیکن اُن کی رقابت کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کاغذ پر دستخط کرنا ہو تو دونوں میں سے کوئی اپنے حریف کے دستخط کے نیچے دستخط ثبت کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اور دونوں کا اصرار ہوتا تھا کہ وہی پہلے دستخط کرے۔ ہم نے اس مصیبت کا علاج یہ نکالا کہ کاغذ کی ایک ہی سطر میں ایک میرواعظ صاحب دائیں اور ایک بائیں جانب دستخط کیا کرے۔ راقم الحروف سب سے نیچے دستخط کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے اپنی رومی ٹوپی، جو میں اُن دنوں پہنا کرتا تھا، اُن کے پاؤں میں ڈالنا پڑی کہ وہ اپنے نجی مسائل کو تحریک کے مسائل سے الگ رکھیں۔ مولوی یوسف شاہ کو میرے مقابلے میں عوامی سطح پر جو کمزوری محسوس ہوئی اُس نے اُن کو اور بھڑکا دیا۔ حکومت تو اُن کی رگِ انا پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔ اُس نے انہیں زور آزمائی کے لیے اُکسانا شروع کیا۔ خود میرواعظ کے حامیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کے مفادات حکومت سے اشتراک کی پالیسی میں ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان میں شال کے ایک مشہور تاجر خواجہ غلام محمد پنڈت بھی تھے۔ انہوں نے ہی حکومت کے ساتھ میرواعظ کی درمیانہ داری کی اور خود میرواعظ کو ایک آخری معرکہ آرائی کے لیے آمادہ کیا۔ وہ کبھی مجھ پر قادیانیت کا الزام لگادیتے اور کبھی نصرانیت کا جس کے ثبوت میں وہ ریش اور لباس کی دلیل پیش کرتے تھے۔ بعد میں میرے طرفدار شیر اور میرواعظ کے پیرو کار بکرا کہلائے۔ اور دونوں کے درمیان میدانِ کارزار گرم ہوتا رہا۔ یہ خانہ جنگی آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ وہ خاندانی وجاہت اور حرص و ہوس کا لالچ ہے۔ جو اس خاندان کے افراد کو لاحق ہوگیا ہے۔ یہی اس خاندان کا دائرۂ رسوخ سکڑ جانے کا باعث بنا ہے۔ اور اب تو اس کے پیرو اندرون شہر کے چند حصوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کے زعم نے ہی ان کی یہ حالت بنا دی ہے۔ بقول اقبالؔ ۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کا دن تھا۔ میرواعظ محمد یوسف شاہ خانقاہ نقشبندیہ میں وعظ خوانی کے لیے تشریف لے گئے۔ اور وعظ خوانی کے دوران ہی انہوں نے مجھ پر قادیانی عقیدے سے منسلک ہونے کا الزام عاید کیا۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ بہتان

تراشی ہے اور میرے عقاید سُنی حنفیہ مسلک کے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مولانا کو ٹوکا۔ اس بات پر سرکشی کی نوبت آگئی۔ اور مخالفین آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ کشمیری اُن دِنوں "کانگڑی" کو متاعِ عزیز کی طرح سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ان آتشبار میزائلوں کا خوب استعمال ہوا اور بہت سے بے گناہ لہولہان ہو گئے۔ اس طرح سے اس نئے فتنے نے سر نکالا لیکن ہم نے اس اشتعال انگیزی کو نظر انداز کر دیا۔

اسی دوران مجھے پھر لاہور کا رُخ اختیار کرنا پڑا۔ میں وہاں ایک تو مسلمان لیڈروں کو صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اُن کی رائے لینا چاہتا تھا۔ دوسرے ہمارے خلاف وہاں سرکاری ایجنسیاں اور راجواڑہ نواز ہندو پریس جو پروپیگنڈا کر رہا تھا اُس کا بطلان بھی کرنا چاہتا تھا۔ ۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو عید الفطر کی تقریب تھی کہ کشمیر سے ایک قیامت خیز فتنۂ مسلمین کی خبر آئی۔ بات یوں ہوئی کہ شہر کے حالات کے پیش نظر حکومت نے میرواعظ یوسف شاہ سے کہا تھا کہ وہ عید کے دن عید گاہ نہ جائیں۔ جہاں مولانا ہمدانی وعظ خوانی کریں گے اور مولانا ہمدانی کو کہا گیا تھا کہ وہ عید گاہ میں نماز پڑھیں۔ میرواعظ صاحبان نے اس موقع کو اپنی طاقت آزمائی کے لیے استعمال کرنے کے لئے کمر باندھی۔ مولوی یوسف شاہ عید گاہ پہنچ گئے۔ لیکن اپنے قلعہ یعنی جامع مسجد کو کھلا چھوڑ گئے۔ مولانا ہمدانی نے اس کا فائدہ اُٹھا کر جامع مسجد کے منبر سے وعظ خوانی شروع کر دی۔ نتیجہ معلوم تھا۔ مسلمانوں کے دو گروہوں میں بڑے خوفناک فسادات ہوئے۔ جس میں سیکڑوں لوگ مجروح ہو گئے۔ حکومت بھی شعلوں کو ہوا دیتی رہی میرواعظ یوسف شاہ کے حامیوں نے میرے پیروؤں کے ساتھ بھی حساب چکانا شروع کر دیا۔ شہر میں

"شیر بکرا" تنازعے نے بڑی ناخوشگوار کروٹ لی۔ حکومت نے دونوں میرواعظ حضرات کا تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۰۷ کے تحت بلوہ کرنے کے الزام میں چالان کر دیا۔ اور ان سے ایک ایک ہزار روپے کی ضمانتِ نیک چلنی طلب کر لی۔ میرواعظ ہمدانی نے حکم کی تعمیل کی لیکن میرواعظ یوسف شاہ اِس کو اپنی شان اور منصب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور شاید وہ یہ بھی خیال کرتے تھے کہ حکومت کے ساتھ اُن کی جو ملی بھگت تھی، اس کے پیش نظر اُن پر ہاتھ نہیں اُٹھایا جائے گا۔ لیکن اُنہیں گرفتار کر کے ۲۴ اپریل کو اُدھمپور جیل میں پہونچا دیا گیا۔ حُسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ جس دن میرواعظ یوسف شاہ کو گرفتار کر کے اُدھمپور لایا جا رہا تھا اُسی دن سے میں بھی میر مقبول گیلانی کے ساتھ جموں سے سرینگر آ رہا تھا۔ کُد میں میرواعظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بے چارے پہلی بار اس ٹنٹے میں پھنسے تھے۔ اس لیے اس خارزار کے زادِ راہ سے ناواقف تھے۔ اپنا بستر تک لانا بھول گئے تھے۔ میں نے کُد میں اُن سے رخصت ہوتے وقت اپنا بستر، تولیہ اور صابن وغیرہ اُن کے حوالے کیا۔ میرواعظ صاحب زیادہ دیر تک جیل میں ٹک نہ سکے اور ۳ مئی کو انہیں سرینگر لا کر رہا کر دیا گیا۔ اُن کی رہائی کے بعد کشمیر میں امن رہا۔ کیونکہ شہر کے چند محلوں کے بغیر وادی بھر میں اُن کا اثر و رسُوخ غائب ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر اُنہوں نے چند ہی دنوں کے اندر پوری کر دی۔

مولوی غلام نبی مُبارکی صاحب میرواعظ جماعت کے سرخیل اشخاص میں سے ایک تھے۔ اُنہوں نے چھتہ بل کی مسجد میں ایک بڑی ناعاقبت اندیشانہ اور اشتعال پھیلانے والی تقریر کی۔ جس کے فوراً بعد نعلبند پورہ میں ایک بلوہ ہوا اور ہمارے حامیوں میں سے ایک جوان محمد خلیل وانی اپنی قیمتی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اُس کا جنازہ اُٹھا تو میں بھی جلوس میں شامل ہوا۔ اور دیکھئے

ہی دیکھتے ایک بڑا اجتماع ہوگیا۔ میں نے مرحوم کی تدفین کے بعد ماتمی جلسے میں میر واعظ اور اُس کے حواریوں کی فتنہ انگیزیوں پر اُن کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ نتیجہ میں مجھے خواجہ غلام نبی گلکار، مفتی ضیاء الدین پونچھی اور بخشی غلام محمد کی معیت میں گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے خطرناک عواقب سے واقف تھی۔ اس لیے شہر میں پھر دفعہ ۱۹-ایل نافذ کر دی گئی اور اخبارات جن میں مسلم کانفرنس کا ترجمان "صداقت" بھی شامل تھا کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو جیلے تو اُدھمپور جیل بھیج دیا گیا اور گرمیوں میں ہمیں بٹوت کے ایک بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ شہر کا وزن برابر رکھنے کے لیے دوسری جماعت سے منشی اسداللہ وکیل اور کچھ دُوسرے کارکنوں کو بھی دھر لیا گیا۔ ہماری گرفتاری کے خلاف شہر میں مظاہرے ہوئے۔ امیراکدل اور مائیسمہ میں حکومت نے گولی چلا دی۔ اُدھر شیر بکرا فساد بھی زوروں پر تھے۔ حکومت نے فساد زدہ علاقوں میں تعزیری چوکیاں قایم کیں۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہندو اور سکھوں کے ساتھ ساتھ میر واعظ یوسف شاہ کے حامی بھی جرمانے سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ حکومت کے اس حکم نامے کا متن بے حد دلچسپ ہے۔

"حضور مہاراجہ بہادر نے منظور فرمایا ہے کہ تعزیری چوکی چھ ماہ کے لیے مائیسمہ میں قایم کی جائے اِس کے اخراجات ایک ہزار آٹھ سو انتالیس روپے ہوں گے۔ اور یہ رقم اُن اشخاص سے وصول ہوگی جو نہ ہندو، نہ سکھ اور نہ یوسف شاہی مسلمان ہوں گے۔"

اب بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی اور میر واعظ صاحب کے سرپرستوں کے اصلی چہرے نگاہوں کے سامنے آگئے تھے۔ عوام میں اس جانبدارانہ اور سراسر

انتقام گیرانہ حکم کا بڑا شدید ردعمل ہوا۔ اور عوام نے پھر احتجاجی تحریک شروع کی۔ وار کونسل کا قیام پھر عمل میں لایا گیا۔ اور خانقاہِ معلّیٰ میں تقاریر کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اب کی بار اس قدر لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا کہ حکومت عاجز ہوگئی اور اُس نے انہیں جیل لے جانے کے بدلے سرسری سماعت کے بعد کوڑے مارنے پر ہی اکتفا کرنا موزوں خیال کیا۔ اُدھر مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر شیخ عبدالحمید اور دوسرے اصحاب نے رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ حکومت کو پھر معقولیت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہمیں ۷ راگست ۱۹۳۳ء کو بٹوت سے رہا کیا گیا۔ ۱۵ راگست کی شام کو رہا ہونے والے رہنماؤں کے استقبال میں حضوری باغ میں جلسہ ہوا۔ جس میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔

ہماری رہائی کے بعد حکومت نے پھر تحریک کی تیز دھار کو کند کرنے کے لیے مسلمانوں کے افتراق کو شدید بنانے کے لیے چالیں شروع کیں۔ اُن کے ہاتھ میں ترپ کا یکہ تھے مولوی یوسف شاہ۔ چنانچہ ۱۷ راگست کی شام کو مولوی یوسف شاہ زیارت پیر دستگیرؒ صاحب واقع سرائے بالا میں وعظ خوانی کے لیے تشریف لے گئے۔ انہیں کسی نے بلایا نہیں تھا۔ بلکہ اس علاقے کے باشندے اُن کے آنے سے ناراض ہو گئے۔ اس لیے مولوی صاحب اپنے ساتھ اپنے سامعین کی بڑی تعداد بھی اپنے محلے سے ہی لے آئے۔ جن میں مستورات کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ مسلمانوں کے دو گروہ ٹکرائے۔ خود میر واعظ صاحب کو پولیس بڑی مشکل سے ہجوم کے غیض و غضب سے بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ میر واعظ صاحب کے حامی اپنی گلیوں میں اس پسپائی کا بدلہ چکانے پر کمربستہ ہو گئے۔ حکومت کے کارندے

بھی اُن کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اس طرح اندرون شہر کے علاقوں میں لوٹ مار اور مار پیٹ کے واقعات پیش آئے۔ اپنے اپنے مضبوط گڑھوں میں فریقِ مخالف کی خوب خبر لی جاتی تھی۔ جہاں کہیں مخالف نظر آیا، تاڑنے والے نے فوراً آواز لگائی "یا علی" اس کا جواب یوں ہوتا تھا "ملِلی" جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اُس کی پگڑی چھین لی جائے۔ چشم زدن میں بیچارے نرغہ میں آئے ہوئے شکار کی پگڑی غائب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح "حیدری" کے نعرے کا جواب "چادری" سے دیا جاتا تھا۔ اور شخص مذکور کی چادر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس فتنۂ بے امان کی زد میں میرے بڑے بھائی مرحوم شیخ محمد مقبول بھی آگئے۔ وہ ایک علاقے سے گذر رہے تھے۔ جہاں مولوی یوسف شاہ کے حامیوں کا غلبہ تھا کہ اُن پر حملہ کیا گیا۔ اور بڑی مشکل سے اُن کی جان چھوٹی۔ اس لڑائی نے ایسی خوفناک صورت اختیار کی کہ شوہروں نے اپنی بیویوں کو اسی بنا پر طلاق دی کہ اُن کے مائیکے والے ایک یا دوسرے فریق کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مولوی یوسف شاہ ظاہرداری کے نقاب سے باہر آگئے۔ اُنھوں نے جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر کے آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے اپنی جماعت قایم کی۔ خواجہ عبدالرحیم بانڈے، منشی اسد اللہ وکیل، خضر محمد ڈرو، منشی اسد اللہ سوکال پورہ، غلام محمد ملک عرف ماہیہ بربزو، کنہ کدل، میرواعظ خاندان کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے آزاد مسلم کانفرنس کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا اور خواجہ عبدالسلام دلال میرواعظ کے مشیر خاص بنے رہے۔

آزاد مسلم کانفرنس کا پہلا اور آخری اجلاس جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ شیر

پارٹی نے اس کانفرنس کا مذاق اُڑانے کے لیے ان ہی تاریخوں پر ایک اور کانفرنس بُلانے کا اعلان کیا۔ جو بعد میں "شورہ" (نشے والوں) کی کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بھی مندوبین شریک ہوئے اور خوب تقریریں کی گئیں۔ الغرض یہ دور مسلمانوں کے لیے انتہائی تفریق و انتشار کا دور تھا لیکن انتشار کی ظاہری صورت کے پیچھے قدیم و جدید کی آویزش نہایت واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

ہر سماج جب پُرانے اور فرسودہ خول کو توڑ کر نئے نظریات کی جانب لپکتا ہے تو پُرانے اور نئے کی کشمکش صرف ایک لازمی ہی نہیں بلکہ لابدی امر بھی بن جاتی ہے۔ شاید مولانا رومیؒ نے اسی امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

مطلب یہ ہے کہ جب تک قدیم تعمیر ڈھائی نہ جائے جدید تعمیر کے لیے راستہ ہموار نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم نے بڑی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں میں اُس نازک مرحلے پر پھوٹ نہ پڑے۔ لیکن تاریخ کی جدلیاتی قوتیں ہم پر خندہ زن رہیں۔ مولوی یوسف شاہ اگرچہ ذاتی طور پر کچھ پڑھے لکھے بھی تھے لیکن وہ جس طبقے کی ترجمانی کرتے تھے۔ اُس کے مفادات پر نئی بیداری سے چوٹ پڑتی تھی۔ لہٰذا وہ اُس طبقے کے نشان بن گئے اور اُن کے طبقاتی کردار نے اُنھیں نشاۃ الثانیہ کے ریلے کو رکانے کے لیے آمادہ کر دیا۔ جس کے آغاز کے لیے اُنھوں نے بھی ابتدا میں کوششیں کی تھیں۔ مگر جو اپنے نظری بہاؤ میں اب اُن کے مفادات کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ مسلمان اس کشمکش کو شعوری طور سے نہ سہی مگر وجدانی سطح پر پہچانتے تھے۔ اُنھوں نے محدود دائروں سے نکل کر بڑے مفادات کی پاسداری

کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح سے میرواعظ صاحب اس دھارے میں بہہ کر رہ گئے۔ اُدھر حکومت اور عوامی تحریک کے دشمن بھی افتراق اور انتشار کے رجحانات کو تقویت دے رہے تھے۔ لیکن تاریخ کی ناگزیر منطق نہ حکومت اور نہ میرواعظ صاحب کی تابع تھی۔ اُس نے وقت کے تقاضے کا ساتھ دیا اور آزاد مسلم کانفرنس تحریکِ آزادی کے بھگوڑوں کے اجتماع کے مترادف قرار پائی۔ بعد میں میرواعظ صاحب اور اُن کے حامیوں نے مختلف روپ دھارن کرکے تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن کشمیری عوام اپنے عمل سے اُنہیں بھی جواب دیتے رہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

لیکن اِس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

اُدھر مسلم کانفرنس کی تنظیم کا ڈھانچہ سارے ملک میں پھیل رہا تھا۔ اور اس کے پرچم تلے عوام کی عظیم اکثریت نجات اور آزادی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران صوفی محمد اکبر، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، محمد مقبول بیہقی بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، راجہ محمد اکبر میرپور، مولوی عبداللہ بساکھی، حاجی دہاب الدین، غلام قادر بانڈے پونچھی جیسے اصحاب اِس کی صفوں میں نمایاں ہوئے اور اُس کی تنظیم میں جُٹ گئے۔ بخشی غلام محمد کو رضاکار دستے کی قیادت سونپی گئی۔ جن کے لیے خاص وردی بھی مقرر ہوئی اور بینڈ باجہ بھی منگوایا گیا۔

مسلم کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۵-۱۶-۱۷ دسمبر ۱۹۳۲ء کو میرپور میں ہوا۔ اور اس کی صدارت کا اعزاز بھی میرے حصے میں ہی آیا۔ ریاست کے اطراف و اکناف سے مندوبین نے اس میں شرکت کی۔ میرے خطبۂ صدارت

میں آزادیٔ تحریر پر پابندی، لیجسلیٹو اسمبلی کو تشکیل نہ دینے، مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں تناسب کے حساب سے حصہ نہ ملنے، زراعت پیشہ اور مزدوروں کی طرف حکومت کی لاپرواہی اور کالے قانونوں کے نفاذ پر حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کے درمیان اِتحاد کی ضرورت ہے۔ میں نے اسی موقع پر "اتحاد زندگی ہے اور تفرقہ موت" کا نعرہ بھی بلند کیا۔ میں نے اپنے خطبے میں غیر مسلموں کو بھی عوامی تحریک میں حصہ لینے کی دعوت دی اور کہا۔

"مسلم کانفرنس کے پیش کردہ مطالبات صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بلکہ ان سے ریاست کا ہر فرقہ مستفید ہو سکتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنے ہم وطن مسلم بھائیوں سے مِل کر اس قومی اِتحاد کو مضبوط بنانے کے لیے آگے نہ آئیں۔"

اجلاس میں شرکت کے لیے ہم نے کشمیریوں کے مربّی، محسن اور کشمیریوں کی حالتِ زار پر آنسو بہانے والے عظیم شاعر حضرت علامہ اقبالؒ کو بھی دعوت دی تھی۔ دعوت کا جواب دیتے ہوئے اُنہوں نے میرے نام جو خط لکھا تھا اُس کا عکس کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ البتہ انہوں نے اِس خط میں ایک ماہر نباض کی طرح ہماری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے آپسی اِختلافات حل نہ کریں اُس وقت تک کامیابی حاصل کرنا مشکل ہوگی۔

مسلم کانفرنس سے احمدیوں کی علیحدگی نے کچھ اور شگوفے کھلائے۔ سرینگر میں ینگ مینز ایسوسی ایشن مرزائیت کے غلبے سے مسلم کانفرنس کو بچانے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس ذیلی انجمن کا جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے تو اِلحاق تھا

لیکن اس کے نوجوان رہنما مولانا محمد سعید مسعودی کی قیادت میں اپنا وجود منوانے کے لیے بے قرار تھے۔ میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے بعد لاہور چلا گیا تو مینز ایسوسی ایشن نے ایک مسلمان اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس حکیم حبیب اللہ کی تنزلی کو بہانہ بنا کر بڑی سخت ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ وار کونسل قایم کی گئی اور تقریر بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ادھر ۱۴ر جنوری ۱۹۳۳ء کو عید کے دن حکومت نے احتیاط کے طور عید گاہ میں ڈنڈا پولیس تعینات کر دی۔ اور میر واعظ محمود مولانا ہمدانی صاحب کے عالی مسجد میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو موقع ہاتھ آیا اور اس نے اس اقدام کو مذہب میں مداخلت قرار دے کر ایجی ٹیشن تیز کر لی۔ حکومت نے مولانا مسعودی اور ان کے ساتھیوں صدر الدین مجاہد، محمد مقبول بیہقی وغیرہ کو ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا۔ شہر میں ۱۴۴ نافذ کر دیا گیا۔ میر واعظ ہمدانی کو سیاسی تقریریں کرنے سے منع کیا گیا۔ لیکن وہ بڑھاپے میں کفنی پہن کر اس حکم کی خلاف ورزی کے لیے اسٹیج پر آئے۔ انہیں بھی گرفتار کر کے لاہور جلا وطن کر دیا گیا۔ بخشی غلام محمد کو ریاسی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور خواجہ غلام محی الدین ہمدانی (زہرہ)، خواجہ غلام محی الدین قرہ، خواجہ محمد یوسف قریشی کو خانقاہ معلی میں تقریریں کرنے کی پاداش میں بارہ بارہ سو روپے جرمانے اور ایک ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ صورتحال بگڑتی گئی اور پلوامہ میں پولیس کی گولیوں سے درجن بھر افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ میں اس صورتحال کا تشویش و اضطراب سے مطالعہ کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے سیالکوٹ میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر لیا تاکہ حالات پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کر کے آئندہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ میری صحت اس وقت کافی گر چکی تھی۔ میں تین سال

کے عرصے میں تین دفعہ قید کاٹ چکا تھا۔ جہاں مجھ سے سخت مشقت بھی کرائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جب جیل سے باہر بھی ہوتا اس وقت بھی تحریک کے معاملات میں جسم و جان کی فکر بھول جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اور میرا وزن بھی گھٹ گیا تھا۔ میرا علاج معالجہ جاری تھا اور مجھے آرام کی صلاح دی جا رہی تھی۔ لیکن صورتحال کا تقاضا عمل اور سرگرمی تھی۔ بہرکیف اجلاس طلب ہوا تو اس میں بیس کے قریب ممبران مجلس عاملہ نے شرکت کی۔ جن میں چودھری غلام عباس بھی شامل تھے۔ اکثر ممبران بھیس بدل کر ریاست سے باہر آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ نوجوانوں نے جو ایجی ٹیشن شروع کی ہے اس کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ نوجوانوں کے مخلص جذبات کا اعتراف کرنے کے باوجود یہ ایک حقیقت تھی کہ اس ایجی ٹیشن سے اصل معاملات سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ نوجوانوں نے جس طور مسلم کانفرنس کی رضامندی کے بغیر ہی ایجی ٹیشن شروع کی تھی وہ بھی تنظیمی نقطۂ نظر سے کوئی قابلِ تعریف بات نہ تھی۔ اور خدشہ تھا کہ اس مثال کی پیروی میں آہستہ آہستہ انتشار پسند عناصر سر اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اور تحریک کا اجتماعی دھارا کمزور ہو جائے گا۔ لیکن حکومت نے جو مظالم روا رکھے تھے اس نے مجلس عاملہ کے اکثر ممبران کو جذباتی بنا دیا تھا۔ اور اس لیے میری صلاح کے برخلاف ورکنگ کمیٹی نے اپنے آپ کو برخاست کرنے کا فیصلہ کر لیا اور تمام اختیارات ایک ڈکٹیٹر کو سونپ دینے کی صلاح دی۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں ڈکٹیٹر بننا قبول کر لوں۔ لیکن میں چونکہ اس طرزِ عمل کو درست نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ پیشکش منظور نہ کی۔ چنانچہ کانفرنس کے جنرل سیکریٹری چودھری غلام عباس کو ڈکٹیٹر بنا کر سری نگر روانہ کر دیا گیا۔ چودھری صاحب نے

سرینگر میں وزیراعظم کالون سے خط و کتابت کی اور ذمہ دار اسمبلی کا قیام اور گلینسی کمیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کرنے پر زور دیا ۔ لیکن کرنل کالون نے ہچکچاہٹ دکھائی تو چودھری صاحب نے سول نافرمانی کا حکم دے دیا۔ ایجی ٹیشن شروع ہوا تو حکومت نے پھر ظلم و جبر روا رکھا اور چودھری صاحب کو گرفتار کرکے چھ مہینے کی سزا سُنائی گئی۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ لاہور کے اخبارات تحریکِ کشمیر کے واقعات کو خوب اُچھال رہے تھے۔ میرواعظ احمد اللہ ہمدانی ایک وجیہہ شخصیت کے مردِ بزرگ تھے اور جلاوطنی کی صعوبت نے اُن کے اردگرد ایک ہالہ سا بُن دیا تھا۔ لوگ اُن کے پاس عقیدت سے آتے اور پُرسشِ احوال کرتے ۔ ایک دن اُنہیں علامہ اقبالؒ سے گفتگو کرنے کا خیال آیا۔ میں حضرت علامہ کے پاس جاتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اُن سے وقت لیا اور مولانا صاحب کو ساتھ لے کر حضرت علامہ کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ علامہ موصوف نے سروقد ہو کر مولانا کی تعظیم کی اور اُن کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے۔ مولانا صاحب نے اپنا دُکھڑا سُنانا شروع کیا تو علامہ موصوف کے باطن کا شاعر بیدار ہو گیا۔ اُنھوں نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا "کتنا بہتر ہوتا اگر آپ جلاوطنی کو قبول کرنے کی بجائے سرزمین کشمیر پر ہی ڈٹ جاتے اور اپنے سینے پر زخم کھا کر شہید ہو جاتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ جن مصائب کی داستان آپ یہاں سُنا رہے ہیں، ان میں کمی ہو جاتی۔ کیوں کہ بزرگوں کی قربانی نجات کا باعث ہوتی ہے۔" میرواعظ صاحب سے تو کچھ جواب نہ بن پڑا لیکن اُن کے چہرے پر ملال کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جب ہم علامہ سے رخصت ہو کر نکلے تو مولانا نے دل کی بھڑاس علامہ موصوف کو جلی کٹی سنانے سے نکالی۔ کہنے لگے "خود تو بے روزہ ہیں۔ چارپائی پر بیٹھے ٹھاٹھ سے حقہ پی رہے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ سینے پر گولی کیوں نہ کھائی۔ کوئی اپنا ہوتا تو پھر دیکھتا یہ مشورہ کیسے دیتے!" مولانا کی اس برافروختگی پر میرے من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ لیکن میں نے اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ ایسی باتوں پر غصہ کرنا آپ کے شایان نہیں۔

اُدھر حکومت نے اسمبلی کے لیے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اپریل کے تیسرے ہفتے میں ریگولیشن ۱ آف ۱۹۹۱ء شائع ہوا۔ جس میں مجوزہ اسمبلی کے اختیارات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی تحریک سے توجہ ہٹ گئی اور ایجی ٹیشن سرد پڑنے لگا۔ میں نے سیالکوٹ میں اپنے اُن ساتھیوں سے جو ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے، مشورہ کرکے اعلان کر دیا کہ اسمبلی کا موجودہ ڈھانچہ اگرچہ ہماری توقعات سے بہت کم ہے، تاہم ہمیں تدبر سے کام لینا چاہیے اور انتخابات میں حصہ لے کر حکومت اور دُنیا پر واضح کر دینا چاہیے کہ مسلم کانفرنس کی طاقت کتنی ہے۔ میں اپریل ۱۹۳۴ء میں سرینگر چلا آیا تو میرے نقطۂ نگاہ کو میرے ساتھیوں نے قبول کر لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ چودھری غلام عباس کی جو اس وقت اُدھمپور جیل میں سزا کاٹ رہے تھے، غیر موجودگی میں اس فیصلے کا اعلان کیوں کر کیا جائے۔ میں اُن سے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اُدھمپور چلا گیا۔ لیکن چودھری صاحب میرے ہم خیال نہ بن سکے۔ میں واپس آیا اور تنظیم کے سامنے سارے حالات رکھے۔ چنانچہ وسیع تر عوامی مفادات کے پیشِ نظر مسلم کانفرنس نے سول نافرمانی کی تحریک واپس بلانے اور الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تنظیم کی جنرل کونسل نے اپنی ۲۰ اگست ۱۹۳۴ء کے اجلاس میں میرے اس عندیے کی اتفاقِ رائے سے توثیق کر دی۔

***

(۲۱)

میری شادی

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں میری شادی مسٹر مائیکل ہیری نیڈو کی صاحبزادی اکبر جہاں سے ہوئی۔ مائیکل ہیری کا لاڈ کا نام ہیری نیڈو تھا۔ اور وہ سرینگر کے مشہور و معروف نیڈوز ہوٹل کے مالک کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ نیڈوز یورپ سے آئے تھے۔ اور پونہ، لاہور اور سرینگر میں اُن کے ہوٹل اپنے زمانے کے بڑے معیاری نعمت کدے تصور کیے جاتے تھے اور وہ یورپی سیاح سیلانیوں کی بڑی مرغوب قیام گاہیں تھے۔ ہیری نیڈو گلمرگ میں واقع اپنے ہوٹل کی شاخ کے انتظام کے سلسلے میں اکثر گلمرگ وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کرکے شیخ احمد حسین کا اسلامی نام اختیار کیا۔ اور علاقہ گلمرگ کی ایک گوجر لڑکی میر جان سے شادی رچائی۔ انہی کے بطن سے اکبر جہاں پیدا ہوئیں۔ جن کے ساتھ قدرت نے مجھے رفاقتِ حیات کے رشتے میں جوڑ دینا تھا۔ اس نوع کے رشتے اگرچہ آسمان میں طے ہوتے ہیں لیکن اِس کا ظاہری اِنتظام کرنے میں پوچھ کے مفتی ضیاء الدین نے بہت بڑا حصّہ ادا کیا۔ میں اگرچہ پہلے پہل اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے شادی کے

بندھن میں قید نہ ہونا چاہتا تھا لیکن دوست احباب نے میری صحت کی طرف میری توجہ دلائی اور کہا کہ شادی اور گھر کا سکھ میری جسمانی راحت اور ذہنی سکون کا باعث بنے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑی وجہ تھی جس نے مجھے شادی کرنے پر مائل کر دیا۔ میری مقبولیت اور شہرت اب عروج پر تھی۔ میری رہائش گاہ پر میرے مداحوں اور عقیدت مندوں کا رات دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ مرد تو خیر بڑی تعداد میں آتے تھے لیکن صنفِ نازک کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں جوانِ رعنا دوشیزائیں اور حسین و جمیل عورتیں شامل ہوتی تھیں۔ میں اُس وقت شباب کی نازک منزل میں تھا جب کہ ہر ہر قدم پر لغزش کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ والہانہ دور ہوتا ہے جب کسی جھنکار اور کسی کھنک سے آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بقول اقبالؔ ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

اس مرحلے پر اگر انسان حزم و احتیاط کا دامن نہ تھام لے تو وہ بامِ ثریا سے اخلاقی پستی کی تحت الثریٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ اسلام نے اس صورتحال میں بشری تقاضوں کا خیال کرکے نکاح کا بے خطا نسخہ تجویز کیا ہے۔ میں نے بھی جلد از جلد شریعت کے اس حصار کو اپنے ارد گرد حائل کرنے میں عافیت سمجھی۔ مبادا اس کی عدم موجودگی میں میرا قدم کسی آزمائش کے موقع پر ڈگمگاہٹ کا شکار نہ ہو۔ میرے پاس آنے والی خواتین جوشِ عقیدت میں میرے کپڑوں کو چھوتیں، میرے ماتھے بلکہ رخساروں کو چومتیں اور میرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ لیتیں۔ اس بے پناہ یلغار کو مناسب فاصلے پر رکھنے کے لیے نکاح سے بہتر ڈھال مجھے اور کوئی نظر نہیں آئی۔ شادی سے پہلے میری ہونے والی خوش دامن نے مجھے اپنے گھر بُلا لیا۔ گھر کے سبھی لوگ مجھے اس

طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں کوئی عجوبہ تھا۔ اور یہ کوئی حیرت انگیز بات اس لیے نہیں تھی کیونکہ لڑکی والے اُس شخص کو خوب جانچ پرکھ لینا چاہتے ہیں جس کے ہاتھ میں وہ اپنی چہیتی بیٹی کی قسمت سونپ دینے والے ہوں میرے ساتھ والی میز پر میری ہونے والی ساس اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ خیروعافیت کے بعد جب گفتگو نے سنجیدہ رُخ اختیار کیا تو میں نے اپنی ہونے والی بیگم کو خبردار کیا کہ جس شخص کے ساتھ اس کا رشتہ طے کیا جارہا ہے اُس کو اپنے مستقبل کے متعلق کچھ علم نہیں ہے وہ ایک ایسے میدان میں سرگرم ہے جہاں کبھی تخت کی آسائشیں ہونگی اور کبھی تختے کی آزمائشیں۔ کبھی عالی شان مکانات میں رہائش ہوگی اور کبھی تنگ و تاریک کوٹھریاں ہوں گی۔ اس لیے اُسے بغور سوچنا چاہیے کہ وہ اپنی موجودہ آرام زندگی کو ایک غیر یقینی زندگی پر قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں گی یا نہیں؟

میری بیوی کی تربیت اُن کی والدہ نے ایک خاص مذہبی ماحول میں کی تھی۔ میری ساس ایک پارسا اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ اور انہوں نے اپنی بیٹی کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے خاص دلچسپی لی تھی۔ میری رفیقہ حیات نے اگرچہ مری کے ایک انگریز مشنری کانونٹ کالج میں سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی لیکن گھر پر اُنہوں نے قرآن و حدیث کا درس بھی حاصل کیا تھا۔ اُس نے علاقہ پٹن موضع نہال پورہ کے مشہور درویش اور خدا دوست بزرگ محی الدین صاحب سے بھی بیعت کی تھی۔ محی الدین صاحب کابل سے کشمیر آئے تھے۔ آپ انگریزی میں ایم اے تک پڑھے ہوئے تھے۔ اور اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر میں ہیڈ ماسٹر بن گئے تھے۔ بالآخر اُنہوں نے دنیا کے لہو و لعب سے دل برداشتہ ہوکر درویشانہ زندگی اختیار کی۔ محی الدین صاحب میری بیوی پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ اور انہوں نے اُنہیں اپنی بیٹی سمجھ کر اُن کی روحانی تربیت کی تھی۔

جب اکبر جہاں نے اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر میری بات سُنی تو اُن کی اسلامی تربیت نے جوش دیا، اُنہوں نے فوراً جواب دیا کہ "آپ اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں اور میں بھی اس راہ میں آپ کے ساتھ ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں"۔ اُن کے جواب سے میری تشفی ہوگئی اور رشتہ طے پاگیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس ملاقات کے فوراً بعد مجھے پھر گرفتار کر کے اُدھمپور میں قید کر دیا گیا۔ جیل سے میں اکبر جہاں کے نام تسلی اور تشفی کے خطوط بھیجا کرتا تھا۔ گرمیوں میں ہمیں اُدھمپور سے بٹوت کے ایک بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور پھر چھ ماہ کی نظر بندی کے بعد جیل سے رہا کیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد بالآخر میرا نکاح بعوض ایک لاکھ روپیہ مہر کے میری نیڈو کے رہائشی مکان واقع گلمرگ میں اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اکبر جہاں کے ساتھ طے پایا۔ نکاح میرواعظ احمد اللہ ہمدانی نے پڑھا۔

شادی کے بعد میں نے کچھ وقت بچھوارہ کے مکان میں گذارا۔ جہاں میں کرائے پر رہتا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک سسرال میں ٹھہرا۔ جن کا رہائشی مکان نیڈوز ہوٹل کے عقب میں واقع تھا۔ میرے بھائی صاحبان نے میری رہائش کے لیے صورہ میں اپنے آبائی مکان کے ساتھ ہی ایک نیا مکان تعمیر کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا اور بالآخر میں مستقل رہائش کے لیے اُدھر منتقل ہوگیا۔ سردی کے موسم میں میری بیوی اکثر لاہور جاتیں اور اپنے والدین کے ساتھ قیام کرتی تھیں۔ جب حالات مجھے اجازت دیتے میں بھی لاہور جا کر سسرال والوں کے یہاں ہی قیام پذیر ہوتا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا۔ میری بیوی میرے لیے گھر

اور گھر سے باہر ایک سچی اور دُھن کی پکی رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ اُنہوں نے مجھے پہلی بار گھر کے سکون سے آشنا کرایا۔ جو والدہ مرحومہ کی رحلت کے بعد میرے لیے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ اُنہوں نے میری پُر آشوب اور ہنگامہ خیز زندگی میں امکان کی حد تک ایک قرینہ اور ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میرا حال تو اُس وقت یہ تھا کہ

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

لیکن بیگم صاحبہ توکل اور تحمل کے ساتھ سب کچھ جھیلتی رہیں۔ اس کے علاوہ جب آزمائشوں کا وقت آیا تو میری بیوی کا استقلال میرے لیے طاقت کا ایک اہم سرچشمہ بن گیا۔ اُنہوں نے میری غیر حاضری میں گھر کے شیرازہ کو حتی المقدور سالم رکھا چونکہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی دختر تھیں۔ لہذا مشکل اوقات میں اُس کے مائیکے والے بھی اُس کے آڑے آئے۔ میں قید و بند یا دوروں وغیرہ کے سلسلے میں گھر سے دُور رہتا تو بھی میری بیوی کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتیں۔ بلکہ صبر و شکر کے ساتھ اپنے اور بچوں کی زندگی کے معمولات قایم رکھتیں۔ اگر میرے بچوں کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کا دوش مجھے اپنے کندھوں پر لینا چاہیے کیونکہ مجھے قومی معاملات کی تگ و دو میں اُن بچاروں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا ہے۔ یہ میری بیوی کی لگن اور خوش اسلوبی کا نتیجہ ہے کہ میرے بچوں نے بڑے ہی ناموافق حالات کے باوجود اپنی توفیق کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ بیگم صاحبہ کا رجحان نماز اور روزے اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کی طرف ہے۔ اور یہ میرے اپنے مزاج کی اُفتاد کے موافق ہے۔ اس لئے وہ صحیح معنوں میں میری رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ میری بیوی کے استقلال کے اصل جوہر اُس کی اُن سرگرمیوں میں کھلے جو اُس نے قومی معاملات میں میرا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے انجام دیں۔ بیگم صاحبہ بنیادی طور پر ایک خدا ترس گھریلو قسم کی خاتون ہیں۔ جنہیں قرآنِ شریف کی تلاوت نماز اور دُوسرے اسلامی معمولات کی ادائیگی میں سکون ملتا ہے اور جو اپنے بچوں کے بکھیڑوں کو سلجھانے میں مگن رہتی ہیں۔ لیکن میں قومی حالات کی جس لہر کی زد میں تھا بیگم صاحبہ اُس سے زیادہ دیر تک اپنا دامن نہ بچا سکیں اور وہ بھی ان لہروں کے تھپیڑوں میں آگئیں۔ اُنہیں چار و ناچار زنان خانے کو ترک کر کے میدانِ عمل میں کودنا پڑا اور ہمارے دوش بدوش صف آرا ہو جانا پڑا۔ یہ اُس وقت ہوا جب میں زندان کی سلاخوں کے اندر بند تھا اور ساری تحریک پر آلام و مصائب کی یورش تھی۔ قومی مفادات کے تقاضوں نے اُنہیں اِس قدر اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ اُنہیں بقول شاعر اپنے پردے کو اپنا پرچم بنا لینا پڑا۔ ۱۹۴۶ء کی "کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کے پیرو رام چند کاک ہماری تحریک پر اپنی پوری قوت سے ٹوٹ پڑے تھے۔ اور وہ اس تحریک کا سارا دم خم توڑ دینا چاہتے تھے۔ اُس وقت بیگم صاحبہ نے گھر کی چلمن کو اٹھایا اور گاؤں گاؤں گلی گلی پھر کر نا اُمید دلوں میں اُمید کے دیے جلانے لگیں۔ اُنہوں نے شہیدوں کے وارثوں کی ڈھارس بندھائی اور قیدیوں کے گھروں میں چولھا روشن رکھوانے کے جتن کیے۔ جب مہاتما گاندھی ۴۷ء کے گرما میں کشمیر آئے تو وہ ہمارے گھر صورہ بھی گئے اور وہاں بیگم صاحبہ نے ہی اُن کا استقبال کیا اور اُن کو کشمیری عوام کے دُکھ درد کی کہانی سنائی۔ مہاتما گاندھی نے کشمیر میں اپنی جو پرارتھنا سبھائیں منعقد کیں اُن میں بیگم صاحبہ سے ہی تلاوتِ قرآن کرائی۔ جو وہ بڑی صحت اور خوش گلوئی سے کرتی ہیں۔ اُن ہی دنوں کشمیری عوام نے بیگم صاحبہ کی دردمندی ایثار اور ثابت قدمی کو دیکھ کر اُنہیں "مادرِ مہربان" کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا اور اس طرح بیگم کے کنبے میں اُن کے بچوں کے ساتھ

ساتھ سارا کشمیر اور اس کے دُکھی لوگ شامل ہو گئے۔ بیگم اس رشتۂ وفا نبھانے میں اپنی فرصت، اپنی آسائش اور اپنی عافیت سبھی سے بیگانہ ہو گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر پر قبائلی چڑھ آئے تو ستم رسیدگان کی مدد کے لیے بیگم نے ریڈ کراس کی تنظیم کی اور دن رات مصیبت زدگان کے آنسو پونچھنے میں مصروف رہنے لگیں۔ انہوں نے جموں میں مغویہ عورتوں کی بازیابی اور بحالی میں بھی کافی بڑا کام کیا اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن ان کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد انہیں بخشی سرکار نے کشمیر سازش کیس میں ملوث کر دیا۔ اُن کو اگرچہ ملزموں کی صف میں باقاعدہ شریک نہیں کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اُن کا نام ہر روز کمرۂ عدالت اور اخبارات میں گونجنے لگا۔ اس کے علاوہ اُن پر سرِ عام حملے بھی کیے گئے اور انہیں اخلاق سوز مظاہروں کا ہدف بھی بنایا گیا۔ ایک باحیا اور مذہب پسند خاتون کے لیے یہ صورتحال کس قدر اذیت ناک ہو سکتی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن بیگم خدا کا نام لے کر یہ سب سہتی رہیں۔ اُن کے صبر و شکر نے پھر ۱۹۶۷ء کا وہ دن دکھایا جب درمیانی مدت کے انتخابات میں بخشی غلام محمد سرینگر سے لڑنے والے پارلیمانی انتخاب میں بیگم صاحبہ کے ہاتھوں پٹ گئے۔ بخشی صاحب کو مرکزی کانگریس ہائی کمان نے یقین دلایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ میں آ گئے تو انہیں مرکزی کابینہ میں شامل کیا جائے گا۔ بخشی صاحب نے اپنی تمام قوت میدان میں جھونک دی۔ میں اُن دنوں دہلی میں جلاوطن تھا اور میرے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن حکومت نے اپنے غرور میں بیگم صاحبہ کے اثر و رسوخ کا پورا اندازہ نہ کیا تھا اور اُن پر اس پابندی کا اطلاق نہ کیا گیا تھا۔ میں نے انگریزی محاورے کے مطابق مخالفین کے زرہ بکتر میں یہ چھوٹا سا شگاف تاک لیا تو اسی کے ذریعہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ ایک بلا پھیر

ذاتی عافیت کوشی سے بے نیاز ہو کر سرینگر چلی جائیں۔ چنانچہ بیگم چپ چاپ سرینگر آ گئیں۔ انہوں نے ایک غیر معروف شخص شمیم احمد شمیم کی حمایت کی اور اس طرح سے بخشی غلام محمد کو اپنے شہر میں ہی شکست فاش ہوئی۔ یہ معرکہ بخشی صاحب کا واٹرلو ثابت ہوا۔ جالوت چت ہو گیا۔ اور یہی زخم سہلاتے ہوئے اگلے سال اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو بے سر و سامانی کی حالت میں یہ الیکشن لڑ کر کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح ناوکِ دشنام کا نشانہ بننا پڑا وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ انہوں نے بڑی ہمت سے مشکلات کا پانسہ پلٹ دیا۔ اب یہ اور بات ہے کہ جس شخص یعنی شمیم احمد شمیم کو کامیاب کرنے کے لیے انہوں نے اس قدر دُکھ سہے وہ بھی بعد میں اُن کا بیری بن گیا اور اپنی ناوک اندازی سے بیگم صاحبہ کی ذات کو محفوظ نہ رکھ کر اپنی سرشت کا سراغ دیا ؎

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اس رشتے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سات اولادیں عطا کیں۔ جن میں سے دو لڑکیاں چند ماہ کی عمر میں ہی وفات پا گئیں۔ باقی تین لڑکے اور دو لڑکیاں ماشاء اللہ ہمارا سرمایۂ حیات ہیں۔ میری پہلی اولاد ایک بچی تھی۔ جس کا نام ہم نے خالدہ رکھا۔ خالدہ بیگم خاندان میں خواجہ غلام محمد شاہ سے بیاہی گئی ہیں اور تیرے تین بچوں کی ماں ہیں۔ اُن کے نام بالترتیب افتخار، مظفر اور عالیہ ہیں۔ افتخار نے ڈاکٹری کی تربیت حاصل کی ہے اُس کی شادی ۱۹۷۵ء میں ہوئی اور اب وہ اعلیٰ تربیت کے لیے امریکہ میں ہے۔ میرا سب سے بڑا لڑکا فاروق ہے۔ میں اسلام کے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی باسعادت زندگی سے بڑا متاثر رہا ہوں اور میں نے اپنے بڑے لڑکے کا نام اُن ہی کے اسمِ مبارک کی مناسبت سے رکھا ہے۔ فاروق

بھی ایک ڈاکٹر ہے۔ اُس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی ہے اور اُس کا ایک لڑکا عمر اور تین لڑکیاں صفیہ، رجنا اور سائرہ ہیں۔ فاروق ۱۹۸۰ء میں پارلیمنٹ کے درمیانی عرصے کے انتخابات میں سرینگر سے کھڑا ہوا۔ وہ ملک بھر میں موجودہ پارلیمنٹ کے لیے واحد اُمیدوار تھا جسے بلامقابلہ کامیاب قرار دیا گیا۔ میرے دوسرے لڑکے کا نام طارق ہے۔ اُس کا نام میں نے مراکش کی خاک سے اُٹھنے والے مشہور اسلامی فاتح طارق بن زیادؒ کے نام پر رکھا ہے، جن کی شجاعت کے طفیل یورپ کی ظلمتوں میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔

طارق نے ایم۔اے تک تعلیم پائی ہے۔ میرے قید و بند کے زمانے میں وہ یورپ کی خاک چھانتا رہا اور کشمیریوں کے کاز کا مقدمہ لڑتا رہا۔ اب وہ سرکاری ملازمت میں ہے۔ میرا تیسرا لڑکا مصطفےٰ کمال ہے۔ یہ اُن دنوں پیدا ہوا جب اتاترک مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد اُن کی شہرت عروج پر تھی۔ اتاترک نے یورپ کے مردِ بیمار "ترکی" کو نئی زندگی عطا کرنے اور پھر اُسے جدید روشنی سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو جرأت مندانہ کارنامے انجام دیے ہیں میں اُن کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ کمال اتاترک میں جسمانی اور اخلاقی بہادری کا بڑا نادر امتزاج تھا۔ انھوں نے گیلی پولی میں انگریزوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے کر اُن کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا مفروضہ غلط ثابت کر دیا۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے ایک فرسودہ اور رجعت پسند سماج کو توڑنے کے لیے جو بہادرانہ اقدامات کیے وہ اُن کی روشن خیالی اور اخلاقی جرأت کی زبردست مثالیں ہیں۔ چنانچہ میں اپنے تیسرے لڑکے کی پیدائش کے وقت جیل میں تھا اور وہیں سے میں نے اُس کے لیے مصطفےٰ کمال نام تجویز کیا۔ مصطفےٰ کمال بھی ڈاکٹر ہے اور اپنا وقت گلمرگ میں میرے باغ کی دیکھ بھال میں

گذارتا ہے۔ ثریّا میری آخری اولاد ہے۔ اُس نے ایم۔اے تک تعلیم حاصل کرلی ہے اس وقت گورنمنٹ زنانہ کالج سرینگر میں بہ حیثیت لیکچرار تعینات ہے۔ اُس کی شادی سرینگر کے معروف متّو خاندان کے چشم و چراغ ڈاکٹر محمد علی متو سے ہوئی ہے اور ان کی بیٹی نائلہ اپنی شوخی اور معصومانہ شرارتوں کے سبب سارے کنبے کی آنکھوں کا تارا بن چکی ہے۔ جب بھی ثریّا کا ذکر آتا ہے تو میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ مجھے ۱۹۷۱ء کا وہ زمانہ یاد ہے جب میں دہلی میں جلاوطنی کے دن گذار رہا تھا، اُس کی شادی اُن ہی دنوں ہوئی۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ ویسے بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے میں جیلوں میں رہا۔ ایک باپ کے جذبات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں جب اُس کی لاڈلی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو اور اُس کو اپنے گھر سے دُور رکھ کر اپنی بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے اور رخصتی کے دو بول کہنے کی مسرّت سے بھی محروم رکھا گیا ہو۔

میری بیوی ۱۹۷۷ء کے درمیانی مدّت کے پارلیمانی انتخابات میں سرینگر سے پارلیمنٹ کی ممبر چُنی گئیں۔ لیکن جب وہ گھر سے دُور دہلی میں رہنے لگیں تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ اُن کے بغیر گھر کا بوجھ سنبھالنا کتنا مشکل ہے۔ میری صحت بھی پہلے جیسی نہ تھی اور بیگم کی غیر موجودگی میرے لیے جسمانی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے سوہانِ رُوح بننے لگی۔ بیگم نے میرا یہ حال دیکھا تو اُنھوں نے حالیہ پارلیمانی انتخاب میں پارٹی کا منڈیٹ قبول کرنے سے معذرت ظاہر کی۔ اگرچہ اب بھی اُن کا اکثر وقت عوام اور اُن کے مسائل کے لیے وقف رہتا ہے لیکن صبح و شام وہ ہماری خبر گیری بھی کرتی رہتی ہیں۔ مسکین باغ سرینگر میں ہم نے غریب اور نادار بچوں کی بہبودی اور

تعلیم و تربیت کے لیے "گلزارِ اطفال" کے نام سے جو مرکز شروع کر رکھا ہے، وہ بیگم صاحبہ کی توجہ کا خاص مرکز ہے اور اُن کی دن رات کی لگن سے یہاں اِن بچوں کی کایا پلٹ گئی ہے۔

▲▲▲

(۲۲)

پرجا سبھا اور اُس کے بعد

میرے ساتھ میرے بہت سے رُفقاء کو اندازہ تھا کہ جو اسمبلی (اس کا نام پرجا سبھا رکھا گیا تھا) تشکیل دی جا رہی ہے وہ محض ایک دِکھاوا ہے تاکہ کشمیر کے عوام اور اُن سے زیادہ اُن کے بیرونی ہمدردوں کا منہ بند کیا جائے۔ لیکن ریاست اور حکومت کے اہم امور ان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ مگر ہم خود حکومت کے مہیا کردہ فورم کو استعمال کر کے دُنیا پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس کس طرح ریاستی عوام کی اکثریت کی نمائندہ جماعت ہے اور اس کی آواز میں کتنی طاقت ہے۔ ریاست کے اندر اور باہر مفادِ خصوصی رکھنے والے عناصر بار بار مُسلم کانفرنس کو مخصوص نمائندوں کی ٹولی قرار دے رہے تھے۔ اب خود حکومت کے ہاتھوں اس جھوٹ کو تار تار کرنے کا موقع ہمارے سامنے تھا۔ البتہ ہم نے حکومت سے مُطالبہ کیا کہ اگر وہ واقعی انتخابات کو پُرامن اور خیر سگالی کے ماحول میں منعقد کرنا چاہتی ہے تو سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔ اور دارو گیر کی پالیسی کو ترک کیا جانا چاہیے۔ حکومت نے اوّل اوّل تو اس مطالبے کو منظور کرنے کی حامی بھر لی لیکن جب کاغذاتِ نامزدگی

داخل کرنے میں صرف ایک یا دو دن رہ گئے اُس نے اپنے وعدے سے منہ پھیر لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حکومت کا اسمبلی قایم کرنے کا اقدام محض ایک فریب تھا اور اب وہ کسی طرح عوام کے اصل نمائندوں کو اس نام نہاد اسمبلی تک پہنچنے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی۔ لیکن یہ وقت سینہ کوبی کا نہیں بلکہ عملی اقدام کرنے کا تھا۔ ہم نے مُسلم کانفرنس کے کارکنوں کو تاروں کے ذریعے تاکید کی کہ وہ نزاکتوں میں جائے بغیر بے دھڑک کاغذات نامزدگی داخل کر لیں۔ ہماری توقعات کے مطابق ہمارے کارکنوں نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ میدان میں ڈٹ گئے۔

اُدھر سرینگر میں میرواعظ یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس نے ہمارے امیدواروں کے خلاف اپنے نمائندے کھڑے کر لیے اور اس طرح تحریک کی پھوٹ کو رسمی شکل میں مکمل کر لیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر مُسلم کانفرنس کی اِنتخابی مہم شروع کی اور بہت جلد اِنتخابی مہم کا پانسہ مُسلم کانفرنس کے حق میں پلٹ گیا۔ میرواعظ کے حامیوں نے یہ صورت دیکھی تو فیر بجا تنازعے کی چنگاریاں بھڑکانا شروع کر دیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہم اس سے بڑے مقاصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان اِشتعال انگیزیوں کو نظرانداز کر کے اصل مقصد کے حصول پر ہی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ میں نے شہر میں جگہ جگہ جلسے کیے اور عوام کو ذہن نشین کرایا کہ لڑائی کے خطوط اور حدود کیا ہیں۔ ۴ ستمبر ۱۹۳۴ء کو ووٹ ڈالے گئے۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو دوست دشمن سبھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ شہر کی پانچوں نشستوں پر مُسلم کانفرنس کے اُمیدواروں نے میرواعظ صاحب کے نامزدگان کو بُری طرح پچھاڑ دیا تھا۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ میرواعظ صاحب اور اُن کے خاندان کا ایک صدی سے زیادہ عرصے سے سرینگر میں ڈنکا بجتا رہا تھا اور اُن کے ساتھ عوام کے ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریکِ آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بالغ کر دیا تھا کہ وہ میرواعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور اُنہوں نے اُنہیں قومی معاملات میں مسترد کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سجادہ کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اُنہیں میری قربانیوں، میرے خلوص اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آ گیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میرواعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میرواعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع راجوری کدل کے اردگرد چند محلوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ڈفلی بجانے لگے۔ آزاد مُسلم کانفرنس کے ایک اُمیدوار خواجہ سعد الدین شال تھے۔ جو امیراکدل سے کھڑے ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب تحریک کے اوّلین قائدین میں سے تھے اور اُنہوں نے تحریک کی آبیاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مُسلم کانفرنس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ اِس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مُسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُبھارے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکے اور معمولی رنجشوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دُور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے میرواعظ خاندان سے خویشی کا رشتہ بھی جوڑا اور انہیں آخر کار میرواعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارۂ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا لیکن جب ہماری جماعت کے خلاف خم ٹھونک کر سامنے آ گئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بٹہ مالو کے قرہ خاندان کے چشم و

ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریکِ آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بالغ کر دیا تھا کہ وہ میر واعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور اُنھوں نے اُنھیں قومی معاملات میں مسترد کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سجّاد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اُنھیں میری قربانیوں، میرے خلوص اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آگیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میر واعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میر واعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع راجوری کدل کے ارد گرد چند محلوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ڈفلی بجانے لگے۔ آزاد مسلم کانفرنس کے ایک اُمیدوار خواجہ سعد الدین شال تھے۔ جو امیرا کدل سے کھڑے ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب تحریک کے اوّلین قائدین میں سے تھے اور اُنھوں نے تحریک کی آبیاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مسلم کانفرنس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ اِس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُبھار سے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکے اور معمولی رنجشوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دُور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے میر واعظ خاندان سے خویشی کا رشتہ بھی جوڑا اور اُنھیں آخر کار میر واعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارۂ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا۔ لیکن جب ہماری جماعت کے خلاف خم ٹھونک کر سامنے آگئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بٹہ مالو کے قرہ خاندان کے چشم و

چراغ تھے اور علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے تازہ تازہ وارد ہوئے تھے، اُن کے خلاف کھڑا کر لیا۔ تحریک کے تیز دھارے نے شال صاحب کے جمے ہوئے پاؤں بھی اکھاڑ دیے اور مسلم کانفرنس کی عوامی مقبولیت کو ڈرامائی انداز سے نمایاں کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے نہ صرف حکومت کے بدترین اندیشوں کو درست ثابت کر دکھایا۔ بلکہ اس نے داخلی طور پر انتشار پسندوں اور جھگڑوں کو بھی انحراف کا پورا پورا مزہ چکھا دیا۔

پرجا سبھا میں اکثریت مہاراجہ کے نامزد کردہ ممبران کی تھی۔ اور مسلم کانفرنس کے ۱۹ منتخب ممبر اس تعداد کا صرف ۲۰ فی صد تھے۔ لیکن اُن کی نمائندہ حیثیت دوپہر کے سورج کی طرح روشن تھی۔ مسلمان نمائندگان کی صحیح تعداد اگرچہ ۲۱ تھی لیکن میرپور کی دو نشستوں پر حکومت نے ہمارے اُمیدواروں کے کاغذات دھاندلی کر کے نامنظور کر دیے تھے۔ مسلم کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے میاں احمد یار خان کو اپنا لیڈر اور مرزا محمد افضل بیگ کو اپنا ڈپٹی لیڈر چن لیا۔ پرجا سبھا کا پہلا اجلاس ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہوا۔ (اس اجلاس میں مہاراجا ہری سنگھ نے بھی شرکت کی) اور وزیر اعظم کالون نے اسمبلی کے اختیارات سے متعلق شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ مسلم کانفرنس کے ایک بزرگ صورت اور صاحبِ حیثیت ممبر حاجی احمد اللہ شہداد نے اسمبلی میں ایک عوامی گیت، جو اُن دنوں کشمیر میں زبان زدِ خلائق تھا، ترنم سے پڑھا ؎

گلینسی کمیشن سے مقصود پایا
یہ سب رنگ لایا میاں شیرِ کشمیر

یہ ایک عجیب اسمبلی تھی اور بقول غالبؔ اِس کی تعمیر میں ؎
مضمر تھی اک صورت خرابی کی

مہاراجا نے اپنی ذات میں قانون سازی کے تمام اختیارات محفوظ رکھے تھے۔ اُسے اسمبلی کے منظور کردہ اُن قوانین کو، جو اُس کی پسند کے مطابق نہ اُترتے ہوں، ویٹو کرنے کا حق تھا۔ وہ اسمبلی کے پاس کردہ کسی تجویز کو بھی کالعدم کر سکتا تھا۔ مہاراجا کے اخراجات اور فوج سے متعلق کسی معاملے پر اسمبلی میں بحث نہ ہو سکتی تھی۔ مہاراجا کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو کسی بھی غرض کے لیے اسمبلی کا رکن نامزد کر سکتا تھا۔ ان حالات میں یہ اسمبلی کیا تھی محض ایک سراب تھا اور مسلم کانفرنس کے ارکان نے پہلے ہی اجلاس میں ان گمبھیر مسائل کے تند چھیڑنا شروع کر دیے لیکن جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندازہ لگایا تھا، پھر بھی یہ تجربہ عوامی تحریک کے مقاصد کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ایک تو اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں کسی کو غلط فہمی نہ رہی دوسرے یہ بات بھی آشکارا ہونے لگی کہ حکومت اسمبلی کو صرف ایک کھلونے کے طور پر عوام کے دل بہلانے کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اُسے عوامی نمائندوں کی اختیار و اقتدار کے مسائل میں آواز بلند کرنا ہرگز پسند نہ تھا اور اس آواز پر کان دھرنا تو بہت دُور کی بات تھی۔ چنانچہ جموں سے منتخب ہونے والے سکھ ممبر سردار بدھ سنگھ نے تو اس کو برملا طور پر ایک کھلونا اسمبلی قرار دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کرنے کے لیے اس کے اِفتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ بھی کیا تھا۔ ایوان کے فرش پر مسلمان اور ہندو نمائندوں نے جب اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کو پیش کیا۔ تو اُن کے مابین غلط فہمی اور بدگمانی کی دُھند چھٹنے لگی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ دراصل مقابلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ ظالموں اور مظلوموں کے درمیان ہے۔ چنانچہ غیر مسلم اور مسلم ممبران سبھا ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور آخرکار ۱۹۳۶ء میں دُنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ جموں اور کشمیر کے لگ بھگ تمام منتخب ممبروں نے بیک وقت اور

یک زبان ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اسمبلی سے واک آؤٹ کیا۔ اُس وقت صرف ایک ممبر پنڈت امرناتھ کاک ہی ایسے رہے جو اس یک جہتی کے مظاہرے سے الگ رہے۔

سردی شروع ہوئی تو میں نے میدانوں کا رُخ کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ اِسی دوران میری مُلاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ جواہر لال حسب و نسب سے ایک کشمیری تھے اُن کے اجداد نے مغل بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں کشمیر کے ناسازگار حالات سے تنگ آ کر ہجرت کی تھی اور شاہجہاں آباد یعنی دلّی کے چاندنی چوک کے نزدیک نہر سعادت علی خان کے کنارے رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ اِسی نسبت سے "نہرو" پکارے جانے لگے تھے۔ اُن کے والد پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔ اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ اُن کے خاندان نے ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے لیے کام کرتے ہوئے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ خود نہرو کی ہی صدارت میں ۱۹۲۹ء میں راوی کے کنارے کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ جواہر لال ہندوستان کے حُریت پسند طبقے کے محبوب بن گئے تھے اور علامہ اقبالؔ جو سیاسی طور پر جواہر لال سے اختلاف رکھتے تھے، اُن کے اس رول پر ایک کشمیری کی حیثیت سے فخر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل انہوں نے اپنے سیاسی حلیف محمد علی جناح کو سیاست کار اور جواہر لال کو محبِ وطن کہہ کر یاد کیا تھا۔

جواہر لال کے دل میں میں نے علامہ اقبالؔ کی ہی طرح کشمیر کے لیے گہری تڑپ دیکھی۔ وہ اپنی مادرِ وطن کو ظلم و جہالت سے نجات دلانے کے لیے بے تاب تھے۔ میں اُن کے علاوہ بھی بہت سے قوم پرست لیڈروں سے ملا اور مجھے یوں لگا کہ

کشمیریوں کی نجات تنگ دائروں سے نکل کر ایک قومی دھارے میں شیرازہ بند ہونے میں ہی مضمر ہے۔ میری ملاقات ان ہی دنوں مشہور قوم پرست مسلمان لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بزرگ بھی کشمیر سے ہی آکر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ بھی اپنے وطن مالوف یعنی کشمیر کے لیے دردمندی کے جذبات رکھتے تھے اور انہوں نے بھی میرے جذبات و خیالات کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہی مکان پر ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کیا جس کو کشمیر کی تحریک آزادی کا ایک اہم موڑ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اور باتوں کے علاوہ کہا،

"کشمیر میں فرقہ وارانہ کھنچاؤ بہت حد تک پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ ہمارے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ میرا آئندہ پروگرام کانگریس کے اصولوں پر کام کرنا ہوگا اور میں عنقریب وطن جاکر اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں، جو قوم پرور نظریے کی حامی ہو۔"

میرے اس بیان سے کشمیر کی سیاسی فضا میں اتھل پتھل مچ گئی۔ پنجاب کی کچھ مسلمان جماعتیں تو پہلے ہی اپنے تعصبات و تضادات کی وجہ سے میری بیری بن چکی تھیں۔ اب ان کی رونق کچھ اور بڑھ گئی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر میں ہندوؤں کے ایک گروہ نے اس پُرخطر اور جرأت مندانہ اور مخلصانہ بیان کو مکر و فریب اور حکمت عملی سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان دوستوں کی ذہنیت اس کے بعد بھی بہت کم بدلی۔ انہوں نے مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف نہیں کیا کہ پہلی بار بے زبان کشمیری عوام کی ترجمانی کا حق ادا کرنے میں اپنا فرض ادا کیا۔

جب میرے خیالات ان دوستوں کے موافق نہ ہوتے تھے اس وقت تو ان کی مخالفت قابلِ فہم ہو سکتی تھی لیکن بظاہر جب حالات کے متعلق میرے خیالات و نظریات ان کے موافق بھی ہوتے ہیں یہ دوست پھر بھی تعصب کی عینک لگا کر شک، بدگمانی اور بغض و حسد کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ کر نکال ہی لیتے ہیں بہرحال میرے بیان مندرجہ بالا کا پنجاب کے بہت سے حلقوں میں کافی گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا اور بہت سے اخبارات، راہنماؤں اور رائے عامہ کے معتبر اداروں نے اسے ریاستی سیاست کی بنیادیں وسیع کرنے اور قوم پرست سیاست کی طرف ایک بڑا قدم قرار دیا۔

لاہور سے واپس لوٹنے پر میں نے اپنے نقطۂ نظر کو مسلم کانفرنس کے سامنے رکھا۔ کچھ تردد رکھنے والی آوازیں ضرور بلند ہوئیں۔ لیکن اکثر رفیق میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ کسی حُسنِ اتفاق یا عارضی مصلحت کوشی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے لیے تحریکِ حریت کی ابتدا سے ہی بنیادیں ڈالی گئی تھیں۔ ہم نے کسی بھی وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں کی قیمت پر اپنے حقوق حاصل کریں گے بلکہ ہم ایک نئے کشمیر کا تصور اپنے اقلیتی برادروں کی بہبودی کے سوا کر ہی نہیں سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہم نے بار بار ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بدقسمتی سے ریاست کے اندر اور باہر مفاد خصوصی اس جارحانہ انداز سے سرگرم تھا کہ انہوں نے کچھ دنوں تک غیر مسلم حضرات کو غلط فہمی کی دھند اور بدگمانی کے غبار میں گم کر کے ہم سے دور رکھا۔ لیکن اب صورتِ حال واضح طور پر بدل رہی تھی خود ہندوؤں اور سکھوں میں ایسے روشن خیال عناصر پیدا ہونے لگے تھے جو تحریک کے امکانات کا صحیح اندازہ لگا رہے تھے انہیں بھی یقین ہو گیا تھا کہ ریاست کے تمام لوگوں کی نجات مل بیٹھ کر کام کرنے اور ایک ہو کر جدوجہد کرنے میں ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو

بتایا تھا کہ پرجا سبھا میں ہندو اور مسلم نمائندوں کے تئیں حکومت کے رویے نے بھی دونوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد سے آشنا کرنے میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ایک متحدہ اور سیکولر پلیٹ فارم قایم کرنے کا بیج اسی دن بویا گیا تھا جب جولائی ۱۹۳۳ء میں پنڈت پریم ناتھ بزاز سے میری ملاقات چشمہ شاہی کے باغ میں ہوئی تھی۔ بزاز صاحب میرے ہم سن اور ہم عصر ہیں۔ اور میں انہیں اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ گلینسی کمیشن میں ایک ممبر کی حیثیت سے انہوں نے جس تدبر، معاملہ فہمی، دوراندیشی اور جرأت مندی کا ثبوت دیا تھا اس نے میرے دل میں ان کے لیے عزت پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو بتایا تھا کہ مسائل کو ہندو اور مسلم کے تنگ خانوں میں بانٹنے سے مشکلات گھٹنے کی بجائے بڑھتی جائیں گی۔ اور انہوں نے اپنے مسلک کے لیے غیر مقبولیت کا عذاب بھی سہا تھا۔ چشمہ شاہی کی ملاقات میں مجھے یوں لگا کہ ان کا دل بھی میرے دل کی طرح ایک ہی تال پر دھڑکتا ہے ہمیں ابتدائی گفتگو کے بعد اتفاق رائے سے اس نتیجے پر پہنچنے میں دقت نہیں ہوئی کہ کشمیر کی تحریک کو بامعنی، بامقصد اور کامیاب بنانے کے لیے اسے ترقی پسندانہ اور جمہوری بنیادوں پر چلانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ ہم اس غرض کے لیے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیال کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہم نے تحریک کو قومی بنیادوں پر چلانے کے لیے ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۳۶ء میں اردو ہفتہ وار "ہمدرد" کا جسے میں نے بزاز صاحب کے ساتھ مل کر جاری کیا تھا، پہلا شمارہ مشہور قوم پرست رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے حضوری باغ کے ایک بڑے جلسے میں جاری کیا۔ بزاز صاحب نے جہاں اس کی دفتری اور ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں وہاں میں اخبار

کے لیے مالی وسائل بہم کرنے میں لگا رہا۔ مولانا محمد سعید مسعودی اخبار کے دوسرے مدیر تھے۔ اخبار نے ملک میں قومی نظریات اور ترقی پسندانہ خیالات کے پھیلاؤ میں کافی کام کیا۔ اور عوام میں کافی مقبول بھی ہوا۔ لیکن یہی ایک اور آویزش کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہوا۔ پنڈت بزاز کو جونہی محسوس ہوا کہ اب اخبار خود کفیل ہونا شروع ہوگیا ہے اور وہ اسے میری امداد کے بغیر جاری رکھ سکتے ہیں تو ان کے من میں چور پیدا ہوگیا۔ انہوں نے حیلے بہانے گھڑ کے مجھ سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں بھانپ گیا کہ ان کے من میں مایا موہ نے سر نکالا ہے۔ لیکن میں ہرگز اس بات کا روادار نہ تھا کہ یہ معمولی بات ہمارے باہمی تعلقات میں رخنے کا باعث بن جائے۔ اس لیے میں نے اخبار سے علیحدہ ہونے اور اس کی ملکیت مکمل طور پر بزاز صاحب کے ہاتھ سونپ دینے کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر شمبھوناتھ پشن ہمارے مشترکہ دوست تھے۔ انہوں نے اخبار کے اثاثے کا تخمینہ لگا کر مجھے ایک طے شدہ رقم ادا کروائی اور پنڈت بزاز بلا شرکتِ غیرے اخبار کے مالک بن گئے۔ جس کو وہ بعد میں بڑی دیر تک کامیابی سے چلاتے رہے۔

پنڈت بزاز ایک ہوشیار آدمی ہیں اور دھن کے پکے بھی۔ سیاسیات میں ایک وسیع نظر رکھتے ہیں اور حسبِ استعداد حق و انصاف کے لیے آواز بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ مگر کسی اصول پر استقلال سے قایم رہنا وہ شاید کوئی خوبی تصور نہیں کرتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری حصولِ زر ہے جس نے ان کی بہت سی خوبیوں کو گہنا دیا ہے۔ بقولِ غالبؔ ؎

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آئے

چنانچہ اُن کی یہ کمزوری اتنی شہرت یافتہ ہے کہ اُن کے اپنے فرقے کے لوگوں نے اُن پر یہ الزام لگایا کہ اُن کے گلینسی کمیشن سے استعفیٰ دینے کی وجہ اُن کی اصول پرستی سے زیادہ مالی نقصان کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ گلینسی کمیشن کے رُکن کی حیثیت سے وہ مشاہرہ وصول کرنے کے حقدار تھے۔ اخبار "ہمدرد" سے میری علاحدگی کی پُشت پر بھی اُن کا یہی احساس تھا۔ اخبار کا بلاشرکتِ غیرے مالک بننے کے بعد اُنہوں نے کئی سیاسی پینترے بدلے۔ وہ نیشنل کانفرنس کی مخالفت اور میر واعظ یوسف شاہ کی آزاد مُسلم کانفرنس کی حمایت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کرتے رہے اور وہ بھی اس ڈھٹائی سے جیسے "ہمدرد" آزاد مُسلم کانفرنس کا ترجمان تھا۔ مولوی صاحب کے پیروؤں کو بزاز صاحب کی یہ روش بڑی بھائی اور اُن کے حلقے میں اخبار کافی مقبول ہوا۔ اس طرح سے بزاز صاحب سِکوں کی کھنک سے بہرہ ور ہوتے۔ لیکن میرے لیے یہ بات ایک اچنبھے سے کم نہ تھی کہ بزاز صاحب جو روشن خیالی اور سیکولر سیاست کے اس قدر سرگرم وکیل تھے، کس طرح راتوں رات میر واعظ کی قدامت پسند جماعت کے ڈھنڈورچی بن گئے۔ بزاز صاحب نے بعد میں محمد علی جناح کے حق میں لکھنا شروع کیا اور دو قومی نظریے کے خود ساختہ وکیل بن گئے۔ وہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے خلاف خوب خوب زہر اُچھالتے رہے۔ بعد میں انہوں نے کسان کانفرنس کے نام سے ایک جماعت کو نیشنل کانفرنس کے خلاف کھڑا کرنے میں کافی سرگرمی دکھائی مگر یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہم نے تحریک "کشمیر چھوڑ دو" شروع کی تو پنڈت بزاز نے اسے "غنڈوں کی تحریک" قرار دینے میں محمد علی جناح صاحب کی جی بھر کے ہمنوائی کی اور رام چند کاک کے مظالم کے قصیدے لکھے۔ بعد میں کشمیر پر پاکستان کے موقف کے حق میں کئی کتابیں اور رسالے شائع کیے۔ اور حکومتِ پاکستان سے خوب ہاتھ رنگے۔ چنانچہ

اسی کمائی کی روشنی دہلی میں اُن کے دولت کدے کی شکل میں مجسم ہو کر "گاش آگر" بن گئی۔ جب سرحد پار سے سیال چاندی کے سوتے خشک ہو گئے تو اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ اور بہانہ یہ تراشا کہ مارشل ایوب خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان میں جمہوریت ختم ہو گئی ہے۔ بزاز صاحب کی ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ شناسائی بھی اس ہرجائی معشوقہ "دولت" سے وفاداری کی بنا پر ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب کانگریس نے انگریزوں کی جنگ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو انگریزوں کو اسے جہادِ حق ثابت کرنے کے لیے ہندوستانی اخباروں اور ڈھنڈورچیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں ایم۔ این۔ رائے اور اُن کے ہم خیالوں کا گروہ مُنہ مانگے داموں مل گیا۔ بزاز صاحب کی سونگھنے کی حِس پیسے کے معاملے میں غضب کی واقع ہوئی ہے۔ اُنہوں نے یہ نادر موقع دیکھا تو فوراً اس جنگِ زرگری میں ایم۔ این۔ رائے کے ہمنوا بن گئے۔ حکومتِ ہند اُن کے اخبار کی ہزاروں کاپیاں خریدتی تھی۔ اور اِس طرح ان کو مالا مال کر رہی تھی۔ غرض بزاز صاحب نے سیاست میں ہمیشہ اشرفی کے نشان کو اپنے لیے ہُما خیال کیا اور اس سے نباہ کرتے رہے۔

پنڈت بزاز نے کشمیر پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کو اپنی رنگین عینک سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاش وہ اپنی تحریروں میں ایک ناطرفدار اور صداقت پسند مؤرخ کا طرز اپنا لیتے! مگر اُنہوں نے ہمیشہ واقعات و حالات اور شخصیات کو اپنے تعصبات کے آئینے میں دیکھ کر ان کے صحیح خدوخال مسخ کر دیے ہیں۔ میری نسبت بھی انہوں نے جگہ جگہ خامہ فرسائی کی ہے اور تقریباً ہر جگہ مجھے اپنی پسند ناپسند کے رنگوں میں پیش کرنے میں چابکدستی دِکھائی

ہے لیکن جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ وہ بار بار اپنے بیانات کی تردید و تکذیب بھی کرتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے غیر سیاسی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہاں اپنے قلم کی روانی دکھائی ہے۔ اس لیے میں نے ذاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے صدر کی حیثیت سے انہیں ۱۹۷۶ء میں اکادمی کا اعزازی فیلو بنایا۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات کسی نہ کسی رنگ میں جاری رہے لیکن ۱۹۷۶ء میں اُن کا ایک خاندانی کام سرکاری قواعد کی حد بندی کے باعث پورا نہ کیا جا سکا اور وہ مجھ سے برگشتہ ہو گئے۔ بعد میں اُنہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ۱۹۷۷ء میں میرے خلاف قایم ہونے والے "عظیم جنتا محاذ" میں چھلانگ لگائی۔ انہیں اُس وقت یہ قطعی طور پر یاد نہ رہا کہ وہ عمر بھر جے پرکاش نرائن، مرارجی ڈیسائی، جگجیون رام، اٹل بہاری واجپائی وغیرہ کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے ہیں۔ لیکن اتفاق سے یہ محاذ مُنہ کی کھا گیا اور اس کے ساتھ ہی پنڈت بزاز راتوں رات سرینگر سے غائب ہو کر دہلی کے "کاشی نگر" میں پھر پناہ گزیں ہو گئے اور اب وہ وہیں سے غلط سلط رپورٹوں پر مبنی کتابیں لکھ کر میرے ساتھ اپنی پُرانی نسبت کو تازہ کرتے رہتے ہیں[1] یعنی

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی ▲▲▲

---

[1]۔ بزاز صاحب ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۸۹ء کی درمیانی رات کو دہلی میں انتقال کر چکے ہیں

۲۳

کچھ تاریخ ساز واقعات

اِدھر کشمیر میں ہماری تحریک وسیع سے وسیع تر میدانوں کا احاطہ کر کے بچپن سے جوانی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی اُدھر ملکی اور قومی سطح پر کچھ ایسے واقعات جنم لے رہے تھے جن کا ہماری آئندہ تاریخ پر بہت گہرا اثر پڑنے والا تھا۔ ہندوستان میں جناح صاحب ایک عرصے کی خاموشی کے بعد کانگریس کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کر رہے تھے۔ اور مسلمانوں کو قومی دھارے سے الگ کر کے اپنی دوکان چمکا رہے تھے۔ جناح صاحب کے ساتھ کانگریس میں اچھا سلوک نہیں ہوا اور اُن کی حد سے بڑھی ہوئی انا (EGO) اب کسی طرح بھی اپنا لوہا منوانا چاہتی تھی۔ جناح صاحب اپنے آپ کو مہاتما گاندھی سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور سمجھتے تھے۔ اور کسی نہ کسی طرح قومی سطح پر ایک ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُس وقت کے کانگریسی لیڈروں نے اُن کے ارادوں کے استقلال کو نہ پہچانا اور کانگریس کلچر میں تنگ نظری کا جو میلان رہا ہے اُس کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اِس کے نتائج بعد میں سارے برصغیر کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً بھگتنا پڑے۔ جو تھے تو کانگریسی کوتاہ نظری کے شکار لیکن مایوسی

میں مسٹر جناح کی خودی کی شان کے بھینٹ چڑھ گئے اور اسی تیز دھارے میں اپنا وجود لہولہان کر کے اُٹھے۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ ریاستوں کے تئیں اپنا نقطۂ نظر واضح کر رہی تھیں۔ اور اس میں کانگریسی نقطۂ نظر ریاستوں کے عوام کے حق میں اور مُسلم لیگی طریقہ کار ریاستی راجواڑوں کے حق میں جھک رہا تھا۔ ہم پر بھی اس کا اثر ہوا اور ہم بے اختیار کانگریس کے دھارے کی طرف کھنچتے چلے گئے۔

اُن ہی دنوں برطانوی دارالعوام نے ایک مسودۂ قانون پاس کیا جس کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت ہندوستان کو ایک وفاقی ریاست میں تبدیل کرنا قرار پایا۔ ایکٹ کے نافذ ہونے پر وائسرائے ہند نے ہندوستان کے پانچ سو سے زیادہ والیانِ ریاست کو دعوت دی کہ وہ چاہیں تو برٹش انڈیا کے صوبوں کی طرح اس وفاق میں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے تمام نوابوں، راجوں اور مہاراجوں کو تو اقتدار کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وفاق میں شمولیت سے انکاری ہو گئے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا ردِ عمل بھی بعینہٖ یہی تھا۔ مُسلم کانفرنس کا عندیہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ اگر ریاست جموں و کشمیر کو مجوزہ وفاق میں شامل ہونا پڑے تو اس میں نمائندگی کا حق عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کو ہی دیا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں اسی ایکٹ کے تحت کانگریس نے برطانوی ہند کے صوبوں میں پہلی ہندوستانی وزارتیں قایم کیں اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یہی ایکٹ کشمیر کے ہند کے ساتھ اُس مشروط الحاق کی بنیاد بنا جس پر مہاراجہ ہری سنگھ نے دستخط کیے۔

۱۹۳۵ء میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ جس کی بازگشت اب تک ریاست کے معاملات میں سُنائی دے رہی ہے اور جس نے بعد میں ایک عالمی اہمیت اختیار

کی ہے۔ یہ برطانوی حکومت اور مہاراجہ کے درمیان گلگت کی حکمرانی سے متعلق معاہدہ تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی سرحد پر واقع کشمیر سے اس لحاظ سے خاص طور پر بہت دلچسپی تھی کہ اس کی سرحدوں سے اُن کے دیرینہ حریف روس کی سرحدیں ملتی تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اُنیسویں صدی سے ہی روس کے خلاف جاسوسی اور دوسری سرگرمیاں ریاست کی سرزمین سے ہی شروع کر رکھی تھیں مہاراجہ زبیر سنگھ کے وقت میں تو یہاں روسی زبان سکھانے کا ایک خاص مکتب کھولا گیا جس کا مقصد ان ہی سرگرمیوں کیلئے تربیت یافتہ جاسوسوں کو تیار کرنا تھا جب رُوس میں بالشویک انقلاب رُونما ہو گیا تو برطانیہ کی تشویش کچھ اور بڑھی اور گلگت کے فوجی نقطۂ نگاہ سے اہم خطے پر اُنکی دھیان نگاہیں مرکوز ہونے لگیں۔ مہاراجہ کی حکومت کو انگریز راج کی طرف سے پُشت پناہی مل رہی تھی۔ اور اس کا سنگھاسن عوامی تحریک کی بپھری موجوں سے ہچکولے کھا رہا تھا چنانچہ اس کو انگریز کا دستِ شفقت ہی ڈولنے اور ڈوبنے سے بچا رہا تھا۔ ایک شکر گذار مہاراجہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گلگت کے خطے کی حکمرانی عملاً برطانیہ کو سونپ دی۔ اور اپنے سپرِ سلطنتِ انگلشیہ کو خطاب کو حق بجانب ثابت کر دکھایا۔

اس معاہدے سے مہاراجہ کے حبُ الوطنی کے دعووں کا پول کھل جاتا ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی گدی کی حفاظت کے لیے انگریز کے ہاتھ ساری ریاست کو فروخت کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مہاراجہ کو یقین تھا کہ انگریز ابھی کئی دہائیوں تک ہندوستان کے سیاہ و سفید کے مختار بنے رہیں گے۔ اُس کے پردادا گلاب سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی پہلی تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے اپنے چیدہ سات ہزار فوجی دہلی کے محاصرے میں انگریزوں کی مدد کے لیے بھیجے تھے۔ اور اب اس کا پڑپوتا ہندوستان کے شمالی دروازے کی

کنجیاں انگریزوں کے ہاتھ میں دے کر اپنی نمک حلالی کا ثبوت دے رہا تھا۔

معاہدے کی رو سے مہاراجا گلگت کے فوجی اور سول انتظامات سے دست بردار ہو گیا اور یہ علاقہ ساٹھ برس کے لیے برطانوی حکومت کی براہِ راست نگرانی میں چلا گیا۔ معاہدے میں کچھ رسمی الفاظ ایسے بھی رکھے گئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ مہاراجا ہری سنگھ کی سرداری گلگت پر بحال ہے لیکن بعد کے سنگین واقعات کے ایک ہی تھپیڑے نے اس خوش فہمی کا ازالہ کر دیا۔ گلگت کو برطانیہ کی تحویل میں دے کر مہاراجا نے جس کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا اُس کی وجہ سے آج سارے خطے پر اعصابی جنگ کے ہی نہیں بلکہ گرم جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ شاہراہِ قراقرم کی تعمیر ہمارے سروں کے اُوپر ہوئی ہے یہ آئندہ اپنی کوکھ میں کیا کیا سانحات و حادثات لانے والی ہے اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس المیے کا مصنف مہاراجا ہری سنگھ ہے۔

۱۹۳۵ء میں مُسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس سرینگر میں ہوا جس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پہلی بار غیر مُسلم رہنماؤں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا اور اس اجلاس کے منتخب صدر چودھری غلام عباس کا ایک شاندار دریائی جلوس نکالا گیا۔ جلوس خواجہ غلام نبی گلکار اور بخشی غلام محمد نے منظم کیا تھا۔ اور اپنی شان و شوکت اور عوامی شرکت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ میں اِس اجلاس میں مُسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے منتخب ہوا۔

دُوسرے سال جماعت کا کوئی سالانہ جلسہ نہ ہوا۔ لیکن ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کو ہم نے ساری ریاست میں "ذمہ دار نظامِ حکومت کا دن" منانے کی اپیل کی۔ یہ

دن بڑے جوش اور جذبے سے منایا گیا۔ مُسلم لیڈروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم رہنماؤں نے بھی حکومت کے اِختیار و اِقتدار میں عوام کو شریک کرنے کی مانگ کی تائید کی اور شخصی حکومت کے ایوان ہل کر رہ گئے۔ ۱۹۳۷ء میں پُونچھ میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری صدارت میں منعقد ہوا۔ میں نے اس وقت کے اہم ترین مسئلے یعنی ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام کو اپنے خطبۂ صدارت کا خاص موضوع بنایا۔ میں نے اپنے خطبے میں کہا:

"ذمہ دار نظامِ حکومت اور خود مختار نظامِ حکومت کو ہم آج ہی اپنا نصب العین نہیں بنانے لگے ہیں بلکہ یہ مطالبہ تو تحریکِ حُریت کی ابتدا سے ہی مقصدِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہا ہے۔ خاص طور سے جب ۱۹۳۲ء میں موجودہ آئین ساز اسمبلی کا آئین مرتب ہو رہا تھا، اُس وقت ذمہ دار نظامِ حکومت کا مطالبہ ریاستِ جموں و کشمیر کے کونے کونے سے کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے موجودہ آئین کا مطالبہ مُسلم اکثریت کے ساتھ مختص نہیں رہا بلکہ اقلیتیں بھی اب بہتر آئین کا مُطالبہ کر رہی ہیں۔"

ہماری تحریک کو بعض حضرات ہندوستان کی تحریک کا محض عکس اور خوشہ چینی قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ دیکھنے کی زحمت برداشت نہیں کرتے کہ ہماری تحریک اپنے مزاج اور ذہن کے لحاظ سے ہر وقت ہندوستانی تحریک سے زیادہ فراخ دل، روادار اور روشن خیال تھی۔ اور ہم نے جو نصب العین اختیار کیے کئی سال کے بعد ہی ہندوستان کی تحریک اپنے آپ کو اُس کے ساتھ ہم آہنگ کر سکی۔ " مثلاً میرے اس خطبۂ صدارت کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ اقلیتی فرقوں کی طرف سے جو شبہات ہمارے بارے میں ظاہر کیے جا رہے تھے اُن کے

جواب میں، میں نے گذارش کی:

"ہمارے پڑوسی ملک، برطانوی ہندوستان کے بعض صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور چند ایک میں مسلمان بھی اکثریت میں ہیں۔ وہاں انڈین نیشنل کانگریس نے تحفظِ حقوق کی نسبت جو قرارداد پاس کی ہے ہمارا اعلان اس کے معیار سے کافی اونچا ہے۔ ہم نے فرسودہ اور رسمی لفاظی کا سہارا لے کر عملاً اقلیتوں کو حقوق عطا کرنے سے گریز نہیں کیا ہے اور نہ اس سلسلے میں منطقیانہ موشگافیوں کی آڑ لی ہے بلکہ ہم نے ہمیشہ غیر مبہم الفاظ میں اپنی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے ہیں اور انہیں سمجھوتے میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ اس پر بھی اگر ریاست کی اقلیتوں کا اصرار ہو کہ اُنہیں ریاست میں وہی کچھ ملے جو برطانوی ہند میں اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے دیا جائے گا تو ہمیں اُس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اب ہمارے ہندو اور سکھ بھائیوں کا فرض ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر غیر ذمہ دار نظامِ حکومت کی زندگی دراز نہ کریں جس کی سخت گیر پالیسیوں سے ہم اور وہ سبھی یکساں طور ناراض اور نالاں ہیں۔"

ریاستوں کے کروڑوں عوام کے حقِ خود ارادیت کو راجواڑے اور اُن کا مغربی انگریز سامراج جس طرح نظرانداز کر رہا تھا وہ بھی ہمارے دلوں میں تلاطم مچا رہا تھا اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری تحریک ایک تنگ کنوئیں میں قید ہو کر اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھی۔ اُسے روحِ عصر کا پورا عرفان اور شعور تھا۔ کشمیر کے حقِ خود ارادیت کے جس نعرے نے آنے والے برسوں میں دنیا بھر کے ایوان ہلا دیے اُن کے بیج میرے خطبۂ صدارت کے ان الفاظ میں چمک رہے تھے۔

"گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا دوسرا حصہ جو فیڈریشن کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اُس کا اثر ریاست اور اس میں رہنے والے عوام پر براہِ راست پڑتا ہے کیوں کہ فیڈرل اسمبلی اور کونسل کے ایوان میں برطانوی ہند کے ارکان کے دوش بدوش ریاستوں کے عوام کو بھی جگہ دی گئی ہے مگر برطانوی مدبروں نے آئین کو ترتیب دیتے وقت ہندوستانی ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے حقوق کو جس بے دردی سے نظرانداز کیا ہے وہ اس آئین کی سیاہ تاریخ میں سیاہ ترین صفحہ شمار ہوگا۔ ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندے خالص حیوان تصور کیے گئے ہیں جن کی رائے اور خواہش کو حکومتِ برطانیہ نے کوئی وقعت نہیں دی۔ اور اُن کے نمائندے نامزد کرنے کے اختیارات معدودے چند افراد کے حوالے کیے گئے ہیں۔ جن کے نازیبا سلوک سے کروڑوں انسان پہلے ہی سے نالاں ہیں۔ اگر ریاستوں کو فیڈریشن میں شامل کرنے سے حکومتِ برطانیہ کا مقصد ریاستوں کی حمایت حاصل کرنا ہے تو یہ مقصد آٹھ کروڑ انسانوں کے قلوب کو مٹھی میں لینے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ نوابوں اور مہاراجوں کی محدود حمایت اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی ہندوستان کے وہ قومی کارکن جو اس وقت آٹھ کروڑ مظلوم ریاستی باشندوں کی ترجمانی کرنے سے ہچکچاتے ہیں وہ فیڈریشن کے نافذ ہونے پر ان ریاستوں کو اپنے دوش بدوش کھڑا کرنے میں کامیابی سمجھیں گے۔ ان حالات میں زیادہ دُور اندیش نواب اور مہاراجے وہی ہو سکتے ہیں جو یا تو فیڈریشن میں شمولیت سے محتاط رہیں یا پھر نامزد نمائندوں کی بجائے مرکز میں جانے والے نمائندوں کے انتخاب کے اختیار اپنی رعایا کے سپرد کر دیں۔"

تاریخ کے "اگر" ہمیشہ دلچسپ خامہ فرسائی کا موضوع رہے ہیں۔ اگر ریاستوں خاص طور پر حیدرآباد اور کشمیر جیسی ریاستوں کے حکمرانوں میں تدبّر ہوتا وہ ہوا کا رخ

پہچان لیتے اور اُسی وقت سے اپنے ملک کے اختیارات میں عوام کی نمائندگی کی راہ ہموار کرنا شروع کر دیتے۔ تو آج برصغیر کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا؟ بعد میں اِن حکمرانوں نے اپنی ڈوبتی ہوئی ناؤ بچانے اور اپنی ریاستوں کی شخصیت بچانے کے لیے، جو جتن کیے وہ اُن کے کسی کام نہ آئے، کیونکہ وقت نکل چکا تھا۔ کسی کا یہ مقولہ کتنا صحیح ہے کہ "زمانہ ایک ایسا حسینہ ہے جو پیچھے سے گنجی ہے۔" اگر آپ اس کی زلفوں کو آگے سے ہاتھ میں لے سکے تو یہ آپ کی لونڈی بن جاتی ہے جو لوگ اس کے آگے نکل جانے کے بعد اس کا تعاقب کرتے ہیں اُن کے ہاتھ حسرت کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اسی سال محمد علی جناح صاحب پہلی بار کشمیر کی سیاحت کو آئے۔ وہ ابھی "قائدِ اعظم" نہیں بنے تھے۔ لیکن ایک معزز ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے مسلم کانفرنس نے اُن کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ ریاست میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں اور اس لیے اُن کا اور اُن کے لیڈروں کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلوب کریں بلکہ انہیں اپنی سیاسی اور اقتصادی گاڑی کا ایک لازم و ملزوم پہیہ سمجھ کر اُن کا بھرپور تعاون حاصل کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہماری تحریک کی وسعت کے لیے ہمیں ترغیب دے رہے تھے، قومی اتحاد کے لیے جو جذبہ اُبھر رہا تھا اور مذہب و ملّت کی جو حد بندیاں مٹ رہی تھیں اس سے کچھ لوگوں کے ماتھوں پر بل ہی نہیں بلکہ پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔ وہ اس اتحاد کو شخصی حکومت کے لیے آخری وار تصوّر کرتے تھے اور شخصی حکومت کے طبقاتی کردار کو نظر انداز کر کے وہ صرف یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ ایک غیر مسلم کی حکومت ہے اس لیے اُس کو ہر قیمت پر بچانا چاہیے۔ اس غرض کے لیے جب کوئی جائز طریقہ ہاتھ نہ آیا تو یہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے

کشمیری پنڈتوں کے ایک تنگ نظر لیڈر شِو نرائن فوطیدار نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے اُن کے محبوب پیغمبرؐ کی ذات پر ایک سوقیانہ حملہ کر دیا۔ مسلمان کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو جب اُس کے پیغمبرِ برحقؐ کی ذات پر کسی جانب سے حملہ ہو تو اس کی شریانوں میں خون کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبلنے لگتا ہے۔ فوطیدار صاحب کی تقریر جیسے کچھ نہ کم تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے اسے ہندو سبھا کے ترجمان "مارتنڈ" میں جلی حروف سے شائع کیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وادی کی فضا لرزنے لگی۔ مولوی یوسف شاہ جو سیاسی قلابازیوں کی وجہ سے بڑے دھارے سے الگ تھلگ ہو چکے تھے اِس فضا میں سامنے آ گئے۔ اُنھوں نے جامع مسجد میں توہینِ رسولؐ پر وعظ کے بعد ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کی۔ بھوری کدل میں پولیس جلوس پر ٹوٹ پڑی۔ گولی سے ایک نوجوان شہید ہو گیا۔ اور مولوی یوسف شاہ گرفتار کر لیے گئے۔

میں اُن دنوں سرینگر سے ۷۵ میل دور بھِپارہ میں تھا۔ جونہی میں نے اس اندوہناک سانحہ کی خبر سُنی تو میں نے ایک بیان میں کہا کہ "مذہب کسی خاص شخص کا اثاثہ نہیں۔ اگر مولوی یوسف شاہ دوپہر کا کھانا جیل میں کھائیں گے تو رات کے دسترخوان پر ہم اُن کے ہم نوالہ ہوں گے۔" طوفان موجیں مارنے لگا تو فوطیدار کی سِٹّی گم ہو گئی۔ اور لگے پنڈت جی گڑگڑا کر معافیاں مانگنے۔ وہ ہماری پناہ میں آ گئے۔ ہم نے انھیں پشیمان دیکھا تو ہم نے اپنے کارکنوں کے ہمراہ ایک کھُلی کار میں اُنہیں شہر میں گھمایا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص پشیمان ہو کر اب معافی مانگ رہا ہے۔ لہٰذا معاملے کو اب ختم کرنا چاہیے ابھی سرینگر سنبھلنے نہ پایا تھا کہ جموں میں فرقہ وارانہ فسادات نے اپنا پھن لہرایا۔ میں

فوری طور پر سردار بدھ سنگھ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ اور
جب تک وہاں امن و امان قائم نہ ہوا وہیں رہا۔
۱۹۳۶ء کے آخری دن کے ساتھ پہلی پرجا سبھا کی زندگی بھی ختم ہوگئی۔ مسلم
کانفرنس نے اسمبلی کے انتخابات لڑے اور پہلے ہی طرح شاندار کامیابیاں حاصل
کیں۔ یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ اُس وقت ووٹ کا حق محدود تھا اور ووٹر آبادی
کا صرف چند فیصد حصہ تھے۔ لیکن پیر ضیاء الدین بڈگام اور چودھری عبدالکریم میر
پوری نے آزاد اُمیدواروں کی حیثیت سے چُناو جیتے۔ مگر وہ بعد میں مسلم کانفرنس
میں شامل ہوگئے۔ اسمبلی کا پہلا سیشن ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو راج گڑھ محل سرینگر
میں ہوا۔ مُسلم کانفرنس کے ممبروں نے صرف حلف اُٹھانے کی رسم میں شرکت کی
اور پہلے ہی دن اجلاس سے واک آؤٹ کرکے اعلان کیا کہ جب تک حکومت اُن
کے جائز مطالبات تسلیم نہیں کرتی وہ اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔

اسی سال مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا
جس میں مُسلمانانِ فلسطین کے ساتھ یک جہتی اور یک سُوئی کا اعلان کیا گیا۔
مہاراجا کو انتباہ دیا گیا کہ وہ مجوزہ ہندوستانی وِفاق میں شرکت سے گریز کرے۔
اسی اجلاس میں اسّی فیصد والی مسلم اکثریت کی ریاست جموں و کشمیر کے لیے
مُسلم وزیرِ اعظم کی تقرری کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

۱۹۳۷ء کے آس پاس ہی میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے لاہور
کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ اُن دنوں میں اور بخشی غلام محمد لاہور میں تھے۔ نہرو
پنجاب پردیش کانگریس کے صدر میاں افتخار الدین کے مہمان تھے۔ ہم نے پنڈت
جی سے ملاقات کے لیے میاں صاحب کی رہائش گاہ پر فون کیا اور وہاں سے

معلوم ہوا کہ وہ صوبہ سرحد کے دورہ پر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن جانے والے
ہیں۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم ملاقات کے لیے اُدھر ہی پہنچ جائیں۔ چنانچہ ہم
دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ پنڈت جی اپنی سُرخ و سپید رنگت اور چہرے بشرے
سے کشمیری خدوخال کا دل کش پیکر لگ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اور
ریل کے ڈبے میں ہی اس طرح محوِ گفتگو ہوگئے جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں۔ اتنے
میں ٹرین چل دی لیکن گفتگو اس قدر دل چسپ تھی کہ ہمیں اُٹھنے کا خیال ہی نہ آیا
اور ہم شاہدرہ تک اُن سے باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہاں بخشی غلام محمد تو
اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔ مگر پنڈت جی مجھ سے اِصرار کرنے لگے کہ میں اُن
کے ساتھ صوبہ سرحد چلا آؤں۔ اُن کے اصرار میں اتنی اپنائیت، تپاک اور گرمی تھی
کہ میں یوں ہی چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ تاکہ پنڈت جی سے تبادلۂ خیال کا تفصیلی موقع
بھی ملے۔ میں نے صوبہ سرحد میں اُن کے ساتھ کئی روز گذارے اور اُن کی دلکش شخصیت
کو قریب سے دیکھا بھالا۔ اُن کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ جس پر
خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ اسی دَورے میں بادشاہ خان اور دیگر سرخ پوش رہنماؤں
سے میرا تعارف ہوا اور بادشاہ خان سے تو دائمی دوستی کے اُس رشتے کی بنیاد
پڑی جو زمانے کے زیروبم کے باوجود آج تک قائم اور سرسبز ہے۔ پنڈت جی سے
گفتگو کے دوران مجھے یہ دریافت کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ انہوں نے ہماری
تحریک کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ وہ ہماری تحریک کے ساتھ صرف ایک ممتاز
سیاسی قائد کی حیثیت سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ایک کشمیری سپوت
کی حیثیت سے اپنے وطنِ مالوف کی تقدیر بدلنے کی کوششوں سے خوب لو لگائے
ہوئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اُنہیں مادرِ کشمیر کے ایک فرزند کی حیثیت سے

خود اس بات کا بڑا شوق تھا کہ وہ مجھ سے ملیں جو اُن کے الفاظ میں "سوئی ہوئی" کشمیری قوم کو جگا رہا تھا! انھوں نے مجھ سے تحریک کے متعلق بہتیرے سوالات پوچھے۔ میں نے بساط بھر انہیں تحریک کے پس منظر سے واقف کرایا۔ اور اُن پر واضح کیا کہ یہ تحریک کسی صورت میں فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تحریک اس وقت تک مسلم کانفرنس کے نام سے جاری ہے لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ باوجود کوشش کے غیر مسلموں نے ہمارے ساتھ اشتراک کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت جی نے مشورہ دیا کہ ہمیں تنظیم کے دروازے ریاست کے ہر باشندے کے لیے بلا لحاظ مذہب و ملت کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ غیر مسلموں میں بھی جسے اس تحریک کا ساتھ دینے کی توفیق ہو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ایسا کر سکے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہندو فرقہ پرست پریس اور جماعتوں کو تحریک پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے کے لیے کوئی دلیل نہ مل سکے گی۔ رخصت ہونے سے قبل میں نے اُن کو اور بادشاہ خان کو کشمیر آنے کی دعوت دی جسے دونوں رہنماؤں نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔

کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان میں اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس پنڈت جواہر لال کی قیادت میں قایم ہوئی۔ جس کا مقصد راجواڑوں کی عملداری کے تحت ریاستوں کے عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلانا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر مسلم کانفرنس کے زعما تحریکِ حریتِ کشمیر کی ہندوستان کے قوم پرستوں سے حمایت چاہتے ہیں تو انہیں اپنے نظریات میں وسعت پیدا کرنا ہوگی اور جماعت کے نام اور اُس کے دستور میں تبدیلی لانا ہوگی۔ حسنِ اتفاق سمجھ لیجیے یا مشیتِ ایزدی کہ کشمیر کے دوسرے عظیم فرزند اور تحریکِ حریتِ کشمیر کے دعا گو اور مربی علامہ

سر محمد اقبال نے ۱۹۳۷ء میں مجھے کچھ اسی قسم کا مشورہ دیا۔ وہ اُن دنوں علیل تھے۔ میں نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی اُن کے کشمیر میں داخلے پر ۱۹۳۱ء سے پابندی تھی۔ اس پابندی کو واپس لینے کی درخواست کی گئی۔ لیکن مہاراجا کی حکومت نے اکتوبر تک اُنہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا۔ اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آگیا تھا۔ اور اقبال نے دوسرے سال کے لیے اپنا دورۂ کشمیر ملتوی کر دیا۔ اُنہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنتِ ارضی کے بدلے جنتِ فردوس کی سیاحت کے لیے بُلا لیے جائیں گے۔ جب میں اُن سے رخصت ہوا تو اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں۔ اور مسلم کانفرنس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیے جائیں۔ صرف یہی صورت کشمیر کے لیے آزادی حاصل کرنے کی ہوگی ورنہ آپسی اختلافات کو غرض مند اور مفادِ خصوصی رکھنے والے دوست اُچھالتے رہیں گے۔

مسلم کانفرنس میں قومی تنظیم کا بیج پہلے ہی مضمر تھا اب اس کا پیرہن بدل کر اسے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی گھڑی بھی آن پہونچی تھی اور کسی شاعر کے الفاظ میں ہر طرف یہ احساس عام ہو رہا تھا ۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

▲▲▲

(۲۴)

خواب کی تعبیر نیشنل کانفرنس

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا عمل کتنا تکلیف دہ اور نازک تھا اس کا کچھ حال تو اُن مرحلہ وار واقعات سے معلوم ہو جائے گا جو مسلم کانفرنس کی تنگ نائے کو نیشنل کانفرنس کے بے کراں دریا تک پہنچنے میں پیش آئے۔ لیکن اس کا اصلی ماجرا صرف اُن لوگوں کے سینوں کی لوح پر لکھا ہوا ملے گا، جنہیں اُن پُرآشوب دنوں میں اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے دلوں کے بنجر شاداب بنانے اور ضمیروں کے بیابانوں کو زرخیز بنانے کے لیے اپنا لہو پانی کی طرح بہا دینا پڑا۔ مجھے ایک طرف تو اپنے ساتھیوں کی بدگمانیوں اور بے یقینیوں سے بار بار مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور دُوسری طرف تحریک کے کائیاں اور ہوشیار دُشمنوں کی، جو کسی نہ کسی طرح تحریک کی اس وسعت پذیری میں روڑے اٹکانا چاہتے تھے، ریشہ دوانیوں سے دو دو ہاتھ کرنا پڑتے تھے۔ ایک طرف اگر مجھے چودھری غلام عباس، اللہ رکھا ساغر اور عبدالمجید قرشی کے تابڑ توڑ اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا تو دوسری طرف مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد اور مرزا افضل بیگ

کی ڈھلمل یقینی اور بعض حالات میں وسواس گھات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ مولوی عبداللہ وکیل جیسے لوگ کھلم کھلا اس نظریے کے دُشمن تھے۔

اُن ہی دنوں جموں میں مُسلم کانفرنس کا چھٹا سالانہ اجلاس جون کے آخری ہفتے میں منعقد ہوا۔ اُس وقت اگرچہ مشورت کا بڑا دھارا واضح طور پر مسلم کانفرنس کی توسیع کے حق میں بہہ رہا تھا لیکن بہت سے دِلوں اور خاص کر جموں کے دوستوں میں ایک تذبذب کا سماں طاری تھا۔ میں نے اس صورتِ حال کو بھانپ کر اپنے خطبۂ صدارت میں کہا،

”یہ ضروری ہے کہ جو لوگ موجودہ نظامِ حکومت میں مبتلائے مصیبت ہیں انہیں ذمہ دار نظامِ حکومت کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد میں شریک کیا جانا چاہیے۔ وہ لوگ کون ہیں؟ وہ صرف مُسلمان ہی نہیں، صرف ہندو اور سکھ ہی نہیں، اچھوت اور بودھ ہی نہیں بلکہ ریاست کے تمام باشندے ہیں۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آٹھ لاکھ کے آٹھ لاکھ غیر مسلم نہایت آرام کی زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ خیال خام ہے۔ دراصل ان میں سے صرف چند ایک ہزار ہی ایسے غیر مسلم ہوں گے جو مصائب و آلام سے بچے ہوئے ہیں۔

ہم ذمہ دار نظامِ حکومت صرف ۸۰ فیصدی مُسلمان آبادی کے لیے طلب نہیں کر رہے ہیں یہ تو ریاست کی سو فیصدی آبادی کے لیے مانگا جا رہا ہے۔ اِس لیے اِس کو حاصل کرنے کے لیے ۲۰ فیصدی ہندو، سکھ، بودھ اور ہریجنوں کو بھی شمولیت کی دعوت دینا اور اُنہیں اپنے ساتھ ملا کر آگے بڑھانا اشد ضروری ہے۔“

میں نے دوسری جانب کی غلط فہمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اِس بات

کی صراحت کی کہ غیر مسلموں کو اشتراکِ عمل کی دعوت دینا نہ زمانہ سازی ہے اور نہ ڈپلومیسی ہے بلکہ یہ ہمارے دل سے نکلی ہوئی ایک پُرخلوص آواز ہے۔

اس اجلاس میں ہم نے واضح طور پر مسلم کانفرنس کا دائرہ وسیع کر کے ایک قومی تنظیم بنانے کا جو خیال پیش کیا اُس سے جماعت کے اندر اور باہر تبادلۂ خیال اور تضاد آرائی جاری رہی۔ معاملات کو ایک واضح سمت دینے کے لیے میں نے ۲۸ جون ۱۹۳۸ء کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کر لیا اور اس میں اس سوال پر خوب بحث ہوئی۔ تقریباً باون گھنٹے تک اجلاس کی نشست جمی رہی اور مخالفت میں خوب خوب دلیلیں دی گئیں۔ ایک مرحلے پر بخشی غلام محمد اور مرزا محمد افضل بیگ بھی چودہری غلام عباس، مولوی عبداللہ وکیل خواجہ احمد دین بانہالی وغیرہ کے ساتھ مسلم کانفرنس کو توڑ دینے کے خلاف رائے دینے لگے۔ لیکن ممبروں کی اکثریت تنظیم کا جامہ بدلنے کے حق میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک وسیع تر قومی محاذ قایم کرنے کے حق میں اس قدر مثبت دلائل موجود تھے کہ مخالفین کی ایک نہ چلی۔ اور انہوں نے بھی اس کی حمایت کرنے میں سرگرمی دکھائی۔ ورکنگ کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے تمام ترقی پسند عناصر ذمہ دار نظامِ حکومت کے حصول کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی مجلسِ عاملہ سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ ہونے والے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے نام اور آئین میں اس قسم کی تبدیلی کی جائے تاکہ تمام ایسے لوگ جو اس سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں۔ بلا تمیز مذہب و ملت، رنگ و نسل آسانی کے ساتھ کانفرنس کے رکن بن سکیں۔

چودہری غلام عباس مرحوم اور اُن کے چند ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ اس

بات کا اندیشہ موجود ہے کہ ایسا کرنے سے تحریک کمزور پڑ جائے گی اور جماعت کے اندر غیر مسلم خلوص کے ساتھ نہیں بلکہ مفادِ خصوصی کی ترجمانی اور نگہداشت کے لیے مورچے قایم کر لیں گے اور دُوسری طرف مسلم کانفرنس کے دشمنِ اسلام کے نام پر ہمارے خلاف محاذ کھڑا کر لیں گے حکومت اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر ہماری صفوں کو تتر بتر کرے گی۔ اپنی جگہ یہ خدشات دُرست تھے اور میں ان امکانات سے بے خبر نہیں تھا۔ لیکن سیاسی دُنیا کے تجربات نے مجھے قائل کیا تھا کہ مفادِ خصوصی رکھنے والوں کا کوئی دین اور دھرم نہیں ہوتا اس لیے ہمیں اپنی صف آرائی فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم کے نام پر ترتیب دینی چاہیے۔ بہرحال ورکنگ کمیٹی نے بھاری اکثریت سے یہ قرارداد جنرل کونسل کی توثیق کے لیے منظور کر لی۔

اب مرحلہ یہ تھا کہ ہم مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس بلا کر اس قرارداد کی توثیق کرائیں۔ لیکن حکومت نئے خیالات کی کروٹ سے بوکھلا گئی۔ سر گوپالا سوامی آئنگر کرنل کالون کی سبکدوشی کے بعد ۱۹۳۷ء میں ریاست کے نئے وزیراعظم بن کر آئے تھے۔ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک روشن خیال مُدبّر ہیں۔ وہ جنوبی ہند کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن کشمیر آ کر وہ ایک ظالمانہ نظام کے آلۂ کار بن گئے تھے۔ اس لئے وہ اپنی سی نہ کر سکے اور اپنے میزبان طبقاتی نظام کے رنگ میں رنگ گئے۔ ان ہی دنوں میرپور کے راجہ محمد اکبر خان کو، جو ایک شریف، مخلص اور دردمند سیاسی رہنما تھے، حکومت کے خلاف تقریر کرنے کی پاداش میں تین سال قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ اس بے رحمانہ تعزیر سے ہم بھی متاثر ہوئے۔ ہم نے ۸ اگست کو "ذمہ دار نظامِ حکومت ڈے" منانے کی اپیل کی۔ سارے ملک میں ایک رَو دوڑ

فرقہ وارانہ اتحاد کے نظارے دکھائی دیے اور طول و عرض میں یہ دِن انتہائی جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ ان جلسوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ اُدھر تحریک نے منظم شکل اختیار کی تو حکومت کے انجر پنجر ڈھیلے پڑنے لگے۔ گوپال سوامی آئے تو تھے یہ کہتے ہوئے کہ وہ ریاست میں امن و قانون کی عملداری بحال کریں گے لیکن لگے دارو گیر اور پکڑ دھکڑ کے پُرانے حربے آزمانے۔ سرینگر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی۔ لیکن ہم نے اس پابندی کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے حضرت بل میں ایک بھاری جلسہ کیا جس میں میرے علاوہ پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا مسعودی، کیشپ بندھو، پنڈت جیالال کلم اور خواجہ غلام محمد صادق نے تقریریں کیں۔ ہم نے دوسرے دن سرینگر کے پرتاپ پارک میں جلسہ کرنے کا بھی اعلان کیا لیکن ۲۹، اگست کو مجھے گرفتار کرکے چھ ماہ قید سخت کی سزا سُنائی گئی۔ کچھ دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ شہر میں زندگی پھر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ جلسے جلوس ہوئے۔ گولیاں چلیں اور کئی نوجوان پھر پروانہ وار مادرِ کشمیر کی مانگ میں اپنے لال لال خون سے سیندور بھرنے لگے۔ میری گرفتاری کے دن ایک سرفروش کا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیر اعظم آئنگر سیکریٹریٹ سے نکل کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ وہ امیرا کدل پار کرکے اُس جگہ پہنچے جسے آج لال چوک کہتے ہیں تو ایک نوجوان محمد رجب نامی نے وزیر اعظم کی کار پر سوار ہونے کے لیے چھلانگ لگائی۔ کار اُسے روندتی ہوئی کوئی پانچ سو فٹ تک چلی گئی جہاں ایک انگریز نے سڑک کے بیچوں بیچ اپنی کار کھڑی کرکے وزیر اعظم کی کار کو رُکوانے میں کامیابی حاصل کرلی اور اس طرح محمد رجب کی زندگی بچ گئی۔ اُس کے جسم پر دو انچ گہرا اور ۲۵ انچ لمبا زخم آیا۔ ایک ہزار سے زیادہ گرفتار شدگان میں چند درجن غیر مسلم بھی پہلی بار قید خانوں میں ہمارے

دوش بدوش نغمہ سرائیوں سے آشنا ہونے لگے۔ کٹھوعہ جیل میں میرے لیل و نہار کوئی بہت اچھے نہیں کٹے۔ ایک تو کٹھوعہ کی آب و ہوا ویسے ہی مجھے راس نہیں آئی۔ ڈسٹرکٹ جیل میں کوئی آسائش بھی میسر نہ تھی۔ میرا کھانا بنانے کے لیے ایک اخلاقی قیدی کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ یہ قیدِ تنہائی میں رہنے کا میرے لیے پہلا موقع تھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ اپنے ہم نفسوں سے الگ تھلگ رہنا انسان کے لیے کتنے بڑے عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں کافی کوفت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہوتا گیا اور میرا زیادہ تر وقت چرخہ کاتنے اور مطالعہ میں صرف ہونے لگا۔ اس علاقے میں طرح طرح کے پرندے بھی ہوتے ہیں جو صبح سویرے ہی اپنی سُریلی چہچہاہٹ سے مجھے جگایا کرتے تھے۔ میں نے بھی اُن سے شناسائی پیدا کرلی۔ اور وہ میرے کمرے میں بلا دھڑک آنے جانے لگے۔ میں اُن کی پیاری حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا اور اُن کو دیر تک چشمِ شوق سے تاکتا رہتا تھا۔ ایسا وقت بھی آیا کہ مجھے اُن کی رفاقت سے تنہائی میں بہت سکون اور اطمینان حاصل ہونے لگا۔ پرندوں سے میرا یہ شوق بعد میں بھی جاری رہا۔

کٹھوعہ کی معیادِ اسیری کا فائدہ یہ ہُوا کہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" منگوا کر پڑھ لی۔ اس مفسرِ قرآن نے اسلام کی سچی عالی ظرفی کا جوہر دریافت کرلیا تھا۔ اور اس کے مطالعے سے میرے قوم پرستانہ خیالات اور راسخ ہوگئے۔

اس سے قبل ہم نے اپنے غیر مسلم اتحادیوں کے ساتھ قومی مطالبہ نامی ایک

دستاویز شائع کر دی تھی۔ جس میں ذمہ دار نظامِ حکومت کو ملک کی تمام علتوں کا علاج قرار دیا تھا۔ اس پر میرے علاوہ مولانا سعید، خواجہ غلام محمد صادق، میاں احمد یار، مرزا محمد افضل بیگ، پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز، سردار بدھ سنگھ، پنڈت جیا لال کلم، منشی غلام محمد، پنڈت شام لال صراف اور ڈاکٹر شمبھو ناتھ پشن نے دستخط کیے تھے۔

مجھے اپنی قید کی میعاد پوری کرنے پر ۲۸ فروری ۱۹۳۹ء کو جیل سے رہا کیا گیا۔ سرینگر میں میرے استقبال کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا۔ چھتہ بل ویر سے مجھے ایک بگھی میں بٹھا کر لے جایا گیا جس کو نو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ جلوس کے آگے باوردی گھوڑ سواروں اور سائیکل سواروں کے دستے تھے۔ اور پھر عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اُن کے پیچھے تھا۔ شاہی مسجد میں جلوس ختم ہوا اور میں نے ایک بڑے جلسے میں، جس میں ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں شامل تھے عوام کا شکریہ ادا کیا۔

حکومت متحدہ قومیت کی بنا پر ہماری قرارداد سے سہم اٹھی تھی۔ اور جیسا کہ میرے بعض رفیقوں نے خطرہ محسوس کیا تھا اُس نے ملک میں اس اقدام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پھیلا دیے تھے، ہماری قوم صدیوں کی غلامی سے ضعیف الاعتقادی کے روگ میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لہذا اس قسم کے واہمے اس کی نفسیات کو فوراً متاثر کرتے ہیں لیکن اگر انہیں صحیح صورتِ حال سمجھا دی جائے تو ان کی پاکیزہ فطرت فوراً حقیقت دیکھنے لگتی ہے۔ میں نے اپنی شدید اسیری کے آلام و مصائب کو سہلانے کی فرصت نہیں پائی اور میں نے ملک کا دورہ کر کے ان بداندیشیوں اور بدگمانیوں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا، جو دشمنوں نے ہماری اسیری سے فائدہ اُٹھا کر ملکی عوام کے ذہنوں میں بُن ڈالا تھا۔ اس دورے کے بعد ملک کی نفسیات (PSYCHOLOGY) ایک انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہو گئی۔ ۲۸ اپریل کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی توثیق کر دی۔ اور اس کے بعد ایک خاص اجلاس طلب کرنا ضروری بن گیا۔

۱۰ اور ۱۱ جون ۱۹۳۹ء کو مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس شاہی مسجد سرینگر میں بلایا گیا اور اس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ صادق صاحب کے بزرگ تحریک کی ابتدا سے ہی اس کے ساتھ وابستہ تھے۔ جب وہ علی گڑھ میں ہی زیرِ تعلیم تھے تو میں نے انہیں اور مرزا محمد افضل بیگ کو مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے تار دے کر بلایا تھا۔ صادق صاحب میں ہر انسان کی طرح بہت سی خامیاں تھیں لیکن غیر مذہبی سیاست پر اُن کا اعتقاد غیر متزلزل تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں جاری رہنے والی طویل بحث میں اپنی روشن خیالی اور استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ نوجوان رہنماؤں کی نئی نسل کے نمائندے تھے۔ اس لیے ہم نے انہیں ہی اس تاریخی سیشن کی صدارت کا اعزاز بخشنا مناسب خیال کیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں سیشن کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا:

"مسلم کانفرنس کا یہ اجلاس فیصلہ کرے گا کہ آج سے اسے نیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جائے اور ریاست کا ہر کوئی باشندہ، جو بالغ ہو، عورت یا مرد بلا امتیازِ مذہب و ملت اس کانفرنس کا رکن بن سکتا ہے۔ جس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام اور شخصی آزادیوں کے حصول کو تحریری طور پر اپنا سیاسی نصب العین ظاہر کرے۔"

خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"جماعت کا نام تبدیل کرنے کا فیصلہ اس کے سابقہ اجلاس میں جموں میں کیا گیا تھا۔ اس کو اس لیے التوا میں رکھا گیا تھا کہ رائے عامہ کو استوار اور تیار کیا جائے۔ لیکن اُدھر برصغیر میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ وفاق میں ریاستوں کی شمولیت نے نہایت اہم نوعیت حاصل کرلی۔ وائسرائے نے راجواڑوں کو گانٹھنے کی کوششیں تیز تر کردیں اور ہماری ریاست نے وفاق میں شمولیت کا فیصلہ کرلیا۔ ان حالات میں ایک متحدہ پلیٹ فارم اختیار کرنے کے سوال کو زیادہ دیر تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔"

لیکن سیشن کی اہم ترین تقریر دراصل چودھری غلام عباس خان کی تھی۔ چودھری صاحب کے دل میں کانٹا لگا ہوا تھا کہ نیشنل کانفرنس پر کانگریس کا غلبہ ہوجائے گا۔ لیکن میں نے انہیں کہا کہ اگر ہم اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد میں ڈٹے رہے اور اتحاد قائم رکھ سکے تو کانگریس یا مسلم لیگ کو ہم اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ وہ میرے استدلال سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نیشنل کانفرنس کے قیام کے حق میں ایک انتہائی زوردار تقریر میں کہا:

"آٹھ سال پہلے ہم نے ریاستی سیاست کے لیے مسلم کانفرنس کا جو جامہ تیار کیا تھا وہ اب بوسیدہ ہوکر تار تار ہوچکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی تحریک کو ایک شایانِ شان نئی پوشاک پہنائیں...... جو مسلمان مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے کی مخالفت کررہے ہیں وہ وہی ہیں جو مسلم کانفرنس کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ حکومت بھی اس نئی تبدیلی سے چراغ پا ہوئی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ اقدام اُٹھایا تو ذمہ دار نظام حکومت کے لیے ان کی پیش قدمی کو روکا نہیں جاسکے گا۔ حیرت کی بات یہ نہیں کہ کچھ غیر مسلم

بھی اس تجویز کی مخالفت کررہے ہیں اُن کے ارادوں کے بارے میں اُن کی کرتوت بڑی اچھی گواہ ہے..... ایک بڑی غلط فہمی یہ پھیلائی جارہی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے تحریک کو بیچ ڈالا ہے۔ یا وہ کانگریس کے ہاتھوں بک گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم گاندھی جی کے چیلے چانٹے بن گئے ہیں۔ لیکن یہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نہ کانگریس کے دستِ نگر ہیں نہ مسلم لیگ کے۔ ہم گاندھی اور جناح دونوں کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم اُن کے ہاتھوں اپنی تقدیر نہیں دے سکتے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ ریاستی لوگوں کو اپنے حکمرانوں کے آگے جھکنا چاہیے۔ ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ جناح صاحب کا کہنا ہے کہ ہماری ریاست کی اکثریت کو اقلیت کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ اور ہم اس نظریے کو درست سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے مطالبات کے سلسلے میں کانگریس یا مسلم لیگ کی مدد کا خیرمقدم کریں گے۔ لیکن ہم اپنے ضمیر کی آزادی کو کسی بیرونی جماعت کے ہاتھوں گروی نہیں رکھ سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہوں لیکن اُن لوگوں کی نسبت، جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کا خود ساختہ ٹھیکے دار جتلاتے ہیں، ہم مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے زیادہ حوصلہ اور ہمت رکھتے ہیں۔ یہ بات کہنا مضحکہ خیز ہے کہ اسّی فیصدی مسلمان بیس فیصدی ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں۔ ہم سچے مسلمان ہیں اور خوف ہمارے دلوں میں ہرگز نہیں۔ ہمارا یہ اقدام ہماری بے خوفی کا مظہر ہے۔ آپ لوگوں کو قائدِ اعظم شیرِ کشمیر کی خدمات کو زیرِ نظر رکھنا چاہیے اور دشمنوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔" بہرحال میں تقریروں اور جوابی تقریروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ سبھی اشارہ کرتے تھے کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا محرک، وکیل اور حمایتی میں ہی تھا اور میں بڑے اعتماد سے حلیفوں اور حریفوں کے

اِن اشاروں کو اپنا رہا تھا۔ آخر قرارداد پر ووٹ ڈالے گئے۔ ایک سو چھہتر [۱۷۶] مندوبین میں سے صرف چار مندوبین نے اپنے ووٹ اِس کی مخالفت میں ڈالے۔ اور یہ چاروں مولوی عبداللہ وکیل خواجہ غلام احمد گنائی بھدرواہی، شیخ احمد دین بانہالی اور چودہری حمیداللہ خان کانفرنس سے اُٹھ کر چل دیے۔ موخرالذکر یعنی چودھری حمیداللہ خان کشمیر کے ایک سابقہ مشیر مال چودھری خوشی محمد ناظر کے صاحبزادے تھے۔ بعد میں چودھری حمیداللہ صاحب نے ایک اخباری بیان کے ذریعے خصوصی اجلاس میں پاس کردہ تجویز کی حمایت کی تھی اگرچہ وہ بعد میں پھر نیشنل کانفرنس سے الگ ہوگئے۔ اور ریاستی پرجا سبھا میں مُسلم کانفرنس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر بنے۔ چودھری حمیداللہ مرحوم کو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں بہت تکلیف اُٹھانا پڑی۔ اُن کے بچے مارے گئے۔ بیوی زخمی ہوئیں۔ اُنہوں نے پاکستان ہجرت کی اور اپنے بچوں کے فراق میں جواں مرگ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔ سیشن نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس کی جنرل کونسل ورکنگ کمیٹی اور عہدیدار نیشنل کانفرنس کے عہدیدار تصوّر ہوں گے۔ جب تک کہ نئی تنظیم کے انتخابات نہ ہوں نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں مندرجہ ذیل غیر مسلم ممبر شامل کیے گئے۔ سردار بودھ سنگھ۔ پنڈت جیالال کلم، پنڈت گردھاری ڈوگرہ، پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور جموں کے سردار مہندر سنگھ۔ ہم نے تنظیم کے لیے لال زمین پر سفید ہل والے نشان کا جھنڈا بھی منظور کرلیا۔ اس جھنڈے کا بنیادی ڈیزائن ایک جوشیلے کارکن پنڈت پریم ناتھ ودر نے پیش کیا تھا۔ جس میں تھوڑی ترمیم کے بعد اسے منظور کرلیا گیا۔ لال زمین کسان اور محنت کش کے لال لال لہو کی ترجمانی کرتی تھی اور ہل اُس کا مرغوب اور کارساز نشان تھا۔ جس کو زمین میں جوت کروہ

گندم کے سنہری خوشے اور دھان کی زرین بالیاں اُگاتا تھا۔ اُس وقت چند ہی لوگوں کو یقین تھا کہ ایک دن یہ پرچم مہاراجے کے محل اور ریاست کے ایوانِ اقتدار پر مستانہ ترنگ کے ساتھ لہرانے لگے گا۔ مولوی محمد سعید نے بعد میں اِس پرچم کا ایک بڑا دلکش ترانہ لکھا جس کے ابتدائی بول ہیں ؎

لہرائے کشمیر کے جھنڈے — طفل و جوان و پیر کے جھنڈے
بازوئے بے شمشیر کے جھنڈے — ہل والے دلگیر کے جھنڈے

لہرائے کشمیر کے جھنڈے

آل جموں و کشمیر مُسلم کانفرنس کی تمام اکائیوں نے اپنے آپ کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرلیا۔ اور اس میں ہندو اور سکھ بھی شامل کیے گئے۔ غیر مُسلم نوجوانوں میں ڈی پی در، جانکی ناتھ زتشی، شام لال صراف، سری کنٹھ رینہ، شام لال واٹ اور پریم ناتھ در اور بار ہولے کے کچھ سکھ نوجوان شامل ہوگئے۔

اجلاس کے بعد جن لوگوں نے کھلم کھلا مخالفت کی تھی وہ تو ہم سے الگ ہوگئے تھے لیکن کچھ دوستوں نے زمین دوز طریقے پر نئی تنظیم کے خلاف کانٹے بچھانے شروع کردیے اس سلسلے میں مولوی محمد سعید اور بخشی غلام محمد تھے جو "کارنامے" انجام دیے اُن کی تفصیلات کچھ دوسری کتابوں میں آچکی ہیں۔

ابتدائی دور کا ذکر مجاہد منزل کی تعمیر کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا۔ یہ ہماری تحریک کا اعصابی مرکز بن چکا ہے اور ایک فعال اور سرگرم تنظیم کی زندگی کے لیے میں اس قسم کی قلبی عمارت کی تعمیر اہم خیال کرتا تھا۔ اُن دنوں ہمارے پاس بہت ذرائع تو نہ تھے لیکن پھر بھی میں نے کمر ہمت باندھ ہی لی۔ اس کا نقشہ سرینگر میونسپلٹی کے انجینیئر کھانڈے خان صاحب نے تیار کیا تھا۔ میں نے تمام شہر میں گھر گھر جا کر

اس کی تکمیل کے لیے چندہ نقدی اور جنس کی صورت میں جمع کیا۔ کشمیر کی بیٹیوں میں قومی جذبہ اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ انہوں نے اپنے کانوں کی بالیاں اور دوسرے سونے اور چاندی کے زیورات اتار کر دیے۔ حالانکہ زیور عورت کی بڑی حسین کمزوری ہوتی ہے اور کشمیری عورتوں کو اپنی غربت کی وجہ سے ویسے بھی بہت ہی کم زیورات نصیب ہوتے تھے۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ۱۹۳۵ء میں اس کی تعمیر پوری ہوئی۔ اس جگہ بالن کی منڈی قایم تھی جسے ہم نے سرکار سے حاصل کر لیا تھا۔ یہ جگہ شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس کے متصل شاہی مسجد کی عمارت واقع ہے اور یہ جہلم کے کنارے پر ہے۔ اس کے بالکل سامنے مشرقی کنارے پر خانقاہ معلی کا دینی اور سیاسی مرکز ہے اور اس لحاظ سے یہ تحریک کا دل بننے کے لیے بالکل موزوں تھا۔ جس وقت کام شروع ہوا اس وقت صرف ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم ہماری گٹھی میں تھی لیکن عوام کے ایثار سے ہزاروں روپے کا سرمایہ جمع ہوا۔ اس کام میں خواجہ عبدالرزاق کینگ، حاجی محمد وانی آبی گذر، خواجہ حبیب اللہ زرگر نے میرا ہاتھ بٹایا۔ بعد میں وقتاً فوقتاً اس عمارت کی توسیع ہوتی رہی۔ خاص طور پر ۱۹۶۲ء کے بعد ہم نے یہاں اوقاف اسلامیہ کا صدر دفتر بنایا تو اس کے احاطے اور عمارات کی توسیع کی۔ اس عمارت میں ایک مرکزی ہال چھوٹے جلسوں وغیرہ کے لیے بنایا گیا۔ جو ہماری تحریک کا اعزازی نگار خانہ بھی بن گیا ہے اور جہاں اس کے اہم رہنماؤں اور واقعات کی تصاویر جمع ہیں۔ یہاں پر دیہات اور دور دراز سے آئے ہوئے کارکنوں اور مہمانوں کے خورد و نوش اور قیام و طعام کا بھی پورا انتظام ہے۔ بعد میں ہم نے ۱۹۸۰ء میں اسی قسم کا ایک مرکزی دفتر "شیر کشمیر بھون" کے نام سے جموں میں بھی تعمیر کیا ہے۔

مجاہد منزل کو بھی ہماری تحریک کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ دھوپ اور سائے کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ سب سے بڑی آزمائش ۱۹۵۳ء میں آئی۔ جب مجھے ایک شب خون کے ذریعے وزارت عظمیٰ سے الگ کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ کچھ دنوں تک تو اسے بخشی غلام محمد کی پارٹی اور ان کے بدنام ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید اپنی کارستانیوں کی آماجگاہ بنائے رہے لیکن بعد میں یہاں سنٹرل ریزرو پولیس کی چوکی قایم کر لی گئی۔ اسی دوران یہاں سے تحریک حریت کا نہایت ہی قیمتی مواد اور دستاویزات اڑا لی گئیں۔ کچھ ایسی دستاویزات پردیش کانگریس کے دفتر واقع ریذیڈنسی روڈ بھی پہنچائی گئی تھیں۔ جہاں بعض اخباری اطلاعات کے مطابق یار لوگوں نے قومی لیڈروں کے خطوط اور دوسری دستاویزات اڑا کر انہیں اونے پونے داموں فروخت کر دیا اور اس مال غنیمت سے اپنی شاموں کا چراغاں کرتے رہے۔ لیکن اس امر کا اعتراف برحق ہوگا کہ بخشی غلام محمد نے مجموعی حیثیت سے اس عمارت کی حفاظت کی اور بعد میں اسے اوقاف کے سپرد کر دیا۔ ہم نے سنٹرل ریزرو پولیس سے بھی بعد میں کرائے کے طور پر ہزاروں روپے کی خطیر رقم حاصل کی جسے مجاہد منزل کی عمارت کی حالت بہتر بنانے کے لیے صرف کیا گیا۔ ▲▲▲

۲۵

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش!

ہماری تحریک اب اپنے منطقی ارتقاء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مُسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنا کشمیر کی سیاسیات میں اپنی نوعیت کا انقلاب انگیز اقدام تھا۔ مجھے احساس تھا کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس میں قدم قدم پر خطرے موجود ہیں۔ لیکن قدم آگے بڑھا کر اُن کو پیچھے ہٹانا کبھی میرا شیوہ نہیں رہا ہے۔ البتہ جن خطرات اور اندیشوں کا ہم نے اندازہ لگایا تھا وہ توقع سے بھی کہیں زیادہ جلدی ہمارا دامن پکڑنے لگے۔

نیشنل کانفرنس کے قیام سے مُسلمانوں کے ملازم طبقے کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب اُن کی وکالت کرنے والا کوئی نہیں۔ اُنھیں مُسلم کانفرنس کے مقاصد کی تکمیل سے دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اِس کو ایک دباؤ ڈالنے والا عنصر بنا کے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چند ملازمتیں حاصل کرنے سے ہماری نجات ممکن نہیں ہو گی۔ بلکہ ہمیں ملک کے سیاسی، آئینی اور معاشرتی نظام کی جڑوں میں چھپے ہوئے روگ کا علاج کرنا چاہیے کیونکہ جب تک جڑ کا علاج نہ ہو ٹہنیاں ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ لیکن افراد وسائل کو

قومی سطح سے ذاتی پر اُتارنے کے درپے لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری بات مُسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے سے کو کم ہی راس آتی تھی۔ دوسری طرف غیر مُسلم تو ہم سے اور بھی بدکنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے سارے مفادات حکمران طبقے سے وابستہ کر رکھے تھے اور وہ کشمیر کے ہندو حکمران کے ناطے اسے ایک ہندو راشٹر سمجھتے تھے اُن کا پڑھا لکھا اور دولت مند طبقہ اِنتظامیہ اور سماجی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ مُسلمان تو خیر پسماندہ ہونے کے ناطے اُن کے اِستحصال کا شکار تھے ہی۔ غیر مُسلم غریب طبقے پر بھی ان کی گرفت مضبوط تھی وہ کسی ایسی تحریک کی حمایت پر تیار نہ تھے جس کا حکمران پر یا اُن کے مفادِ خصوصی پر کوئی ناگوار اثر پڑتا۔ لے دے کے کشمیری پنڈتوں کے نوجوان طبقے کا ایک حصہ نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گیا۔ لیکن اُن پر بھی اپنے فرقے کی طرف سے مُسلسل دباؤ پڑتا رہتا تھا اور وہ ہمارے ہر قدم کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنھوں نے نیشنل کانفرنس میں اس مقصد کے لیے شمولیت کی تھی کہ وہ اِس کی پالیسیوں کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال سکیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تو لگے راہ فرار ڈھونڈھنے اعتراضات شروع ہوئے کہ ہمارے جلسوں میں نعرہ تکبیر کیوں بلند کیا جاتا ہے یا جلسے کا اِفتتاح قرآن شریف کی تلاوت سے کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ عجیب منطق تھی۔ بھلا اس منطق کو آگے لے جایئے تو کچھ یوں بات بنتی تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے لیے "بندے ماترم" کو اپنا قومی ترانہ چننے میں کیا تُک تھی؟ یہ بنکم چندر چٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" کا ایک حصہ تھا جو سارے کا سارا مُسلمانوں کے خلاف تھا۔ خود اس ترانے کے دو آخری بند انتہائی مُسلم آزار تھے۔ اس لیے اُنھیں حذف کر دیا گیا تھا۔ "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ کانگریس کے جلسوں میں اکثر بلند ہوتا تھا۔ یہ بھارت کو "دیوی" کا رُوپ دے کر

دیوی پوجا اور بت پرستی کا سا تصور پیدا کرتا تھا۔ جو اسلام کے نظریۂ توحید کے منافی تھا لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا اور خود ہمارے غیر مسلم معترضین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں اُن کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ سامعین کی ذہنی سطح اور تہذیبی فضا کو دیکھ کر نعرے اور تقریر کی زبان استعمال کی جاتی ہے کیونکہ وہ ان سے مانوس ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے نعرہ تکبیر سے ہی ایک خوابیدہ قوم کو جگایا تھا۔ مسلم کانفرنس میں تبدیل کرنے کا مقصد بھی ہرگز یہ نہیں تھا۔ مسلمان اپنی مذہبی روایات سے کنارہ کش ہوں۔ کیونکہ ہمارا غیر مسلموں سے بھی کوئی مطالبہ نہیں تھا کہ وہ اپنے مذہب سے کسی طور پر برگشتہ ہوں۔ میرا تو پورا یقین تھا کہ ایک مسلمان سچا مسلمان ہونے کے باوجود اچھا قوم پرست اور ایک ہندو کھرا ہندو ہونے کے باوجود پکا دیش بھگت بن سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ تعصب کی عینک کو آنکھوں پر چڑھائے رکھیں تو وہ کبھی حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے۔ مجھے یاد ہے کہ اپریل ۱۹۴۰ء میں عید میلاد النبیؐ کی ایک تقریب تھی۔ میں نے قرآن کریم کی ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ "اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلامؐ کو ایک روشن چراغ سے تشبیہ دی ہے اور جس طرح سورج چڑھتے ہی ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے بعد اب کسی اور پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کی معرفت جو نسخۂ کیمیا یعنی قرآن بھیجا ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ اس کے بعد کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں رہی۔" میری اس خالص مذہبی تقریر کا میرے غیر مسلم دوستوں نے بتنگڑ بنایا اور ہنگامہ کھڑا کیا۔ پنڈت جیالال کلم، پنڈت کیشپ بندھو اور پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر

اعتقاد رکھتا ہوں اور جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ اعتقاد اُن کے قوم پرست ہونے میں حائل نہیں ہوتا اُسی طرح میری قوم پرستی میں بھی اس سے کوئی دراڑ نہیں پڑتی۔ لیکن بندھو جی اور کلم صاحب تو اس بہانے سے استعفیٰ دینے کی منزل تک پہنچ گئے اور وہ یہ بھول گئے کہ مہاتما گاندھی اپنے آپ کو بار بار ایک سچا اور پکا ہندو سمجھتے تھے لیکن اُن کی قوم پرستی کی . اس بناء پر مشتبہ نہیں تھی۔ لیکن انھیں تو بہانے کی تلاش تھی اور وہ استعفیٰ دے کر ہی رہے۔ بعد میں پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی نیشنل کانفرنس سے کوچ کر گئے۔ یہ پنڈت حضرات اس فریاد کو لے کر جواہر لال نہرو کے پاس بھی گئے لیکن نہرو جی نے اس اعتراض کو اسی حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیا جس کا یہ مستحق تھا۔

دوسری طرف مسلمان ممبران بھی قوم پرستی کی اختیار کی ہوئی راہ پر پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا رہے تھے اور کسی طرح پھر پیچھے کی جانب گردش دوران کو موڑنا چاہتے تھے۔ مجلس احرار سے میری اس لیے نہیں بن سکی تھی کہ وہ ہم کو اپنے اشاروں پر نچانا چاہتے تھے اور ہمیں فیصلوں کا حق ملک سے باہر نہیں بلکہ ملک کے اندر رکھنے کا روادار تھا۔ دوسرے انھیں ہماری تحریک سے زیادہ اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کی فکر دامن گیر تھی۔ اور وہ ہماری قربانیوں اور مظلومیت کو نیلام کر کے اپنا بھلا کرنا چاہتے تھے۔ تیسرے انھوں نے اپنی تحریک کا محور قادیانیت کی مخالفت کو بنایا تھا۔ اور میں فرقہ وارانہ مناقشوں سے بیزار تھا۔ کیوں کہ یہی مناقشے کشمیری مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر کے انھیں ایک لقمۂ تر بنا چکے تھے جس کو کوئی بھی نگل سکتا اور نگل لیتا تھا۔ ہماری تحریک میں مجلس کے چند ہمدرد موجود تھے۔ جن میں مسلم کانفرنس اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد سعید مسعودی پیش پیش تھے۔ مولانا مذکور وات علاقہ دراوہ مظفرآباد کے رہنے والے تھے

بعد میں آپ نے معہ خاندان نقلِ مکانی کیا اور نرہ گام میں آباد ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں مولوی سعید صاحب محکمہ تعلیم میں مُلازم تھے اور تحریک کے ہمدردوں میں شُمار ہوتے تھے۔ بعد میں انھوں نے مُلازمت ترک کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اپنے علمی عبور، چرب زبانی اور فہم و فراست کی وجہ سے جلد ہی تنظیم کی اعلیٰ صفوں تک پہنچ گئے۔ بد قسمتی سے اُن کے مزاج میں ایک صورت خرابی کی ازل سے ہی مضمر ہے۔ انھیں ہلّیر لڑانے اور گروہ بندی میں بڑا لُطف آتا ہے۔ کسی جماعت میں بھی شامل ہو جائیں اپنے اردگرد ضرور ایک گروہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور پھر پردے کے پیچھے سے تار کھینچ کر اُن کو جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کر تب سکھا لیتے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ اس میں خود اُن کے مقاصد اور اُن کی ذات ہی کیوں تختۂ مشق نہ بنے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اُن کے مزاج کی اس حیران کن خاصیت سے کبھی پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکا۔ مُسلم کانفرنس میں رہ کر بھی یہ نوجوانوں کو ہمارے خلاف اُکساتے رہتے تھے۔ اب نیشنل کانفرنس بن گئی۔ اُس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ نئی تنظیم کی دیواریں مُنہدم کرنے کے لیے جوڑ توڑ لڑاتے رہے اور ایک مرتبہ تو اُن کی اس خصلت سے تنگ آکر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے انھیں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں "مفتیِ کشمیر" کے لقب سے بھی نوازا۔

اُدھر جموں کے نیشنل کانفرنس کے رہنما بھی ایک عجیب ذہنی بے یقینی کا شکار ہونے لگے۔ ہم نے نیشنل کانفرنس بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا اُس کے مُحرک ہمارے گرد و پیش کے حالات تھے اور یہ فیصلہ کشمیر کے عوام کے مفادات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ یہ کسی بیرونی جماعت یا رہنما کے اثر کا نتیجہ ہرگز نہ تھا۔ کشمیری زبان اور کلچر کے لحاظ سے ایک مخصوص انفرادیت کے مالک ہیں۔ "راج ترنگنی" کے فاضل

مترجم سر آرل سٹائن اور عظیم ہندوستانی مؤرخ ڈاکٹر تارا چند تو اس حد تک گئے ہیں کہ کشمیر برِصغیر ہند و پاک کا نہ جغرافیائی نہ تہذیبی اور نہ تاریخی طور پر حصّہ ہے۔ اُن کا میل جول بیرونی دُنیا سے بہت کم رہا ہے اس لیے اُنھوں نے اپنی مشکلات کے حل کے لیے کبھی کسی کی طرف دستِ سوال دراز نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُنھوں نے اُن کا مقابلہ اپنے حالات کے مُطابق خود ہی کیا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے بعد بھی یہی صورت پیش آئی اور اپنی قربانیوں کی وجہ سے اُن میں ایک خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اِس کے برعکس صوبہ جموں کے باشندے زبان اور کلچر کے لحاظ سے اپنے ہمسایہ پنجاب کے غالب اثر میں رہے ہیں۔ اُن کی آپس میں رشتہ داریاں بھی تھیں اور کاروباری تعلّقات بھی۔ چونکہ ریل گاڑی جموں تک آتی تھی اِس لیے ملنے جُلنے کی سہولیات بھی خاطر خواہ تھیں۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو یہ دوڑ کر جموں سے لاہور جا پہنچتے اور وہاں سے ہدایات کی پوٹلی لے کر لوٹتے۔ ادھر ۱۹۳۱ء کو ایجی ٹیشن سے مُلازمتوں میں مُسلمانوں کو جو فائدہ حاصل ہوا تھا اُس کا زیادہ فائدہ بھی جموں اور پنجاب کے ان مُسلمانوں نے اُٹھایا تھا جو پنجابی زبان بولتے تھے۔ وہ مُسلم کانفرنس کی نیشنل کانفرنس میں تبدیلی سے اپنے آپ کو دباؤ کے ایک حسبِ خاطر ذریعے سے محروم تصوّر کرنے لگے تھے۔ ان میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ اور یہ ذہنی طور پر ریاست سے باہر کے سیاسی رُجحانات کے غُلام بنے ہوئے تھے۔ باہر کے لیڈر بھی ان کو ایک کم ترقی یافتہ نو آبادی کے گُماشتوں کی طرح اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ صورت کم و بیش آج بھی قائم ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج یہاں کے غیر مُسلم فوراً جالندھر، امرتسر اور نئی دہلی پہنچ کر ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جموں کے ہندو اور مُسلمانوں میں کبھی مضبوط قیادت نہ اُبھر سکی۔ جموں کی بات چلی ہے تو وہاں مضبوط قیادت کے کال کی کچھ اور وجوہات

کی طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔

جموں شہر آبادی اور وسعت کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے لیکن اپنے چھوٹے پن کے باوجود یہ ریاست کی راجدھانی اور حکمران خاندان کا آبائی شہر تھا۔ کچھ لوگ رشتے داریوں یا دیگر وجوہات کی بنا پر دربار میں رسائی حاصل کر لیتے۔ عوام میں اُن کی قدر ہوتی تھی اور اُنھیں عزت و وقار حاصل ہو جاتا۔ دربار میں سفارش کسی کے اثر و رسوخ کی بنیاد بن گیا اور سفارشیں زیادہ تر ملازمتوں اور عہدوں سے متعلق ہوتی تھیں۔ اُن کو عوام کے بنیادی مسائل سے بس واجبی ہی دلچسپی رہتی تھی۔ اِس صورت حال میں آج بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے اگرچہ پرانا نظام بدل گیا ہے۔ لیکن ذہنوں کی ساخت اور عادتوں کا معمول بدلتے بدلتے ہی بدلتا ہے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ صوبہ جموں کی آبادی جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں ذیلی برادریوں اور قبیلہ داری میں بٹی ہوئی ہے۔ ہندوؤں میں برہمن، راجپوت، مہاجن، کھتری، جاٹ، پچھڑا، اوٹ، ہریجن، بھگت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ بعد میں اُن کا اور بھی بٹوارہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً راجپوتوں میں سوان راجپوت، جموال، ٹھاکر وغیرہ۔ برہمنوں اور مسلمانوں میں بھی یہی مسئلہ ہے اور یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ صوبہ جموں میں کوئی مضبوط قیادت نہیں اُبھر سکی۔

وادیٔ کشمیر کی کیفیت اس سے بہت مختلف ہے۔ یہاں کی پچانوے فی صدی آبادی پر آج سے چند سال پہلے تک سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہمیشہ بند رہے ہیں۔ فوج میں اُن کو غیر عسکری قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ حکمران طبقے نے خاص طور پر ۱۸۴۶ء کے بعد کشمیر کو ایک نوآبادی سمجھا اور یہاں کی مسلم آبادی کو ہمیشہ دبا کر رکھا۔ اس لیے یہاں جو قیادت اُبھری اُس کے سوچنے کی سطح عوامی تھی

اور اس کی عوامی بنیاد وسیع تر تھی۔ مجھے تحریکِ کشمیر کی اس منفرد شخصیت کا ہمیشہ گہرا احساس رہا اور میں نے حتی المقدور بیرونی اثرات کے آگے سر جھکانے سے انکار کیا۔ چاہے وہ مسلم لیگ ہو یا کانگریس ـــــ سوشلسٹ ہوں یا کمیونسٹ۔ ہم چند گام تو ان کے ساتھ چلے ضرور لیکن مُڑ مُڑ کر اپنے مفادات اور اپنی انفرادیت کے دائرے میں مراجعت کرتے رہے۔ یہ دراصل کشمیر کی شخصیت اور شناخت (IDENTITY) کی تلاش تھی۔ کشمیر تواریخی، جغرافیائی اور تہذیبی سطحوں پر ایک خاص انفرادیت کا مالک رہا ہے۔ لیکن پچھلے گذشتہ چار صدیوں سے ہمارے غیر ملکی نوآبادکار تحلیل، مسخ اور ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ہمیں اس جدوجہد میں غیر کشمیری مسلمانوں اور غیر کشمیری غیر مسلموں سے لڑنا پڑا لیکن ہمارے عزم میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ واقعہ یہی ہے کہ کشمیری شناخت کی یہی تلاش ہمارے بظاہر غیر مربوط اقدامات کو اندرونی اور داخلی معنویت اور تسلسل بخشتی ہے۔

میں اپنے ضمیر کو کسی کے پاس گروی رکھنے کے حق میں کبھی نہیں رہا۔ اکثر دیکھنے میں آرہا ہے کہ کچھ لوگ بادشاہ سے زیادہ وفادار بن کر تحریکِ کشمیر کو بیرونی عوامل کا نتیجہ اور بیرونی تحریکوں کو دُم چھلّہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخی دیانت کا خون چڑھانے کے مترادف ہے۔ کشمیر کی تحریک ہندوستان کی تحریک کا ان معنوں میں تسلسل ہے جن معنوں میں خود ہندوستان کی بیداری عالمی شعورِ آزادی کی انگڑائی سے وابستہ ہے۔ لیکن تحریکِ کشمیر کے اپنے انفرادی خدوخال اتنے نمایاں اور ممتاز ہیں کہ اُن سے آنکھیں بند کرنے والا چشمۂ آفتاب سے آنکھیں میچ لیتا ہے۔ ۱۹۳۱ء اور اس کے بعد کشمیر کا حکمران ٹولہ اور اُن کا غیر ریاستی مفاد خصوصی رکھنے والا نقارہ بجانے والا پریس چلاتا رہا کہ یہ تحریک احراری اور قادیانی انگیخت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مہاراجہ بیکانیر

نے لندن سے واپسی پر ایک بیان میں کشمیر کی تحریک کو پنجاب کے مسلمانوں کی اکساہٹ کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کا جواب اس وقت "دی سٹیٹسمین" کلکتہ کے نمائندے نے یوں دیا جو ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کے شمارے میں چھپا۔

"ہم برطانوی ہند میں یہ سنا کرتے تھے کہ کشمیر کی موجودہ تحریک باہر کے اثر یا پروپیگنڈہ کا نتیجہ ہے یا یہ کہ اندرونِ کشمیر کے چند تعلیم یافتہ لوگ باہر کے لوگوں کے اکسانے سے بھڑک اٹھے ہیں۔ لیکن جب میں کشمیر آیا تو معلوم ہوا کہ یہ اندرونی تضادات و عوامل کی پیداوار ہے۔ ہر کشمیری میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے حقوق طلب کرتا ہے۔ اُن میں جو بیداری پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مصائب اور مشکلات نے انھیں خوابِ گراں سے چونکا دیا ہے۔ مہاراجہ بیکانیر جو ابھی ابھی انگلستان سے لوٹے ہیں کشمیر کے واقعات و سانحات کے ہرگز شاہد و ناظر نہیں ہیں۔ لہٰذا اُن کا بیان قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ کشمیر کا قضیہ بیرونی مداخلت کا نتیجہ ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیر کی ایجی ٹیشن بیرونی امداد کے بل پر نہیں بلکہ خود اپنے اسباب و عوامل کی بنیاد پر جاری ہے۔"

بعد میں کانگریس کے ساتھ ہمارے اصولوں کی ہم آہنگی سامنے آئی۔ اور کانگریس کے چند لیڈروں نے ہماری اِمداد بھی کی۔ لیکن صرف اسی بنیاد پر تحریکِ کشمیر کو کانگریس کے بحرِ بیکراں کی ایک موجِ کم آب قرار دینا اسی طرح ہماری تحریک کے اِمتیازی نقشے کو نظر انداز کرنے کی ناانصافی کے برابر ہوگا جس طرح تحریک کے ابتدائی دور کو احراریوں اور احمدیوں کا خوشہ چین قرار دینا۔ اس صورتِ حال کا سیاسی سطح پر بھی عکس نظر آیا۔ چودھری غلام عباس جموں میں اپنے گرد و پیش کا دباؤ برداشت کرنے

کی قوت کھو بیٹھے اور جس نیشنل کانفرنس کی وکالت میں انھوں نے فصاحت کے دریا بہائے تھے وہ کوئی وجہ بتائے بغیر اس سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کے ساتھ اللہ رکھا ساغر وغیرہ بھی مستعفی ہو گئے۔ دو سال تک چودھری صاحب اپنی بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھاتے رہے لیکن آخرکار مسلم کانفرنس کو زندہ کرنے کے سرگرم حامی بن کر سٹیج پر لوٹ آئے۔ اگرچہ اپنی اس ڈھل مل یقینی اور سیاسی تذبذب کو وہ بعد میں وہ جاذبِ نظر انداز میں پیش کرتے رہے۔ ع

دکھائیں راویوں نے طبع کی جولانیاں کیا کیا
ہوئی ہے کیا سے کیا جب انجمن تک بات پہنچی ہے

میں ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی تنگ نظریوں کے درمیان چکی کے دو پاٹوں میں پڑے ہوئے دانۂ گندم کی طرح پیسا جا رہا تھا۔ لیکن یہ آزمائش مجھے اور زیادہ قائل کر دیتی تھی کہ ہمارا بنیادی موقف بالکل طور پر درست ہے نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد اگرچہ ہمارے تعلقات کانگریسی رہنماؤں سے بڑھتے گئے لیکن اُس میں کانگریسی لیڈروں کے خُلق اور اُن کی ملنساری کا بھی بڑا دخل تھا۔ ہم نے نیشنل کانفرنس کو نہ تو کانگریس میں ضم کیا اور نہ اُن کے پاس اپنے ذہن کو گروی رکھا۔ آج چالیس سال بعد جب میں صورتِ حال پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہی کشمکش نظر آتی ہے۔ اُدھر ایک بڑے طوفان کی لہر ہمیں اپنے آغوش میں لے کر ہماری اِنفرادیت اور شناخت کا نام و نشان مٹانے کے لیے مچل رہی ہے۔ اِدھر ہم اپنی شخصیت کا ننھا سا چراغ جلا کر اسے بادِ مخالف کے جھونکوں سے بچا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انھی دنوں کانگریس نے دوسری عالم گیر جنگ چھڑ جانے کے بعد برطانیہ کی جنگی مہم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ہم کانگریس کے پجاری ہوتے تو ہم کو اس فیصلے پر

آمنّا وصدقنا کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے اس نظریہ کو نادُرست سمجھا۔ اُس وقت ساری مُہذّب دُنیا فسطائیت اور آمریت کے بدترین نِظام کے خلاف لڑ رہی تھی۔ رُوس نے اپنے سیاسی حریفوں امریکہ اور برطانیہ کا ساتھ اس لیے دیا کیونکہ وہ نازیت کو سب سے بڑی لعنت سمجھتا تھا اور یہی بات بھی یہی تھی۔ یہ لعنت انگریزوں اور دوسرے تمام سامراجوں کی بدعت سے زیادہ زہرآلود اور خطرناک تھی۔ ہم نے ایک پریس کانفرنس بلا کر نازی جرمنی کو شکست دینے کے لیے اپنی نیک خواہشات اور حقیر خدمات کو پیش کیا۔ اس بات سے کچھ ماتھوں پر ضرور بل پڑے۔ لیکن ہم اُس سے نہ مرعوب ہوئے اور نہ پشیمان۔

ہماری مخالفت میں ہمارے ہندو اور مُسلم اِنتہا پسند مہربان عجیب عجیب پینترے بدلنے لگے۔ ہمارا ماجرا اِس شعر کا سا ہوگیا تھا۔ ؏

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مُسلمان ہوں میں

نیشنل کانفرنس کے کچھ غیر مُسلم اراکین نے ۱۹۴۳ء میں ۱۳ جولائی کو ہمارے یومِ شہیدان منانے پر اعتراض کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ شہید جو ۱۹۳۱ء میں کام آئے تھے مُسلمانوں کی تحریک کی حمایت میں مرے تھے۔ لہٰذا اُن کا دن منانے سے نیشنل کانفرنس کا سیکولر کردار مجروح ہوجائے گا۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ معصوم اور پاک رُوحیں ظُلم کے خلاف اپنی جانیں نچھاور کر چکی تھیں اور اُنھیں فرقہ وارانہ عصبیت کے ہاتھوں سپرد کرنا انتہائی بے انصافی ہوگی۔ میں نے اُنھیں یہ بھی کہا کہ قوموں کے احیاء اور آزادی کی تحریکیں خاص عوامل کی بنیاد پر اوّل اوّل مذہبی لبادہ پہن کر نمودار ہوتی ہیں۔ مذہب چونکہ انسانوں کے جذبات کو فوری طور ارتعاش میں لاتا ہے۔ لہٰذا قومی شعور کی پہلی انگڑائی اس کی کوکھ میں

ہی پنپتی ہے۔ رُوس کی بعض ایشیائی ریاستوں میں حاجی مُراد کی مذہبی تحریک۔ خلافت عثمانیہ کے تحت عبدالوہاب نجدی کی احیاء کی تحریک ہندوستانی مُسلمانوں میں شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی کا جہاد، سوامی دیانند، رام موہن رائے، تلک اور ہندو اور مہاتما گاندھی کی تحریکوں کی بنیاد مذہب پر ہی قائم تھی۔ مگر ان کی کوکھ سے ہی قومیت اور آزادی کی عظیم الشان ہل چل نے جنم لیا۔ یہی عرب مُلکوں میں ہوا۔ جہاں بعد میں اس نے سامراج دُشمنی اور عرب قوم پرستی کا روپ دھارن کر لیا۔ راجہ رام موہن رائے، تلک، گاندھی اور ٹیگور نے ہندو مت کے عقائد سے وابستگی ظاہر کی اور لالہ لاجپت رائے نے تو سوامی دیانند سرسوتی کی سوانح تک لکھی دوسری طرف وہابی تحریک کے سید احمد بریلوی اور سید اسمٰعیل شہید اور دیوبند تحریک کے بانی مولانا قاسم نانوتوی مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمود الحسن، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال نے مسلمانوں کے دینی جذبے لیکن دراصل اس پردے میں قومی شعور کی بالیدگی کا عمل جاری تھا۔ لیکن میرے دوست میری اس دلیل کو نہ مانے۔ اس پر میں نے اُن کے اِعتراضات کو سختی سے مسترد کر دیا اور ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد بھی یہ دن پوری عقیدت و احترام کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔ مُسلم فرقہ پرستوں کی ستم ظریفیاں اس سے کچھ کم نہ تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں رام گڑھ سے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کرنے کے بعد کشمیر آرہا تھا۔ اِس اِجلاس کی صدارت مولانا آزاد مرحوم نے کی تھی۔ اسی دوران لاہور میں مُسلم لیگ کا وہ مشہور اجلاس ہورہا تھا جس میں قرار دادِ پاکستان منظور کی گئی۔ میں اِجلاس کا مشاہدہ کرنے کے لیے گیا۔ اور عام لوگوں میں تقریر سننے کے لیے بیٹھ گیا۔ بدقسمتی سے میرے قد کی لمبائی مجھے ہر جگہ نمایاں کر دیتی ہے۔ سٹیج سے صوبہ سرحد کے سردار اورنگ زیب کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ دوڑ کر مجھے سٹیج پر لینے کے

لے آئے۔ لیکن میں نے انکار کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں سُننے کے لیے آیا ہوں بولنے کے لیے نہیں۔ جب مجھے احساس ہو گا کہ ہماری آپس کی پالیسیوں میں تضاد نہیں تو سٹیج پر بولنے کے لیے بھی آ جاؤں گا۔ کچھ ہی دیر بعد مولانا ظفر علی خاں بڑے ٹھاٹھ سے اجلاس میں آئے۔ مسلم لیگ کے رضا کار ننگی تلواریں سونت کر اُن کے آگے پیچھے، دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُنھیں ایک رزمیہ ہیرو کی طرح سٹیج کی طرف لے جا رہے تھے۔ اُس وقت حیدر آباد کے مشہور رہنما نواب بہادر یار جنگ گرج رہے تھے۔ مرحوم ایک زور دار اور شعلہ بار مُقرر تھے۔ شُستہ اُردو میں بڑی فصیح و بلیغ تقریر کرتے تھے۔ کشمیریوں کی مظلومیت بیان کرتے ہوئے انھوں نے ریاست میں مُکمل ذمہ دار نظامِ حکومت کا مُطالبہ کیا۔ لیکن حیدر آباد کے لیے اس مطالبہ کو اس لیے خارج از بحث قرار دیا کہ حیدر آباد کو مُسلمانوں نے بہ زورِ شمشیر حاصل کیا ہے اور شمشیر کی طاقت سے ہی اس کو اپنے پاس رکھیں گے۔ یہ دلیل اتنی بودی تھی کہ نواب صاحب کی اردوئے مُعلّٰی بھی اس کے بچپنے کو نہ چھپا سکی اور میں دل برداشتہ ہو کر جلسے سے اُٹھ کر آ گیا۔

دوسرے دن دفترِ "انقلاب" میں میری مُلاقات مولانا غلام رسول مہرؔ اور عبد المجید صاحب سالک سے ہوئی۔ دونوں میرے کرم فرما تھے۔ میں نے اُن سے بہادر یار جنگ کی تقریر کا ذکر چھیڑا اور استفسار کیا کہ جو بات کشمیر کے عوام کے لیے جائز ہو سکتی ہے اُسے حیدر آباد کے عوام کے لیے کیوں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا؟ ریاست حیدر آباد میں مطلق العنان حکومت کے حق میں نواب صاحب نے جو دلیل پیش کی ہے وہی دلیل کشمیر کا مہاراجہ یا اُس کے ہم خیال کیوں نہیں دے سکتے؟ جب دلیل کا جواب استدلال سے نہ دیا جا سکے تو غُصّے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مہرؔ صاحب اپنی متین طبیعت کے باوجود جھلّائے اور بولے کہ ہم حیدر آباد کے لیے لاکھوں کشمیر قربان کر سکتے ہیں۔ میں مہرؔ صاحب کا احترام کرتا تھا اس لیے بڑی نرمی سے بولا۔ آپ ضرور کشمیری عوام کو قربان کر لیں لیکن کیا خود کشمیری عوام بھی اس کے لیے تیار ہوں گے؟ مہرؔ صاحب سے جواب تو نہ بن پڑا لیکن دونوں اصحاب کے چہرے پر ناگواری کے آثار ضرور اُبھر آئے اور میں نے قطعِ کلام کرنے کو ہی مُناسب خیال کیا۔

اس عجیب و غریب فضا میں مجھے کام کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی ضعیف الاعتقادی پر افسوس تو ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم پرستی کی راہ اختیار کی جائے۔ مجھے اکثر علامہ اقبالؔ کا یہ شعر تسلی دیتا تھا۔ ع

گُمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مُسلماں کا
شبستاں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رُہبانی

میں اُوپر تذکرہ کر چکا ہوں کہ میں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات میں انھیں اور بادشاہ خان کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ جس کو انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔ اِدھر درمیانی عرصے میں جواہر لال ہمارے مسائل اور مصائب میں گہری دلچسپی لیتے رہے تھے۔ یہ عجیب اتّفاق ہے کہ وہ بھی کشمیر اور اس کے معاملات سے علامہ اقبالؔ کی طرح بہت وابستہ رہتے تھے۔ ایک شیخ تھا اور ایک برہمن لیکن کشمیر کے سنگم پر آ کر یہ اپنی ساری چوکڑیاں بھول جاتے تھے۔ اور اس کی دردمندی میں دُنیا جہان کو فراموش کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب پر تو اُن کے بہت سے حریفوں نے پھبتی کسی کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کہنے والا جب کشمیر جیسے چھوٹے قطعۂ زمین کی بات کرتا ہے تو بس صرف کشمیر کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پنڈت جی پر پٹیل اور دوسرے زعما یہ فقرے کستے تھے کہ یہ کشمیر کو سارے ہندوستان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اور ہندوستان کو ہی کشمیر میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ جب ۱۹۴۶ء میں نہرو کشمیر آنے کے لیے تڑپ رہے تھے اور اُن کو مہاراجہ کی حکومت گرفتار کرنے کی سوچ

رہی تھی تو نہرو نے کہا کہ مجھے ہندوستان کی وزارتِ اعظمیٰ کے بدلے کشمیر کے لیے قیدی بننا زیادہ پسند ہوگا۔ برطانیہ کے ایک سابق وزیرِ اعظم ارل اٹلی تو کہتے تھے کہ کشمیر کے ساتھ نہرو کی جذباتی وابستگی میں کسی حسین عورت کے ساتھ اُس کے کسی عاشق کے والہانہ عشق کی کیفیت جھلکتی ہے اور کشمیر کا جھگڑا ہرگز اس قدر نہ اُلجھتا اگر نہرو اپنی عقلیت پسندی کو ترک کر کے اس کے گیسوؤں میں اپنا دل نہ گنوا بیٹھتے۔ مجھے ذاتی طور پر جواہر لال کی کشمیر سے اس شیفتگی اور وابستگی نے بہت متاثر کیا اور ہماری گہری دوستی کی بنیاد اسی مشترکہ عشق پر پڑی جس کی کیفیت کے متعلق کسی شاعر کا کہنا ہے ؎

آکہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے

فروری ۱۹۳۹ء میں لدھیانہ میں آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اُس میں مجھے کشمیر کے ایک وفد کی قیادت کرنے کی دعوت دی گئی میں اُن دنوں کٹھوعہ جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔ اس لیے شرکت نہ کر سکا۔ مگر میرے بہت سے ساتھی وہاں پہنچ گئے۔ جواہر لال نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"کشمیر میں جو ایجی ٹیشن شیخ محمد عبداللہ کی راہبری میں شروع ہوئی وہ محتاجِ تشریح نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کشمیر کے غیور باشندے کیا چاہتے ہیں۔ اور اُن کی غربت و افلاس کس طرح دور ہو سکتے ہیں۔ اس کا واحد اور صحیح علاج جو اُنھوں نے تجویز کیا ہے وہ ہے ذمہ دار نظامِ حکومت۔ ایسی آواز کو دبانے کے لیے کشمیر کے قائد شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کا بہانہ بنا کر گرفتار کیا گیا ہے۔ سٹی مجسٹریٹ نے چھ چھ ماہ قید اور پچیس پچیس روپے جرمانہ کی سزائیں بھگتنے کا حکم صادر

کیا۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں کہ دنیا میں جو بھی سیاسی لیڈر آزادی حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے اُس کا گھر جیل میں ہوا کرتا ہے۔ مگر سامراج شاہی کی کھوکھلی اور شاطرانہ چال بازیاں اب زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی ہیں۔ اگر شیخ محمد عبداللہ کو قید و بند میں رکھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے اُن حالات پر پردہ پڑ سکتا ہے جو کشمیر میں پیش آ رہے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ حاکموں نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کی بناء پر شیخ محمد عبداللہ کے ایامِ قید میں اضافہ حق بجانب ثابت ہو۔"

یہ دوسری بات ہے کہ چودہ سال بعد خود یہ الفاظ کہنے والے رہنما کو بھی طاقت کے نشے میں اپنی بات یاد نہ رہی۔ اُس نے میرے بارے میں مہاراجہ سے زیادہ جابرانہ اور سامراجی طرزِ عمل اختیار کیا۔ ؎

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

▲▲▲

(٢٦)

باتیں ہماریاں

مارچ ۱۹۳۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس تریپورہ میں منعقد ہوا جس میں صدرِ کانگریس کی دعوت پر میں نے بھی شرکت کی۔ میرے ساتھ بخشی غلام محمد، پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت کیشپ بندھو اور مولانا محمد سعید مسعودی بھی وہاں آئے۔ اجلاس میں ہماری شرکت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس زہر کا ازالہ ہو سکے جو ہمارے مخالفین نے یہ کہہ کر پھیلایا تھا کہ کشمیر کی تحریک مسلم فرقہ پرستوں کی تحریک ہے۔ ہمیں جواہر لال کے علاوہ باقی سرکردہ کانگریسی رہنماؤں سے بھی ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ہم نے ریاستوں کے لیڈروں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ ریاستِ بھوپال کے رہنما جے نرائن مالویہ نے ہماری نیشنل ڈیمانڈ کی تعریف میں کہا کہ ہم نے آپ کے قومی مطالبہ کو بغیر کسی ترمیم کے بھوپالی عوام کا مطالبہ بنا کر نواب بھوپال کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کشمیر کا لفظ لکھا ہوا تھا وہاں اسے بھوپال کے لفظ سے تبدیل کر دیا۔ مجھے تریپورہ کانگریس کے اجلاس سے مخاطب ہونے کی بھی دعوت بحیثیت ایک معزز مہمان کے دی گئی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

"ریاستی لوگوں کی شکایات اور مصائب خالص اقتصادی اور سیاسی ہیں۔ مگر والیانِ ریاست اور اُن کے کارندے راستہ روکنے کی خاطر ہماری کوشش پر مذہب کا رنگ چڑھاتے ہیں۔ ہم ہندوستانی عوام سے مالی جانی یا اقتصادی امداد نہیں مانگتے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ غلط پروپگنڈے پر اعتبار نہ کریں اور ریاستوں میں قومی تحریکوں کو اس قسم کے غلط رنگ میں نہ دیکھیں۔"

بہرحال پنڈت جواہر لال نہرو بادشاہ خان کے ہمراہ کوہالہ کے راستے سے ۳۰ مئی ۱۹۳۹ء کو کشمیر میں وارد ہوگئے۔ کوہالہ سے ہی نیشنل کانفرنس کی طرف سے اُن کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ جب وہ سرینگر پہنچے تو انھیں چھتہ بل ویر (VEIR) سے ایک شاندار دریائی جلوس میں امیرا کدل تک پہنچایا گیا۔ سینکڑوں کشتیاں آراستہ پیراستہ پرندے[1] کے پیچھے پیچھے جاری تھیں۔ دریا میں محرابیں اور ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ اور جہلم کے دونوں کناروں پر ہزاروں مرد عورتیں اُن کا استقبال کر رہے تھے۔ سیٹھ کشوری لال نے نیشنل کانفرنس کی طرف سے میزبانی کے فرائض انجام دیے اور وہ اُنہی کے بنگلے میں فروکش ہو گئے۔ پنڈت جی کو کوہ پیمائی کا بڑا چسکا اور شوق تھا۔ اس لیے ہم اُن کی پارٹی کو کچھ دنوں کے لیے پہلگام لے گئے۔ مٹن میں کشمیری پنڈت خواتین اپنے رواجی لباس میں موجود تھیں۔ وہ لمبے پیرہن اور سر پر "ترنگ قصابہ" پہنے ہوئے تھیں۔ پنڈت جی اس نظارے سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ فوراً اُن کے پاس چلے گئے۔ شاید اُن کو اپنے آبا کے رہن سہن اور پہناوے کی جھلک نظر آگئی تھی۔ پہلگام سے ہم "کولہائی" بھی گئے۔ یہ راستہ ہم نے گھوڑوں پر طے کیا اور ہمالیہ پربت کے قرب شکن حسن سے دل اور نظر کا دامن بھر لیا۔ اس دورے میں مجھے بڑے دنوں کے

[1] بڑی اور سجی سجائی کشتی۔

بعد گھوڑ سواری کا اپنا شوق پورا ہوتا دکھائی دیا۔ میں بچپن سے ہی اگر کسی کھیل میں لُطف لیتا رہا ہوں تو وہ عُمدہ گھوڑے کی سواری ہے۔ برق رفتار رخش پر یہ دنیا کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میں اپنے ہم سِنوں کے ساتھ گھوڑے دوڑانے کا مقابلہ کیا کرتا تھا۔ اِس دورے میں مجھے پنڈت جی کی ذات میں ایک اچھا شاہ سوار مِلا۔ اور کبھی کبھی ہم ترنگ میں آکر گھوڑوں کی طنابیں ڈھیلی چھوڑ دیتے تھے۔ بعد میں واقعات نے جو کروٹ لی اُن میں میرا یہ شوق بس ایک حسرت بن کر رہ گیا یعنی بقولِ اقبال ؎

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق؟

ساتھ میرے رہ گئی ایک میری آرزو

پنڈت جی جہاں جہاں بھی گئے اُن کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور اُنھوں نے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ اُن کے اِس دورہ سے نیشنل کانفرنس کا نام سارے ملک بلکہ دُنیا بھر تک پہنچ گیا۔ اور کشمیری تحریک کے ڈنکے بجنے لگے۔ اِسی دوران دوسری عالم گیر جنگ کا اعلان ہوا اور پنڈت جی کو جون کے وسط میں بادلِ ناخواستہ جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ لیکن جواہر لال کے دورۂ کشمیر کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ریاست کے اندر اور باہر غیر مُسلموں نے تحریک کے نئے قومی لبادے کی معنویت سمجھ لی۔ لیکن ہندوستان کے قوم پرست مُسلمانوں کو چھوڑ کر باقی مُسلم طبقوں میں اس سے غلط فہمی بھی پیدا ہو گئی۔ پنجاب کے مُسلم پریس نے تو اِس کی مخالفت میں لمبے چوڑے مضامین شائع کیے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت مُحمّد علی جناح کی مستعد اور چابکدست قیادت کی وجہ سے مُسلم لیگ کو ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ اور اِس کا ستارہ عروج پر تھا۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جہاں

ہندوستان بھر میں صوبہ سرحد کے استثنےٰ کے سوا مُسلمان کانگریس سے دُور ہو رہے تھے وہاں کشمیر میں ہمارے فاصلے کم ہو رہے تھے۔ ہم یہاں اکثریت میں تھے۔ اس لیے ہمارا نظریہ ایک اکثریت کا پُر اعتماد نظریہ تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے مسلمانوں کا نظریہ ایک اقلیت کا تشویش آمیز نظریہ تھا۔ وہ ہندو اکثریت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے طالب تھے۔ ہم یہاں بہ حیثیت اکثریتی طبقے کے غیر مُسلموں کو اُن کے جائز حقوق کی حفاظت کا یقین دلا رہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے جاتے جاتے ایک بڑا اہم بیان دیا۔ یہ بیان کشمیر سے ان کی جذباتی وابستگی کا گواہ بھی ہے اور کشمیر کے اُس وقت کے حالات پر ایک صاحب نظر کا تبصرہ بھی۔ اُنھوں نے کہا:

"میں کشمیر ایک سیاح یا اجنبی کی حیثیت سے نہیں آیا بلکہ اس سرزمین کے بیٹے کی حیثیت سے آیا اور اسی حیثیت سے کشمیر کے مردوں اور خواتین نے میرا پُرتپاک اور مُحبت بھرا خیر مقدم کیا۔۔۔۔۔ کشمیر مجھے محبوب ہے۔ کیونکہ اِس کے پہاڑوں اور وادیوں کا خون میری رگوں میں جوش مار رہا ہے۔ اور جو شخص بھی اِس مسحور کُن زمین سے تعلق رکھتا ہے اس کو حق ہے کہ وہ اس تعلق پر جتنا بھی چاہے فخر کرے۔ یہ چند دن جو میں نے کشمیر میں بسر کیے ان میں میری آنکھوں نے کشمیر کی اس محبوبیت کو دیکھا جس سے انسان کے احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اور اِس ہوا میں سانس لینے سے خون میں جوش اور شباب کے ولولے زندہ ہو جاتے ہیں۔ میں نے شہر کے تعلیم یافتہ دانشوروں سے لے کر گلیشروں کے آس پاس پہاڑوں کی چوٹیوں پر ریوڑ چرانے والے چرواہوں تک ذاتی رسائی پیدا کی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کے عوام میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں حکومت میں جمود اور

بے حسی طاری ہے وہاں لوگ جوش اور حرکت میں ہیں .... میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا ممنون ہوں کہ بہ دورانِ قیام مجھے جس کا مہمان بنے رہنے کا شرف ملا۔ شیخ صاحب میں جمہور کی رہنمائی کرنے اور کامل تدبّر کے ساتھ عوام کے نصب العین کی طرف جانے کے تمام اوصاف جمع ہیں۔ شیخ صاحب نے عوامی تحریک کو باوجودِ مخالفت اور دقتوں کے فرقہ وارانہ راستے سے نکال کر قوم پرستی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ کشمیر کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کو شیخ محمد عبداللہ جیسا بہادر، دوراندیش اور مدبّر رہنما نصیب ہوا ہے۔ کشمیری پنڈتوں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے تحفّظ کے لیے تنگ اور محدود ذرائع کا سہارا لینا چھوڑ دیں اور ان بڑی تحریکات میں حصہ لیں جو پرانی دنیا کو تبدیل کرنے کا موجب بن رہی ہیں۔"

نیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء میں، ۲۷ سے ۲۹ ستمبر تک بارہ مولہ میں ہوا۔ اس کی صدارت سردار بدھ سنگھ نے کی۔ بدھ سنگھ کو بعض لوگ تیاگ مورتی اور مہاتما کے القاب سے بھی پکارتے تھے۔ تھے بھی وہ بڑے صوفی منش، شریف الطبع، خدا ترس اور غریب نواز شخص۔ وہ خاصے پڑھے لکھے تھے اور ملازمت میں وزیرِ وزارت کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ جو ان دنوں ایک منصبِ جلیل تصوّر ہوتا تھا۔ لیکن شخصی حکومت کے حکام سے وہ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ غریب عوام کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا ان کا دل اُس سے اُچاٹ ہو گیا اور انھوں نے ملازمت کو تیاگ دے دیا۔ بعد میں وہ کچھ عرصہ جنگل میں تپ تپسیا کرتے رہے۔ باہر آئے تو ہماری تحریک شروع ہو چکی تھی۔ سردار بدھ سنگھ کے دل میں فرقہ وارانہ دوئی ذرہ برابر نہ تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے وقت سے ہی ہماری تحریک کی حمایت میں تقریریں کرنے لگے تھے۔ میں تو کبھی کبھی خاصا

سرشار ہوتا تھا۔ جب وہ عوامی جلسوں میں برسرِ عام کہتے تھے کہ "شیخ عبداللہ کا وجود میری دعاؤں کا ثمر ہے۔ میں نے خدا سے مانگا تھا کہ ظلم کے خاتمے کے لیے کوئی بہادر رہنما ہمارے اندر پیدا ہو۔ خدا نے میری سن لی اور شیخ صاحب کو ہمارے اندر بھیج دیا۔" سردار بدھ سنگھ نے کئی مرتبہ قید و بند کی آزمائشیں سہیں۔ وہ ناٹے قد کے آدمی تھے مگر اُن کے چہرے پر سفید اور دراز ریش بڑی نورانی معلوم ہوتی تھی۔ غیر مسلم اُن کی بات سنجیدگی سے نہ سنتے تھے بلکہ الٹا اُن کو مذاق کا ہدف بناتے۔ ۱۹۴۸ء میں، میں نے انھیں اپنی پہلی وزارت میں شامل کیا۔ میں تو انھیں ریاست کا پہلا صدرِ ریاست بنانا چاہتا تھا لیکن مرکز اور ریاست کے بہت سے دوستوں کو یہ تجویز پسند نہیں آئی بعد میں وہ پارلیمنٹ کے ممبر بنے اور ۱۹۵۷ء میں بہت پیرانہ سالی میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ واہگورو انھیں سورگ میں جگہ دے۔

۱۹۴۱ء میں نیشنل کانفرنس کا ایک اور سالانہ اجلاس سرینگر میں منعقد ہوا اور اس کے صدر بھی سردار بدھ سنگھ ہی چنے گئے۔ اس میں خان عبدالغفار خاں نے بھی خاص دعوت پر شمولیت کی۔ اس اجلاس میں سیاسی قراردادیں بھی بہت سی پاس ہوئیں۔ لیکن مجھے اس کا وہ منظر خاص طور پر یاد ہے جب اجلاس کے اختتام پر ایک عظیم کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں برصغیر کے کچھ عظیم اردو شاعروں کا کلام سننے کا موقع ملا۔ مشاعرے کی صدارت مشہور سخن شناس جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے کی۔ اسی مشاعرے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی مشہور نظم

"شیر سے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا"

سنائی۔ حفیظ کی مجھ سے لاہور میں بہت پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ بعد میں کشمیر آتے

رہے اور اُن کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انھیں کشمیریوں کی حالتِ زار سے شاعرانہ دلبستگی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایک بڑا پُرسوز گلا بھی پایا ہے۔ وہ جب نوجوانی کے ایام میں اپنا کلام سُناتے تو محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا۔ ایک تو برجستہ کلام تھا۔ کشمیریوں کی صحیح ترجمانی۔ دوسرے اُن کا طرزِ ادا۔ ایک سماں بندھ گیا۔ حقیقتاً بعد میں بھی کشمیر کرتے رہے۔ "کشمیر چھوڑ دو" میں انھوں نے "خون کے چراغ" کے نام سے ایک نظم لکھی جو کافی مقبول ہوئی اور جس نے بیرونِ کشمیر میں بھی مہاراجا کے مظالم کا پردہ چاک کیا ؎

سُرخ پھولوں سے زمینِ کشمیر کی ہے سُرخ رو — لالہ بن کے پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو
معرکہ اس خاک پہ گذرا ہے دار و گیر کا — لالہ زار اس کو نہ سمجھو کھیت ہے شمشیر کا
حملہ آور ہیں مہاراجے کی فوجیں چار سُو — شعلہ زن ہیں آگ اور لوہے کی فوجیں چار سُو
فطرتِ انسان کو ہے طوقِ غلامی ناپسند — نعرے آزادی کے لے کر اُٹھے ہیں سربلند
سرفروشان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے — آگے اور آگے بڑھو نامِ خدا لیتے ہوئے

میں جب ۱۹۶۴ء میں پاکستان گیا تو اپنے پُرانے دوست سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بوڑھے تو ہو چکے تھے لیکن اُن کا جوشِ وہی جوان تھا۔ کشمیر کی انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعے جو خدمت کی ہے اس کو ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اس مشاعرے میں روش صدیقی مرحوم نے بھی اپنا پُر اثر کلام سنایا۔

شاعروں کی بات چلی ہے تو مجھے فیض احمد فیض یاد آرہے ہیں۔ فیض محمد دین تاثیر کے دوست تھے۔ اور جب وہ سری نگر میں امر سنگھ کالج کے پرنسپل تھے تو اُن کے پاس آتے رہتے تھے۔ ہم سے بھی اُنہی دنوں اُن کی ملاقات ہوئی۔ فیض ایک بہت اچھے مشہور شاعر تو ہیں ہی لیکن ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ اُن کا جھکاؤ اشتراکی نظریات کی طرف تھا لیکن وہ تحریکِ کشمیر کے ہمدردوں میں سے تھے۔ اُن کی شخصیت میں چاندنی کی طرح ایک ملائم مگر روشن خاصیت موجود ہے۔ اُن کی شادی محمد دین تاثیر صاحب کی سالی ایلس (ELIS) جارج سے سرینگر میں ہوئی۔ اور میں نے ہی اُن کا نکاح پڑھا۔ فیض سے میری ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مشترکہ دوستوں کے ذریعہ برابر علیک سلیک کا سلسلہ جاری ہے بلکہ انھوں نے کچھ عرصہ قبل ایک نظم کا خوبصورت تحفہ "شیخ محمد عبداللہ کے نام" بھجوادیا تھا؎۱۔ اور مجھے اس کو دیکھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی تھی۔

قبلۂ ہمداں جوش ملیح آبادی بھی میرے پُرانے دوستوں میں سے تھے۔ اُن کا ٹھاٹھ، اُن کا طنطنہ اور اُن کا شاعرانہ جلال انھیں خاصے کی شخصیت بنا دیتا ہے۔ جواہر لال اور مولانا ابوالکلام اُن کے قدر دانوں میں سے تھے۔ وہ مئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں۔ چونکہ میں کبھی اس شے کی طرف رغبت پیدا نہیں کر سکا اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انھوں نے میرے بارے میں نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی چھیڑ خانی کا یہ انداز موجود ہے۔ ؎

رند ہوں رند رہ نہیں سکتی — شیخ صاحب سے میری رسم و راہ
اُن کی محفل میں ہے چراغِ ثواب — میری محفل میں آفتابِ گناہ
اُن کی لوحِ جبیں پہ داغِ سجود — میرے آئینے میں تجلّیِ ماہ
ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا — جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ
جس کی ہر ہر روش ہے حسبِ مراد — جس کا ہر ہر اصول ہے دل خواہ
تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس — تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ
ہے جو اس تیرہ دورِ باطل میں — حق نگہ، حق شناس، حق آگاہ

؎۱ یہ وہی نظم ہے جس کا مشہور مصرعہ ہے ؎ میرے وطن تیرے زخموں کے لالہ زار کی خیر (م۔ ی۔ ش)

چارہ گر رہنما، غریب نواز — شیر کشمیر شیخ عبداللہ
صرف اس شیخ سے محبت ہے — ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ

بعد میں جوش صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پاکستان چلے گئے۔ ان کے جانے سے ان کے دوستوں کو تو صدمہ ہوا ہی لیکن خود جوش بھی مرے میں ضرر رہے۔ اس کو کہتے ہیں۔ ع

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

شعرا میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تحریک کے ابتدائی ایام میں ہماری آواز کو سہارا دیا بلکہ وہ ان اجلاسوں میں شریک ہوئے جو لاہور کی کشمیر کمیٹی نے ہماری حمایت میں بلائے تھے۔ ایک اور حسرت جن کا کشمیر اور ہم سے تعلق رہا چراغ حسن حسرت المعروف سند باد جہازی تھے۔ وہ پونچھ کے رہنے والے تھے۔ لیکن بلا کا قلم پایا تھا۔ جب تک جیے ہماری تحریک کو اپنے سرچشمۂ قلم سے سینچتے رہے۔ خواجہ احمد عباس ترقی پسندوں اور نہرو خاندان کے قریب رہے ہیں۔ وہ کئی بار کشمیر آئے۔ اور کشمیریوں کی جدوجہد پر "زعفران کے پھول" اور دوسرے افسانے لکھے۔ راجندر سنگھ بیدی کو میں نے ۴۷ء کے بعد جموں کے ریڈیو سٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ یہ شریف اور نہایت ہی لائق ادیب اپنی تحریر سے ہمارے نقطۂ نظر کی ترویج میں بہت کامیاب رہا۔ کرشن چندر کا تعلق تو کشمیر کی سرزمین سے براہِ راست تھا۔ انھوں نے بھی کشمیریوں کی جدوجہد پر کئی افسانے لکھے جب ۴۸ء کے بعد تلنگانہ تحریک کے سلسلے میں ان کی تلاش ہوئی تو میں نے انھیں گلمرگ میں اپنا مہمان بنا کر بٹھایا جہاں انھوں نے کشمیر سے متعلق اپنا ناول "شکست" لکھا جس کے کچھ باب انھوں نے مجھے انھی دنوں سنائے اور مجھے کافی پسند آئے۔ علی سردار جعفری بھی ہمارے دوست

تھے۔ ۱۹۵۳ء کے نرغے کے بعد انھوں نے کئی مہینے کشمیر میں گزارے اور اپنے دوستوں صادق صاحب اور ڈی۔ پی۔ صاحب کو ہماری سرکوبی کے طریقے اشعار کے نسخوں میں سمجھاتے رہے لیکن یہ تو اس راستے کے لازمی پڑاؤ ہیں۔ اس کے برعکس ایک اور اشتراکی ادیب مخدوم محی الدین نے ۵۳ء کے بعد ہمارے خلاف کسی کارروائی میں حصہ نہ لیا حالانکہ وہ ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ تھے۔ اور تلنگانہ کی تحریک میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مخدوم صاحب ہمارے پرانے دوست تھے جب کشمیر آتے ہم سے ضرور ملتے اور ہماری تحریک کے اصولوں اور سرگرمیوں کی بڑی تعریفیں کرتے۔

ادیبوں کی بات چلی ہے تو ان اولین محسنوں کی یاد تازہ کرنا ضروری ہے جن کے قلم کا احسان کشمیریوں پر ہمیشہ رہے گا۔ علامہ اقبال کا ذکر آ ہی چکا ہے انھوں نے اس وقت کشمیر اور کشمیریوں کی سربلندی کے خواب دیکھے جب ہم میں سے اکثر ابھی ماں کی کوکھ میں لوریاں سن رہے تھے۔ جب کشمیر پر ظلمت اور ظلم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں تو وہ فرما رہے تھے۔ ع

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

یا ع

معمور ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس دیس میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

میں ان سے پہلی بار ۱۹۲۳ء میں ملا۔ جب میں لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ ان کا دل کشمیر کے لیے تڑپتا تھا۔ اور وہ اپنے سپرو ہونے پر ناز کرتے تھے۔ جب وہ کشمیر سے اپنی نسبت کا ذکر کرتے تھے تو مسرت سے ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور ان کا چہرہ

سرنگوں ہو جاتا تھا۔ میں نے تصوّر میں خاکہ بنایا تھا کہ اتنا بڑا آدمی بڑے ٹھاٹھ سے رہتا ہوگا لیکن جب اُن سے ملا تو پتہ چلا کہ وہ واقعی فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے اس مصرع کی تفسیر ہیں ؎

میرا شعار امیری نہیں فقیری ہے

وہ چارپائی پر ایک سفید چادر پر بیٹھے ہوتے اور کمرے میں ایک دو اور کرسیاں لگی ہوتیں۔ ہم آتے تو اپنے خاص خادم علی بخش کو کشمیری نمکین چائے لانے کے لیے کہتے۔ ہم کو غریب الوطنی میں اپنی اس مرغوب چائے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اور ہم اُن کے پاس چائے پینے کے لیے اکثر جایا کرتے تھے۔ اُن کا جسم لاہور میں تھا اور روح کشمیر میں۔ تحریک کے اُتار چڑھاؤ میں ہم کو جو دِقتیں پیش آتی تھیں اُن کے سلسلے میں وہ ہمیں بڑے دانشمندانہ مشورے دیا کرتے تھے۔ سوچا تھا کہ اُنھیں کشمیر لا کر اُن کی خوب خدمت کریں لیکن قُدرت کو کچھ اور منظور تھا اور مجھے اس کا ساری عمر ملال رہا۔ اگر بعد میں میرے گلے سے اقبالؔ کا کلام کشمیریوں کے لیے صورِ اسرافیل بن کر گونجا تو اسے میں اُن کی فریاد کی ہی تاثیر سمجھتا ہوں جس کے متعلق وہ خود کہہ چکے تھے۔ ؎

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ!

میں اسی لیے اپنے حقیر وجود کو اُن کی قلندرانہ آہِ سحرگاہی کا ثمر سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں اُن کے آنسوؤں کے تخم اور آہوں کی تمازت سے ہی وہ شرارہ پھوٹا جو میری حقیر ذات کی صورت میں تحریک کا علامتی چراغ بن گیا۔ علامہ اقبال سے اُن کی وفات سے چند ہی ماہ قبل میری ملاقات ہوئی۔ اُن دنوں فضا میں مسلم کانفرنس کی سرحدیں وسیع کر کے اس میں دیگر برادرانِ وطن کو لانے کی بات بھی چل رہی تھی۔

علامہ اقبالؔ نے اس تجویز کو نہ صرف پسند کیا بلکہ بڑی تائید سے فرمایا کہ کشمیریوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ اپنی تحریک کو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر چلائیں۔ مجھے اس امر پر فخر کا احساس ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کشمیر میں میری عاجزانہ کوششوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ لوگ اُن کے پاس میری شکایت کرنے گئے تو علامہ نے اُنھیں اپنے خاص انداز میں ڈانٹا اور کہا کہ عبداللہ نے کشمیری کے دل سے ظالم حکومت کا خوف ختم کر دیا ہے۔ کشمیریوں کو ایسا ہی نڈر شخص آزادی کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔ مجھے ساری عمر قلق رہا کہ علامہ نے میری درخواست پر کشمیر آنا مان لیا تھا۔ لیکن پہلے تو ڈوگرہ حکومت نے ان کی راہ میں مشکلات پیدا کیں اور بعد میں موت کا بے رحم ہاتھ ان کی راہ میں ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا۔ ہم نے اُن کی یاد میں دو سال قبل کشمیر یونیورسٹی میں دنیا کی پہلی مسندِ اقبال قائم کی ہے۔ جس کے اولین ڈائریکٹر مشہور اقبالؔ شناس پروفیسر آل احمد سرورؔ مقرر ہوئے ہیں۔ ہماری دیکھا دیکھی اب پاکستان میں بھی اقبال چیئر قائم کی گئی ہے۔ جس کے ڈائریکٹر علامہ کے صاحب زادے جاوید اقبال بنائے گئے ہیں۔ ہماری اقبال چیئر اب اقبال انسٹی ٹیوٹ بن گئی ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری کا نام بھی ہم نے اقبال لائبریری رکھا ہے۔ جس میں مشہور مصوّر ایم۔ ایف۔ حسین کی بنائی ہوئی اقبال کی ایک نادر تصویر بھی آویزاں ہے۔ نیز ہم نے سری نگر میں اقبال کے نام سے ایک خوبصورت باغ کا بھی انتساب کیا ہے۔ یہ پہلے حضوری باغ کہلاتا تھا اور اب اقبال پارک۔

کشمیر کی تحریکِ حرّیت مولانا غلام رسول مہرؔ اور مولانا عبدالمجید سالکؔ کے احسان کو بھی کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان حضرات نے ۱۹۲۶ء میں لاہور سے روزنامہ "انقلاب" نکالا تھا۔ جب ۱۹۳۱ء میں ہماری تحریک شروع ہوئی تو اس اخبار کے صفحات

کشمیر کے اخبار و کوائف کے لیے وقف رہنے لگے۔ مولانا مہر ایک سنجیدہ عالم تھے اور اُن کے اداریے علم و فضل اور متانت کی دلاویز دستاویزیں ہوتے تھے۔ مولانا سالک کو قدرت نے زورِ قلم اور ظرافت کا تحفہ عطا کیا تھا۔ وہ "افکار و حوادث" کے مزاحیہ کالم میں ہمارے مخالفین کے بخیے اُدھیڑ دیتے تھے۔ ان کے شذرات میں بھی بڑی تیکھی کاٹ ہوا کرتی تھی۔ جب "انقلاب" کی انقلاب آفرینیاں بڑھ گئیں تو سرکار انگلشیہ نے پہلے تو اُن سے حکومتِ کشمیر کی آڑ میں ایک بار پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی لیکن جب اس سے بھی مہر و سالک کے حوصلے پست نہ ہوئے تو "انقلاب" کا داخلہ کشمیر میں بند کر دیا گیا۔ اس پر ادارۂ "انقلاب" نے "کشمیری مسلمان" "مظلوم کشمیر" "مکتوب کشمیر" اور "مظلوم" کے نام سے اخبار نکالے اور حکومت کشمیر اُن پر پابندی عائد کرتی گئی۔ لیکن یہ اخبار کسی نہ کسی طرح ہم تک پہنچتے رہے۔ اخبار "مکتوب کشمیر" تو ایک پوسٹر کی شکل کا ہوتا تھا اور ہم اسے چسپاں بھی کر دیتے تھے۔ بعد میں ہمیں اور بھی نشر و اشاعت کے ذرائع ملے لیکن ہم مہر و سالک کی ابتدائی ہمدردی اور امداد کو بھلا نہیں سکتے۔ یہ بزرگ آپس میں بے حد اخوت رکھتے تھے اور اسی لیے کسی شاعر نے اُن کے متعلق کہا تھا ع

مہر و سالک دو ایڈیٹر، انقلاب اخبار ایک

شاعروں کا یہ ذکر آغا عبدالکریم شورش کاشمیری کے بیان کے بغیر نامکمل رہے گا۔ شورش کاشمیری کا ہماری سرزمین سے تعلق تھا اور وہ اس کے ساتھ ایک گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اُن کا آمیزہ اجتماعِ ضدین تھا۔ وہ بیک وقت پاکستان اور ابوالکلام کے عاشق تھے۔ وہ ایک شعلہ بار خطیب بھی تھے اور "چٹان" جیسے اخبار کے تیز و ترش مدیر بھی۔ کشمیر کے معاملات میں اُنھوں نے بار بار ڈوگرہ شاہی کو للکارا۔ مثلاً "کوچ کشمیر"

کے وقت اُن کی مشہور نظم ع

اے ہری سنگھ نوا ہائے شرر بار سے ڈر
شیرِ کشمیر کے آوازۂ پیکار سے ڈر

کافی مقبول ہوئی۔ وہ کشمیر کے حالات و کوائف کے ساتھ آخر تک دلچسپی لیتے رہے۔

سید حبیب "سیاست" کے مدیر تھے۔ اُنھوں نے اپنے اخبار میں نہ صرف ہماری تحریک کو صحیح انداز میں پیش کیا بلکہ کشمیر آکر اس تحریک کی حدی خوانی بھی کی اور ہمارے ساتھ جلسوں میں تقاریر بھی کرتے رہے۔ مولوی محمد الدین فوق کا تو میں ذکر کر چکا ہوں۔ وہ بھی کشمیر کے مسائل اور معاملات کو ابھارنے میں پیش پیش رہے۔ اور کشمیر سے متعلق علامہ اقبال کے شیرِ خاص کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ تحریک کشمیر سے اُردو کے جن شاعروں کا گہرا تعلق رہا اُن میں اخبار "زمیندار" لاہور کے آتش نگار مدیر مولانا ظفر علی خان کا نام بھی شامل ہے۔ مولانا ایک عجیب سرد و گرم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ابتدا میں تو ہمارے بڑے حامی تھے۔ لیکن قادیانی معاملے پر وہ ہم سے برگشتہ ہو گئے۔ راجا ہری کرشن کول نے پنجاب میں اکالیوں کی تحریک کو دبانے کے لیے اُنھیں وہاں کے دوسرے شہ زوروں کی طرح اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب راجہ صاحب کشمیر میں وزیرِ اعظم ہو گئے تو ظفر علی خاں صاحب بھی یہاں آ گئے اور ایک ہاؤس بوٹ میں سرکاری مہمان کے طور پر براجمان رہے۔ جن کا نمک کھاتے تھے رگِ حمیت اُسی طرف پھڑکتی تھی چنانچہ وہ خانقاہ معلیٰ میں ہماری تقریر سننے کے لیے گئے تو وہاں اُن کے منہ سے کوئی غیر محتاط فقرہ نکل گیا۔ اس پر خواجہ غلام محی الدین قرہ کے چچیرے والد حاجی احمد اللہ نے اُنھیں سخت ٹوکا اور وہ بڑی بیزاری کے عالم میں اپنی کمیں گاہ کو لوٹ آئے۔

پیرزادہ غلام احمد مہجور سے تحریکِ حریت کے وسط میں تعارف ہوا جب اُن

کے قومی ترانے "وہ لوہا باغبانو نو بہار کی شان پیدا کر" میں انھوں نے ہماری تحریک اور کشمیریوں کے ابھرتے ہوئے قومی احساس کی شاندار ترجمانی کی۔ میں نے یہ نظم اکثر اجتماعات میں اپنے ترنم سے پڑھی ہے اور ان پڑھ دیہاتیوں اور مزدوروں کا دل گرمایا ہے۔ یہ شاید کشمیری زبان کی واحد نظم ہے جسے میں نے اس انداز سے گایا اور جو اسقدر مقبول ہو گئی۔ مہجور صاحب تاریخ کشمیر کے بھی نکتہ شناس تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں آخری عمر میں ایک تاریخ کشمیر لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ میں انھیں اس تاریخ کا مواد فراہم کرنے کے لیے دہلی اپنے ساتھ لے گیا مجھے یاد ہے کہ ہم موٹر کار کے ذریعہ سفر کر رہے تھے۔ جب ہم پانی پت کے قریب پہنچے تو مہجور صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس مشہور میدان کو دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ہندوستان کی تقدیر بدلنے والی کئی لڑائیاں لڑی گئیں۔ جن میں شہاب الدین محمود غوری اور پرتھوی راج چوہان، ہیموں بقال اور اکبر اعظم اور احمد شاہ ابدالی اور مرہٹہ پیشواؤں کی تین لڑائیاں مشہور زمانہ ہیں۔ وہ میدان تو اب کھیتوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن جب مہجور صاحب نے اس کو دیکھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور کچھ وقت کے بعد کہنے لگے کہ شاید برِصغیر کی تقدیر کا ایک حتمی فیصلہ بھی اسی میدان میں طے کیا جائے۔ میں نے مسکرا کر بات ختم کر دی۔ بعد میں مہجور صاحب کے لیے میری حکومت نے تاحیات وظیفہ بھی مقرر کر لیا۔ جب ان کے بیمار ہونے کی خبریں آنے لگیں تو میں نے ڈاکٹر علی محمد جان کو ان کا معائنہ کرنے کے لیے ان کے آبائی گاؤں بھیجا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے مولا سے جا ملے اور ان کی تاریخ دھری کی دھری رہ گئی۔ البتہ ان کا وظیفہ ان کی بیوہ کے نام پر کر دیا گیا۔ مہجور صاحب کو ان کے قومی رول کے لیے سرکاری اعزاز سے دفن کرنے کی بھی میں نے منظوری دے دی۔ ▲▲▲

(۲۷)

اوقافِ اسلامیہ

تحریک حریت کی ابتداء میں ہی مسلمانوں نے اپنے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس بات کی پُرزور مانگ کی تھی کہ وہ تمام مساجد، معابد، جائدادیں اور زمینیں ان کو واگذار کر دی جائیں جن پر اہل اسلام کا حق تھا لیکن جو گذشتہ سو سال میں ضبط کر لی گئیں ہیں اور جن پر حکومت نے ناجائز قبضہ جما یا ہے۔ اس دراز دستی کی ابتداء ۱۸۱۹ء میں ہوئی جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کے آخری افغان گورنر جبّار خان کو شوپیان کے قریب شکست دے کر کشمیر پر قبضہ جما لیا پہلے پہل تو سرینگر کی جامع مسجد اور خانقاہِ معلیٰ پر بھی قبضہ کیا گیا۔ اور ایک وقت تجویز یہ تھی کہ خانقاہِ معلیٰ کی عمارت منہدم کر دی جائے۔ ان دو معابد کے علاوہ متعدد مساجد اور زیارتوں کو مقفل کیا گیا۔ ہمارے زمانے میں پتھر مسجد کو ایک گودام اور مسجد دارہ شکوہ کو شورہ خانے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ پتھر مسجد جس کو جہانگیر کی محبوبہ اور لائق ملکہ نورجہاں نے تعمیر کیا تھا۔ سکھ عہد میں ایک اصطبل کے طور پر استعمال کی جاتی رہی۔ بعد میں ڈوگروں نے اسے شالی (دھان) کا گودام

بنادیا۔ مسجد دارا شکوہ شاہ جہاں کے چہیتے دانشور بیٹے نے اپنے مرشد مُلّا آخون شاہ کے لیے تعمیر کی تھی۔ مگر اب یہ بارود خانہ بنادی گئی تھی۔ اسی طرح سرینگر اس کے مضافات اور جموں میں بھی بہت سے مذہبی مقامات اور جائدادیں حکومت کے قبضۂ مخالفانہ میں تھیں۔ تحریکِ حُریت کی ابتداء میں ہی ان مقامات کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ جب مسلم کانفرنس بنی تو فیصلہ ہوا کہ ان جائدادوں کے انتظام و انصرام کے لیے ایک اوقاف کمیٹی کا وجود عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے اوقافِ اسلامیہ کی تشکیل کی گئی۔ مجھے اُس کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ میں سیاسی تحریک کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ اس اہم ملّی جائداد کی دیکھ ریکھ کی کی طرف بھی توجہ دینے لگا۔ گلینسی کمیشن کے بعد ہمیں مسجد دارا شکوہ کے ساتھ جو قطعات اراضی ملے ان کو ہم نے باغات میں تبدیل کرلیا۔ کچھ اور معابد بھی واگذار کر لیے گئے۔ لوگوں میں اس واگذاری سے اتنا جوش پھیلا کہ انھوں نے مندرجہ ذیل گرہ لگاکر اس کا استقبال کیا ؎

گلینسی کمیشن سے مقصود پایا
یہ سب رنگ لایا میاں شیرِ کشمیر

پتھر مسجد کے ساتھ جو ملحقہ زمین تھی اُس پر لکڑی کی ایک ٹال لگادی گئی تھی۔ ہم نے اُسے خالی کرواکے وہاں مجاہد منزل کی عمارت کھڑی کردی۔ ایک لیتھو پریس بھی خریدا جس پر ہمارے قومی ترجمان "حقیقت" اور "صداقت" چھپتے رہے۔ "حقیقت" ہم نے ۱۹۳۲ء میں ہی شروع کیا تھا۔ بعد میں جب یہ اخبار حکومت کے عتاب کی نذر ہوگئے تو ۱۹۴۲ء میں ہم نے اخبار "خدمت" جاری کیا جس کے پہلے مدیر مولانا محمد سعید مسعودی بنے۔ ۱۹۵۳ء کے نرغے میں اس پر بخشی غلام محمد اور اُس کی ٹولی نے قبضہ جمایا اور اُسے ہمارے خلاف استعمال کرنے لگے۔ لیکن بخشی صاحب کے زوال کے بعد اس پر صادق صاحب

اور اُن کے کارندوں کا تسلّط ہوا تو انھوں نے توپ کی نال بخشی صاحب کی طرف کردی۔ کوئی مجھ سے کہتا تو میں اُسے جواب دیتا ؎

این سنگِ مہماں سنگ است کہ بر من زدہ بودی

الغرض میں حسبِ استعداد اوقاف کا انڈ سنبھالنے اور بڑھانے میں لگا رہا لیکن سیاسی سرگرمیوں کے تقاضے اور جیل کی دعوتیں اس قدر کثرت سے آئیں کہ میں حسبِ دلخواہ اوقاف کو بڑھاوا نہیں دے سکا۔ چاہے میں جیل خانے میں رہا ہوں یا اس سے باہر، اوقاف کے ساتھ میرا معاملہ بقول غالب یوں رہا ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن میں پھر بھی اس کی بنیادیں آہستہ آہستہ استوار ہوتی چلی جارہی تھیں۔ ہم نے عیدگاہ کی طرف بھی اپنی توجہ کی۔ اس میں شہر کے مسلمانوں کے دو عظیم اجتماعات عیدین کے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ چنانچہ سلطان زین العابدین کے بڑے بھائی علی شاہ کی بنائی ہوئی مسجد اب بھی اس کی قدامت کی شہادت دے رہی ہے۔ ہم نے عیدگاہ کو اپنی تحویل میں لے کر اس کو صاف ستھرا بنایا۔ آثار شریف حضرت بل میں معراج اور میلاد النبیؐ کی تقریبات پر وادی کے مسلمانوں کے دو سب سے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ ان کی ملّی مرکزیت کا نشان ہے ہم نے اس کی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ خاص طور سے عرس کے دنوں میں اس کو غرض مند خوانچہ فروش اور دوکاندار غلاظت کی آماجگاہ بناتے تھے۔ اس کا تدارک کیا۔ یہ زیارت میرواعظ کلاں کے حصّے میں شمار کی جاتی تھی اور صرف وہی بعض خاص تقریبات پر وعظ خوانی کرسکتے تھے۔ مولوی یوسف شاہ کو بحیثیت میرواعظ

یہ زعم ہوگیا تھا کہ دوسری جماعت کو یہاں انتظام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارا مقصد صرف زیارت کے انتظامات کی بہتری تھا۔ اس لیے ہم نے دخل اندازی پر اصرار نہیں کیا۔ جب مولوی یوسف شاہ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تو ہم نے میدان اُن کے لیے چھوڑ دیا۔ انھوں نے آثارِ شریف کے شمال کی طرف دوکانوں کی ایک قطار تعمیر کروائی۔ لیکن باقی معاملات جُوں کے تُوں چھوڑ دیے۔ زائرین کی جگہ کے ناصاف ہونے اور عرس شریف پر بدانتظامیوں کی جو شکایت تھی اُن کا کوئی مداوا نہ ہوا۔ ان حالات میں مجلسِ اوقاف کو یہ ناخوشگوار فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ اس زیارت کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چاہے اس کا مطلب مولوی صاحب کی بے دخلی ہی کیوں تصوّر نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب مولوی صاحب کو وہاں وعظ خوانی کے لیے تشریف لانا تھا مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع نے انھیں وہاں پہنچنے سے روک دیا۔ جس منبر پر وہ وعظ کرتے تھے اس کو بھی زیارت سے باہر لایا گیا۔ اوقاف نے اس طور مستحکم طریقے سے زیارت کے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ تعمیر و تجدید کا دور شروع ہوا جس میں مجھے بھی کافی توجہ مبذول کرنا پڑی۔ میں نے محلہ وار دورے کرکے عوام سے نقد و جنس کے عطیے اکٹھا کرنا شروع کر دیے۔ ہر جمعہ اور کسی بڑی تقریب پر میں درگاہ میں حاضر رہ کر زائرین سے عطیات وصول کرتا اور الحمدللہ یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ عوام نے بڑی عقیدت اور فراخ دلی سے تعاون کیا۔ اور آثارِ شریف کا دلکش اور دل نواز نقشہ نگاہوں کے سامنے اُبھرنے لگا۔ زائرین کے لیے نشست و برخواست آب رسانی وضو سازی اور نماز ادا کرنے کی آسائشیں فراہم کی گئیں۔ خود زیارت گاہ کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ نئی زیارت گاہ کا موجودہ پیکر بڑی کاوش کے بعد تیار کیا گیا۔

اس میں بنیادی تخیّل حکومتِ ہند کے سربراہِ تعمیرات مسٹر حبیب الرحمٰن کا ہے۔ مسٹر رحمٰن سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور نسیم باغ کے نزدیک کلیئر ماؤنٹ ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا تو باتوں باتوں میں ہی انھوں نے درگاہ کی نئی تعمیر کا تخیّل پیش کیا۔ اس کو ہماری ریاست کے چیف آرکیٹیکٹ صدیقی صاحب نے جو حیدرآباد کے رہنے والے ہیں کچھ اور آگے بڑھایا۔ آخر میں ڈیزائن کی تشکیل و تنظیم حیدرآباد کے مشہور ماہر تعمیرات فیاض الدین صاحب نے مکمل کی۔ یہ ڈیزائن کشمیر میں کلاسیکی اسلامی فنِ تعمیر کا اپنی نوعیت کا پہلا کھرا اور خالص نمونہ ہے۔ اس سے پہلے کشمیر کی زیارتوں، مسجدوں وغیرہ میں جو فنِ تعمیر برتا گیا ہے وہ عربی ایرانی فنِ تعمیر سے بالکل جداگانہ ہے جس کی ترقی یافتہ شکلیں ہمیں مُغلیہ دور کے معابد میں ملتی ہیں۔ کشمیر میں اسلامی فنِ تعمیر لکڑی کی فراوانی کے سبب لکڑی کے قالبوں میں ہی پروان چڑھا۔ لیکن اس کی ہیئت کذائی اور چہرے بُشرے پر بُودھ اور چینی اثرات اتنے نمایاں ہیں کہ کبھی کبھی اُن پر بودھ پگوڈاؤں (PAGODAS) کا گمان ہوتا ہے۔ جو چین، لاسا، لداخ، نیپال اور بھوٹان میں اب بھی عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں درگاہ شریف کا نیا ڈیزائن تقریباً پورے کا پورا لکڑی سے مُبرّا ہے۔ صرف اخروٹ کی لکڑی کا نہایت مُرصّع اور مُنقّش کام اس کے اندرونی حجروں کی آرائش میں لگایا گیا ہے اور اس کے دریچے اور جالیاں کشمیر کی صنعت کاری کے جاذبِ نظر یادگار نمونے بن گئے ہیں۔ لیکن باہر سے درگاہ کا ڈیزائن تاج محل اور دہلی کی جامع مسجد سے قریب تر ہے اور اس کی امتیازی حیثیت سرینگر کے خطِ افق (SKY LINE) میں اتنی نمایاں ہے کہ یہ صرف اپنے حسین پیکر کی وجہ سے ہی شہر کا ایک امتیازی نشان بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمارت کے بعد کشمیر میں فنِ تعمیر کا ایک انقلابی دور شروع ہوگیا ہے اور یہ آئندہ نئے اُفق تخلیق کرتا رہے گا۔

ہمیں کوئی ایک کروڑ روپیے سے زیادہ رقم اس منصوبے کی تکمیل پر خرچ کرنا پڑی۔

جس کا بیشتر حصہ میں نے حضرت بل میں زائرین سے اور شہر و دیہات میں عقیدت مندوں سے عطیات اور چندے کی صورت میں وصول کیا۔ نفیس قسم کا سنگِ مرمر مکرانہ راجستھان سے منگوایا گیا، جہاں کی کانوں سے کبھی تاج محل کا سفید پتھر حاصل کیا گیا تھا۔ سنگِ مرمر پر عربی آیات کی خطاطی لکھنؤ اور دہلی کے چوٹی کے خوشنویسوں نے کی اور یہ مُغل دور کی خطاطی کی یاد دلاتے ہیں۔ مرکزی حُجرے کے لیے جہاں موئے مبارک محفوظ رکھے گئے ہیں ایک عالی شان فانوس چیکوسلواکیہ سے منگوایا گیا، جو کشمیر میں ہی نہیں بلکہ سارے ملک میں اپنی نوع کا بہترین اور سب سے بڑا فانوس ہے۔

زیارتِ حضرت بل کی تجدید و تعمیر میں جن ساتھیوں نے میرا ہاتھ بٹایا ان میں سے ہر ایک کا نام گنوانا تو مشکل ہے۔ لیکن چند نام جو مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں۔ یہ ہیں۔ حاجی احمد وانی گندر، حاجی غلام محمد وانی بچھواہ، میر غلام رسول صاحب سابق چیف انجینئر، حاجی محی الدین متو وغیرہم۔

انسان اکثر اس زعم میں رہتا ہے کہ کوئی خاص کام صرف اس کی کاوش سے سرانجام پایا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی میں جو تجربے پیش آئے ہیں اُن سے میں قائل ہوگیا ہوں کہ جب تک منشائے الٰہی نہ ہو کوئی کام سرزد نہیں ہو سکتا۔ بقولِ شاعر؎

بے رضائے تو یکے برگ نہ جُنبد ز درخت

آثارِ شریف کا جو نقشہ اس وقت نمودار ہوا ہے اس کے پیچھے بھی مشیتِ الٰہی کام کر رہی تھی میری نوجوانی کا واقعہ ہے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ معراج کی تقریب جاری تھی یا میلاد کی۔ جمعہ کا دن تھا اور حضرت بل میں حسبِ دستور مسلمانوں کا ایک جمِ غفیر زیارت کے لیے جمع ہوا تھا۔ میر واعظ کلاں مولوی احمد اللہ کی وعظ خوانی کے بعد مسلمان نماز کے لیے صفیں درست کرنے لگے زیارت کے پچھلے صحن میں خوانچہ فروشوں اور پکوڑے فروشوں کے ڈیرے جمے ہوئے

تھے۔ کہیں ٹوکری فروش اپنا مال بیچنے کے لیے نعرے لگا رہے تھے کہیں میدان میں گوبر اور غلاظت کے ڈھیر تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اوپر کے صحن میں بھی یہی حالت تھی۔ مسجد کے اندر کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ الغرض ہر طرف افراتفری تھی۔ لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا تو اُن دنوں کوئی بندوبست نہ تھا اس لیے امام کا خطبہ قرأت یا تکبیرات بہت کم سنائی دیتی تھیں۔ امام اُن دنوں اس جگہ کہیں اقامت کرتا تھا جہاں آج کل گلشن واقع ہے۔ بہرحال جس دن کی میں بات کر رہا ہوں۔ اُس دن بھی فرزندانِ توحید نماز کے لیے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن تکبیرات چونکہ سنائی نہیں دیتے اس لیے نماز پورے حضور کے ساتھ ادا نہ ہو سکی اُوپر والے صحن کی صفیں اقامت میں تھیں تو نچلے صحن کی صفیں سجود میں اور اُن سے باہر والے لوگ رکوع میں۔ یہ حالت دیکھ کر درد مندوں سے آہ و بکا کا شور اُٹھا۔ میں اُن دنوں شاید انٹر میں زیر تعلیم تھا۔ مجھے یہ حالت دیکھ کر بے حد رنج ہوا۔ میں افسوس کر رہا تھا کہ وادی میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ مرکزیت کی حامل اس جگہ کا انتظام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔ تاکہ اُن کے اسلامی فرائض خوش اسلوبی سے ادا ہو سکیں۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اور نیم غنودگی کی سی حالت میں میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی کہ کاش۔! میرے بس میں ہوتا تو زیارت کے اس نقشے کو حقیقت کا لباس پہنا دیتا۔ بات آئی گئی۔ کسے معلوم تھا کہ وہ لمحہ بھی زمانے کے بطن میں پرورش پا رہا ہے جب قدرت میرے ہی کمزور ہاتھوں سے اس نقشے کے خاکے میں روپ رنگ بھر دے گی۔ میری بیگم کے مرشد، غلام محی الدین صاحب نے جو ایک مردِ بزرگ اور دست قلندر تھے، اُن سے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس زیارت کی ایسی شان اُبھرے گی کہ مسلمان تیل بل سے ہی ننگے پیر اور مؤدب ہو کر زیارت کے لیے آیا کریں گے۔ اس لیے جو کچھ بھی یہاں پر ظہور

پذیر ہوا ہے اُس کے متعلق یہ سمجھنا درست ہوگا کہ منشائے الٰہی کا کرشمہ ہے۔ اُسی کی منشا تھی کہ یہ کام میرے عاجز ہاتھوں سے سرانجام پائے۔ میں دل کی انتہائی گہرائیوں سے شانِ ایزدی کا شکر بجالاتا ہوں کہ اُس نے مجھے اس عظیم کارنامے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے چنا۔ بخشی غلام محمد مرحوم نے بڑی کوشش کی تھی کہ اپنے دورِ اقتدار میں یہاں کی مسجد کی بُنیاد ڈال دیں لیکن مشیّت کو وہ منظور نہ تھا اس لیے اُن کی مُراد بھر نہ آئی۔

آثارِ شریف حضرت بل کا ذکر آیا ہے تو اُس کی تاریخ اور مذہبی تقدس کی طرف اشارہ کرنا بھی لازمی ہے۔ اِس جگہ حضرت سرورِ کائنات، رحمۃ للعالمین پیغمبرِ اسلام کا ایک موئے مبارک ہے۔ روایت ہے کہ یہ موئے مقدس ایک عرب شیخ کی تحویل میں تھا جو حرم کعبہ کے کلید برداران میں سے تھا۔ یہ شیخ حجاز سے وہاں کی حکومت سے اختلافات کی بنا پر ہندوستان چلے آئے اور حیدرآباد دکن میں مقیم ہو گئے۔ اُن دنوں ایک کشمیری خواجہ نورالدین عشاوری کا حیدرآباد جانا ہوا، تو اُنھوں نے زرِ کثیر خرچ کرکے اس متاعِ بے بہا کو حاصل کر لیا۔ وہ اس عظیم توشے کو لے کر کشمیر آ رہے تھے کہ اس کی بھنک شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے کانوں میں پڑی۔ اُنھوں نے فوراً موئے مبارک کی ضبطی کا حکم دے دیا۔ اور اسے اجمیر شریف پہنچا کر درگاہِ معین الدین چشتیؒ میں رکھوانے کا فرمان جاری کیا۔ روایت کے مطابق ابھی اس حکم پر عمل درآمد ہونے ہی والا تھا کہ ایک شب شہنشاہ کو خواب میں آنحضورؐ کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی۔ اورنگ زیب نے حضورؐ کو کشمیر کی جانب مائلِ سفر دیکھا۔ اُس نے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں سلام علیکم عرض کی۔ جواب ارشاد ہوا کہ تم مجھے کشمیر جانے سے کیوں روکتے ہو؟ شہنشاہ بیدار ہوا اور اس پر خواب کا مفہوم آشکار ہوگیا۔ اُس نے فوراً موئے مقدس کو سرکاری نگرانی میں کشمیر روانہ کیا۔ جب موئے مقدس نواحِ کشمیر میں وارد ہوا تو اپنے وقت کے کشمیری رؤسا، اُمراء،

علماء اور فضلاء نے اس کا بڑی عقیدت اور احترام سے استقبال کیا۔ پہلے تو اسے خانقاہِ مُعلیٰ میں رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن جب زائرین کا انبوہ بہت بڑھ گیا تو اس کو حضرت بل لے جانا طے کیا گیا۔ وہاں کشمیر کے مُتمول صوبیدار کا ایک وسیع باغ واقع تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہاں زائرین کی نشست و برخاست کے لیے کُشادہ جگہ موجود تھی۔ اس لیے اُسے یہیں پر قیام پذیر رکھنا مُناسب خیال کیا گیا۔ اس وقت سے یہ مقام برابر وادی کے مسلمانوں کے لیے مرکزِ عقیدت و ہدایت ہے اور اُن کی مرکزیت اور اجتماعیت کا پُرشکوہ نشان بن گیا ہے۔

اس روحانی مرکز کی شان بہت سی نِگاہوں میں برابر کانٹے کی طرح کھٹکتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ اس کو محو کرنے کے لیے ایک باضابطہ اور مُنظّم مگر ناپاک کوشش، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اُس دن ایک پُراسرار اور حیرت انگیز طریقے سے موئے مبارک اپنے مقام سے غائب کیا گیا۔ یہ خبر تمام وادی میں آناً فاناً جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور مُسلمانوں کے ذہنی عوامل پر برقِ آسمانی کی طرح گری۔ اُس زمانے میں ہم جموں کے سپیشل جیل میں کشمیر سازش کیس کے تحت زیرِ حراست تھے۔ وادی میں ایک کُہرام مچ گیا۔ کشمیر کا کونہ کونہ ہل اُٹھا بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ حکومتِ ہند کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور جواہر لال نہرو ریڈیو سے اپیلیں نشر کرنے لگے۔ کریں تو کیا کریں۔ وادی کے تمام مُسلمان اپنی جانیں پروانہ وار نثار کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ جب صورتِ حال نے خطرناک عواقب کا رُخ اختیار کرنا شروع کیا تو اچانک اعلان ہوا کہ موئے مُبارک دستیاب ہو گیا ہے۔ حکومتِ ہند نے لال بہادر شاستری کو سرینگر بھیجا اور مُسلمان نمائندوں سے شناخت کرا کے گواہی دلوائی گئی کہ یہی اصل موئے مبارک ہے۔ آج تک اس راز سے پردہ نہیں ہٹ سکا ہے کہ موئے مقدس کو اپنی جگہ سے اُٹھا

لینے والا کون تھا اور واپس رکھنے والا کون تھا؛ لیکن حالات و واقعات کی گواہی سے مترشح ہوتا ہے کہ:

چرخِ کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یعنی اس کے پیچھے اُن ہی لوگوں اور طاقتوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا جنھیں مسلمانوں کا یہ روحانی مرکز ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور جو اس اجتماعی مرکز کو ختم کر کے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دینا چاہتے تھے۔ سیاسی مرکز پر تو اُن کا ہاتھ پڑ ہی چکا تھا اور مجاہد منزل میں سنٹرل ریزرو پولیس کا کیمپ لگا ہوا تھا۔

اِن تمام واقعات کے ذکر سے میرا مقصد اس بات پر زور دینا ہے کہ انسان کو کبھی اپنی طاقت پر غرور اور زر پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔ انسان کی چالوں سے بہتر چالیں اللہ کی دانست میں ہیں کہ فرمودہ الٰہی ہے "ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین"۔ انسان کی شطرنج بازی سے مشیتِ ایزدی نہیں بدل سکتی۔ بخشی غلام محمد کے اقتدار کو زمین بوس ہونا تھا اور موئے مبارک کا سانحہ اس کے سیاسی تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔

اقتدار سے میری علیحدگی کے بعد جب مجھے طویل مدت کے بعد جیل خانوں سے رہائی نصیب ہوئی تو میں نے اپنی ساری توجہ اوقاف کی طرف مرکوز کی۔ میری غیر حاضری میں اوقاف کے انتظام پر بھی بخشی غلام محمد نے قبضہ جمایا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے خاص طور طریقے سے اوقاف کے کام کو نبھایا اور اس میں تھوڑی وسعت بھی پیدا کی۔ لیکن اِس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کیے۔ میں نے اوقاف کی از سرِ نو تنظیم کی۔ مجاہد منزل میں اس کے لیے ایک نیا دفتر قائم کیا۔ اور اِسے ایک ٹرسٹ

کی صورت دی۔ اس کے ڈھانچے کو ذیلی شعبوں مثلاً شعبۂ تعمیرات، شعبۂ بیت المال، شعبۂ باغات، شعبۂ املاک (ESTATES) وغیرہ میں تقسیم کیا۔ مسلمانوں کی بہت سی زمینیں بے توجہی کی حالت میں پڑی ہوئی تھیں اور احتمال تھا کہ ان پر غرض مند ناجائز قبضہ جمائیں گے۔ میں نے اُن رقبہ جات کے ارد گرد خاردار تار لگوائے اور انھیں ثمردار باغات میں تبدیل کروا دیا۔ اور اس طرح اوقاف کے لیے آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ پیدا ہو گیا۔

اِسی طرح ہم چند اور بڑی زیارتوں کو اوقاف کے دائرے میں لے آئے۔ ان میں چرار شریف میں واقع حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی زیارت، زیارت بابا ریشیؒ گلمرگ، زیارت سید حسینؒ منطقی اونتی پورہ، زیارت حضرت پیر دستگیرؒ خانیار، زیارت حضرت عالی بخشؒ بچھر پورہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی آمدنی اور خرچ پر بھی نگاہ رکھی گئی ہے اور ان کی تعمیر و تجدید کے لیے بھی کافی کام کیا گیا۔ ہماری دیکھا دیکھی باقی زیارتوں کے انتظام کرنے والوں کو بھی ولولہ ہوا اور انھوں نے آمدن و خرچ کی باقاعدگی اور تعمیر و تجدید کی طرف توجہ کرنا شروع کی۔ اوقاف نے اُن کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ اس طرح زیارت حضرت مخدوم حمزہؒ، زیارت حضرت شاہ ہمدانؒ، زیارت حضرت نقشبند مشکل کشاؒ کی تعمیر و تنظیم کے سلسلے میں خاصا کام ہوا اور یہ تحریک شہر و دیہات میں معابد و مساجد کی اصلاح اور توسیع کا باعث بن گئی تا آنکہ آہستہ آہستہ یہ زیارت گاہیں بھی مرکزی اوقاف سے ملحق ہوتی گئیں۔ الحاق شدہ مساجد اور زیارت گاہوں کی مجملہ آمدن مرکزی اوقاف میں جمع ہوتی ہے۔ جہاں محاسبات کے تمام قواعد کی نگرانی میں ان کی آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا ہے۔ حسبِ طلب ذیلی اوقاف کے اخراجات بھی پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اوقاف اپنے مرکزی خزانے سے بیواؤں، یتیموں

اور مسکینوں کی بھی امداد کرتا ہے۔ کئی دینی مدرسے چلائے جا رہے ہیں جن میں مدینۃ العلوم حضرت بل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔

اوقاف کو خود کفیل اور مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کے اقدامات و تدابیر پر بھی برابر غور ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے صفر سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور اب اوقاف کے پاس ایک کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کے ذرائع وجود میں آچکے ہیں۔ جھیل ڈل کے کنارے بلیوارڈ پر ساٹھ ستر لاکھ کی لاگت سے ایک جدید طرز کا ہوٹل کمپلیکس تعمیر کیا گیا اسی طرح رستم گڈھی کے نزدیک دوکانوں اور عمارات کا ایک بڑا کمپلیکس زیرِ تعمیر ہے جس پر لاکھوں روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔ تریہ رشی حبہ کدل کی تعمیرِ نو کا کام ہنوز جاری ہے۔ یہاں نئی عمارت، دوکانات، عالی شان مسجد اور حمام کی تعمیر تکمیل کے قریب ہے اور اب زیارت گاہ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اور اس سارے تعمیری پروگرام پر لاکھوں کا خرچہ ہوگا۔ اسی طرح کرن نگر میں سید کرم شاہؒ صاحب کی زیارت پر ایک گول مارکیٹ کی تعمیر بھی کی گئی ہے۔ اوقاف کی جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں اُن میں نفاست اور حسن کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا جاتا ہے تاکہ کشمیر کے فنِ تعمیر میں جلال و جمال کا ایک دلکش اِمتزاج ہو اور یہ ملک کے اجتماعی حُسن کو بڑھا سکے۔ افسوس ہے کہ ہمارے شہر باش اور ہم وطن کشمیر کے فنِ تعمیر کی نزاکتوں کی طرف کم توجہ کر رہے ہیں۔ اور اس طرح سے کشمیر فنِ تعمیر میں اپنا امتیازی کردار کھو رہا ہے۔

اِس وقت اوقاف کی کوششوں کا محور اپنی املاک کو بڑھانے اور ساتھ ہی ساتھ زائرین کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دینا ہے۔ جب اس کام سے فراغت ہوگی تو آمدنی کا بڑا حصہ تعلیم و تربیت اور دیگر اصلاحی تعمیری کاموں میں صرف

کرنے کی تجویز ہے۔

بدقسمتی سے جموں میں ابھی ہم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہاں کے مسلم رہنماؤں نے اس کام کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد وہاں مسلمانوں کا وجود ہی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ اور برابر جدوجہد کر رہے ہیں۔ جموں میں محلہ استاد میں ایک شاندار مسجد تیار ہو گئی ہے۔ جو اپنی تعمیر کی پاکیزگی اور رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے اور جس کی وجہ سے اس علاقے کی شکل نکھر آئی ہے۔ تالاب کھٹیکاں میں ایک شاندار جامع مسجد بخشی غلام محمد صاحب کے عہد میں تعمیر ہو چکی ہے۔ ہم نے ریذیڈنسی روڈ پر ایک جدید ڈھنگ کی شاندار تعمیر کی طرح ڈالی ہے۔ جس میں دوکانیں اور فلیٹ موجود ہیں۔ تحصیل منڈی راجوری میں ہم نے شاہدرہ شریف کی مشہور زیارت کا انتظام بھی سنبھالا ہوا ہے۔ میری توقع یہ ہے کہ ہمارے بعد بھی مسلمان اس ادارے کو نہ صرف زندہ رکھیں گے بلکہ اس کی ترقی میں سرگرمی سے کوشاں رہیں گے۔ اس طرح سے یہ ادارہ قومی اصلاح کی ضرورتوں کی کفالت کر سکے گا اور انھیں حکومت یا دوسروں کی طرف بار بار ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا۔

اوقافِ اسلامیہ سے صرف یہاں کے مسلمان ہی مستفید نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ یہاں کے تمام عوام کو اس سے فائدہ مل رہا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں میں نے عوامی حکومت کے پہلے سربراہ کی حیثیت سے زمامِ اقتدار سنبھالی تو حکومت کا خزانہ خالی تھا۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کے محکمے میں جو گاڑیاں تھیں اُن میں مہاراجا اپنا مالِ غنیمت لے کر جموں فرار ہو گیا تھا۔ اُدھر سے عوامی رسد وغیرہ کی

بہم رسانی کے لیے سرکاری بار برداری کے ذرائع کی بھی اشد ضرورت تھی۔ چنانچہ ہم نے اوقاف کے بیت المال سے پیسہ اُدھار لیا۔ اور درجن ڈیڑھ درجن گاڑیاں خرید کر محکمہ ٹرانسپورٹ کی شروعات کیں۔ آج اِس محکمے کے پاس ہزاروں گاڑیوں پر مشتمل فلیٹ ہے۔ جس کی آمدنی کروڑوں میں ہے۔

۲۸

معرکۂ بیم و رجا

تاریخ کا یہ بہیہ انقلاب کا نقیب ہے اس صدی کی پانچویں دہائی شاید اس صدی کی سب سے انقلاب آفریں، ہنگامہ خیز اور واقعات ساز دہائی تھی۔ عالمی پیمانے پر دُنیا کی سب سے لرزہ خیز جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس نے ساری دھرتی کو آندھی میں گھرے ہوئے ایک رنگین غبارے کی طرح لرزہ براندام کر دیا۔ یہ غبارہ کبھی فسطائی اور کبھی اتحادی طاقتوں کے آنگن میں گھومتا نظر آ رہا تھا۔ ہندوستان میں مسلم لیگ پہلی بار ایک عوامی تنظیم کی شکل اختیار کر کے کانگریس کے غرور کو پاش پاش کر رہی تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد جس قسم کا سلوک کیا گیا تھا اُس نے انھیں نفسیاتی طور پر عدمِ تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا اور خوفزدہ آدمی ہمیشہ جذبات میں بہہ جاتا ہے۔ کشمیر پر بھی یہ عالمی اور ملکی واقعات اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ اِن بڑے الاؤں سے اُٹھنے والی چنگاریاں کبھی کبھی کشمیر میں آن گرتیں اور یہاں کے خرمنِ امن کو شرر بار کر دیتیں کشمیر کی شخصی حکومت اپنے سرپرست اور زندگی کے ضامن برطانوی سامراج کے پنکھے جھل رہی تھی۔ برطانیہ پر ہٹلر کی شکل میں جو مصیبت نازل ہو گئی تھی اُس

پرست حکومت سے بدرجہا بہتر ہے چاہے ایسی ڈکٹیٹر شپ ملک کی ترقی میں حائل ہی کیوں نہ ہو۔"

حکومت کے ایک اور قدم نے تلخی پیدا کی اور وہ ریاست میں ذریعہ تعلیم اردو کو ناگری اور فارسی حروف میں رکھنا تھا۔ ہم ناگری اور فارسی حروف دونوں کو سکھائے جانے کے حق میں تو تھے۔ لیکن حکومت کا منشا کچھ اور ہی تھا۔ وہ اس آڑ میں اُردو کو جو اس صدی کی ابتدا سے اور فارسی کو جو کوئی چھ سو سال سے ریاست کی سرکاری اور رابطے کی زبان رہی تھی، دیش نکالا دینا چاہتے تھے۔ ہم نے وزیر اعظم سے اس بارے میں گفتگو کرنے کے لیے وقت مانگا۔ لیکن اُن کا موقف دلیل کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ اس لیے وہ ٹال گئے۔ البتہ اردو کو چور دروازے سے ریاست بدر کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ اردو کو عدالتی اشٹامپوں اور ٹکٹوں سے خارج کیا گیا۔ عدالت کے سمن اور عنوان ناگری حروف میں چھاپے جانے لگے۔ اسمبلی کی کارروائی میں خوبصورت اور آسان اردو الفاظ چن چن کر نکالے جانے لگے اور اُن کی جگہ سنسکرت کے نامانوس اور ثقیل الفاظ ٹھونسے جانے لگے اور اس طرح سے ایک ایسی زبان کے چلن پر زور دیا جانے لگا جو عوام سے دور تھی۔ ایک اور دل دوز سانحہ جس نے ساری ریاست کے عوام کے دل چھلنی کر ڈالے۔ ریاستی حکومت کا قازقستان سے آئے ہوئے مہاجرین کے ساتھ انسانیت سوز سلوک تھا۔ چین میں ماؤزے تنگ کی سُرخ کمیونسٹ فوج ۱۹۳۴ء سے ہی زوال آمادہ اور بد دیانت کومن تانگ حکومت کا ایک کے بعد ایک مضبوط گڑھ مسمار کر رہی تھی۔ ۱۹۴۹ء کے آخر میں اس انقلاب کی لرزشیں چینی ترکستان میں جسے اب سنکیانگ کا نام دیا گیا ہے۔ میں اس طور محسوس کی گئیں کہ وہاں کے باثر اور دیندار مسلمانوں کا بڑا قافلہ الیاس خان نامی سردار کی قیادت میں ریاست کی حدود میں داخل ہوا۔ اُن کے

ساتھ گھوڑے، بھیڑ بکریاں، یاک، پارچہ جات، سونا اور دوسرا ذاتی سامان تھا۔ حکومت نے پہلے تو پروانۂ راہداری دینے کی حامی بھر لی لیکن پھر اُن پر وہ مظالم ڈھائے گئے کہ اُن کے ہزاروں ہم سفر اور جانور مویشی وغیرہ تڑپ تڑپ کر ہر گام پر مرتے گئے۔ ہم نے اس بے دردانہ بلکہ مجرمانہ سلوک کے خلاف آواز بلند کی تو حکومت کے ڈھنڈورچی اخبارات "ملاپ" لاہور "ہمدرد" سرینگر وغیرہ نے ان بے چاروں پر بہتان تراشنا شروع کر دیا کہ یہ قازق تو دراصل ڈاکو ہیں۔ اس لیے کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن یہ سراسر جھوٹ تھا۔ اس لیے ہم نے اس کی مدلل تردید کی۔ اس پر فرقہ پرست اخبارات اپنے اصل روپ میں سامنے آ گئے اور کہنے لگے کہ شیخ محمد عبداللہ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے اُن کی جماعت قازق مسلمانوں کے لیے آنسو بہا رہی ہے لیکن ہم نے اس بلیک میل کا مقابلہ کیا اور آخر کو حکومتِ ہند اور حکومتِ کشمیر دونوں کو قازق مہاجرین کی حالتِ زار کا احساس کرنا پڑا اور اُن کو باعزت طور پر پناہ دی گئی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہند اور پاکستان کے آزاد ملک وجود میں آئے تو کشمیر میں مقیم قازقوں نے حکومتِ ترکی سے درخواست کی کہ چونکہ اُن کے نسلی اور لسانی تعلقات ترکوں کے ساتھ ہیں اس لیے انہیں ترکی میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ جب اُن کی درخواست منظور ہو گئی تو اپنے سوادِ اعظم کے ساتھ مل گئے۔ جنوری ۱۹۴۲ء کے آغاز میں جاپان اتحادیوں کے خلاف جنگ میں کود پڑا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مشرقِ بعید میں برطانیہ کی عسکری قوت کو تاخت و تاراج کر دیا اور برما پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان کے دروازوں پر دستک دینے لگا۔ سُبھاش چندر بوس جاپانیوں کے بل بوتے پر ہندوستانی پرچم لہراتے ہوئے دہلی کے لال قلعہ پر نظریں گاڑ رہے تھے۔ برطانیہ پر ہول طاری ہونے لگا اور اُس نے ہندوستانی عوام کو نفسیاتی طور ناطرفدار بنانے کے لیے اپنے ایک شہرت یافتہ مدبر سر سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستانی رہنماؤں سے گفت و شنید کے لیے نئی دہلی روانہ کر دیا۔ کرپس نے جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کی آزادی کی یقین دہانی

کی۔ لیکن اس وقت جبکہ آزادیٔ ہند سے متعلق کچھ اہم مشورے ہو رہے تھے، ہندوستانی ریاستوں میں کالی چمڑی کے سامراجیوں کے ظلم سہنے والے عوام کو بدستور مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے اپنے تاریخی شعور اور عوامی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تناقض کے خلاف آواز بلند کی، اور دیسی ریاستوں کے عوام کی ترجمانی کا بیڑا اٹھا لیا۔ میں نے پنجاب ریاستی پرجا منڈل، میسور نیشنل کانفرنس، حیدرآباد پیپلز کانفرنس اور دوسرے پرجا منڈلوں سے رابطہ قائم کیا۔ ہم نے اعلان کیا کہ دیسی ریاستوں میں بسنے والے دس کروڑ باشندے اُن معاہدوں کے پابند نہیں ہو سکتے جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور والیانِ ریاست کے درمیان طے پائے ہیں اور ریاستی عوام کی طرف سے بولنے کا حق راجواڑوں کو نہیں عوام کے نمائندوں کو ہے۔ ہماری اس آواز پر آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس نے ۱۹ اپریل ۱۹۴۲ء کو ریاستوں کا یوم مطالبات منایا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو سرینگر میں ہمارا ایک زبردست جلوس نکلا اور جلسے کے اختتام پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں بتایا گیا کہ ہر ریاستوں کے لوگوں کی جان و مال اور عزت کو جاپان اور جرمنی کی ظالمانہ یلغار سے بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہ ہے کہ ریاستوں میں ذمہ دار نظامِ حکومت قائم کیا جائے تاکہ عوام کی مالی، جسمانی اور ذہنی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو کر وطن کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔"

ہم آزمائش کی اس گھڑی میں دنیا کے معاملات سے شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے نہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مئی ۱۹۴۲ء میں کشمیریوں کی خاص وضع میں نیشنل کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس ایک ڈونگے میں ہوا۔ ڈونگا پانی پر تیرتی ہوئی ایک کشتی کو کہتے ہیں جس میں رہنے سہنے کی سہولیات ہوتی ہیں۔ ڈونگا جھیل کی سطح پر گھنٹوں تک تیرتا رہا اور ہم نے یہ قرارداد پاس کی۔

"تاریخِ عالم کے اس مرحلے پر عوام کو اس بات کا پوری شدت سے احساس کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک کو فسطائی طاقتوں سے کتنا بڑا خطرہ درپیش ہے۔ عوام کو اُن کے خوابِ راحت سے جگایا جانا چاہئے کیونکہ موجودہ جنگ صرف بڑی طاقتوں کا معاملہ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے عوام کا فسطائیت اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف متحدہ محاذ بن گئی ہے۔ چاہے وہ طاقتیں بیرونی ساخت کی ہوں یا سودیشی یافتہ۔ بین الاقوامی سطح پر فسطائی اور ظلم کی طاقتوں کی شکست گھریلو محاذ پر بھی اُن کی شکست کا باعث بنے گی۔ لہٰذا عالمی فسطائیت کی شکست کے لیے کشمیری عوام کو متحد اور ایک آواز ہونا چاہئے۔"

اُن دنوں مہاراجا ہری سنگھ اپنی آزادی پسندی کا بہت ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے۔ اور اُنھوں نے آزادیٔ ہند کی حمایت میں ایک مبہم سا بیان بھی دے ڈالا تھا۔ میں اس دوغلے پن کو برداشت نہ کر سکا اور میں نے اپنے منہ پھٹ انداز میں کہا:

"ہز ہائی نس جب ہندوستان کی آزادی کے متعلق بڑے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اس آمرانہ اور جابرانہ طرزِ حکومت کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں جس کے خون آشام پنجوں میں پھنس کر اُن کی اپنی رعایا سسک سسک کر زندگی بسر کر رہی ہے۔"

کچھ ہی دنوں کے بعد کرپس صاحب کو اپنے مشن کی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا۔ کانگریس نے اُن کی تجاویز ٹھکرا دی تھیں۔ چنانچہ کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا۔ کرپس تجاویز کی کانگریس کی طرف سے نامنظوری ایک غیر دانشمندانہ اقدام تھا، اور اس نے تقسیم ہند کی راہ ہموار کی۔ کرپس نے جو فارمولا پیش کیا تھا وہ تقسیم ہند سے مختلف تھا جس کے تحت ہندوستان کی وفاقی حیثیت برقرار رہتی تھی۔ یہ مطالبہ

مسٹر جناح نے منظور کر لیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے مطالبۂ پاکستان کو طاق پر رکھنا مان لیا تھا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ کانگریس نے اس کو نامنظور کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبۂ پاکستان نے زیادہ زور پکڑ لیا اور ایک وقت آیا کہ کانگریسی قیادت کو اس آشوب کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اگر اس وقت کرپس کی تجاویز مان لی جاتیں تو شاید خون کی وہ ہولی روکی جاسکتی تھی جس نے تقسیم ہند کی وجہ سے گنگا اور سندھ کے پانیوں کو سرخ کر دیا۔ بہر حال ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو مہاتما گاندھی کے ساتھ کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھلا ایسے موقع پر نیشنل کانفرنس جیسی سامراج مخالف جماعت کیسے چپکے بیٹھی رہتی اور تماشائی بنی رہتی؟ ہماری ورکنگ کمیٹی نے برطانوی دار و گیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ رہنماؤں کو رہا کر کے ہندوستان کی آزادی پر معنی خیز گفتگو کا آغاز کر کے فسطائی مخالف محاذ کو تقویت بخشے۔ میں نے اس مطالبے کی حمایت میں ۲۰ر اگست کو عام ہڑتال کرنے کی اپیل کی اور عوام نے میری اپیل پر لبیک کہتے ہوئے اس دن سارا کاروبار بند رکھا۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگریسی جیل چلے گئے۔ اور برطانیہ نے تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کو کچل کے رکھ دیا۔ اس حد تک کہ اگر مہاتما گاندھی کچھ عرصے کے بعد آغا خان پیلس پونہ میں مرن برت نہ رکھتے تو اس تحریک کے اثرات بھی معدوم ہو چکے ہوتے۔ کانگریسی رہنماؤں کے اس طرح منظر سے غائب ہونے کا مسلم لیگ اور اُن کے زیرک لیڈر جناح صاحب نے خوب فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے اعصاب پر پاکستان کے نعرے کا پرچم لہرانے لگا۔ میں پاکستان کے نعرے کی نفسیات سے ہمدردی تو رکھتا تھا۔ کیونکہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا ہندو فرقہ پرستی کے خلاف ایک جارحانہ ردِ عمل تھا اور صرف ہندو مہاسبھا جیسی فرقہ پرست تنظیموں نے ہی نہیں

بلکہ کانگریس کے ایک طاقتور مگر تنگ نظر گروہ نے بھی ان کے تمدنی مذہبی اور اقتصادی احساسِ تحفظ پر مسلسل وار کر کے انہیں ایک اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر میرا یہ بھی یقین تھا کہ ایک سہمی ہوئی اقلیت کا جذباتی ردِ عمل ہے۔ جس سے اس کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچنے کے زیادہ اندیشے ہیں۔ میں پاکستان کو بنیادی طور ایک فرار پسند نعرہ سمجھتا تھا۔ ایسی جذباتی اور ذہنی فضا میں نیشنل کانفرنس کا میرپور میں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ مجھے پہلی مرتبہ نیشنل کانفرنس کی صدارت سونپی گئی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں برطانوی سامراج کی چالوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی پریشانیوں کو موضوعِ سخن بنایا۔ میں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

"میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ وہ اسی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی مٹی میں مل جائیں گے۔ ان کو سندھ کی سرزمین پر اپنا نعرۂ توحید بلند کئے ہوئے تیرہ سو سال، ہندوستان کے باقی حصوں میں ایک ہزار سال اور کشمیر آئے ہوئے ساڑھے چھ سو سال کی مدت گذر چکی ہے۔ ہمارے کروڑوں آباؤ اجداد کا وجود ہندوستان کی مٹی کا جزو بن چکا ہے اور آج اس سرزمین کے ذرّے ذرّے میں ہمارے خون کی آمیزش ہے کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور درۂ خیبر سے لے کر آسام تک اس سرزمین کا کون سا ایسا حصہ ہے جس میں مسلمانوں کی یادگاریں اُن کی بستیاں، اُن کے معابد و مساجد، زیارات و مقابر اور علمی و عملی کمالات کے لازوال نمونے بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ سرنگا پٹنم ہو یا سیکری نگر دونوں ہمارے ہیں۔ ان حالات میں ہم ہندوستان کے کسی حصے سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اب ساری سرزمین پر ہمارے حقوق دائمی اور

ایسی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ الغرض ہندوستان ہمارا وطن ہے اور یہی ہمارا وطن رہے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس وطن اور گھر کو غیروں کے تسلّط سے آزاد کرنے اور اس کے مالک بننے کی کوششوں میں سب سے آگے رہیں۔"

▲▲▲

۲۹

"نیا کشمیر"

اُدھر دُنیا کے سٹیج پر تاج و تخت نوکِ شمشیر پر کھلونوں کی طرح اُچھل رہے تھے اُدھر ریاست میں سیاسی اور اقتصادی صُورتِ حال مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ ریاست کا بے درد انتظامیہ تو پہلے ہی اپنے عیش و عشرت میں مگن تھا۔ اُسے عوام کی مشکلات سے بس زبانی جمع خرچ کی حد تک دلچسپی تھی۔ جنگ نے اشیائے ضروریہ کی نقل و حمل مشکل بنا دی۔ اُدھر ریاست میں سوکھا پڑا اور کھانے پینے کی اجناس کا کال پڑنے لگا۔ چاروں طرف "روٹی روٹی" کی ہاہاکار مچ گئی اور ایک وقت تو نیشنل کانفرنس کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی عوامی دُکھ درد کے مداوا کے لیے متحد ہو گئیں۔ جموں میں گولیاں چلائی گئیں اور سرینگر میں گرفتاریاں کی گئیں۔ مہاراجا نے اس نازک سیاسی صورتِ حال سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ناٹک کے سے انداز میں ایک آئینی و اصلاحاتی کمیشن کا طمطراق سے اعلان کیا۔ کمیشن کے دائرۂ اختیار میں "ریاست جموں و کشمیر میں ترقی یافتہ نظامِ حکومت" اور اس نوع کی چکنی چپڑی باتیں رکھی گئی تھیں لیکن جب کمیشن کے ممبروں کا اعلان ہوا تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سوانگ محض اشک شوئی کے

لیے رچایا جا رہا ہے۔ ریاست بھر کے وفادارانِ ازلی، نمک خوارانِ سرکار، ذیلدار، پنشنر اور اسی قسم کے سرکاری زر خرید کمیشن میں بھرتی کیے گئے تھے، جنھیں مسائل کا شعور تو کیا اُن کی خبر تک نہیں تھی۔ نیشنل کانفرنس کی طرف سے مرزا محمد افضل بیگ اور خواجہ غلام محمد صادق کمیشن کے لیے نامزد کیے گئے تھے۔ اگرچہ کمیشن کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے انجام سے متعلق ہم کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھے۔ مگر ہم نے پھر بھی اپنے ممبروں کو اس کی پہلی نشست میں جانے کی اجازت دے دی۔ تاکہ سوانگ کی حقیقت کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جائے بہت جلد ہمارے ممبروں کو کمیشن کی اصلیت کا سُراغ مل گیا اور اُنھوں نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کو رپورٹ پیش کر دی کہ یہ ایک ڈھکوسلہ ہے۔ ہم نے اپنے ممبروں کو کمیشن سے واپس بلا لیا اور اس کے ساتھ ہی فیصلہ کر لیا کہ وقت آ گیا ہے جب خود نیشنل کانفرنس کو پہل کر کے ایک سیاسی، آئینی و اقتصادی منشور تیار کرنا چاہیے جو ایک تو ہمارے مقاصد کا نشان بن جائے دوسرے ہماری آرزوؤں، اُمنگوں، تمناؤں کا مرکزی نقطہ یہی "نیا کشمیر" کی ترتیب کا پہلا زینہ ثابت ہوا۔ اگرچہ ۱۹۳۱ء سے ہی ہماری سیاسی جدوجہد چند خاص مقاصد کے لیے حصول کی جانب مرکوز تھی لیکن جدوجہد کے ناہموار راستے پر کبھی کبھی تو یہ خواب تعبیروں کی کثرت سے پریشان ہو جاتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ نیشنل کانفرنس اپنے مقاصد کو قلمبند کر کے اُنھیں عوام کے سامنے پیش کرے۔ یہ سارے ہندوستان میں اس قسم کی پہلی کاوش تھی۔

ہماری تحریک کا دائرہ پہلے تو مسلمانوں تک محدود رہا اور اُس وقت اُس کا نقطۂ اجتماع (RALLYING POINT) اسلام تھا۔ لیکن اب تحریک کے دروازے سب مذاہب کے لوگوں پر کھول دیے گئے تھے۔ تو ایک مشترکہ نقطۂ اجتماع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ نقطہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی نوعیت کا ہی ہو سکتا

تھا۔ زندگی اور تحریک کے تجربے نے ہمیں قائل کر دیا تھا کہ عوام کے مختلف طبقات میں بنیادی ٹکراؤ مذاہب کا نہیں بلکہ مفادات کا تھا۔ ایک طرف استحصال کرنے والے تھے اور دوسری طرف وہ جو اس استحصال کا شکار تھے، ہماری لڑائی کا منشا و مقصد مظلوم کی حمایت اور ظالم کی مخالفت تھا۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ ہماری ایک جابرانہ نظام سے ٹکر ہے کسی شخصیت سے نہیں۔ ہمارا جاگیرداری نظام سے جھگڑا تھا جاگیردار کی ذات سے نہیں۔ واقع یہ تھا کہ ہم بیماری سے نفرت کرتے تھے بیمار سے نہیں۔ اس لیے ہمارے مقاصد کی شناخت اور تشریح کی ضرورت تھی۔ تاکہ ہماری جدوجہد کا پرکار اسی نقطے کے ارد گرد گھومے پھرے۔ اس منشور کے لیے پہلے تو ہم نے ریاست بھر کے تمام علاقوں کے مسائل کی فہرست مرتب کی اور اجتماعی مسائل پر بھی بھرپور نظر ڈالی۔ اس منشور کو مرتب کرنے کے لیے ہم نے پنجاب کے ایک مشہور ترقی پسند دوست بی پی ایل بیدی کی خدمات حاصل کیں۔ محمد دین تاثیر، کے ایم اشرف، دانیال لطیفی اور احسان دانش جیسے لوگوں نے بھی دستاویز کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ بیدی صاحب کی بیدار مغز اور سلیقہ مند بیوی فریدہ نے مسودہ ٹائپ کیا۔ جب یہ منشور تیار ہوا تو نیشنل کانفرنس کے متعلقہ اداروں نے اسے منظور کیا۔ چنانچہ جب مہاراجہ اپنے مشرقِ وسطیٰ کے دورے سے واپس آئے اور شہر کے استقبالیہ کے سلسلے میں مجاہد منزل کے سامنے گزرے تو میں نے اسے اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"نیا کشمیر" اپنی ترتیب کے وقت صرف ریاست ہی نہیں بلکہ ملک بھر کی سطح کی ایک انقلابی دستاویز تھی۔ اور اس کی انقلاب آفرینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج چھتیس سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک جوان و جاوید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں زمین کاشت کار کے حوالے کرنے کا

جو تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس پر تو برصغیر میں آزادی کے بعد بھی برس ہا برس تک عمل درآمد نہ ہو سکا۔ "نیا کشمیر" میں عورتوں، مزدوروں اور سماج کے دوسرے کمزور طبقوں کے حقوق باضابطہ تسلیم کر کے تحفظ کا بیان کیا گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "نیا کشمیر" پر اشتراکی نظریات کا اثر رہا ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کے اس پہلو کا تعلق ہے جو بین الاقوامی سطح پر محنت کشوں اور مظلوموں کی جدوجہد کی طرف داری کرتا ہے۔ نیشنل کانفرنس نے ہمیشہ اس کو سراہا ہے اور وہ نہ صرف انقلاب روس بلکہ انقلاب فرانس کے اصولوں اور روشن خیالی کی کرنوں سے اپنے ذہن و ضمیر کو مالا مال کرتی ہے۔ لیکن ہم اشتراکیت کے آمیزے میں جمہوری طرز عمل، نرم روی کے انسانیت نواز اور حیات بخش عناصر بھی شامل کرنے کے حق میں تھے۔ جب ہم نے نیا کشمیر کو اپنایا تو مسلم لیگ کے نوابوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے رجعت پسندوں نے بھی ہم پر آوازے کسے۔ ایک مسلمان لیڈر نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس سے ہندو سرمایہ دار کے ساتھ مسلمان سرمایہ دار بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس طرح مسلمان گھاٹے میں رہیں گے۔ اسی طرح ایک ہندو نیتا نے یہ کہہ کر اس کی مذمت کی کہ اگر اس منشور پر عمل درآمد کیا گیا تو ہندو عورتوں کو بھی مسلمان خواتین کی طرح طلاق آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اور اس طرح ہندو سوسائٹی خطرے میں پڑ جائے گی۔ انہی دنوں منظفر آباد میں ہندو سبھا کا ایک اجلاس ہوا جس میں اکھل بھارتیہ ہندو مہا سبھا کے ایک بڑے لیڈر ڈاکٹر مونجے اور کشمیر یووک سبھا کے نیتا شو نرائن فوطیدار نے "نیا کشمیر" کی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی اور اپنے پیروؤں سے "نیا کشمیر" کے نظریات کے خلاف کمربستہ رہنے کی اپیل کی۔ لیکن بعد میں ہندوستان میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں کانگریس بائیں بازو کی اسی سوچ کی طرف جھکتی گئی جس کا احساس "نیا کشمیر" میں مضمر تھا اور انڈین نیشنل کانگریس

کا اوادی سیشن کا ریزولیوشن، جس میں ملک کا لائحہ عمل ایک سماج وادی نظام قائم کرنا ٹھہرایا گیا۔ دراصل "نیا کشمیر" کی فکر کی ہی صدائے بازگشت تھا۔ جب ۱۹۶۹ء میں مسز اندرا گاندھی نے بنکوں کو قومیانے جیسے انقلابی اقدامات سے کانگریس کے رجعت پسند رہنماؤں کو پسپا کر دیا۔ اس وقت بھی بائیں بازو کی اسی سوچ کا بول بالا ہو رہا تھا۔

"نیا کشمیر" کے مقاصد کو میں نے اس کے دیباچے میں مختصراً یوں بیان کیا ہے۔

"ہم اپنے "نیا کشمیر" میں اپنی ریاست کے مرد اور عورت ذات کی جدید تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا روحانی اور ذہنی قد صدیوں کے ذہنی دباؤ اور مظالم نے کوتاہ کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے شاندار انسان پیدا کریں جو ہماری خوبصورت مادرِ وطن کے شایانِ شان ہوں۔"

(نیا کشمیر کا دیباچہ ضمیمہ ...... میں ملاحظہ ہو)

"نیا کشمیر" کی اشاعت ریاست کے دانشور حلقوں کے لیے ایک خیال انگیز ترغیب ثابت ہوئی۔ اس پر اندرون اور بیرون ریاست زبردست بحث و مباحثہ شروع ہو گیا اُدھر ریاست کی عوامی زندگی میں متعدد جذر کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ وزیر اعظم خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔ مہاراجا اپنے زوال آمادہ نظام کے ناسور کا علاج تو نہ کرتے تھے۔ صرف اس نظام کی ناکامیوں کا تختۂ مشق اپنے ملازم وزرائے اعظم کو بناتے تھے۔ گوپالا سوامی آئینگر کو چلتا کر دیا گیا اور بمبئی کے ایک سیاسی معصوم سر مہاراج سنگھ کو لایا گیا۔ لیکن چار مہینے کے اندر اندر ان کا بھی بستر بند ہو گیا۔ کرنل ہاکسر نام کے ایک بھی آئے جو مہاراجا کے پرانے دوست تھے اور جن کا کانگریسی لیڈروں سے بھی یارانہ تھا۔ لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ ٹک سکے۔ پھر ایک ممتاز ہندوستانی قانون دان سر بینیگل نرسنگھ راؤ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ بی۔ این راؤ تھے تو شریف آدمی، لیکن جس نظام

کی میزبانی کرتے تھے وہ تعصب اور تنفّس سے بھرپور تھا چنانچہ آتے آتے ہی انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا:

"جموں و کشمیر ایک ہندو ریاست ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی غیر ہندو آبادی بھی ترقی کرے۔"

بی۔ این۔ راؤ کے اعتدال پسند خیالات کے بارے میں بہت دوستوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ اس لیے اس بیان سے مجھے کافی رنج ہوا۔ چنانچہ میں نے انہی دنوں حضرت بل میں ایک تقریر میں راؤ صاحب کو اس تعصب آمیز روش کے لیے متنبہ کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے علم نہیں کہ سر مینگل نے کشمیر کو کیوں ایک ہندو ریاست کہا ہے لیکن مجھے اس سے سخت اختلاف ہے۔ ایک ایسی ریاست کو جس کی پچاسی فیصدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے، ہندو ریاست کہنا خود اپنی ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مہاراجا کا ہندو ہونا ہی ریاست کی ہیئتِ ترکیبی کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وزیر اعظم نے ہندو ریاست کی اصطلاح استعمال کر کے جس ذہنی کیفیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ریاست کے بہت سے اعلیٰ حکام کی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ مختلف فرقوں کے درمیان امتیاز کی دیواریں منہدم کی جائیں۔"

▲ ▲ ▲

(۳۰)

محمد علی جناح اور ہم

۱۹۴۴ء میں جناب محمد علی جناح سرینگر سیر و تفریح کے لیے تشریف لائے تو وہ ایک ہندوستان گیر شخصیت کے مالک بن چکے تھے اور اُن کے سیاسی امتیاز کے ساتھ اُن کی قانون دانی کا لوہا سبھی مان چکے تھے اس وقت اُن کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح بھی تھیں۔ وہ شیو پورہ میں ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ انہی دنوں چیف جسٹس سر برجور دلال کی عدالت میں ایک مقدمہ حنیفہ بیگم اور مہر علی تھانیدار کے متنازعہ نکاح سے متعلق زیرِ سماعت تھا۔ مہر علی کشمیر پولیس میں ایک تھانیدار تھا اور مقدمہ حنیفہ بیگم سے اُن کے نکاحِ ثانی سے متعلق تھا۔ حنیفہ بیگم کا ایک اور دعویدار اُستاد عبدالکبیر پیر تھا۔ مہر علی کے ساتھ ہماری جان پہچان تھی۔ مقدمہ کافی مشکل تھا۔ اور اس نے کافی توجہ مبذول کر رکھی تھی میں اور مرزا محمد افضل بیگ جناح صاحب سے اُن کے ہاؤس بوٹ میں ملے تاکہ انھیں اس مقدمے کا وکالت نامہ لینے پر مائل کر سکیں۔ یہ میری جناح صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ جناح صاحب نہایت صاف ستھرے انگریزی سوٹ میں ملبوس تھے۔ اگرچہ وہ دبلے پتلے تھے لیکن اُن کی آنکھوں میں ذہانت اور چہرے پر ایک

قدرتی تمکنت موجود تھی۔ وہ ایک خاص آن بان سے بات کرتے اور بہت کم مسکراتے۔ اس لیے اُن کے گھر میں سنجیدگی کا ماحول قائم رہتا۔ بیگ صاحب سے مقدمے کی نوعیت سُن کر انھوں نے ایک ہزار روپیہ فی پیشی فیس طلب کی۔ ہم اتنی بڑی فیس ادا کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور جناح صاحب کو فیس گھٹانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میری پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی ہوگی۔ آپ کو ایک ہزار روپے فی پیشی کے حساب سے فیس دینا ہوگی۔ جب ہی میں وکالت نامہ قبول کر سکوں گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں خیراتی کاموں کے لیے چندہ دے سکتا ہوں لیکن پیشہ ورانہ اصولوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ معاملہ طے کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور وہ پیشی کے دن سرینگر کی عدالت میں وکالت کے جوہر دکھانے کے لیے آ گئے۔ ان کی فاضلانہ بحث سُننے کے لیے کمرۂ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بھی تماشائیوں میں تھا۔ جناح صاحب کی وکیلانہ موشگافیاں رنگ لائیں اور ایک بڑے ہی باریک اور لطیف سے نقطے کی تشریح پر مقدمہ جیت گئے۔ کمال یہ ہے کہ یہ موشگافی اسلامی کیلنڈر سے متعلق ایک نکتے سے متعلق تھی۔

اسی زمانے میں عید میلاد النبیؐ کا جلسہ شاہی مسجد میں ہونے والا تھا۔ ہم نے انھیں ایک نشست کی صدارت پیش کی۔ جو انھوں نے قبول فرمائی۔ اور صدارتی تقریر انگریزی زبان میں فرمائی۔ جناح صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلوب کریں بلکہ ان کو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر اپنے ساتھ چلائیں۔ اُدھر ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور جناح مسلمانوں کو برگشتہ خاطر کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں برٹش انڈیا ایکٹ کے تحت جو انتخابات مختلف صوبوں میں ہوئے اس میں بھی مسلم لیگ نے پہلی بار قابلِ لحاظ کامیابی حاصل کی تھی۔ صوبہ جاتِ متحدہ آگرہ و اودھ یعنی یو۔پی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک انتخابی سمجھوتہ ہوا تھا۔ جب نتیجہ ظاہر ہوا تو کانگریس نے ایک بڑی اکثریت کے ساتھ انتخابات جیت لیے اِس لیے اُس کو حکومت بنانے کے لیے دوسری جماعتوں کے ہاتھ بٹانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اپنی کامیابی کے زعم میں اس نے وزارت میں مسلم لیگ کے شامل ہونے پر کڑی شرطیں عائد کیں۔ جن کے ماننے سے مسلم لیگ نے انکار کیا۔ اور وزارت میں شامل نہ ہوئی۔ اگر کانگریس فراخ دلی اور تدبّر سے کام لیتی اور نواب محمد اسماعیل خان اور چودھری خلیق الزمان جیسے مسلم لیگی لیڈروں کو وزارت میں شامل کرتی تو شاید آج ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن جواہر لال کی بے جا ضد کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم لیگی لیڈروں کو کانگریس پر کوئی بھروسہ نہ رہا اور نہ یہ اعتماد کہ کانگریس کی موجودگی میں وہ کبھی بھی عنانِ اختیار سنبھال سکیں گے۔ چنانچہ اس احساس سے ہندو مسلم تلخی اور بڑھ گئی۔ برطانوی راج کے ساتھ یہ اشتراک زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ اور کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلم لیگ نے اس خوشی میں ملک گیر پیمانے پر ایک یومِ نجات منایا۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی سر سکندر حیات کی قیادت میں برسرِ اقتدار آئی۔ بنگال، سندھ اور آسام میں مسلم لیگی وزارتیں قائم ہوئیں۔ ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ عام مسلمانوں کا رجحان واضح طور پر مسلم لیگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہم کشمیر میں فرقہ وارانہ سیاست کے اس دور کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اگرچہ جموں کے مسلم ملازم طبقہ کے دباؤ کے تحت چودھری غلام عباس نے سیاسی قلابازی کھائی اور انھوں نے پھر مسلم کانفرنس کی احیاءِ نو کا بیڑا اٹھایا۔ اُن کے ساتھ جموں کے کچھ

نوجوان بھی تھے۔ میرواعظ یوسف شاہ کو بھی جنھیں تاریخ کی رفتار نے طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا تھا یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور وہ بھی چودھری عباس کے ساتھ ہو گئے تھا لیا۔ اُنھوں نے ہی حیدرآباد کے مشہور سیاسی رہنما بہادر یار جنگ کو کشمیر مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ نواب صاحب اُردو زبان کے ایک انتہائی طاقتور خطیب تھے۔ اور حیدرآباد کی اتحاد المسلمین کے سربراہ۔ وہ کشمیر تو پہنچ گئے لیکن جب وہ مسلم کانفرنس کے اِجلاس سے خطاب کرنے والے تھے تو حکومت نے اُنھیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کشمیر چھوڑ دینے کا حکم دیا اور اُنھیں تعمیل کرتے ہی بنی۔ یہ صورت ہرگز پسندیدہ نہیں تھی اور ہم کسی طرح اِس کے روادار نہیں تھے۔ لیکن بہادر یار صاحب کے کانوں میں نہ معلوم کس نے کیا بات ڈال دی کہ اُنھوں نے اس کارواں کا سارا اِلزام مجھ پر عائد کر دیا۔ حالانکہ ہمیں اس معاملے سے دور کا سروکار بھی نہیں تھا۔ بہرحال کچھ تو اس واقعے سے اور کچھ اُن بیانات کی وجہ سے جو میں مُسلم لیگ کی سیاست کے خلاف دیتا رہتا تھا مسلم لیگ اور نیشنل کانفرنس کے درمیان غلط فہمیوں کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ میری ہرگز یہ مرضی نہیں تھی کہ ان دو جماعتوں کے درمیان آویزش کا ماحول قائم ہو۔ اور میں نے اسی مقصد سے جناح صاحب کے نام ایک خیرسگالی کا مکتوب بھی روانہ کیا تھا۔ جناح صاحب نے اس کے جواب میں مجھے دہلی آنے اور اُن سے ملاقات کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ موقع پا کر میں نے اُن سے ملنے کے لیے دہلی گیا۔ اس وقت بخشی غلام محمد بھی میرے ساتھ تھے۔ جناح صاحب نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا اور یہ ملاقات دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اُن دنوں وہ اپنی قیام گاہ اورنگ زیب روڈ میں مقیم تھے۔

ہم نے جناح صاحب کے سامنے تحریکِ کشمیر کی تفصیل بیان کی اور جن نشیب و فراز سے ہم گزرے تھے اُن کی ساری روداد اُن کے سامنے رکھی۔ میں نے عرض کی کہ ریاست جموں و کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے جس میں پچاسی فیصدی مُسلمان رہتے ہیں۔ بنابریں معاملات کے متعلق اُن کا نظریہ ایک اکثریت کا ہی ہو سکتا ہے اقلیت کا نہیں اس کے برعکس وہ یعنی جناح صاحب ہندوستان میں ایک اقلیت کی رہنمائی کر رہے ہیں جن کو تحفظات کی ضرورت ہے۔ دوسری بات میں نے یہ بھی کہ تجربے نے ہم پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ بنیادی مسئلہ مختلف مذاہب کی ٹکر کا نہیں ہے بلکہ سماج میں مختلف طبقوں کی اقتصادی نابرابری ہے۔ ایک طرف استحصال کرنے والے ہیں اور دوسری طرف وہ جن کا اِستحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہماری لڑائی شخصیات سے نہیں بلکہ ایک نظام سے ہے اِس میں ہندو اور مُسلمان کی تمیز کرنا کوتاہ اندیشی ہوگی۔ جن اِصلاحات کا ہم کشمیر میں مطالبہ کر رہے ہیں اُن سے سب مذاہب کے پیرو مستفید ہوں گے۔ اِس لیے یہ مقصد ایک مشترکہ جدوجہد سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ مُسلم اقلیت کے ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے جہاں اُن کا فرض ہے کہ وہ اقلیت کے حقوق کی پوری نگہداشت کریں وہاں اُن کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جو علاج وہ اُن کے لیے تجویز کر رہے ہیں کہیں وہ اُنھی کے حق میں سمِ قاتل نہ بن جائے۔ اور مذہب کے نام پر ایک علیحدہ ہوم لینڈ کے لیے جدوجہد بالآخر کہیں اُن کے لیے مفید ہونے کی بجائے مُضر ثابت نہ ہو۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ صرف اکلوتا مذہب ہی پائیدار مملکتوں کی سنگِ بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے اور عناصر کا اشتراک لابدی ہے۔ مثلاً زبان، طرزِ معاشرت، جغرافیائی محلِ وقوع کی مناسبت GEOGRAPHICAL CONTIGUITY، اگر صرف مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں مملکتوں کی بنیاد ڈالنا قبول کیا جائے تو ہندوستان کے مذاہب کی اکثریت اِتنی ہے کہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔ میں نے جناح صاحب سے کہا کہ مملکتیں کبھی مذہب کے نام پر اِستقلال حاصل نہیں کر سکتیں ہیں

نے پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں کی مثالیں دے کر ان کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ اگر مذہب مملکتوں کے استقلال کا بنیادی پتھر ہوتا تو دنیا کی سب سے طاقتور عیسائی سلطنتیں آپس میں دنیا کی سب سے خون ریز جنگیں نہ لڑتیں۔ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اور یہ ملک مذہبی جنگوں کا اکھاڑہ بن کر تباہ ہو جائے گا۔ میں نے جناح صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ پاکستان کا جو نقشہ آپ کے ذہن میں ہے اس کے مطابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل رہے گا۔ اور مذہب کے علاوہ اُن میں اور کوئی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کا جوڑ زیادہ دیر قائم رہنے کی اُمید نہیں ہے۔ باقی رہا مغربی پاکستان تو اس میں بھی کئی قومیں بستی ہیں، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ ان میں بھی چپقلش پیدا ہونے کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ایک اور خطرہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کم از کم تین حصوں میں بٹ جائے گی۔ اور اس کی آواز کی تاثیر گم ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں دو بڑی قوموں کے درمیان منافرت کی خلیج وسیع ہوگی جس کا فائدہ ہندوستان کے مشترکہ دشمن جب چاہیں اُٹھا سکتے ہیں۔ جناح صاحب کچھ بے تابی سے میری باتیں سُنتے رہے اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ اُن باتوں سے خوش نہیں ہوئے لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے کمالِ صبر سے میری ساری گفتگو سنی اور آخر ایک مردِ بزرگ کی طرح فہمائش کے انداز میں کہنے لگے۔

"میں آپ کے باپ کے مانند ہوں۔ اور میں نے سیاست میں اپنے بال سفید کیے ہیں میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کبھی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر اُن کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ وقت آئے گا جب آپ کو

میری بات یاد آئے گی اور آپ افسوس کریں گے۔"

جناح صاحب نے مزید کہا کہ "آپ ایک ایسی قوم پر کیسے اعتبار کر سکتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں سے پانی پینا تک پاپ سمجھتی رہی ہے۔ اُن کے سماج میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ آپ کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔" انھوں نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا کہ "ایک بار بمبئی میں میں اپنی بیوی کے ساتھ میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ نوکر ایک ملاقاتی کا کارڈ اندر لایا۔ یہ مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی کا تھا۔ میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ جب وہ میز پر بیٹھے تو میں نے انھیں کھانے میں شمولیت کی دعوت دی۔ مالوی جی نے یہ کہہ کر انکار کیا "آپ جانتے ہیں کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر آپ کے ساتھ ایک میز پر کھانا نہیں کھا سکتا۔" جناح صاحب بولے کہ میں نے جواب دیا کہ آپ ساتھ ہی دوسری میز لگا کر کچھ کھا لیجیے۔ مگر مالوی جی نے کہا یہ بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ نیچے مشترکہ قالین بچھی ہوئی ہے۔ اور اس کے ذریعے چھوت آ سکتی ہے۔ جناح صاحب نے کہا کہ اس پر میں نے قالین ہٹوا دیا اور مالوی جی کی خدمت میں میوے اور دودھ پیش کیا۔ جناح صاحب نے اس واقعہ کو کافی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا۔ اور مجھ سے سوال کیا کہ جس قوم کے برگزیدہ لیڈروں کا یہ حال ہو وہ آپ کو کیسے جینے دیں گے۔" میں نے جواب میں کہا کہ ہندو سماج میں چھوت چھات کا روگ موجود ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن پڑھے لکھے ہوئے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اس علت سے تنگ ہے اور اس کا علاج کرنا چاہتی ہے۔ خود مہاتما گاندھی ہریجن سدھار اور دوسرے اِصلاحی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اس بیماری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے تمام باشعور اور سمجھ دار ہندوستانیوں کو بلا تمیز مذہب و ملت اس بیماری کو دور کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔ انسان کتنی ہی مہلک بیماری

کا شکار کیوں نہ ہو لیکن ڈاکٹر نہ اُسے زہر دیتا ہے اور نہ اُس کا گلا گھونٹتا ہے اور نہ ہی اُس کے ساتھ تعلق توڑ دیتا ہے بلکہ پیار اور محبت کے ساتھ اُس کے علاج و معالجے میں مُنہمک رہتا ہے میں نے ہنسی ہنسی میں جناح صاحب سے یہ بھی کہا کہ اِس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ آپ ایک بلند پایہ وکیل ہیں۔ لیکن آپ کا کیس ہے کمزور۔ جناح صاحب خفیف سے تبسم کے بعد خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد گفتگو کا رُخ کشمیر کی طرف مُڑا۔ میں نے کہا کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنی تحریک مذہبی بنیادوں پر چلانی چاہیے یا قومی بنیادوں پر اس کا فیصلہ تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ۱۹۳۱ء سے اس کی آبیاری کی ہو۔ اور تحریک کے معاملے میں کسی قسم کی قلابازی کے شکار نہ ہوئے ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ایسے لوگ چاہے مُسلم کانفرنس میں ہوں یا نیشنل کانفرنس میں، معاملہ اُن ہی سے طے کروا لینا چاہیے۔ ایسے رہنماؤں کی فہرست بے شک چودھری غلام عباس (جو اس وقت مسلم کانفرنس کے ساتھ تھے) مُرتب کریں۔ جب یہ فہرست تیار ہو تو آپ (جناح صاحب) خود کشمیر آکر یہ سوال ایسے رہنماؤں کے سامنے پیش کریں اور اُن کی رائے طلب فرمائیں۔ مجھے بھی موقع دیا جائے کہ میں بھی اپنا نقطۂ نظر اُن صاحبان کے سامنے رکھوں۔ اس کے بعد فیصلہ اُن پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اُن کی اکثریت فیصلہ آپ کے حق میں کرتی ہے تو نیشنل کانفرنس کو توڑ دیا جائے گا۔ اور ہم سب مسلم کانفرنس میں شامل ہو جائیں گے۔ جس کی قیادت بلا شُبہ چودھری غلام عباس سنبھالیں۔ لیکن اگر فیصلہ اس کے برعکس ہوا تو چودھری غلام عباس مُسلم کانفرنس توڑ کر اپنے رفقا سمیت نیشنل کانفرنس میں آجائیں جس کی قیادت میں بدستور کرتا رہوں گا۔ جناح صاحب نے سوال کیا کہ اگر فیصلہ مسلم کانفرنس کے حق میں ہوا تو آپ قیادت سے گریز کیوں کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ قیادت وہی کر سکتا ہے جس کا اعتقاد اُس نظریے پر ہو جس پر جماعت چلائی جا رہی ہے۔ اس لیے میں پیرو تو بن

سکتا ہوں لیکن قیادت کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ جناح صاحب نے یہ تجویز پسند کی۔ اور کہا کہ اگر جماعت نے میرے ہی نظریے کو قبول کیا تو وہ اُسے مِلّت کا فیصلہ سمجھیں گے۔ اور مُسلم کانفرنس کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی جماعت توڑ کر آپ کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد ہم نے اُن کے کشمیر آنے کی تاریخ طے کی۔ اس ساری گفتگو میں بخشی غلام محمد بھی موجود تھے۔ لیکن وہ چُپ چاپ ہمارے مکالمے کو سُن رہے تھے۔ اُنھوں نے گفتگو کے دوران اپنی منقار شاید ایک بار بھی نہیں کھولی۔

مئی ۱۹۴۴ء میں جناح صاحب جموں کے راستے سرینگر تشریف لائے۔ لیکن اُن کی آمد سے پہلے ہی مسٹر غضنفر علی اور دوسرے مسلم لیگی لیڈر کشمیر آکر اُن کے دورے کے لیے حالات ہموار کرنے کے لیے یہاں پہنچ چکے تھے۔ میں نے بخشی غلام محمد کو اُن کی اگوائی کے لیے بھیجا تھا۔ جنھوں نے اُن کے ساتھ چودھری غلام عباس اور کچھ اور ساتھی بھی ہو لیے۔ مولوی یوسف شاہ اور اُن کے ہمراہیوں نے قاضی گُنڈ جاکر اُن کا استقبال کیا۔ اُس وقت مولوی یُوسف شاہ کی جماعت اور نیشنل کانفرنس میں کافی کھچاؤ موجود تھا۔ اس لیے راستے میں وہ نیشنل کانفرنسی کارکنوں سے ٹکرائے۔ جناح صاحب نے دوپہر کا کھانا کھنہ بل کے ڈاک بنگلے میں کھایا تو میر واعظ صاحب وغیرہ وہاں بھی رونا لے کر بیٹھے۔ خیر جناح صاحب سرینگر میں وارد ہوئے تو نیشنل کانفرنس نے اُن کا شاندار استقبال کیا اور اس میں ہندو مسلم بھی شامل تھے۔ پرتاپ پارک میں ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا۔ ایک بے بجائے پنڈال پر ماٹو آویزاں رکھے گئے تھے۔ جن پر قومی نعرے اور اقبال کے اشعار مثلاً "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"، جناح صاحب زندہ باد، شیر کشمیر زندہ باد وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ جناح صاحب سٹیج پر میرے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ میں نے خیر مقدم کے کچھ الفاظ کہے۔ اور اُس کے بعد پنڈت جیا لال کلم نے انگریزی میں خطبہ

اِستقبالیہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے اعتراف کیا کہ اُن کا جو اِستقبال کیا گیا اس پر ایک بادشاہ بھی فخر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے مطلب کی بات سے کہاں چوکنے والے تھے۔ تقریر میں ہی کہا کہ اُن کے خیال میں اُن کا استقبال صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس لیے یہ لیگ کے اصولوں کے تئیں استقبال ہے۔ چنانچہ اس بات پر خفا ہو کر پنڈت جیالال کلم اور چند کوتاہ اندیش ساتھی سٹیج سے اُٹھ کر چلے گئے۔ کارروائی کے خاتمے پر وہ ورگن کی طرف چلے جہاں مولوی یوسف شاہ کے حامیوں نے استقبال کی ایک ڈفلی منظم کی تھی۔ لیکن وہ استقبال یونہی سا تھا۔ اس لیے افراتفری کے درمیان ختم ہوگیا۔ اس کے بعد جناح صاحب نشاط کی طرف گئے۔ جہاں مسٹر امجد علی کے پرائیویٹ مکان میں اُن کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اُن کے دورانِ قیام اُن سے مختلف خیالات کے لوگ ملتے رہے۔ میں نے بھی اُن سے کئی ملاقاتیں کیں۔ جب میں نے دہلی کی گفتگو کی سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ وہ چودھری غلام عباس کو حسبِ اقرار رہنماؤں کی فہرست تیار کرنے کے لیے کہیں تو وہ اس اِقرار سے پہلو بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ اصل بات یہ تھی کہ چودھری غلام عباس نے فہرست تو تیار کر لی تھی اور اس میں مولوی یوسف شاہ صاحب کے نام پر قطع لگا کر جناح صاحب سے کہا تھا کہ باقی سب زعما شیخ صاحب کے ساتھ ہیں۔ جناح صاحب نے یہ صورت دیکھی تو دہلی کے قول و قرار سے پہلو بچانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اُنھوں نے البتہ یہ کہا کہ میں چودھری غلام عباس کے ساتھ مل بیٹھ کر باہمی مشاورت سے مسئلے کو سلجھانے کی تدبیر کروں۔ میں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ ایک تو اس سے اِقرار کی خلاف ورزی ہوگی۔ دوسری وجہ میرے انکار کی یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان زعماء نے اِبتدا سے ہی تحریکِ کشمیر میں قربانیاں دی ہیں اور تکالیف کا سامنا کیا ہے لہٰذا کسی اہم فیصلے میں اُن کی رائے ضرور پوچھی

جانی چاہیے۔ وہ ربڑ کی مہریں نہیں کہ جہاں چاہا اُن کا نشان لگا دیا اور ایسا کرنا تو جمہوری طرزِ عمل کا مُنہ چڑھانے کے برابر ہوگا۔ جناح صاحب میری بات کو ٹال گئے اور اِس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے جناح صاحب سے یہ بھی کہا کہ آپ کوہالہ کے پار مسلمانانِ ہند کے مسلّم لیڈر ہیں۔ لیکن آپ کوہالہ کے اِس پار ہمارا جا کی ہمنوائی کرتے رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ فی الحال ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں اور مقامی سیاست سے لاتعلق رہیں۔ جناح صاحب خاموش رہے۔ بعد میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کشمیر آئے جو مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری اور جناح صاحب کے خصوصی معتمد تھے میری اطلاع کے مطابق اُنھوں نے بھی جناح صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مقامی تنازعوں میں مداخلت سے اِجتناب کریں لیکن جناح صاحب کی طبیعت کہاں ماننے والی تھی۔ اب آثار و قرائن سے صاف نظر آرہا تھا کہ جناح صاحب توازن قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔ اور وہ واضح طور مسلم کانفرنس کی پشت پناہی کر کے ہم سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ دنوں میں اُن کی یہ روش اور زیادہ نمایاں ہوگئی اور وہ نیشنل کانفرنس کے خلاف میدان تیار کرنے میں اپنی وکیلانہ صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔ مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے لیے اس سے قبل پونچھ کے مقام کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جناح صاحب کی موجودگی کا فائدہ اُٹھانے کے لیے اسے پونچھ کی بجائے جامع مسجد سرینگر میں بلانے کا اعلان کیا گیا۔ نیشنل کانفرنس کے بہت سارے کارکنوں نے مجھ سے اجازت چاہی کہ وہ اس اجلاس میں جناح صاحب سے برسرِ عام کچھ چبھتے ہوئے سوالات کا جواب طلب کریں گے۔ میں نے اُن کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ وہ اجلاس میں ضرور شمولیت کریں اور صبر و سکون کے ساتھ اُن کے خیالات کو سنیں لیکن ہر حال میں شور و شر سے اِجتناب کریں۔ کیونکہ جناح صاحب مسلمانانِ ہند کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں اور اُن کا ہم پر احترام واجب ہے۔ باقی اگر وہ

کچھ سوالات اٹھاتے ہیں تو میں اُن کا جواب دوسرے دن جلسے میں دوں گا۔ پھر یہاں کے عوام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ حسب پروگرام مسلم کانفرنس کا اجتماع جامع مسجد کے صحن میں ہوا۔ بیس پچیس ہزار لوگوں نے اس میں شمولیت کی جناح صاحب نے اپنی تقریر میں مسلمانانِ کشمیر کو مسلم کانفرنس کا ساتھ دینے کی دعوت دی۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس پر بھی کس کس کے تیر اندازی کی اور کہا کہ نیشنل کانفرنس یہاں کی ہندو اقلیت کو اسی طرح دھوکا دینا چاہتی ہے جس طرح ہندوستان میں کانگریس مسلم اقلیت کو فریب دینا چاہتی ہے۔ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ ہم جن حالات کا مطالبہ کر رہے ہیں اُس کا پچاسی فیصدی فائدہ مسلمانوں کو ملے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دھوکہ ہے جناح صاحب کی منطق کی کاٹ دو دھاری تھی اور وہ ایک تیر سے دو شکار کھیل رہے تھے۔ مسلمانوں کو غیرہ وہ برطانوی ہند کے حالات یاد دلا کر ہم سے بدظن کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اکثریت اور اقلیت کا قضیہ کھڑا کر کے وہ غیر مسلموں کو بھی ہم سے بدظن کرنا چاہتے تھے۔ کمال یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے اُس مشورے کی دھجیاں بھی اُڑا رہے تھے جو انھوں نے سنہ ۱۹۳۵ء میں پتھر مسجد کے جلسے میں ہمیں دیا تھا۔ جلسہ بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے ختم ہو گیا۔ دوسرے دن نواب بازار میں میں نے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جناح صاحب کی تقریر کا جواب دیا۔ میں نے مسلمانوں کے لیے پاکستان کی افادیت کو دلائل کے ذریعہ بے نقاب کیا۔ شہر میں کافی جوش و خروش پھیل گیا۔ اور اس قسم کے کچھ اور جلسے ہوئے۔ جناح صاحب کو ان جلسوں کی اطلاع مل گئی تو وہ کچھ گھبرا سے گئے۔ وہ ایک مقبول نعرے کی علمبرداری پر مسلم عوام کے قائد تو بن گئے تھے لیکن عوام کی سطح پر انھیں کام کرنے اور اُن کا سامنا کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ عوامی سمندر میں جوار بھاٹے سے سہم گئے۔ اور حکومت کے مہمان بن کر لال منڈی کے نزدیک ایک

ہاؤس بوٹ میں فروکش ہو گئے۔ سر بی۔ این۔ راؤ وزیرِ اعظم تھے۔ انھوں نے احتیاطی طور پر دفعہ ۱۴۴ نافذ کرائی اور مجھے جلسوں سے خلاصی مل گئی۔ چودھری غلام عباس کے چھوٹے بھائی چودھری زُبیر بارہمولہ میں بحیثیت اسسٹنٹ انجینئر تعینات تھے۔ عباس صاحب اُن کے پاس ٹھہرنے کے لیے گئے تھے۔ اور وہاں انھوں نے خفیہ طور پر یہ پروگرام طے کیا تھا کہ جناح صاحب کو واپس ہندوستان لوٹنے سے پہلے وہاں ایک استقبالیہ دیں گے۔ ڈیڑھ مہینے سرینگر میں گذارنے کے بعد جب وہ راولپنڈی کی طرف روانہ ہوئے تو بارہمولہ میں اُن کے لیے ایک استقبالیہ جلسے کا پروگرام مسلم کانفرنس نے طے کیا تھا۔ جناح صاحب بارہمولہ کے ایک مقامی پارک میں عوام سے خطاب کرنے لگے۔ تو ہمارے ایک نوجوان اور جوشیلے کارکن محمد مقبول شیروانی نے شیرِ کشمیر زندہ باد اور نیشنل کانفرنس زندہ باد کے نعرے لگائے۔ جناح صاحب یہ صورتِ حال دیکھ کر گھبرا گئے۔ پولیس کی حفاظت میں اپنی کار تک چلے آئے اور سیدھے راولپنڈی کا رُخ اختیار کیا۔ یہ سب معاملات چودھری صاحب نے ایک راز کی طرح چھپائے تھے۔ لہٰذا ہمیں ان کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ہی علم ہوا۔ کشمیر میں جناح صاحب مولوی یوسف شاہ پر بھی برسے تھے۔ چنانچہ اِس کا ماجرا چودھری غلام عباس نے اپنی سرگذشت کشمکش میں یوں بیان کیا ہے۔ "آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ سیاسیات سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور ہم آپ کی اسی طرح عزت کرنے کو تیار ہیں۔ جس طرح انگریز کنٹربری کے بڑے پادری کی کرتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ اُسی کی طرح سیاست سے کنارہ کش رہیں۔" جناح صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہمیں کشمیر میں ایک مُلّا کی نہیں بلکہ لیڈر کی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جناح صاحب اپنے سوا کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ اور اسی لیے کہتے تھے کہ میں نے پاکستان ایک ٹائپ مشین اور ایک سٹینو کی مدد سے بنایا ہے۔ شاید

اُن کے اس اُدھم بیزار رویے کا نتیجہ تھا کہ۔ بقول غالب ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

جن دنوں جناح صاحب کشمیر میں موجود تھے، صوبہ سرحد کے ایک کانگریس رہنما خان عبدالقیوم خان صاحب بھی ان دنوں سرینگر آئے ہوئے تھے۔ تھے تو وہ کشمیری نژاد لیکن بڑے عرصے سے صوبہ سرحد میں بس گئے تھے۔ بیرسٹر تھے اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہوا تھا۔ خان عبدالغفار خان صاحب کی سُرخ پوش تحریک میں شامل تھے۔ لیکن دنوں صوبہ سرحد میں سیاسی فضا بہت گرم تھی۔ اس لیے گرفتاری سے بچنے کے لیے اُنھوں نے سرینگر کی ٹھنڈی فضاؤں کا رُخ اختیار کیا تھا۔ پٹن میں واں گام کے نزدیک اپنی آبائی زمین پر ایک مکان تعمیر کیا تھا اور سرینگر میں وکالت بھی شروع کر دی تھی۔ ہم اُن کو ایک قوم پرست رہنما کے طور پر جانتے تھے۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ اُنھوں نے اندرونی طور پر مسلم لیگ سے ساز باز کر رکھی تھی اور وہ ایک مارِ آستین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالباً وہ آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا اندازہ کر کے پیش بینی اور پیش بندی سے کام لینا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے قدم کشمیر میں جمانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ میں نے کئی بار جناح صاحب کو جن کے پاس وہ اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ اُن کے ذریعہ پیغام بھیجے کہ میرے دل میں اُن کے لیے بے حد عزت اور احترام موجود ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ اُن کے اور ہمارے درمیان کوئی تلخی پیدا ہو۔ پاکستان کا مسئلہ اُن کے فرمودات کے مطابق برطانوی ہند کا مسئلہ ہے، ریاستوں کا نہیں۔ اُنھوں نے خود مسلم کانفرنس والوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ مہاراجا کو کسی صورت میں ناراض نہ کریں۔ بلکہ اُنھوں نے مسلم کانفرنس کو اپنے مغربی طرزِ خیال میں بتایا کہ نعوذ باللہ جس طرح وہ پانچ وقت نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں اُسی طرح اُنھیں مہاراجا زندہ باد کا نعرہ لگانے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے۔ چنانچہ ان حالات میں اُن کے اور ہمارے درمیان ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب پاکستان وجود میں آتا ہے اُس وقت ریاستِ کشمیر کے لیے یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ کیا راستہ اختیار کرے۔ تب تک مسلم لیگ کے زعما کو نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے۔ مسلم لیگ کے زعما ہم سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ اِس کے برعکس کانگریسی رہنماؤں نے ہمارا ساتھ دیا اور تحریک کی آبیاری کی ـــــ قیوم صاحب نے اُن خیالات کو محترم جناح صاحب تک پہنچایا یا نہیں یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن اُن کو پیش بینی اور پیش بندی کے جو عطیات عطا ہوئے تھے اُن کے پیشِ نظر ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک خیالی رقیب کو میدان میں ڈٹے دیکھنا اپنے مفاد کے منافی تصوّر کرتے تھے۔ جو رول ۱۹۴۴ء میں قیوم خان نے ادا کیا اُس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی نظریں کشمیر پر کافی دیر سے لگی ہوئی تھیں۔ جب ۱۹۶۴ء میں میں پاکستان کے دورے پر گیا تو اس کی تائید مارشل ایوب خان نے یہ کہہ کر کر دی کہ۔

"قیوم خان تو کشمیر کا جاگیردار بننا چاہتا تھا۔ تبھی اُس نے قائدِ اعظم کو غلط راستے پر ڈال دیا۔"

قیوم خان کے متعلق سُرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان بھی کسی غلط فہمی میں نہ تھے۔ وہ ہمیشہ اُنھیں شک کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اگر اُن کو کانگریس میں برداشت کیا جاتا تھا تو محض خان عبدالغفار خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی وجہ سے بادشاہ خان کا خیال تھا کہ قیوم خان خود غرض ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوئی بھی پینترا بدلنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے ایسا ہی ثابت کر دیا اور یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اُنھوں نے ۱۹۴۴ء میں جناح صاحب کو ہمارے خلاف کافی پٹی پڑھائی تھی۔ اور چکنی چپڑی باتوں سے اُنھیں غلط فیصلے لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے اپنے قیامِ کشمیر کے دوران مختلف خیالات کے

لوگ جناح صاحب سے ملنے کے لیے جاتے رہے۔ بعض لوگوں نے جب اُن سے مولوی یوسف شاہ کے متعلق رائے پوچھی تو اُنھوں نے انگریزی زبان میں جواباً کہا HE IS A ROTTEN EGG (یعنی وہ ایک گندا انڈہ ہے)"۔ ہمارے ایک رضاکار علی محمد طارق جو ملنے ملانے کے بارے میں بڑے تیز و طرار واقع ہوئے تھے۔ جب اُن سے ملے تو اُنھوں نے جناح صاحب سے پوچھا کہ کیا کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیر کے لوگ ہی کریں گے؟ اِس پر جناح صاحب نے انگریزی میں فقرہ چست کیا "LET THE PECPLE GO"۔ طارق صاحب بھی کہاں نچلے بیٹھنے والے تھے اُنھوں نے اس فقرے کی پانی پی پی کر تشہیر کی جس سے عوام میں جناح صاحب کے متعلق کافی ناراضگی پھیل گئی۔ جناح صاحب کے تعلق سے مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب میں جناح صاحب سے ملنے کے لیے دہلی گیا تو اُنھی دنوں سید قاسم رضوی سے جو حیدرآباد میں رضاکار تحریک کے سربراہ تھے، میری مڈبھیڑ وہاں کے ایک ہوٹل میں ہوئی۔ وہ ایک متاثر کن شخصیت تو رکھتے تھے لیکن میں نے اُنھیں بڑی جذباتی طبیعت کا آدمی پایا۔ میں نے اُنھیں یہ ذہن نشین کرانے کی بڑی کوشش کی کہ اُنھیں جذبات کی بجائے حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہندوستان ایک نازک ترین دور سے گذر رہا ہے اور معمولی سی غلطی بھی بڑے خسارے کا باعث بن سکتی ہے لیکن وہ جذباتیت میں اس قدر اُلجھ چکے تھے کہ میرا کہا سنا اُن کے اوپر سے برسات کے پانی کی طرح بہہ گیا۔ دراصل اُن دنوں ہندوستانی مسلمان ایک اعصابی تشنج کے شکار ہو گئے تھے۔ اُن پر غصہ کرنے کی بجائے اُن سے ہمدردی کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن واقعات کے تیز ریلے میں اِس کی فرصت کس کو تھی؟ مجھے سٹیٹس پیوپلز کانفرنس کے دوران ایک دفعہ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مولانا ترمذی سٹیٹس پیوپلز کانفرنس کے ایک سرکردہ ممبر تھے۔ اور میں اُنہی کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُن دنوں بھی وہاں رضاکار

تحریک کا کافی غلغلہ تھا۔ میں نے وہاں کے چند معززین کو آنے والے حالات سے مطلع کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ حیدرآباد کی ہندو اکثریت سے سمجھوتہ کر کے اس وقت مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند شرائط حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر اُنھوں نے ایسا نہ کیا تو بعد میں آنے والا جمہوریت کا طوفان اُن کو تنکوں کی طرح بہا لے جائے گا۔ لیکن وہاں نظام شاہی کے اقتدار کے متعلق اُنھیں غلط فہمی تھی کہ یہ دراصل اُن کا اقتدار ہے اور دائمی ثابت ہوگا۔ اِس کا خمیازہ اُنھیں ۱۹۴۸ء کے بعد جس بری طرح سے بھگتنا پڑا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ میرے پردہ ذہن پر تازہ ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ سٹیٹس پیوپلز کانفرنس کے سلسلے میں میرا بڑودہ جانے کا اتفاق ہوا۔ سٹیشن پر جوں ہی پہنچا تو وہاں کے کچھ مسلمانوں نے کالی جھنڈیوں سے مظاہرہ کیا اور مجھے کچھ دیر تک کار میں سوار نہیں ہونے دیا۔ تاکہ جو کچھ اناپ شناپ وہ میرے خلاف کہنا چاہتے تھے میں اُس کو سن سکوں۔ میرے استقبال کے لیے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر سٹپٹا گئے اور خاموشی سے مسلم لیگیوں کا یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب مسلم لیگی اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو میں کار میں سوار ہونے لگا۔ اُنھوں نے سارے کالے جھنڈے میری کار میں پھینک دیے۔ شام کو چوک میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں میں نے بڑودہ کے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ جس راستے پر جا رہے ہیں وہ سلامتی اور عافیت کا راستہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کا علاقہ ہندوستان میں ہے اور اگر پاکستان وجود میں بھی آئے جب بھی وہ ہندوستان کا حصہ بنے رہیں گے۔ اگر وہ پاکستان جانا چاہیں تو اول تو اُنھیں اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ دوسرے وہ اپنی املاک، عبادت گاہیں، قبرستان کس طرح کندھے پر اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ اس لیے اُنھیں ہندو بھائیوں کے ساتھ خوشگوار

تعلقات قائم کرنے چاہئیں، اور اس زمین کے ساتھ ہم رنگ بننا چاہیے جہاں وہ رہتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب جلسہ گاہ سے بولے کہ اگر یہاں ہمارے دو مارے جائیں گے تو پاکستان میں اُن کے دس کا گلا کاٹا جائے گا۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ اس جواب میں جذبات کے سوا کچھ نہیں کیونکہ کوئی مُلک اپنے آپ کو دوسرے کی خاطر آگ کی نذر نہیں کرے گا اور نہ آپ کو بچانے کے لیے فوج کشی پر آئے گا۔ جناح صاحب کے متعلق میرے دل میں کوئی ناراضگی نہیں تھی بلکہ میں اُن کا پھر بھی احترام کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی گواہی میری وہ تقریر دیتی ہے جو میں نے قبائلی حملے کے بعد اُس وقت کی، جب میں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ناظم اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ سرکاری افسروں کی پہلی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ "پاکستان ہمارا دشمن نہیں ہے اور جناح صاحب کے لیے ہمارے دلوں میں وہی احترام ہے جو پہلے تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کا جھگڑا بات چیت سے طے ہو اور اگر اس غرض کے لیے مجھے جناح صاحب سے ملنے کے لیے کراچی بھی جانا پڑے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔" لیکن جناح صاحب اُس وقت طاقت کے نشے میں مخمور تھے۔ انھوں نے ایک بے سلاح و سامان قوم سے بات چیت کرنے کو اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھا۔ لیکن طاقت کی یہ مساوات جب اُن کے خلاف ہوگئی تو وہ ہڑبڑا کر چونک اٹھے مگر اُس وقت سانپ نکل گیا تھا اور صرف لکیر باقی رہ گئی تھی۔

بہرحال بات جناح صاحب کے دورۂ کشمیر کی ہو رہی تھی وہ کشمیر سے چلے گئے اور ایک تلخ اور کڑوے انسان کی طرح چلے گئے۔ اس کے بعد جو تقدیر ساز واقعات پیش آنے والے تھے اُن میں جناح صاحب کے مزاج کی اس کڑواہٹ کا بڑا زبردست حصہ تھا۔ انھوں نے پھر کبھی مڑ کے نہیں دیکھا اور نیشنل کانفرنس اور اس کے زعما کے خلاف دل میں رنجش برقرار رکھی اس کے جو خطرناک اور المناک نتائج برآمد ہوئے اُن

کا علم تاریخ کے ہر طالب علم کو ہے۔ جناح صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری دن انھوں نے بڑی کشمکش اور بےزاری میں گذارے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کے ذہن میں اُس وقت کشمیر ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور اس کھٹک کی بنیاد اُن کے نادان دوستوں نے ۱۹۴۴ء کے وسط میں اُن کے قیام سرینگر میں ڈال دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے آخری لمحوں میں اس کانٹے کی خلش انھیں ضرور بےقرار کر رہی ہوگی۔ کشمیر کی گتھی کے بہت سے پیچ و خم جناح صاحب مرحوم کی بے لچک طبیعت اور اُن کی غیر جمہوری افتادِ طبع سے جڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ذاتی طور وہ ایک بڑی صاف ستھری شخصیت کے مالک تھے اور اُن کے کردار کی صلابت و دیانت INTEGRITY کو اُن کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ تاریخ اُن کی سیاسی بصیرت کے بارے میں بہرحال آخری منصف ہے۔ خدائے بزرگ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ع

نے گوہ کنے ماند و نہ مجنوں صفتے

▲▲▲

۳۱

ہزار دام سے نکلے ہیں...*

گوپالا سوامی آئینگر کے چلے جانے کے بعد بی۔ این۔ راؤ آگئے تو فضا میں عوامی تحریک کا غلغلہ تھا۔ مہاراجا ہری سنگھ آنے والے طوفان کا اندازہ تو کرتے تھے لیکن وہ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کے سہارے تیرنے سے ناامید نہیں ہوئے تھے۔ عوامی تحریک کی دھار کو کند کرنے کے لیے انھوں نے دوعملی (DIARCHY) کے ہتھیار کو آزمانے کی ٹھان لی۔ یعنی انھوں نے اپنی کابینہ میں دو عوامی وزیروں کو شامل کرنے کا اعلان کیا۔ دراصل یہ خیال سر تیج بہادر سپرو کے ذہن کی اُپج تھا۔ سر تیج کشمیری الاصل تھے اور اُن کا سپروؤں کی اُسی شاخ سے تعلق تھا جس شاخ سے علامہ اقبال نسبت رکھتے تھے۔ سر تیج فارسی اور اُردو کے ایک جید عالم تھے۔ اور اُردو کو اُس کے حقوق دلانے کی جدوجہد میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ آئینی ماہر اور قانون دان تھے اور اُن کی قانونی بصیرت کا سارے ملک میں ڈنکا بج رہا تھا۔ وہ بہت سے والیانِ ریاست کو آئینی اور قانونی مشورے دیا کرتے تھے۔ کشمیر دربار سے بھی اُن کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ اور مہاراجا اکثر اُن سے آئینی اور قانونی معاملات سے متعلق

* پورا شعر یوں ہے:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

رجوع کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ وزارت میں عوامی نمائندے شامل کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا اور مہاراجا نے ان کی صائب رائے کے وزن و وقار کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ ہمارے ذمہ دار نظامِ حکومت کے مطالبے سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں تھا۔ لیکن ہم نے مہاراجا کی اس پیش کش کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مہاراجا نے جموں سے وزیر گنگا رام کو اور کشمیر سے نیشنل کانفرنس کے نمائندے مرزا محمد افضل بیگ کو کابینہ میں مقرر کیا۔ وزیر گنگا رام کو وزارتِ داخلہ اور تعلیم اور بیگ صاحب کو محکمہ تعمیرات کا قلمدان تفویض کیا گیا۔ اگرچہ بیگ صاحب سچے معنوں میں عوامی نمائندے تھے لیکن اُن کے مقابلے میں وزیر گنگا رام جو اُن سے کم پڑھے لکھے تھے اور کم لیاقت کے مالک تھے، کو زیادہ اہم قلمدان دیا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس اقدام کے پیچھے خلوصِ نیت نہیں بلکہ ڈپلومیسی کام کر رہی تھی۔ حکومت کے وزراء کو اُس وقت تک ڈھائی ہزار روپے کا ماہانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ لیکن عوامی وزیروں کے لیے صرف سولہ سو روپے ماہانہ مقرر کیے گئے۔ اس کے باوجود بیگ صاحب کام کرتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے کچھ عوامی بہبود کے کاموں کی طرف توجہ مبذول کرائی تو حکومت نے رقومات کی کمی کا بہانہ کر دیا۔ کابینہ کے پانچ ممبران میں اُن کی آواز اکیلی تھی۔ بیگ صاحب کی موجودگی بالکل بے معنی بن گئی۔ بیگ صاحب اس صورتِ حال سے برابر مجھے اور جماعت کو مطلع کرتے رہے اور انھوں نے ایک مرحلے پر کہا۔ چونکہ وہ عوام کی بہبود کے کاموں میں کوئی موثر امداد نہیں کر سکتے اور وہ جان چکے ہیں کہ عوام کی اقتدار میں شرکت کا یہ تجربہ محض ڈھکوسلا ہے اس لیے اُن کو استعفیٰ دینے کی اجازت دی جائے۔ جماعت نے اس معاملے پر غور کیا اور وہ بھی اس نتیجے پر پہنچی کہ بیگ صاحب کو کابینہ سے قطع تعلق کرنا چاہیے۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد ہی مارچ [illegible] میں بیگ صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ وزیر گنگا رام نام کو ہی عوامی وزیر تھے۔ لیکن دل

سے مہاراجا کے حلقہ بگوش تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اُن کو بھی مستعفی ہونا پڑا۔

اُدھر حکومت ہماری پیٹھ پیچھے ایک سازش کے تانے بانے تیار کر رہی تھی میاں احمد یار خاں ہماری اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے۔ ان کی کوئی عوامی اساس نہ تھی۔ لیکن ہم نے اُن کی تعلیم کے پیشِ نظر اُنھیں یہ مرتبہ دیا تھا۔ میں نے اُنھیں سرینگر کی ایک اسمبلی نشست سے منتخب کروایا۔ جبکہ ہمارے پاس مقامی لیڈروں کی ایک بڑی قطار موجود تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ہم فراخدلی کا مظاہرہ کر کے ایک کشمیری زبان نہ بولنے والے کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دے رہے تھے۔ احمد یار صاحب کشمیریوں سے بہت کم ارتباط رکھتے تھے بلکہ پہلے پہل تو وہ ڈوگرہ سبھا کے ممبر تھے اور اپنے آپ کو احمد یار خان ڈوگرہ کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بیگ صاحب کو ہم نے اُن کی قومی خدمات کے علاوہ اُن کی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے بھی کابینہ کے لیے چُنا تھا۔ اس کے علاوہ احمد یار خان کے برعکس وہ ایک کشمیری بولنے والے شخص تھے اور کشمیر کی نمائندگی کے اہل اور حقدار تھے۔ لیکن احمد یار خان کو یہ فیصلہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ وہ اندر ہی اندر لیلائے وزارت سے ہم کنار ہونے کے لیے کانٹوں کے بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ جب ہم نے بیگ صاحب کو واپس بُلا لیا۔ احمد یار خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس چھوڑی ہوئی ہڈی کو منہ میں ڈال کر چبانے لگے اور پارٹی کو دغا دے کر وزارت میں شامل ہو گئے۔ احمد یار خان کو گانٹھنے کا یہ معرکہ رام چندر کاک نے سرانجام دیا تھا۔ یہ پنڈت صاحب ایک لائبریرین کے معمولی عہدے پھلانگتے ملازمت میں شامل ہوئے تھے۔ مگر اپنی زمانہ سازی، نمک حلالی اور چاپلوسی کے بل بوتے پر مہاراجا کے اندرونی ایوانوں میں گھس آئے تھے۔ پہلے یہ ریاست کے چیف سکریٹری بنے۔ پھر وزیرِ حضوری اور آخر میں وزیرِ اعظم۔ جب وزیرِ اعظم بنے تو ہم نے اس پر خوشنودی ظاہر کی کہ ایک کشمیری کو پہلی بار ڈوگرہ مہاراجوں نے اس منصب

کے لیے چُنا ہے۔ لیکن کاک صاحب نے جلد ہی اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ کشمیریوں کو کچلنے کے لیے بدترین ہتھکنڈوں پر اُتر آنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے اور اسی لیے مہاراجا کی نظرِ انتخاب اُن پر پڑی تھی۔ لیکن پھر یہ منہ کے بل تاریخ کے اندھے کنوئیں میں گر گئے اور اُن کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ احمد یار کی غداری کے خلاف سارے کشمیر میں ہاہاکار مچ گئی اور حکومت کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت ہی کشیدہ ہو گئے۔ بعد میں احمد یار خان کو وزارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اور وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ جہاں وہ ایک حسرت ناک اور گمنام آدمی کی حیثیت سے رحلت کر گئے۔ ع

دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اُدھر مقاصد کی ہم آہنگی ہمیں کشاں کشاں انڈین نیشنل کانگریس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ کانگریسی لیڈر ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی کر رہے تھے۔ اور بدلے میں بظاہر کچھ بھی نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ ہمارے ریاستی ہندو دوستوں میں سے بہتوں کو کانگریسی لیڈروں کا ہمارے ساتھ یہ التفات ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ ہمارے تعلقات جواہر لال نہرو اور دیگر کانگریسی زعما کے ساتھ روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت ریاستوں کے معاملات میں براہِ راست دخل نہیں دینا چاہتی تھی۔ لیکن ریاستوں میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ اُس کی ہمدردی ضرور تھی۔ اور وہ اُن کے حالات کو بہتر بنانے کی دِل سے خواہشمند تھی۔ جہاں مسلم لیگی لیڈر ذہنی طور پر والیانِ ریاست کے نزدیک تھے اور عوامی لیڈروں کے ساتھ رعونت اور روکھے پن سے پیش آتے تھے وہاں کانگریسی لیڈر حکمتِ عملی کے طور پر ہی سہی، بالیقین طور پر عوامی رہنماؤں کے زیادہ قریب تھے اور اپنے حُسنِ اخلاق اور ملنساری سے اُن کا دل جیتنے میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے ریاستوں کی گتھی کو سلجھانے کے لیے ایک الگ جماعت سٹیٹس

پیپلز کانفرنس اپنی چھتر چھایا میں قائم کی تھی جس کے روحِ رواں جواہر لال نہرو تھے۔ اگرچہ مسلم لیگ نے بھی دیکھا دیکھی آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ قائم کی تھی لیکن نقل را چہ عقل وہ ہمیشہ فائلوں تک ہی محدود رہی۔ کانگریس نے ریاستوں کے معاملے میں جو رویہ اپنایا تھا اُس سے ریاستی عوام متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنی اپنی ریاستوں میں پرجا منڈلوں کے نام سے جماعتیں قائم کی تھیں جو کسی نہ کسی رنگ میں عوام کو بیدار کرنے کی کوششوں میں لگی تھیں۔ یہ سب پرجا منڈل آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کی شاخیں بن گئے۔ نیشنل کانفرنس کو بھی اس جماعت میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ لدھیانہ کانفرنس میں نیشنل کانفرنس کے وفد کی شرکت کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ میں چونکہ محبوس جیل میں تھا۔ اس لیے میری شرکت تو ممکن نہ ہو سکی لیکن اس اجلاس میں بڑے زور و شور سے میری رہائی کا مطالبہ ہوا اور پنڈت جی نے بہ حیثیتِ صدرِ کانفرنس میرے اور تحریکِ کشمیر کے حق میں ایک زوردار تقریر فرمائی۔ بعد میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے ساتھ ہمارے تعلقات اور بڑھتے گئے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ اس کا بوجھ میرے ہی کاندھوں پر آن پڑا۔ مجھے پہلے اس کانفرنس کا نائب صدر اور پھر صدر منتخب کر لیا گیا۔ جواہر لال نہرو کانگریس کے معاملات میں کافی مصروف رہتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے ریاستوں کے معاملات میں مجھ پر ہی انحصار کرنا شروع کیا۔ میں نے ریاستوں کے کئی دورے کیے اور ریاستوں کی تحریکِ آزادی کو شیرازہ بند کرنے اور سرگرم بنانے کے لیے مجھے کافی جستجو اور تگ و دو سے کام لینا پڑا۔

اس سے قبل تری پورہ اور رام گڑھ میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے اور ہمیں خاص دعوت پر وہاں بُلایا گیا۔ ہم نے ان اجلاسوں میں شرکت کی۔ تری پورہ کے اجلاس میں ہماری ملاقات نیتاجی سبھاش چندر بوس سے ہوئی۔ وہ بھی کشمیر کے معاملات سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اُنھوں نے ہماری تحریک کے غیر فرقہ وارانہ رول کو کافی سراہا۔ اِن اجلاسوں میں ہمارے تعلقات کانگریس اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ذاتی اور جماعتی سطح پر اور اُستوار ہوئے اور ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔

حکومت کا رویہ بھی عجیب تھا۔ مہاراجا ہری سنگھ اپنے آپ کو کانگریسی لیڈروں کے قریب بتاتے تھے۔ لیکن جوں جوں کانگریس کے ساتھ ہمارے تعلقات بڑھتے جارہے تھے ان کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اُن کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ہم سیکولر سیاست کو اپنا رہے تھے۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ کانگریس کے ہی مخالف بن گئے اُنھیں اپنی گدی کی حفاظت اِسی بات میں نظر آئی کہ ہندو اور مسلمان کو آپس میں دست و گریباں رکھا جائے۔ حالات کے متعلق ہماری تشخیص درست ثابت ہو رہی تھی چنانچہ مہاراجا انہی لوگوں پر اعتماد کرنے لگا جو مسلم کانفرنس کے قریب تر تھے۔ گوپالا سوامی آئینگر کو جس طرح برخواست کیا گیا اس سے مہاراجا کی اسی ذہنیت کی غمازی ہوتی۔ آئینگر مدراس کی سول سروس کے ایک اعلیٰ عہدیدار رہے تھے۔ تھے تو وہ مہاراجا اور اُن کے نظام کے ہی وفادار لیکن اُن کے خیالات جنوبی ہند کے اکثر مدبروں کی طرح قوم پرستانہ تھے اور انتظامیہ کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے اُن کا عہدِ وزارت کوئی بہت قابلِ ذکر یا کارساز EVENTFUL نہیں رہا۔ میری اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلے پہلے تو وہ ہم پر خوب گرجے اور برسے لیکن آخر میں وہ سمجھ چکے تھے کہ اگر کوئی جماعت ریاست میں بامقصد سیاسی کردار ادا کر سکتی ہے تو وہ نیشنل کانفرنس ہے۔ اس لیے جب بھی وہ مجھ سے ملتے تھے عزت و احترام سے پیش آتے تھے اور ہمارے ذاتی تعلقات بڑے اچھے تھے۔ جب مہاراجا نے اچانک اُن کو چلتا کر دیا تو اُنھیں کافی صدمہ ہوا۔ میرے اُن کے ساتھ جو تعلقات اس دور میں اُستوار ہوئے تھے اُن کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آزاد ہندوستان میں پنڈت

جواہر لال نہرو نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالی تو گوپالا سوامی آئنگر نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انھیں جواہر لال نہرو سے متعارف کراؤں چنانچہ میں نے انھیں جواہر لال نہرو سے ملایا۔ اور دورانِ ملاقات اُن کی قابلیت کا بھی ذکر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں جواہر لال نے انھیں اپنی کابینہ میں شامل کر لیا اور پھر ایک وقت تو وہ مرکزی وزیرِ داخلہ بھی ہو گئے۔

گوپالا سوامی آئنگر کے چلے جانے کے بعد سر بی۔ این۔ راؤ کو وزارتِ عظمیٰ کے لیے چنا گیا۔ وہ میسور کے رہنے والے تھے اور بہت شریف الطبع انسان تھے۔ اُن کا شمار اعلیٰ درجے کے ماہرینِ قانون میں ہوتا تھا اور آزادی کے بعد اُنھوں نے اپنی قابلیت کا سکہ بین الاقوامی اداروں میں بھی بٹھایا۔ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے رہے۔ اُن کے ہی وقت میں ریاست کی کابینہ میں دو عوامی وزیر شامل ہوئے۔ جب تک راؤ صاحب رہے معاملہ ٹھیک ہی چلتا رہا۔ لیکن جب اُن کو رخصت کر کے رام چندر کاک کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تو یہ ناؤ بھنور میں پھنس گئی اور بیگ صاحب کو مستعفی ہونا پڑا۔ رام چندر کاک نے نیشنل کانفرنس دشمنی اور مسلم کانفرنس نوازی کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور آزادی کے بعد یہی پالیسی مرکز میں رام چند کاک کی ذہنیت کے حامیوں نے چلائی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

جولائی ۱۹۴۵ء میں کانگریس کے سرکردہ لیڈر جیلوں سے رہا کیے گئے تو اُنھوں نے اپنی بگڑی ہوئی صحت بنانے کے لیے کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور حسین چمن زاروں کا رخ کیا۔ ہم نے سرینگر میں ان کے استقبال کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یکم اگست کو جب جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، خان عبدالصمد خان اچکزئی، میاں افتخار الدین، مسٹر آصف علی وغیرہ کشمیر تشریف لائے تو ہم نے چھتہ بل سے امیرا کدل تک اُن کا دریائی جلوس نکالا۔ دریائی جلوس کا یہ طریقہ کشمیر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور سلطان زین العابدین بڈشاہ کے وقت سے اس کی روایات ملتی ہیں۔ دریا کو رنگ برنگے بھڑک دار پارچہ جات سے سجایا جاتا ہے۔ اور کناروں پر واقع مکانات کے دریچوں اور بارہ دریوں سے لوگ اپنے بیش قیمت اور رنگین قالین، نمدے، ریشمی کپڑے وغیرہ لٹکاتے ہیں۔ پھر خوبصورت آراستہ پیراستہ کشتیوں جنھیں پرندے کہا جاتا ہے کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ انھیں خوبصورت وردیاں پہنے ہوئے ملاح چلاتے ہیں۔ اُن کے ساتھ دوسری کشتیوں میں بینڈ باجے اور بھانڈ وغیرہ ہوتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر مرد و زن اور بچے اپنے رنگ برنگے لباسوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ شہر کی ساری آبادی کنارۂ آب پر آ گئی ہے۔ ایک ایسا سماں بن جاتا ہے جس کی دنیا بھر میں شاید کوئی نظیر نہ ہو۔ ہم نے اِن رہنماؤں کا دریائی جلوس نکالا اور انھیں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا۔ جلوس کے انتظامات کی نگرانی نیشنل کانفرنس کی رضاکار کور کے سالار بخشی غلام محمد کر رہے تھے۔ راستے میں میر واعظ کے حامیوں نے زینہ کدل کے قریب رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی اور بدتمیزی کا بھی مظاہرہ کیا لیکن لوگوں کا اس قدر جوش و خروش تھا کہ گڑبڑ کرنے والے اپنی بدذوقی کے مظاہرے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ بے شک کاک شاہی اُن کی پیٹھ ٹھونک رہی تھی اور وہ سنگ باری اور فحاشی جیسے ہتھکنڈوں پر اُتر آئے تھے لیکن عوام نے اُن کا جواب متانت اور وقار سے دیا۔ اس مظاہرے کی پشت پر کون تھا اس کا اعتراف حکومت نے اپنی سرکاری رپورٹ میں یوں کیا: "مسلم کانفرنس کے حامیوں نے عالی کدل اور زینہ کدل کے درمیان جلوس پر پتھر پھینکے جس کے نتیجے میں بے شمار لوگ زخمی اور ایک شخص ہلاک ہو گیا۔" یہ مظاہرہ اس قدر تہذیب سے گرا ہوا تھا کہ مسٹر جناح نے وائسرائے کو ایک خط لکھ کر اس کی تحقیقات کا مطالبہ

کیا اور ہم نے مسٹر جناح کے اس مطالبے کی حمایت کی۔ لیکن کچھ ہونا تھا نہ ہوا۔ شام کو حضوری باغ میں ایک شاندار استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے صدر نیشنل کانفرنس کی حیثیت سے صدر انڈین نیشنل کانگریس مولانا ابو الکلام آزاد کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ مولانا کے علم و فضل اور ان کی قربانیوں کا ذکر کرنے کے بعد اس خطبے میں میں نے وقت کے اہم مسائل کو ابھارا اور اس میں سب سے زیادہ زور ہندوستان کی قومیتوں کے حق خود ارادیت پر دیا۔ جو لوگ نیشنل کانفرنس پر یہ الزام عائد کرتے رہتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کانگریس کی اندھی تقلید کر رہی ہے، ان کے لیے اس خطبے پر نظر ڈالنا نہایت مفید ثابت ہوگا کیونکہ ہم نے کانگریسی رہنماؤں کی اس کہکشاں سے جو حضوری باغ کے سٹیج پر موجود تھی۔ برملا طور پر مسلم لیگ کے جائز مطالبات کی طرف توجہ دینے کی اپیل کی۔ خطبے کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"ہم اس حقیقت کا عرفان رکھتے ہیں کہ متحدہ و متفق عوام ہی مطلوبہ طاقت کو غاصب کے ہاتھوں سے چھین سکتے ہیں اور ملک کو آزادی دلا سکتے ہیں۔ ہماری مراد یہ ہے کہ آزادی کے مشترک سوال پر تمام فرقوں کے درمیان اتحاد ہو۔ حضرت مولانا صاحب! ہم آپ سے تخاطب کا شرف حاصل کرتے وقت اپنا دل کھول کر نیشنل کانگریس کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور صریح الفاظ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اتحاد کے لیے نہ صرف از سر نو سلسلہ جنبانی ایک لابدی امر ہے بلکہ اس تمام سلسلے پر نئی تدبیروں سے فوری اور دور رس اقدامات وقت کی اولین ضرورت ہے۔ آزادی ہند کے سوال کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہم اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ کانگریس کی سرفروشیوں اور قربانیوں، اس کے مسلمہ رہنماؤں کی بے نظیر رفعت اور مجردگی اور مسلم عوام کے لیے ناقابل انکار جذبۂ آزادی کی موجودگی

میں کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی جزوی طور پر ہی نیشنل کانگریس کے دائرے میں شامل ہوتے ہیں؟ ہم اس امر میں یقین رکھتے ہیں کہ حالات کی موجودہ صورت تبدیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ امر جناب والا کے فرائض میں شامل ہے کہ مسلم لیگ اور دوسری مسلم تنظیموں کے طریقۂ کار کا جائزہ لیں اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے مطابق ان میں درست اور منصفانہ باتوں کو قبول فرمائیں۔ اچھائی کسی بھی منبع سے کیوں نہ آئے بے تردد اس کو قبول کرنا اولوالعزمی تصور ہوتی ہے۔ غلبۂ اکثریت کے کچھ خدشات ہیں جو مسلم عوام کے قلوب پر مسلط ہیں۔ اگر انھیں اصول خود ارادیت سے دور کیا جا سکتا ہے اور اگر اس اصول کو مان لینے سے آزادی کے لیے بیدار شدہ عوام کی بھاری طاقت کی تائید قومی محاذ کو حاصل ہو سکتی ہے تو یہ مسئلہ نیشنل کانگریس کے ایجنڈا میں سر فہرست ہونا چاہیے۔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس نے حق خود ارادیت کا اصول کشمیر کی سب قومیتوں کے لیے عقیدے کے محدود دائرے کے لحاظ سے نہیں بلکہ کلچر اور تہذیب کے وسیع مفہوم کے لحاظ سے قبول کر لیا ہے اور اس یقین کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے اختیار کردہ آئین نیا کشمیر کی تمہید میں نمایاں مقام دیا گیا ہے۔"

مولانا آزاد کی صحت قلعۂ احمد نگر کی اسیری میں غارت ہو چکی تھی۔ انھیں اس دوران اپنی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم کی موت کے صدمے سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا اور ظالم انگریزوں نے انھیں آخر وقت پر بھی ان سے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی۔ مولانا نے اپنے آسمان وقار شعار کی وجہ سے آہ تک نہ کی تھی مگر ان کے چہرے بشرے سے ظاہر تھا کہ ان کی جسمانی صحت اس صدمے سے سخت متاثر ہوئی ہے۔ انھوں نے جلسے میں اپنی نحیف آواز میں کہا کہ "میں یہاں اپنی متاع گم گشتہ یعنی کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں آیا ہوں اور امید ہے

کہ آپ مجھے اپنے خوبصورت وطن میں چند ہفتے تنہائی اور سکون سے بسر کرنے دیں گے البتہ ایک چھوٹا سا پیغام دیتا ہوں کہ اس میں آپ کو بصیرت کے دفتر ملیں گے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا۔

"قدرت نے اس ملک کو شیخ عبداللہ کی شکل میں ایک قابل اور مقتدر رہنما دیا ہے۔ شیخ صاحب اور اُن کے رفقاء نے آپ کی درست رہنمائی کی ہے۔ میں آپ سے کہوں گا کہ آپ شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں پر اعتماد رکھیں اور اُن کا ساتھ دیں۔ اگر آپ اُن کی رہنمائی پر استقلال سے کاربند رہیں گے تو وہ وقت قریب ہے کہ اُن کی قیادت میں آزادی حاصل کریں گے۔ کامیابی آپ کو تلاش نہیں کرنا پڑے گی بلکہ کامیابی آپ کی تلاش میں ہوگی اور آپ کے قدم چومے گی۔"

اس جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا، "میرا ذکر مہمان کے طور پر ہوا ہے حالانکہ مجھے کشمیری ہونے کا فخر حاصل ہے۔ کشمیریت میرے خون میں میرے رگ و ریشے میں اور میرے دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے۔"

جلسے میں خان عبدالغفار خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا، "شیخ محمد عبداللہ کشمیریوں کے لیے خداداد تحفہ ہے۔ اگر آپ اُس کی پیروی نہ کریں گے تو آپ خسارے میں رہیں گے۔"

نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کچھ ہی دنوں کے بعد سوپور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت میں نے کی۔ زندہ دلانِ سوپور نے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور کوششیں کی تھیں۔ اپنی کارروائی، مباحث اور فیصلوں کے اعتبار سے یہ اجلاس ہماری تحریک کا ایک انتہائی اہم پڑاؤ ثابت ہوا۔ پہلی بار نیشنل کانفرنس کے کسی اجلاس میں ریاست

بھر کے ڈیلی گیٹوں اور نمائندوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت شمولیت کی تھی اور یہ بھی ہوا کہ اس میں پہلی بار کانگریس کے اعلیٰ ترین رہنماؤں نے شرکت کی۔ مولانا آزاد تو اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر گلمرگ میں فروکش ہو گئے تھے۔ لیکن جواہر لال، بادشاہ خان، میاں افتخار الدین، عبدالصمد خان اچکزئی، مسز اندرا گاندھی (جو ان دنوں سیاست سے دور ہی تھیں لیکن جواہر لال کی لاڈلی بیٹی کی حیثیت سے اُن کے ساتھ رہتی تھیں۔) وغیرہ اہم شخصیات اس اجلاس کی خصوصی مہمان تھیں۔ اس اجلاس میں حق خود ارادیت کی قرارداد پاس کی گئی جو ہندوستان کی تمام جماعتوں کے لیے مشعلِ راہ تھی اور ہندوستان کے سیاسی تناظر میں اولیت کا شرف رکھتی تھی۔ اس قرارداد کی تائید میں جواہر لال نہرو نے بھی تقریر کی۔ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں ازراہِ کرم یہ بھی کہا کہ "کشمیری بھائیو! شیخ محمد عبداللہ نے تمھیں نئی زندگی دی ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں ایسا لیڈر دیا جو تمھارے لیے دنیا کی کسی بھی طاقت سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے تمھیں جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن اس کی کوششوں سے تم آج پھر انسانوں کے روپ میں نظر آرہے ہو۔ میں نے یہاں آکر وادیوں میں، دیہات میں غرض جہاں کہیں بھی گیا "شیر کشمیر زندہ باد" کا نعرہ سنا۔ اور جب سیدھے سادے دیہاتی ان کا ذکر محبت سے کرتے ہیں تو اُس وقت آپ کے محبوب رہنما کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے اور دلوں پر اُن کی شخصیت کا اثر ہوتا ہے۔ یہ تمام ریاستی باشندوں اور آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے نازک موقع پر آپ کو ایسا رہنما ملا ہے۔" جواہر لال نے اپنی تقریر میں کشمیری پنڈتوں کی نکتہ چینی کا دائرہ سوپور اجلاس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ کچھ دنوں کے بعد انھیں شیتل ناتھ میں پنڈتوں نے بطورِ مہمانِ خصوصی بلایا تو انھوں نے وہاں پر بھی انھیں جلی کٹی سنائی۔ آپ نے شدھ ہندی میں پیش کیے گئے پنڈت جیا لال کلم کے سپاسنامے

کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ نعرہ بازی اور دھرم اور سنسکرتی کے بیتے گزرے واقعات سے چمٹے رہنا کسی قوم کی روشن خیالی کی دلیل نہیں ہے۔ گری ہوئی قوموں کو تہذیب کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کشمیری پنڈت قوم نے اپنی سیاست نوکریوں تک محدود رکھی ہے جو اس قوم کے گرنے کی علامت ہے۔ تنگ خیالی اور تنگ نظری نے اس قوم کو گھیر رکھا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی سیاست بہت فرسودہ اور رجعت پسندانہ ہے آپ کو خلوص دل سے نیشنل کانفرنس میں شامل ہونا چاہیے۔"

پنڈت جی اس کے بعد میرے ہمراہ کئی پہاڑی مقامات کی سیر کو گئے۔ انھیں کوہ پیمائی کا عجیب شوق تھا اور اِس سلسلے میں وہ مشکلات اور تکلیفوں کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ اُدھر رام چند کاک ان کے ہمارے ساتھ اِلتفات کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ انہی دنوں جب ہم جنوبی کشمیر کے مشہور پہاڑی چشمے کونسر ناگ جانے کے لیے شوپیان سے ہوکر گئے۔ تو کاک صاحب نے وہاں اس خیال سے کہ لوگ پنڈت جی کا استقبال نہ کریں۔ دفعہ ۱۴۴ لگا دی تھی۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے اور جواہر لال کو جلوس کی شکل میں لے جایا گیا۔ میں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "حکومت ہمارے مہمانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کر رہی ہے۔ وہ ایک مہذب سرکار کے شایانِ شان نہیں، لیکن اِس وقت تک، جب تک کہ یہ مہمان ہمارے درمیان ہیں، ہم اِن اشتعال انگیزیوں کو نظر انداز کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ کون کتنا بل رکھتا ہے۔"

▲ ▲ ▲

(۳۲)

افراد اور اقوام

فنِ تاریخ میں افراد اور واقعات کے باہمی تعلق پر کافی خامہ فرسائی ہوئی ہے اور یہ مسئلہ ہنوز کشمکش اور تضاد آرائی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ افراد دراصل قوموں کی تواریخ بناتے ہیں اور تواریخ اُن کے بازیچے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ افراد دراصل تو تاریخی قوتوں کا مُہرہ ہوتے ہیں۔ اُن کے رول میں اُن کی منشا سے زیادہ تاریخ کے دھارے کے رُخ کا دخل رہتا ہے۔ میرے خیال میں سچائی اُن دو انتہاؤں کے درمیان کسی جگہ واقع ہے۔ تاریخی قوتوں کی موافق اور سازگار ہوا کے بغیر افراد بڑے کارناموں کا الاؤ روشن نہیں کر سکتے لیکن افراد کا اِمتیاز اس میں ہے کہ وہ اپنی خودی اور جوشِ عمل کے زور سے تاریخی قوتوں کی رفتار تیز کرتے ہیں اور اُن کی سمت کا بھی تعین کرتے ہیں۔ یہ بات سکندرِ اعظم کے لیے بھی صحیح ہے اور لینن کے بارے میں بھی۔ کارل مارکس کا خیال تھا کہ کمیونسٹ انقلاب کے لیے یورپ کے ممالک میں سے جرمنی میں سب سے زیادہ موافق حالات ہیں اور روس میں سب سے ناموافق لیکن لینن کی عہد ساز ہستی نے اس خیال کو غلط ثابت کر کے اِشتراکیت کا طلوع روس کی

سرزمین سے گرد کھایا۔ اقبالؔ نے بھی اس نظریے کو نپولین کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاص لب و لہجے میں یوں بیان کیا ہے ؎

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

ہندوستان کی آزادی کے ڈرامے میں بھی افراد اور قوم کی یہ کشمکش بڑے دلچسپ مطالعے کا موضوع ہے۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے عین قبل ہم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اُس وقت مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان نے ایسی اُٹھان حاصل کر لی تھی کہ کانگریسی زعما اُس کے آگے خوفزدہ ہو کر سپر انداز ہو رہے تھے اُن میں سے کچھ زعما اپنی مجروح انا کے بل پر جناح صاحب کو نظر انداز کرنے اور اُن کا مقابلہ کرنے کی غلط پالیسی پر گامزن تھے۔ جس کا مظاہرہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیبنٹ پلان کی غلط تشریح کرتے ہوئے کیا۔ جب اُنھوں نے کہا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہم وِفاق کی ریاستوں کے حق خود ارادیت کے پابند نہیں ہوں گے۔ اِس بات سے بِدک کر جناح صاحب نے کیبنٹ پلان کے متعلق اپنا سارا رویہ ہی بدل دیا۔ اور تقسیم ملک کے لیے نہرو کی یہ بات آخری بہانہ ثابت ہوئی۔ اِس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں جناح صاحب کانگریس میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بنائی تھی اور مسز سروجنی نائیڈو نے اُنھیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا تھا لیکن اِس کے باوجود اُنھیں کانگریس کی چوٹی پر پہنچنے نہ دیا گیا۔ دوسری طرف سردار پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح اپنی الگ ہندو مملکت حاصل کرنا اور اپنے بڑھاپے کے ایام میں اپنے خوابوں کا ہندوستان بنانا چاہتے تھے۔ تیسری طرف مولانا آزاد جیسے لوگ تھے جو اگرچہ بدستور تقسیم کی مخالفت کر رہے تھے لیکن جن کا ذاتی اثر عوامی مقبولیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے محدود بلکہ محو ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف مہاتما گاندھی ایسے رہنما

تھے جنھوں نے وہ اپنا قومی نقطۂ نظر کھویا اور نہ جد و جہد کا صحیح تناظر۔ وہ مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی سعی کرتے رہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ اپنے عمل سے نفرت اور بدی کی قوتوں کے خلاف دیوار بن کر کھڑے رہے۔ وہ نواکھلی کا معرکۂ کارزار ہو یا بہار کی مہا بھارت گاندھی جی ہر جگہ جسم و جان کی پروا کیے بغیر اپنے اصولوں کی سربلندی کے لیے اپنی بے ہتھیار لڑائی لڑتے رہے۔ اُنھوں نے ہندو مسلم فسادات کے خلاف اور پاکستان کے پچپن کروڑ روپے کی جبری بندش کے خلاف مرن برت رکھا۔ وہ تقسیم کا خط کھینچے جانے کے باوجود آخر تک پاکستان کے علاقے کو جسم و جان کا حصہ سمجھتے رہے اور اُنھوں نے اعلان کیا کہ وہ پاکستان جا کر وہاں سے نفرت کی قوتوں کے خلاف جد و جہد جاری رکھیں گے۔ لیکن بھلا بدی کا بھوت پریت اس مینارِ نور کو کیسے سالم و ثابت رہنے دیتا؟ اُنھوں نے پاکستان میں اپنی ہم خیال ہم نوا اور ہم آہنگ نفرت کی قوتوں پر اِس مردِ درویش کی یلغار سے پہلے ہی اُن کی زندگی کا چراغ دہلی کی سرزمین پر گُل کر دیا۔

گاندھی جی اپنے آخری دنوں میں دو انتہاؤں کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک طرف مسلم لیگ نے نظریۂ نفرت کے شعلے بھڑکا کر آسمانوں کو چھو رہے تھے۔ اُس کے لیڈر اچانک ایک سلطنت کے ایوان تک پہنچ گئے تھے اور جلد از جلد اپنی تاج پوشی کرانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے سرمایہ دار اور طبقۂ عالیہ کے افراد ایک مملکت کے ذرائع پیداوار و اختیارات پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ اُن کی ہی ترجمان تھی۔ اس لیے اُسے مسلمانوں کے دور رس مفادات سے زیادہ اس محدود طبقے کے مفادات پورا کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ لوگ اس مردِ درویش کی آواز پر بھلا کیسے کان دھرتے؟ دوسری طرف مہاتما جی کی اپنی جماعت کانگریس نے ذہنی سطح پر بٹوارے کی اس اخلاقیات سے مصالحت کر لی تھی اور

اس کے بوڑھے رہنما بھی جلد از جلد تاریخ کے صفحات میں اپنی حکمرانی کی چند سطریں درج کروانا چاہتے تھے اور اس طرح مہاتما کی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دراصل ہندوستانی بورژوازی، جلد از جلد انگریزوں کی جگہ پیداوار کے ذرائع اور اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی تھی اور ایسے گاندھی جی کی اصول پرستی اپنے لیے ایک رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بے چارے گاندھی جی ایک زہر خند کے ساتھ ساری کیفیت کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کہتے تو کس سے۔ ان کی بات سننے والا کوئی نہ رہا تھا۔ غالب کی زبان میں وہ بھی اس زمانے میں اپنے حالات کی یوں ترجمانی کر سکتے تھے۔ ع

بیا ورید گر ایں جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

(اگر اس جگہ میری زبان سمجھنے والا کوئی ہے تو اس کو لے آؤ کہ شہر میں رہنے والے اجنبی کو کچھ باتیں کہنا ہیں)

جس تنظیم کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اور جس کے تنِ مردہ میں انھوں نے اپنے اعجازِ مسیحائی سے زندگی کی روح پھونک دی تھی اس کے رہنماؤں کے لیے اب گاندھی جی ایک دخل در معقولات کرنے والے شخص بن گئے تھے۔ وہ قیادت کی چوٹی پر پہنچ کر اب تنہا رہ گئے تھے اور یار لوگ اب انھیں دُور سے ہی تاک رہے تھے۔ بلکہ کچھ کانگریسی رہنما تو کھُسر پھُسر کر رہے تھے کہ وہ بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں کہ یوں گاندھی جی غالب کی زبان میں کچھ اس کیفیت کو پہنچ گئے تھے۔ ع

تیری نظر کا گلہ کیا جو ہے مجھ دل کو
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

اس آرزو کے پیچھے پیچھے وہ کسی ایسے معصوم بچے کی طرح آگے چلتے گئے جو کسی تتلی کے حسین پروں پر فریفتہ ہو کر اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھتا چلا جائے۔ ان کے پاس اپنی

جان کی متاع تھی جس پر ان کا بس تھا۔ چنانچہ اپنے اسی سرمایہ کو انھوں نے اپنے خواب کی خاطر قاتل کی گولی کی نذر چڑھا دیا اور اپنا مقدس خون دے کر نفرت کی اس جوالا کو ٹھنڈا کر دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ۔ ع

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

محمد علی جناح اس ڈرامے کے دوسرے اہم ترین کردار تھے وہ اس صدی کی پہلی چوتھائی صدی میں کانگریس کے روشن ستارے کی حیثیت سے چمکے اس وقت ان کو ایک بڑے قوم پرست اور بے خوف رہنما کی حیثیت حاصل تھی وہ ایک چوٹی کے وکیل اور منطق باز تھے اور انھوں نے بڑی بے جگری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ کانگریس کے اعلیٰ رہنما اس وقت اُن کی عزت کرتے تھے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس طرح سرد مہری اور عدم التفات سے کانگریس کے دھارے سے پہلے تو الگ ہو گئے۔ اور پھر اس کے سب سے بڑے مخالف بن گئے۔ تاریخ کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ مسلمانوں کے انتہا پسند طبقے کے رہنما بن گئے۔ جو پاکستان کے نام سے اپنا الگ وطن قایم کرنے پر تُل گیا تھا۔ جناح صاحب اپنی تربیت اور پس منظر کے لحاظ سے اس طبقے سے کوسوں دور تھے انھیں اسلام کے واجب ارکان کو زندگی میں برتنے سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ ہندوستان میں اسلامی کلچر کی زبانوں یعنی عربی فارسی اور اردو سے بھی بے بہرہ تھے ان کے متعلق حکایات مشہور ہیں کہ جب انھیں کبھی نماز ادا کرنا پڑتی تھی تو وہ کس طرح مشکل میں پڑ جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نظریہ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے تھے۔ اور میں اس خیال سے متفق ہوں کہ ان کے عظیم انہماک اور لگن کے بغیر پاکستان کا حصول ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے جذبات کے اس ارتکاز اور عمل کی اس وحدت کا ایک سبب تو یہی تھا کہ وہ بڑے

مستقل مزاج اور دھن کے پکے شخص تھے۔ اس کے علاوہ کانگریسی رہنماؤں کے توہین آمیز سلوک نے اُن کی ذاتی انا کو اس حد تک چوٹ پہنچائی تھی کہ اُن کے اندر اپنی شخصیت منوانے کی ایک شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک نفرت محبت سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ اِس لیے جناح صاحب کے سر پر بھی یہی دھن سوار ہو گئی اور اُن کی تخلیق پاکستان نفرت کے اسی سانگ منتھن سے برآمد ہوئی۔ یوں ایک بڑے آدمی کی نفرت کا شعلہ ایک مملکت کے رگ و پے میں منتقل ہو گیا اور پاکستان ابھی تک اپنی تعمیر میں مضمر اِس خرابی سے پوری طرح دامن نہیں چھڑا سکا ہے۔ بلکہ اس کے قومی وجود کے اس شگاف کے پیچھے جو ۱۹۷۱ء میں واقع ہوا اس کی کارفرمائی تھی۔ شاید اقبال نے ایسی ہی صورت حال کے متعلق کہا تھا ؎

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

جناح صاحب کی مثال انوکھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امبیدکر کی مثال پر غور کرنے سے بھی ہندوستانی تحریک آزادی کے اس پہلو پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ امبیدکر شروع میں گاندھی جی کی بے اعتنائی کی وجہ سے اُن سے ناراض تھے۔ لیکن آزادی کے طلوع کے وقت جواہر لال نہرو انھیں کسی طرح اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کی دستور سازی میں ایک اہم ترین رول ادا کیا لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ کانگریس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انھوں نے اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت بدھ مذہب اختیار کیا۔ جناح صاحب کے کردار کو سمجھنے کے لیے اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب اُن کی زخمی انا آسودہ ہو گئی تو وہ دو قومی نظریے سے دستبردار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی ایک اوّلین تقریر میں کہا کہ ہم میں سے اب کوئی ہندو

یا مسلمان نہیں بلکہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ جناح صاحب مغرب کے لبرل ازم کے پروردہ تھے یوں لگتا ہے کہ وہ زندہ رہتے تو پاکستان میں سیاسیات کا رُخ کچھ اور ہوتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رہنماؤں کی اسی صف میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ کتابی معیاروں کے لحاظ سے اُن سے بہتر مسلمانوں کی رہنمائی کے اوصاف کسی اور میں نہیں تھے۔ وہ ایک بڑے برگزیدہ دینی گھرانے میں حرم شریف کی دیواروں کے سایے میں پیدا ہوئے تھے۔ اور انھوں نے اس صدی کی ابتدا میں مسلمانوں میں بیداری کا صورِ اسرافیل پھونکا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی قیادت کے معاملے میں وہ جناح صاحب جیسے مغرب کے رنگ میں رنگے وکیل کے مقابلے میں جم نہ سکے۔ اِس میں اُن کے قوم پرستانہ اعتقادات کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین، ایک صاحب طرز ادیب، ایک شعلہ بیان خطیب اور قوم پرست رہنما تھے۔ اُن کو قدرت نے طاقت ور زبان اور قلم عطا کیے تھے۔ جن سے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک تازہ رُوح پھونکی۔ "الہلال" اور "البلاغ" مسلمانوں کو بیدار کرنے والے پہلے دو جریدے تھے۔ اور اُن کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں میں شکست خوردگی کی بجائے اُمید اور ولولے کی لہر پیدا کی لیکن حق یہ ہے کہ اُن کی طبیعت کی ساخت ایک عوامی رہنما کی نہیں تھی۔ اُن کے عادات و اطوار میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ عوامی مسائل کا میدانِ کارزار میں سامنا کرنے کی بجائے گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں جناح صاحب جذباتی نعرے دے کر مسلم عوام کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے وہاں مولانا اپنی خلوت گاہ سے غبارِ کارواں کو دیکھتے رہ گئے یعنی ؎

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

مولانا کی پوزیشن عجیب ہو گئی۔ فرقہ پرست ہندو انھیں مسلمان سمجھ کر اُن پر اعتبار نہ کرتے تھے اور مسلمان انھیں ہندوؤں کا بچہ جمہورا یعنی شو بوائے SHOW BOY قرار دیتے تھے۔

جواہر لال اگرچہ ذاتی طور اُن کی بہت عزت کرتے تھے لیکن اُن کے جذبات و خیالات کی کہاں تک پاسداری کرتے تھے اس کی ایک ہلکی سی تصویر مولانا کی سوانحی کتاب INDIA WINS FREEDOM کو پڑھ کر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں مولانا آزاد بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ اور ان سے خال خال ہی کوئی شرفِ ملاقات حاصل کر سکتا تھا۔

سردار پٹیل اور مولانا آزاد کی کبھی نہیں بنی سردار پٹیل پر ہندو احیا پرست REVIVALIST نظریات کی چھاپ تھی۔ وہ ہر مسئلے کو ہندوؤں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے اور کٹر ہندو و فرقہ پرست جماعتیں ان پر کافی اعتماد کرتی تھیں۔ وہ سیاسی اور معاشی دونوں نقطہ ہائے نظر سے پکے رجعت پسند تھے اور ترقی پسند جماعتوں سے کم ہی علاقہ رکھتے تھے۔ بلکہ ان کو گویا ناپسند کرتے تھے۔ سردار منہ پھٹ تھے اور اپنے دلی جذبات کو کم چھپاتے تھے جہاں تک اُن سے بن پڑتا اپنے مخالفین پر وار کرتے۔ مسلمانوں پر اُن کا اعتماد بہت کم تھا اور فرقہ وارانہ فسادات میں وہ ہندو فرقہ پرستوں کی پیٹھ ٹھونکنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ ایک بار جب میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ بولے کہ پاکستان کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنی تعداد میں ہو سکے مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان میں دھکیلا جانا چاہیے۔ تاکہ پاکستان اُن کے بوجھ تلے ہی دب کر رہ جائے۔ اور مجبور ہو کر ہندوستان کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔ صاف ظاہر تھا کہ اُن دنوں دہلی اور اس پاس کے علاقوں میں جو ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے اُن کے پیچھے سردار پٹیل کی سیاست کارفرما تھی۔ چنانچہ انھوں نے اسی زمانے میں لکھنؤ میں مسلمانوں کے خلاف ایک زہریلی تقریر کی۔ مہاتما گاندھی نے اس تقریر کی رپورٹ سنی تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ ایک بار جب میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو سردار پٹیل کی اس تقریر کا باتوں باتوں میں ذکر آ گیا گاندھی جی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہنے لگے کہ سردار کی زبان میں کانٹے ہیں۔ بعد میں انھوں نے اس تقریر پر سردار کی سرزنش بھی کی۔

سردار اور جواہر لال کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جواہر لال کا جنم اور تربیت ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اُن کے باپ پنڈت موتی لال فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ اُن کے حلقۂ احباب میں مسلمانوں کی کثیر تعداد شامل تھی۔ کشمیری ہونے کے ناطے اُن میں رواداری اور فراخدلی کے اوصاف بھی موجود تھے۔ برعکس اس کے سردار کی تربیت ایک خالص ہندووانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ پھر سردار اپنے آپ کو ہندوستان کی وزارتِ عظمیٰ کا اصل حقدار اور ہندوؤں کی اُمنگوں کا ترجمان سمجھتے تھے۔ جواہر لال سے وہ عمر میں بھی بڑے تھے۔ اس لیے جواہر لال کے وزیرِ اعظم بننے کو وہ اپنی حق تلفی خیال کرتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں جواہر لال ایک خواب دیکھنے والے تصور پرست تھے وہاں سردار ایک سلجھے ہوئے منتظم اور پکے حقیقت پسند تھے۔ سردار جواہر لال کو ہی نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور قدردانوں کو بھی اپنا مخالف خیال کرتے تھے۔ میرے اور جواہر لال دونوں کی رگوں میں کشمیری خون تھا۔ اور نظریات و خیالات کے لحاظ سے بھی ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک تھے۔ اس لیے سردار کو میرا اور جواہر لال کا ربط کبھی پسند نہ رہا اور وہ مجھے اپنے مخالفوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے۔ بدقسمتی سے میرا ٹکراؤ کشمیر میں ایک ہندو مہاراجا اور اس کے توسط سے ہندو مفادِ خصوصی کے ساتھ تھا۔ یہ بھی سردار اور میرے درمیان جھگڑے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مرکزی محکمۂ جاسوسی کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر والیہ نے جب مسلسل میرے اور میری حکومت کے خلاف غلط رپورٹیں بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا تو ہم نے اُس کو ریاست سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ اور حکم کی تعمیل کے لیے چوبیس گھنٹے کی معیاد رکھی۔ سردار مرکزی ہوم منسٹر تھے اور اس حیثیت سے محکمۂ جاسوسی

اُن کے پاس تھا۔ سردار کو ہمارا یہ اقدام بہت ناگوار گذرا اور اس طرح سے دلّی کے ایوانوں میں ایک زلزلہ سا پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے جواہر لال نے ہمیں دلّی آنے کی دعوت دی۔ میرے ساتھ بخشی اور بیگ صاحب بھی تھے۔ سردار پٹیل کے گھر میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں جواہر لال، مولانا آزاد اور گوپالا سوامی آئینگر نے بھی شرکت کی۔ بات چل نکلی تو ہم نے اس اقدام کی وجوہات بیان کیں اس پر سردار بولے "میں نے کئی بار جواہر لال سے کہا ہے کہ ہم نے کشمیر کا جو جوا کھیلا تھا اُس میں ہم ناکامیاب ہوگئے ہیں۔ ہمیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔" سردار نے بڑے دُکھ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "چند دن پہلے کشمیر کی مہارانی میرے پاس آئیں اور اپنی دُکھ بھری داستان کہتے کہتے اس صوفے پر غش کھا کر گر گئیں۔ کیونکہ مہاراجا ہری سنگھ کو ریاست سے باہر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔"

اب مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بولا "آپ کو مہاراجا اور مہارانی کے ساتھ اس قدر ہمدردی ہے کیا آپ کے دل میں اُن ہزاروں بے گناہوں کے لیے بھی کوئی جذبہ موجود ہے جن کو ان دونوں نے جموں کے علاقہ میں تہہ تیغ کروایا۔" سردار بولے "بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں۔" میں نے جواب دیا "کشمیر کے لوگوں نے آپ کے ساتھ آدرشوں کی ہم آہنگی کی بنا پر ہاتھ ملایا ہے۔ آپ اب اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے لیکن ہم نے آپ کی ذات کے ساتھ ہاتھ نہیں ملایا۔ بلکہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے یہ سوال اُنھی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم بھی اپنا کیس اُن کے سامنے رکھیں گے۔ آپ بھی اپنا موقف اُن کے سامنے رکھیے۔ جو ان کا فیصلہ ہوگا ہمیں وہ منظور ہے۔" سردار اس پر چپ ہوگئے۔ لیکن جواہر لال میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک کونے میں لے گئے۔ وہ بولے کہ فضا میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی ہے لہٰذا اس معاملے کو یہیں پر چھوڑ دیا جانا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ ہم رشتہ توڑنا نہیں چاہتے لیکن اگر سردار کو یہ رشتہ پسند نہیں

تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ مسودۂ الحاق کی رو سے مرکز کشمیر میں مرکزی انٹلی جنس کے دفتر قائم نہیں کر سکتا۔ یہ محض ہماری خوش اخلاقی تھی کہ ہم نے انھیں وہاں کام کرنے کی اجازت دی۔ لیکن ہم یہ ہرگز نہ چاہیں گے کہ یہ ادارہ ہمارے اور مرکزی حکومت کے درمیان تلخی پیدا کرنے کا باعث بنے۔ پھر بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ حسن والیہ کو ہم پھر سے کام کرنے کی اجازت دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس کو بھی ہدایت کی جائے کہ وہ غلط قسم کی رپورٹیں مرکز کو بھیجنے کی شرارت نہ دہرائے۔"

سردار پٹیل میرے کس قدر خلاف تھے اس کا اندازہ بی۔ این۔ ملک کی کتاب "MY YEARS WITH NEHRU" کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ حضرت بعد میں سنٹرل انٹلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر ہوگئے۔ اُن کو سردار نے میرے خلاف خوب پٹی پڑھائی تھی جس کے نتیجے میں انھوں نے میرے خلاف غلط سلط رپورٹیں مرکز کو بھیجنا شروع کیں اور جواہر لال کے دل میں میرے خلاف زہر بھرنا شروع کیا۔ یہیں سے دراصل ۱۹۵۳ء کی سازش کے ابتدائی بیج بوئے گئے۔ جب سردار پٹیل اور مرکزی محکمۂ داخلہ میں اُس کی ذہنیت کے حکام نے مجھے ہٹانے اور ایک متوازی قیادت وجود میں لانے کی کوششیں شروع کیں۔ انھی دنوں سردار پٹیل اور اُن کے گروہ نے بخشی غلام محمد کو سیاسی طور پر گود لے لیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپانا شروع کر دی۔ بہر حال ہم تقسیم سے پہلے کی قیادت پر نظر ڈال رہے تھے۔ مسلمانوں میں اُن دنوں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی وغیرہ بزرگ بھی تھے۔ یہ لوگ بڑے شریف الطبع تھے۔ اور دینی امور میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ اُن کا تعلق دیوبند سے تھا جسے ایک مذہبی اور علمی ادارے کے علاوہ قومی معاملات کا ایک بڑا مرکز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات پروان چڑھائے اور اسی ادارے نے مولانا محمود الحسن

اور مولانا عبیداللہ سندھی جیسے بزرگ مجاہد پیدا کیے جنھوں نے انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد اور ہندوستانی قوم پرستی کی آبیاری میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔ لیکن تقسیم سے ذرا قبل مولانا مدنی جیسے بزرگ بھی عوامی سطح پر الگ تھلگ ہو چکے تھے۔ یہ سیاسیات کی بھول بھلیوں سے بہت دور تھے اسی لیے عوامی سطح پر مسلم لیگ کے سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکے اور مسلمانوں کی قیادت مجموعی طور پر محمد علی جناح صاحب نے مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں تھام لی۔

پنجاب اور صوبہ سرحد میں تقسیم ملک تک مسلم لیگ کو پورا غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔ پنجاب میں اس کا ایک سبب خضر حیات خان کی یونینسٹ پارٹی تھی جو عوام سے زیادہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی جماعت تھی۔ اس لیے اس کی عوامی حیثیت مشکوک رہی۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے بلکہ ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی میں مولانا آزاد صوبہ سرحد سے ہی منتخب ہو کر بھیجے گئے۔ لیکن جب تقسیم کے وقت صوبہ سرحد کے عوام سے اس بارے میں استصواب رائے ہوا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کس مملکت میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو پانسہ سرخ پوشوں کے خلاف پلٹ گیا۔ سرخ پوش عمر بھر مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف جدوجہد کرتے رہے تھے۔ لیکن اب کانگریسی لیڈر انھیں بیچ منجدھار میں چھوڑ گئے تھے۔ خان عبدالغفار خان اس بے وفائی سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے استصواب میں پاکستان اور ہندوستان میں شمولیت کے علاوہ ایک تیسرا راستہ یعنی پختونستان کے قیام کا متبادل حوالہ بھی مانگا کیونکہ وہ اب ہندوستان کے حق میں اپنے پیروؤں کو ووٹ دینے کے اخلاقی جواز کو مشتبہ سمجھتے تھے لیکن انگریزوں اور مسلم لیگ کے علاوہ بادشاہ خان کے عمر بھر کے دوست کانگریسیوں نے بھی ان کی حمایت نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ استصواب

صرف ہند اور پاکستان کے درمیان شمولیت کے حوالے تک محدود ہو گیا۔ سرخ پوشوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور مسلم لیگی مذہبی جذبات کو برانگیخت کر کے صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن خان عبدالغفار خان نے اس وشواس گھات کے باوجود ہار نہیں مانی۔ وہ دو قومی نظریے کے برابر مخالف رہے اور انھوں نے یہ بات بار بار کہی کہ پاکستان کے قیام اور ملک کے بٹوارے کی ذمہ داری جناح صاحب سے زیادہ کانگریس کی اس وقت کی قیادت کو قبول کرنی چاہیے۔ ان کے مطابق دراصل کانگریسی دل سے ایک ہندو ریاست کے قیام کی آرزو رکھتے تھے۔ اور انھیں اپنے ساتھ مسلمانوں کی بھاری تعداد کی موجودگی رنگ میں بھنگ کے مترادف لگتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے جناح صاحب کے مطالبۂ پاکستان کی آڑ لے کر جو دراصل مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے سودا بازی کا ایک روپ BARGAINING COUNTER تھا۔ جناح صاحب کے ساتھ ایک غیر تحریر شدہ اور خاموش ذہنی سمجھوتہ طے کر لیا۔ اور ان کے کام کو آسان بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد یہ ذہنیت برابر قائم رہی۔ اور نہ صرف مسلمانوں کی بھاری تعداد کو پاکستان میں دھکیلنے کا سبب بن گئی بلکہ گاندھی جی جیسے مردِ قلندر کی، جو تقسیم کی اخلاقیات کو قبول نہ کر پائے تھے، شہادت کی صورت میں سامنے آگئی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں پر تقسیم ملک کی ذمہ داری عاید کرتے ہوئے کانگریسی لیڈر یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ جہاں ان کی صفوں میں صرف مہاتما گاندھی ایک ایسے معزز استثنار (HONOURABLE EXCEPTION) نظر آتے ہیں جو دو قومی نظریے کے آگے سپر نہ ڈال سکے وہاں مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان اور بیسیوں اعلیٰ قوم پرست مسلمان لیڈر ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اپنی پوری قوت

کے ساتھ ملک کے بٹوارے کی مخالفت کی جب تک کہ کانگریسیوں نے انھیں اپنی تعداد کے بل پر ویٹو نہ کردیا۔ دو قومی نظریہ کے خلاف پہلا محاذ جنگ بھی مسلم اکثریت والے علاقے یعنی ریاستِ کشمیر میں قائم ہوا۔ جہاں اس نظریے کے توسیع پسند مسلم بازوں کی پہلی ٹولی کے خلاف مسلمانانِ کشمیر اس وقت میدانِ جنگ میں ڈٹ گئے تھے۔ جب ہندوستانی فوج اور بقول مولانا مسعودی ان کو کشمیر پہنچانے والے "طائرانِ ابابیل" ابھی پالم کے ہوائی اڈے میں پر ہی تول رہے تھے۔

یہ بات بھی کچھ حیرت انگیز نہیں کہ مطالبۂ پاکستان کے لیے سب سے شدید جذبات اُن علاقوں کے مسلمانوں میں پائے جاتے تھے جو ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے تھے یہ لوگ تقریباً اجتماعی خودکشی کے راستے پر گامزن ہو گئے تھے۔ اجتماعی خودکشی اس لیے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اُن کے علاقے پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے۔ لیکن پھر بھی جنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ ایک عجیب جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یوپی، بہار وغیرہ کے مسلمان اس سلسلے میں سب سے آگے تھے۔ افسوس کہ تقسیم کے عواقب بننے کے باوجود اُن کے مسائل جوں کے توں رہے اور اسی علاقے میں اب بھی سب سے زیادہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنوبی ہند میں جہاں غیر مسلموں اور مسلمانوں میں تحمل اور رواداری کا برتاؤ موجود ہے تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد حالات پر کوئی قابلِ لحاظ اثر نہیں پڑا۔ اور نہ وہاں فرقہ وارانہ فسادات کی وہ فراوانی نظر آتی ہے جو گنگا اور جمنا کے دوآبے کا مشکوک امتیاز DUBIOUS DISTINCTION. بن گئی ہے۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں سرحد اور کشمیر تو پاکستان کے کھلم کھلا مخالف تھے اور پنجاب میں تقسیم سے چند ماہ پہلے تک مسلم لیگ برسرِ اقتدار نہ آسکی تھی۔

جواہر لال نہرو اس تقدیر ساز قیادت کے ایک اور جاذبِ نظر ستارے تھے۔ وہ کار کشا بھی تھے اور کارساز بھی لیکن وہ ایک معمہ بھی تھے۔ اُن کی ذات میں خوبیوں اور خامیوں کے کتنے ہی دھارے اس طرح سے جمع ہو گئے تھے کہ اُن کے بارے میں کوئی دو ٹوک فیصلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور اس لیے جسمانی لحاظ سے بڑے پُرکشش تھے۔ اُن کے سُرخ رخساروں کو دیکھ کر کشمیر کے مشہورِ زمانہ سیب کی یاد آجاتی تھی۔ وہ رئیسانہ ماحول میں پلے تھے۔ اور پھر انگلستان کے طبقۂ شرفا کے ساتھ اُن کی ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ اس لیے ذہنی طور پر بڑے آزاد خیال اور عملی طور بڑے آزاد مشرب تھے۔ وہ برطانیہ کی لبرل روایات کا حصہ بن گئے تھے اور انگریزی میں ہی سوچتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہندوستانی میں تقریر کرتے تو یہ کسی انگریزی متن کا سرسری ترجمہ لگتی۔ جس میں روانی اور فصاحت مفقود نظر آتی۔ بقول مولانا آزاد وہ خواب بھی انگریزی میں دیکھتے اور پھر انگریزی میں ہی بڑبڑاتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن پر انیسویں صدی کے اواخر کے انگلستان کے سوشلسٹ دانشوروں اور فیبین سوسائٹی کا اثر بھی تھا۔ وہ مارکس کے بھی شیدائی تھے۔ اس لیے اُن کے لبرل ازم میں ایک لوکدار زاویے کا اضافہ ہوگیا تھا وہ نہ پورے لبرل رہ گئے تھے اور نہ پکے اشتراکی وہ شیکسپیئر کے ہیملیٹ کی طرح اُن دو انتہاؤں کے درمیان اس انداز سے ادھڑ گم ہو لیتے تھے کہ اس شعر کا ماجرا سامنے آجاتا تھا۔ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جواہر لال کے دل میں ایک بڑا ادیب چھپا ہوا تھا۔ اُن کی شاندار اور زوردار انگریزی نثر اُن کے زورِ قلم کی شاہد ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناستک کہتے تھے لیکن وہ ہندوستان کے اس ماضی کے عاشقِ زار بھی تھے اور قصیدہ خوان بھی جس میں

ہندو احیاء پرستی اور ہندو سوراج کا افسوں بھی تھا۔ ان کی ڈسکوری آف انڈیا یعنی دریافتِ ہند کبھی کبھی غیر شعوری طور پر بھی کے ایم منشی اور دیانند سرسوتی جیسے ہندو احیاء پسندوں کے نظریہ تاریخ کے قریب تر آجاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو اس قدیم سلطنت کو پھر سے قائم و دائم کرنے کا ایک ہتھیار (INSTRUMENT) سمجھتے تھے۔ اور اس لیے اُن کی تصوّر پرستی میں میکاولی کی سیاست کاری اور شعبدہ بازی کے عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی جیسے اصول پسند عارف کا یہ چیلا بیک وقت قدیم ہند کے مشہور سیاست کار چانکیہ کا بے حد پرستار بھی تھا اور اس کی کتاب ارتھ شاستر جس میں اس نے ریاست کی فریب کاری کے گُر بیان کئے ہیں۔ جواہر لال کے اپنے اعتراف کے مطابق اُن کے سرہانے پر رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ جواہر لال نے میکاولی طرز کی یہ سیاست کاری کشمیر میں ہمارے ساتھ بھی برتی۔ پاکستان کے ساتھ بھی برتی اور بین الاقوامی سطح پر ہنگری اور دوسرے معاملات میں بھی اس کا مظاہرہ کیا۔ جواہر لال ایک بڑے جذباتی قسم کے شخص بھی تھے اور اُن کا شخصی طلسم اور کشش ایسی تھی کہ اُن کا گرویدہ نہ ہونا محال تھا۔ دراصل اُن میں اس دلفریب تہذیب کی وضعداری کا اثر نمایاں تھا جو انگریزی نفاست، ہندو لطافت اور مسلمان شرافت کے دھاگوں سے بنی تھی۔ ان کی تربیت مغرب اور مشرق کے اسی تہذیبی سنگھم پر ہوئی تھی اور وہ اس کے ایک نہایت ہی دل نواز اور اُجلے نمونے تھے۔ وہ دوست نوازی میں مبالغہ کی حد تک بھی جا سکتے تھے۔ مگر صرف اُس صورت میں جب اُنھیں اپنے راشٹر اور اپنے ذاتی مفادات پر زد پڑتی نہ معلوم ہوتی تھی۔ جب اِس کا اندیشہ ہوتا تو اُن کی آنکھیں بدل جاتیں جب میں اُن کے لیے کار آمد نہ رہا تو مجھے جیل بھجوا دیا۔ بخشی غلام محمد نے اُن کے کہنے پر اپنے محسن اور اپنی قوم سے

دغا کی۔ لیکن جب نہرو کو اُن کی بھی ضرورت نہ رہی تو کسی گلے سڑے پھل کی طرح انھیں بھی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اسی طرح کرشنا مینن صرف اُن کی پالیسی چلاتے تھے۔ لیکن جب اُن کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہوا تو بیچارے کرشنا مینن کو جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا، بلا کسی جھجک کے قربانی کا بکرا بنا کر اور بے آبرو کر کے کابینہ سے نکال دیا۔ انھیں بہت جلد غصّہ آجاتا لیکن بہت جلد نرم بھی پڑ جاتے تھے اور پھر ایسی معشوقانہ ادا کے ساتھ اِس کی تلافی کر دیتے کہ دل میں خواہش ہوتی کہ وہ بار بار غصّہ کریں اور بار بار اس کی تلافی کریں۔ غالب نے جو بات محبوب کے وداع اور وصال کے بارے میں کہی تھی وہ اُن کے غصّہ کرنے اور من جانے پر بھی صادق آتی ہے۔

ع
وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

جواہر لال صنفِ نازک سے خاصے متاثر ہوتے تھے۔ وہ حسین صورت اور دلکش گفتگو کے لمس سے فوراً پگھل جاتے تھے۔ اور ایسی صحبتوں میں خوب چہکتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اُن کا موڈ بگڑا ہوا تھا کہ کوئی طرحدار خاتون آ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جواہر لال کے چہرے کی فکر آلود شکنوں سے شگفتگی اور شوخی کی کرنیں طلوع ہو گئیں۔ بڑے بڑے قومی اجتماعات اور اہم مواقع پر ایسا ہوا کہ اہم ترین مباحث کے بیچ اُن کی کوئی حسین دوست آ گئیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے ساتھ محوِ راز و نیاز ہو گئے اُن کی طبیعت کی اس اُفتاد کے متعلق اکبر آبادی کا یہ شعر بہت صحیح ہے۔

روک سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

چنانچہ کانگریس کے سرکردہ رہنما اُن کی اِس اُفتادِ طبیعت پر اشاروں اشاروں میں

ہی تبصرہ کرتے رہتے تھے اُن کی زندگی پر بہت سی عورتوں کا خاصا اثر رہا اور وہ اُن کے مزاج میں دخیل رہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس قسم کی خواتین ظاہری حُسن کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں سے بھی آراستہ تھیں۔ اور جواہر لال جیسے دانشور کی ذہنی رفاقت کر سکتی تھیں۔ اِن میں سروجنی اور پدماجا نائیڈو، مسز مردولا سارا بھائی، لیڈی ایڈونا ماؤنٹ بیٹن اور بیسیوں دوسری خواتین کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

عورتوں کے علاوہ کشمیر اُن کی بڑی کمزوری تھی انھوں نے ایک بار ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا جب میری کوئین آف سکاٹس سے فرانسیسیوں نے کیلے کی بندرگاہ چھین لی تو میری نے کہا کہ مرتے وقت میرے دل کو چیرا جائے تو وہاں کیلے کا لفظ لکھا ہوا ملے گا۔ اسی طرح میرے دل میں بھی کشمیر کا لفظ نقش ہے"۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ اپنے آخری لمحات میں انھیں جہانگیر کی طرح کشمیر کی یاد آئی ہو گی۔ اُن کی یہ توجہ کشمیر کی خوش قسمتی بھی ثابت ہوئی اور بد قسمتی بھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ کشمیر کے حُسن کو انھوں نے صنفِ نازک کے دلربایانہ پیرائے میں ہی دیکھا اور اس میں نسوانی حُسن کی ہلکی ہلکی آنچ پائی۔ وہ کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایک بے پناہ خوبصورت نازنین کی طرح جس کا حُسن غیر شخصی اور انسانی تمنا کی رسائی سے بالاتر ہو۔ کشمیر کے نسوانی حُسن کا یہ ایک پہلو ہے۔ دریاؤں، وادیوں اور طرح دار درختوں کا محور نسوانی حُسن .... بعض اوقات اس حُسن کی ادائے دلبری مجھ پر غالب آجاتی اور میں تقریباً بے ہوشی کی سی کیفیت محسوس کرتا۔ یہ معشوق چہرہ زیبا کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ جو آدمی خواب میں تو دیکھتا ہے لیکن جو جاگ اٹھنے کے فوراً بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے"۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپ ہوگا کہ کشمیر کے ایک اور فرزند اور عاشق علامہ اقبال نے بھی کشمیر کے حُسن کو سراہا۔ لیکن اُن کا پیرایہ بیان

نہرو سے بالکل مختلف ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا دشوار بن جاتا ہے کہ دونوں میں سے کونسی تعریف زیادہ خوبصورت ہے ع

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب (اقبال)

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کشمیر کے ساتھ جواہر لال نہرو کا جو عشق تھا کیا وہ کشمیریوں کے میرے ساتھ لگاؤ کو اپنی نفسیاتی سطح پر رقابت کی صورت میں محسوس نہ کرنے لگے تھے چونکہ وہ کشمیر کا تصوّر ایک عورت کے استعارے میں کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اپنے نفسیاتی رقیب کو ہٹانے کا جذبہ کہیں اُن کو میرے خلاف اقدام کرنے کا محرک تو ثابت نہ ہوا ہو؟

جواہر لال نے زندگی تو ایک کھلنڈرے لڑکے کی سی زندہ دلی کے ساتھ گذاری لیکن اُن کے آخری ایّام پر حُزن و ملال کی پرچھائیاں منڈلاتی رہیں۔ اُن کے اندر کے چانکیہ نے اُن کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ وہ چین کے معاملے میں صرف سیاسی طور پر ہی مجروح نہ ہوئے بلکہ اِس کا زخم اپنے سینے میں بھی سہلاتے رہے۔ وہ گاندھی جی کے جانشین کی حیثیت سے دنیا بھر کی اخلاقی قیادت کے دعویدار تھے لیکن کشمیر کے معاملے نے اُن کی اِس اخلاقی اِمامت کو مشکوک بنا دیا۔ خود کشمیر کے اندر انھوں نے سنہ ۵۳ء کے نرغے کے بعد اپنے مریدوں کو جو کھیل کھیلنے کی اجازت دی تھی وہ اُن کی شبیہہ بگاڑنے کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اپنے آخری دنوں میں کشمیر کے معاملے میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی بڑی تمنا رکھتے تھے اور اس لیے انھوں نے بخشی غلام محمد کو کامراج پلان کی کلہاڑی کی ایک ضرب سے یہاں کی نخلِ سیاست سے الگ کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے

سـ۳۲ء میں میری رہائی کے بعد اپنے رنج اور تاسف کا اظہار کیا اور وہ خلوصِ دل سے اس گتھی کا حل سلجھانے کے لیے میری مدد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن تاریخ بڑی بے رحم ہے اُس نے اُنھیں "تلافیِ ملاقات" سے پہلے ہی موت کے ہاتھوں میں دے دیا اور اُن کی دل ہی دل میں رہ گئی۔ ؎

میری یہ عادت نہیں کسی کی خاطر رکھ لوں بیتے شبانہ

(اقبال) ▲▲▲

(۳۳)

"کشمیر چھوڑ دو"

برصغیر میں عام اِنتخابات ہوئے اور اِن میں مُسلم لیگ نے نمایاں کامیابیاں حاصل کرلیں۔ اُسی زمانے میں حکومتِ برطانیہ نے ایک کابینہ مشن ہندوستان روانہ کیا تاکہ وہ یہاں کی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ساتھ ہندوستان کی گتھی سُلجھانے کے لیے بات کرسکے۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہوچکی تھی اور اِس کے ساتھ ہی برطانیہ کے عالمی اِقبال اور اِقتدار کا سُورج بھی آفتاب لبِ بام ہوگیا۔ اِتحادیوں نے دوسری عالم گیر جنگ میں محوری طاقتوں کو شکست تو دی تھی لیکن اس کا سب سے زیادہ خمیازہ برطانیہ کو ہی اُٹھانا پڑا تھا جو مُلک اِس جنگ سے پہلے دنیا کی پہلی طاقت تصور ہوتا تھا اب پے در پے ضربوں سے اِس قدر خستہ اور شکستہ ہوچکا تھا کہ وہ کسی طرح تیسرے درجے پر اپنا بین الاقوامی رُتبہ قائم رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اُدھر وِنسٹن چرچل کو برطانیہ کے بیدار مغز عوام نے جنگ جیت جانے کے باوجود اِنتخابات میں ٹھکرا دیا تھا کیونکہ وہ اِس کی جنگ جُویانہ اور جارحانہ پالیسیوں کی بجائے امن و چین سے رہنے کو ترجیح دیتے

تھے کلیمنٹ اٹیلی کی لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تھی۔ جو برطانیہ کے ڈوبتے ہوئے استعمار کو بچانے کے جتن کرنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ شاہِ برطانیہ کے دست و بازو اس قدر شل ہو چکے ہیں کہ وہ ہزاروں میل دور واقع جذبۂ آزادی سے سرشار ہندوستان کو اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتے۔ کیبنٹ مشن کی ہندوستان کو روانگی اسی احساس کا نتیجہ تھی۔ اِس وفد کی قیادت وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے۔ اور اس کے ممبروں میں سر سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر الیگزینڈر شامل تھے۔ اس وقت یہ بات چل رہی تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے قیام کے بعد راجے اور مہاراجے فیصلہ کریں گے کہ وہ کس وفاق کے ساتھ شامل ہوں گے۔ جواہر لال نہرو اور کانگریس اس نظریے کی مخالف لیکن جناح صاحب اور مسلم لیگ اس کی حمایت کر رہے تھے میں دہلی گاندھی جی سے ملنے گیا اور اُن سے کہا کہ ریاستوں میں سرداری کا حق عوام کو ملنا چاہیے اور ہمیں اپنے اس حق کو منوانے کے لیے فوری طور پر ایجی ٹیشن شروع کرنے سے گریز نہ کرنا چاہیے۔ لیکن گاندھی جی نے اس مرحلہ پر کوئی تحریک شروع نہ کرنے کا مشورہ دیا اور میں واپس لاہور آگیا۔ اسی اثنا میں کیبنٹ مشن ۱۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو سرینگر گیا اور ۲۴ اپریل کو واپس آگیا۔ میں نے لاہور سے مشن کے نام ایک تار بھیجا جس کا متن درج ذیل ہے۔

> "آج کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ مہاراجا کے شخصی نظام سے مکمل آزادی کا حق چاہتے ہیں۔ ایک سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کشمیر کا سودا ہوا۔ صرف ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض جو آج برطانوی سکے کے مطابق پانچ لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ سے بھی کم رقم بنتی ہے،

کشمیر اس کے عوام، اس کے سبزہ زار اور مرغزار اور اس قسم کے تمام وسائل ہ سکھ سلطنت کے ایک باجگذار راجا گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیئے گئے۔ اُس وقت کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے اِس معاہدے کے سلسلے میں کشمیر کا سودا کرنے کی مزاحمت کی لیکن اُسے برطانوی فوج کی مدد سے مطیع بنا دیا گیا۔ اِس طرح سے ۱۸۴۶ء کے اس بکری پتر نے جس کو غلطی سے معاہدۂ امرتسر کہا جاتا ہے، کشمیریوں کی قسمت پر مہر لگا دی۔ ہم اس بیع نامے کی اخلاق اور سیاسی حیثیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ جس میں کشمیری عوام کبھی فریق نہیں رہے اور جو ۱۸۴۶ء سے ان کی غلامی کی دستاویز رہتا چلا آیا ہے۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کے باشندگان کا مستقبل طے کیا جا رہا ہے اور برطانوی کیبنٹ مشن مستقبل کا آئینی ڈھانچہ تشکیل دے رہا ہے۔ اِس لیے راجواڑوں کے معاہدات کرنے کا حق اس وقت ریاستوں کے عوام، راجواڑہ شاہی اور بالادستی رکھنے والی طاقت کے درمیان ایک اہم مسئلے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہم کشمیریوں کے لیے اِس رشتے کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ایک انتہائی اہم معاملہ بن گیا ہے۔ ہمارے موقف کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ بیع نامہ کو، جس کی وجہ سے کشمیر ڈوگرہ مہاراجوں کے زیرِ عنان آیا۔ اُن حقوق کے موافق کوئی حق عطا نہیں کرتا۔ جن کی بنا پر ان ریاستوں کا نظام چلایا جاتا ہے۔ جن پر معاہدات سے پیدا شدہ حقوق کی عملداری ہے۔ اِس لحاظ سے کشمیر کا معاملہ ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے اور کشمیر کے عوام کیبنٹ مشن کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی حکمرانی کے خاتمے کے بعد انھیں آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔

۱۸۴۶ء کا بیع نامہ جسے غلطی سے معاہدہ امرتسر کہہ کر پکارا جاتا ہے اس دعوے کو اظہر من الشمس بنا دیتا ہے۔ کوئی بھی کاغذی پتر، چاہے اس کے تقدس کا کتنا ہی ڈھنڈورہ کیوں نہ پیٹا جائے، چالیس لاکھ سے زیادہ عورتوں اور مردوں کو ایک تاناشاہ کا غلام نہیں بنائے رکھ سکتا جب وہ اس کے زیرنگیں نہ رہنے پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ ہم کشمیری عوام اپنی تقدیر خود بنانے کی قسم کھا چکے ہیں، اور کیبنٹ مشن سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے موقف کی قوت اور انصاف کا اقرار کریں۔ کشمیر عظیم برصغیر ہندوستان کے شمال و مغرب میں واقع ایک جغرافیائی وحدت ہی نہیں ہے۔ جو اپنی خوبصورتی اور قدرتی دولت کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اس کا محلِ وقوع نہایت اہم فوجی اور سیاسی نوعیت کا ہے، یہ ہندوستان، چین اور روس کا مقامِ اتصال ہے اور اس لحاظ سے اس کی بین الاقوامی اہمیت ہے۔ ہمارا وطن کشمیری قوم کا گہوارہ ہے، جو اپنی زبان، کلچر اور روایت کی ہم آہنگی اور اپنی مشترکہ جدوجہد کی تاریخ کے لحاظ سے ہندوستان میں ایک نادرِ روزگار جگہ ہے جہاں تمام فرقے اور طبقے ایک متحدہ قومی مطالبے کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔"

کچھ ہی دنوں کے بعد میں کشمیر آگیا اور میں نے یہاں تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تاکہ عوام کو کشمیر کی تاریخ کے اس اہم موڑ اور اُن کے مستقبل کے امکانات کے بارے میں باخبر کر سکوں۔ میں نے پہلی تقریر ۱۰ مئی ۱۹۴۶ء کو مائسمہ میں دھن جی بھائی اڈے کے احاطے میں کی۔ اور اعلان کیا کہ انگریزوں کے جانے کے ساتھ ہی وہ تمام راجے اور مہاراجے بھی چلے گئے ہیں جو انگریز سامراج کے پٹھوؤں کی حیثیت سے اپنی رعایا پر مسلط تھے۔ اور وہ سارے معاہدے بھی کالعدم ہو گئے ہیں۔ جو ناجائز طریقے سے عمل میں لائے گئے تھے۔ اور جن کا منشا عوام کو اُن کی مرضی کے خلاف طوقِ غلامی پہنانا تھا۔ میں نے ایک اور تقریر زینہ دار محلہ میں کی اور کہا کہ ہم ایک ایک روپیہ اکٹھا کریں گے اور اس طرح سے پچھتر لاکھ روپے کی وہ رقم مہاراجا کو واپس کریں گے جس کے عوض اُس کے پر دادا مہاراجا گلاب سنگھ نے آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے کشمیر کو خرید لیا تھا اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

اے بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

میں نے ایک اور تقریر اندرونِ شہر میں کی۔ میری تقریریں اس قدر جوشیلی تھیں کہ سارے کشمیر میں عزم اور ولولے کا ایک الاؤ روشن ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ علامہ اقبال نے اپنے شاعرانہ مکاشفے میں کشمیر کی حالت کے بارے میں جو بشارت دی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہو گئی ہے۔ ؎

باش تا بینی کہ بے آوازِ صور
ملتے برخیزد از خاکِ قبور

چنانچہ کشمیر کے حالات کی بھنک جونہی جواہر لال نہرو کے کان میں پڑی انھوں نے مجھے دہلی آنے اور بات چیت کرنے کا سندیسہ بھیجا۔ ۱۹ مئی کو میں نے اپنے رفقا کے ساتھ بات چیت کی اور ۲۰ مئی کی صبح کو میں راولپنڈی روڈ کے ذریعے دہلی کی طرف

چل پڑا۔ جب میں ضلع مظفر آباد میں سران اور کہو کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ راستے کے بیچوں بیچ ایک بھاری پتھر رکھا گیا ہے اور پولیس کی ایک جمعیت موجود ہے۔ میری کار روکی گئی۔ مجھے ڈیفنس رولز کے تحت جاری کیا گیا ایک وارنٹ دکھایا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لیکن مجھے اِس تاریکی میں کڑمی کے ڈاک بنگلہ تک پہنچایا گیا جہاں میں نے رات بسر کی۔ دوسرے روز علی الصبح لا کر اسی دن واپس سرینگر پہنچایا گیا اور بادامی باغ کے کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا۔ مجھے جہلم کے راستے سے شہر نہیں لایا گیا بلکہ مانسبل کے لمبے راستے سے لایا گیا تاکہ شہر سے میرا گذر نہ ہو اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ لیکن میری گرفتاری کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی اور فوراً ہی وسیع پیمانے پر مظاہرے، جلسے اور جلوس شروع ہو گئے۔ حکومت نے رات کی تاریکی کے پردے میں شہر میں ہی کیا وادی کے اہم ناکوں پر بھی پولیس اور فوج بچھا دی تھی۔ بلکہ پونچھ، راجوری، بھدرواہ، کوٹلی، بانہال وغیرہ مقامات پر بھی فوج روانہ کر دی گئی تھی۔

شہر و دیہات میں ہڑتال و مظاہرے جاری رہے۔ پولیس نے بے تحاشا گرفتاریاں شروع کر دیں۔ مظاہرین پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں۔ جن سے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بیس سے زائد افراد لقمۂ اجل بن گئے اور ایسے شہیدوں میں اسلام آباد کی مسماۃ مختی بھی تھی۔ اس تحریک میں سردار بدھ سنگھ، پنڈت شیام لال صراف، پنڈت کیشپ بندھو، سردار سنت سنگھ تیغ، درگا پرشاد در اور جانکی ناتھ زتشی بھی گرفتار ہوئے۔ اُدھر خواجہ غلام محی الدین قرہ روپوش ہو کر تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے دلیرانہ کارناموں سے کافی شہرت حاصل کی اور کشمیری لوگ گیتوں کے ہیرو بن گئے۔

میری گرفتاری کے ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے تقریباً تمام چوٹی کے لیڈروں اور اہم کارکنوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ صرف بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق آنکھ بچا کر کشمیر سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ حضرات میری گرفتاری سے قبل ہی لاہور پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے وہاں کشمیر کے حالات سے اخبارات اور کانگریس کے رہنماؤں کو آگاہ کیا۔ کشمیر کے وزیر اعظم پنڈت رام چند کاک نے ایک پریس کانفرنس میں یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ اس دن کے لیے گیارہ مہینے سے تیاری کرتے رہے تھے اور انھوں نے اِس غرض کے لیے کشمیری فوج کی کچھ ٹکڑیاں مشرق وسطیٰ سے جہاں وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مقیم تھیں، واپس بلائی تھیں۔

"کشمیر چھوڑ دو" تحریک نے ریاست کے عوام میں ایک عظیم ابھار پیدا کر دیا تھا لیکن ہندو پریس کا ایک حصہ اس کے خلاف ہی رہا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ صورت کچھ بھی ہو ایک ہندو مہاراجے کے ڈانواڈول سنگھاسن کی ہر قیمت پر رکشا کی جانی چاہیے۔ کانگریس کے اس وقت کے صدر آچاریہ کرپلانی بھی ہماری تحریک سے بیزار تھے لیکن سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ مسٹر محمد علی جناح اور اُن کی مسلم لیگ کشمیری عوام کے سینوں کو چھلنی کرنے والی گولیوں سے آنکھیں موند کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ جناح صاحب شاید دل ہی دل میں کشمیر میں اپنے تجربات سے شاکی رہے تھے۔ انھوں نے اُڈو کیا دھاڑ اور مہاراجا اور کاک شاہی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسے غنڈوں کی تحریک قرار دیا۔ جناح صاحب نے اِس تحریک کو بیرونی انگیخت کا نتیجہ بتایا اور اُن کا صاف اشارہ یہ تھا کہ سوویت روس اس تحریک کی پشت پر ہے۔ البتہ ایک جواہر لال تھے جو چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور ہماری تحریک کی حمایت کرتے رہے۔ مہاراجا اور ریاست میں اُن کے دوستوں نے کانگریسی لیڈروں

خاص طور پر مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ رام چندر کاک تو خود سردار پٹیل کو ہمنوا بنانے کے لیے بمبئی چلا گیا اور اُن سے ملا۔ دلّی میں سیٹھ گھنشیام داس برلا نے بھی سردار پٹیل وغیرہ کے ذریعے جواہر لال کو کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جواہر لال بھی کہاں ماننے والے تھے۔ وہ گاندھی جی سے ملے اور اُنھیں تحریکِ کشمیر کی حقیقت سے واقف کیا۔ اُنھیں اِس بات پر سخت غصّہ آیا کہ حکومتِ کشمیر نے مجھے اس وقت گرفتار کر لیا جب میں اُن کے بلاوے پر اُن سے تبادلۂ خیالات کے لیے جا رہا تھا۔ جواہر لال نے مہاراجا کے نام کئی تار روانہ کیے جن میں اُن سے کہا گیا کہ وہ مجھے رہا کریں۔ اُنھوں نے کشمیر آکر مہاراجا سے اس سلسلے میں بات چیت کی بھی پیش کش کی لیکن مہاراجا نے جوابی تار میں بتایا کہ آپ کا یہاں آنا غیر دانشمندانہ ہوگا۔ اور اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن جواہر لال بھی ٹلنے والوں میں نہ تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے تمام کام ایک طرف چھوڑ کر کشمیر کا رُخ کیا۔ اُس وقت کانگریسی لیڈر کیبنٹ مشن کے ساتھ آزادیِ ہند کے بارے میں اہم گفت و شنید کے نازک ترین دور سے گذر رہے تھے اور جواہر لال اس بات چیت میں بڑا اہم رول ادا کر رہے تھے۔ اس لیے مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد نے جو اُس وقت کانگریس کے صدر نشین تھے نے اُنھیں سفرِ کشمیر اختیار کرنے سے باز رکھنے کی کوششیں کی۔ اور دہلی میں ہی رہنے کی ضرورت کا احساس دلانا چاہا۔ جواہر لال نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”میری جگہ عوام کے درمیان ہے۔ اس لیے مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔“ بہرحال وہ سارے زمانے کو ٹال کر راولپنڈی پہنچ ہی گئے۔ یہاں بخشی غلام محمد اور کچھ دوسرے کانگریسی لیڈر اُن سے ملے اور پھر یہ سارا قافلہ کوہالہ کی طرف روانہ ہوا۔ جو برطانوی پنجاب اور مہاراجا کی ریاست کی حد فاصل تھا۔

مہاراجا کی حکومت نے جس کے سربراہ اُس وقت رام چند کاک تھے، جواہر لال کے داخلے پر پابندی لگائی۔ جواہر لال اس سے قبل ہی مہاراجا کے مظالم کی مذمت کر چکے تھے اور اُنھوں نے کہا تھا کہ ”سرینگر کو شہر خموشاں میں تبدیل کر دیا گیا ہے“ کشمیر میں ظلم و جبر کی جو لہر چل رہی تھی۔ کاک شاہی اُس پر پردہ ڈالنے کے لیے جواہر لال کو کسی طرح روکنا چاہتی تھی اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ جواہر لال کی سرینگر میں موجودگی تحریک کے شعلوں کو اور تیز کرے گی۔ چنانچہ اس نے گھبراہٹ میں جواہر لال کے کشمیر کے داخلے پر پابندی لگائی اور کوہالہ پل پر ایک فوجی دستے کو تعینات کیا۔ دوسری طرف جموں اور کشمیر کی ہندو سنستھاؤں کو اپنے حاشیہ بردار کوہالہ پہنچانے کے لیے بھی متحرک کیا گیا۔ اور اُنھیں سرکاری وسائل کا استعمال کر کے وہاں پہنچایا گیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کشمیری پنڈت، جو اس وقت تک جواہر لال کو اپنا سپوت قرار دیتے ہوئے خوشی اور فخر سے پھولے نہ سماتے تھے، اب پنڈت شیو نارائن فوطیدار کی سربراہی میں ہندوستان کے اسی جواہر اور کشمیر کے اسی لال کو کالی جھنڈیاں دکھانے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ اُدھر ڈوگرہ سبھا کے پرتی ندھی بھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئے تھے۔ حد یہ ہے کہ پنڈت کاک نے مولوی یوسف شاہ کو گانٹھ کر اُن کے چند حامیوں کو بھی کوہالہ پہنچا دیا تھا۔ اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے کشمیری عوام کی حمایت کرنے کے جرم میں جواہر لال کے خلاف ایک آواز ہو گئے تھے۔ ان سبھی جتھوں نے جواہر لال کے خلاف مظاہرے کیے اور واپس جاؤ کے نعرے لگائے۔ لیکن پنڈت جی جیسے جیالے اور جری شخص کہاں رُکنے والے تھے۔ وہ رِندانہ قدم بڑھاتے گئے اور اُن کے بڑھتے ہوئے قدموں سے مظاہرین اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن ایک سپاہی نے بندوق کی

انی اُن کے سینے کی طرف گھما دی۔ پنڈت جی زخمی ہو گئے لیکن واپس نہیں ہٹے۔ قافلے کے ساتھ آنے والے بہت سے لوگ پُل کے اُس طرف پنجاب میں رُک گئے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ حکومتِ کشمیر جھک گئی ہے اور اب پنڈت جی سری نگر چلے جائیں گے۔ لیکن کچھ منچلوں نے پل پار کر کے حکمِ امتناعی کی خلاف ورزی کی۔ گورنر کشمیر مہاراج کرشن ندہ موقع پر موجود تھے۔ اُنھوں نے تمام پارٹی کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اور پنڈت جی کو پہلے دومیل اور پھر اوڑی کے ڈاک بنگلے میں نظر بند رکھا گیا۔ اُدھر جب پنڈت جی کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں چھپی تو ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ ملک کے اکثر حصوں میں اس عظیم رہنما کی گرفتاری کے خلاف مظاہرے ہوئے گولیاں چلیں اور بہت سے لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

جواہر لال کے بنگلے کے باہر حکومت نے دو کاریں رکھوا دیں اور اُن سے کہلوایا کہ وہ کسی بھی وقت واپس ہندوستان جانے کے لیے آزاد ہیں۔ لیکن جواہر لال ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُدھر دہلی میں کانگریسی حلقوں میں جواہر لال کی عدم موجودگی سے ایک کہرام سا مچ گیا۔ بہر حال برطانوی حکومت کے ساتھ انتہائی اہم نوعیت کی بات چیت میں وہ مرکزی کردار تھے۔ مہاتما گاندھی کی ایما پر مولانا آزاد نے اُن سے ٹیلی فون پر بات کی اور اُنھیں بتایا کہ دہلی میں اُن کی موجودگی کتنی ضروری ہے۔ مولانا نے اُنھیں یقین دلایا کہ اُن کی عزت کانگریس کی عزت ہے۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے وہ کشمیر کے معاملات میں مؤثر مداخلت کریں گے اور پھر جواہر لال چند دنوں کے بعد کشمیر جا سکیں گے آخر کار جواہر لال راضی ہو گئے۔ چنانچہ وائسرائے لارڈ ویول نے اپنا خاص جہاز اُن کو واپس لانے کے لیے بھیجا اور وہ اوڑی کے ڈاک بنگلے میں دو راتوں کی نظر بندی کے بعد ۲۲ جون کی صبح کو ۲ بجے واپس دلی پہنچے۔ جواہر لال نے کشمیر کی صورتِ حال سے متعلق اپنے بیان میں ڈوگرہ شاہی کے جبر و استبداد سے پردہ سرکایا۔ اُنھوں نے کہا:

"ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے لازمی طور اس کی قدر و منزلت سے بھی واقف ہے جو شیخ محمد عبداللہ کو وہاں حاصل ہے۔ وہ کشمیر کی دُور دراز وادیوں میں لوگوں کا محبوب اور اُن کا شیرِ کشمیر ہے۔ اُس کی شخصیت کے گرد لاتعداد افسانوں اور عوامی گیتوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ ریاستی عوام کی تحریکوں کے سلسلے میں میرے سب سے بڑے اور بیش قیمت ساتھی ہیں اور میں ہر اہم معاملے میں اُن کی رائے لیتا ہوں۔

کیا کوئی شخص سمجھتا ہے کہ ہم اُن سے یا اُن کے ساتھیوں سے صرف اس لیے کنارہ کشی کریں گے کہ حکومتِ کشمیر کے پاس چند بندوقیں ہیں۔ ہم یقیناً اِس بھاری امتحان میں کشمیری عوام اور اُن کے رہنماؤں کے دوش بدوش کھڑے رہیں گے...... اِس وقت خوبصورت اور شاداب وادی میں عوام کا خون بہایا جا رہا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی حکومت کسی نہ کسی بہانے عوامی تحریک کو کچل دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

جواہر لال نے واپس لوٹنے سے قبل مہاراجا کو ایک خط لکھا کہ میں بہت جلد واپس کشمیر آؤں گا اور اگر اُس وقت آپ نے مجھے پھر روکنے کی کوشش کی تو میں اُن احکامات کی پھر خلاف ورزی کروں گا۔ جواہر لال کے ساتھ آنے والے کچھ دوستوں کو سری نگر آنے کی اجازت دی گئی۔ اُن میں مشہور وکیل دیوان چمن لال بھی تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ دیوان صاحب مجھ سے ملنے کے لیے بھی آئے۔ مجھے بادامی باغ کے ملٹری ہسپتال میں رکھا گیا تھا۔ جس کو نظر بندی کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میرے

خلاف حکومت نے دفعہ ۱۲۴-الف (بغاوت) کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ اور مسٹر برکت
رائے سیشن جج کو سپیشل جج مقرر کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس وزیر سروپ چند
نے ۲۰ رمئی ۱۹۴۶ء کو میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ میرے ساتھ علی محمد طارق
اور پنڈت شیام لال صراف کو بھی اس کیمپ میں محبوس رکھا گیا تھا۔ حکومت کی طرف
سے لاہور کے ایک وکیل مسٹر سیٹھی استغاثے کے چیف پراسیکیوٹر بنائے گئے تھے۔
اُنھیں یومیہ سوا سو پچاس روپے محنتانہ ادا کیا جاتا تھا۔ مسٹر سیٹھی زیادہ دیر تک نہ
سکے لیکن پچاس ہزار سے زیادہ کی رقم اینٹھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن کے بعد پنڈت
مدھو سودن کاک نے استغاثے کی کمان سنبھالی۔ پنڈت جیا لال کلم اور دیگر کئی کشمیری
پنڈت ساتھیوں نے میری طرف سے وکالت نامہ پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نے پٹنہ کے
ایک وکیل مسٹر سہائے کو وکیل صفائی بنا کے بھیجا۔ مسٹر آصف علی اور دیوان چمن لال بھی
وکلائے صفائی میں شامل تھے لیکن حقیقتاً آصف علی صاحب نے ہی صفائی کا بوجھ
سنبھالا۔ اُنھوں نے ہی شہادت قلمبند کروائی۔ گواہوں پر جرح کی اور آخر میں پُرزور
بحث کی۔ اُن کے قیام و طعام کا انتظام ایک ہاؤس بوٹ میں کیا گیا تھا۔ پنڈت
جیا لال کلم اور دوسرے وکلاء اُن کا ہاتھ بٹانے کے لیے موجود رہتے تھے۔ مسز فریدہ
بیدی نے ٹائپ کا کام کرنے میں اُن کی بڑی مدد کی اور کافی محنت سے کام لیا۔
آصف علی صاحب نے آزاد ہند فوج کے مقدمے میں بھولا بھائی ڈیسائی کے اٹھائے
ہوئے نکتے کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ "غلاموں کو بغاوت کرنے کا پیدائشی حق
ہے اور معاہدہ امرتسر کے خلاف بغاوت کا یہی حق کشمیریوں کو حاصل ہے۔" اُنھوں
نے کہا "آج ۱۹۴۶ء ہے جب برطانوی کابینہ نے اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کو
آزاد رہنے کا حق ہے۔ اس دور میں ساری دنیا میں عوام کی آزادی کے چرچے

ہو رہے ہیں کیا اس وقت بھی یہ کہنا جرم ہے کہ اس ریاست کی حکومت کی بنیاد بھی
عوام کی رضامندی ہونی چاہیے نہ کہ وہ قابلِ تحقیر ایک صدی پُرانا بکری پتر جس کو
دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت مسترد کرے گی۔" کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۴ر جولائی کو جواہر
لال دہلی میں تھوڑی سی فراغت پاتے ہی کشمیر کی طرف دوڑ پڑے۔ مہاراجا ایک طرف
اُن کی گرفتاری کے اثرات سے گھبرا گیا تھا تو دوسری طرف اُس پر وائسرائے اور
کانگریس کا بھی زبردست دباؤ تھا۔ لہٰذا اب کی مرتبہ جواہر لال کے داخلے پر کوئی
پابندی نہیں لگائی گئی۔ جواہر لال نے مجھ سے بھی ملاقات کی اور میرے گھر جا کر
میری اہلیہ سے بھی ملے۔ ایک روز تو وہ میری صفائی میں بیرسٹری کا گاؤن پہن کر عدالت
کے کٹہرے میں آن کھڑے ہوئے اور وکلاء صفائی میں اپنا نام درج کروایا۔ میرے
لیے جواہر لال کو گاؤن میں دیکھنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ کشمیر چھوڑ دو کی تحریک
تمام ریاست میں پھیلتی جا رہی تھی۔ خاص طور کشمیر کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو دھڑا
دھڑ گرفتاری کے لیے پیش کیا تھا۔ کافی مظالم برداشت کیے اور کتنے ہی نوجوانوں نے
جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ چودھری غلام عباس بہت ہی جذباتی رہنما تھے۔ انھوں نے
بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ اگرچہ اُن کے رہنما محمد علی جناح صاحب
نے شملہ کی بلندیوں سے جاری کیے ہوئے بیان میں اسے "بیرونی عناصر کی شہ پر"
شروع کی گئی غنڈوں کی تحریک قرار دیا تھا اور اُن کے ساتھی میر واعظ کے پیروکار اس
تحریک کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مقدمہ کوئی تین ہفتے تک جاری رہا۔ جس کے
دوران میں نے عدالت کے سامنے ایک بیان پیش کیا یہ بیان اس مقدمے کی مفصل
روئداد KASHMIR ON TRIAL میں چھپ چکا ہے۔ بیان میں میں نے کہا۔
"یہ ایک معمولی بات ہے کہ مجھے قید کیا جاتا ہے، مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا

ہے یا مجھے سزا دی جاتی ہے۔ لیکن یہ معمولی بات نہیں ہے کہ کشمیر کے عوام غربت، تحقیر اور پستی کا شکار بنائے گئے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ گذشتہ دو مہینوں کے دوران ان پر کیا کیا قیامتیں ڈھائی گئی ہیں اور ان پر اِس وقت کیا غضب بیت رہا ہے۔ اُنہی واقعات نے ہمارے مُطالبے اور "کشمیر چھوڑ دو" کے نعرے کی معقولیت اور منطق کو واضح کیا ہے۔ ایسا نظام جو اِس قسم کے ہتھکنڈوں کے سہارے کے بغیر نہیں جی سکتا، قابلِ مذمت ہے۔ اگر میری اور میرے ساتھیوں کی قید سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے ہم نے اپنے آپ کو وقف کیا ہے تو ہم اُس پر بے حد خوش ہیں اور ہم اپنے وطن اور اپنے آباؤ اجداد کی دھرتی کی خدمت کرنے پر فخر سے سرشار ہو جائیں گے۔"

۱۰ ستمبر کو جب جج نے اپنا فیصلہ سنایا تو عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ عدالت سے باہر بھی ہزاروں لوگ فیصلہ سننے کے لیے اکٹھا ہو گئے تھے۔ مجھے تین الزامات میں الگ الگ تین تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ جو یوں تو نو سال کے عرصے پر محیط ہوتی تھی مگر چونکہ یہ سزا بیک وقت شروع ہوتی تھی اِس لیے یہ تین سال قید کے مترادف تھی۔ اِس کے علاوہ پانچ سو روپے کا جرمانہ بھی عاید کیا گیا۔ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کا ایک پہلو بہت دلچسپ ہے۔ جہاں کانگریس نے مجموعی طور پر ہماری حمایت کی وہاں کانگریسی پریس نے جس پر ہندو سرمایہ داروں کا غلبہ تھا بھارا جاکی حمایت کی۔ اس کے برعکس جہاں جناح صاحب اور مسلم لیگ نے ہماری مخالفت کی وہاں لاہور کے لیگی اور مسلم پریس نے ہماری خوب تائید کی۔ مہر اور سالک کے اخبار "انقلاب" نے تو لیگ اور مسلم کانفرنس پر رجعت پسندی کا الزام لگایا۔ "زمیندار، احسان" وغیرہ نے بھی ہماری حمایت میں لیگ کی پالیسی کے خلاف تھام کھلا اداریے لکھے۔ آغا عبدالکریم خان المعروف شورش کاشمیری نے جو تحریکِ

پاکستان کے حامی تھے تحریک کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پُرجوش انداز میں یوں للکارا:

اے ہری سنگھ نواہائے شرربار سے ڈر
وقت اور وقت کی بدلی ہوئی رفتار سے ڈر
بجلیاں کوندرہی ہیں سرِ میدانِ وفا
شیرِ کشمیر کے آوازۂ پیکار سے ڈر
اپنے محلوں کی دھڑکتی ہوئی بنیاد کو دیکھ
اپنے آغاز کے انجامِ سیاہ کار سے ڈر
میرے خامے کی اَزانوں میں ہے شمشیر کا لوچ
ہاں سنبھل دیکھ میرے شعلۂ گفتار سے ڈر

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے ہیچ نامہ امرتسر کی اصل حقیقت بے نقاب کرتے ہوئے لکھا:

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں
بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں
مرد کا سرمایۂ محنت پچھتر لاکھ میں
عورتوں کا جوہرِ عصمت پچھتر لاکھ میں
مُلک و ملّت قوم، مال و جاں پچھتر لاکھ میں
ہاں پچھتر لاکھ میں ہاں ہاں پچھتر لاکھ میں

کشمیر وادی میں وہاڑا گونج اُٹھے کہسار
ہو گئے بیدار مزدور اور جاگے کاشتکار
چار سُو آزادیٔ جمہور کی سُن کر پکار
ہو گئی برہم نشے میں نخوتِ سرمایہ دار
عیش کے کانوں میں پیغامِ اجل آنے لگا
کاروبارِ شہریاری میں خلل آنے لگا

مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" میں لکھا:

ہر طرف ہنگامہ پھر برپا ہے دار و گیر کا
ہو رہا ہے پھر ہرا زخم تنِ کشمیر کا
گونجتی ہے پھر فضا زنجیر کی جھنکار سے
شور جس میں دب رہا ہے نعرۂ تکبیر کا

جواہر لال نہرو نے بعد میں اس مقدمے کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے اپنی پُرزور، برجستہ اور صاف و شفاف نثر میں لکھا۔

"عوامی تحریکیں، جس کے پیچھے کوئی قوت یا صداقت ہوتی ہے، عام طور پر ایسی شخصیتوں کو نمایاں کرتی ہیں جو اس تحریک کی علامت اور نشان بن جاتی ہیں۔ اسی قاعدے کی رو سے شیخ محمد عبداللہ آزادی کے لیے کشمیری عوام کی اُمنگوں کے سب سے ضیابار اور جیتے جاگتے نشان بن گئے ہیں۔ اس حساب سے شیخ محمد عبداللہ کا مقدمہ بھی ایک فردِ واحد کے مقدمے کی سطح سے بہت اُوپر اُٹھ گیا۔ ایک پوری قوم کو کٹہرے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس کو زیادہ صحت کے ساتھ یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ رائے عامہ کی عدلیہ کے سامنے ریاست کے اُن حکام کی پیشی تھی جنھوں نے ریاست کی عظیم عوامی تحریک کے دھارے کا رُخ موڑنے کی فضول کوشش کی تھی۔ یہ بات حیرت ناک ہے کہ حکم چلانے والے لوگ کس طرح تاریخ کے سبق کو بھول بیٹھے اور اُن کی عقل و دانش پر اس قدر پتھر پڑ گئے کہ وہ ہم عصر واقعات کی منطق بھی نہیں سمجھ سکے۔ ریاست کے عوام نے ریاست کی مسلح افواج کے خلاف جدوجہد شروع کی ہے وہ اس مقدمے کے ساتھ ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ داستان اُس وقت تک چلتی رہے گی جب تک یہ اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔"

("کشمیر آن ٹرائل" کا دیباچہ)

▲▲▲

اسیری کے کوائف

مجھے سزا سنائی گئی اور اُس کے فوراً بعد جموں کے باہو قلعے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی۔ ہر طرف گھاس اُگ آئی تھی جو انسان کے قد کے برابر اونچی تھی۔ بھڑوں کے چھتے ہر طرف موجود تھے اور زنبور دن بھر اپنی بھنبھناہٹ کا منحوس ساز بجاتے رہتے تھے۔ سانپ اور بچھو بھی کچھ کم نہ تھے اور شکار کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ الغرض یہ جگہ انسانی رہائش کے بالکل قابل نہ تھی۔ میں نے اس کھلی زیادتی کے خلاف احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال کی۔ حکومت فوراً جھک گئی اور مجھے قلعۂ باہو سے نکال کر ریاسی سب جیل بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں سردار بدھ سنگھ، خواجہ غلام نبی وکیل عرف نب جی اور پنڈت کشپ بندھو پہلے ہی موجود تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جیل خانہ بھی انسانی بود و باش کے لائق نہ تھا۔ ریاسی میں بے پناہ گرمی پڑتی ہے۔ مچھروں کے ٹڈی دل انسانی خون کی پیاس میں شب خون مارتے تھے اور سانپ اور بچھو جیل میں سر نکالتے رہتے تھے۔ مگر ہم کرتے بھی کیا۔ چار و ناچار دن گذارتے رہے۔ ریڈیو اور اخبارات سے ہم کو محروم رکھا

گیا تھا۔ لیکن ایک بات بہت اچھی تھی میرے ساتھیوں نے ڈیرہ خوب سجایا تھا۔ جس کوٹھری میں مجھے بٹھایا گیا وہ میرے ساتھیوں کا گودام گھر تھا۔ فرش پر مختلف قسم کی ہانڈیاں رکھی ہوئی تھیں اور دیواروں پر پوٹلیاں قطار در قطار لگی ہوئی تھیں۔ مجھے شوق چرایا کہ ذرا دیکھوں ان ہانڈیوں وغیرہ میں کیا رکھا ہوا ہے؟ جب اُن کے ڈھکن کھولے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ان میں انواع و اقسام کی پڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کو کھولا تو کسی میں لونگ اور دوسرے گرم مصالحے پائے۔ اور بھی بہت سی چیزیں فرش سے لٹک رہی تھیں۔ کچھ اور ہانڈیوں میں کھانڈ، سوجی، گھی وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ الغرض کمرہ کیا تھا۔ باضابطہ پنساری کی ایک دوکان تھی۔ ہم نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا "بھئی یہ پنساری کی دوکان کیوں اور کس لیے سجا رکھی ہے؟" سردار بدھ سنگھ مسکراتے ہوئے بولے کہ "یہ میرے دو ساتھی جو جیل میں بچت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ خود کھاتے پیتے تو ہیں نہیں۔ اپنے راشن کے پیسوں سے اول جلول چیزیں منگواتے رہتے ہیں اس میں سے تھوڑا سا خرچ کر کے باقی حفاظت سے رکھ دیتے ہیں۔ بعد میں مہینے بھر کے بعد اسے بازار میں بکنے کے لیے بھیج دیتے ہیں اور اسے نقدی میں تبدیل کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہسپتال سے یہ شیشوں کے بنڈل لا چکے ہیں اور غالباً اُن کو بھی بعد میں نقد نارائن کی شکل دیں گے۔" سردار صاحب خاموش ہوئے تو بندھو جی ایک کونے سے بول اُٹھے "سردار صاحب اناپ شناپ بول رہے ہیں۔ یہ خود تو روز حلوا اور دُکیا چٹخارے لے کر چٹ کر جاتے ہیں اور پھر دُنیا کو بتاتے ہیں کہ میں تیاگی ہوں اور پیٹ پر پتھر باندھے رہتا ہوں۔" اس پر قہقہے چھوٹے اور خوب ہنسی مذاق رہا لیکن میں نے ایک بار کیشپ بندھو سے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس طریق کار کا

مقصد کیا ہے۔ اب بندھو جی بڑی سنجیدہ صورت بنا کر فہمائش کے انداز میں کہنے لگے "بھئی تم مسلمان لوگ صرف پیٹ پوجا کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ جو بھی ہاتھ آیا چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہو۔ تمھیں کبھی فکرِ فردا کی توفیق نہیں ہوئی۔ آخر ہم جیل میں آئے ہیں اور کیا معلوم ہمیں کب تک یہاں سڑنا پڑے۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں بھی کچھ پیسہ پونجی جمع کر لیں تاکہ جب جیل سے باہر جائیں تو ٹھن ٹھن گوپال کی طرح خالی ہاتھ نہ جائیں۔" میں اس منطق پر خوب ہنسا۔ بہر حال بات آئی گئی ہوئی البتہ انھوں نے جو کھانڈ وغیرہ جمع کی تھی اس کا میں حلوا بناتا رہا۔ انھیں بھی کھلاتا اور خود بھی کھاتا۔ بچارے کیشپ بندھو چار و ناچار ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے لیکن بقول شاعر؎

کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے بیٹھے ہیں

گرمی کا زور بڑھتا گیا اور ہم حکومت پہ زور ڈالنے لگے کہ ہمیں کسی ٹھنڈی جگہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ہماری بات کا اثر ہوا۔ اور ہمیں بھدرواہ جیل بھیج دیا گیا۔ سردار بدھ سنگھ پیچھے رہ گئے۔ لیکن مرزا محمد افضل بیگ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ بھدرواہ جیل میں مجھے بیگ صاحب، غلام نبی وکیل المعروف نب جی اور بندھو جی کے ساتھ محبوس رکھا گیا۔ باقی کچھ ساتھی قلعہ رام نگر میں قید رکھے گئے۔ کچھ ادھم پور میں زیر حراست رہے اور کچھ جموں سنٹرل جیل میں قید۔ سرینگر جموں سڑک پر بٹوت کے قریب دشوار گذار پہاڑیوں کی اونچائی پر ایک جگہ ایسی ہے جسے گج پتھ کہتے ہیں۔ اس کا نام ہی پرانے زمانے میں کشمیریوں میں لرزہ پیدا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہاں عمر قید کی سزا بھگتنے والے خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے اور اس چار دیواری کا نظارہ دور سے دیکھنے والوں کے لیے بھی ہیبت اور ہول کا عالم پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ

ہماری نظر بندی کے دوران اس خستہ حال زندان خانے کی مرمت کرائی گئی۔ اطلاعات کے مطابق پنڈت رام چند کاک کا ارادہ یہ تھا کہ مجھے وہاں بھیج دیا جائے۔ لیکن اس ارادے کی بھنک کسی طرح عوام میں پہنچ گئی۔ چاروں طرف زبردست شور اٹھا اور کاک صاحب کی دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ بعد روزہ جیل میں ہمارے شب و روز بسر ہوتے گئے۔ اب ہمیں جیل میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ اور چاروں طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ انسان انسان کے خون سے ہولی کھیل رہا تھا۔ اور اس طرح آزادی کی صبح خون آشام چہرے کر طلوع ہو گئی تھی۔ ہم نے زندان سے ہی لاہور میں مقیم ساتھیوں بخشی صاحب اور صادق صاحب سے خفیہ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ تاکہ ہم تیزی سے بدلتے ہوئے واقعات کی ٹوہ لگاتے رہیں اور حالات کی رفتار سے مقدور بھر واقف رہ سکیں۔ یہ رابطہ قائم کرنے کے لیے بھی ہم نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو الف لیلوی انداز کا تھا۔ ہم تاریکی میں قلعے کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف ایک لمبی رسی پھینک دیتے تھے۔ اُدھر لاہور سے آیا ہوا ایلچی تازہ ترین ڈاک رسی کے ایک سرے میں گرہ لگا کر باندھ دیتا تھا۔ ہم رسی کو کھینچ لیتے پھر ڈاک کی یہ تھیلی کسی گنج گراں مایہ کی طرح کھولتے تھے۔ اور بعد میں کسی نہ کسی طرح اپنا جواب بھی اپنے قاصد تک پہنچا ہی دیتے تھے۔

جیل کی چار دیواری میں اگرچہ ہمارے جسم قید تھے۔ لیکن ہمارے ذہن باہر کی وسیع دنیا میں برپا ہنگاموں کے ساتھ گتھے ہوئے تھے۔ اور ہمارے اندر ایک حشر بپا رہا تھے۔ ہمارے سامنے سب سے نازک اور اہم سوال یہ تھا کہ بدلی ہوئی سیاسی دنیا میں ریاست جموں و کشمیر کے لیے کونسا راستہ فائدہ مند رہے گا۔

آیا وہ ہند کے ساتھ الحاق کرے پاکستان میں شامل ہو یا دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے اپنا وجود برقرار رکھے۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں تو پاکستان کبھی اس کو تسلیم نہ کرے گا۔ اور ریاست جنگ کا اکھاڑہ بن جانے کے علاوہ داخلی محاذ پر بھی انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن میرے دوستوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی سیاست کبھی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی ترجمان نہیں رہی ہے۔ بلکہ اس پر ہمیشہ سامنتی سوچ اور جاگیردارانہ نظام کا غلبہ رہے گا۔ اس لیے پاکستان میں یہ رجحان غالب رہیں گے اور وہاں عوامی امنگوں کے پورا ہونے کے امکان بہت تاریک ہیں۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کے عوام بھی پاکستان میں رہ کر اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ کر سکیں گے۔ جو انھوں نے "نیا کشمیر" کی صورت میں قلمبند کیا ہے۔ اس طرح سے ہم اسی لعنت کا طوق پھر پہن لیں گے۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہم نے اتنی کڑی اور قیمتی قربانیاں پیش کی ہیں۔ ان دوستوں کا استدلال یہ بھی تھا کہ برصغیر کے بٹ جانے کے باوجود ہندوستان میں ایسی جماعتیں اور افراد موجود ہیں جن کی سوچ ہماری سوچ سے اور جن کے اصول ہمارے اصولوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ ہم اپنے دل کی مراد اور خوابوں کی تعبیر اسی مملکت کے ساتھ ناطہ جوڑ کر کر سکیں۔ اُدھر لاہور سے جو اطلاعات آ رہی تھیں وہ بھی ہمارے ان اندیشوں کی غمازی کر رہی تھیں۔ ہمارے سامنے کشمیر کو آزاد رکھنے کا سوال بھی ابھرا۔ لیکن ہماری مشترکہ رائے تھی کہ آج کل کی دنیا میں جب فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ کشمیر جیسی چھوٹی سی اکائی کے لیے جو بڑی طاقتوں کے مکمل نرغے میں ہو، آزاد رہنا مشکل ہی نہیں محال ثابت ہوگا اور وہ سازشوں اور بدامنیوں کا گہوارہ بنی رہے گی۔ البتہ یہ بات بالکل دوسری ہے کہ خود یہ طاقتیں ایسا چاہیں اور اس کی ترقی

اور امن و امان کے لیے ضمانت دیدیں تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال فرصت کے لمحات میں ہم ان مسائل کی پرتیں کھولتے رہتے تھے۔ اور اُن پر کافی دماغ سوزی کرتے رہتے تھے۔

اُدھر حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ آگ اور خون کی بھیانک لہریں مشرقی اور مغربی پنجاب میں اُودھم مچا رہی تھیں۔ وہی لوگ جو آزادی کے لیے دیوانے ہو رہے تھے اب آنسو بہاتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کہیں اِس قسم کی آزادی سے انگریزوں کی غلامی ہی تو بہتر نہ تھی؟ ہم تک یہ اطلاعات پہنچتیں تو ہم بھی اپنا کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔ صرف میرے لب پہ یہ دعا مچلتی رہتی کہ ہماری ریاست اس طوفانِ بدتمیزی سے محفوظ و مامون رہے۔

ہمارے دِلوں میں آتش فشاں گرم تھا کہ بھدرواہ میں بھونچال کے شدید جھٹکے آنا شروع ہو گئے۔ یہ جھٹکے ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک جاری رہے۔ بیچارے بھدرواہ والے گھبرا گئے اور اُنھوں نے گھروں سے باہر آکر جنگلوں اور کھلے میدانوں میں ڈیرے جما دیئے۔ ہم بھدرواہ کے قلعے میں قید تھے اس کے تین اطراف میں اونچے اونچے دو منزلہ مکانات واقع ہیں۔ ایک طرف اونچی دیوار کھڑی تھی۔ بیچ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ زلزلے کا زبردست جھٹکا آیا تو ہم چاروں ساتھی جھٹ سے اِس صحن میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری نگاہیں قلعے کے کنگروں کی طرف لگی ہوئی تھیں بیگ صاحب زلزلے سے سخت ڈرتے ہیں۔ وہ کافی گھبرا گئے۔ کیشپ چندھو اُن کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں چائے کی گرم گرم پیالی تھی۔ اُن کی نظر قلعے کی کنگری پر تھی لیکن کبھی کبھی گھبراہٹ میں چائے کی چسکی بھی لے لیتے اور بیگ صاحب کو تسلی بھی دیتے۔ پیالے سے گرم چائے کے قطرے بیگ صاحب کی گردن پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بیگ صاحب نے کنگروں سے تو نظر نہیں اُٹھائی لیکن چلا اُٹھے۔ "کبھی تم نے تو مجھے جلا دیا!" کیشپ چندھو جواب دے رہے تھے کہ "میری نہیں زلزلے کی کارستانی ہے۔" اُدھر جھنگرن پر جھٹکے لگ رہے تھے۔ ہمارا باورچی ایک ہندو تھا۔ ہم اُس کو باہر آنے کی ترغیب دیتے رہے لیکن وہ نہ مانا۔ اور بڑے گیانی دھیانی کا روپ دھارن کر کے بولا کہ پرماتما جو کرتا ہے وہی ہو گا۔ اُس کے بغیر کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ لیکن جب جھٹکے ذرا سا تیز ہو گئے اور کنگروں سے اینٹیں گرنے لگیں تو پنڈت جی مہاراج کی ساری شیخی ہَوا ہو گئی۔ وہ ڈر کے مارے بید لرزاں کی طرح کانپنے لگے۔ گھٹنوں گھٹنوں چلتے ہوئے اور رام رام جپتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے نیچے آ گئے۔ مہاشے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ سیدھے ہمارے پاس پہنچ کر بیچ میں گھس گئے۔ صورتِ حال بگڑتی جا رہی تھی اور ہماری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ہم نے جیلر سے بڑی اِستدعا کی کہ دروازہ کھول کر ہمیں میدان میں لے جاؤ لیکن اُس نے سپرنٹنڈنٹ کے حکم کے بغیر ایسا کرنے سے اِنکار کر دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ہم نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ لیکن دروازہ بھی خم ٹھونک کر کھڑا رہا۔ آخر جب حالات انتہائی نازک ہو گئے تو دروازہ کسی نہ کسی طرح کھل گیا اور ہم دوڑ کر میدان میں جا کر قدرت کی اس جلالی ترنگ کا مشاہدہ کرنے لگے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک مقامی ڈاکٹر تھا۔ ہمارا اتا پتا لینے کے لیے آن پہنچا اور ہماری حالت دیکھ کر دُور سے ہی کہنے لگا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک اُونچی سطح کے میدان میں کھڑے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہماری طرف آ رہے تھے۔ وہ ہمیں تسلی دیتے ہوئے اُدھر آنے لگے کہ زلزلے کا ایک جھٹکا آیا۔ بیچارے ڈاکٹر صاحب اُوندھے ہو کر رہ گئے اور نیچے لڑھکتے چلے گئے۔ اب ہماری باری تھی اُنھیں دلاسا دینے کی گھبرائیے مت

سب خیریت ہے۔ بہرحال ہم ایک مہینے تک شامیانوں میں رہے جب زلزلے کے جھٹکے ختم ہو گئے تو ہم واپس قلعے میں داخل ہو گئے۔ اُن دنوں کا ایک اور پُرلطف واقعہ میرے ذہن کے پردے پر اُبھر رہا ہے۔ ہمیں جو راشن الاؤنس ملتا تھا اُس کا حساب کتاب ہم نے پنڈت کیشپ بندھو کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ جیلر کے ذریعہ روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں منگوایا کرتے اور اُن کا حساب رکھتے۔ ایک دن میں نے اپنے کمرے میں بلند آوازے چیخ کی آواز سنی۔ باہر آ کر دیکھا کہ بندھو جی جیلر کے ساتھ سخت تیز کلامی کر رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے؟ بندھو جی بولے کہ "میں نے صبح جیلر سے سگریٹ کی ڈبیہ لانے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے اَن سُنی کر دی اور میں صبح سے سگریٹ کے ایک کش کے لیے تڑپ رہا ہوں"۔ میں نے معاملہ ختم کرنے کی غرض سے کہا کہ "کوئی بات نہیں ہے میں بیگ صاحب سے ایک سگریٹ لاتا ہوں۔ رات بھر گذارہ کیجیے اور پھر صبح جیلر سے دو ڈبے سگریٹ وصول کیجیے"۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اور بندھو جی کونے میں سندھیا میں لگ گئے۔ مجھے کسی چیز کے لیے اُن کے کمرے میں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کمرے میں میری نظر ایک کونے میں لٹکے ہوئے ایک تھیلے پر پڑی۔ میں نے تھیلے کو کھولا تو میری آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں کیونکہ اس تھیلے میں سگریٹ کے ایک نہیں، دو نہیں پورے سترہ ڈبے محفوظ و مامون رکھے ہوئے تھے۔ میں اُلٹے پاؤں بیگ صاحب کے کمرے میں گیا اُن کو سارا ماجرا سنایا اور سگریٹ کا تھیلا اُن کے سامنے رکھا۔ بیگ صاحب کو شرارت سوجھی۔ ہم نے سگریٹ تھیلے سے باہر نکال لیے اور ہمارے پاس جتنے پھٹے پُرانے جوتے تھے اُن کو تھیلے میں بند کر کے بندھو جی کے کمرے میں اُسی جگہ لٹکا دیا جس جگہ یہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے دن فیصلے کے مطابق جیلر بندھو جی کے لیے سگریٹ کے دو ڈبے لے آیا۔ بندھو جی خراماں

خراماں ایک ڈبیہ کو تھیلے میں رکھنے کے لیے چلے۔ ہم چپکے چپکے اُن کو تاک رہے تھے۔ جب اُنھوں نے وہ تھیلا کھولا تو اُن پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ لیکن ہم سے کچھ کہتے نہیں بنی۔ چند دن گذر گئے تو ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے۔ ہم نے پوچھا کہ مسکراہٹ کس خوشی میں ہے۔ تو بولے کہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود چپ سادھے بیٹھے ہو؟ ہم نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ بہرکیف بڑی منت سماجت کی تو ہمارا دل پسیج گیا اور ہم نے اُنھیں سگریٹ واپس کر دیے۔ لیکن اُنھیں سگریٹ لوٹاتے ہوئے میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا آپ کا ارادہ سگریٹ کی دوکان چلانے کا ہے؟ بندھو جی نے ریاستی جیل والا جواب دُہرایا اور کہا کہ "تم مسلمانوں نے تو کبھی فکرِ فردا کی ہی نہیں ہے۔ آخر ہم جیل میں ہیں اور کمائی کا کوئی وسیلہ نہیں۔ اگر چہ راسیلے نے سگریٹ بیچ کے لاکھوں روپے بنالیے تو میں بھی کچھ نہیں گھر جا کر سگریٹ کی دوکان ہی کروں گا"۔ جیل میں میرا ایک اور مشغلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بھدرواہ میں سُرخ رنگ کی مینائیں میرے کمرے کے اوپر منڈلا رہی ہوتیں تو میں دانا دُنکا بکھیر دیتا اور وہ آہستہ آہستہ یہ دانا چُگنے لگتیں۔ پہلے تو وہ مجھ سے ڈرتی تھیں۔ اور میری آہٹ پا کر پھُر سے اُڑ جاتیں لیکن آہستہ آہستہ مجھ سے مانوس ہو گئیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ میں اُن کو ہاتھ میں لے کر اُن کے کانوں میں آویزے پہنایا کرتا اور وہ بڑی ادا سے یہ آویزے ہلانے لگتیں میں دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ علامہ اقبال کی یہ آرزو ہم نے جیتے جی پوری کر ہی لی۔ ع

۱؎ سرینگر کا ایک پان سگریٹ بیچنے والا دوکاندار جو بھاری دولت اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوا۔

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ٹھنگے سے اس کے دل میں کھٹکا نہ کچھ مِرا ہو

میری اسیری کے دوران کئی کانگریسی لیڈر اور رہنما کشمیر آئے۔ جن میں سے دو کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تھے مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریس کے اس وقت کے صدر آچاریہ جے بی کرپلانی۔ کرپلانی جی آئے تو تھے کشمیر کے حالات کا مطالعہ کرنے لیکن ان کی اصل غرض و غایت کا پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن یہ بات ضرور ہوئی کہ انھوں نے اپنے دورے کے بعد کشمیری عوام میں کچھ اچھے اثرات نہیں چھوڑے۔ یہ بات بھی سننے میں آئی تھی کہ وہ سردار پٹیل کی طرف سے مہاراجہ کے نام پیغام لے کر آئے تھے۔ بہرحال مہاراجہ کشمیر سے پچاس ہزار روپیہ کا ایک چیک بھی پُراسرار مقاصد کی تکمیل کی خاطر اینٹھ لے گئے۔ کرپلانی جی کو مہاراجہ نے یہ خطیر رقم کس غرض کے لیے دی؟ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا ہے۔ حال ہی میں اس پر کافی لے دے بھی ہوئی۔ مگر کرپلانی جی بغلیں جھانکنے لگے لیکن حساب فہمی کی بات پی گئے۔

جہاں تک مہاتما گاندھی کے کشمیر آنے کا تعلق تھا یہ اُن کے لیے کشمیر دیکھنے کا پہلا اور آخری موقع تھا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۹۱۵ء میں کُنبھ میلے میں اُن کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر نہیں آسکے تھے۔ پھر میں نے انھیں کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے نہ صرف اس دعوت کو قبول کیا تھا بلکہ وہ کشمیر کے لیے روانہ ہوئے اور ایبٹ آباد تک پہنچ گئے۔ انھوں نے مہاراجہ کی دعوت پر سرکاری مہمان بننا قبول کر لیا تھا۔ جب یہ بات میں نے سنی تو میں نے اِس پر اُن سے احتجاج کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ مہاراجہ کا مہمان

بن کر وہ کشمیری عوام کو کرب میں مبتلا کریں گے۔ ان کو تو کشمیری عوام کا مہمان بن کر آنا چاہیے۔ گاندھی جی مہاراجہ سے قول ہار چکے تھے لیکن میرے استدلال کا بھی اُن کے پاس جواب نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے دوسرے روز اپنی من پسند گری کے ساتھ واپسی کا رُخ اختیار کیا۔ اور کشمیر یاترا کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

اُن کے کشمیر آنے سے پہلے دہلی میں ایک اچھا خاصا ڈراما کھیلا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جواہر لال نہرو نے کشمیر کے حالات سن کر پھر سرینگر آنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن حکومتِ کشمیر اُن کے آنے سے گھبرا رہی تھی۔ اس نے اپنی یہ تشویش وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن تک پہنچادی۔ جنھوں نے مہاتما گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اس مرحلے پر پنڈت جواہر لال کو کشمیر جانے سے روک دیں۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ جواہر لال اِس معاملے میں خاصے جذباتی ہیں۔ یہ صورت دیکھ کر مہاتما گاندھی نے جواہر لال کی بجائے خود کشمیر جانے کی پیش کش کی۔ ماونٹ بیٹن نے کشمیر دربار سے مشورہ کر کے گاندھی جی کو لکھا کہ آپ کشمیر چلے جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ محمد علی جناح بھی وہاں جانے کا فیصلہ کریں۔ اور اس طرح کشمیر میں کشمکش اور تضاد کے شعلے اور بھڑکیں گے۔ اسی اثنا میں رام چند کاک دہلی گئے۔ کاک نے سردار پٹیل سے ملاقات کی اور سردار پٹیل نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ جواہر لال کے کشمیر جانے کے سخت خلاف ہیں۔ پنڈت جی کے کانوں میں اس کی بھنک پڑی تو انھوں نے گاندھی جی کو لکھا:

"میں نے وائسرائے کی چٹھی دیکھی ہے۔ میں اس بات کے تذکرے سے تنگ آگیا ہوں کہ پنڈت کاک کیا سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہتر یہ رہے گا کہ اُس کے مشورے کے برعکس عمل کیا جائے۔ کئی مہینوں"

آپ کے یا میرے کشمیر جانے کا معاملہ چل رہا ہے اور اب میں اس سے عاجز ہو گیا ہوں۔ میرا طریقہ اس طرح کام کرنے کا نہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ زندگی میں اس معاملے سے زیادہ کسی چیز نے میرے صبر کا امتحان لیا ہو۔ اگر ایک طرف ہندوستان کی وزارت داخلہ ہو اور دوسری طرف کشمیری عوام کو میری موجودگی کی ضرورت تو میں بلا کسی جھجک کے اپنے عوام کے پاس جانا پسند کروں گا۔"

بہرحال گاندھی جی نے سردار پٹیل کے مشورے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کشمیر جانے کا فیصلہ کر لیا اور ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو سرینگر کی طرف چل پڑے۔ اُن کے سرینگر روانہ ہونے سے قبل برلا ہاؤس میں جہاں گاندھی جی تھے، ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال اور سردار پٹیل نے بھی شرکت کی۔ کشمیر اگر وہ یقیناً مجھ سے ملتے اور انھوں نے اس کا اظہار یہاں اپنے بہت سے ملنے والوں سے بھی کیا تھا۔ لیکن میں ایک دور دراز پہاڑی علاقے میں محبوس تھا۔ اس لیے اُن کا مجھ سے ملنا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ راولپنڈی کے راستے سے آئے اور پہلی اگست کو سرینگر پہنچے۔ اُس دن شام کو سرینگر میں حکومت نے اس خوشی میں چراغاں کیا تھا کہ گلگت پر برطانیہ کی عملداری ختم ہو گئی تھی اور وہ کشمیر دربار کو بحال کر دیا گیا تھا۔ اُن کے سرینگر پہنچنے کے چند گھنٹے بعد ہی مہارانی تارا دیوی جنھوں نے اپنے شوہر کو مٹھی میں بند کر رکھا تھا، گاندھی جی کی قیام گاہ پر آئیں۔ وہ کار سے اتر کر ننگے پاؤں گاندھی جی کے پاس چلی گئیں۔ اُن کے ہاتھ میں ایک طلائی طشتری میں رکھا ہوا جھاگ سے بھرا دودھ کا پیالہ تھا۔ انھوں نے کورنش بجا لا کر طشتری گاندھی جی کی طرف بڑھا دی۔ گاندھی جی نے کہا یہ کیا ہے؟ تو مہارانی بولیں

کہ ہمارا دستور ہے کہ جب کوئی مہارشی یہاں آئے تو ہم اسے دودھ پیش کرتے ہیں۔"

گاندھی جی نے ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہا کہ "جس رعایا کی ماں بھوکی ہو، گاندھی اُس کا دودھ نہیں پیتا۔" سرینگر میں اُن کا قیام باغات برزلہ میں سیٹھ کشوری لال کے مکان پر رہا۔ جہاں وہ اپنی روزانہ پرارتھنا سبھائیں منعقد کرتے اور عوام کے بھاری اجتماعات سے ملتے۔ گاندھی جی شہر اور وادی میں ادھر اُدھر گھومے پھرے۔ انھوں نے وزیر اعظم کاک سے مُلاقات کی اور مہاراجا نے انھیں شاہی محل میں دعوت پر بلایا۔ جہاں مہاراجا نے اُن کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ مہارانی نے اُن کی آرتی بھی اُتاری اور اُن کے چرن بھی چھوئے۔ لیکن اس مردِ قلندر کی بے نیازی کی یہ شان تھی کہ اُس نے مہاراجا سے اس کے منہ پر کہا کہ "تمھاری رعایا تم سے ناراض ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" گاندھی جی نے مہاراجا اور مہارانی کے پرزور اصرار کے باوجود شاہی محل میں کچھ کھانے پینے سے انکار کر دیا۔ اور مہاراجا اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

مہاتما شہر کے گنجان محلوں سے گزرتے ہوئے ہمارے گھر صورہ بھی تشریف لے گئے۔ جہاں بیگم صاحبہ نے اُن کا سواگت کیا اور ہندو دستور کے مطابق اُن کی خاطر تواضع بھی کی۔ گاندھی جی نے پدرانہ شفقت کے ساتھ اُن کی ڈھارس بندھائی اور انھیں مفید نصائح سے بھی نوازا۔ گاندھی جی نے انھیں تیز رنگانہ سرگرمی انداز میں تکلف سے بھی گریز کا مشورہ دیا۔ بیگم صاحبہ نے گاندھی جی کی دعائیہ مجلسوں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ وہاں تلاوتِ کلامِ پاک بھی کی۔ مہاتما گاندھی کشمیر میں ٹھہر کر ۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو جموں کے راستے واپس چلے گئے۔ جموں میں انھوں نے شام کے وقت ایک پرارتھنا سبھا کی اور وہاں لوگوں کے ایک وفد سے کہا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔ واپسی پر انھوں نے پریس کو کشمیر

کے بارے میں ایک بیان بھی دیا۔ اُنھوں نے کہا: "میں نے دیکھا کہ کشمیریوں کے دلوں پر شیخ عبداللہ راج کرتے ہیں۔ کشمیر کے مہاراجا نے اپنی رعایا کا اعتماد کھو دیا ہے۔ وہ شیخ عبداللہ کی عزت کرتے ہیں۔ ان کی سیواؤں اور قربانیوں کے سبب شیخ صاحب کو رہا کرنے سے ہی کشمیر کے عوام خوش ہوں گے۔" واپسی پر جواہر لال کو اپنے دورے کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا:

"میں نے وہاں پرارتھنا سبھائیں تو کیں لیکن تقریر نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کوئی پابندی عائد تھی۔ بلکہ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں وہاں سیاسی تقریر نہیں کروں گا۔ میں نے ریاست کے وزیراعظم کو بتایا کہ وہ عوام میں کتنا غیر مقبول ہے۔ اس نے مہاراجا کو لکھ دیا ہے کہ اس کے اشارے پر وہ وزیراعظم مستعفی ہو جائے گا۔ جب میں مہاراجا سے ملا تو مہارانی کے ساتھ اُن کا ہونے والا جانشین بھی بیٹھا ہوا تھا جس کی ایک ٹانگ پر پلستر لگا ہوا تھا۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ برطانیہ کے اقتدارِ اعلیٰ کے خاتمے کے ساتھ کشمیری عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کا دور شروع ہو جائے گا۔"

گاندھی جی نے بھی کشمیر سے واپس جاکر معاہدہ امرتسر کو ایک "بکری پتر" قرار دیا اور کہا کہ اس کی میعاد ختم ہونے پر اب کشمیر کی سرداری اس کے اصل حقداروں یعنی وہاں کے عوام کو منتقل ہونی چاہیے۔

اسی اثنا میں پاکستان اور ہندوستان کی دو مملکتیں وجود میں آگئی تھیں، اور اُن کے درمیان روزِ اول سے ہی کشیدگی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ نے مشرقی پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جہاں مسلمانوں کو کافی جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اُدھر خبریں آنے لگیں کہ پاکستان کے قبائلی کشمیر پر چڑھائی کے لیے پر تول رہے ہیں۔ کشمیر میں مہاراجا حالات کے نئے رُخ سے پہلے ہی پریشان تھا۔ اس نے اپنے وزیراعظم رام چند کاک کو اُس کی ناکام پالیسیوں کی سزا کے طور پر نہایت درشتی کے ساتھ برخواست کر دیا اور ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاراجا کے سترے بہترے ماموں جنرل جنک سنگھ نے قائم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ اُدھر قبائلیوں کی نقل و حرکت کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ ان خبروں سے مہاراجا اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔ ہندو مہاراجا ہراساں ہو کر اپنی نجات میری رہائی میں ہی سمجھنے لگا۔ اُس کو اب نوشتۂ دیوار نظر آ رہا تھا کہ میں ہی آنے والے سیلاب کے آگے بند باندھنے کا کام کر سکتا ہوں۔ مہاراجا پر اندرونی دباؤ بڑھتا گیا اور باہر سے بھی کانگریس کی کوششوں میں تیزی اور شدت آ گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی مہاراجا کو یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ہی ریاست کو بچا سکتا ہے۔

بالآخر مہاراجا نے مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھدرواہ سے بادامی باغ ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں مہاراجا کا برادرِ نسبتی کنور نسچنت چند مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد طے ہوا کہ مہاراجا کی اور میری ملاقات ہو۔ مجھے شاہی محل پہنچا دیا گیا۔ وہاں جانے سے پہلے مجھے مشورہ دیا گیا کہ ملاقات کے وقت میں خیرسگالی کے طور پر کچھ اشرفیاں مہاراجا کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے جب یہ کہا کہ اشرفیاں تو میرے پاس نہیں ہیں تو پنڈت شام سندر لال در نے اپنی جیب سے کچھ اشرفیاں نکال کر میرے حوالے کیں۔ میں جب مہاراجا کے پاس پہنچا تو وہاں مہاراجا اُس کی رانی اور ہونے والے وزیراعظم مہر چند مہاجن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اشرفیاں مہاراجا کو پیش کیں۔ میں نے مہاراجا سے کہا کہ آپ کو جو غرض مند لوگ اُن شبہات میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست کے مسلمان آپ کے یا آپ کے

خاندان کے دشمن ہیں وہ غلط فہمی اور بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی آپ کی گدی چھیننا نہیں چاہتا۔ البتہ ہم ریاست کا نظام حکومت ایک آئینی اور جمہوری طریقے سے چلانا چاہتے ہیں۔ میں نے مہاراجہ سے کہا کہ تازہ حالات واقعی بہت گمبھیر ہیں۔ ان کا مقابلہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ریاست کے مسائل پر عبور رکھتا ہو اور جسے اپنے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ میں نے مہرچند مہاجن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت اچھے اور لائق جج تو ہو سکتے ہیں لیکن انھیں کشمیر کے حالات کی پیچیدگی کا کوئی اندازہ نہیں ہے اور نہ ہی لوگ انھیں جانتے پہچانتے ہیں۔ اس لیے ان کو وزیراعظم مقرر کرنا نہ آپ کے لیے سودمند ہوگا اور نہ ہی اس ملک کے لیے فائدہ مند۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہوگا کہ آپ ان کی تقرری سے گریز کریں۔ یہ بات یاد رہے کہ مہاراجہ اس مرحلے پر مہرچند مہاجن کو وزیراعظم مقرر کرنے ہی والے تھے۔ مہاجن صاحب سردار پٹیل کی ایما پر کشمیر آئے ہوئے تھے اور اس وقت مہاراجہ کے ساتھ اپنی ملازمت کی شرائط طے کر رہے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مہرچند مہاجن کی بیوی ریاست کی تحصیل میرپور کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد لالہ تیج رام ریاست میں تحصیلدار تھے اور ان کے بھائی اسکردو کے وزیر وزارت۔ اس کے علاوہ انھوں نے کانگریس کی طرف سے اس باؤنڈری کمیشن میں کام کیا تھا جس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی حد مقرر کی تھی۔ بہرحال ملاقات ختم ہو گئی۔ میں واپس بادامی باغ آ گیا اور ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ تین سال کی قید کے بدلے مجھے صرف ایک سال چار ماہ اور گیارہ دن کے بعد ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا کہ حالات نے مہاراجہ کو ان کی مرضی کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سرینگر کے جمہوروں، مسلمانوں اور سکھوں نے میرا پرجوش

استقبال کیا۔ چھتہ بل ویر سے مجھے ایک شاندار دریائی جلوس میں لے جایا گیا۔ میں ایک ایسے بجرے میں بیٹھا ہوا تھا جس کو وردی پوش ملاح کھینچ رہے تھے۔ اس کے آگے پیچھے سینکڑوں کشتیاں جا رہی تھیں دریا کے دونوں کناروں پر مردوں، عورتوں اور بچوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ جن کے خوش آمدید کے بولوں اور نعروں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ ۵ اکتوبر کو حضوری باغ میں ایک بہت بڑا عوامی اجتماع ہوا جس میں خواجہ سعدالدین شال نے سرینگر کے شہریوں کی طرف سے ایک خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا: "مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیوں گرفتار کیا گیا تھا اور کیوں رہا کیا گیا۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنے عوام سے دور رہا ہوں اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے الگ تھلگ۔ جس وقت میں جیل گیا اُس وقت برصغیر ایک وحدت تھا۔ آج یہ دو ٹکڑوں میں بٹ چکا ہے۔ کشمیری عوام کو دیکھنا ہے کہ انھوں نے جس خواب کے لیے قربانیاں دی ہیں، وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ ہم وہی راستہ اختیار کریں گے جو کشمیریوں کی آزادی، خوشحالی، نجات اور ترقی کی منزل کی طرف جائے گا۔ غلامی کی صورت میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت فوراً قائم کی جانی چاہیے جو اس نازک سوال پر ریاستی عوام کے حقوق و مفادات کی نگہبانی کے لیے مناسب راہِ عمل اختیار کرے۔ ہم الحاق کا فیصلہ اور حقیقی آزادی حاصل کیے بغیر نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ہمارا نعرہ ہے کہ "الحاق سے پہلے آزادی"۔" ایک اور پبلک جلسے میں انھی دنوں میں نے اس سلسلے میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے:

"اس وقت ریاست جموں و کشمیر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے ساتھ یا الگ تھلگ رہ کر آزاد رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر ہوں جس کی پالیسی بالکل واضح ہے۔ پنڈت جواہر لال میرے بہت قریبی دوست ہیں اور گاندھی جی کی میں عزت کرتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ہماری تحریک کی بڑی مدد کی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود الحاق کے مسئلے کی سب سے بڑی کسوٹی یہاں کے عوام کے مفادات ہوں گے اور میں اس میں حائل نہ ہوں گا۔ ہمارا سب سے پہلا فریضہ اس وقت ڈوگرہ تسلط سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر یہاں کے لوگ پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کریں تو میں سب سے پہلا آدمی ہوں گا جو اس کو تسلیم کرے گا۔"

ں میں نے ساتھ ہی اپنے بنیادی عقائد کا اعادہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر بھی لیا تو اس دو قومی نظریے پر ہم کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے جو آج سارے ملک میں اس درجہ زہر پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔"

▲ ▲ ▲

۳۵

طوفان سے پہلے

میری رہائی کے ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈروں اور کارکنوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میرے جو ساتھی ریاست سے باہر گئے ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگے۔ خواجہ محی الدین قرہ اپنی روپوشی ترک کر کے منظرِ عام پر آگئے۔ میں نے دھیرے دھیرے جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر سے اکٹھا کرنا شروع کیا اور جماعت کو دوبارہ منظم کیا۔ مجاہد منزل تو ہمارا صدر دفتر تھا لیکن ہم نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر شہر کے دماغ امیرا کدل کے بڑے چوک میں جو بعد میں لال چوک کہلایا، واقع پلیڈیم سینما میں اپنا کارگذار دفتر قائم کیا۔ چونکہ ریاست کے انتظامیہ کی باگیں ڈھیلی پڑ رہی تھیں اور آنے والے دنوں کے پُر آشوب امکانات نے ہمیں اندیشہ ہائے دُور دراز میں مُبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اندرونی امن و امان اور شہریوں کی عزت و عصمت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے ایک رضاکار تنظیم بنانے کی کارروائی بھی شروع کر دی۔ میں نے اس تنظیم کی غرض و غایت خانقاہِ معلّٰی کے اُس جلسے میں بیان کی جو میری رہائی

کی تہنیت میں منایا گیا تھا۔ دستار بندی کے بعد میں نے اس تنظیم میں عوام کو بلا لحاظ مذہب و ملت شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد یوں بیان کیے:۔

۱۔ سلامتی فوج کے سامنے ملکِ کشمیر کی آزادی اور اس کے ناموس کی حفاظت مقدم ہوگی۔

۲۔ سلامتی فوج کے رضاکاروں پر ملک کے لوگوں کی عزت و عصمت کی حفاظت کا فرض لازم ہوگا۔

۳۔ رضاکاروں کو مسلم اکثریت پر یہ امر واضح کرنا ہوگا کہ غیر مسلم اقلیت کی حفاظت نہ صرف فرضِ اولین ہے بلکہ اسلام کے صحیح اصولوں کا حقیقی تقاضا بھی ہے۔

۴۔ رضاکاروں کو مستعد رہنا ہوگا کہ فرقہ وارانہ منافرت کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے پائے اور باہمی چپقلش اور خلفشار کے رجحانات سر نہ اٹھانے پائیں۔

ادھر سرحد پار سے تشویشناک اطلاعات آرہی تھیں۔ مغربی اور مشرقی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں صرف ہماری ریاست دارالامان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے ہندو مسلم سکھ پناہ گزیں ریاست کی سرحدوں میں داخل ہورہے تھے۔ مہاراجا کی حکومت نے ہند اور پاکستان سے موجودہ حالات کو قائم رکھنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیش کش کی تھی۔ حکومتِ ہند نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہند کے ساتھ کشمیر کا کوئی براہِ راست رابطہ نہ تھا۔ لیکن پاکستان کے ساتھ ڈاک خانوں وغیرہ کے سلسلے میں سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ اور ڈاک و تار کا سارا انتظام پاکستان کے محکمہ ڈاک و تار نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن جب ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام پر سرینگر کے ڈاک خانہ پر پاکستان

کا سبز ہلالی جھنڈا لہرایا گیا تو قائم مقام وزیر اعظم جنرل جنک سنگھ کو یہ بات ناگوار گذری اور انھوں نے یہ جھنڈا نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ پاکستان کی طرف سے ایک خاص ایلچی مہاراجا کو پاکستان سے الحاق پر آمادہ کرنے کے لیے سرینگر آیا لیکن اس کی گفتگو منزل سے نہیں بڑھی۔ حالانکہ اس سے قبل رام چند کاک نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ساتھ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں پینگیں بڑھالی تھیں۔ بہرحال پاکستان کو مہاراجا کی روش پسند نہیں آئی اور اس نے ریاست کی درآمدات جن میں نمک، پٹرول اور غذائی اجناس شامل تھیں، راولپنڈی میں روک لیں۔ کشمیر میں امپیریل بینک کی شاخ کو کرنسی نوٹوں اور ریزگاری کی بہم رسانی بھی رکا دی گئی۔ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ جو راستے ملاتے تھے وہ سب پاکستان سے ہوکر جاتے تھے۔ اس لیے صورتِ حال گمبھیر ہوگئی۔ مہاراجا کی حکومت نے پاکستان کی اس روش پر احتجاج کیا لیکن حالات بگڑتے ہی گئے۔

ادھر پاکستان کے اربابِ اقتدار نے دو نمائندے ہم سے بات چیت کے لیے سرینگر روانہ کیے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور شیخ صادق حسن یہ دونوں حضرات کشمیری نژاد تھے۔ ڈاکٹر تاثیر لاہور کے ایک امیر کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لیے ایس پی کالج سرینگر کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ ان دنوں ہماری ان سے کافی راہ و رسم بھی پیدا ہوگئی تھی۔ موخر الذکر امرتسر کے ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور قالین بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لاہور میں مقیم ہوگئے اور پنجاب مسلم لیگ کے صوبائی صدر بنادیے گئے۔ میں ان دونوں اصحاب سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلکہ شیخ صادق حسن

نے تحریک کی ابتدا میں کشمیر آکر ہماری ہمت بھی بندھائی تھی۔ چنانچہ میرے گھر مورہ میں اُن کی میری اور خواجہ غلام احمد عشائی کے ساتھ ایک مختصر ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے فراغت پانے کے بعد میں نے شیخ صادق حسن سے پوچھا کہ بہ حیثیت ایک کشمیری کے اُن کا کیا مشورہ ہے کہ ہم کس طرح اپنے مستقبل کا تعین کریں؟ شیخ صاحب نے بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بہ حیثیت کشمیری کے وہ یہی پسند کریں گے کہ ہم نہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور نہ پاکستان کے ساتھ بلکہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہیں۔ کیونکہ دونوں جانب کے حالات انتہائی خراب ہیں۔ لیکن بہ حیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ کے وہ چاہیں گے کہ کشمیر کا رشتہ پاکستان کے ساتھ ہی قائم ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہم ابھی ایک شخصی نظام کے غلام ہیں اور غلاموں کا فیصلہ صائب نہیں ہوتا۔ ہمیں پہلے اپنی ریاست میں آزادی ملنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی ہم اس نازک ترین فیصلے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اُنھیں یقین دلایا کہ ہماری تحریک کے متعلق ماضی میں مسلم لیگ کا جو بھی رویّہ رہا وہ ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہ ہوگا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال سے دوستی اور کانگریس کی وہ امداد جو اُنھوں نے ہماری تحریک کو دی ہے، ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اگر ہم یہ محسوس کریں کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کا مستقبل پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے ہی روشن ہو سکتا ہے۔ تو ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔ لیکن ہم کسی بھی صورت میں یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہم پر کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنی گفتگو میں پاکستان سے الحاق کرنے پر سخت زور دیا اور اس سلسلے میں ہمیں جلد قدم اٹھانے کی ترغیب دی۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ یہ وقت

اس اہم سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان میں کس قسم کے نظام کا نقش اُبھرے گا اور دونوں ممالک میں حالات کیا رُخ اختیار کریں گے؟ اس وقت آگ کے شعلے اُن دونوں مملکتوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آگ بجھانے میں وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں؟ ایسے حالات میں ہم سے توقع رکھنا کہ ہم فوراً اپنے مستقبل کا تعین کریں، قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔ کیونکہ ہم امن و سکون کے ماحول میں ہی اس سوال کو مناسب طریقے سے حل کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ صرف ہماری موجودہ نسل پر ہی اثر انداز ہوگا بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کو ابھی مہاراجا کی شخصی حکومت کے چنگل سے آزاد ہونے کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ بعد میں یہاں کے ہندو، مسلمان، سکھ مل بیٹھ کر فیصلہ کر سکیں کہ وہ ہند سے رشتہ جوڑیں۔ پاکستان سے الحاق کریں یا آزاد رہیں۔ اس لیے اس وقت اس سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم پر دباؤ ڈالنا زیادتی ہے۔ وقت آنے پر یہاں کے لوگ اس سوال کا فیصلہ کریں گے اور دونوں مملکتوں کو یہاں کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ ہم تو اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ریاستِ کشمیر پاکستان کا ایک حصہ بن کر رہے گی میں نے جواباً کہا کہ کشمیری عوام نے تو یہ حق آپ کو نہیں سونپا۔ ۱۹۳۱ء میں جب ہم نے تحریکِ کشمیر شروع کی تو ہم نے کسی بھی طاقت کو، چاہے وہ مسلم طبقے کی ہو یا ہندو اکثریت کی، یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ ہم اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں یہ امانت سپرد نہ کریں گے۔



"میرے شہر میں بجلی کے جوہر" مشہور کارٹونسٹ آر کے لکشمن کی نظر میں۔
(بشکریہ "ٹائمس آف انڈیا")



مرارجی ڈیسائی کے ساتھ۔



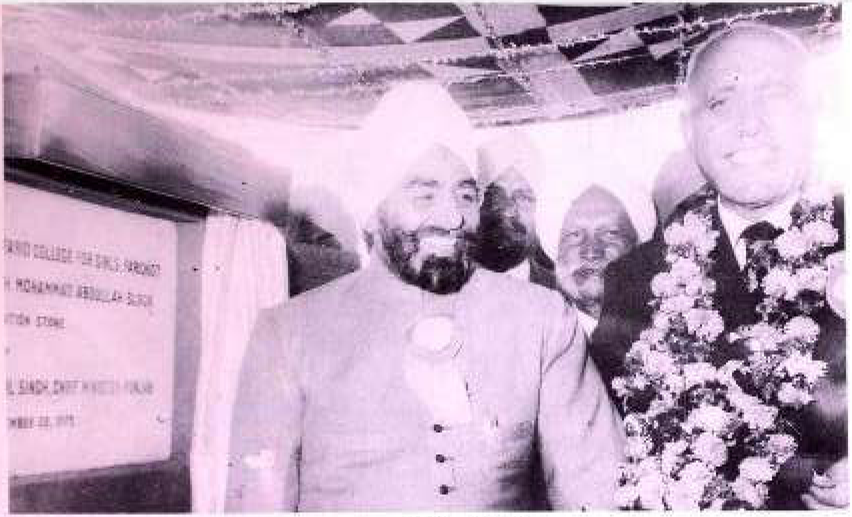
وزیر خارجہ اٹل بہاری واجپائی کے ساتھ۔



صدر نیلم سنجیوا ریڈی کے ساتھ

جیوتی باسو کے ساتھ

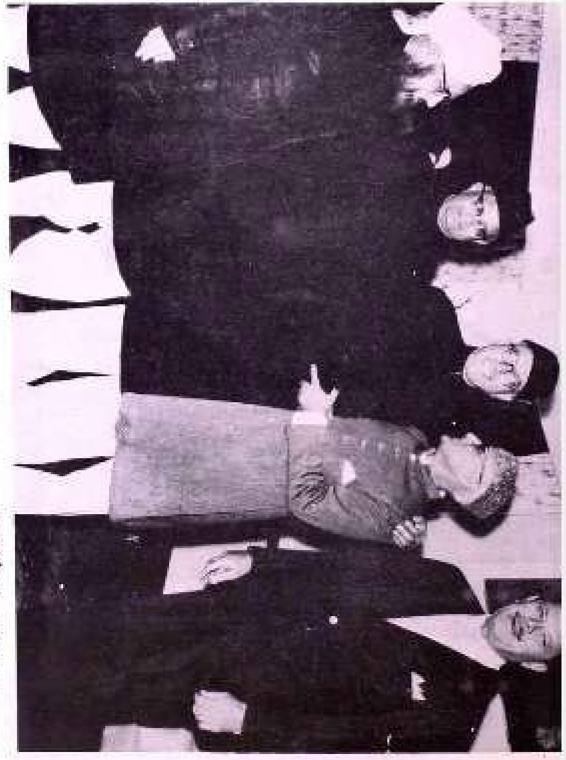




گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ۔

ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نارائن کے ساتھ





اسلام آباد۔ مئی ۱۹۶۴ء۔ صدر ایوب خاں، چودھری غلام عباس اور میر واعظ یوسف شاہ کے ساتھ۔



۱۹۶۴ء۔ وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق جیل سے رہائی پر استقبال کر رہے ہیں۔

اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ آپ اس صورت میں ہمیں تحریری طور پر یقین دلائیں کہ آپ وقت آنے پر ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوں گے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ تو حالات پر منحصر ہوگا اور یہاں کے رہنے والے باشندوں کی آزادانہ رائے اور رضا پر۔ میں اُن سے یہ حق پہلے سے ہی چھیننے کا نہ حقدار ہوں نہ روادار۔ تاثیر صاحب اس پر جھلاہٹ کا شکار ہوگئے اور انھوں نے تحکمانہ لہجے میں، جس میں طاقت کا غرور جھلک رہا تھا کہا کہ اگر میں اُن کا کہنا ماننے پر راضی نہیں تو وہ پھر "دوسرے ذرائع" استعمال کریں گے۔ مجھے بھی اس پر غصہ آگیا اور میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن اگر آپ نے زور زبردستی کا راستہ اختیار کیا تو پھر آپ ہماری لاشوں پر ہی کشمیر حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال شیخ صادق حسن اور عشاق صاحب نے مداخلت کی اور ہنسی مذاق میں یہ ناخوشگواری دور کرنے کی کوشش کی۔ معاملہ وہیں پر ختم ہوگیا۔ البتہ دونوں نے مجھے لاہور آنے اور وہاں جناح صاحب سے ملنے اور رُو برو گفتگو کرنے کی دعوت دی۔ میں نے دعوت تو قبول کرلی لیکن مجھے لاہور جانے سے پہلے دہلی کا رُخ اختیار کرنا پڑا۔ میری اسیری کے زمانے میں مجھے آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر چن لیا گیا تھا۔ چونکہ یہ کارروائی میری عدم موجودگی میں عمل میں آئی تھی اس لیے اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے وہاں میرا جانا ضروری تھا۔ اور پھر ریاستوں کو درپیش اہم ترین معاملات پر غور کرنے کے لیے میں نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس بھی بُلایا تھا۔ مبادا پاکستان کے رہنماؤں کو میرے دہلی جانے سے کوئی غلط فہمی ہو میں نے اپنے اس قصدِ سفر کی اطلاع پاکستان کے وزیر اعظم کو دیدی اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ دہلی سے واپسی پر میں بذاتِ خود اُن سے ملنے کے

لیے آؤں گا اور اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے ہوئے میں نے اپنے ایک معتمد ساتھی خواجہ غلام محمد صادق کو پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لیے لاہور بھیج دیا۔ میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا۔ جواہر لال کے ساتھ جیل کے باہر یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ اب وزیر اعظم بن گئے تھے۔ لیکن وہ دوستوں کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسوم و آداب کی تمام قیود نظر انداز کرکے بذاتِ خود دہلی کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کیا اور مجھے گارڈ آف آنر کی سلامی بھی پیش کی گئی۔ مجھے دہلی میں وزیر اعظم کے خاص مہمان کی حیثیت سے اُن کی ہی رہائش گاہ پر ٹھہرایا گیا اور وہاں میں نے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا۔

"کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اور امن وسکون کی فضا میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی طرف سے ہم پر کوئی زبردستی کا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ہم بغاوت کریں گے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے مہاراجہ کو نہیں عوام کو کرنا ہے اور جب تک اُن کو اندرونی طور آزادی نہیں ملتی وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔"

ایک طرف تو ہندوستانی رہنماؤں کا یہ رویہ تھا۔ جس میں ممکن ہے اُن کی دور اندیشی کی مصلحتیں بھی شامل رہی ہوں دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کو عجیب پریشانی نے گھیر رکھا تھا۔ جناح صاحب اور مسلم لیگ نے کشمیر کی تحریک کے تئیں جو معاندانہ اور مخالفانہ روش اختیار کر رکھی تھی اس نے اُن میں ایک احساسِ جرم پیدا کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے کہ اگر کشمیریوں سے آزادی کے ساتھ الحاق کے معاملے پر رائے حاصل کرلی گئی تو صوبہ سرحد کے برعکس

کشمیر میں فیصلہ اُن کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ وہ نیشنل کانفرنس کی مقبولیت اور عوامی قوت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اسی لیے وہ مہاراجا کو ہی گانٹھ کر کشمیر کو ہڑپ کرلینا چاہتے تھے۔ اور کشمیری عوام اور اُن کے نمائندوں سے بات چیت کرنے میں ہیٹی سمجھتے تھے۔ اُدھر مہاراجا نے تذبذب دکھانا شروع کیا اور اُس کے دِل میں اپنی الگ سلطنت قائم کرنے کا خیال رچ بس گیا۔ چنانچہ جب جون ۱۹۴۷ء میں ماونٹ بیٹن کشمیر آیا تو اُس نے مہاراجا کو صلاح دی کہ اُس کی ریاست کی آبادی کی ترکیب یوں تو پاکستان کے ساتھ الحاق کا تقاضا کرتی ہے۔ لہٰذا وہ اگر راضی ہے تو پاکستان سے الحاق کا اعلان کردے لیکن مہاراجا نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ اس پر ماونٹ بیٹن نے کہا کہ پھر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرلو پیادہ فوج کا ایک ڈویژن فوراً یہاں بھجوادوں گا تاکہ کسی کو شرارت کی نہ سوجھے لیکن مہاراجا پھر بھی چُپ رہا۔ اُس کا دماغ اس قدر ماؤف ہوگیا تھا کہ جس وقت ماونٹ بیٹن دہلی واپس جانے کے لیے مہاراجا سے ملنے کے لیے آیا تو مہاراجا نے کہلوا بھیجا کہ میرا پیٹ خراب ہے اور ڈاکٹر نے مجھے کسی سے ملنے سے منع کردیا ہے۔ مہاراجا دراصل اس سیاسی بیماری کی آڑ میں کوئی دو ٹوک جواب ٹال رہا تھا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو انھوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو معاملہ استصواب رائے پر آجائے جس میں پاکستان کی جیت کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیریوں کو اس حق سے محروم کرنے کے لیے دراز دستی کا راستہ اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ صوبہ سرحد کے استصواب سے متعلق یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ وہاں لیگ نے اِس لیے جیت حاصل کرلی کہ خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمتگار جماعت نے استصواب میں حصہ نہیں لیا۔ ان کے حصہ نہ لینے کی وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ ہوا کا رخ دیکھ رہے

تھے اور کچھ یہ بھی کہ انھیں کانگریسی قیادت کے رویے سے مایوسی، محرومی اور بیزاری کا احساس ہوگیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ عمر بھر کانگریس کا ساتھ دینے کے بعد کانگریسیوں نے اُنھیں اپنی گدی سنبھالتے ہی مگرمچھ کے آگے پھینک دیا ہے۔ اس لیے وہ استصواب میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان سے الحاق کی تجویز پیش کرنے پر خود بھی آمادہ اور مطمئن نہیں تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کے اندازِ فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے پاکستانی حکومت کے ترجمان "ڈان" کراچی نے اُنہی دنوں یہ دھمکی آمیز اداریہ لکھا۔

> "وقت آیا ہے کہ مہاراجا کشمیر کو بتایا جائے کہ وہ پاکستان میں شامل ہوجائے۔ اگر اس نے لیت ولعل سے کام لیا تو اُس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہونا ناگزیر ہوں گے۔"

اِسی دوران پاکستان کے صوبہ سرحد اور نواحی علاقوں سے جسے قدیم زمانے میں گاندھارا کے نام سے پکارا جاتا تھا، قبائلیوں کے پرے کے پرے کشمیر کی طرف بڑھنے لگے اور مظفرآباد تک پہنچ گئے۔ سرینگر میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہاراجا کے پاس قلیل فوج تھی۔ جو اس نے مختلف علاقوں میں پھیلادی اور دفاعی استحکامات کرنے لگا۔ اُدھر پونچھ اور میرپور وغیرہ میں جلسے منعقد ہوئے جن میں تجاویز منظور ہوئیں۔ ان تجاویز کے ذریعے مہاراجا سے استدعا کی گئی کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کرے۔ پونچھ میں جب حالات نے پلٹا کھایا تو مہاراجا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود پونچھ کا دورہ کرے۔ چنانچہ مہاراجا اپنی فوج کے انگریز چیف آف دی سٹاف جنرل اسکاٹ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ پونچھ پلندری وغیرہ کے اکثر لوگ فوجی ملازمت میں تھے کچھ ریاستی اور کچھ ہندوستانی فوج میں۔ کیونکہ پونچھ فوجی بھرتی کا بڑا زرخیز میدان تھا۔ وہاں کے سابق اور موجودہ فوجیوں نے اپنی

وردی میں ملبوس ہو کر اور اُن پر اپنے میڈل اور تمغے چمکاتے ہوئے فوجی طریقے پر مہاراجا کا پُرجوش اِستقبال کیا۔ لیکن بدقسمتی سے مہاراجا کی سطح بین نگاہیں تہہ تک نہ جا سکیں اور اس نے رسمی اِستقبال کا بالکل غلط مفہوم اخذ کیا۔ اس نے ان کی محبت کا جواب غرور اور نخوت سے دیا۔ پاکستان سے الحاق کرنے کا جو مطالبہ انھوں نے کیا تھا مہاراجا نے اس کو گستاخی پر محمول کیا اور انھیں مزہ چکھانے کے لیے اپنی فوج بھیج کر ان پر شدید مظالم توڑے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ گھروں کو آگ لگوا دی گئی اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کشمیر فوج میں وہاں کے لوگ ملازم تھے ان میں ان واقعات سے بڑی تشویش پھیل گئی۔ اِن واقعات کی صدائے بازگشت ہمارے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہم نے بھی وہاں حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے اپنے کچھ نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے واپس آئے تو انھوں نے دردناک واقعات کی بڑی دلگداز رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ ہم نے بھی اُن مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو دراز دستیاں بند کرنے کی صلاح دی۔ میں نے دہلی میں اوائل اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب قبائلی حملہ آور مظفرآباد کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پونچھ کے سوال پر ایک اخباری کانفرنس میں کہا۔

"پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مہاراجا کے مظالم کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ وہاں کے لوگوں کو اُن مظالم کے خلاف احتجاج کا پیدائشی حق حاصل ہے اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور مہاراجا نے اُن پر فوجی یلغار کر کے وہاں حالات کو تباہی کے دہانے پر لا دیا ہے۔"

میں نے مسلمانانِ کشمیر کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پنجاب کی مسلم اکثریت والی ریاست کپورتھلہ میں اب ایک مسلمان نظر نہیں آتا۔ یہی حال الور، بھرت پور وغیرہ ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اس لیے کشمیر میں اگر کچھ لوگ اِن اندیشوں میں گرفتار ہیں کہ اُن کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا تو اس کو ہمدردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔"

اُدھر مہر چند مہاجن اور اُن کے نائب رام لال بترہ نے جو ایک پنجابی اور کٹر آریہ سماجی تھا کشمیری پنڈت رہنماؤں کو بلا کر انھیں بندوقیں اور دوسرے اسلحہ جات کی پیش کش کی تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کشمیری پنڈت رہنما مہر چند جی کے اس جھانسے میں نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے نادان مہربانوں کو جواب دیا کہ اُن کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں سے زیادہ اکثریت کی خوشنودی کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ ہتھیاروں کے اس تحفے کو اپنے ہی پاس رہنے دیں۔

حکومتِ برطانیہ نے ریاستوں کے سربراہوں کو یہ اِختیار دیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے وہ یومِ آزادی یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پائیں انھیں دونوں مملکتوں کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے جوں کا توں معاہدہ (STAND STILL AGREEMENT) کر لینا چاہیے۔ تاکہ رسل و رسائل اور ڈاک و تار کا سلسلہ برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مہاراجا نے پاکستان کے ساتھ تو معاہدہ کر لیا لیکن ہندوستان نے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے یہ شرط لگائی کہ پہلے مہاراجا کو سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا چاہیے۔ مہاراجا اس پر راضی نہ ہوا اس لیے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ نہ ہو سکا۔ پاکستان کو اس معاہدہ کی رو سے ڈاک و تار کے شعبے پر بالادستی حاصل ہو گئی۔ چنانچہ سرینگر کے ڈاک خانے اور تار گھروں پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا اور ملازموں سے

پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں جانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اکثر مسلمان ملازموں نے جب پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھا تو وہ سمجھے کہ الحاق کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انھوں نے اپنی رضا پاکستان کے حق میں ظاہر کی۔ لیکن معاہدے کی رو سے وہ چھ مہینے کے اندر اندر اپنے اس چناؤ OPTION کو بدل بھی سکتے تھے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب پانسہ پلٹا تو ہندوستان نے ان ملازموں کی رائے جاننے کی پرواہ ہی نہیں کی۔ الٹا اُن بے چاروں کو ملازمت سے ہی نکال باہر کر دیا۔ یہ بات بھی شروع میں ہی میرے اور ہندوستان کے درمیان تلخی کی ایک وجہ بن گئی۔

▲▲▲

(۳۶)

درونِ خانہ ہنگامے تھے کیا کیا

پنڈت رام چند کاک کا ریاست کی وزارتِ اعظمیٰ تک پہنچ جانا کمال کی بات تھی۔ انھوں نے محکمہ آثار قدیمہ میں ایک معمولی عہدہ سے ملازمت شروع کی تھی بعد میں ریاست کے چیف سکریٹری، وزیرِ حضور اور وزیرِ اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ سر این۔ گوپال سوامی آینگر۔ راؤ کے علاوہ جو بھی وزیرِ اعظم کشمیر آیا وہ زیادہ دیر تک یہاں ٹک نہ سکا۔ سر مہاراج سنگھ آئے اور چند ہی مہینوں میں بستر گول کر کے چلے گئے۔ یہی حال کرنل ہاکسر کا بھی ہوا۔ اُن کے بعد رام چند کاک وزیرِ اعظم بنائے گئے۔ یہ کشمیری بولنے والے پہلے شخص تھے جو ڈوگرہ شاہی میں وزارتِ عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہوئے۔ تھے تو وہ کشمیری پنڈت لیکن اپنے معزز طبقے کی نہ تو اُن میں طبیعی تھی نہ نرمی اور نہ انکسار۔ یہ بڑے تند خو اور اکڑ فوں کرنے والے تھے انھی کے زمانۂ اقتدار میں بیگ صاحب کو مہاراجے کی حکومت سے استعفیٰ دینے کے سوائے کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا تھا۔ اور انھی نے میاں احمد یار خاں کو سازباز سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اور پارٹی کے

فیصلے کے خلاف بیگ صاحب کی جگہ سنبھالنے پر تیار کر لیا تھا۔ رام چند کاک کے تعلقات مہاراجا کے ساتھ کس قسم اور نوعیت کے تھے۔ وہ تو میں بتا نہیں سکتا لیکن یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ غالباً اپنی فہم و فراست اور دُور اندیشی کے سبب وہ بھانپ گئے تھے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ یہ پاکستان کے ساتھ آخرکار الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اپنا راستہ ہموار کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ آنھوں نے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ مہاراجا اگرچہ رنگین طبیعت کے مالک تھے لیکن جہاں اُن کے ذاتی اور خاندانی مفاد کا سوال آتا تھا وہ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ کاک صاحب کے یہ تیور دیکھ کر غالباً اُنھوں نے کاک کو وزارتِ عظمیٰ سے چلتا کر دیا۔ ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء یعنی پاکستان کے قیام کے صرف چار دن پہلے وہ شیر گڑھی میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مہاراجا کا ایک اے۔ ڈی۔ سی۔ ایک شکارگاہ سے جہاں مہاراجا شکار کھیلنے کے لیے گیا تھا ایک مُہر بند لفافہ لایا۔ کاک نے لفافہ کھول کر خط پڑھا تو اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس میں اُن کو فوری طور پر برخواست کرنے کے احکامات درج تھے۔ جب رام چند کاک کو نوشتۂ دیوار نظر آیا تو اُس نے ہوائی جہاز کے ذریعے ریاست سے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن مہاراجا نے اسے ہوائی اڈّے پر ہی گرفتار کروالیا۔ اور اس کی جگہ جنرل جنک سنگھ کو وزیرِ اعظم بنایا۔ پنڈت رام چند کو سرینگر سنٹرل جیل میں بند رکھا گیا اور اُن کے خلاف کچھ مقدمے بھی دائر کر دیے گئے۔ جنک سنگھ نے اُس کے خلاف بعض الزامات کی تحقیقات کے لیے ایک

انکوائری بھی بٹھا دی۔ خود مہاراجا کشمیر کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ اوّل اوّل تو مہاراجا کو بہت اعتدال پسند، لبرل اور مذہبی تعصّب سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ اُن دنوں اس کا میل جول بھی زیادہ تر مسلمان مصاحبوں اور درباریوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جن میں نواب خسرو جنگ، عبدالرحمٰن آفندی اور صاحب زادہ نور محمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں شُدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کا زور ہوا اور خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار "منادی" میں یہ خبر چھاپ دی کہ ایک بڑی ریاست کا ہندو مہاراجا مذہبِ اسلام قبول کرنے ہی والا ہے تو ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے میں یہ تشویش پھیلی کہ ہو نہ ہو یہ مہاراجا کشمیر ہی ہوگا۔ چنانچہ مہاراجا کے گرد اُنھوں نے زبردست گھیرا ڈالا اُن کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ آریہ سماج کے چالاک ایجنٹوں نے اُن کے دِل میں مسلمانوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کیے اور آخرکار اُنھیں مسلمان دشمن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اِن حالات میں جب نئے وزیرِ اعظم کی تلاش شروع ہوئی تو اُن کی نگاہیں آریہ سماج کی صفوں کو تاکنے لگیں۔ اس پس منظر میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سردار پٹیل نے مہر چند مہاجن اور رام لال بترہ کو کشمیر میں اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھوا دیا۔ الحاق کے بارے میں مہاراجا کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی ریاست کو دونوں نوزائیدہ مملکتوں سے الگ رکھ کے آزاد رکھے۔ چنانچہ اس نے مسودۂ الحاق پر دستخط کرنے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جو خط لکھا اُس میں اِس بات کا برملا اعتراف کیا کہ کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی کی ہیئتِ ترکیبی کے پیشِ نظر اُس کی اپنی خواہش آزاد رہنے کی تھی۔ بعد میں پاکستان نے اپنی کوتاہ اندیشی میں حملہ کر کے مہاراجا کے اس خواب کو مسمار کر دیا اور خود اُس کے الفاظ میں

ان کے لیے اس بات کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کرکے اس سے فوجی معاونت مانگے۔" لیکن ان صریح واقعات کے باوجود فرقہ پرست ہندو پریس آج تک برابر چلاتا آیا ہے کہ میں کشمیر کا سلطان بننے کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں الحاق کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے۔ اسی طرح فرقہ پرستی کے یرقان میں مبتلا لوگوں کو ہر چیز پیلی لگتی ہے انھیں حقائق سے تو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ گوئبلز کے اس فلسفے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ "جھوٹ کہتے جاؤ، کہتے چلو، کچھ نہ کچھ تو چپک جائے گا اور بالآخر لوگ اس کو سچ ماننے لگیں گے۔" بہرحال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میں اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں دہلی سے واپس سرینگر لوٹ آیا۔ صادق صاحب قبائلی حملے میں ۲۲ اکتوبر سے صرف ایک دن پہلے لاہور سے سرینگر پہنچ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان سے وہ بڑی مشکل سے نکل پائے تھے کیونکہ وہ انھیں یرغمال بنا کر وہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب پاکستانی حکمران اپنے وطن کی سرزمین پر میرے نمائندے کے ساتھ میرے دورہ کراچی کی تفصیلات طے کر رہے تھے، اُن کے بھیجے ہوئے حملہ آور کشمیر کی دھرتی کو روندنے اور کشمیریوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے تھے۔ لاہور میں اُن کی ملاقات پاکستان کے وزیر اعظم کے ساتھ نہ ہو سکی۔ اور انھیں صرف نواب افتخار حسین ممدوٹ جیسے دوسری صف کے لیڈروں سے ہی ملنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ ہر قیمت پر یقین دہانی اور اعلان چاہتے تھے کہ کشمیر کا الحاق صرف پاکستان کے ساتھ ہی ہوگا۔ جو ہماری طے شدہ پالیسی کے مطابق ممکن نہیں تھا۔ اس سے قبل بخشی غلام محمد بھی

نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ وغیرہ سے مل آئے تھے۔ اور انھوں نے بھی یہی رٹ لگائی تھی۔ صادق صاحب کے ذریعے پاکستانی زعماء نے مجھے وہاں آنے کا بلاوا بھیجا وہ چاہتے تھے کہ میں کراچی جا کر محمد علی جناح سے ملوں اور خود اُن کے ساتھ گفتگو کروں۔ آمد و رفت کا انتظام پاکستانی حکام نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ایک صحافی جی۔ کے۔ ریڈی نے جو سری نگر سے "کشمیر ٹائمز" نامی اخبار نکالتا رہا تھا وہ پاکستان کی زبردست وکالت کر رہا تھا اور پاکستان بننے کے بعد وہاں کے تعلقات عامہ کا ناظم بن گیا تھا بعد میں انکشاف کیا کہ میرے پاکستان بلانے میں اُن کی نیت صاف نہ تھی۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح کراچی لانا چاہتے تھے۔ اور وہاں مجھے قید میں ڈال کر میرے نام پر پاکستان کے حق میں اہالیانِ کشمیر کے بیانات شائع کرنا چاہتے تھے۔ ریڈی نے اُن کے منصوبوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"اُن کی اسکیم یہ تھی کہ جب شیخ صاحب کراچی پہنچیں گے تو اُن کا شاندار استقبال کیا جائے۔ اگر وہ لیگی لیڈروں کے فریب میں آ جائیں تو ٹھیک دوسری صورت میں کراچی میں جناح کے ساتھ اُن کی ملاقات کے دو دن بعد کشمیر پر حملہ کرنے کی تیاری کی گئی تھی۔ چال یہ سوچی گئی تھی کہ اگر شیخ صاحب اپنی بات پر اڑے رہے اور قائداعظم کی ترغیب و تحریص میں نہ آئے تو انھیں چپکے سے گرفتار کرکے کسی غیر معروف مقام پر لے جایا جائے اور جب وہ کسی جیل میں پڑے زندگی کے دن گزار رہے ہوں تو اُن کی صدارت میں عارضی حکومت کا اعلان کرکے اُن کے نام پر بیانات و اعلانات جاری کیے جائیں۔ اس طرح سے جب قبائلیوں کے غول کے غول کشمیر میں لوٹ مار کر رہے ہوں گے تو کشمیری یہی خیال کریں گے انھیں

ہم نے اسے ہندوستان پہنچا دیا اور جواہر لال کے گھر میں اُس کی خوب رسائی ہوگئی۔ قبائلی تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ۲۱ اکتوبر کو مظفر آباد گر گیا اور ۲۲ کو چناری مہاراجا نے برگیڈیئر راجندر سنگھ کی کمان میں، جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی جنرل سکاٹش سے چیف آف اسٹاف کا چارج حاصل کر لیا تھا، کچھ کمک مظفر آباد کی طرف روانہ کی۔ اُن کی مڈبھیڑ قبائلیوں کے ساتھ بونیار کے دیوان مندر کے پاس ہوئی۔ راجندر سنگھ خود بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے کام آئے۔ لیکن اُس کی فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔ اُن میں سے کچھ تو مارے گئے اور کچھ دُم دبا کے بھاگ گئے۔ ۲۴ اکتوبر کو قبائلیوں نے اوڑی پر قبضہ کر کے اسے لُوٹ لیا۔ اب سرینگر کا راستہ بلا کسی مزاحمت کے کھلا تھا اور حملہ آور چاہتے تو چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ کر دم لیتے۔ لیکن انھیں لوٹ مار کی حرص نے اندھا بنا دیا اور "سرینگر ہنوز دور است" ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں ایک امریکی اخبار نویس مارگریٹ بروک وائٹ اُن کے ساتھ آئی تھی۔ اُس نے اپنی کتاب "HALF WAY TO FREEDOM" میں قبائلیوں کی لُوٹ کا ماجرا بیان کیا ہے۔ اُس کے مطابق:۔

"اُن کی بسیں اور ٹرکیں مالِ غنیمت سے لدی پھندی ایک یا دو دن میں واپس آجاتی تھیں تاکہ اور پٹھانوں کو لے کر پھر کشمیر لوٹیں اور اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کو آزاد کرانے کے اسی عمل کا اعادہ کرتے ہوئے بلا تفریقِ مذہب و ملت ہندو، سکھ اور مسلمان دہقانیوں کو لوٹیں۔ قبائلیوں کی پیش قدمی سے ڈوگرہ فوج کا کیا حال ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بادامی باغ چھاؤنی میں تعینات ساڑھے اٹھارہ سو فوجی افسروں اور آدمیوں نے روپوش ہو جانے میں خیریت سمجھی اور بعد

شیخ صاحب نے کشمیر سمجھا ہے۔ بہرکیف مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ پاکستانیوں کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

اُدھر فوجی محاذ پر ریاست کے لیے خطرات بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مہاراجا کا چیف آف اسٹاف ایک انگریز تھا۔ اُس نے مہاراجا کی ۹ ہزار فوج کو مختلف اطراف میں جھونک دیا تھا۔ ایک ٹکڑی مظفر آباد کے متصل سرحد پر تعینات کی گئی تھی۔ یہ ٹکڑی مخلوط تھی۔ اِس میں ہندو ڈوگرے بھی تھے اور پونچھ و میرپور میں جھونک دیا تھا۔ ایک ٹکڑی مظفر آباد کے متصل ڈوگرے بھی تھے۔ اور پونچھ و میرپور کے سُدن قبیلے کے مسلمان بھی۔ پونچھ و میرپور کے لوگ پہلے سے ہی جلے بیٹھے تھے۔ وہ مظفر آباد کی پہاڑی چوٹیوں سے اپنے گھروں سے شعلے اُٹھتے دیکھ رہے تھے اور جو مظالم ڈوگرہ ہندو فوج نے وہاں توڑے تھے اس کی خبریں بھی اُن کو مل چکی تھیں۔ اس لیے اُن کی وفاداری کے خیمے اُکھڑ چکے تھے۔ چنانچہ جب قبائلی اس راستے سے سرحد کے اندر گھس آئے تو انھوں نے بغاوت کر دی اور قبائلیوں سے جا ملے۔ حملہ آوروں کی جس ٹکڑی نے ایبٹ آباد مانسہرہ سرحد سے مظفر آباد پر حملہ کیا۔ وہ دو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ان میں محسود، محمند، وزیری، آفریدی اور دوسرے قبیلوں کے لوگ شامل تھے اور کچھ تو افغانستان کے یاغی علاقے سے بھی آ گئے تھے۔ اُن کی پُشت پر رسل و رسائل کی فوجی تنظیم تھی اور وہ جب صبحِ کاذب کے دھندلکے میں کچھ پیادہ اور کچھ بسوں یا ٹرکوں میں مظفر آباد میں داخل ہوئے تو انھوں نے اسلام زندہ باد کے نعرے بلند کر کے مقامی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مہاراجا کی چوتھی جے اینڈ کے بٹالین یہاں ایک ڈوگرہ لیفٹیننٹ کرنل نرائن سنگھ کی کمان میں تعینات تھی۔ فوج مسلح قبائلیوں کے مقابلے میں چند گھنٹوں سے زیادہ دیر تک ٹک نہ سکی۔ اور آن کی آن میں اس کا صفایا ہو گیا۔ مقامی ڈپٹی کمشنر مہتہ مارا گیا اور اُس کی بیوہ کرشنا کو ایک سال تک مقبوضہ کشمیر کے پناہ گزین کیمپ میں رہی۔ بعد میں

میں جب ہندوستانی افواج کی آمد پر انھیں چھپے ہوئے پایا گیا تو ہندوستانی فوج کے افسر بزدلی کے اس مظاہرے پر انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ اور انھیں جنرل کلونت سنگھ نے جموں لے جانے کا حکم دے دیا۔"

۲۶ر اکتوبر کو قبائلیوں نے مہورہ کے اُس بجلی گھر کو تباہ کر دیا جو سرینگر کو برقی روشنی مہیا کرتا تھا اور اس طرح راجدھانی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو وہاں کا ظالم بادشاہ نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ لیکن اُس دن مہاراجا ہری سنگھ نے یہ کہاوت سچ ثابت کر دکھائی وہ دربار گڈھ سرینگر کے جگمگ جگمگ کرنے والے ہال میں اُس وقت اپنے مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں سے دسہرے کے جشن پر اشرفیوں کا خراج حاصل کر رہا تھا۔ اچانک ساری روشنیاں چلی گئیں اور اُس کے ساتھ ہی مہاراجا کی سلطنت کا ستارہ بھی غروب ہو گیا قبائلی حملہ آوروں نے بارہمولہ کا رُخ اختیار کیا جو پہاڑوں کے دامن میں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور اس علاقے کی سب سے بڑی تجارتی منڈی رہی ہے۔ بارہمولے سے سرینگر کا فاصلہ ایک گھنٹے سے زیادہ کا نہ تھا اور اُس وقت بھی یہ راستہ برصغیر کے عمدہ ترین راستوں میں سے ایک تھا۔ یہاں کی آبادی سولہ ہزار کے قریب تھی۔ قبائلی چاہتے تو اسی دن سرینگر پہنچ سکتے تھے۔ لیکن بارہمولے کے گھروں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انھوں نے تین دن تک بارہمولہ میں زناکاری، شکم پُری اور لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا کہ انھیں سرینگر کی یاد ہی نہ آئی۔ انھی تین دن میں ساری صورتِ حال کا پانسہ پلٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی قبائلیوں کی شبیہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسخ اور غارت ہو کر رہ گئی۔ بارہمولہ کے شہری اُن تمام دیہات اور چھوٹے قصبوں سے زیادہ خوش حال اور دولت مند

تھے، جنھیں قبائلیوں نے تاراج کیا تھا۔ اس لیے اُن کی رفتار رُک گئی۔ یہ قتل و غارت، عصمت دری اور لوٹ مار میں مگن ہو گئے دو دن تک یہ بازار گرم رہا اور اس میں قبائلیوں نے مذہب کی تمیز روا نہ رکھی۔ اُن کی خرمستی اس حد تک بڑھ گئی کہ انھوں نے یہاں کے عیسائی مشن ہسپتال میں چودہ دخترانِ کلیسا یعنی یورپی راہباؤں تک کو اپنی دراز دستی کا نشانہ بنایا۔ سینٹ جوزف مشن ہسپتال کی مدر سپیریر جو بلجیم کی ایک راہبہ سسٹر میری اڈیلیٹرڈ تھیں کے علاوہ تین نرسوں اور ایک انگریز جوڑے کو تہ تیغ کر دیا۔ کئی انڈور بیمار موت کے گھاٹ اُتارے اور ہسپتالوں کی دوائیوں تک پر ہاتھ صاف کیا۔ سکھ دوست تو خاص طور اُن کا نشانہ بنے۔ چنانچہ اذیتوں کی تاب نہ لاکر کچھ سکھوں نے خود کشی کر لی۔ اور بہت سی سکھ بہنوں نے یا تو دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دی یا اُن کے مرتدوں نے انھیں قطاروں میں بٹھا کر ان کے سروں کو تن سے جدا کر دیا۔ ایک عجیب کسمپرسی اور ہائے وہو کا عالم تھا۔ یہ کشمیر کے مسلمانوں کا "سلطنتِ خداداد" پاکستان سے پہلا سابقہ تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور ان کے مال و اسباب کو لوٹا گیا۔ ایک مسلمان جولاہے غنی جو کی چادر چھین لی گئی۔ جب اُس نے پوچھا کہ کیا یہی مسلمانوں کا شیوہ ہے تو اس کو گولی مار دی گئی۔ بارہمولہ میں ایک چھوٹا سا سینما گھر بھی تھا اس کو ایک قحبہ خانے میں تبدیل کر لیا گیا۔ اور یہاں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کو بھی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک مقامی مسلمان رسول جو درزی نے دو ڈھلو قبائلیوں کو اپنے گھر میں دعوت پر بلایا۔ وہ کھانا کھا چکے تو انھوں نے عورتیں طلب کیں۔ خوش قسمتی سے عورتیں پہلے ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ کشمیری پنڈت عورتیں کانوں میں "ڈیجہور" نام کا ایک زیور پہنتی ہیں جو سونے کا ہوتا ہے قبائلی درندے چھینا جھپٹی میں اس طرح سے یہ

زیور کھینچ لیتے تھے کہ عورتوں کے کان بھی کٹ جاتے تھے۔ قبائلیوں نے کشمیری عورتوں کے قیمتی پھرن* تک نہ چھوڑے وہ انھیں پہنے ہوئے بارہمولہ میں گھومتے پھرتے اور قہقہے لگاتے دیکھے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبائلیوں کی یہ لوٹ مار کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی وہاں کے حکمرانوں کو خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ قانون دشمن لوگ خود پشاور اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں لوٹ کا بازار گرم نہ کریں۔ یہ لوگ قبائلی علاقوں سے برطانوی فوج کے چلے آنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گئے تھے اور پاکستان کے شہروں کی طرف حریصانہ نظریں اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں کشمیر کا راستہ دکھایا اور انھیں بتایا گیا کہ وہاں انھیں نقد و جنس اور عورتوں کی صورت میں جو کچھ ملے گا وہ اُن کا مالِ غنیمت تصوّر ہوگا۔ اس کا مقصد ایک تو خود اس آفت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور دوسرا کشمیری عوام کو غلام بنانا تھا۔ چنانچہ جب بارہمولہ سے قبائلی آگے جانے کا نام ہی نہ لینے لگے تو عبدالقیوم خان نے قبائلیوں کے ایک بڑے پیر مانکی کو بارہمولہ بھیجا جس نے انھیں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ لیکن قبائلی اپنے لوٹ مار کے مال اور عورتوں کو کسی کی تحویل میں دینے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ اُن میں سے بہت سے اپنا انعام لے کر واپس اپنے ٹھکانوں کی طرف جانے لگے۔

اُدھر یہ حالات رونما ہو رہے تھے اُدھر مہاراجا نے بوریا بستر باندھ کر اپنے جواہرات اور دیگر قیمتی اثاثہ کو صندوقوں میں بند کر کے ایک سو سے زیادہ گاڑیوں میں لاد دیا اور خود اس بھگوڑے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے ۲۶ اکتوبر کو جموں کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کے ساتھ اس کے نزدیکی رشتہ دار، مصاحب، احباب

* کشمیری پہناوا۔

وغیرہ کے علاوہ اس کے خاندانی مندر گدادھر کی طلائی مورتی بھی تھی۔ جب یہ قافلہ اُدھم پور پہنچا تو مہارانی تارا دیوی نے اپنے بال بکھیر کر اس مورتی کو اپنی گود میں لے لیا۔ جب مقامی ہندو آبادی ایک کھلی کار میں مہارانی کو مورتی لیے ہوئے دیکھ رہی تھی تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جذبات کا پارہ کہاں پہنچا ہوگا۔ اُن کا خون اُبال کر مہارانی وہاں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلنے کا جو ناٹک کھیلنا چاہتی تھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مہاراجا کی اس بزدلانہ حرکت سے کشمیری عوام کو بڑا دکھ ہوا۔

کیونکہ ان پر ایک سو برس راج کرنے کے بعد اور اُن کے خون پسینے کی کمائی سے عالی شان محلات تعمیر کرنے کے بعد اپنے خاندان کے نمائندے کی حیثیت سے اس نے آزمائش کی گھڑی میں انھیں یکہ و تنہا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بزدلانہ فرار مہاراجا کی اس شبیہ کو ریزہ ریزہ کرنے کا باعث بن گیا جو اس نے بڑی محنت اور لاگت سے بنائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مہاراجا گلاب سنگھ کا بہادر جانشین کہتا تھا۔ اور اس کو لیفٹننٹ جنرل راجیشور مہاراجہ ادھیراج کا بھاری بھرکم خطاب بھی ملا ہوا تھا۔

اب اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ کشمیریوں سے صرف استحصال کا رشتہ رکھتا تھا۔ چنانچہ کشمیریوں کے ساتھ اس کی اس جذباتی عدم وابستگی کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب اس نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد اس کی راکھ صرف جموں شہر کی فضاؤں میں بکھیر دی جائے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت کی قیمت کے مطابق فرار ہوتے وقت اس نے کروڑوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات موتی اور نیلم اپنے ساتھ لے لیے تھے۔ عوامی حکومت نے اگرچہ بعد میں سونے چاندی کے ظروف اور کچھ نوادرات اُن کے یہاں سے واپس لا کر توشہ خانہ میں محفوظ کرا دیے لیکن بہت سا مال و متاع اُن کے پاس ہی رہا۔ اُن سے وہ تخت بھی حاصل کر لیا گیا

جس پر سونے کا بڑا زبردست جڑاؤ کام ہے۔ لیکن بعد میں میر قاسم نے اپنے دور میں اس تخت کو امر محل جموں میں نمائش کے لیے رکھنے کے بہانے کرن سنگھ کے حوالے کر دیا۔

بہر حال اس نازک گھڑی پر رونے پیٹنے کا یارا کسے تھا اس وقت سب سے اہم کام لوگوں کے حوصلے حواس اور MORALE قائم رکھنا تھا۔ مہاراجا کی اس حرکت کے بعد حکومت کے وہ سبھی چھوٹے بڑے اہلکار جو جموں کے رہنے والے تھے، اس کے پیچھے پیچھے جموں کی طرف بھاگ گئے۔ انتظام و انصرام پر فالج گر گیا۔ اب نیشنل کانفرنس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے رضا کاروں کی مدد سے انتظامیہ کو سنبھالے ہم نے اِس انتہائی نازک موقعے پر یہ ذمہ داری قبول کر لی اور کشمیر کے اقتدار کو جسے مہاراجا شہر کے چوک میں چھوڑ کر رفوچکر ہو گیا تھا، اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُدھر پاکستان کے کچھ ایجنٹ سرینگر میں مصروفِ کار تھے۔ اگرچہ قبائلیوں نے انھیں وقت پر نہ پہنچ کر مایوس کر دیا تھا لیکن انھوں نے ایک خفیہ میٹنگ میں طے کیا کہ وہ شہر کے تمام پلوں خاص طور پر ہوائی اڈے جانے والے پلوں کو تباہ کر ڈالیں گے تاکہ ہندوستانی افواج کی آمد کی صورت میں ان کی نقل و حرکت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ ہمیں اِس بات کی اطلاع مل گئی اور ہم نے نیشنل کانفرنس کے رضا کاروں کو پلوں اور دوسری تنصیبات کے پہرے پر مقرر کر دیا۔ اُدھر قبائلیوں کی لوٹ مار کی خبروں نے بھی ساری وادی میں اشتعال کی لہر پیدا کر دی تھی اور سبھی ہندو مسلمان نیشنل کانفرنس کی قیادت میں قومی عزت کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے پاس جس نوع کے بھی ٹوٹے پھوٹے نجی ہتھیار تھے اُن سے اپیل کی گئی کہ وہ انھیں نیشنل کانفرنس کے حوالے کریں۔ جن لوگوں کے پاس موٹر کار یا کسی اور قسم کی سواریاں تھیں اُن سے بھی یہی استدعا کی گئی۔ رضا کاروں کو ہتھیار استعمال

کرنے کی تربیت دینے کے لیے رات دن مختصر سی ٹریننگ دی گئی اور اس طرح سے کشمیر ملیشیا کی بنیاد پڑ گئی۔ مغلوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے صدیوں سے کشمیریوں کو غیر مسلح کر کے انھیں عسکری تربیت سے دُور رکھا تھا۔ لیکن اب آزمائش کی اس گھڑی میں اُن کا جذبۂ حبِ وطن اُن کی صدیوں کے دبے ہوئے سرچشموں کو اُبال رہا تھا۔ رضا کاروں میں ہندو، مسلم، سکھ نوجوانوں کے علاوہ لڑکیاں بھی شامل ہوئیں اور ان سب نے پلوں، بینکوں اور دیگر اہم دفاتر پر پہرہ دیا عجیب جذبہ تھا۔ ان میں بھی۔ وہ دن رات اسی دھن میں لگے رہتے۔ کھانا ملے یا نہیں، پاؤں میں جوتے ہوں یا نہیں، لیکن وطن کی محبت سے اتنے سرشار تھے کہ ذاتی آرام و آسائش کا بالکل خیال ہی نہیں رہا تھا۔ شاید شاعر نے اِن ہی مجاہدوں کے متعلق کہا تھا:

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

رضا کاروں کو ہدایت تھی کہ وہ غیر مسلم بھائیوں کے گھروں پر کڑا پہرہ دیں اور ان کو یقین دلائیں کہ جب تک وہ اُن کے دروازوں کی نگہبانی کر رہے ہیں کوئی قبائلی ان کی لاشوں پر سے ہی دہلیز کو پار کر کے گھر میں گھس سکتا ہے ان دنوں نہ ریڈیو اسٹیشن تھا اور نہ نشر و اشاعت کے دوسرے وسائل، ہر روز شام پرتاپ پارک میں لوگ جمع ہو جاتے تھے میں اُن کو دن بھر کے تازہ حالات سے آگاہ کرتا اور دوسرے دن کے لیے ہدایت دیتا تھا۔ اُن کو حوصلہ دینے کے لیے میں اُن کی وطن پرستی کے جذبے کو بھی مہمیز کرتا تھا۔ اور یہی بات ہے کہ لوگ ان دنوں ایک جان ہو کر مرنے مارنے پر تیار تھے۔

اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں اب کچھ اہم سیاسی اقدام ناگزیر بن گئے تھے۔

ظاہر تھا کہ پاکستان اب ہمارے ضمیر کا چراغ اور ہمارے ذہن کی روشنی بجھانا چاہتا تھا۔ تاکہ خوف اور دہشت کی تاریکی میں وہ ہماری متاعِ آزادی اور ہمارے حقِ خود ارادیت پر شب خون مارے۔ اوّلیت اس بات کو تھی کہ ہم اپنا قومی وجود اس یلغار سے بچانے کی کوشش کریں۔ اس لیے ہم اب امداد کے لیے ہندوستان کی طرف نگاہیں اٹھا رہے تھے۔ اس جانب بہت سے مخلص دوستوں نے ہمارا ہاتھ بھی بٹایا۔ جن میں مرحوم سیف الدین کچلو بھی تھے۔ وہ ان دنوں سرینگر میں تھے۔ وہ حالات کی نزاکت بھانپ کر الٹے پاؤں دلی چلے گئے اور وہاں کانگریسی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ کشمیر کو بچانے کے لیے کوشش کریں۔ لیکن ہندوستان کی حکومت کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مہاراجا نے رسمی طور پر ہندوستان سے الحاق نہیں کیا تھا۔ اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ جب تک ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا کوئی قانونی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ہندوستان کی فوجوں کو کشمیر بھیجنا ایک قانونی جرم ہوگا۔ ان کا نظریہ تھا کہ اس صورت میں پاکستان بھی ایسا کر سکتا ہے اور چونکہ ابھی ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کی سربراہی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان کا آپس میں لڑنا ممکن نہ ہوگا اور اگر انھیں لڑنے کی صلاح دی گئی تو وہ دونوں طرف سے کمان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لیے فوجی امداد بھیجنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ مہاراجا کشمیر مسودۂ الحاق پر دستخط کریں۔ مہاراجا ہری سنگھ نے اس معاملے پر تذبذب کا مظاہرہ کیا تھا۔ جون کے وسط میں ماؤنٹ بیٹن نے سرینگر آکر انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ الحاق کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں اور عوام کی رائے جاننے کے بعد دو میں سے ایک مملکت کے ساتھ الحاق کر لیں۔ سردار پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن ہی کی معرفت کہلا بھیجا تھا کہ اگر مہاراجا ۱۵ اگست سے پہلے پاکستان

میں ہی جانے کا فیصلہ کرے تو ہندوستان اسے ایک غیر دوستانہ قدم تصوّر کرے گا۔

ایک اور رکاوٹ مہاتما گاندھی کی ذات تھی۔ اس بات پر دو رائیں تھیں کہ کیا گاندھی جی فوج بھیجنے کی اجازت دیں گے یا نہیں! چونکہ میں ہندوستانی رہنماؤں سے امداد طلب کرنے کے لیے دلی آیا ہوا تھا اس لیے میں نے اس معاملے پر گاندھی جی سے بات چیت کی۔ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ کشمیر کی لڑائی زمین کے لیے نہیں بلکہ انہی آدرشوں کو بچانے کے لیے ہے جن کی علمبرداری اور ترجمانی وہ کرتے ہیں۔ جن کا پرچار خود انھوں نے عمر بھر کیا ہے اور جن کے لیے وہ اس وقت بھی چٹان بن کر بادِ مخالف کے تیز جھونکوں کے آگے ڈٹ گئے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کو اس وقت کشمیری عوام کی امداد سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے۔ جبکہ کشمیری عوام حملہ آوروں کے ظلم و جبر کے خلاف بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستان نے امداد نہ دی تو ایسا کرنا کشمیر کے لوگوں سے زیادہ ان آدرشوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی جو ہمیں مشترکہ طور پر عزیز ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے ازراہِ شفقت اس استدعا کو منظور کر لیا۔ اور فوج کشمیر روانہ کرنے کی اجازت بخشی۔ ادھر مہاراجا جموں پہنچ گیا تھا۔ مگر اس کے کیمپ میں کیسی بھگدڑ اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

"مہاراجے کے مشورے سے طے پایا کہ کسی ہوائی جہاز کا انتظام ہو سکے تو دلی جاکر فوری طور پر امداد لانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ پاکستان جاکر ہتھیار ڈال دیے جائیں۔"

(مہاجن، کشمیر کا ہند سے الحاق۔ صفحہ ۱۶)

مہاراجا کی حالت ایسی غیر تھی کہ اس نے ۲۶ اکتوبر کو جموں پہنچنے پر اپنے خاص مصاحبین

کو ہدایت دی تھی کہ اُس کو اُس کے خوابِ استراحت سے صرف اسی صورت میں جگایا جائے جب وی۔ پی مینن واپس آئے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ ہند نے الحاق منظور کیا ہے۔ دوسری صورت میں اُس کو نیند ہی کی حالت میں اپنے پستول سے کنپٹی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ حکومتِ ہند نے اس مرحلے پر ریاستوں کے محکمے کے سیکریٹری وی۔ پی مینن کو روانہ کیا۔ اُن کی جیب میں دستاویزِ الحاق کا مسودہ تھا۔ وہ ۲۶؍ اکتوبر کو ہی اس پر مہاراجا سے دستخط کروا کے واپس دہلی پہنچ گئے۔ اُن کا استقبال کرنے کو خود سردار پٹیل ہوائی اڈے پر گئے تھے۔ اور انھیں اپنے ساتھ جواہر لال کی کوٹھی پر لے آئے۔ میں بھی وہیں رُک گیا۔ اُن دنوں پنڈت جواہر لال یارک روڈ کی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے اور میں اُن کے مہمان کی حیثیت سے وہیں مقیم تھا۔ وی۔ پی مینن اور مہر چند مہاجن جس وقت اُن کے پاس پہنچے میں کوٹھی میں ہی موجود تھا۔ مہر چند مہاجن پنڈت جی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں انھوں نے پنڈت جی سے کہا۔

"فوج دیجیے، الحاق لیجیے، اور جو بھی اختیارات چاہیے عوامی پارٹی (نیشنل کانفرنس) کو دیجیے، لیکن آج ہی ہوائی جہاز سے فوج سرینگر بھیج دیجیے۔ ورنہ میں جناح صاحب کے پاس جا کر مصالحت کروں گا۔"

بھلا جواہر لال ایسی باتوں کی تاب لانے والے کہاں تھے۔ یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے۔ جواہر لال کو جب غصہ آتا تھا تو غضب ہو جاتا تھا۔ انھوں نے مہاجن صاحب سے نہایت درشت لہجے میں کہا کہ پاکستان سے سمجھوتے کا شوق ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ پنڈت جی غصے میں ہی کچھ بڑبڑاتے ہوئے شعلۂ جوالہ بن کر باہر آئے۔ میں نے پنڈت جی کو اس حال میں دیکھا تو اُن سے وجہ دریافت کی۔ پھر بڑی لگاوٹ سے

میں نے اُن کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور اُن سے کہا کہ یہ وقت خفا ہو جانے کا نہیں ہے بلکہ جلد از جلد اقدام کرنے کا ہے اگر تھوڑی سی تاخیر ہو گئی تو پھر نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ سانپ نکل جائے گا اور ہم لکیر پیٹتے رہ جائیں گے۔ میں نے پنڈت جی کو یہ اطلاع بھی دی کہ نیشنل کانفرنس کی تائید اس فیصلے کے ساتھ ہے۔ اِس سے انھیں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ وہ اندر گئے اور مہاجن صاحب سے کہا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی شیخ عبداللہ کا بھی خیال ہے اور اس طرح دستاویزِ الحاق پر دستخط کر دیے گئے۔ مہاجن نے اس واقعے کے متعلق بعد میں لکھا۔

"ایسے آڑے موقعے پر شیخ عبداللہ کی مدد کا ہمیشہ ممنون رہوں گا کیونکہ انھوں نے بروقت پیغام بھیج کر کشمیر کو پاکستان کے ہاتھ جانے سے بچا لیا۔"

دستاویزِ الحاق میں مہاراجا نے خارجی معاملات، رسل و رسائل اور دفاعی امور میں الحاق کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے الحاق منظور کرتے ہوئے یہ مشہورِ زمانہ شرط لگا دی۔ جس نے بعد میں کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ انھوں نے مہاراجا کو لکھا۔

"جن مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے اُن کے پیشِ نظر میری حکومت ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو اس اصول کے تحت قبول کرتی ہے کہ جس ریاست میں الحاق کا مسئلہ مابہ نزاع ہو، وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہونا چاہیے۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جوں ہی امن و امان بحال ہو اور حملہ آوروں سے ریاست کو نجات ملے تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے۔"

لیکن یہ بات یہاں پر دلچسپی کا باعث ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت فوج کشمیر میں بھیجنے کی مخالفت کرکے کچھ بین الملکی پیچیدگیوں کے اُٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ہندوستانی کابینہ کی دفاعی سب کمیٹی کے صدر تھے اور اُن کی مخالفت سے ایک نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ لیکن جب مہاتما گاندھی نے کشمیر میں فوج بھیجنے کے حق میں رائے دی تو ماؤنٹ بیٹن کو بھی سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

جواہر لال نہرو نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میرے نام اپنے خط میں لکھا۔

"ہم نے ایک مشکل کام کا بیڑا اٹھا لیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پار اتر جائیں گے۔ کل جب سے فیصلہ لیا گیا ہے اور جب سے میں نے آج سنا ہے کہ ہماری فوج سرینگر میں اتر گئی ہے، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے اب یہ ہمارے مستقبل کا امتحان ہوگا۔"

۳۷

آگ، خون اور روشنی

ہندوستان کی تقسیم کا پرکار صرف اس کی علاقائی وحدت کے جگر میں شگاف کرنے کے لیے نہیں گھوما تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ املاک، افواج، اثاثوں اور ملازمتوں کی تقسیم بھی حتمی تھی۔ اُس وقت ہندوستانی فوجوں کے کچھ ٹکڑے پاکستان میں اور پاکستانی فوجوں کے کچھ دستے ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے۔ گویا ایک افراتفری کا عالم تھا۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام تھا ہی نہیں۔ لیکن ہندوستانی محکمۂ دفاع نے سرینگر فوج پہنچانے کے لیے بے حد مستعدی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ رائل انڈین ایئر فورس کے علاوہ تقریباً تمام شہری جہاز بھی طلب کر لیے گئے۔ اور کوئی ایک سو جہازوں نے کشمیر فوج پہنچانے کا تاریخی معرکہ شروع کر لیا۔ ۲۷ر اکتوبر صبح تڑکے پہلی سکھ رجمنٹ کے ساڑھے تین سو سپاہیوں کا پہلا دستہ سرینگر بھیج دیا گیا۔ اس دستے کی کمان لیفٹیننٹ کرنل دیوان رنجیت رائے کے ہاتھ میں تھی اور یہ صبح کے ساڑھے نو بجے کے قریب سرینگر کے ہوائی اڈے پر اترا۔ کام اتنی چابک دستی سے کیا گیا کہ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ "۲۷ر اکتوبر کے فوجی آپریشن کی برق رفتاری سے دوسری

عالمگیر جنگ کی جنوب مشرقی ایشیا کمان کی، جس کا میں لیڈر تھا، کوششیں ماند پڑگئیں۔ چنانچہ اس دستے نے ہوائی اڈے کے قریب پہنچے ہوئے قبائلیوں کا صفایا کر دیا۔ ہندوستانی فضائیہ کی اس برق رفتاری نے پاکستانی حملہ آوروں کی قسمت مہر بند کی جبکہ وہ اپنی غفلت سے جاگ کر کسی طور پر ہوائی اڈے کو تہس نہس کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے۔ ذرا پیچ اور گھنٹوں کی دیر ہو جاتی تو ہوائی اڈہ دشمن کے قبضے میں آگیا ہوتا اور پھر ہندوستانی جہازوں کا اترنا محال ہو جاتا۔ ہندوستانی فوج کا ایک اور دستہ سیدھا بارہمولہ چلا گیا۔ جہاں اُس کے کمانڈر کرنل رائے کام آئے۔ اِس فوجی دستہ کو پٹن کی طرف پسپا ہو جانا پڑا۔ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ اور ہماری فوجوں کی بہت قلیل تھی۔ قبائلی کرنل خورشید انور کی کمان میں آگے بڑھتے گئے اور سرینگر سے چار پانچ میل دور شالہ ٹینگ میں مورچہ جما کے شہر کے دروازے کھٹکھٹانے لگے۔ اُدھر سے بڈگام کی طرف وہ ہوائی اڈے پر دھاوا بولنے کے لیے پہنچ گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہندواڑہ، اشمیل اور گاندربل کے علاقے میں پھیل گئے۔ ہم تو ہر قیمت پر سرینگر کو بچانے کے جتن کر رہے تھے اگر شہر کا امن و امان بگڑ جاتا تو ساری لڑائی کا نقشہ ہی پلٹ جاتا۔ اِس مرحلہ پر ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ سرینگر اور کشمیر کو بچانے میں صرف ہندوستانی افواج کا ہی حصہ نہیں بلکہ دوسرے عوامل کا بھی اگر زیادہ نہیں تو برابر کا حصہ ضرور ہے۔ راولپنڈی سے سرینگر تک موٹر سے چھ گھنٹے سے زیادہ کی مسافت نہیں ہے لیکن قبائلی حملہ آوروں نے مظفرآباد سے مضافاتِ سرینگر تک پہنچنے میں چھ دن لگا دئے۔ جس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک بڑی وجہ یہ تھی کشمیری عوام نے حملہ آوروں کو بے روک ٹوک آگے بڑھنے نہیں دیا بلکہ قدم قدم پر اُن کا مقابلہ کر کے اُن کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

گویا قبائلیوں سے کشمیر کو بچانے کا فریضہ ہندوستانی فوج کی آمد سے پہلے ہی کشمیریوں نے اپنے نازک کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قبائلیوں نے مقامی آبادی کو زیر کرنے کے بعد ہر قریئے اور قصبے میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اِس لیے یہ خیال بالکل بجا ہے کہ اگر قبائلی لوٹ مار میں اپنا وقت صرف نہ کرتے تو ہندوستانی فوجوں کے سرینگر میں اُترنے سے بہت پہلے وہ سرینگر پر اپنا جھنڈا گاڑ چکے ہوتے۔ لیکن اُن کا خیال بھی اُن کے رہنما جناح صاحب کی طرح یہی تھا کہ "کشمیر ایک چیک ہے جو میری جیب میں پڑا ہے۔ جسے میں جب چاہوں بھنا سکتا ہوں۔" قبائلی اپنی طاقت کی دھن میں کشمیریوں کے مستحکم ارادے اور دوسرے عوامل سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ وہ تو کشمیری گھروں میں پڑے ہوئے "سماواروں" اور آفتابوں کے دستوں کو جو پیتل کے بنے ہوئے ہوتے ہیں "زرِ خالص" سمجھ کر دھڑا دھڑ سرحد پار بھجوا کر سمجھ رہے تھے کہ کشمیر میں حاصل کئے گئے مال غنیمت سے وہ اپنی صدیوں کی محرومیاں دور کر پائیں گے اور تو اور انھوں نے وہاں کے چرچ کے کانسی کے گھنٹے تک نہیں چھوڑے۔

بہر حال دہلی سے متواتر کمک آ رہی تھی۔ پٹیالہ کی فوج کا ایک دستہ بھی ہوائی جہازوں میں سرینگر پہنچا۔ انھوں نے اپنا کیمپ رام باغ میں قائم کر لیا۔ لیکن تقسیم نے جو ناسور پیدا کئے تھے اب اُس کا ایک بھیانک شگوفہ کھلا۔ پٹیالہ کمانڈر نے نیشنل کانفرنس سے کچھ گائڈ مانگے۔ جو راستوں کی نشاندہی کر سکیں۔ یہ کیمپ کئی روز تک رام باغ میں لگا رہا۔ جب اِس کو محاذ پر چڑھنے کا حکم مِلا اور اس نے کیمپ خالی کیا تو خندقوں سے نیشنل کانفرنس کارکنوں کی تین چار لاشیں ملیں۔ اِس پر زبردست سنسنی پھیل گئی۔ شہر میں دوکانیں بند کر دی گئیں اور لاشوں کو جلوس کی

صورت میں بازاروں میں گھمانے لگے۔ ہندوستانی سیکولرازم کا یہ پہلا نقش تھا جو یہاں کے عوام کے دلوں پر پڑا۔ چنانچہ عوام میں بیزاری پھیل گئی اور اُنھوں نے ہماری بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ حالات اِنتہائی نازک تھے اگر ہمارے قدم ذرا بھی ڈگمگا جاتے تو صورتِ حال کا پلٹا کھانا یقینی تھا۔ میں نے فوراً کارکنوں کی ایک میٹنگ بلائی اُس وقت ہم نے اپنا دفتر پولوگراونڈ کے متصل ریجنیا ہوٹل میں منتقل کر دیا تھا۔ اِس میٹنگ میں ہندوستانی فوجوں کے بڑے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل کلونت سنگھ بھی موجود تھے۔ میں نے کارکنوں کو سمجھایا کہ پٹیالہ ٹائگرس کی یہ حرکت اگرچہ بہت افسوسناک ہے لیکن نفسیاتی طور غیر متوقع نہیں، یہ لوگ پاکستان کے علاقے سے تازہ دم آئے ہوئے ہیں۔ وہاں اُن کے ہم مذہبوں اور عزیز و اقارب پر جو قیامت گذری ہے اُسے اُنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ اِس وقت جو لڑائی ہو رہی ہے وہ سکھوں اور مسلمانوں کی مذہبی لڑائی ہے۔ اِس لیے ہر سکھ کا فرض ہے کہ جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آئے اُس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے کیونکہ مغربی پنجاب میں بھی مسلمان ہر سکھ کو لقمۂ اجل بنا دیتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ اس چھوٹے سے خطے میں ہم ہندو، مسلمان یا سکھ کی لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں۔ اس لیے اِس قسم کے واقعات سے شاید ہم کو کئی بار دوچار ہونا پڑے۔ لیکن ہمارے عزم و ارادے میں کوئی کمزوری نہ آنی چاہیے۔ ہمیں تہیّہ کرنا ہوگا کہ ہم اِنسان کی درندگی کو اپنے اصول اور عمل سے شکست دے کر اس کے اندر چھپی ہوئی شرافت کو اُبھاریں گے۔ فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کے بھوت کو ہم کشمیر کی سرزمین پر ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفنا دیں گے۔ چاہے وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا سکھ فرقہ پرستی۔ البتہ ہمیں ہندوستانی رہنماؤں سے درخواست کرنی ہے

کہ آدرشوں کی جنگ لڑنے کے لیے وہ احتیاط سے اپنی فوج کشمیر بھیجیں۔ اور یہاں بھیجنے سے پہلے اُن کو کشمیر میں ہو رہی لڑائی کے مقاصد بہ خوبی ذہن نشین کرائے جانے چاہییں تاکہ وہ اُن جراثیم سے پاک ہو سکیں جو اُنھیں ہند اور پاکستان میں چاروں طرف سے آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ فوجی افسران کو بھی دل لگا کے کوششیں کرنی چاہییں۔ جنرل کلونت سنگھ نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور پنڈت جی نے اس بات کی ہدایات جاری کیں کہ فوج کو کشمیر روانہ کرنے سے پہلے اُن مقاصد کے بارے میں پوری طرح سمجھایا جانا چاہیے جن کے لیے کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ اس نسخے سے تو کچھ فرق پڑا لیکن اِس میں شک نہیں کہ ابتدائی دور میں پونچھ اور راجوری کے غریب مسلمانوں نے ہندوستانی فوجوں کے ہاتھوں کہیں کہیں بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائیں۔ آہستہ آہستہ فوج اور شہریوں کے تعلقات سنبھلنے لگے۔ اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ جب ایک سال کے بعد یہی پٹیالہ پلٹن ہندواڑہ سے کہیں اور تبدیل ہوئی تو وہاں کے عوام کی طرف سے مجھے سیکڑوں تار موصول ہوئے جن میں درخواست کی گئی تھی کہ اِس کو ہندواڑہ میں ہی رہنے دیا جائے۔ اِس طرح سے اِبتدا میں ہی ہم نے کشمیر کے میدان جنگ پر فوجی محاذ کے ساتھ ساتھ نظریاتی محاذ پر بھی کامیابیاں حاصل کیں۔

میں نے زندگی میں بھی بڑے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ مجھے اپنوں کے تیرِ ملامت اور ناوکِ دشنام سہنا پڑے ہیں۔ لیکن میں کبھی انسان کی بنیادی اِنسانیت سے نااُمید نہیں ہوا۔ اِنسان میں وحشی پن اور درندگی بھی ہے۔ اور نیکی اور شرافت کے جوہر بھی۔ سوال محض یہ ہے کہ ہم انسان کے خمیر میں رچے ہوئے اُن دو پہلوؤں میں سے کس کو اُبھارتے اور سنوارتے ہیں۔

شالہ ٹینگ میں قبائلیوں کے ساتھ ہندوستانی فوج کی پہلی زبردست اور بڑی خونریز جھڑپ ہوئی۔ اس وقت ہندوستانی فوج کے پاس کافی کمک آگئی تھی اور کچھ بمبار جہاز بھی۔ قبائلیوں کے پاس بمباروں کے خلاف کوئی بچاؤ نہ تھا۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ جانے پر مجبور ہوگئے۔ حالانکہ پاکستان فوج کے میجر اکبر خان جنھوں نے جنرل طارق کا لقب اختیار کیا تھا خود اس لڑائی کی نگرانی کرنے کے لیے شالہ ٹینگ پہنچ گئے تھے۔ ہوائی جہازوں سے قبائلیوں پر دہشت طاری ہوئی اور وہ انھیں "شیطان کا چرخہ" کہہ کر پکارنے لگے۔ ہندوستان کی بکتر بند گاڑیوں نے بھی لڑائی کا پانسہ پلٹنے میں اہم حصہ ادا کیا۔ قبائلی پٹن کی طرف مڑ گئے اور وہاں ایک اور مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ پٹن کے قصبے کو کافی نقصان پہنچا آخر وہاں بھی کافی لاشیں چھوڑ کر قبائلی بارہمولہ کے راستے اوڑی ہو کر مظفر آباد تک پہنچ گئے اور اپنے ساتھ لوٹ مار کی جائداد اور اغوا کی ہوئی بد قسمت عورتیں لے گئے۔ بارہمولہ پر ہمارے دوبارہ قبضے کے فوراً بعد میں بخشی غلام محمد اور سردار بدھ سنگھ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بارہمولہ جیسا بارونق قصبہ شمشان بنا تھا اور شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لیکن جوں ہی ہماری آمد کی خبر پھیلی لوگ جنگلوں سے جہاں وہ پناہ لینے کے لیے گئے تھے۔ آگئے اور مستانہ وار رقص کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ان کے جذبات قابو میں نہیں ہوں گے۔ لیکن ہماری موجودگی نے کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونے دیا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں اپنے ہیڈ کوارٹر ریجنا ہوٹل میں سویا ہوا تھا کہ ایک بجے کے قریب آرمی ہیڈ کوارٹر بادامی باغ سے اطلاع آئی کہ اس رات قبائلی سرینگر میں داخل ہونے والے ہیں۔ اور ان کا رخ سیدھے میرے ہیڈ کوارٹر کی طرف ہوگا۔ اس لیے مجھے کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے۔ مجھے علی الصبح دہلی جانا تھا۔ میرے ساتھ وی۔ پی مینن بھی جانے والے تھے۔ جو مہاراجا کو سرینگر چھوڑ کر کا مشورہ دینے آئے تھے۔ میں رات کو اپنے ہیڈ کوارٹر سے نکلا۔ ہوائی اڈے کے راستے میں ایم۔ اے۔ کے۔ واتل کا مکان تھا۔ ہم نے اس کے پچھواڑے میں پناہ لی۔ کچھ دیر نزدیک سے بھی ایک خوفناک دھماکے کی آواز آئی۔ ہم سمجھے کہ بس اب پکڑے گئے اور تشدد کے لیے تیار ہوگئے۔ لیکن ہمارے انتظار کے باوجود کوئی ہمیں پکڑنے کے لیے نہیں آیا۔ شاید کسی گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ اور ہم کچھ اور ہی سمجھے تھے۔ دوسری صبح کو میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی روانہ ہوگیا۔

قبائلی جب بارہمولہ میں تھے ہمارے ایک پرجوش اور نوجوان ساتھی محمد مقبول شیروانی ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ شیروانی کے ہاتھ کہیں سے ایک موٹر سائیکل آگئی تھی۔ وہ ہمیں اپنے علاقے کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے سرینگر آئے تھے جہاں وہ مجھ سے ملے۔ وہ پھر واپس جانے کو پر تول رہے تھے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ حالات بہت خراب ہیں اس طرح تن تنہا واپس مت لوٹو۔ مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ حب وطن کے جذبات اس وقت لوگوں کا خون اس طرح اچھال رہے تھے کہ انھیں اپنی عافیت کی کوئی پروا نہ تھی لیکن جس خطرے کا میں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا وہی ہوا۔ وہ سنگرامہ کے نزدیک قبائلیوں کے نرغے میں آگئے اور انھیں بارہمولہ پہنچا دیا گیا جہاں قبائلیوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ میرے خلاف نعرہ دیں اور پاکستان زندہ باد پکاریں۔ لیکن انھوں نے انکار کیا اور "شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد" کا نعرہ بلند کیا۔ بس پھر کیا تھا ان کو یسوع مسیح کے سے انداز میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور ان کی ہتھیلیوں اور پنڈلیوں میں کیلیں پیوست کر دی گئیں۔ لیکن ان کی بہادری اور اپنے مقصد کے ساتھ لگن ملاحظہ ہو کہ جب ان کے جسم کو کیلوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا وہ شیر کشمیر زندہ باد کے نعرے برابر بلند کرتے جا رہے تھے اس کے بعد انھیں چند گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اور یہ بہادر کشمیری نوجوان اپنے وطن کی آن نبھاتا ہوا شہید ہوگیا۔

بعد میں جب بارہمولہ آزاد ہوا تو جواہر لال اپنی پہلی یاترا میں اُن کی قبر پر حاضر ہوئے اور وہاں خراجِ عقیدت ادا کیا۔ مہاتما گاندھی نے، جو خود بھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کچھ ہی مہینوں میں اپنی جان نچھاور کرنے والے تھے، اپنی ۱۹ نومبر کی پرارتھنا سبھا میں انھیں خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا:

"یہ ایک ایسی شاندار شہادت تھی کہ جس پر کوئی بھی ہندو، مسلمان، سکھ یا عیسائی ناز کر سکتا ہے۔"

بعینہٖ ایسا ہی واقعہ مظفر آباد میں بھی پیش آیا۔ جہاں نیشنل کانفرنس کے ایک معزز کارکن ماسٹر عبدالعزیز رہا کرتے تھے۔ جب قبائلی مظفر آباد پر چھا گئے تو ماسٹر صاحب نے اپنے گھر میں ہندو اور سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والی کچھ پڑوسی عورتوں کو پناہ دی۔ جب قبائلی ان کو پکڑنے کے لیے آئے تو اُس نے اُن سے کہا "تم مجھے تو مار سکتے ہو لیکن ان بے گناہ اور معصوم عورتوں اور بچوں کو مارنے کا تمھارے پاس کیا جواز ہے۔ تم تو اپنے آپ کو اسلامی مملکت کا علمبردار کہتے ہو۔ اسلام میں اس بات کی کہاں اجازت ہے کہ بے گناہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر تلوار اُٹھائی جائے۔" اس راست گفتاری پر قبائلیوں کو بڑا تاؤ آگیا وہ ماسٹر جی اور کچھ دوسرے ہندوؤں اور سکھوں کو دریا کے کنارے لے گئے اور گولیوں سے اُن کے جسم کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ یہ حُبِ وطن اور جذبۂ ایثار و قربانی کے کچھ انمول نمونے ہیں۔ اُن کی قیمت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ اس وقت پیش آئے جب چاروں طرف شرافت اور محبت کے چراغ گُل ہو چکے تھے۔ جب تک دنیا میں انسانیت موجود ہے، تب تک یہ بے لوث مثالیں نسلِ انسانی کو فیضان اور حوصلہ بخشتی رہیں گی۔ ان قربانیوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ہماری تحریک میں کتنی اندرونی شکتی اور قوت موجود تھی۔ یہ مجاہد اپنا کام کر گئے اور ہماری قوم اُن

کا نام لیتے ہوئے ہمیشہ فخر و ناز سے گردن بلند کرتی رہے گی۔

بارہمولہ اور اوڑی میں ہندوستانی افواج کی رہنمائی بریگیڈیر سین کر رہے تھے۔ وادی میں حکومت کا نظم و نسق عملاً نیشنل کانفرنس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی کے رضاکار دفتروں، بینکوں اور دیگر اہم ناکوں کی نگہبانی کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے محکمۂ خوراک میں کسی کو ڈیڑھ لاکھ کی رقم لے جاتے ہوئے پکڑ لیا۔ اُس کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ پوچھ تاچھ سے معلوم ہوا کہ وہ یہ روپیہ کسی بینک میں جمع کرانے کے لیے جا رہا تھا۔ ہم نے روپیہ ضبط کر لیے بعد میں مختلف ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ رقم بہت کام آئی۔

بہت جلد قبائلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہماری فوج اوڑی تک پہنچ گئی۔ اور اس طرح پاکستان کے کشمیر پر بزورِ شمشیر قبضہ کرنے کے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جناح صاحب کے لیے یہ خاص طور پر بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ واقف کار حلقوں کے مطابق انھیں پاکستانی حکام نے ایبٹ آباد پہنچا دیا تھا کہ سرینگر پر پاکستانی پرچم کشائی کی خبر سننے کے بعد وہ عید کے روز جو ۲۶؍ اکتوبر یعنی قبائلیوں کے ریاست کے داخلے کے بعد چوتھے روز پڑتی تھی، ایک فاتحانہ جلوس کی صورت میں وہاں داخل ہوں۔ جب پانسہ پلٹ گیا تو جناح صاحب جلال میں آگئے۔ انھوں نے اپنی افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو حکم دیا کہ وہ کشمیر پر پوری طاقت سے دھاوا بول دیں۔ لیکن جنرل گریسی ہند اور پاکستان کی فوجوں کے سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکلینک کی نوٹس میں یہ معاملہ لائے۔ سر کلاڈ نے جناح صاحب سے کہا کہ دونوں ملکوں کی افواج انگریز افسروں کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ اگر پاکستانی فوج کشمیر پر چڑھ آتی ہے تو یہ دونوں مملکتوں کے درمیان اعلانِ جنگ ہوگا۔ اور اُس صورت میں انگریز

افسر اپنے عہدوں سے الگ ہو جائیں گے۔ پاکستانی فوج کا سارا انحصار برطانوی افسروں پر تھا۔ اس لیے جناح صاحب معاملے کی نزاکت سمجھ کر اپنے احکامات پی گئے۔ لیکن پاکستان کی فوجی مشین پردے کے پیچھے جنگ میں لگی رہی۔ اور پاکستانی فوج کے ایک افسر میجر جنرل اکبر خان جنرل طارق کا روپ دھار کر حملہ آوروں کی رہنمائی کرتے رہے۔ دسمبر آتے آتے کشمیر کی سرزمین پر موجود حملہ آوروں کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔

▲▲▲

(۳۸)

آندھی میں چراغ

مہر چند مہاجن مہاراجا کے ساتھ ہی کشمیر چھوڑ کر جموں میں اس کے محل میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی کمین گاہ میں خود آرام سے بیٹھ کر اپنے نائب رام لال بترہ کے ذریعے ہمارے کام میں بے جا مداخلت کر رہے تھے۔ یہ دو عملی حکومت کے فالج زدہ نظام میں اور رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی۔ چنانچہ میں نے جواہر لال سے کہا کہ ان حالات میں ہماری جماعت امن و قانون کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔ یا تو مہر چند مہاجن کو رخصت کیا جائے یا ہم میدان چھوڑ دیں گے۔ پنڈت جی حالات کی نزاکت سے واقف تھے۔ اور وہ کشمیر کے نظم و نسق کی نئی تنظیم کے حق میں تھے۔ لیکن سردار پٹیل ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ مہر چند مہاجن کو سیاسی سٹیج پر جمائے رکھنا چاہتے تھے۔ گو وہ خوب جانتے تھے کہ نیشنل کانفرنس کے تعاون کے بغیر مہاجن صاحب ایک پل کے لیے ٹک نہیں سکتے۔ اس وقت نہرو کیا سوچتے تھے اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجا ہری سنگھ کے نام لکھا۔

"کشمیر میں اگر کوئی ذمہ داری نبھا سکتا ہے تو وہ شیخ عبداللہ ہے ان کی

شخصی دیانت اور دماغی توازن کے بارے میں میری رائے بہت ہی
عمدہ ہے۔ کشمیر میں اُن کے بغیر کسی مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل دریافت نہیں
کیا جا سکتا۔"

اِن حالات میں ایک اور صورت اختیار کی گئی۔ مہر چند مہاجن بدستور وزیر اعظم رہے لیکن مہاراجا نے مجھے انتظامیہ کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کر دیا اور میں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں میں اپنے عہدے کا حلف لیا۔ ۱۸۴۶ء کے بعد ریاست میں ۴۰ وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ مگر میں پہلا کشمیری مسلمان تھا جو اس عہدے پر فائز ہوا تھا۔ میں نے یہ منصب سنبھالتے ہی سرینگر سیکریٹریٹ میں حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے خطاب کیا۔ میں نے انھیں اس بحرانی کیفیت میں ہمت و حوصلہ قائم رکھنے اور اپنے فرائض مستعدی سے انجام دینے کی تلقین کی۔ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمیں پاکستان سے کوئی عناد نہیں ہے۔ لیکن ہمارا موقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق کشمیر کے لوگوں کو ہے۔ اسی لیے ہندوستان سے الحاق کی نوعیت عارضی ہے اور یہ تابع رائے شماری ہے اور ہم بھی رائے شماری کے ذریعے اِس کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں جناح صاحب کو اگر اب بھی یہ جمہوری طریقہ منظور ہو تو میں اُن سے بات کرنے کے لیے کراچی بھی جا سکتا ہوں۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے ریاست کے درہم برہم انتظامیہ کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے اپنے قریبی ساتھیوں کو مختلف فرائض سونپے۔ بخشی غلام محمد مرکز میں ہی میرے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بیگ صاحب اننت ناگ کے، صوفی محمد اکبر بارہمولہ کے، میر مقبول گیلانی اوڑی کے اور محمد امین وکیل ڈوڈہ کے ایمرجنسی ایڈمنسٹریٹر مقرر کیے گئے۔ محی الدین قرہ صاحب کو بھی بعض ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ صادق صاحب ملیشیا کے انچارج رہے اور وہ کلچرل

شعبے کی تنظیم میں بھی سرگرم رہے۔ اس شعبے نے کچھ گیتوں کو جن میں عوامی مزاج کی ترجمانی کی گئی تھی۔ موسیقیت سے سنوار کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے ڈرامے حبِ وطن کے موضوعات پر تیار کیے اور اس سے پاکستانی درندگی کے خلاف ایک فضا تیار کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملی۔ مہجور کاشمیری کی نظموں نے اِن سرگرمیوں میں اور جان ڈال دی۔ اُن کا قومی نغمہ " وہ لوبا بخوانو نو بہارک شان پیدا کر" مقبولِ عام ہو گیا۔ میں اس نغمے کو خود بھی بڑے مجمعوں میں ترنم سے پیش کر کے عوام کے وطنی جذبات ابھارتا رہا تھا۔ بدقسمتی سے کلچرل شعبے کی اس تنظیم پر کمیونسٹوں نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ اور یہ اُن کی سازشوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ چنانچہ وطن پرستی کا راستہ ترک کر کے یہ بعد میں کمیونسٹوں کے اغراض کی ڈھنڈورچی بن کر رہ گئی۔

ملیشیا کی تنظیم میں بھی اِسی قسم کے رجحانات نے سر اٹھانا شروع کیا تو میں نے کرنل عدالت خان کو اس کا کمانڈنٹ مقرر کیا۔ اور اس کا نظم و نسق اُس کے ہاتھ میں سونپ دیا۔ چنانچہ ملیشیا کے نوجوانوں نے ضلع ڈوڈہ کو فرقہ پرستی کی آگ سے بچانے میں کافی اہم خدمات انجام دیں اور کچھ نوجوانوں نے تو اپنی قیمتی جانیں بھی نچھاور کر دیں۔ ان میں غلام خان، سومناتھ بیرو، پشکرناتھ داد اور کچھ دوسرے مجاہد شامل تھے۔ میں کشمیر ملیشیا کی تنظیم کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ کشمیریوں کو صدیوں کے بعد پہلی بار ہتھیار واپس ملے تھے۔ اِس بہادر قوم نے تاریخ کی ابتدا سے ہی اپنی عسکری صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ راجہ للتادتیہ کی فوجوں نے ایک طرف وندھیاچل اور دوسری طرف منگولیا کی حدوں تک کشمیر کا پرچم لہرایا تھا۔ اور خود للتادتیہ منگولیا کے ہی کسی صحرا میں پران تیاگ آیا تھا۔ مسلمان سلاطین کے وقت میں سلطان شہاب الدین نے پنجاب اور سندھ کو فتح کیا تھا۔ اُس کی فتوحات اتنی شاندار تھیں کہ علامہ اقبال

اس کے توسط سے کشمیر کی عسکری روایات کا ذکر اس فخریہ لہجہ میں کرتے ہیں۔ ع

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز پُر دم بودہ است
عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدیں نزاد

محمود غزنوی نے جب شمالی ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر کشمیر کا رُخ اختیار کیا تو مہینوں توسہ میدان کے آس طرف محاصرہ ڈالنے کے باوجود اس کی کچھ پیش نہ چلی اور آسے کشمیر سے ہزیمت کھا کر لوٹنا پڑا۔ مغلوں نے کشمیر پر پے در پے حملے کیے لیکن بھگوان داس جیسے جہاں دیدہ جرنیل یہاں سے پسپا ہو کر چلے گئے اور پھر اکبر بادشاہ کو شمشیر کی بجائے حکمتِ عملی سے کشمیر پر سبقت حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو جانا پڑا۔ کشمیریوں کے اس بازوئے شمشیر زن کو مفلوج بنانے کے لیے مغلوں نے اُن پر فوجی تربیت کے دروازے بند کر دیے اور بعد میں یہ حکمتِ عملی افغانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے بھی برتی۔ لیکن اب کشمیری ہتھیار حاصل کر کے اپنی شاندار فوجی روایات کے احیا کے لیے جمع ہو رہے تھے۔

ادھر ہم کشمیر میں قبائلیوں کو پیچھے دھکیلنے میں سرگرم عمل تھے۔ اُدھر جموں میں مہاراجا ہری سنگھ فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کے لیے خوب ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرینگر سے بھاگ کر جوں ہی وہ رام بن پہنچے تھے تو اُنھوں نے پہلا فائر داغ کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے کی مہم شروع کی تھی۔ وہ جب سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے رام بن کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو اُنھوں نے چائے طلب کی۔ شومئ قسمت سے چائے لانے والا بیرا ایک مسلمان تھا اور اُس کے سر پر رومی ٹوپی تھی۔ اُس کو دیکھتے ہی مہاراجا کے مُنہ کا مزہ بگڑ گیا اور اُس نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔

جموں پہنچ کر مہاراجا اور مہارانی تارا دیوی نے کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنا شروع کیا۔

اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اُنھوں نے جموں کو انتہا پسند ہندوؤں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے تربیت یافتگان میں مہلک ہتھیار تقسیم کیے اور اُنھیں مسلمانوں کا صفایا کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ایسی ہی ایک ٹولی کی سربراہی پروفیسر بلراج مدھوک کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اودھمپور اور ریاسی میں مسلمانوں کے خونِ ناحق سے خوب ہاتھ رنگے۔ ہندو اکثریت کے دوسرے علاقوں میں بھی ایسی ہی وارداتیں پیش آئیں۔ انہی دنوں ایک بار میں جواہر لال کے ساتھ ایک چھوٹے پیکٹ ہوائی جہاز میں جموں آیا۔ جموں کے مسلمانوں کا وفد شیخ عبدالحمید کی قیادت میں جواہر لال سے ملا۔ اور اُن کو اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ جواہر لال نے اُنھیں دلاسا دیا اور مہاراجا کی بھی پرائیویٹ طور سرزنش کی کہ جو ہتھکنڈے وہ استعمال کر رہا ہے وہ مذموم اور مہلک ہیں۔ جموں کے مسلمان عملاً اپنے مکانوں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دن اُن کو حکم دیا گیا کہ اُنھیں سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ اُنھیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس جھانسے میں آ گئے اور بسوں میں سوار ہو گئے۔ اُنھیں سانبہ کی طرف لے جایا گیا۔ اور وہاں بسوں سے اُتار کر گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا گیا۔ اُن میں معزز اور معمر شہری بھی شامل تھے۔ اور بوڑھی عورتیں بھی۔ اُن دنوں اگر کوئی گوجر وغیرہ بے خبری میں شہر کی طرف آ نکلتا تو سنگھ کے جوان بیراج کی طرح تاک کر اُس کو قتل کر دیتے تھے۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اس قتلِ عام کے پیچھے مہاراجا اُس کی متعصب مہارانی اور مہر چند مہاجن کا ہاتھ کارفرما تھا۔ ہم کشمیر میں اپنا سب کچھ لڑائی میں جھونک کر برسرِ پیکار تھے۔ اور فرقہ پرستی کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جموں میں بیٹھے ہوئے مجنوں کی ان ریشہ دوانیوں سے چاروں طرف

زہر پھیل رہا تھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ مہاراجا اور مہارانی کے ذہنوں سے اُٹھنے والی اس منحوس آگ کے شعلے ڈوڈہ کو لپیٹ میں لینے کے لیے لپکنے لگے۔ وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد رہتی تھی۔ اِس لیے ہمیں اُن کو بچانے کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ کرنل عدالت خان نے وہاں ملیشیا کی ایک ٹکڑی روانہ کی۔ جس نے بڑی بہادری اور بڑی دانشمندی سے آگ کے شعلے بجھا دیے۔ مہاراجا نے جموں میں اپنے ایک قرابت دار کرنل بلدیو سنگھ پٹھانیہ کو چیف ایمرجنسی آفیسر اور میجر پرتیم سنگھ کو جموں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ یہ لوگ اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے کی بجائے مضافات میں اُن کے کیمپوں پر ہونے والے حملوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور اُنھوں نے بحالی کے کام کے ساتھ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو بھی وابستہ کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی ساری مسلم آبادی راشٹریہ سیوم سنگھ کے رحم و کرم پر تھی۔ اور کبھی کبھی تو اُن کی نگرانی میں کیمپوں سے مسلمان عورتوں کو اغوا بھی کیا گیا۔ صورت حال ایسی سنگین ہوگئی کہ جواہر لال نہرو کے ایک ذاتی جان پہچان کے آفیسر جی۔ سی۔ بالی، جو جواہر لال کے حکم سے جموں میں محکمۂ جاسوسی کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے طور پر کام کر رہے تھے، نے جواہر لال کو ایک خاص مکتوب میں اُن واقعات کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ:

"ڈوگرہ اور راجپوت سپاہی جموں میں مصیبتوں اور قتل و غارت کے لیے اِسی طرح ذمہ دار ہیں جس طرح پاکستان سے آئے ہوئے قبائلی حملہ آور۔ یہ شیروں کی طرح گاؤں کو جلاتے ہیں، عورتوں کو اغوا کرتے ہیں اور اُن کی عزت لوٹتے ہیں۔ ان غیر تہذیبانہ افعال میں اُنھیں مہاراجا اور یہاں کے حکمران طبقوں کی خاموشی سے اور بھی شہ ملتی ہے۔"

اُن دنوں جموں میں جو کچھ ہوا اُس میں مہارانی تارا دیوی کا بڑا ہاتھ تھا۔ تارا دیوی ایک

پُراسرار کردار راج گرو کے زیر اثر تھی۔ راج گرو کا اصل نام سوامی سنت دیو تھا اور وہ ایک غیر ریاستی شخص تھا۔ وہ کافی خوبصورت تھا۔ ریشم کے کپڑے پہنتا اور قیمتی عطر میں بسا رہتا۔ مہاراجا نے اچھ بل کی بارہ دری میں اُس کو رہنے کی اجازت دی تھی اور بعد میں چشمہ شاہی کے ایک بنگلے میں بھی رہتا تھا۔ جہاں محل کی رانیاں اُس کے درشن کو آتیں سنت دیو کے خلاف ایک انگریز خاتون مسز برک نے جو چشمہ شاہی میں رہتی تھی، حکومت سے شکایت کی کہ وہ اُس کی جوان لڑکیوں سے پینگیں بڑھاتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لیے اُسے ریاست سے باہر جانے کو کہا گیا۔ بعض لوگ اُسے کشمیر کا راسپوتین RASPUTIN کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ وہ کٹر قسم کا جنونی فرقہ پرست تھا۔ اور مہارانی کو اُس نے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا۔ پہلے پہلے تو مہارانی کی ہری سنگھ کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ لیکن ۱۹۴۵ء کے آس پاس مہارانی کا محل کے معاملات میں عمل دخل بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد مہاراجا اپنی جوان، خوبصورت اور اپنی عمر سے بیس سال کم نو عمر بیوی کے زیر اثر آتا جا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کا ولی عہد اب جوان ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کی وجہ سے اُس کی ماں کا منصب بڑھ رہا تھا۔ بہر کیف۔ مہارانی نے ست دیو کے ہی مشورے پر پنجاب سول سروس کے ایک ریٹائرڈ آفیسر رام لال بترو کو جو نہایت ہی متعصب شخص تھا مہاراجا کا وزیر حضوری اور بعد میں نائب وزیر اعظم مقرر کروا دیا۔ جموں میں مہارانی، راج گرو اور رام لال بترو کا یہ تکون اب شد و مد سے کام کر کے غضب ڈھا رہا تھا۔ مہاجن صاحب تو کٹر آریہ سماجی اور تنگ نظر تھے ہی، وہ رہی سہی کسر پوری کرتے رہے۔ دوسری طرف مظفر آباد سے بارہ مولا تک ایک اور آفت مچی تھی۔ قبائلیوں نے خاص طور پر سکھوں کو چن چن کر اپنا نشانہ بنایا تھا۔ اُن میں جتنے لوگ بھی جان بچا سکے وہ سرینگر پہنچ گئے۔ اُن کی حالت بہت بُری تھی اکثر

اُن کے خویش و اقارب قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن کا اثاثہ لوٹ لیا گیا تھا۔ بہت سے خود بھی گھائل ہو کر آئے تھے۔ ہم نے اُن کی ڈھارس بندھانے کی حتی الامکان کوشش کی اور اُن کی مدد بھی کی۔ لیکن وہ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جلد از جلد بانہال پار کر کے جموں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا انتظام نہیں تھا۔ جتنی گاڑیاں تھیں وہ مہاراجا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور کچھ گاڑیاں پاکستان میں ہی روک لی گئی تھیں۔ میں نے اننت ناگ کے بیس بائیس تانگہ بانوں کو آمادہ کیا کہ وہ اُن مصیبت زدگان کو جموں پہنچائیں اور ہم سے منہ مانگے دام لے لیں۔ انھوں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو میں نے اُن سے اِنسانی ہمدردی کے نام پر اپیل کی۔ آخر کار وہ آمادہ ہو گئے اور اُن مصیبت زدگان کو حفاظت کے ساتھ جموں پہنچایا۔ لیکن اُن کی نیکی اُن کے لیے وبالِ جان بن گئی جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو نگروٹہ کے قریب ایک سنگھی ٹولی نے ان پر گھات ماری۔ اُن کے تانگے چھین لیے اور اُن کی ساری پونجی ہتھیالی اور پھر اُنھیں نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ ایک تانگہ بان کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اُس نے یہ خبر اننت ناگ پہنچا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک کہرام مچ گیا۔ اننت ناگ میں کشمیری پنڈتوں کی خاصی آبادی تھی۔ دوسرے نواحی علاقوں سے کشمیری پنڈت سمٹ کر اننت ناگ میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں نگروٹہ کی واردات کا خمیازہ اُن کشمیری پنڈتوں کو نہ اُٹھانا پڑے۔ بیگ صاحب اور دوسرے کارکنوں نے بڑی محنت کی۔ لوگوں کو سمجھایا کہ انتقام کی بات ہے تو اُن لوگوں سے لیا جانا چاہیے جو اِس فعل کے مرتکب ہوئے نہ کہ اُن بے گناہوں سے جو ہمارے گھروں میں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ یہ بلا اس طرح ٹل گئی۔ لیکن جموں سے بہت تشویشناک اطلاعات آتی رہیں۔

کشمیر میں ایک گونہ اطمینان ملا تو میں نے جموں کا رُخ کیا۔ جموں جا کر ہم نے وہاں جو حالات دیکھے اُن سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ۳؍نومبر ۱۹۴۷ء کو سردار پٹیل نے ہندوستان کے ڈیفنس منسٹر سردار بلدیو سنگھ اور مہاراجا پٹیالہ کے ساتھ جموں کا دورہ کیا اور وہاں مہاراجا ہری سنگھ سے گفتگو کی۔ ۵؍نومبر کو شہر میں ڈھنڈورہ پٹوایا گیا کہ مسلمان اپنے آپ کو پولیس لائنز میں پیش کریں۔ تاکہ اُنھیں پاکستان بھیجا جا سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ اُنھیں کوئی چالیس ٹرکوں میں سوار کیا گیا اور ہر ٹرک میں ساٹھ افراد کے قریب سوار کیے گئے۔ اُنھیں سانبہ کے قریب ایک پہاڑی کے نزدیک اُتار گیا جہاں مشین گنیں نصب کی گئی تھیں۔ چند ایک جوان عورتوں کو الگ کر کے باقی تمام جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کو آن کی آن میں گولی سے اُڑا دیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق شیر خوار بچوں کو اُن کی ماؤں کی گود میں نیزوں کی انی سے ہلاک کیا گیا۔ اس گروپ میں چودھری غلام عباس کی صاحبزادی بھی تھیں جنھیں اغوا کر لیا گیا اور جنھیں میں نے بعد میں ذاتی کوششوں سے برآمد کر کے اُن کے نامور والد کے پاس پاکستان بھجوا دیا۔ میں نے جب یہ حالتِ زار دیکھی تو انسانوں کی درندگی پر میں تڑپ تڑپ اُٹھا۔ کشمیر میں قبائلیوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا تھا اُس کے گھاؤ میری روح میں تازہ تھے جموں کے ان کچوکوں سے میرے زخموں کے ٹانکے پھر سے کھل گئے۔ لیکن یہ رونے دھونے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف میں نے جموں میں صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کاروائی شروع کی اور دوسری طرف ۸؍نومبر کو پاکستان جانے کے خواہشمند مسلمانوں کو ایک کانوائے کے ذریعہ روانہ کیا۔ جس کو باقاعدہ فوجی گارڈ کے تحت بھیجا گیا تاکہ ۵؍اور ۶؍نومبر کے قتلِ عام کا پھر اعادہ نہ ہو۔

میری بیگم میرے ساتھ جموں آئی تھیں۔ وہ ان حالات سے بے حد متاثر ہوئیں۔ انھوں نے اُن بے کس اور مظلوم عورتوں کی امداد کے لیے کیمپ قائم کیے جو اغوا کرنے والوں کی کمین گاہوں سے نکالی گئی تھیں۔ وہ اب ناموس کے تقاضوں کے تحت پاکستان جانے پر مائل نہ تھیں۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے بہت سے مسلم نوجوانوں کے ساتھ اُن کی شادی کے انتظامات کئے اور اُن کا گھر بسانے میں دن رات دلچسپی لیتی رہیں۔

جموں کے عوام نے میرا پُرجوش استقبال کیا۔ میں نے ایک بڑے عوامی جلسے سے خطاب کیا اور اُنھیں کشمیر کے حالات سے رُوشناس کر دیا۔ جموں کے بعض حصّوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی تھیں اُن پر میں نے وہاں کی اکثریت کو آڑے ہاتھوں لیا اور عوام کو سمجھایا کہ یہ راستہ اُنھیں تباہی کی طرف لے جائے گا۔ میں نے ڈوگرہ راجپوتوں کو للکارتے ہوئے کہا کہ اُنھوں نے نائیوں اور دھوبیوں کے ساتھ اُن بے گناہ مسلمان عورتوں اور بچّوں کو بھی مار ڈالا ہے جو لیگ یا پاکستان کے الفاظ سے ناآشنا تھے۔ وہاں بعض ایسے غیر مسلم دوستوں کا بھی پتہ چلا جنھوں نے مسلمان عورتوں بچّوں اور مردوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔ میں نے اُن کی سراہنا کی اور اس غارت گری کے عالم میں مجھے اُمید کی صرف یہی کرن دکھائی دی۔ جموں کے نزدیک ڈگیانہ کیمپ میں بہت سے مسلمانوں کو ایک کھلے میدان میں رکھا گیا تھا۔ اُن کے پاؤں کے نیچے بس زمین کا فرش اور سر پر ننگے آسمان کی چھت تھی۔ اُن کی حالت بڑی ابتر تھی میں وہاں گیا۔ اُن کو ڈھارس دی اور اُنھیں جموں کے اسلامیہ اسکول میں (جواب ہری سنگھ ہائی اسکول کہلاتا ہے) منتقل کرا دیا۔ اسی طرح سے گرد و نواح سے جو اغوا کی ہوئی مسلمان لڑکیاں برآمد ہوئیں اُنھیں بھی اُستاد محلّے کے کیمپ میں رکھا۔ جہاں ایک انگریز خاتون ...... اُن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ میں نے سرکاری مہمان خانے

میں مہر چند مہاجن کو بھی ملاقات کے لیے بُلایا اور اُسے خوب جلی کٹی سنائی کہ وہ اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں کس حد تک ناکام رہا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ بزدلوں کی طرح سرینگر سے رفوچکر ہو کے اب مہاراجہ کی شرن میں چھپے ہوئے بیٹھا ہے۔ میں نے اُس کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ اُس کی نظروں کے سامنے جموں کے گورنر چیت رام چوپڑہ کے حکم سے جموں کے شہریوں کو لاریوں میں بٹھا کر سانبہ پہنچایا گیا اور وہاں اُنھیں گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ اسی طرح آر ایس ایس کی ٹولیوں میں سرکاری اسلحہ خانے سے ہتھیار کر تقسیم کیے گئے اور شہر و دیہات میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ اُن کی مال و جائداد کو لوٹ لیا گیا اور اُن کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ میں نے مہاجن صاحب سے کہا کہ اس طرح آپ نے وزیر اعظم کے منصب کو رسوا کر دیا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک طرف ہم کشمیر میں مسلم فرقہ پرستی کے خلاف محاذوں پر ڈٹ گئے ہیں اور اندرونی محاذ پر غیر مسلموں کی جانیں بچانے کے لیے جتن کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ ہمارا کام آسان کرنے کی بجائے کھلے بندوں مسلمانوں کے قتلِ عام کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ میں نے اُن کی توجہ اُن کے اُس بیان کی طرف بھی دِلائی جو اُنھوں نے مقامی ہندوؤں کے ایک وفد کے سامنے دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ جموں خطے میں مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا منصوبہ کامیابی سے پورا کر لیا گیا ہے۔ میں نے مہاجن صاحب کو چیتاونی دی کہ اگر قتل و غارت کا بازار بند نہیں کیا گیا تو میں اُن کو گرفتار کر کے جیل خانے میں ٹھونس دوں گا۔ مہاجن صاحب شرم کے مارے لال بھبوکا ہو گئے اور کچھ نہ کہہ سکے۔ شائد جو کچھ ہو رہا تھا، وہ مہارانی کی منشا اور اُس کی ہدایت کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی روحِ خبیث (EVIL GENIUS) بن گئی تھیں اور من مانیاں کر رہی تھیں۔ مہاجن صاحب میرے لہجے سے گھبرا گئے اور

انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ فضا کو ٹھیک کرنے میں میری مدد کریں گے۔ میں نے مہاراجا ہری سنگھ سے بھی ملاقات کی اور اُن کو حالات سے واقف کیا۔ جموں کے خطے میں مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی تھیں، اُن کی طرف انھیں متوجہ کیا اور اُن سے جو بُرے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ اُن سے اُنھیں خبردار کیا۔ مہاراجا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُن میں وہ پہلے کا سا پندار نہ رہا تھا۔ بلکہ سہمے سہمے سے لگ رہے تھے۔ انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز کیا۔ شائد اُن کا مجرم ضمیر انھیں کوس رہا تھا۔ عجیب صورت تھی۔ اپنے اقتدار کے عروج میں وہ حکومت کے گھمنڈ میں مجھ سے آنکھیں چار کرنے سے کتراتے تھے۔ اب وہ اپنی شکست خوردگی اور ناکردہ کاری کے احساس سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ وہ صرف ہوں ہاں کر کے رہ گئے۔ میں نے بخشی غلام محمد کو جموں میں ہی چھوڑا تاکہ وہ ہماری طرف سے وہاں حالات پر نظر رکھیں اور جموں کی بگڑی کو بنانے میں ہاتھ بٹا سکیں۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ میرا دہلی جانا ہوا۔ وہاں گرو نانک دیو جی مہاراج کے جنم دن کے سلسلے میں سکھ حضرات ایک تقریب کا اہتمام کر رہے تھے۔ میرے پاس چند سکھ دوست آئے اور انھوں نے مجھے اس تقریب میں تقریر کرنے کی دعوت دی۔ اُن دنوں صورت حال بڑی گھمبیر تھی۔ دہلی میں تقریباً سارے کے سارے وہ سکھ موجود تھے جو مغربی پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات دیکھ کر آئے تھے۔ اور جن کے دل میں انتقام کی جوالا آتش فشاں کی طرح مچل رہی تھی۔ لیکن میں نے دعوت منظور کر لی۔ یہ لوگ مہاتما گاندھی کے پاس بھی گئے اور اُن سے بھی جلسے میں آنے کی درخواست کی۔ مہاتما گاندھی اُن دنوں اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں ہندو اور سکھوں کو کھری کھری سنا رہے تھے۔ جن میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ وہ نفرت کے کھیل میں فریق بننے سے گریز کریں۔

ان سے خاص طور پر جذباتی قسم کے ہندو سکھ بڑے خفا تھے۔ اس لیے گاندھی جی کچھ دیر کے لیے تامل کرتے رہے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بھی جلسے میں آ رہا ہوں تو انھوں نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ خود بھی وہاں چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لوگوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی تقریر شروع کی تو پہلے کچھ آوازیں بلند ہوئیں لیکن جوں جوں میری تقریر آگے بڑھتی گئی مجمع خاموش ہوتا گیا۔ بعد میں تو سکھوں نے سٹیج سے مجھے اس بات کے لیے مبارک باد دی کہ جب سارا ہندوستان نفرت کی آگ میں جھلس رہا ہے تو میری قیادت میں کشمیر میں ہندو، مسلمان اور سکھ کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑ رہے ہیں۔ اس پر مجمع میں شیرِ کشمیر زندہ باد کے نعرے بھی لگے۔ گاندھی جی کی تقریر لوگوں نے انتہائی تعظیم کے ساتھ سنی اور اس جلسے سے راجدھانی کی فضا میں بڑا سدھار پیدا ہو گیا۔

گاندھی جی اپنی زندگی کے اُن آخری دنوں میں فرقہ پرستی کے جاگے ہوئے راکشس کو سُلانے کے لیے ایک مردِ مجاہد کی طرح جنگ کر رہے تھے وہ ایک نفری لشکر کی طرح اس آسیب پر حملہ آور ہو رہے تھے اور جسم و جان کی ساری عافیتوں کو بھول گئے تھے۔ میں اُسے کشمیر اور کشمیریوں کی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ جب اس مردِ باصفا کو اپنے اور پرائے مایوس کر رہے تھے۔ اُس وقت اُسے کشمیر اپنے آدرشوں کا سب سے بڑا اور آخری قلعہ نظر آ رہا تھا وہ اس قلعے سے چھن چھن کر آنے والی انسانیت اور شرافت کی کرنوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے۔ اُن کا بس چلتا تو وہ ان کرنوں کو اپنی چادر کے پلوؤں میں باندھ کر چاروں طرف بانٹ دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی عظیم شہادت سے پہلے وہ بار بار کشمیر اور اس کے عوام کی بہادرانہ جدوجہد کا ذکر کرتے رہے۔ اُن دنوں اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں انھوں نے کیا کہا اُس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"کشمیر کی سرزمین پر اس وقت اسلام اور ہندومت کا امتحان ہو رہا ہے اگر دونوں نے اپنا اپنا حصہ صحیح طور پر ادا کیا تو اس ڈرامے کے بڑے اداکاروں کو ابدی شان حاصل ہو جائے گی۔ کشمیر تو روشنی کا منبع بن چکا ہے اب میری یہی اُمید اور یہی دعا ہے کہ کشمیر اس گھُپ اندھیرے میں تمام برصغیر کے لیے بھی روشنی کا مینار ثابت ہو۔"

"اگر کشمیر میں لڑنے والی ہندوستانی فوج کشمیر کو بچاتے ہوئے اُسی طرح کام آجائے جس طرح سپارٹا کے رہنے والے تھرماپلے میں کٹ گئے تھے تو میں ایک آنسو بھی نہ بہاؤں گا۔ میں اس بات پر بھی غمزدہ نہ ہوں گا اگر شیخ عبداللہ اُن کے ہندو، مسلم اور سکھ رفیق اپنے فرض کو نبھاتے ہوئے جان قربان کر دیں۔ وہ باقی ہندوستان کے لیے ایک روشن مثال ہوگی۔ اس سے ہندوستانی عوام پر یہ حقیقت ازسرِنو آشکار ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں۔"

"کشمیر خوشبو کا ایک ایسا گہوارہ بن گیا ہے جس کی مہک سے ہندوستان ہی نہیں دنیا مہک رہی ہے۔"

"حکومت ہند نے کشمیر میں ہوائی جہازوں سے اپنی فوج اُتارتے وقت مہاراجا کو لکھا ہے کہ ریاست کا الحاق غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ساتھ مشروط ہے۔ اور اس رائے شماری میں حصہ لینے کا حق بلا امتیاز مذہب و ملت ریاستِ کشمیر کے ہر باشندے کو حاصل ہوگا۔"

"لیکن کشمیر میں تو شیخ عبداللہ ہے۔ وہ بڑی بہادری سے لڑ رہے ہیں۔ بہادری کی میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اہنسا کرتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی تو بہادری ہے۔ اور اس کی تعریف میں بھی کروں گا۔"

"شیخ عبداللہ وہاں کا سچا مہاراجا ہے۔ ہزاروں مسلمان اُن پر فدا ہیں۔ اُن کو شیرِ کشمیر کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، ایسا کہنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن وہ کیسا مسلمان ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب کو ساتھ لے کر بیٹھتا ہے۔"

"شیخ عبداللہ نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ کشمیر میں اُنھوں نے ہندو، مسلمان اور سکھ کو ایک ساتھ رکھا اور ایک ساتھ مرنا جینا سکھایا۔ یہ بڑی بات ہے۔"

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ ایک طرف میں کشمیر کی سرزمین پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر گاندھی اور اُن کے ہندوستان کے اصولوں کے لیے لڑائی لڑ رہا تھا اور عین اُسی وقت دہلی میں میرے خلاف غرض مندوں نے سازشوں کے بیج بونے شروع کر دیے تھے۔ گاندھی جی کے پاس بھی یہ لوگ میرے خلاف اناپ شناپ کہنے کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ایک مرتبہ گاندھی جی کو کھلم کھلا پرارتھنا سبھاؤں میں کہنا پڑا کہ "ایک طرف شیخ عبداللہ اتنے بڑے اور اتنے مشکل کام میں جٹا ہوا ہے دوسری طرف اُس کے خلاف کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ ایسا بالکل اچھا نہیں لگتا۔" گاندھی جی کے پرائیوٹ سیکریٹری پیارے لال نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اُن دنوں ہندوستانی کابینہ کے کچھ ارکان میری شخصیت اور ارادوں کے متعلق شکوک میں مبتلا تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے مہاراجا کے گدی سے دستبردار ہو جانے کا خیال پیش کیا تو یہ لوگ جھٹ اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے کہنے لگے کہ شیخ صاحب سے زیادہ مہاراجا پر اعتماد کیا جانا چاہیے۔ اس بات سے مرکزی کابینہ میں بھی کافی تناتنی رہی۔ لیکن گاندھی جی نے اُنھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ اصول کے معاملے پر سمجھوتہ کرنے سے کہیں زیادہ اصول کی خاطر خطرہ مول لینا بہتر ہے۔ گاندھی جی کے ان خیالات سے میرے مخالف بے حد جز بز ہو رہے تھے۔ سردار پٹیل

ہری سنگھ وغیرہ کا خیال تھا کہ میں مہاتما گاندھی کو جموں کے واقعات کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ یہ ادھوری حقیقت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ مجھ سے بولے کہ تقسیم کے بعد مہاراجا کی فوجوں نے جموں میں جو کچھ کیا ہے، کیا اُس کے متعلق اطلاعات صحیح ہیں؟ میں نے اُن سے کہا کہ بدقسمتی سے جو اطلاعات آپ تک پہنچی ہیں وہ ٹھیک ہی ہیں۔ اس پر سکون کے اس سمندر میں جیسے جوار بھاٹا سا آگیا۔ گاندھی جی نے اپنی آواز اونچی کی اور بولنے لگے کہ پھر کیسے آپ مہاراجا کے اختیارات کو کم کرنے کے بارے میں چپ سادھے ہوئے ہیں۔ آپ ایسا کریں گے تو اپنی جنتا سے وشواس گھات کریں گے۔“

مہاتما کشمیر کو علاقے سے زیادہ اصول کا معاملہ مانتے تھے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ ”ہندوستان کو کشمیر میں کچھ اصولوں کے لیے شمع روشن رکھنی ہے اور اگر اصولوں کے بارے میں ہند کو سمجھوتہ کرنا پڑے تو کشمیر ہی کیا ساری ریاستوں کو تلانجلی دی جانی چاہیے۔“ وہ اقلیتوں کے ساتھ مکمل انصاف اور ظلم کرنے والوں کو اُن کے جرائم کے مطابق کیفرِ کردار تک پہنچانے کے حق میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہندوستان رقبے میں چھوٹا ہو لیکن اُس کی روح پاکیزہ ہو تو یہ انصاف اور عدم تشدد کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ یہاں کے بہادر لوگ ظلم و ستم سے بھری دنیا کی اخلاقی قیادت کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف فوجی طاقت کے استعمال سے توسیع شدہ ہندوستان مغرب کی عسکری ریاستوں کا تیسرے درجے کا چربہ ہو گا جو اخلاق اور آتما سے محروم رہے گا۔ وہ کشمیر کو اس لحاظ سے بھی بہت اہم مانتے تھے کیونکہ یہ ہندوستان میں مسلم اکثریت رکھنے والی واحد ریاست تھی۔ اُن کے کہنے کے مطابق ہندوستان کے سیکولرازم کی صداقت کا اصل معیار کشمیر ہو گا۔ اور اگر ہندوستان کشمیر کے عوام کو راضی نہ رکھ سکا تو ساری دنیا میں اُس کی شبیہ مسخ ہو کر رہ

جائے گی۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان کی دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم کے بعد کشمیر میں ہو رہے تجربے پر اُن کی نگاہیں مرکوز ہیں۔ کشمیر ہندوستان کے مستقبل کا عنوان بھی ہو گا اور امتحان بھی۔“

گاندھی جی کشمیر کے معاملے کو نہایت نازک سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اِس کی مثال ایسی ہے جیسے خشک گھاس کے انبار میں ایک دہکتے ہوئے انگارے کی۔ ذرا بھی ناموافق ہوا چلی تو سارے کا سارا برصغیر اس کی آگ کے شعلوں میں لپٹ جائے گا۔ اسی لیے وہ مہاراجا کے جرائم کا زبردست احساس رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ کشمیر کے لوگوں کو کسی فوج پر تکیہ کرنے کی بجائے عدم تشدد پر یقین رکھنے والے ایک لشکر میں منظم کر کے اپنے آپ کو اپنی سرزمین کی عزت کے لیے قربان کرنا چاہیے۔ تا کہ اُن کے دل میں نہ خوف رہے اور نہ غصہ۔ اِس طرح سے کشمیر ایک ایسی مقدس سرزمین میں تبدیل ہو گا جس کی مہک سے ساری دنیا معطر ہو گی اور جس کی بہادری انسانیت کا ایک نیا باب رقم کرے گی۔“

گاندھی جی کی موجودگی اور دوسری مجبوریوں کا خیال کر کے اُس وقت تو نئی دہلی کے ایوانوں میں میرے یہ مخالف خاموش رہے لیکن ۱۹۵۳ء کے لیے اُسی دن سے گھات لگا رہی اور ظاہر ہے کہ اس گروہ کی سربراہی حکومت ہند کے ممتاز وزیر داخلہ اور ہندوستان کے مردِ آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل بنفسِ نفیس کر رہے تھے۔ مجھے اِس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ سابرمتی کا یہ سنت زندہ رہتا تو نہ ۱۹۵۳ء کا زلزلہ عمل میں آسکتا اور نہ کشمیریوں کو اس نرغے کے خوفناک عواقب کا نشانہ بنایا جا سکتا۔ اُس وقت کے گھٹاٹوپ اندھیارے میں مہاتما گاندھی اپنے کردار اور گفتار سے علامہ اقبال کے اس شعر کی مجسم تصویر لگتے تھے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

▲▲▲

۳۹

لرزشیں اور لغزشیں

قبائلیوں نے کشمیر میں جو حرکتیں کیں۔ اُن کی وجہ سے یہاں پاکستان کے خلاف بڑی بدظنی پھیل گئی تھی۔ اِس حد تک کہ پاکستان کے حق میں کُھلے بندوں بولنا جان جوکھوں کا کام بن گیا تھا۔ اُن دنوں بارہمولہ کے ڈپٹی کمشنر چودھری فیض اللہ خان تھے۔ جو کشمیر کے ایک سابق مشیر مال چودھری خوشی محمد ناظر کے بیٹے تھے۔ جب قبائلیوں نے بارہمولہ پر قبضہ جما لیا تو انھوں نے اپنی جانب سے چودھری صاحب کو ہی بارہمولہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا اور وہ پاکستان کی طرف سے کام چلانے لگے۔ لیکن جب بارہمولہ پھر ہمارے ہاتھوں میں آیا نیشنل کانفرنس کے رضاکار چودھری صاحب کو گرفتار کر کے لائے اور سرینگر کے لال چوک میں انھیں عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔ عوام نے اُن کی کافی تذلیل کی اور بعد میں انھیں حفاظتی اِقدام کے طور جیل بھجوا دینا پڑا۔ ایسا ہی ماجرا خواجہ سلام شاہ نقشبندی کے لڑکے حسام الدین کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ہندوارہ میں وہاں کے مسلمانوں نے اپنے ایک ہم مذہب تحصیلدار کو اِس الزام میں کہ اس نے قبائلیوں کے ساتھ اشتراک کیا تھا۔ اپنی اجتماعی عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا اور آگے اس لیے

موت کی سزا سُنائی کہ اُس نے وہاں کی اقلیت پر ظلم ڈھائے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ پاکستانی حملے کے خلاف عوام کے دِلوں میں نفرت کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کہنا خلافِ واقعہ ہو گا کہ کشمیر میں پاکستان کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ کو حملے سے پہلے ہی پاکستانی اپنے ملک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اُن کو لینے کے لیے پاکستان کے کچھ معتمد سرینگر آ گئے تھے۔ وہ سرینگر کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور رات کے اندھیرے میں میرواعظ صاحب کو وہیں بُلوا لیا۔ انھوں نے میرواعظ کو یہ اِطلاع دی کہ پاکستان کشمیر پر چڑھائی کرنے ہی والا ہے اور پاکستان کے اربابِ اقتدار کی خواہش ہے کہ میرواعظ اِس حملے کی رہنمائی کریں۔ اور پھر پاکستان کی طرف سے یہاں کے حاکمِ اعلیٰ مقرر ہوں۔ مولانا موصوف کوئی سیانے سیاست دان تو تھے نہیں۔ بلکہ بہت بھولے بھالے تھے۔ جاہ پسندی اُن کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ اس جھانسے میں آ گئے۔ اور علی الصبح اِن ایلچیوں کی ہمراہی میں پاکستان روانہ ہو گئے۔ لیکن بعد میں حملے نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ پاکستانیوں کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور مولوی صاحب پاکستان میں ہی اٹک گئے۔ اُن کی جماعت کا دائرہ سرینگر کے چند محلوں تک محدود تھا۔ اور اُن کے پیروؤں کی تعداد بیس بائیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ یہ لوگ اپنے میرواعظ کے بغیر بے سہارا رہ گئے۔ قبائلیوں کی کرتوت کے باعث اور عوام کے جذبۂ نفرت کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنا غم و غصہ پی لینا پڑا اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔ میرواعظ صاحب کی بیگم صاحبہ اور اُن کے دوسرے افرادِ کنبہ یہیں پر رہ گئے تھے۔ جب ہم نے اِنتظام و اِنصرام سنبھالا تو اُن کی بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے انھیں حفاظت کے ساتھ سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان بھجوا دیا اور اُن کے ساتھ کچھ نامزد افراد بھی پاکستان چلے گئے۔

سرکار سے وابستہ کچھ مسلمان سرکاری ملازم پاکستان کے حق میں عوام کو اُبھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں بادلِ ناخواستہ انھیں اُن حرکات سے باز رکھنے کے لیے جیل میں ڈال دینا پڑا۔ کمال یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے مسلمان آفیسروں کو میں نے جموں جاکر وہاں کے مسلمانوں کو نفسیاتی سہارا دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت پاکستان کے گُن گانے والے یہ آفیسر اپنی جان کے خوف سے حیلے بہانے تراشنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ کرنل عدالت خان کے سوا اس سلسلے میں کسی نے سامنے آنے کی جرأت نہیں دکھائی۔ کچھ دوستوں نے پاکستان جانے کی راہداری طلب کی۔ چنانچہ ہم نے انھیں سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان جانے کی اجازت دیدی۔ جو دوست جیل میں پڑے ہوئے تھے، ان میں چودھری غلام عباس خاں، مولوی عبدالرحیم، اُن کے بھائی نذیر احمد، جناح صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری خورشید حسن قابلِ ذکر ہیں۔ میں جیل میں اُن سے ملنے کے لیے گیا اور انھیں یہ مشورہ دیا کہ جب تک رائے شماری کا وقت نہیں آتا وہ خاموشی اختیار کر لیں۔ مناسب وقت پر جس طرف بھی رائے دینا چاہیں آزادی سے دے سکتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم ایک ملک کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں اور میدانِ جنگ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں کوئی بھی حکومت اُس ملک کے حق میں کھلم کھلا رائے عامہ منظم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ہم کسی کے ضمیر کو خریدنا تو نہیں چاہتے۔ لیکن ملک میں امن و سلامتی کی فضا دوبارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لیے اگر وہ شرائط کے تحت یہاں رہنا چاہیں تو انھیں خوشی سے اس کی اجازت ہوگی اور ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب دوست پاکستان جانے کے بڑے آرزومند تھے جو اُن کے خوابوں کا دیس بن گیا تھا۔ چنانچہ اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم

نے انھیں سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان روانہ کر دیا۔

چودھری غلام عباس صاحب "کشمیر چھوڑ دو" میں اپنی گرفتاری کے وقت سے ہی جموں جیل میں پڑے ہوئے تھے۔ میں اور میری بیگم دونوں اُن سے ملنے کے لیے جیل میں گئے۔ وہاں ایک بڑا جذباتی منظر تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ کافی شفقت اور محبت سے ملے۔ میں نے انھیں تمام کوائف سے آگاہ کیا اور درپیش بحران کو دور کرنے کے لیے اُن کی رائے طلب کی۔ ہم لمبی گفتگو کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے کہ ریاست میں رائے شماری ممکن العمل نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے مزید خون خرابہ ہونے کا امکان ہے۔ البتہ اگر ریاست کو دونوں ممالک، ہند اور پاکستان آزاد رکھنے کی ضمانت دیں تو شاید اِس سے معاملہ سلجھ سکتا ہے۔ میں نے چودھری صاحب کو جموں میں ہی قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُن کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے۔ بہر حال میں نے انھیں صلاح دی کہ وہ پاکستان جاکر جناح صاحب کو وہ راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں جس پر ہمارا اتفاقِ رائے ہو گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ چودھری صاحب نے اِس تجویز کو جناح صاحب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ لیکن جناح صاحب نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ بلکہ اُلٹے چودھری صاحب کے خلاف اُن کے رقیبوں اور حریفوں کو طرح طرح کے افسانے تراشنے کا موقع ہاتھ آگیا۔

جموں میں جو بچے کھچے مسلمان رہ گئے تھے وہ سب سیالکوٹ جانا چاہتے تھے۔ ہم نے انھیں باز رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ اور انھیں پھر سے آباد ہونے اور کاروبار کرنے کے لیے ہر ممکن امداد پیش کی۔ لیکن اُن کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس سے وہ اس قدر سہم گئے تھے کہ انھیں ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انھیں بس سیالکوٹ پہنچنے میں ہی اپنی نجات نظر آتی تھی۔ شاید اُن کے دل میں یہ بات بھی تھی کہ وہاں اُن کی آبادکاری کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوں گے۔ بہر حال ہم نے اُن کی شدید خواہش کا احترام

کیا اور لاریوں میں بٹھا کر انھیں سوچیت گڑھ سے پار پہنچا دیا۔ جموں میں مسلمانوں کے چند ہی گھر ایسے بچ گئے جو اپنی جگہ سے نہیں اُکھڑے۔

تحریکِ حریتِ کشمیر میں مولوی عبداللہ وکیل اور اُن کے خاندان نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ خود مولوی عبداللہ احمدیوں کے لاہوری مکتب کے پیرو تھے۔ اور ۱۹۳۱ء سے پہلے ہی اُنھوں نے اپنے مکان واقع کاچگری مسجد میں درس دینا شروع کیا تھا۔ وہ روزانہ درس کی محفل آراستہ کرتے اور اس میں سننے والوں، خاص طور نوجوانوں کے لیے فکر و عمل کا کافی مواد ہوا کرتا تھا۔ اس تربیت گاہ سے نکلنے والے نوجوانوں نے بعد میں تحریک کے ہراول دستے کے طور پر کام کیا۔ چنانچہ کشمیر کی سب سے پہلی گرفتاری محمد اسماعیل کی تھی، جو مولوی صاحب کا درس سنتا رہتا تھا۔ محمد اسماعیل، مولوی عبداللہ کی طرح علاقہ شوپیان کا رہنے والا تھا۔ اور درزی کا کام کرتا تھا۔

مولوی عبداللہ میں علم کا جوہر تو تھا۔ لیکن جو تحریک میں نے شروع کی تھی اس میں عزم و استقامت کی ضرورت تھی۔ اُن میں یہ شے موجود نہ تھی۔ اس لیے بادِ مخالف کے ہلکے سے جھونکے سے اُن کا رُخ بدلتا رہتا تھا۔ مگر مجھے تو تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ہر خوبی رکھنے والے انسان کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں اُن کے اوصاف کو اُجاگر کرتا اور اُن کی کمزوریوں کو امکان کی حد تک برداشت کرتا رہتا تھا۔ اور اُن کے وجود سے تحریک کو جس قدر بھی فائدہ مل سکتا تھا وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اُن کے بیٹے مولوی عبدالرحیم میرے اولین ساتھیوں میں سے تھے اور مولوی عبداللہ اُنھیں تحریک کے ایک صفِ اول کے قائد کی حیثیت سے آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ مولوی عبدالرحیم شریف تھے اور درد مند بھی۔ پرجا سبھا میں کاہچرائی کے بل پر ہمارے اسمبلی ممبران نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ سر برجور لال اسمبلی کے صدر تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہم ایسا قدم اُٹھائیں۔ لیکن ہم قائل نہ ہو سکے۔ بالآخر اُنھوں نے مولوی عبداللہ کو،

جو ہماری پارلیمانی پارٹی کے ممبر تھے، اپنے شیشے میں اُتار لیا اور اُنھوں نے ہمارا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اُن کے خلاف تنظیم کی ضبط شکنی کے سلسلے میں کارروائی کرنا پڑی۔ اُدھر اُن کی تحریک سے عدمِ وفاداری کے بدلے میں اُن کے فرزند عبدالرحیم کو منصفی مل گئی۔ انھیں منصفی کی ملازمت مل گئی تو اُن کے پاؤں ڈولنے لگے۔ وہ مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آئے اور ہم شالیمار باغ چلے گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ اُن کا ذاتی فیصلہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ منصفی میں انھیں فکرِ معاش سے تو خلاصی مل جائے گی لیکن وہ تحریک میں حصہ لینے کی سرمستی اور سعادت سے محروم رہیں گے۔ عبدالرحیم نے رونی صورت بنا کر کہا کہ اُن کا گذارا چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ سوچتے ہیں کہ منصف بن کر وہ کچھ بچاتے رہیں گے اور وقتاً فوقتاً میری مالی امداد کرتے رہیں گے۔ تاکہ میں تحریک کا کام اطمینان سے چلانے کے قابل رہوں اور احتیاج کا شکار نہ ہو جاؤں۔ مجھے تو اس وعدہ پر اعتبار نہیں آیا۔ لیکن میں نے کہا کہ آپ کے وعدے کی صداقت وقت ہی ثابت کرے گا۔ لیکن بنیادی طور پر آپ کو اس مسئلے کا خود فیصلہ کرنا ہے کہ آپ قوم کو منجدھار میں چھوڑ کر سرکاری کرسی پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں یا نہیں۔ میری اجازت دینے یا نہ دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال انھیں منصفی مل گئی اور اس طرح تحریک کا ایک ابتدائی ساتھی مجھ سے جدا ہو گیا۔ وہ میری مدد کے وعدے کو بھی بھول گئے۔ لیکن ایک دن میں اُن کے گھر پر چلا گیا۔ مجھے سخت تنگ دستی کا سامنا تھا اور میرے گھر میں فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی۔ میں نے انھیں شالیمار والی بات یاد دلاتے ہوئے کچھ رقم قرضے کے طور پر مانگی۔ مولوی صاحب کا جواب سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔ اُنھوں نے ایک بڑا کھاتہ کھولتے ہوئے اپنی رام کہانی سنانا شروع کی کہ بچوں کی پڑھائی پر کتنا خرچ آتا ہے اور گھر کے دوسرے اخراجات کتنے ہیں۔ غرض اُنھوں نے بڑی چالاکی

سے خسارے کا بجٹ میرے سامنے پیش کیا۔ وہ بھی اس لب و لہجہ میں کہ میری جیب میں کوئی رقم ہوتی تو میں ان کے ہی حضور کر دیتا۔ جواب تو غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن جس طریقے سے انھوں نے میرا تقاضا ٹال دیا اس پر مجھے ضرور مایوسی ہوئی اور پھر میں نے انتہائی سخت ایام میں بھی انہیں آزمانے کی زحمت نہیں دی۔ عبدالرحیم کے بھائی بشیر احمد تحصیلداری کی قیمت پر بِک گئے۔ اُن کے ایک اور بھائی محمد ایوب صابر نے اخبار "البرق" نکالا اور اس کے ذریعے سے طرح طرح کے جتن کر کے اپنی معاش کی سبیل کرتے رہے۔ لیکن جب احمدیوں کو نیشنل کانفرنس سے الگ کر دیا گیا تو اُن سب نے تحریک کے تئیں مخالفانہ اور معاندانہ روش اختیار کی۔ نیشنل کانفرنس سے احمدیوں کے اخراج کی تفصیل و تاریخ پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم نے محسوس کیا کہ قادیانیوں نے ہمارے قومی مقاصد کے بدلے اپنے مذہبی مقاصد کی ترویج کے لیے ہمارا پلیٹ فارم استعمال کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں اُن سے بادلِ ناخواستہ الگ ہو جانا پڑا۔ حالانکہ یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے کہ تحریک کے ابتدائی برسوں میں انھوں نے ہماری بڑی مخلصانہ امداد کی۔

مولوی عبداللہ سے میری آخری ملاقات شیر گڑھی میں ہوئی۔ جہاں ۱۹۳۸ء میں ریاستی حکومت کا سیکریٹریٹ واقع تھا۔ اُن کے صاحب زادے مولوی بشیر کو بخشی غلام محمد کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ حکومت کے خلاف محاذ آرائی کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب پدرانہ شفقت سے مجبور ہو کر اُنھیں رہا کرنے کی سفارش لے کر میرے پاس آئے۔ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو نہایت غصے کے عالم میں تھے اور اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کسی کی کیا سنتے! ہمارے متعلق بہت تیز کلامی کرتے رہے۔ اُنھوں نے ہمیں بد دعائیں بھی دیں۔

لیکن زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اپنے سن اور شعور کو نظر انداز کر کے گالی گلوچ پر بھی اُتر آئے۔ میں نے اُنھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ سرکاری دفتر ہے۔ ملازم چاروں طرف گھوم پھر رہے ہیں۔ اُن کو ایک بزرگ ہونے کے ناطے اِس قسم کا وطیرہ اختیار نہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے فرزند کی رہائی چاہتے ہیں تو اُنھیں اپنے صاحب زادے کو نصیحت کرنی چاہیے کہ وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے اور حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانے کی روش ترک کر دے۔ لیکن مولوی صاحب ایسے غیظ و غضب میں تھے کہ اُن پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ اور بھی زیادہ مشتعل ہونے لگے۔ جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو میں نے مجبور ہو کر اپنے چپراسی سے کہا کہ وہ اُنھیں کمرے سے باہر لے جائے۔ اِس واقعہ کے کچھ عرصے بعد ہی وہ دنیائے فانی سے چل بسے اور برزلہ میں اپنے فرزند عبدالرحیم صاحب کے بنگلے کے باہر اُن کی قبر بنا دی گئی۔ کیونکہ وہ بہائی مذہب کے عقیدت مند کی حیثیت سے انتقال کر گئے تھے اور شاید کشمیر میں دفن ہونے والے پہلے بہائی تھے۔ ▲▲▲

(۴۰)

میدانِ جنگ کی گھن گرج

جموں، ریاسی اور اودھمپور میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کی ٹولیوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ جو مسلمان مرد، عورتیں یا بچے کسی نہ کسی طرح بچ نکلے تھے ان کو کیمپوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں اپنی بیگم کے ساتھ ان کیمپوں میں گیا اور ان سب کو جموں لے آیا۔ کچھ دیر بعد انھیں ان کی خواہش کے مطابق یا تو پاکستان بھیج دیا گیا یا انھیں رشتہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔

جب ہم قبائلیوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے تو پنڈت جواہر لال سرینگر کے دَورے پر آئے۔ ان کے اعزاز میں لال چوک میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا جہاں انھوں نے میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اعلان کیا کہ "یہ ہندوستان اور کشمیر کا ملاپ ہے"۔ انھوں نے ہندوستان کی طرف سے یقین دہانی کی کہ کشمیریوں کے حقِ خود اختیاری کو پورا کیا جائے گا اور ان کے باقی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ملاپ اصولوں اور قدروں کا ملاپ ہے۔ جب تک ہندوستان اصولوں اور قدروں پر قائم رہے گا، ہمارے رشتے پر امیر خسروؒ کا یہ شعر صادق

آتا رہے گا۔

من تو شُدم تو من شُدی من تن شُدم تو جاں شُدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

میں جواہر لال کے ساتھ بارہمولہ بھی گیا۔ جگہ جگہ لڑائی میں کام آنے والے قبائلیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جواہر لال نے وہاں بھی عوام سے عیدگاہ میں خطاب کیا۔ اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ابھی دونوں سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی کشمیر تشریف لائے۔ اس وقت قبائلی سرینگر پر برابر دباؤ ڈال رہے تھے۔ چنانچہ سردار شہر میں داخل نہیں ہوئے۔ ہوائی اڈے کے نواح میں ہی ایک مکان واقع تھا۔ سردار وہیں رکے اور وہاں ہمارے مسائل اور ضروریات پر تبادلۂ خیال کیا۔ یہ اُن کا پہلا اور آخری دورۂ کشمیر تھا۔ وہ اسی دن واپس دہلی چلے گئے اور اُن کے دورے کے نتیجے میں فوجی کمک پہنچنے میں یقینی طور پر تیزی آگئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری فوجیں دشمن کو پیچھے دھکیلتی چلی گئیں۔ ہماری کامیابی کی وجہ فضا پر ہمارے ہوائی بیڑے کا مکمل کنٹرول تھا۔ پاکستان اپنا ہوائی بیڑہ مقابلے میں لانے کے لئے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ لیکن برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو تنبیہ کر دی تھی کہ اگر پاکستان کے ہوائی جہاز ہندوستانی فوجی جہازوں کے مقابلے میں آگئے تو وہ پاکستانی فوج سے اپنے افسروں کو واپس بلالیں گے۔ پاکستان کے پاس اپنے ہوا باز تو تھے نہیں لہٰذا وہ سہم گئے اور بے بسی سے اپنی شکست کا تماشا دیکھنے لگے۔ گلگت کے علاقے پر انگریز پہلے ہی حریصانہ نظریں ڈال رہے تھے اور وہ اس علاقے کو اپنی براہِ راست نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ روس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جا سکے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے ۱۹۳۵ء میں مہاراجا کشمیر سے گلگت کا علاقہ

نافے سال کے بچے (۱۹۴۸ء) پر حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے وہاں گلگت سکاؤٹس کی ایک نیم عسکری تنظیم کھڑی کر لی تھی۔ جو علاقے کے امن و قانون کی نگہداشت کرتی تھی۔ اس عسکری تنظیم کا کمانڈر بھی ایک انگریز ہی تھا۔ لیکن آزادی کے بعد انگریزوں کو یہ علاقہ مہاراجا کو واپس کرنا پڑا۔ مہاراجا نے وہاں کا انتظام اپنے ایک قریبی فوجی آفیسر گھنسارا سنگھ کو وہاں کا گورنر بنا کر سونپ دیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد گلگت سکاؤٹس نے بغاوت کر دی۔ چترال، ہونزہ، نگر، حویلی، پونیال، یاسین، اشکومان اور کوہِ خضر وغیرہ کے راجاؤں نے جو مہاراجا کے باجگذار تھے اُن کا ساتھ دیا اور علاقے کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ مزاحمت کرتے رہے۔ لیکن جب اُن کی فوج ہار گئی تو اُن کو گرفتار کر کے پاکستان روانہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد جموں و کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کیا گیا تو ہم قیدیوں کے تبادلے میں انھیں پاکستان سے چھڑا لائے۔ گلگت کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے حملہ آور اسکردو، کرگل اور بجو بھی تک پہنچ گئے۔ وہ درہ زوجیلا اور گُریز وادی پر بھی چھا گئے تھے۔ لیکن لداخ پر ابھی قبضہ کرنا باقی تھا۔ ہندوستانی فوج نے جنرل تھمایا کی کمان میں اس علاقے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ تاریخ میں پہلی بار بکتر بند گاڑیاں اور ہلکے ٹینک ساڑھے گیارہ ہزار فٹ اونچے دشوار گذار زوجیلا درے سے پار کرائے گئے۔ سڑک نہایت خراب تھی اور برف سے ڈھکی ہوئی۔ لیکن فوج نے بڑی جوانمردی سے بھاری اسلحہ زوجیلا سے آگے پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ان ہتھیاروں کے میدانِ جنگ میں پہنچ جانے سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ قبائلی خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتے تھے کہ یہ بھاری مشینیں وہاں تک پہنچ جائیں گی۔ اُن کے پاس اس قسم کے جدید سامانِ حرب کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے وہ دُم دبا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اور ہندوستانی فوج کرگل میں داخل ہو گئی۔ خواجہ غلام محمد ٹھٹ

کو اس علاقے کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ اُن کی قیادت میں فوج نے ایک جلوس کی صورت میں کرگل کے بازاروں کا گشت لگایا۔ اور امن و امان بحال کیا۔

جموں کی جانب سے زیادہ دباؤ پونچھ اور جھنگڑ میں پڑا۔ یہاں بھی ہندوستانی فوج نے قبائلیوں کو پسپا کر دیا۔ جھنگڑ نوشہرہ تک کا علاقہ قبائلیوں سے صاف کر دیا گیا۔ اب مقابلے میں قبائلی نہ رہے تھے۔ بلکہ باضابطہ پاکستانی فوج لڑ رہی تھی۔ اگرچہ بین الاقوامی مصلحتوں کی بنا پر پاکستانی حکومت اس کے وجود سے برابر انکار کر رہی تھی۔ جھنگڑ کے محاذ پر ہمیں اس وقت ایک بڑا صدمہ اُٹھانا پڑا جب بریگیڈیئر عثمان دُشمن کے توپ کے گولے سے جاں بحق ہو گئے جب وہ اپنی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُن کی لاش جیسی حالت میں بھی باقی رہی تھی جامعۂ ملیہ دلی میں ممتاز مسلمانوں کی صف میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کی گئی۔ بریگیڈیئر عثمان ایک لائق فوجی آفیسر تھے اور انھوں نے اپنی جنگی مہارت سے دُشمن کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ ویسے تو میرے سارے فوجی آفیسروں کے ساتھ بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ لیکن بریگیڈیئر عثمان کو میں بڑے بڑے قریب سے جانتا اور اُن کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شریف اور ملنسار انسان تھے۔ ان کا مستقبل بڑا شاندار نظر آ رہا تھا۔ لیکن تقدیر کے آگے کس کی پیش جاتی ہے۔ ان کی موت کا یہ پہلو بہر حال تابناک تھا کہ کشمیر کے محاذ پر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہندو اور مسلمان کی نہیں بلکہ رواداری اور تنگ نظری کی جنگ تھی۔ پونچھ شہر کو قبائلیوں نے چاروں طرف گھیر لیا تھا۔ اور گرد کی پہاڑی چوٹیوں سے اُن کی توپوں کے گولے برابر شہر کے اندر گرتے رہتے تھے۔ بیشتر مسلمانوں نے پاکستان کے علاقے کی طرف پناہ لے رکھی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کا گھبراہٹ سے برا حال تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح جموں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن راستہ خطرناک تھا۔ اردگرد کے علاقوں میں لڑائی ہو رہی

تھی۔ اس لئے جموں پہنچنا کارے دارد والا معاملہ بن گیا تھا۔ میں اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے فوجی ہوائی جہاز میں پونچھ جا پہنچا۔ ہوائی اڈے کے متصل ہی ایک مقام پر لوگ جمع ہوگئے۔ اُنھوں نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اپنے جواب میں میں نے انھیں دلاسا دیا۔ اس کے بعد میں نے جہازوں کے ذریعے اُن کو جموں پہنچانے کا حسب استعداد انتظام کرایا۔

پاکستان نے اُن دنوں میرے سر کی ایک بڑی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اِس لئے فوج کو میری حفاظت کے سلسلے میں کافی تشویش رہتی تھی۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ مجھے اکثر محاذوں پر جانا ہی پڑتا تھا۔ فوجی جوانوں کو حوصلہ دینے کے لئے، شہری آبادی کی تکلیفات دور کرنے کے لئے، پناہ گزینوں کے کھانے پینے اور دیگر سہولیات کا جائزہ لینے کے لئے۔ یہ سب ایسے امور تھے کہ جن کو نبھائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بہرحال ہماری فوجی سرگرمیوں کی لہر اونچی جا رہی تھی اور دشمن کی صفوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ اور وہ ریاست کے بڑے حصے سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ قریب تھا کہ ریاست ان کے قدموں سے بالکل نکل جاتی کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو اچانک جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ اس میں نہ فوج سے صلاح لی گئی تھی اور نہ ہم سے مشورہ۔ اس پر طرہ یہ کہ جب جنگ بندی کی لکیر کھینچنے کی نوبت آئی تو ہماری فوج کو بعض ایسے علاقوں کو خالی کرنا پڑا جن پر انھوں نے بڑی مشکل سے غلبہ حاصل کیا تھا۔ ایسے علاقوں میں کوٹلی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن جموں میں مہاراجا اور اُس کے حواری موالی اب بھی فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں کو ہوا دے رہے تھے۔ جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما گاندھی کو شہید کر دیا گیا تو مہاراجا نے آر۔ ایس۔ ایس کی کھلم کھلا طرفداری کر کے نیشنل کانفرنس کی طرف سے نکالے جانے والے ماتمی جلوس کو تتر بتر کروایا۔ اِس کے برعکس جموں کے بازاروں میں آر۔ ایس۔ ایس کی طرف سے مہاتما

کے قتل کی خوشی میں مٹھائیاں اور لڈو بانٹے گئے۔ اور عینی مُشاہدین کے مطابق ایسے بہت سے تھال راج محل سے آئے تھے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے صدر مقام ناگپور کے علاوہ جموں سارے مُلک میں ایسا دوسرا شہر تھا جہاں اِس قسم کی کمینہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوا۔ جب گاندھی جی کی شہادت کے بعد ساورکر کو گرفتار کر لیا گیا تو اُس دن جموں میں احتجاج کے طور پر ہڑتال کرائی گئی اور محکمہ جاسوسی کی اطلاع کے مطابق اس ہڑتال کے پیچھے مہاراجا کا ہاتھ بھی کام کر رہا تھا۔ ؎

کسی بت کدے میں بیان کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری ▲▲▲

۴۱

پہلی عوامی کابینہ

سیاسی محاذ پر ہم شہری انتظامیہ کو بحال کرنے اور مضبوط بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ قبائلی حملے کے وقت انتظامیہ کے بڑے بڑے افسر جو صوبہ جموں سے تعلق رکھتے تھے کام چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔ ہم انھیں واپس لے آئے۔ نیشنل کانفرنس سے موزوں آدمیوں کو چن کر انھیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ جماعت کے سبھی لوگ پناہ گزینوں کے لئے آرام و آسائش اور دوسرے انتظامات میں دن رات ایک کر رہے تھے۔ جموں و کشمیر ملیشیا اور کلچرل کانفرنس کے شعبۂ ڈراما کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا بھی ایک اہم کام تھا۔ اور دونوں اداروں نے کچھ خدمات انجام دیں۔ لیکن حکومت میں دوعملی کی وجہ سے قدم قدم پر دقتوں کا احساس ہو رہا تھا۔ بطور ناظم اعلیٰ کے میرا مہر چند مہاجن کے ساتھ جو وزیر اعظم تھے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ ہم ریاست کے کونے کونے میں حالات کا مقابلہ اپنی مقدور کے مطابق کر رہے تھے اور مہاجن صاحب مہاراجا کے محل میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ بالآخر میں نے مرکزی سرکار کو بتایا کہ یہ دوعملی نہیں چلے گی۔ مہاجن صاحب کے ہاتھ خون سے کچھ کم نہیں رنگے تھے۔ میں نے قبائلی حملے کے بعد کشمیر میں ایک والنٹیر کور قائم کیا اور انھیں آتشگیر اسلحہ کے استعمال میں تربیت دینے کی ٹھان لی۔ جواہر لال نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور سری نگر میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر کے ہاتھ کچھ ۳۰۳ رائفلیں اس کور کے لئے بھیج دیں۔ مہاجن کو پتہ چلا تو اس نے انھیں رُکوا دیا۔ بلکہ یہ اطلاع بھی ملی کہ اس نے یہ رائفلیں راشٹریہ سنگھ کے حامیوں کو فراہم کر دیں چنانچہ میں نے جواہر لال کی توجہ بھی اس طرف دلائی جنھوں نے مہاراجا اور مہاجن دونوں کو ڈانٹ پلائی۔

جموں کے اس قتل عام کی بھنک مہاتما گاندھی کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی چنانچہ اُنھوں نے اپنی روایتی بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا،

"مہاراجا کو جموں میں بے شمار مسلمانوں کے قتل اور مسلمان عورتوں کے اغوا کے اطلاعات ملی تھیں۔ اُسے اس کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئیے۔ ڈوگرہ فوج اُس کے براہ راست کنٹرول میں تھی۔ لہٰذا اُسکو ان وارداتوں کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جانا چاہئیے۔ شیخ محمد عبداللہ جموں آئے اور اُنھوں نے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کی کوشش کی جموں میں جو کچھ ہوا اس کے پیش نظر مہاراجا کو الگ ہو کے شیخ صاحب اور کشمیر کے لوگوں کو پورا موقعہ دینا چاہئیے کہ وہ حالات کو ٹھیک کریں۔"

مہاتما گاندھی کو میں نے بھی حالات سے باخبر رکھا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے مہاراجہ کے ساتھ مہاجن کو بھی آڑے ہاتھوں لیا جس کا مہاجن کو ساری عمر قلق رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ اور مہاجن نے اُن دنوں جو انسانیت سوز جرائم کئے اُن پر اُن کے خلاف اُسی قسم کا مقدمہ چلایا جا سکتا تھا جیسا دوسری عالمی جنگ کے بعد کچھ نازی جنگی مجرموں کے خلاف نیورمبرگ کے مقام پر چلایا گیا تھا ہم نے اس سلسلے میں کچھ حقائق ترتیب دینا شروع کئے تھے

مرکزی وزارت داخلہ کو اس کا پتہ چل گیا اور پھر میری منشا کے باوجود مختلف قومی اور بین الاقوامی وجوہات کی بنا پر مہاراجا اور مہاجن انصاف کے کٹہرے میں پیش نہ کئے جا سکے۔

سردار پٹیل کشمیر میں میسور طرز کی ایک عبوری حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مہاجن صاحب کو اقتدار کی بالادستی حاصل ہوتی۔ لیکن میں نے حکومتِ ہند کو بتایا کہ یہ تجربہ کامیاب نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جواہر لال نے مہاراجہ کو ایک خط میں لکھا:۔

"اگر ریاست میں رائے شماری ہوتی تو ہمیں اس صورت میں ریاست کی آبادی کی اکثریت جس کا مطلب وہاں کے مسلمان ہیں، کی خوشنودی حاصل کرنا ہوگی۔ جموں میں حال ہی میں جو پالیسی روا رکھی گئی اُس سے مسلمان ناراض ہیں۔ اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بیزاری پھیل گئی ہے اگر کوئی شخص اس صورتِ حال کو سدھارنے میں موثر رول ادا کرسکتا ہے تو وہ شیخ عبداللہ ہیں۔"

لیکن مہاراجا اور پٹیل اس کے باوجود بضد رہے۔ اس پر جواہر لال نے براہِ راست سردار کو لکھا:۔

"میں اِس اصول کو نہیں سمجھ پا رہا ہوں جو غالباً ریاستوں کی وزارت کی راہنمائی کر رہا ہے۔ یہ وزارت پاکوئی اور وزارت بحث و نظر سے بالاتر نہیں ہے۔ اور نہ اُسے اس طرح کام کرنا چاہئے کہ یہ اپنی خود مختاری کی سختی سے حفاظت کرتی رہے اور باقی وزارتوں سے الگ تھلگ کام کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو حکومت ایک پیوستہ وابستہ اکائی نہیں ہوتی۔ جو ایک مقصد کے لئے مصروفِ عمل ہو۔ اور وزیر اعظم کا تو پھر کوئی کام ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ موجودہ مسئلے کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اِس کی وجہ سے بہت سے متعلقہ سوال اُٹھتے ہیں بین الاقوامی، فوجی اور دوسرے۔ جو ریاستوں کی وزارت کے دائرے سے باہر ہیں۔ اِسی لئے اس کا جائزہ کابینہ کو مجموعی طور پر متعدد بار لینا پڑتا ہے۔ دوسری وزارتوں کو بھی اجتماعی یا انفرادی

طور اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔ میری اِس میں ذاتی دلچسپی لینے کی وجہ بھی یہی ہے تاکہ وزیر اعظم کی حیثیت سے میں بہت سی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کر سکوں۔"

جواہر لال کی اس چٹھی کا سردار پر زبردست اثر ہوا اور انھوں نے دسمبر ۴۸ء کے آخری ایام میں استعفیٰ پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس سلسلے میں انھوں نے استعفیٰ کا خط بھی لکھا لیکن بات مہاتما گاندھی تک پہنچ گئی۔ گاندھی جی نے نہ صرف سردار کو تدبّر اور تحمّل دکھانے کا مشورہ دیا بلکہ ایک ملاقات میں مجھ سے بھی کہا کہ میں سردار سے مِل کر انھیں اِس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں سردار سے ملا اور انھیں کشمیر کے انتظامیہ کی دو عملی اور اس کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ سردار کے پاس اِن دلائل کا جواب نہ تھا چنانچہ وہ مہاجن کو رخصت کرنے پر راضی ہوگئے۔ مہاراجہ نے اُن کو پانچ سال کے لئے مقرر کیا تھا۔ چنانچہ انھیں باقیماندہ عرصے کی تنخواہ کی رقم نقد ادا کر دی گئی۔ جو ان دنوں ایک خطیر رقم کی حیثیت رکھتی تھی۔

مہاجن صاحب کے نائب رام لال بترہ کو پہلے ہی رخصت کر دیا گیا تھا۔ اب جونہی مہاجن بھی گئے۔ تو مہاراجا نے وزیر اعظم کی حیثیت سے میری تقرری کا فرمان جاری کیا۔ میں ڈوگرہ شاہی کے ایک سال کے بعد ریاست کا پہلا مسلمان اور عوامی وزیر اعظم بن گیا تھا۔ میں نے اپنی کابینہ میں بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ، غلام محمد صادق، سردار بدھ سنگھ، پنڈت شیام لال صراف، پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ، کرنل پیر محمد خان کو شامل کیا۔ کرنل بلدیو سنگھ پٹھانیہ وزیر حضور رکھے گئے۔

پہلی عوامی کابینہ میں بخشی غلام محمد کو نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے شامل کیا گیا یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے تمام ساتھیوں میں سے بخشی صاحب کو ہی کیوں اپنی نیابت کے لئے چُنا؟ اِس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے اُن حالات پر

نگاہ ڈالنا پڑے گی جن کا مجھے اُس وقت سامنا تھا۔ ریاست میں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ریاست ہند اور پاکستان کے درمیان جنگ کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ نے خاص طور پر شمالی ہندوستان کو ایک اژدہے کی طرح اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ اس آگ سے جموں کا بڑا حصہ متاثر تھا، ایڈمنسٹریشن میں ابتری بپا تھی۔ ان تمام حالات کا مقابلہ وہی لوگ کر سکتے تھے جن میں خود اعتمادی، بے پناہ جرأت اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نپٹنے کی ہمت موجود ہوتی۔ یہ گُن بخشی صاحب میں بڑی حد تک پائے جاتے تھے۔

اگرچہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اُن میں عوام سے رابطہ قائم رکھنے کا بڑا ملکہ تھا اس لئے اس وقت کے حالات کا مقابلہ کرنے میں وہی میرے معاون اور مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے ان کی ان تنظیمی صلاحیتوں سے فائدہ بھی اُٹھایا۔ مگر بد قسمتی سے ان کی کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی اُن کی خوبیوں کی ہی طرح بہت تھیں۔ وہ نہایت ہی افلاس زدہ ماحول میں پلے بڑھے تھے۔ اور اُن کی صحبت بھی بچپن میں کچھ قابلِ تعریف نہ رہی تھی وہ غربت اور محتاجی کی تلخی چکھ کر جوان ہوئے تھے۔ اُن کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ جس کے ارکان کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرنا پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کا بخشی صاحب کی سیرت پر کوئی بہت اچھا نقش نہیں پڑا۔ میں اُن کی اِن کمزوریوں کو جانتا تھا۔ کبھی کبھی تحریک کے دوران بھی اُن کے کردار کی یہ کوتاہیاں سطح پر آتی رہتی تھیں۔ لیکن مجھے اُمید تھی کہ میں آہستہ آہستہ اُن کی اِن کمزوریوں پر قابو حاصل کر سکوں گا۔ اور اُن کے اندر جاگزیں مثبت پہلوؤں کو اُبھار کر قوم کو فائدہ پہنچا سکوں گا۔ اُن کی اِن کمزوریوں کو مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بخشی صاحب کو اپنے شیشے میں اُتارنے کے لئے اُنھیں ایک موٹر کار اور کچھ دوسرے تحائف کی پیش کش کی تھی۔ جو کہ بخشی صاحب نے چپکے چپکے قبول کر لی تھیں۔

ہم سے اجازت لینا تو درکنار اُنھوں نے ہمیں اس کی اطلاع دینا بھی گوارا نہ کیا تھا جب یہ معاملہ طشت از بام ہو گیا تو ساتھیوں نے بخشی صاحب پر اُنگلیاں اُٹھانا شروع کر دیں۔ لیکن میں نے کسی طرح معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ بد قسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ اُن کے خاندان کے تقریباً ہر فرد نے بخشی صاحب کے مرتبے کا فائدہ اُٹھانا چاہا۔ اور دولت کی بھوک مٹانے کے لئے ہر طرح سے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیئے۔ سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ بخشی صاحب ان کوششوں کی صرف چشم پوشی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ممکن حد تک ان کو کامیاب بنانے کے لئے بھی کوشاں رہتے تھے۔ میں کبھی کبھی فہمائش اور کبھی طنز و مزاح کے انداز میں بخشی صاحب کو سمجھاتا رہا کہ ایسا کرنے سے تمام تحریک کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے اور اَن سنی کرتے رہتے۔ بچپن کی محرومیاں ان کے خون میں ایسی رچ بس گئی تھیں کہ وہ اُن کا ازالہ کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ میرے بدترین اندیشے سچے ثابت ہوں گے اور اُن کی اِن نفسانی کمزوریوں کی وجہ سے بعد میں تحریک اور خود کشمیر کو کافی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

بہر حال یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو نئی کابینہ نے حلف اُٹھایا۔ اور کام میں جٹ گئی۔ کابینہ کی تشکیل سے کچھ دوستوں کے شیشۂ سکون میں دراڑ پڑ گئی۔ ہمارے ساتھیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو وزارت میں آنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے انھیں انتظامیہ کے دوسرے فرائض سونپنا زیادہ مناسب خیال کیا۔ انتظامیہ ایک بنیاد ہے۔ جس پر قومی نظام کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر بنیاد مضبوط ہے تو عوام کا بھلا کیا جا سکتا ہے۔ وزراء ایک پالیسی ترتیب دیتے ہیں۔ اس کو عملی جامہ پہنانا انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے خواجہ غلام نبی کو گورنر کشمیر اور غلام محمد شاہ کو سپلائیز کا ڈائیرکٹر بنایا۔ محمد امین وکیل کو ڈوڈہ کا ڈپٹی کمشنر

مقرر کیا۔ اور کچھ دوسرے کارکنوں کو مختلف عہدے سپرد کر دیئے۔ یہ بات پہلے پہل انھیں ناگوار تو گذری مگر اس سے کافی فائدہ حاصل ہوا۔ اور ایڈمنسٹریشن میں ایک نئی جان آگئی۔

خواجہ محی الدین قرہ خواجہ غلام محمد صادق کے چچیرے بھائی اور برادرِ نسبتی تھے۔ ان کا تحریک میں ضرور حصہ رہا تھا۔ اور وزیر بننے کے بڑے شوقین تھے۔ لیکن میرے لئے ایک ہی خاندان سے دو افراد کو کابینہ میں لینا ممکن نہ تھا۔ صادق صاحب قرہ صاحب سے عمر میں بڑے تھے۔ اور رشتہ بھی بڑی قربت کا رکھتے تھے۔ اِس لئے میری نظرِ انتخاب پہلے اُن پر ہی پڑی۔ محی الدین صاحب روٹھ کر نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے اور ایک نئی جماعت پولیٹیکل کانفرنس قائم کر بیٹھے۔ بعد میں انھوں نے پاکستان سے خفیہ رابطہ قائم کر لیا۔ اور سرحد پار سے مالی امداد کے نام پر کافی پونجی بٹوری۔ کچھ نوجوانوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ تھوڑا سا حصہ اُن میں بھی بانٹا کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے کھلم کھلا پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا لیکن کوئی خاص اثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک میں جو نام پیدا کیا تھا اُس پر بھی اوس پڑ گئی۔ ■■■

(۴۲)

ایک طالع آزما کے کرتب

پاکستان کے اربابِ اقتدار کے ذہن میں کشمیر کو پاکستان میں ملانے کے لئے کئی متبادل تجاویز تھیں۔ ریاست کے ہندوستان سے اِلحاق کرنے سے بہت پہلے اُنھوں نے کشمیر کو اپنا لقمہ بنانے کے لئے داؤ آزمائے۔ لیکن وہ ان چالوں کے بے اثر ہونے کے اِمکان سے غافل نہ تھے۔ اُس صورت میں اُنھوں نے کشمیر کو بہ زورِ بازو اپنے ساتھ مِلانے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ دھمکی ہے جو ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اُس وقت دی جب وہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں شیخ صادق حسن کے ہمراہ مجھ سے ملنے کے لئے سرینگر آئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ نہیں کرتے تو وہ "دوسرے ذرائع اِختیار کریں گے"۔ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا کہ یہ ذرائع کشمیر میں قبائلیوں کے بھیج دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے قبائلیوں کو کشمیر کی طرف کیوں دھکیل دیا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ جب پاکستان بنا تو اس کا ہمسایہ مُلک افغانستان اُس پر خوش نہ تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ انگریزوں نے اس کے بہت سارے علاقے کو چھین کر جبراً ہندوستان میں مِلا دیا تھا اور ڈیورنڈ لائن فضا پر

بنی نہ تھی اس لئے جب انگریزوں نے ہندوستان سے رختِ سفر باندھا تو افغانستان نے اپنے چھینے ہوئے علاقے کی بحالی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ افغانستان کا خیال تھا کہ اس طرح اس کا خشک محاصرہ ختم ہو جائے گا اور وہ سمندر کے ساحل تک پہنچ سکے گا۔ افغانستان کے جذبات اس معاملے میں اس قدر شدید تھے کہ وہ اقوامِ متحدہ میں واحد ممبر تھا جس نے پاکستان کے عالمی انجمن کا رکن بنائے جانے کی مخالفت کی تھی۔ اُدھر پاکستان ایک پریشانی میں مبتلا تھا۔ اُسے یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ افغانستان کہیں قبائلیوں کو اُکسا کر اُن کا رُخ پاکستان کی طرف نہ پھیر دے اور پاکستان کے غیر یقینی حالات کا فائدہ اُٹھا کر اپنے عزائم کی تکمیل نہ کر لے۔ اِس لئے اگر قبائلیوں کو کشمیر کی جانب جھونکا جا سکے تو ایک پتھر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ پاکستان بھی قبائلی خطرے سے بچ جائے گا اور کشمیر کے مسلمانوں کی مظلومیت کا شور مچا کے قبائلیوں کو کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بھی اِستعمال کیا جا سکے گا۔ اس منصوبے کے پیچھے عبدالقیوم خان کا دماغ کار فرما تھا۔ جو اُس وقت صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ یہ ایک کشمیری النسل بیرسٹر ہیں اور اُن کا خاندان بھی کافی زمانے سے پشاور میں مقیم ہے۔ یہ پشاور میں وکالت کے زمانے میں خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار جماعت میں شامل ہوئے۔ اور اس طرح کانگریس کے ساتھ ان کا ناطہ جڑ گیا۔ چنانچہ یہ مرکزی لیجسلیٹیو اسمبلی میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈری کے منصب تک پہنچ گئے۔ ان کے تعلقات خان بادشاہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان کے ساتھ تو بہت اچھے تھے۔ لیکن خود عبدالغفار خان ان پر بالکل اعتبار نہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کو موقعہ پرست ہی سمجھتے رہے۔ قیوم صاحب "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچنے کے لئے سری نگر آ گئے۔ یہیں پر قیام کے دوران اُن کے دل میں کشمیر پر حکومت کرنے کی ہوس جاگ اُٹھی۔ بنا بریں پاکستان میں اُن کو کشمیری معاملات کا ماہر سمجھا

جاتا تھا اور کشمیر کے معاملات پر ان کی بات توجہ سے سُنی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جناح صاحب سے جب پہلے پہل قبائلی اور پاکستانی فوج کشمیر میں بھیجنے کی اجازت مانگی گئی تو اُنھوں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ کیونکہ وہ ایک قانون دان کی حیثیت سے اس کے نتائج و عواقب سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن قیوم خان اور پنجاب کے کچھ سر پھرے کشمیر پر اپنی قوت بازو کو آزمانے کے لئے مچل رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کشمیر کو زیر کرنا اُن کے لئے کوئی مشکل بات ثابت نہ ہوگی چنانچہ اُنھوں نے قبائلیوں کو ٹرانسپورٹ، ہتھیار، رسد، پٹرول اور دیگر ضروریات مہیا کر کے کشمیر پر دھاوا بولنے کے لئے روانہ کیا اور کچھ من چلے لیڈر بھی ان کے ساتھ ہو لئے۔

قبائلی اپنی دُھن میں مست سیاسی شطرنج کی اس چالبازی سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ اس "جہاد" میں اپنی من کی ترنگ پورا کرتے رہے۔ یعنی لوٹ مار، عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ زور زبردستی وغیرہ۔ آئے تو تھے تو کشمیر فتح کرنے لیکن اٹک گئے بدکاریوں میں۔ سری نگر موزوں وقت پر نہ پہنچ سکے۔ اور یہ موقعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جناح صاحب ایبٹ آباد ہی میں خوش خبری اور بلاوے کا انتظار کرتے رہے اور قبائلی لوٹ کا کچھ مال اور عورتیں لے کر راولپنڈی پہنچ گئے۔ وہ خون کا مزا چکھ چکے تھے۔ بھلا راولپنڈی میں ایسی سی کرنے سے کب باز رہتے۔ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر جس چیز پر ہاتھ ڈالا اُسے اُٹھا کر لے گئے۔ پاکستانی اِس فارسی مقولے کو بھول چکے تھے کہ ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں مپسند۔ اب اپنی باری آئی تو لاہور کے اخبارات میں زبردست واویلا مچ گیا۔ مطالبہ ہونے لگا کہ ان "مجاہدینِ نفس" کو جلد از جلد اپنے ٹھکانوں میں واپس کر دیا جائے۔

پاکستانی حکمران کہتے رہتے ہیں کہ اُنھوں نے قبائلیوں کو کشمیر اس لئے بھیجا تھا کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچا سکیں۔ وادی کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اٹھانوے فی صد ہے۔ ظاہر ہے کہ دو فیصد مقامی غیر مسلموں سے اُنھیں

کوئی خطرہ در پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر پاکستان کے حکمراں سوچیت گڑھ کے علاقے سے قبائلیوں کو ریاست کی ہندو اکثریت والے حصے میں بھیج دیتے تو اس دعوے میں وزن پیدا ہو سکتا تھا۔ خالص فوجی نقطۂ نگاہ سے بھی ایسا کرنا اُن کے لئے زیادہ فائدہ مند رہتا کیونکہ اگر وہ سرینگر جموں روڈ کو کاٹ کے رکھ دیتے تو کشمیر ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے علیحدہ ہو کر رہ جاتا اور صرف ہوائی راستہ اس کے الحاق کا ضامن نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ تو وادی کشمیر کی خوبصورتی سے مزے اُٹھانے اور ہمارے ساتھ انتقامی کارروائی کرنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ انھیں کشمیر کے لوگوں سے زیادہ اس خوبصورت سرزمین کو فتح کرنے کی فکر تھی۔ وہ یہاں کے جنگلوں، مرغزاروں اور پہاڑوں کو اپنی آغوش میں سمو لینا چاہتے تھے۔ اور یہاں دادِ عیش دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعض پاکستانی حاکموں نے یہاں مقامات اور مکانات بھی اپنے لئے پسند کر لئے تھے۔ کشمیری عوام جائیں بھاڑ میں، اُن کی کیوں فکر کی جائے؟

جب مئی ۱۹۶۵ء میں، میں پاکستان گیا تو راولپنڈی میں میں نے ۱۹۴۷ء کے واقعات کا ذکر صدر ایوب خاں کے ساتھ کیا۔ فیلڈ مارشل نے اِن واقعات پر ایک واہیں نگاہ ڈالتے ہوئے ایک آہ کھینچی اور کہا کہ "ہاں قیوم خاں کشمیر کا راجہ بننا چاہتا تھا اور اسی لئے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی من مانی کرتا چلا جا رہا تھا۔"

ہندوستان اگرچہ آزاد ہو چکا تھا لیکن ابھی انگریز زندگی کے اہم شعبوں میں چھائے ہوئے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے آخری وائسرائے رہنے کے بعد اب آزاد ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی افواج کے سربراہ دونوں انگریز تھے۔ اور اُن کے سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکنلیک تھے۔ اس پس منظر میں جب ہندوستان کی فوجیں ۱۹۴۷ء کے اواخر میں قبائلیوں کو ہانکتی ہوئی پاکستانی سرحدوں تک پہنچ گئیں تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ہند اور پاکستان کے درمیان کھلے بندوں اعلانِ جنگ

نہ ہو جائے۔ پہلے تو جناح صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن دونوں ملک اپنے موقف پر اڑے رہے۔ پاکستان چاہتا تھا کہ رائے شماری سے پہلے ہندوستان کی فوجیں کشمیر سے نکل جائیں اور ہندوستان زور دیتا تھا کہ کوئی تصفیہ کرنے سے پہلے پاکستان تمام قبائلیوں کو واپس بُلالے۔ اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کے مشورے سے وزیراعظم برطانیہ کلیمنٹ اٹیلی کو لکھا کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ تضیہ باہمی مصالحت سے طے کرانے کے لئے فوری طور پر ہندوستان کی طرف پرواز کریں۔ لیکن برطانوی وزیراعظم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس تجویز کا بیج پھینک دیا کہ اس مسئلے کو اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنے وزیراعظم کی رائے سے متفق تھے۔ لیکن گاندھی جی اور سردار پٹیل اس کے حق میں نہیں تھے۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ ہمیں اپنے معاملے کو اغیار کے سامنے پیش نہیں کرنا چاہئے اور اگر ہند اور پاکستان کے درمیان تصفیہ نہیں ہوتا تو وہ کسی ایشیائی مُلک کو مصالحت کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ سردار پٹیل کا خیال تھا کہ اقوامِ متحدہ صرف مغل آرائی کا سٹیج ہے اور وہاں کسی بات کا فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔ بالآخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رائے غالب آئی اور معاملہ سلامتی کونسل میں پیش کیا ہوا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پر پاکستانی حملے کا معاملہ اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے حکومتِ ہند نے عالمی ادارے کے نام لکھا:

"اِس ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہ کہیں حکومتِ ہند ریاست جموں و کشمیر کی وقتی مصیبت کو اپنے سیاسی فائدے کے لئے استعمال تو نہیں کرتی، حکومتِ ہند نے بات صاف کر دی ہے کہ جونہی ریاست جموں و کشمیر کی سرزمین حملہ آوروں کو نکال کر خالی کرلی جائے گی اور امن و امان کے عام حالات از سرِ نو بحال کئے جائیں گے، ریاست جموں و کشمیر کے عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں گے اور وہ فیصلہ جمہوریت کے مسلّمہ طریقہ کار رائے شماری یا استصواب PLEBISITE OR REFREMDUM کے ذریعے عمل میں آئے گا

جس کی غیر جانبداری کو یقینی بنانے کے لئے یہ اقدام بین الاقوامی نگرانی میں کیا جائے گا۔"

چنانچہ ہندوستان کی طرف سے مقدمہ پیش کرنے کے لئے پہلا وفد گوپال سوامی آئینگر کی قیادت میں روانہ ہوا۔ پاکستانی وفد کی قیادت وزیر خارجہ چودھری سر ظفر اللہ خان کر رہے تھے۔ مجھے بھی ہندوستان کے وفد میں شامل کیا گیا۔ میرے لئے سمندر پار جانے کا پہلا موقع تھا۔ سر ظفر اللہ خان ایک ہوشیار بیرسٹر تھے۔ انھوں نے بڑی ذہانت اور چالاکی کا مظاہرہ کر کے ہماری محدود سی شکایت کو ایک وسیع مسئلے کا روپ دے دیا اور ہندوستان و پاکستان کی تقسیم کے سارے پر آشوب پس منظر کو اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ ہندوستان پر لازم تھا کہ وہ اپنی شکایت کا دائرہ کشمیر تک ہی محدود رکھتا۔ لیکن وہ سر ظفر اللہ کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا اور اس طرح یہ معاملہ طول پکڑ گیا۔ بحث بحثی کا سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ ہمارے کان پک گئے اور ہمارا قافیہ تنگ ہونے لگا۔ ہم چلے تو تھے مستغیث بن کر لیکن ایک ملزم کی حیثیت میں کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے۔

گوپال سوامی آئینگر بہت قابل اور جہاں دیدہ منتظم تھے۔ لیکن وکیلوں کی چالاکیوں سے بے بہرہ تھے۔ مجھے بھی سلامتی کونسل کے صدر نے اپنا عندیہ بیان کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے یہ دعوت اچانک پیش کی۔ اور میں اس کے لئے تیار بھی نہ تھا۔ میں اس دن بخار میں مبتلا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ جو کچھ بھی میں زبانی کہہ سکتا تھا کہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ داؤں سر ظفر اللہ خان کی شطرنج بازی کا نتیجہ تھا کیونکہ وہ اچانک مجھے تقریر کروا کر میری پوزیشن سلامتی کونسل کے ممبروں میں گرا دینا چاہتے تھے۔ بہرحال میں نے تقریر کی۔ جو گھنٹہ بھر سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ تقریر کے دوران سر ظفر اللہ خان اور برطانوی نمائندے سر فلپ نول بیکر نے مداخلت کی کوششیں کیں اور میری ان سے خوب نوک جھونک رہی۔ ظفر اللہ خان نے فقرہ کسا کہ میں جواہر لال کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ "مجھے

جواہر لال کی دوستی پر فخر ہے اور آپ کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ جواہر لال کے ساتھ میرا خون کا رشتہ ہے اور خون خون ہے اور پانی پانی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود اگر کبھی کشمیر کے لوگوں کے مفاد اور جواہر لال کی دوستی میں ایک چیز کا انتخاب کرنے کی نوبت آگئی تو میں کشمیری عوام کے مفاد کو جواہر لال کے ساتھ دوستی پر قربان نہیں کروں گا۔" بہرکیف ہمیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سکیورٹی کونسل نے ہمیں فروعی معاملات میں اُلجھا دیا ہے۔ وہاں کشمیر کے معاملے کی بجائے ہند پاکستان کا وسیع تر سوال اُٹھایا گیا اور ایجنڈے میں بھی اس کا یہی نام رکھا گیا۔ برطانیہ کی اس دیوانگی میں ایک پُر کاری کی ادا مضمر تھی۔ وہ اگر پاکستان کا اس قدر حامی بن گیا تھا تو اس کی ایک خالص تجارتی وجہ تھی۔ نپولین بوناپارٹ نے انگریزوں کو دوکانداروں کی قوم قرار دیا تھا۔ اور یہاں پر وہ پھر اپنی نسلی جبلت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں عرب ممالک کا ایک پورا بلاک اُبھر رہا تھا۔ جن کے پاس تیل کی وافر دولت تھی۔ برطانیہ کا وزیر خارجہ ارنسٹ بیون پاکستان کو ایک مسلم ملک کی حیثیت سے عرب ملکوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے لئے ایک پُل کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اور اسی لئے برطانیہ کا اقوامِ متحدہ میں نمائندہ ہندوستان دشمنی میں پیش پیش تھا۔

ہم ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو نیو یارک میں ہی تھے کہ مہاتما گاندھی کی شہادت کی خبر آئی۔ ہم پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ میں نیو یارک روانہ ہونے سے قبل گاندھی جی سے مل آیا تھا۔ انھوں نے جنوری ۱۹۴۸ء کے مہینے میں اپنی شہادت سے کچھ ہی دن قبل فرقہ وارانہ اتحاد کی فضا قائم کرنے کے لئے مرن برت رکھا تھا۔ میں بخشی غلام محمد کے ساتھ دہلی گیا اور ہم نے گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کشمیر میں آپ کے دشمنوں کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور آپ کے دشمنوں اور کشمیر دونوں کو آپ کی زندگی کی ضرورت ہے۔ میں نے گاندھی جی سے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس وقت تک کشمیر نہ لوٹوں گا جب

تک آپ اپنا برت نہیں توڑتے۔ مہاتما نے کہ میرے برت کا ایک مقصد کشمیر کے معاملے میں بھی سچائی اور صداقت پر دنیا کی نظریں مرکوز کرا دینا ہے۔ گاندھی جی کشمیر کو فرقہ وارانہ آشتی کی تجربہ گاہ سمجھتے تھے۔ لیکن انھیں دکھ ہوتا تھا کہ پاکستان تو پاکستان خود ہندوستان میں بعض تنگ نظر لوگ کشمیر کے متعلق شرارت آمیز پروپگنڈا میں مصروف ہیں۔ اُن کے پاس برلا ہاؤس میں کچھ لوگ آتے تھے۔ جنھوں نے کشمیر کے کسی شہر میں عورتوں کے ایک جلوس کی تصویریں اُن کو پیش کرکے ہمارے خلاف کارروائی کی اپیل کی تھی۔ یہ تصویریں قطعی طور پر فرضی اور جعلی تھیں اور گاندھی جی نے اس بات کو فوراً بھانپ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ شکایت کرنے والوں کو لائقِ التفات ہی نہیں سمجھا۔ بہرکیف جواہر لال اور مولانا آزاد کی کوششوں سے دہلی میں صورت حال سدھر گئی۔ پاکستان کو وہ کروڑ روپے کی رقم ادا کی گئی۔ اور گاندھی جی نے پانچ دن کے بعد ہمارے سامنے برت توڑ دیا۔ اس وقت کسے اندازہ تھا کہ یہ عظیم درویش اور پاکباز قلندر جسے اقبالؔ نے وہ مردِ پختہ کار حق اندیش و باصفا کہہ کر یاد کیا ہے۔ ایک مجنوط الحواس فرقہ پرست کی گولی کا نشانہ بن جائے گا۔ مہاتما گاندھی نے اگرچہ ظاہری لڑائی ہار دی تھی لیکن اپنی روح میں انھوں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے ایک دلربایانہ شانِ استغنا اور کج کلاہی کے ساتھ اپنے اصولوں اور اپنے ضمیر کی آزادی کی قربان گاہ میں جان کا چڑھاوا پیش کرکے دنیا کو اس شعر کا مفہوم سمجھا دیا۔ ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے ۔۔۔ یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

گاندھی جی کی شہادت کی خبر سے تمام دنیا میں کہرام مچ گیا۔ امریکہ میں بھی صفِ ماتم بچھ گئی۔ سلامتی کونسل کا خاص اجلاس بلایا گیا جس میں دنیا بھر کے ممالک کے مندوبین نے انھیں شاندار الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اقوامِ متحدہ کے جھنڈے تعظیماً سرنگوں

کر دیے گئے۔ عالمی انجمن کی تاریخ میں یہ پہلی بار تھی کہ ایک ایسے شخص کی موت پر اس قسم کا ماتم منایا جا رہا تھا جس کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ یہ سچے معنوں میں اس مردِ قلندر کی شخصیت کا اعجاز تھا۔

کشمیر کا تنازعہ برس ہا برس تک سلامتی کونسل میں موضوعِ بحث بنا رہا۔ ہندوستان کی کچھ اعلیٰ مرتبت شخصیات نے وقتاً فوقتاً ہندوستانی وفود کی سربراہی کی۔ جن میں گوپالا سوامی آئینگر، سی۔ ایل ستیلواد، بی این راؤ، وجے لکشمی پنڈت، وی کے کرشنا مینن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موخرالذکر نے سلامتی کونسل میں مسلسل اور متواتر بولنے کے تمام ریکارڈ توڑ کر رکھ دیے۔ سلامتی کونسل کی طرف سے کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے اور حل کرنے کی سفارشات پیش کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً بہت سے وفد اور خاص نمائندے کشمیر بھیجے جاتے رہے۔ لیکن معاملہ سلجھنے کے بجائے اُلجھتا ہی رہا اور اس کی وجوہات کے لئے مسئلۂ کشمیر کی نزاکتوں کے ساتھ عالمی سیاست کی پیچیدگیوں پر بھی ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

▲▲▲

۴۳

اقوامِ متحدہ۔ بڑی طاقتوں کی شطرنج

جس وقت کی بات ہو رہی ہے اس وقت اقوام متحدہ پر اس کے پانچ میں سے تین مستقل ممبر بلائے بے درماں کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ امریکہ، چین اور برطانیہ۔ چین جیسے دیوہیکل ملک کی نمائندگی تائیوان کا ایک چھوٹا سا جزیرہ کر رہا تھا جس کے سیاہ و سفید کا مالک جنرل ازمو چیانگ کائی شیک تھا۔ باقی سارا چین کیمونسٹوں کے جھنڈے تلے آ گیا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کا شترمرغ اس حقیقت کو دیکھنے سے برابر آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ اس لئے تائیوان کا نمائندہ چین کی نمائندگی کا دم تو بھرتا تھا لیکن حقیقی معنوں میں امریکہ کے اشاروں پر ناچتا رہتا تھا۔ فرانس اُن دنوں اندرونی انتشار میں الجھا ہوا تھا۔ لہٰذا خارجی معاملات سے اُس کو بس واجبی دلچسپی تھی۔ برطانیہ عام طور پر "بڑے بھائی" امریکہ کی پیروی کرتا تھا اور کشمیر کے معاملے میں تو بالخصوص امریکہ کے نقشِ قدم پر چلتا تھا۔ البتہ امریکہ برطانیہ کی رائے کی بہت قدر کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ برطانیہ ڈیڑھ دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کر چکا ہے۔ اور اس لئے ہندوستان کے حالات و واقعات پر اُس کی نظر گہری ہے۔ کشمیر کے معاملے پر روس ایک عجیب قسم کی ناطرفداری

کا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ امریکہ کی پالیسی بھی کچھ نیم دروں اور نیم بروں نوعیت کی تھی۔ برطانیہ کی ذہنی کیفیت ہم سے پوشیدہ نہ تھی۔ سلطنت ہند تو اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن رسی کا بل اس خاکستر میں ابھی باقی تھا۔ چنانچہ سلامتی کونسل میں میری تقریر کے دوران برطانوی نمائندے فلپ نول بیکر نے اپنی اس ذہنیت کو آشکار کرتے ہوئے مجھ پر اُلٹے سیدھے سوالات داغ دیئے۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے سے گریز نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ برطانیہ ہندوستان کی تقسیم، اُس سے پیدا شدہ حالات اور کشمیر کے تنازعے کے ذمہ دار ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ جہاں کہیں برطانیہ کو پسپا ہونا پڑا ہے وہاں اس نے جاتے جاتے بٹوارے کا سہارا لیا ہے اور دائمی فتنے کے بیج بو دیئے ہیں۔ چاہے فلسطین کا معاملہ ہو یا عرب دُنیا کا۔ وہ اسی ڈگر پر چلتا رہا ہے اور ہندوستان میں بھی اس نے اسی فتنہ گری کا مظاہرہ کیا ہے۔ میرا یہ جوابی حملہ کچھ غیر روایتی قسم کا تھا۔ اس غیر سفارتی UNDIPLOMATIC وار سے نول بیکر صاحب تیورا کر رہ گئے۔ اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اُن کے چہرے سے خفت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہفتوں تک ہندوستان پر الزام تراشی کی جو بارش کی گئی تھی اُس نے ہمارے وفد کے سبھی ارکان کا دل دکھایا تھا ہر رکن کی یہی خواہش تھی کہ ہماری طرف سے بھی کوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی جرأت پیدا کرے۔ لیکن گوپالا سوامی جیسے شریف الطبع اور نرم گفتار انسان سے یہ کب ممکن ہو سکتا تھا؟ میں نے تقریر کی تو میرے ساتھیوں کے چہرے پھول کی طرح کھل اُٹھے جیسے میں نے اُن ہی کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ میری تقریر کے بعد سلامتی کونسل کا اجلاس ملتوی ہوا تو سب سے پہلے روس کے نمائندے مسٹر یعقوب ملک نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور مصافحہ کرتے ہوئے مجھے مبارکباد دی۔ ہمارے ڈیلی گیشن کے ساتھی بھی پھولے نہ سماتے اور کئی دن تک میری تقریر گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ مسٹر نول بیکر نے گوپالا سوامی آئینگر

کے سامنے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ میں برطانوی نمائندے سے ملنے کے لئے جاؤں۔ میں نوئل بیکر صاحب کے ہوٹل میں گیا۔ وہ اندر موجود تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے باہر رکھ کر کافی دیر تک انتظار کروائے رکھا۔ اس طرح شاید وہ سلامتی کونسل میں اپنی خفت کا بدلہ چکا رہے تھے۔ میرا پارہ بھی چڑھنے لگا۔ میں واپس جانے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ نوئل بیکر صاحب باہر آگئے اور ہماری ملاقات شروع ہوگئی۔ دونوں طرف سے خوب گرماگرمی رہی۔ انھوں نے بڑی رعونت کے ساتھ مجھ کو ٹوکا تو میں نے جواب میں خوب کھری کھری سنائی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ پاکستان کے اس موقف کی تائید کرتے رہے کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر کے علاقے میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔ اور نہ قبائلیوں کو کشمیر بھیجنے میں پاکستان کا کوئی ہاتھ تھا۔ میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ہزاروں میل دور اپنی عشرت گاہ میں بیٹھ کر وہ حالات کا صحیح اندازہ کیسے کرسکتے ہیں اور اس شخص کے بیان کو کس بنا پر نظر انداز کر رہے ہیں جو خود میدانِ جنگ سے آیا ہوا ہے ؟ نوئل بیکر آئیں بائیں شائیں کرتے رہے اور ہماری گفتگو بڑے ناخوشگوار ماحول میں ختم ہوگئی۔ میں نے یہ سارا ماجرا من و عن گوپالا سوامی آئینگر کو بتادیا۔ اور اُن سے کہا کہ اب برطانیہ کے عزائم کے بارے میں کوئی شُبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ آئینگر صاحب نے سفارتی ذرائع سے اس واقعہ پر برطانیہ سے احتجاج بھی کیا۔ بعد میں جواہر لال یہ معاملہ اٹیلی اور کرپس کی نوٹس میں لائے اور انھوں نے یقین دلایا کہ آئندہ برطانوی نمائندہ اس قسم کا رویہ اختیار نہ کرے گا۔

میں نے جب ہندوستانی وفد میں شمولیت کے لئے حامی بھرلی تھی تو میری ایک اُمید یہ بھی تھی کہ نیویارک میں شاید پاکستانی وفد سے نجی طور پر گفت وشنید کا موقع پاسکوں۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح بدگمانیاں دور ہوسکیں گی اور کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے کی

راہ نکل آئے گی جسے فریقین باعزت خیال کریں۔ ہندوستان پاکستان سے لڑائی نہیں چاہتا تھا۔ ہم کشمیری عوام بھی ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ ہماری چھوٹی سی ریاست ہمارے دو بڑے ہمسایہ ملکوں کے درمیان قوت آزمائی کا میدان بن جائے۔ لیکن پاکستانی وفد کے ارکان کو دیکھ کر میری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ میرے ساتھ ملنا کیا، بات کرنا کیا، آنکھیں ملانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اِن حالات میں اُن سے افہام و تفہیم کی توقع رکھنا بالکل بے معنی تھا۔ ابھی میں وہیں تھا کہ ہندوستان سے مہاتما گاندھی کی شہادت کی خبر ملی۔ لیک سکسس میں چند روز قیام کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ گاندھی جی کی شہادت ایک جانکاہ صدمہ تھی۔ اُن کی شہادت سے پیدا ہونے والے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بھی ہندوستان لوٹ آنا ضروری تھا۔ اپنے مختصر سے قیام میں میں نے اقوامِ متحدہ کے طریقۂ عمل کا پہلا تجربہ حاصل کیا تھا۔ میں یہ تاثر لے کر لوٹ رہا تھا کہ اس بین الاقوامی ادارے سے انصاف حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں پر مفادات کے تقاضوں کا بول بالا ہوتا ہے۔ سچائی اور انصاف کا نہیں۔ چنانچہ اس کا برملا اظہار سوویت روس کے نمائندے یعقوب ملک نے ایک استقبالیہ میں کیا۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ ناطرفداری کا رجحان کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں اور کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کے حق میں اپنا ووٹ کیوں نہیں دیتے ؟ تو انھوں نے جوابی سوال داغ دیا ”ہندوستان کوریا کے معاملے میں روس کا ساتھ کیوں نہیں دیتا ؟“ گوپالا سوامی ساتھ ہی کھڑے سن رہے تھے۔ انھوں نے جواباً کہا کہ ہر معاملے کو ہم حق و انصاف کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یعقوب ملک نے ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ ابھی آپ کا ملک بین الاقوامی سیاست میں تازہ وارد ہے اور اسی لئے انصاف وغیرہ کی باتیں کرتا ہے۔ خود ہم بھی شروع میں یہی کرتے رہے۔ لیکن جلد

ہی ہمیں اپنے تجربے سے اندازہ ہو گیا کہ بین الاقوامی سیاست میں معاملات کو حق و انصاف کی ترازو پر نہیں تولا جاتا بلکہ مفادات کی میزان میں اُن کا وزن کیا جاتا ہے۔ یہاں تو ایک ہی معیار چلتا ہے۔

"تم ہمارا ساتھ دو۔ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ تم ہمارے مفادات کی رکھوالی کرو ہم تمہارے مفادات کی حفاظت کریں گے۔"

نیویارک سے واپسی پر میں اقوام متحدہ کے بارے میں جو تاثرات لے کر آیا تھا شاید اسی نوعیت کے تاثرات گوپالا سوامی آئینگر کے دل میں بھی اُبھرے تھے جب ہم نیویارک سے ہند کے لئے ہوائی جہاز پر سفر کر رہے تھے تو آئینگر صاحب نے جو میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے ایک کاغذ میرے حوالے کیا اور کہا کہ اسے پڑھ لو۔ اس میں انھوں نے کشمیر کے مستقبل کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کشمیر کو آزاد رکھنا ہی اس گتھی کا بہترین حل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ریاست کی سرحدیں اتنی لمبی چوڑی ہیں اور کتنے ہی بڑے ملکوں سے ملتی ہیں۔ اس لئے ان سرحدوں کی حفاظت کا دردِ سر اور بوجھ ہندوستان برداشت نہیں کر سکتا۔

کچھ مدت کے بعد میں پھر سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک گیا۔ وہاں خالی خولی بحثوں میں بڑا وقت ضائع ہوا۔ لیکن معاملہ طول ہی پکڑتا گیا۔ اب کی بار میری ملاقات پاکستان کے چودھری محمد علی اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس ملاقات کی شانِ نزول یہ ہے کہ اس وقت سلامتی کونسل کے چیرمین کنیڈا کے میکناٹن تھے۔ انھوں نے ہند اور پاکستان کے وفود کو کسی مسئلے پر صلاح مشورے کے لئے اپنے دفتر میں بلوایا تھا۔ دورانِ گفتگو میری چودھری ظفر اللہ سے کسی نکتے پر شدید تکرار ہوئی۔ معاملہ یوں تھا کہ جب ظفر اللہ خاں بول رہے تھے تو میں

دیکھ رہا تھا کہ وہ واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کر رہے ہیں۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے انھیں ٹوک دیا۔ اس پر ظفر اللہ خاں نے زبردست وکیلانہ چالاکی سے مجھے اور گوپالا سوامی کو یہ کہہ کر لڑوا دینا چاہا کہ مجھے اپنے وفد کے سربراہ کی گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے میں نے جواب میں کہا کہ یہ ہمارے وفد کا آپسی معاملہ ہے۔ آپ کو اس میں ٹانگ اڑانے کی زحمت نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ناصح بننے کی کوشش۔ جنرل میکناٹن کی مداخلت سے معاملہ ٹل گیا۔ جب گفتگو کے بعد ہم کمرے سے باہر آئے تو ایک شخص نے علیک سلیک کے بعد مجھ سے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اخلاقاً علیک سلیک کا جواب دیا اور مصافحہ بھی کیا لیکن میرے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ میں نووارد کو نہیں پہچان پایا تھا۔ اس نے بڑی ملنساری سے کہا کہ خیر آپ مجھے نہیں پہچانتے۔ میں چودھری محمد علی ہوں۔ اور اسلامیہ کالج لاہور میں ہم دونوں نے اکٹھے پڑھا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا اور میں نے اپنے بچپن کے ساتھی کو پہچان لیا۔ ہم محبت کے ساتھ گلے ملے۔

چودھری صاحب اُس وقت پاکستانی وزارت خارجہ کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہمیں الگ سے ملاقات کرنی چاہیے۔ تاکہ پرانی یادیں تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ مسائل پر بھی تبادلۂ خیال کا موقع نکل آئے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم ایک ہوٹل میں ملے اور چار گھنٹے تک اکٹھے رہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھی اس موقع پر تشریف فرما تھے۔ میں نے دونوں صاحبان کو تفصیل کے ساتھ کشمیر کے واقعات سنائے اور اپنے نقطۂ نگاہ سے باخبر کیا۔ میں نے انھیں کسی لگی لپٹی کے بغیر بتایا کہ ان تمام واقعات کی ذمہ داری پاکستان کے اربابِ اقتدار پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ کشمیر کے معاملے میں من مانی نہ کرتے تو شاید اس کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی۔ دونوں حضرات پاکستان کی غلطیوں سے بیزار تھے اور پشیمان بھی۔ انھوں

نے کہا کہ جو کچھ ہو چکا، سو ہو چکا۔ اب اصلاحِ احوال کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس معاملے کے حل کے لئے باہر کے ملکوں پر تکیہ کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ملک آپس میں برسرِپیکار ہیں۔ اور ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔

غالباً بڑی طاقتوں کی یہ بھی خواہش ہے کہ ہند اور پاکستان کے درمیان کشمیر کی ہڈی پڑی رہے اور یہ آپس میں اس کے لئے لڑتے رہیں اور بڑی طاقتوں کے دستِ نگر رہیں۔ اس لئے اگر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ تحفے کے طور پر کشمیر طشتری میں رکھ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ مخالف طاقتیں ایسا ہونے ہی نہ دیں گی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب امریکہ اور برطانیہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان جیسے بڑے ملک کے ساتھ اپنے تجارتی مفاد کو گھاٹے میں ڈالنا پسند نہ کریں گے۔ ایک نہ ایک دن وہ ہندوستان کے ساتھ بگڑی کو بنانے کے لئے سرگرم ہوں گے اور آپ کو اپنی حالتِ زار پر HIGH & DRY بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔ آپ نے ہندوستان سے تیغ آزمائی کر کے بھی دیکھ لیا۔ اس تجربے سے آپ کو یہ سبق مل گیا ہوگا کہ طاقت کے بل بوتے پر آپ کشمیر کو ہندوستان سے الگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان حالات میں صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔

ہندوستان سے مفاہمت کا۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اس راہِ مستقیم کو اختیار کریں۔ اور ہم سب آپس میں مل کر ایک ایسے حل کا سراغ لگائیں جو ہندوستان پاکستان اور کشمیر کے عوام کے لئے قابلِ قبول ہو اور ان کی عزت کا ضامن بھی۔ ظاہر ہے کہ مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا ہے تو کچھ لو اور کچھ دو کا اصول اختیار کیا جانا چاہئے۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران مختلف امکانی حل زیرِ بحث لائے اور کہا کہ ریاست کو دو ملکوں کے درمیان ایک آزاد (BUFFER) ریاست کی حیثیت سے رکھنا بھی اس مسئلے کا ایک معقول

حل ہو سکتا ہے۔ لیکن آزاد ریاست کے قیام کی ضمانت دونوں ممالک کے علاوہ اقوامِ متحدہ اور چین کو بھی دینا ہوگی۔ محمد علی نے سوال کیا کیا سردار پٹیل کو یہ حل منظور ہوگا؟ میں نے جواباً کہا کہ آپ اس کی فکر مت کیجئے۔ اور یہ ذمہ داری میرے سپرد کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اب حالات کا رُخ دیکھ کر بڑے نرم پڑ گئے تھے۔ وہ کسی طنطنے کے بغیر بولے کہ مجھے اس تجویز میں کافی وزن نظر آتا ہے۔

لیکن چودھری محمد علی کچھ سوچ کر غیر مبہم لہجے میں بول اٹھے کہ پاکستان اس حل کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہندوستان ایک دولت مند ملک ہے وہ کشمیر میں بے تحاشا دولت خرچ کر کے ہمارے لئے مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وقت آئے گا جب آپ چاہیں گے کہ اگر صرف وادی کو ہی آزاد کر دیا جاتا تو بڑی بات ہوتی لیکن اس وقت تک جہلم میں اتنا پانی بہہ چکا ہوگا کہ کوئی آپ کی بات پر کان دھرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا۔ نیویارک کے قیام کے دوران پاکستانی وفد نے اپنی بے اصول قلابازیوں کے خوب کرتب دکھائے۔ وہ سردار محمد ابراہیم کو میرے مقابلے میں کشمیر کا اصل نمائندہ ثابت کرنا چاہتے تھے اس لئے اُس کے نام کو خوب اُچھال رہے تھے۔ لیکن یا تو انھیں سردار صاحب کی لیاقت پر شک تھا یا اُن کی وفاداری پر کم اعتبار۔ چنانچہ اُنھوں نے وہاں کے ایک مشہور اخبار میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تصویر چھاپی اور اُس کے نیچے سردار ابراہیم کا نام لکھ دیا۔ تاثیر صاحب کو ہی سردار ابراہیم ثابت کر کے ادھر اُدھر دکھایا اور گھمایا جا رہا تھا۔ سردار ابراہیم نے یہ حال دیکھا تو فوراً دوسرے دن وہاں سے وطن کی طرف لوٹ پڑے۔ بعد میں پاکستان کا یہ جھوٹ پکڑا گیا اور اُن کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔

نیویارک میں قیام کے دوران سعودی عرب کے وفد نے مجھے دعوت پر بلایا۔ وہاں سعودی عرب کے نمائندوں سے کشمیر کے معاملے پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ میں نے ان کے

سامنے بھی اپنا نقطۂ نظر رکھا۔ وہ میرے اِستدلال کے قائل ہوگئے اور انھوں نے چاہا کہ میں اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خاں سے مُلاقات کروں۔ میں نے انھیں مُطلع کیا کہ اگر چودھری صاحب اس معاملے پر مجھ سے تبادلۂ خیال چاہتے ہوں تو انھیں مجھے باقاعدہ مُلاقات کی دعوت بھیجنی چاہیے۔ لیکن نہ تو چودھری صاحب نے کوئی دعوت دی اور نہ میں نے کوئی سِلسلہ جنبانی کی۔ معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ میں نے گفت و شنید کے اس اتار چڑھاؤ سے اپنے معاونین دُرگا پرشاد اور جانکی ناتھ زتشی کو بھی آگاہ رکھا۔

پاکستان کے اربابِ اقتدار نے کشمیر کے معاملات میں کتنی ٹھوکریں کھائیں اور انھوں نے کس طرح نہایت معمولی باتوں کے لئے تقریباً یقینی تصفیے کو تارپیڈو کر دیا۔ اس پر غور کرنے سے تأسف اور حیرت کے جذبات بیک وقت ابھرتے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی عقل و خرد عین موقعے پر جبکہ تصفیہ تقریباً ان کی گرفت میں ہو جاتا تھا، گھاس چرنے کے لئے چلی جاتی تھی۔ اِس میں ان کی فہم کا قصور تھا یا ان کی سیاست گری کے تقاضوں کا۔ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ مثلاً ایک دفعہ مفاہمت کے راستے میں یہ چھوٹا سا اِختلاف رکاوٹ بن گیا کہ رائے شماری کے وقت کشمیر میں ہندوستانی فوج کی کتنی تعداد رہنی چاہیے؟ ہندوستان ستائیس ہزار کی تعداد پر اصرار کرتا تھا لیکن پاکستان کسی صورت میں بائیس ہزار سے زیادہ ہندوستانی فوجیوں کی موجودگی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ تصفیہ کی شرائط کے مطابق یہ فوجیں بھی احتیاط کے طور پر بارکوں کے اندر رکھی جاتی تھیں۔ محض حفظِ ماتقدم اور حفاظتی اقدامات کے لئے۔ اسی طرح جب آسٹریلیا کی سپریم کورٹ کے جج سر اوون ڈِکسن اقوامِ متحدہ کے نمائندے کی حیثیت سے کشمیر آئے تو انھوں نے ساری ریاست کا دورہ کرنے اور مسئلے کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ رائے شماری صرف وادی اور اس

کے ملحقہ علاقوں میں کی جانی چاہیے۔ تجویز کے مطابق جنوب کی طرف کے ہندو اکثریت والے علاقے ہندوستان میں ضم کئے جانے تھے اور شمال کی طرف کے علاقوں (جن کو آزاد کشمیر کا نام دیا جاتا ہے) کو پاکستان کا حصہ رہنا تھا۔ کیونکہ سر اوون کے مطابق ان علاقوں کے لوگوں نے پہلے ہی پاکستان میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اِظہار کر دیا تھا۔ اُن کی رائے میں ہندو بہرحال ہندوستان کے حق میں ووٹ دیتے۔ اِس لئے ہندو اکثریت کے علاقوں میں رائے شماری کرانا بے معنی تھا۔ اُن کا خیال یہ بھی تھا کہ پہاڑی علاقوں میں رائے شماری کو منظم کرنے میں کافی دقتیں پیش آئیں گی اور آبادی کی اتھل پتھل بھی بھاری پیمانے پر ہوگی۔ اس لئے اُن کے خیال میں صرف انہی کی تجویز قابلِ قبول اور قابلِ عمل تھی۔ لیکن لیاقت علی خاں نے یہ شرط رکھی کہ وہ اس تجویز پر جب ہی غور کریں گے جب پہلے مجھے وزارت سے الگ کر دیا جائے۔ اُن کو خدشہ تھا کہ میرے ہوتے ہوئے پانسہ یقینی طور پر ہندوستان کے حق میں پلٹ جائے گا۔ اور اُن کو ایک نسخۂ کیمیا ہاتھ آیا تھا کہ مجھے اِختیار سے ہٹا دیا جائے۔ اس بات پر وہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ زور دیتے رہے کہ مفاہمت کا یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ حکومتِ ہند نے پاکستان کو اگرچہ یقین دلایا تھا کہ میری حکومت ہر لحاظ سے ناطرفدار رہے گی۔ لیکن اس نے میرے ہٹائے جانے کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ اس طرح تو رائے شماری سے پہلے ہی پاکستان کی فتح کا اعلان ہو جائے گا۔ اِس کے علاوہ پاکستان کے حکمرانوں کو کشمیر کے تصفیے سے زیادہ کشمیر کے جھگڑے سے دلچسپی تھی اور وہ اِسے زندہ رکھ کر اپنے ملک میں اپنی بقا کا سامان کر رہے تھے۔ جواہر لال نے میرے نام ایک خط میں کیا خوب لکھا تھا کہ:

"پاکستانی حکمران اس آدمی کی طرح ہیں جو ایک چلتی ہوئی بائیسکل پر سوار ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جونہی حالات معمول پر آجائیں گے بائیسکل

ٹھہر جائے گا اور وہ نیچے گر پڑیں گے۔"

(خط ۲۵ اگست ۱۹۵۲ء)

لیکن ہندوستان بھی اس وقت کشمیر کو صرف ایک قطعۂ زمین نہیں بلکہ ایک مجسّم آدرش سمجھتا تھا، اور اِس کو اپنے ساتھ شامل رکھنے کو اپنے اصولوں اور پالیسی کا اہم ستون خیال کرتا تھا۔ چنانچہ جواہر لال نے کرشنا مینن کے نام ۲۴ فروری ۱۹۵۱ء کو لکھا۔

"اگر پاکستان کی فرقہ وارانہ پالیسی اور اپروچ کشمیر میں حاوی ہو گئے تو یہ صرف کشمیر ہی کا المیہ نہیں ہوگا بلکہ اِس سے ہندوستان میں ہی کیا پاکستان میں بھی تمام صورتِ حال کا توازن درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کا صفایا کرنے کے مرحلے میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ ایسے خوفناک خیالات ہیں کہ میں ان سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے لوگ گہرے سمندر پر لگی برف کی اس پتلی سی تہہ پر موج اُڑا رہے ہیں اور ہم پر ہٹ دھرمی کا اِلزام عائد کرتے ہیں۔"

قصہ مختصر کہ سلامتی کونسل کی طرف سے تصفیہ کنندگان اور وفود آتے رہے۔ کشمیر کے سیر سپاٹے سے لُطف اٹھاتے رہے اور پھر رپورٹیں پیش کرتے رہے۔ کبھی ڈکسن آئے تو کبھی گراہم۔ کبھی ایڈمرل نِمٹز کو استصواب کا نگران بنانے کا چرچا ہوا اور کبھی سویڈن کے گنار یارنگ آئے۔ لیکن معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ اقوام متحدہ کے دفتر میں کتنی بڑے کمرے کشمیر کے تنازعے سے تعلق رکھنے والی دستاویزات اور کاغذات سے بھرے پڑے ہوں گے۔ معاملہ طول پکڑتا گیا۔ لیکن زندگی ساکت نہیں بلکہ متحرک ہے۔ کشمیر کے معاملے میں بھی اقوام متحدہ وقت اور تبدیلی کے تیز گام پہیے

کو روک نہیں سکی۔ ہم کشمیر میں حالات کو اپنے اصول اور نظریات کے مطابق تشکیل دینے میں مصروف رہے اور اقوام متحدہ فردوسی کے اس شعر پر عمل پیرا رہی۔ ؏

پئے مشورت مجلس آراستند

نشستند و گفتند و برخاستند

▲▲▲

۴۴

اِنقلاب آفریں اِقدامات

جوں ہی محاذِ جنگ پر توپوں کی گھن گرج دھیمی پڑنے لگی ہمیں اپنے خوابوں کے نقوش اُبھارنے کی اُمنگ نے آن لیا۔ ریاستی عوام کی مظلومی اور محکومی کا سب سے بڑا نشان ہمارا دہقان تھا۔ اُس کے دستِ دولت آفریں دن رات فرہاد کی طرح جوئے شیر کاٹتے رہے۔ لیکن جب اُس کے خوشوں کا گندن اُس کے کھیتوں میں جھلملانے لگتا تو جاگیردار اور چکدار اس کو سال بھر کی محنت سے محروم کرکے فاقہ کرنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے دیہات کے اکثر کسان جاڑوں میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے پہاڑوں اور میدانوں کا رُخ اختیار کرتے اور وہاں خون پسینہ ایک کرکے چند ٹکے حاصل کرتے۔

چنانچہ ہم نے اس ناسور کی جڑ کاٹنے کے لئے زمینی اصلاحات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ہم نے "نیا کشمیر" کے آئینی اور اقتصادی منصوبے میں کاشتکار کو زمین کا مالک بنانے کے متعلق جو خاکہ پیش کیا تھا اب اسی میں رنگ بھرنے لگے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک سو بیاسی کنال یا سوا بائیس ایکڑ سے زیادہ اراضی کوئی شخص اپنی ملکیت میں نہیں رکھ سکتا۔ باقی زمینیں اُسے اپنے کاشتکاروں کے نام بلامعاوضہ منتقل کرنا ہوں گی۔ اس طرح سے ۳۹۶ بڑی جاگیریں تحلیل کردی گئیں۔ نو ہزار سے کچھ زیادہ مالکان کی ساڑھے چار لاکھ ایکڑ زمین کی ملکیت

زائل کردی گئی۔ جس سے کوئی ڈھائی لاکھ کاشتکاروں کو زمین کے مالکانہ حقوق حاصل ہوگئے۔ البتہ باغات اس حکم سے مستثنیٰ رکھے گئے۔ اِن اصلاحات کی انقلاب آفریں نوعیت کو سمجھنے کے لئے کشمیر میں مہاراجا کے خاص حقوق پر نظر ڈالنا ضروری ہوگی۔ جب ۱۸۴۶ء بیع نامہ امرتسر کے ذریعہ انگریزوں نے کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کردیا تو اُس وقت ریاست کی ساری زرعی اراضی بھی مہاراجا کی ملکیت قرار دیدی گئی۔ چنانچہ اِس بنا پر اُس وقت سے وادی کی ساری زرعی زمین فرمانروائے وقت کی ملکیت قرار دی جاتی رہی۔ یعنی جو مہاراجہ تخت نشین ہوتا تھا وہ اُس کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ بعد میں مہاراجوں نے اپنے جابرانہ نظامِ حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے رشتہ داروں، مصاحبوں، حاشیہ نشینوں، منظورانِ نظر اور وظیفہ خواروں کو بڑی بڑی جاگیریں اور چک عطا کئے۔ جن کا مالیہ وغیرہ تو کاشتکار کو بھرنا پڑتا تھا۔ لیکن اُسے کمائی کا صرف چوتھائی حصہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کی سفاکی کو اُبھارنے اور عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے ہم تحریک کے دوران اکثر جلسوں میں اقبال کا یہ شعر گنگناتا رہتا تھا۔ ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

بعد میں ۱۹۳۱ء کی تحریک کے نتیجے میں جب گلینسی کمیشن قائم ہوا تو ہم نے اِس کے سامنے مُطالبہ رکھا کہ زمین کو کسان کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کمیشن کی سفارشات پر کسانوں کو کچھ سہولیات ملیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے صورت حال علامہ اقبال کے اس فرمودہ کو دُہرا رہی تھی۔ ؎

از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب ٭ انقلاب انقلاب اِنقلاب اے انقلاب

کشمیر ایک زرعی ملک ہے جہاں ۹۰ فیصدی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں کی زمینوں کو حکمران طبقے نے اکثر جاگیروں میں بانٹ رکھا تھا۔ بعض جاگیردار صاحبان کو ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کی زمینیں کہاں واقع ہیں اور کس طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اُن کا کام تو یہ تھا کہ جب اناج کاشتکار کے خون سے سیراب ہو کر پک جائے تو وہ اپنے کاردار کو اُس کے سر پر یم راج کی طرح بھیجدیں۔ اور پیداوار کے بیشتر حصے کو کوٹھلا (گودام) میں ڈال کر اُس پر اپنا قفل جڑ جادیں۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کاشتکار کے کسی چھوٹے بچے کا دل مچل جاتا اور وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مکی کا ایک بھٹہ کھیت سے نکالتا اور کاردار کی نظر اُس پر پڑتی تو غضب ٹوٹ پڑتا۔ کاردار نہ صرف اُسے مار مار کر ادھ مُوا کر دیتا تھا بلکہ اُس کے مُنہ سے مکی کے چبائے ہوئے دانے بھی باہر اُگلوا کے ہی دم لیتا تھا۔ کاشتکار کو مشکل سے تین چار مہینے کی روٹی ملتی باقی کے لئے وہ جاگیردار کے دروازے پر دُم ہلاتا رہتا یا پنجاب کی خاک چھانتا اور بعض اوقات اس صحرا نوردی میں فاقہ مستی کی موت مر جاتا۔ ایسے بہت سے کم نصیبوں کی زندگی کی شام لاہور، امرتسر یا راولپنڈی کے کسی گلی کوچے میں ہو جاتی۔ جب میں لاہور میں زیرِ تعلیم تھا کبھی کبھی یہ کشمیری بھیک مانگنے کے لئے میرے ہوسٹل میں بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ایک ایسے ہی کشمیری سے پوچھا کہ تم جو دن بھر محنت مزدوری کرتے اور کماتے ہو پھر شام کو کیوں بھیک مانگتے ہو؟۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے دن بھر کی محنت کے بعد دو سے تین روپے تک ملتے ہیں۔ وہ میں پیٹ کے ساتھ باندھ کے رکھتا ہوں تاکہ وطن واپسی پر مالیہ ادا کر سکوں اور ہو سکے تو کچھ کپڑے لتے اپنی بیوی بچوں کے لئے لے جاؤں۔ ان بیچاروں کی حالتِ زار پر رحم کھانے کی بجائے پنجاب کے لوگ انھیں حقارت کے ساتھ "ہاتو" کہہ کر پکارتے۔ وہ انھیں باربرداری کے حیوان سے زیادہ

حیثیت نہ دیتے تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو اُن کی بپتا سے متاثر ہوتے تھے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی حالتِ زار سے متاثر ہو کر فرمایا تھا ؎

بہ ریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

یا ابو الاثر حفیظ جالندھری پکار اُٹھے تھے ؎

ثمر سے محروم ہے مالک ہے جو تیشے کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے اجارے ختم کرنا اُن سے کسی معاوضے کے بغیر زمین چھین لینا اور پھر اُسے اِن بدنصیب لوگوں کے حوالے کرنا ایک دلیرانہ ہی نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہندوستان میں سالہا سال بعد تک بھی اس قسم کا قدم اُٹھایا نہیں جا سکا۔ ہم پر کئی اطراف سے سخت نکتہ چینی کی گئی لیکن ہم حق بجانب تھے۔ اس لئے ہم نہ ڈرے اور نہ دبے۔ ہم نے معاوضے کا مطالبہ کرنے والوں سے کہا کہ زمینوں کے اصل مالکوں سے زمین زور زبردستی چھین لی گئی۔ اور جاگیروں اور چکوں میں بانٹ دی گئی تھی۔ لہٰذا اُن سے معاوضے کا مطالبہ کرنا نہ منصفانہ ہے اور نہ معقول۔ جن لوگوں نے یہ زمین مہاراجے کی جی حضوری کر کے حاصل کی تھی اور کاشتکاروں کی محنت سے اپنے عالیشان محلات کا اینٹ گارا اُٹھایا تھا اُن کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس کے اصل مالکوں سے اُن کا معاوضہ مانگیں۔ معاوضے کا اگر کوئی حقدار ہے تو وہ کاشتکار ہے جس کو ایک صدی سے دو دو ہاتھوں سے لوٹا گیا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم اتنے روپے لائیں کہاں سے جن سے ہم جاگیرداروں اور زمینداروں کی لبالب بھری ہوئی تجوریوں میں اور اضافہ کر دیں؟ ہم نے "نیا کشمیر" کا منشور پیش کر کے

اپنا عندیہ بخوبی واضح کر دیا تھا کہ اگر کبھی نیشنل کانفرنس اقتدار میں آگئی تو ہم کاشتکاروں کو بلا معاوضہ زمین واپس لوٹا دیں گے۔ اور جاگیرداری و چکداری کا خاتمہ کر چھوڑیں گے۔ اس لئے ہم نے پہلے ہی عوام اور استحصالی طبقوں کو اِن اصلاحات کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ لیکن ہندوستان میں ابھی اس قسم کی کوئی سوچ نہیں ابھری تھی۔

اس ریاست کے استحصالی طبقے اور مرکز میں اُن کی پیٹھ ٹھونکنے والوں نے ہماری ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا۔ سردار پٹیل نے تو خاص طور پر اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کا ایک بڑا کارن تھا کہ ریاست کے ہندو جاگیرداروں نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ہم سب کچھ مذہبی تعصب کی بنا پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان اصلاحات کی زد زیادہ تر غیر مسلم جاگیرداروں پر پڑتی ہے۔ میں نے سردار کو اعداد و شمار کے آئینے دکھا کر یہ اطمینان دلانے کی کوششیں کیں کہ ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال اس معاملے میں نہیں آتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہندو جاگیرداروں کے دوش بدوش مسلمان جاگیردار بھی اُن کی زد میں آتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ لیکن سردار کی ضد راج ہٹ کے مانند تھی اور وہ برابر اِن اصلاحات کی مخالفت کرتے رہے البتہ جواہر لال اور مولانا ابوالکلام اِن اصلاحات کو پسند کرتے تھے اور ان کے حق میں تھے۔ مقامِ شکر ہے کہ ہم ابھی ہندوستان کے آئین کے بندھنوں اور موشگافیوں میں اسیر نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے ہم مرکز کی رضامندی کے پابند نہیں تھے۔ میں نے لال چوک کے ایک بڑے اجتماع میں اس فیصلے کا اعلان کیا اور زرعی اصلاحات نافذ ہو گئیں۔ اِن کے نفاذ سے لکھو کھا مظلوم اور بے سہارا کاشتکاروں کی غلامی کی زنجیریں آنِ واحد میں کٹ کر رہ گئیں۔ رات کو جو کاشتکار ایک غلام کی حیثیت سے سو گیا تھا، صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اُس نے اپنے آپ کو زمین کے مالک کی شکل

میں پایا۔ بہت سے کاشتکاروں پر ایسی ذہنی کیفیت طاری رہی کہ اُنھیں کئی دِن تک باور نہ آیا کہ ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی یہ اپنی نوعیت کا بڑا ہی عہد آفریں تجربہ تھا۔ اِن اصلاحات پر عمل درآمد کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میری کابینہ کے چند ساتھیوں نے اس سلسلے میں لیت و لعل اور ٹال مٹول کی پالیسی اپنانی چاہی تھی۔ لیکن میں نے ان کو عملی جامہ پہنانے کا پکا اِرادہ کر لیا تھا۔ اس لئے میں مضبوطی سے قدم اٹھاتا گیا اور حق یہ ہے کہ منشیر مال کی حیثیت سے مرزا محمد افضل بیگ نے بھی اِس سلسلے میں قابلِ تعریف کام کیا۔ کشمیر میں سود خواروں، 'وڈداروں' اور مہاجنوں کے علاوہ حکومت نے بھی ایسے قرضوں میں دیہاتیوں کو بال بال جکڑ رکھا تھا۔ جو ہر سال ادائیگی کے بعد سود مرکب کے طفیل پھر اپنی اصل حد تک آجاتے تھے۔ کئی صورتوں میں قرضہ لینے والوں نے اصل رقم سے کئی گنا زیادہ رقم ادا کی تھی مگر پھر بھی اُن کے سر پر قرضے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر مقروض نے اصل رقم سے ڈیڑھ گنا زیادہ بطور اقساط نقدی و جنسی ادا کر دیا ہو تو باقی قرضہ کالعدم تصور کیا جائے گا۔ ان اصلاحات کو عدالتوں کے دائرے سے باہر رکھا گیا اور ڈیٹ ریکونسلیشن بورڈ DEBT RECONCILATION BOARD مقرر کر کے اُن کا فیصلہ اُس کے دائرہ اختیار میں رکھا گیا۔ ان بورڈوں میں وکیل پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی تاکہ قانونی گورکھ دھندوں میں اِنصاف کو اُلجھا کر فیصلے کو طوالت کی نذر نہ ہونے دیا جائے۔ جس حوصلے اور ولولے کے ساتھ میں نے ان اِصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں تعجیل کی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات فطری تھی کہ بعض استحصالی عناصر میرے دُشمن بن جائیں۔ لیکن ایسا ہونا میرے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ان عناصر کا جال سرینگر اور جموں سے ہوتا ہوا دہلی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ دہلی میں بیٹھے ہوئے اربابِ اقتدار کے کانوں

میں میرے خلاف زہر گھول دینے میں اور بھی زیادہ سرگرم ہو گئے۔ اور مجھے ایک فرقہ پرست کے روپ میں پیش کرنے کے لئے نئے نئے سوانگ رچاتے رہے۔ سردار پٹیل کی کوٹھی ایسے عناصر کی آماجگاہ بن گئی اور مجھ پر ان کی تیر اندازی کی کمیں گاہ۔

بیگار ریاست میں ایک ایسی بدعت تھی جس نے شہر و دیہات میں وحشت کا عالم طاری کر دیا تھا۔ اِس ظالمانہ رواج کی نذر ہزاروں کشمیری اسکردو' بھونجی' اور لداخ کے دشوار گذار علاقوں میں ہو گئے تھے۔ اور اس سے نجات حاصل کرنا انھیں ناممکن نظر آتا تھا۔ میری حکومت نے بیگار کا نہ صرف خاتمہ کر دیا بلکہ اُسے غیر قانونی بھی قرار دیا۔

میری ایک اور بدقسمتی یہ تھی کہ کشمیر سب سے پہلی ریاست تھی جہاں میں نے موروثی حکمران کے خلاف ۱۹۳۱ء میں تحریک شروع کی تھی۔ اتفاق سے یہاں کا راجہ ہندو تھا۔ اس لئے کشمیر کو نہ معلوم کس پیمانے سے ہندو ریاست سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہاں پچاسی فیصدی زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ کوئی تحریک جو صحیح معنوں میں عوامی تحریک ہوتی مسلمانوں کی شمولیت کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ لہٰذا مہاراجہ اس کے حواریوں اور بھائی بندوں نے ہماری تحریک کو فرقہ پرستی کا نام دے کر بدنام کرنا چاہا۔ چونکہ کشمیر میں سو ڈیڑھ سو سال غیر مسلم حکمران برسرِ اقتدار رہے تھے لہٰذا مسلمانوں کی حالت ایک محکوم مقہور اور مظلوم طبقے کی سی تھی۔ ان کو جملہ حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ حکومت کے نظم و نسق میں ان کا تناسب صفر کے برابر تھا۔ تعلیم میں وہ سب سے زیادہ پسماندہ تھے ــــ اور تجارت میں بھی وہ پچھڑے ہوتے تھے۔ الغرض ان کی حالت گونگے اور بے زبان مویشیوں سے بہتر نہ تھی اور سر البین بیزجی نے ان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ ہو بہو درست تھا۔

اس لئے جب ملک آزاد ہوا اور ہم نے حکومت سنبھالی تو مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانا ہمیں انصاف و مساوات کا منطقی اور منصفانہ تقاضہ معلوم ہوا لیکن ہندو طبقے کے لوگ جو حکومت پر چھائے ہوئے تھے اس تبدیلی کو اپنی اجارہ داری پر حملہ تصور کرنے لگے۔ انھیں اپنے موقف کی کمزوری کا احساس تھا۔ اسی لئے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے بے تحاشہ شور مچانا شروع کیا تاکہ اس گڑگڑاہٹ میں اصل مسئلے کے خدوخال چھپ جائیں۔ انھوں نے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ اس تبدیلی کے اثرات اور حقائق کو پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سردار پٹیل نے کئی بار اس بارے میں ہم سے استفسار کیا۔ جب ہم نے ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے ملازموں کے اعداد و شمار اور ان میں مختلف فرقوں کے لوگوں کا تناسب الگ الگ کر کے انھیں دکھایا تو وہ سناٹے میں آگئے۔ وہ بولنے لگے کہ شکایت تو مسلمانوں کو ہونی چاہیئے تھی لیکن سر پر آسمان اُٹھاتے ہیں ہندو لوگ۔ میں نے جواب میں کہا کہ شاید ہندو اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ مرکز صرف اُن کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کے دل اور دروازے دونوں بند ہیں۔ سردار یہ سن کر صرف مسکرا کر رہ گئے۔

جہاں تک ملازمتوں کے شعبے کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا تناسب آج بھی اُن کی آبادی کے توازن سے بہت کم ہے۔ یہ عدم مساوات اُن محکموں میں بہت ہی نمایاں ہے جو براہ راست مرکز کے ماتحت ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی سیکولر شبیہ کے لحاظ سے انھیں سیکولرازم کا جھروکہ درشن SHOW WINDOW ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن حالات میں کسی بہتری کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ہم بار بار مرکزی حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ریاست کے مسلمانوں کے لئے یہ بات مشکل بن جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیکولرازم کے دعووں پر اعتماد کر لیں۔ وہ جب دعویٰ اور عمل میں زمین و آسمان کی تفاوت پاتے ہیں تو اُن کی نفسیات میں کچھ ایسی گرہیں پڑ جاتی ہیں جو قومی احساس کے لئے ہرگز مفید اور معاون نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دعوے اور عمل کا

یہ فرق ہندوستانی راہنماؤں کا سب سے بڑا المیہ رہا ہے اور اُنھوں نے کئی بار خود بھی اس کے مہلک عواقب کا اعتراف کیا ہے۔

ایک اور انقلاب آفرین اِقدام جس نے ہماری تحریک کے مقاصد کو مُنفرد کیا، لیکن میرے دشمنوں کی صفوں میں کئی گنا اِضافہ کر دیا کشمیر کے موروثی راجواڑے کا خاتمہ تھا۔ ہم نے ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد اس خاندان کے چنگل سے کشمیر کو چھڑایا تھا۔ جس کی زیادتیوں نے کشمیریوں کو غلاموں سے بدتر حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

یہ زمانہ اگرچہ بڑی آزمائش اور آشوب کا تھا لیکن کشمیریوں میں کوئی چار صدیوں کے بعد پہلی بار آزادی کی کرنیں دِلوں کی مُرجھائی ہوئی کونپلوں کو پھر سے شگفتہ کر رہی تھیں۔ پہلی مرتبہ ایک وزیرِاعظم دور دراز دیہات کا دورہ پیدل یا گھوڑے کی پیٹھ پر کرتا دیکھا جاتا تھا۔ وہ اُن سے گھل مِل جاتا۔ اُن کی زبان میں اُن سے باتیں کرتا اور اُن کو شگفتہ جبینی پر اُبھارتا۔ دہلی سے رقومات جلنا اُن دنوں بہت آسان نہ تھا۔ ایک تو خود وہ تقسیم کے زخموں کو چاٹ رہی تھی دوسرے وہاں کی بیوروکریسی کو کشمیر کے مستقبل کے متعلق اندیشہ ہائے دور دراز لاحق تھے۔ لہٰذا وہ لالہ جی کی کاروباری ہوشیاری کے ساتھ روپے پیسے کے معاملے میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہے تھے۔ اِدھر ہم بھی کشمیر کو اِس حد تک زیرِ بارِ احسان نہیں کرنا چاہتے تھے کہ پھر سیاسی اور بُنیادی مسائل پر ہماری آزادیٔ گفتار اور رخِ کلاہی پر کوئی آنچ آئے۔ ہم کشمیریوں میں خود کفالت، قُربانی اور محنت کی عادت ڈالنا چاہتے تھے۔ جس سے انھیں عارضی طور پر ضرور تکلیف ہوتی لیکن اُن کا کردار بھی سانچے میں ڈھل جاتا اور آخری نتیجے کے طور پر بھی اُن کی دائمی اور دیرپا نجات اور خوش حالی کا ضامن ہوتا ——— ہم یقینی طور پر کسی حد تک نامرغوب راستہ

اِختیار کر رہے تھے۔ اور پاکیزگی و دیانت کو بے ایمانی اور بددیانتی پر ترجیح دے رہے تھے لیکن محبِ وطن اور کشمیر کی تقدیر سے سچی اور بڑی وفاداری کا تقاضا یہی تھا۔ یہ صرف میری لن ترانی نہیں تھی۔ علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں شاہ ہمدانؒ کی زبانِ مبارک سے یہی مجربِ نسخہ کشمیریوں کے لئے تجویز کیا تھا۔ ؎

بندۂ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر
بزمِ با دیو است آدم را وبال
رزمِ با دیو است آدم را جمال

گزشتہ ۱۹۵۳ء کے بعد ذاتی اغراض کے متوالوں نے کُھلی ڈھیل چھوڑ کر اپنے لئے سستی مقبولیت کا کُھل جا سِم سِم دریافت کر لیا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اُن کی سستی مقبولیت فریب سے زیادہ ثابت نہ ہوئی اور وہ بعد میں عوام کے غم و غصے کی لہروں میں تنکوں کی طرح بہ گئے۔ اسی طرح اُنھوں نے جلد بازی اور کونے کاٹنے SHORT CUTS کے جو حل پیش کئے تھے اُنھوں نے بھی ریاست کی پائیدار خوش حالی کا راستہ ہموار نہیں کیا بلکہ کردار کی تباہی کے ساتھ ریاست کے لئے ایسے مصائب اور مسائل کا انبار چھوڑ گئے جس کے کانٹے قوم کو اب برسوں سے نوکِ مژگاں سے نکالنے پڑ رہے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء کے اس دور کی کچھ اہم کامیابیوں کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے:۔

۱۔ موروثی حکمرانی کا خاتمہ کیا گیا۔ ریاست کے آئینی سربراہ کی تقرری چناؤ کے ذریعہ کرانی طے پائی۔ چنانچہ ماہرین نے کشمیر کو بجا طور پر وفاق کے اندر وفاق ——— REPUBTIC WITHIN A REPUBLIC سے موسوم کیا ہے۔ ہری سنگھ کشمیر کو

چھوڑ کر ایسے چلے گئے کہ پھر انھیں یہاں کا رُخ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

ب۔ ریاست کے جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کر کے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی اور جاگیرداروں وغیرہ کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ سالہا سال کے قرضے معاف کر دیے گئے۔

ج ، کشمیر میں پہلی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سرکاری بجٹ کا ۳۵ فیصد حصہ تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دیا گیا۔

(د) کشمیر میں چار صدیوں کے بعد کشمیریوں پر مشتمل فوج نیشنل ملیشیا کا قیام عمل میں لایا گیا اور انھیں اسلحہ رکھنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔

(س) ریاستی انتظامیہ میں پہلی بار ریاستی باشندوں کو کلیدی عہدوں اور گزیٹیڈ اسامیوں میں بڑا حصہ ملا۔ جن میں مسلمانوں کی ایک اچھی تعداد بھی شامل تھی۔ انھیں ۱۸۱۹ء یعنی کشمیر میں سکھ شاہی کے آغاز سے خال خال ہی کسی اہم اسامی پر تعینات کیا جاتا تھا۔

(ش) کشمیری زبان کے لئے اس کے مخصوص لہجے اور ضروریات کے مطابق ایک ایسا رسم الخط اختراع کیا گیا جو ٹائپ میں آسکتا تھا اور سکولوں میں کشمیری اور ڈوگری زبان میں تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد یہ اقدام بھی نئی حکومت کی کوتاہ بینی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اور جو لاکھوں نصابی کتابیں ہم نے چھاپ دی تھیں انھیں ردی کے مول بیچ دیا گیا۔

(ص) جو تارکین وطن ۱۹۴۷ء میں جان کے لالے پڑنے پر سرحد پار کر کے بھاگ گئے تھے انھیں واپس لا کر ان کی بحالی کا کام شروع کیا گیا۔ انھیں تقاوی قرضے دیے گئے اور ان کی آبادکاری کے لئے خاص عملہ مہیا کیا گیا۔

(ن) کشمیر اپنے ہنرمندوں کی محنت اور عرق ریزی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور رہا ہے یہاں کے کاریگروں کی انگلیوں میں حُسن اور خوبصورتی کے چمن زار آراستہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ اُن کے بنائے ہوئے شال دوشالے۔ قالین، چوب کاری، پیپر میشی، سونے اور چاندی کے جڑے ہوئے ظروف وغیرہ ساری دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ لیکن خود یہ کاریگر کارخانہ داروں اور درمیانہ داروں کے استحصال کا نشانہ بن کر عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں ہم نے انھیں استحصالیوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم کا قیام عمل میں لایا۔ اور اس کا دفتر اس عالی شان عمارت میں رکھا جہاں کبھی برطانوی حکومت کا ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کشمیر کو ہندوستان کے آئینی ڈھانچے میں دفعہ ۳۷۰ کے تحت عزت و آبرو کا مقام دلانے میں کامیابی حاصل کر لی گئی جس کے تحت اسے ہندوستان کی مجموعی سرداری کے چوکھٹے میں اپنا ذیلی آئین اپنا ذیلی پرچم اور اپنی ذیلی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا حق حاصل ہوا۔ ان بیشتر کامیابیوں کا مغز ۱۹۵۳ء کے بعد نکال کر دلّی کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کی گئی۔ اور کشمیری عوام کو بہلانے کے لئے صرف ان کا خول ہی خول باقی رہنے دیا گیا۔

ہم نے اُس وقت خود کفالت کے بارے میں کتنی زبردست کوششیں کیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نے ریاست میں زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے پر زور دیا تاکہ ہم کسی پر بوجھ نہ بننے پائیں۔ اُن دنوں میں خود ایک وقت مکئی کا روٹی جسے کشمیری میں "مکایہ واٹھ" کہتے ہیں کھایا کرتا تھا۔ تاکہ عوام کو بھی اپنی خوراک میں تنوع پیدا کرنے کی عادت پڑ جائے

اور وہ صدیوں کی روایتی خوراک کے قیدی بن کر نہ رہ جائیں۔ میں نے لوگوں کو یہ مشورہ دینے سے بھی گریز نہیں کیا کہ اپنی گردن اونچی رکھنے کے لئے اگر انہیں آلو جو غذائی لحاظ سے کسی دوسری غذا سے پیچھے نہیں ہیں کھانا پڑیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں یار لوگوں نے اس کا افسانہ بنا دیا۔ بخشی صاحب نے رعائتی نرخوں پر چاول مہیا کرنے کی بدعت شروع کردی اور وہ لوگوں کو برسرِ عام تلقین کرتے گئے کہ اگر وہ آدھ سیر چاول کھانے کے عادی ہیں تو اب سے ڈیڑھ سیر کھانا شروع کردیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کشمیریوں کی فاقہ مستی کا کھُلم کھلا مذاق اُڑانے کے مترادف تھا۔ اور اُن کی حمیت کو سُلا کر اُن کی شکم پرستی کو اُبھارا جا رہا تھا۔ بھلا ایسے قومی شعور سے عاری لوگ اگر مجھ پر پھبتیے اڑاتے رہے تو میں اقبالؔ کا یہ شعر دُہرانے کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا ؎

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

بعد میں خوراک کی اِس امداد (سب سڈی) نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ یہ ہمارے خزانے کا ایک بھاری حصّہ ہڑپ کرتی رہی اور دوسری طرف سارے ملک میں کشمیریوں کو چاول کی خیرات لینے کے طعنے دیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ خوراک اور دوسرے میدانوں میں خود کفالت حاصل کرنے کا سارا خواب درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انڈے سے لے کر بینگن بلکہ چائے تک ہر ایک چیز کے لئے ہمیں بیرونِ ریاست کی منڈیوں کی طرف ہاتھ پھیلانے پڑے۔

اس کے علاوہ میں نے اُنہی دنوں عوام کو اپنا کنبہ محدود رکھنے کے ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی تاکہ اُنھیں عیالِ کثیر کی جلت اور ملک کو آبادی کے دھماکے

کی مصیبت کا شکار نہ ہونا پڑے۔

لیکن میری گرفتاری کے بعد اس نظریے کو میری تعریض اور تضحیک کا ذریعہ بنایا گیا۔ حالانکہ بعد میں خود مرکز نے اس کی اہمیت کا احساس کر کے اِسے ترجیحی پروگراموں میں شامل کر لیا۔ ؎

کبھی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی
کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا

▲▲▲

۴۵

سازشوں کے سائے

ہندوستان کی فضا کو میری ذات کے خلاف مسموم بنانے کے لئے جو مہم چلائی جا رہی تھی اس کی پشت پر جو وجوہات تھیں اُن پر ایک نظر ڈالنا کشمیر کی سیاست کی پیچیدگیوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے لازمی ہے۔ سب سے پہلی بات جو میرے مخالفین کو کھلتی تھی یہ تھی کہ میں کشمیر کی تحریکِ حریت کا بانی ہوں اور صدیوں کے بعد میں نے یہاں کی مستِ خواب آبادی کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کیا ہے۔ اتفاق سے جاگنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی اور حکمران طبقہ ہندو تھا۔ اس لئے بہت سے ہندو پہلے دن سے اس صورتِ حال کو پسند نہ کرتے تھے اُنھوں نے نہ صرف میرا ساتھ نہ دیا بلکہ مجھے اپنا دشمن تصوّر کر لیا۔ اِس بات کا ثبوت پنجاب اور دہلی کے ہندو اخبارات کے صفحات پیش کرتے ہیں جو ۱۹۳۱ء سے آج تک کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی مسئلے پر میرے خلاف زہر اُگلتے رہے ہیں۔ بعض اوقات میرے اقدامات سے میرے مسلمان بھائی بھی خوش نہ ہو سکے لیکن اِن اخبارات پر تعصب کی ایسی عینک چڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھی اِسے میری چال ہی سمجھتے رہے۔ یہ ان اخبارات کا قصور نہیں بلکہ اس ذہنیت کا کرشمہ ہے جس کی یہ ترجمانی

کرتے ہیں۔ ایک اور امر جس نے ہندو فرقہ پرستوں کو مجھ سے بدگمان کر دیا تھا یہ تھا کہ میں نے آزادی کے بعد کچھ ایسی اصلاحات کو نافذ کر دیا جن سے سوءِ اتفاق سے حکمران طبقے کے استحصال عناصر پر زد پڑی اور اُن کا زیادہ تر فائدہ محض اتفاق سے اکثریتی طبقے کو ملا۔ یہ اور بات ہے کہ اُن سے مستفید ہونے والوں میں لاکھوں ہریجن اور دوسرے غیر مسلم بھی تھے۔ چونکہ وہ لوگ نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور خاموش تھے اس لئے ہندو فرقہ پرستوں کی نگاہ اُن کی طرف نہیں گئی۔ ایک اور بات یہ تھی کہ غیر منقسم ہندوستان کی ریاستوں کو عام طور پر اُن کی آبادی کی ترکیب کی بجائے اُن کے حکمرانوں کے مذہب کی بنا پر بانٹ دیا گیا تھا اور اسی حوالے سے اُنھیں ہندو، مسلمان یا سکھ ریاستوں کی ذیل میں شمار کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے عوام کی بھاری اکثریت اگرچہ ہندوؤں کی تھی لیکن مسلمان اُسے ایک مسلم ریاست ہی تصوّر کرتے تھے۔ اِس کے برعکس ریاست جموں و کشمیر کی پچاسی فیصدی سے زیادہ آبادی اگرچہ مسلمان تھی لیکن ہندو اسے ایک ہندو ریاست ہی مانتے تھے۔ باقی ریاستوں کا حال بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ ریاست کشمیر میں مطلق العنانیت کے خلاف جو جنگ میں نے شروع کی تھی وہ راجہ کی ذات کے خلاف نہ تھی بلکہ ایک نظام کے خلاف تھی۔ لیکن اس کو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ یہ صورت ہندوؤں تک محدود نہیں تھی بلکہ مسلمان بھی اس کا شکار تھے۔ اور میں اس سلسلے میں مولانا غلام رسول مہر کا وہ واقعہ بیان کر چکا ہوں جب اُنھوں نے کشمیر کی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں سے ہندو مہاراجا کا اقتدار ختم ہونا چاہیے۔ لیکن میرے ٹوکنے پر کہ پھر ایسا ہی معاملہ حیدرآباد میں بھی پیش آنا چاہیے وہ بول اُٹھے تھے کہ حیدرآباد کی بات دوسری ہے۔ ہم اس کے لئے کئی کشمیر قربان کر سکتے ہیں۔ کچھ متحرّز لوگ ضرور اس سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً گاندھی جی اور جواہر لال۔ لیکن گاندھی تو دوسری

اِنتہا کو گئے تھے۔ اور انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا "چونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لہٰذا اسے پاکستان میں جانا چاہیے"۔ میں نے چونکہ ایک ہندو حکمران کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت دکھائی تھی اِس لئے ہندو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے کھٹکتا ہوا خار بن کر رہ گیا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی بد اعتمادی کی فضا اس قدر بنی ہوئی تھی کہ ہر مسلمان کو ہندوستان میں شک و شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ میری بساط کیا ہے۔ مولانا آزاد جیسی عظیم المرتبت ہستی کو بھی اس الزام سے مبرّا نہیں رکھا گیا۔ اِسی کارن میرے ہر اقدام کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی خاندانی حکومت کا خاتمہ اس نظام کی چھاؤں میں پلنے والے ایک بڑے طبقے کے مفادات پر چوٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بھلا وہ مجھے اِس اقدام کے لئے کیوں مرحبا کہتے۔ لہٰذا انھوں نے ریاست میں میرے خلاف فضا بنانے کے لئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ اِنہی عناصر نے ہندوستان کے فرقہ پرستوں سے گٹھ جوڑ کر کے جموں میں پرجا پریشد کی تحریک کو اکسایا اور "ایک ودھان، ایک نشان اور ایک پردھان" کے نعرے کو اپنا طبلِ جنگ بنا لیا۔ وہ اِس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ مہاراجہ کے خاندان کو راج سنگھاسن پھر سے سونپ دینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا چلتر چلا کر کشمیر کے مسلمانوں کو اب بھی مغلوب رکھا جا سکتا ہے۔ میں اُن کے اِس منصوبے کی راہ میں چٹان بن کر حائل تھا اور اس لئے وہ مجھے ہی میدان سے ہٹانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کر رہے تھے۔ میرے مخالفین کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز ہو گئیں کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اقتدار کے مرکز سے ہٹا دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس آزمودہ کار نسخے کو استعمال کرنا شروع کر دیا گیا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ انھوں نے اخلاقیات کے اصولوں کو فراموش

کر کے* چانکیہ نیتی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے میرے قریبی ساتھیوں پر ڈورے ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بخشی غلام محمد میرے سب سے قابلِ اعتماد ساتھی اور نائب تھے۔ اور میرے بعد ان کا دوسرا درجہ تھا۔ اُنھوں نے بخشی کی فطرت کی کمزوریوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ سردار پٹیل نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرنا اور اُن کی پیٹھ پر تھپکی دینا شروع کیا۔ اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اُنھیں روپے پیسے سے مالا مال کر دیا گیا۔ ان کے بھائی بندوں کو فوج میں بھاری مالیت کے ٹھیکے الاٹ کئے گئے۔ ایسا نفسیاتی ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی جس میں بخشی صاحب کو یہ باور ہو جائے کہ کشمیر کی حکومت کے روحِ رواں وہی ہیں اور اُن کی ہی بدولت یہاں کا کاروبارِ مملکت چلتا ہے۔ خوشامد کا کارگر ہتھیار بھی استعمال کیا گیا۔ بخشی صاحب کو "مردِ آہن" کا خطاب دے کر ان کا دماغ خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُدھر میں بخشی غلام محمد کی کچھ خوبیوں کا قائل اور قدردان تھا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اُن سے محبت بھی کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اُن کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کی شاخ تراشی کر کے اُن کے مثبت پہلوؤں کو اُبھارنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں کبھی کبھی سرزنش اور کبھی دوستانہ مشورے کی صورت میں اُنھیں ان کمزوریوں کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ بخشی صاحب تھے بڑے زمانہ ساز آدمی۔ وہ کبھی مجھ سے نہیں اُلجھتے تھے۔ اور ہمیشہ سر جھکا کر میری باتوں کو ایسے سنتے جیسے واقعی انھیں اپنے کئے پر افسوس ہو رہا ہو اور وہ اب آئندہ کے لئے احتیاط کرنے کا پیمان باندھ رہے ہوں۔ اُن کی یہ ادائیں ایسی تھیں کہ کئی بار اُن کی غلطیوں پر کارکنوں اور عوام نے میرے سامنے شکایت بلکہ احتجاج کیا۔ لیکن میں اُن سے درگذر کرتا رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اُن کی عادات بدلنے میں کامیابی کا جو خواب دیکھ رہا تھا وہ میری سادگی اور حسنِ ظن

سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ اُلٹا یہ ہوا کہ اُن کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کا پلڑا روز بروز زیادہ بھاری ہوتا گیا اور اُن کو شاباش کہنے والے اُنھیں اور زیادہ بگاڑتے رہے۔

جواہر لال کے ساتھ اگرچہ میرے مراسم بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے اور وہ میری بے حد عزت کرتے تھے لیکن کچھ ایسی ہوا چلی کہ وہ بھی بخشی صاحب کی پیٹھ ٹھونکنے لگے۔ چنانچہ ایک بار ایک اہم معاملے کے متعلق جواہر لال نے مجھے خط لکھا اور خط کے آخر میں یہ معنی خیز جملہ لکھ دیا کہ میں اس خط کی ایک نقل بخشی غلام محمد کو بھی بھیج رہا ہوں۔ میں اس پر بہت حیران ہوا۔ میں نے جواہر لال سے احتجاج کیا اور انھیں لکھا کہ یہ طریقِ کار نہ درست ہے اور نہ ہی حق بجانب۔ اگر اُن کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا ہے تو انھیں داؤ کھیلنے کی ضرورت نہیں۔ میں اقتدار سے خود دستبردار ہوتا ہوں۔ وہ بخشی غلام محمد یا کسی ایسے شخص کو جس پر وہ پورا اعتماد کرتے ہوں ریاستی حکومت کا سربراہ بنا سکتے ہیں۔

جواہر لال پر میرے اس خط کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے جواب لکھا کہ وہ کشمیر میں صرف شیخ محمد عبداللہ کو جانتے ہیں اور یہ کہ میرے اندیشے درست نہیں ہیں۔ لیکن حالات کچھ اور ہی کروٹ لے رہے تھے۔ اس قسم کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں کہ بہت جلد کچھ ہونے والا ہے چنانچہ ایک مرتبہ صادق صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ بخشی صاحب اور چند ساتھیوں کی ایک خفیہ میٹنگ میں اس بات پر غور کیا گیا ہے کہ مجھے گرفتار کیا جائے اور اس طرح وزارتی انقلاب بپا کر دیا جائے۔ میں نے بخشی غلام محمد، خواجہ غلام محمد صادق، مرزا محمد افضل بیگ اور مولانا محمد سعید مسعودی کو اپنے گھر بلایا۔ اور اس راز کا افشا کیا۔ اس پر بخشی صاحب نے پوچھا کہ آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے؟ میں نے صادق صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے صادق صاحب کو اعترافِ حق کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور وہ اپنے کہے ہوئے سے مُکر گئے۔ اس پر میں نے

اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چاہے ایسی میٹنگ ہوئی ہو یا نہ لیکن میں یہ بات کافی دیر سے سُنتا آیا ہوں کہ آپ لوگ مجھے وزیرِ اعظم کے عہدے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ بخشی صاحب اپنے مخصوص انداز میں بولے کہ کون ہے وہ جو ایسا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ملائمت مگر مضبوطی سے جواب دیا کہ "آپ" بخشی صاحب اس پر بڑے سٹپٹائے اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور وہ دنیا بھر کی قسمیں کھا کر کہنے لگے کہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ان کی قسموں میں اس قدر شدّت تھی کہ میں چُپ ہو گیا۔ بلکہ اُن سے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو جانے دیجیے۔ لیکن آئندہ اگر ایسا خیال آ جائے تو گرفتاری کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مجھ سے برملا کہہ دیجیے۔ میں خود ہی کسی دوسرے کے لئے جگہ خالی کر دوں گا لیکن جس کسی کو بھی آپ نامزد کریں اُس کے ہاتھ پر سب کو حلفِ وفاداری لینا چاہیے۔ میں نے پیش کش کی کہ اس قسم کا حلف سب سے پہلے میں اُٹھاؤں گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ کی خواہش یہ ہو کہ میں سیاسی میدان سے بالکل ہی علیحدگی اختیار کروں تو میں ایسا کرنے کے لئے بھی تیار ہوں تاکہ جماعت میں انتشار پیدا نہ ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ نااتفاقی اور انتشار قوم کی موت کے مترادف ہو گی اور میں اس کا ہرگز روادار نہیں۔

مجھے نیچا دکھانے اور میرے مخالفوں کو مہمیز کرنے کے لئے جواہر لال کے پرائیوٹ سیکریٹری پنڈت دوارکا ناتھ کاچرو پیش پیش تھے۔ وہ کشمیر میں ایک متبادل لیڈرشپ کے اُبھار اور اُس کے لئے فضا ہموار کرنے کے لئے دن رات ایک کر رہے تھے۔ ایک اور کشمیری پنڈت کاشی ناتھ بامزئی اس ناٹک کے ایک اور اداکار تھے۔ اُن کو میری سفارش پر مرکز میں انفارمیشن سروس کے ایک بڑے عہدے پر تعینات کیا گیا تھا لیکن وہ اب میرے بیری بن گئے تھے۔ ایک اور شخص جو جبر و گنجے میں میرے خلاف زہر افشانی کرتا رہتا

تھا بریگیڈیئر بی ایم کول تھا۔ کول ایک پرانا کشمیری پنڈت تھا اور نہرو خاندان میں اُس کی رسائی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں اودھم پور میں ایک بریگیڈیئر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ اُس کے تحت سپاہیوں نے چند گوجر عورتوں کو اغوا کیا۔ مجھ تک معاملہ پہنچا۔ میں نے کول کو ریاست سے باہر بُلانے کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو میں اُس کو جیل بھیج دوں گا۔ اگرچہ چند فوجی آفیسروں نے میری کافی منت سماجت کی لیکن میں نہ مانا۔ اُنھیں کول کو واپس بُلاتے ہی بنی اور اس طور پر وہ میرے درپے آزار ہو گیا۔ اِس صورتِ حال کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ میرے مخالفین کو معلوم تھا کہ میرے خلاف فرقہ پرستوں کی چالیں اس وقت تک کامیاب نہیں رہ سکتیں جب تک جواہر لال نہرو اور میرے درمیان ذہنی اور جذباتی فاصلے حائل نہیں ہو جاتے۔ اِس لئے میرے مخالفوں کا تمام زور پنڈت جی کو میرے خلاف بدظن کرنے پر مرکوز ہو گیا۔ حملے کا منصوبہ بڑی زیرکی اور ہوشیاری سے ترتیب دیا گیا۔ پنڈت جی پر براہِ راست اثر ڈالتے ہیں کچھ موہوم اندیشے اور خطرات درپیش تھے۔ اس لئے اُنھیں گھیرے میں لانے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ کوشش یہ کی گئی کہ اُن کے گرد جو مصاحب اور قابلِ اعتماد لوگ تھے اور جو اُن کے مزاج میں دخل رکھتے تھے، اُن کو کسی نہ کسی طرح قابو میں لایا جائے اور پھر اُن کے ذریعہ پنڈت جی کو رام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کھیل میں پنڈت جی کے خاندان کے افراد بلکہ اُن کے نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کو بھی بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا گیا۔ پنڈت جی کے قرابت داروں کے کانوں میں مجھے بیٹھے کسی نہ کسی بہانے میرے خلاف کوئی بات ڈال دی جاتی تھی اور کشمیری کہاوت کے مُطابق "بات بات سے پہاڑ تک بن جاتے ہیں"۔ پنڈت جی تو خیر بشر تھے۔ سردار پٹیل تو جانتے تھے کہ مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔ اُنھیں اِس کا بھی علم تھا کہ میرے اور جواہر لال کے تعلقات کس قدر قریبی ہیں۔ اُنھیں ہماری یہ قربت ایک آنکھ

نہیں بھاتی تھی کیونکہ اُن کی جواہر لال سے چشمک ہی نہیں بلکہ باقاعدہ رقابت موجود تھی۔ سردار پٹیل اپنی جگہ یہ سمجھتے تھے کہ عمر اور کانگریس سے وابستگی کے لحاظ سے ہندوستان کا پہلا وزیرِ اعظم بننا اُن کا حق تھا۔ لیکن گاندھی جی نے جواہر لال کو اپنا نائب اور جانشین قرار دے کر اُنھیں اِس جائز حق سے محروم کر دیا تھا۔ گاندھی جی سے وہ تقسیمِ ہند سے پہلے بہت قریب تھے۔ اور اپنے آپ کو گاندھی جی کا آدمی سمجھتے تھے۔ لیکن تقسیمِ ملک کے بعد اُن کے گاندھی جی سے اختلافات ہونے لگے۔ خاص طور پر فرقہ وارانہ معاملے میں گاندھی جی اُن کے رویے سے بیزار ہو کر جواہر لال کے زیادہ قریب آ گئے۔ اس حد تک کہ اپنے آپ کو گاندھی کا آدمی قرار دینے والے پٹیل اب گاندھی جی کو جواہر لال کا آدمی قرار دینے لگے۔ نظریاتی طور پر بھی اِن دو بڑے رہنماؤں کے درمیان بڑی خلیج موجود تھی۔ پنڈت جی کے سیاسی نظریات سردار سے بہت مختلف تھے۔ اس لئے سردار اُن لوگوں کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے جو جواہر لال کی قربت میں رہتے تھے۔ بلکہ وہ اپنی تمام تر طاقت صرف کر کے اُن کو مشکلات و مصائب میں پھنسانے کی ٹوہ میں لگے رہتے اور تب تک بس نہ کرتے جب تک کہ اُن کا تختۂ مشق اُن کے سامنے گھٹنے ٹیک نہ دیتا۔ سردار کے غیظ و غضب کے شکار جواہر لال کے بہت سے چاہنے والے ہو گئے جن میں جودھ پور ریاست کے ایک بڑے سیاسی لیڈر اور ہمارے قریبی دوست جے نرائن ویاس بھی شامل تھے۔ چنانچہ خود جے نرائن سے جب میں نے پوچھا کہ اُنھوں نے جواہر لال کا ساتھ کیوں چھوڑا تو اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کہ ہوم منسٹر کی حیثیت سے سردار نے اُنھیں کئی جھوٹے مقدمات میں اُلجھا رکھا تھا۔ میں اُن کی درد بھری کہانی سُن کر بڑا متاثر ہوا۔ لیکن جب میں نے جواہر لال سے فریاد کی تو اُنھوں نے کوئی مداوا نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود جواہر لال سردار پٹیل کے منہ لگنے سے گھبراتے تھے اور اُن کے دل میں چاہے کچھ بھی

جذبات کیوں نہ رہتے ہوں وہ تصادم اور ٹکراؤ کے مواقع کو ٹالنے کے ہی آرزومند رہتے۔ مجھے بھی سردار کی طبیعت کے اس رجحان سے واقفیت ہو چلی تھی اس لئے میرے لئے ایک ہی چارہ کار تھا کہ یا تو میں سردار کے سامنے سپر ڈال کر نجات حاصل کر لوں یا مختلف سازشوں کے چکر میں گرفتار ہو کر جیل خانے کی راہ دیکھوں۔

میرے ساتھ سردار نے اتنی دور جانے کی جرأت تو نہیں کی لیکن انھوں نے میرے برادرِ نسبتی کرنل غلام قادر عرف ہیری نائیڈو کو اپنے عتاب کے لئے چُن لیا۔ غلام قادر مہاراجہ ہولکر کے دربار میں وزیر تھے اور کافی عرصے سے ریاست اندور کے مہاراجا کی ملازمت سے وابستہ تھے۔ وہ مہاراجہ کے بہت قریب تھے۔ اور اُن کا امورِ سلطنت میں خاصا دخل رہتا تھا۔ سردار پٹیل کی ایما پر اُن پر یہ بہتان تراشا گیا کہ وہ مہاراجہ کے ہیرے جواہرات اور زیورات بیچنے کے لئے امریکہ جانے والا تھا۔ غلام قادر کو بہت پریشان و سراسیمہ کیا گیا۔ سردار نے اپنے سکریٹری وی۔ پی۔ مینن کو اندور بھیجا تاکہ وہ اِس معاملے کی تحقیق و تفتیش کرے۔ غرض اِس بات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا کہ وہ کسی نہ کسی اِلزام میں ماخوذ ہو جائے۔ بس یہ وہ سرکار کا یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ اس طرح مجھ پر دباؤ ڈالنے اور مجھے پریشان کرنے کا کوئی ذریعہ اُس کے ہاتھ لگے۔ لیکن بڑی جستجو کے باوجود کوئی بات ہاتھ نہ آسکی۔ البتہ میرے برادرِ نسبتی کا قافیہ اس قدر تنگ کر دیا گیا کہ وہ اِندور کو خیرباد کہنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ میں اُن دنوں اقوامِ متحدہ کے لئے ہندوستانی ڈیلی گیشن کے رُکن کی حیثیت سے نیویارک جانے والا تھا۔ میں نے سردار کی اس روِش پر پنڈت جی اور گوپالا سوامی سے زبردست احتجاج کیا۔ میں نے انھیں یہ چیتاونی بھی دی کہ اگر اس معاملہ میں اِنصاف سے کام نہ لیا گیا تو میں ڈیلی گیشن سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ شاید اِس وجہ سے

سردار کے بڑھے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ اگر میرا دباؤ نہ پڑتا اور سردار کو معلوم نہ ہوتا کہ ہندوستان کے لئے میری شمولیت کتنی اہم ہے تو وہ غلام قادر کو بڑے گھر کا مہمان بنا کر ہی دم لیتے۔

پنڈت جی کے اعصاب کو نرم بنانے اور اُن کو میری 'مخطرناکی' کا قائل کرنے کے لئے عجیب و غریب حربوں سے کام لیا گیا۔ ہوم منسٹر کی حیثیت سے سردار پٹیل جاسوسی کی مختلف ایجنسیوں کو کنٹرول کرتے تھے اُن دنوں مرکزی انٹلی جینس کا ایک دفتر سرینگر میں کام کرتا تھا۔ جس کا سربراہ محکمہ جاسوسی کا ایک افسر کرنل حسن والیہ تھا۔ بخشی صاحب ریاست کے ہوم منسٹر تھے۔ اُن کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ حسن والیہ ہمارے خلاف مرکز کو غلط سلط رپورٹیں بھیجتا رہتا تھا۔ بخشی صاحب نے ہی تجویز کیا کہ اس کو ریاست بدر کیا جانا چاہیے۔ میں نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور حسن والیہ کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر دفتر بند کرنے اور دہلی چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اِس واقعہ سے دہلی کے ایوانوں میں سنسنی پھیل گئی۔ لیکن آئینی لحاظ سے ہم پر اس بات کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ ہم سنٹرل انٹلی جینس کو ریاست میں کام کرنے دیں۔ اس لئے سردار ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اُنھیں غصّہ تو بہت آیا لیکن علاوہ وہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے جواہر لال سے اِس معاملے پر زبردست احتجاج کیا۔ معاملہ اتنا سنگین بن گیا کہ جواہر لال نے سردار کے ہی گھر پر اس سوال پر غور کرنے کے لئے ایک میٹنگ بلائی۔ ریاست کی طرف سے اس میٹنگ میں میرے علاوہ بخشی غلام محمد اور بیگ صاحب شریک ہوئے مرکز کی طرف سے جواہر لال کے ساتھ سردار پٹیل مولانا آزاد اور گوپالا سوامی آئینگر موجود تھے۔ سردار کی طبیعت اس روز ٹھیک نہ تھی۔ اس لئے وہ صوفے پر ٹیک لگائے لیٹے رہے۔ حسن والیہ کا معاملہ چھڑ گیا تو میں نے اُس کو ریاست بدر

کرنے کے حکم کا سارا پس منظر بیان کیا۔ اور کہا کہ الحاق کی دستاویز کی رو سے مرکزی انٹلی جینس ریاست میں کام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ محض اپنی وضعداری اور رواداری (COURTESY) کی بنا پر ہم نے اِس دفتر کو وہاں کام کرنے کی اجازت بخشی تھی۔ لیکن جب ہمیں محسوس ہونے لگا کہ یہ مرکز اور ہمارے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے کی بجائے تلخی پیدا کرنے پر تُلا ہوا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا ریاست میں وجود فائدہ مند ہونے کی بجائے ضرر رساں ثابت ہوگا۔ سردار بڑے ملال کے ساتھ بولے کہ میں نے جواہر لال سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم نے کشمیر میں ایک جوا کھیلا جس میں ہمیں مات ہوگئی ہے۔ اس لئے ہمیں کشمیر کو چھوڑ دینا چاہئے۔ لیکن جواہر لال ہیں کہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے ہندوستان کے عوام کے ساتھ رِشتہ جوڑا ہے، چند افراد کے ساتھ نہیں۔ اور اس رِشتے کی بنیاد بھی خیالات اور آدرش کی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے۔ کوئی مالی یا مادی فائدہ نہیں ہے۔ اگر آپ کو کشمیر کے ساتھ الحاق کرنا پسند نہیں اور آپ اپنے بیان سے پھر جانا چاہتے ہیں تو آپ کو سارے واقعات ہندوستان کے عوام کے سامنے رکھنے چاہئیں، ہم بھی اپنا کیس اُن کے سامنے پیش کریں گے اُس کے بعد اگر وہ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دینا پسند نہیں کریں گے تو ہم اپنا راستہ لے لیں گے اور آپ اپنا۔ میرے اس طرزِ کلام سے محفل میں سناٹا چھا گیا اور سبھی کے اعصاب تن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر سے رُخصت ہو کر بمبئی میں گھوڑ دوڑ سے دل بہلا رہے تھے اور اپنے راجکمار کرن سنگھ کو اپنا ریجنٹ بنا گئے تھے۔ مہارانی تارا دیوی سردار کے پاس دُہائی دینے کے لئے آئی تھیں۔ سردار نے اِس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ "مہارانی جب میرے پاس آئی تھی تو اس صوفے پر بیٹھی تھی جس پر آپ بیٹھے ہیں۔ وہ اس قدر سہمی ہوئی اور

پریشان خاطر تھی کہ یہیں پر غش کھا گئی۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو مجھ سے کہا کہ ہم نے کون سے ایسے پاپ کئے تھے کہ ہمیں بن باس دیا گیا۔ میں تو اُس کی حالت دیکھ کر بڑا افسردہ ہو گیا۔" میں نے سردار کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ "آپ کو اُن ہزاروں بے گناہ مُسلمانوں کا بھی کبھی خیال آیا ہے جن کو انہی بھولی بھالی مہارانی صاحبہ نے جموں کے علاقہ میں تہہ تیغ کروا دیا۔" سردار کے پاس اِس کا جواب نہیں تھا لیکن وہ خشم آلود نظروں سے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ فضا بہت تنی ہوئی تھی اور بھی حاضرین گُم سُم بیٹھے تھے۔ جواہر لال صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کر کے مجھے الگ لے گئے اور کمرے کے ایک کونے میں میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا کہ "ضد چھوڑ دو۔ اِس معمولی بات پر معاملات کو بگڑنے نہ دو۔" پنڈت جی کے لہجے میں اس قدر اپنائیت تھی کہ میں نرم پڑ گیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں آپ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں کیونکہ ہمارے درمیان باہمی اعتماد کا رشتہ موجود ہے۔ لیکن سردار کے ہاتھ میں اگر انٹلی جینس کا یہ ہتھیار دیا گیا تو وہ ہمیں ایک نہ رہنے دیں گے۔ بہر حال جواہر لال کی معاملہ فہمی اور شگفتہ مزاجی سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور میٹنگ برخواست ہو گئی۔

سردار پٹیل کے ساتھ ایک اور معاملے پر ہماری خاصی آویزش رہی اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں ہمیں اتنا ہی زور لگانا پڑا جتنا ہم نے کشمیر میں خاتمہ جاگیرداری اور زرعی اِصلاحات کے لیے لگایا تھا۔ جس وقت کشمیر پر حملہ ہوا اُس وقت ہماری ریاست پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی مدار میں تھی اور اُس یونیورسٹی کو یہاں کے تعلیمی امور اور امتحانات پر نگرانی کا حق حاصل تھا۔ اِس یونیورسٹی کا صدر مقام لاہور تھا۔ لہٰذا ہند سے ہمارے تعلقات کے بعد اس یونیورسٹی سے ہمارا تعلق کٹ گیا۔ اِس مرحلے پر جہاں ہم اپنی الگ

یونیورسٹی قائم کرنے کے حق میں تھے وہاں سردار پٹیل اور اُن کے طرزِ فکر کے علمبرداروں کی ضد تھی کہ ہم مشرقی پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ کار کو ہی تسلیم کریں۔ تعلیم کو میں بنیادی اہمیت دیتا ہوں اور مجھے اندیشہ تھا کہ اگر ہم نے کسی اور یونیورسٹی کا دائرہ اختیار تسلیم کیا تو ہماری سرکاری زبان اُردو پر زد پڑے گی۔ نصاب کی کتابوں میں گھٹیا اور جانبدارانہ مضامین کو لینا ہوگا۔ اور ہماری ثقافتی شخصیت کے خدوخال اُبھر نہیں پائیں گے چنانچہ ہم نے الگ یونیورسٹی بنانے کا مصمم اِرادہ کر لیا۔ مرکز اپنی سی الاپتا رہا۔ لیکن ہماری گردن میں ابھی آئین کی گرانباریوں کی زنجیریں نہیں لگی تھیں۔ چنانچہ ہم نے ایک الگ یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کر ہی ڈالا۔ اور تحریک حریت کے ایک اولین مجاہد اور تعلیم شناس خواجہ غلام احمد عشائی اِس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یہی یونیورسٹی اب بالغ ہو کر جموں اور سرینگر کی دو علاقائی یونیورسٹیوں کی شکل میں پنپ رہی ہے۔

میں اُن معاہدات پر دیانتداری سے عمل کرنے کے حق میں تھا جو ہمارے اور مرکز کے درمیان طے پائے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ جہاں ہم اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کا خیال رکھیں گے وہاں ہم مرکز کے اِختیارات کا بھی احترام کرتے رہیں گے اور اسی طرح مرکز بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ہمارے حقوق کی پاسداری کرے گا۔ اِس طرح سے ہمارے درمیان اعتماد بڑھتا جس سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا گھیرا خود بخود چھٹ سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے راہنما کئی ذہنی تحفظات کا شکار بن گئے تھے اور ہمیں اپنے ساتھیوں کا سا اعتماد دینے کی بجائے حاکموں کی سی نخوت برت رہے تھے اسی ذہنیت کے نتیجے میں وہ ہمارے ہر معاملے میں جائز یا ناجائز طور پر مداخلت کا موقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ میں قدرتی طور پر اس بے اعتمادی کے آگے سر جھکانا پسند نہیں کرتا تھا اور بڑھتی ہوئی مداخلت کی مزاحمت کرتا تھا۔ ایک دفعہ گوپالا سوامی آئینگر

نے جو اُس وقت مرکز کے وزیر داخلہ تھے، مجھ سے یہ سوال کیا کہ اُن کی وزارت سے مشورہ کئے بغیر ہی میں نے کیوں اور کیسے پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو گرفتار کر کے قید میں بھیجا؟ مجھے یہ سوال اور اُن کا انداز ہرگز نہیں بھایا۔ اور میں نے جھٹ پٹ جوابی سوال پوچھا کہ آپ نے ہندوستان کے مختلف جیلوں میں ہزاروں کمیونسٹوں کو پابجولاں کر دیا ہے تو آپ نے ہم سے کیوں مشورہ نہیں کیا؟ امن و قانون ریاست کے اِختیارات کی ذیل میں آتے ہیں اس میں ہمیں مرکز سے پوچھنے کی ضرورت کیسی؟ گوپالا سوامی آئینگر ردِ عمل کے طور پر مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ شاید انھیں اِس قسم کے طرزِ کلام سے کبھی اور سابقہ نہیں پڑا تھا۔ الغرض میرے اور مرکز کے درمیان اِس قسم کے ٹکراؤ اور اور تصادم اکثر وقوع پذیر ہوتے تھے اور ہر ٹکر کے نتیجے میں وہ مجھ سے اور زیادہ بدک جاتے۔ اس لئے بھی میں دہلی کی بری کتابوں میں سرِ فہرست رہنے لگا۔ مرکز میں کشمیر اور خاص طور پر میرے متعلق سردار پٹیل کے شکوک بڑھ رہے تھے۔ اُن دنوں وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کی طرف سے مختلف لوگ کبھی رازدارانہ اور کبھی اعلانیہ کشمیر بھیجے جاتے تھے۔ جو کشمیر اور میرے متعلق انھیں مستند اطلاعات بہم کریں۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جہاں جواہر لال کے بھیجے ہوئے لوگ میرے متعلق اچھی رپورٹیں پیش کرتے، وہاں پٹیل کے بھیجے ہوئے لوگ میرے بارے میں بالکل متضاد بیانات پیش کرتے۔ بی۔ ایم۔ ملک مرکزی انٹلی جینس کا ایک اعلیٰ آفیسر تھا۔ اُس کو ۱۹۴۹ء کے وسط میں کشمیر بھیجا گیا تاکہ وہ صحیح صورتِ حال کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرے۔ ملک نے مجھ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ہم نے بڑی تفصیل کے ساتھ کشمیر اور دوسرے متعلقہ معاملات پر تبادلۂ خیال کیا۔ ملک، بخشی غلام محمد، صادق صاحب، ڈی پی در، مولانا مسعودی اور جنرل تھمایا سے بھی ملا۔ واپس جاکر اس نے اپنی رپورٹ اپنے آفیسر اعلیٰ کو پیش کر دی جس میں

میرے متعلق اُس نے بہت عمدہ خیالات ظاہر کیے تھے۔ یہ رپورٹ جب وزارتِ داخلہ کے سکریٹری ایچ، وی آر آئینگر کو ملی تو اُس نے اُسے جھٹ وزیر اعظم کے پاس بھیج دیا۔ جواہر لال رپورٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ کشمیر اور میرے متعلق ان کے اپنے خیالات کی تصدیق بھی کرتا تھا اور آئینہ داری بھی۔ اُنھوں نے اِس رپورٹ کی نقلیں بنا کر اپنے بیرونی ملکوں میں اپنے سفارت خانوں کو بھیج دیا تاکہ ہند کے سفیر کشمیر کے متعلق صحیح صورتِ حال سے واقف رہ سکیں۔ سردار پٹیل کے پاس بھی رپورٹ بھیج دی گئی تھی لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ رپورٹ اُن کے دیکھے بغیر جواہر لال کے پاس چلی گئی ہے اور جواہر لال نے اُس کی خوب تشہیر کر دی ہے تو انہیں سخت طیش آیا۔ سردار پٹیل نے پرسش کے لئے ملک کو طلب کر لیا۔ اور بڑے غصّے سے دریافت کیا کہ رپورٹ کو اُن کے پاس بھیجنے کی بجائے براہ راست وزیر اعظم کے پاس کیوں بھیج دیا گیا ہے۔ ملک پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اور وہ صفائی میں بولا کہ اُس نے رپورٹ اپنے آفیسر اعلیٰ کو بھیج دی تھی نہ کہ وزیر اعظم کو۔ اس پر اُس کی جان بخشی ہو گئی۔ سردار نے ملک کے سامنے میرے خلاف جو تقریر جھاڑ دی اس کا ذکر ملک نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ سردار پٹیل نے ملک سے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ میری نسبت جواہر لال کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے اور مجھے بڑا خطرناک اور ہندو دشمن سمجھتے ہیں۔ سردار نے ملک کے سامنے مجھے اِس لئے بھی آڑے ہاتھوں لیا کیونکہ میں مہاراجہ کی مخالفت کر رہا تھا۔ سردار باتونی آدمی نہیں تھے۔ اور خوب جانتے تھے کہ کہاں اور کس وقت کیا کہنا چاہئے۔ اگر وہ ملک کے سامنے یوں گویا ہو گئے تھے تو اس کے صاف معنی یہی تھے کہ ملک اِشارہ سمجھے اور جب کبھی آئندہ میرے متعلق کوئی رپورٹ بھیجے تو اُس میں اُن کے خیالات کا لحاظ رکھے۔ ملک خود رقم طراز ہے کہ اُس ملاقات کے تھوڑی ہی دیر بعد سردار نے تین سینئر افسروں کو نظر انداز

کر کے اُسے اِنٹلی جینس بیورو کا سربراہ مقرر کیا۔ اسی قسم کے طور طریقوں سے سردار نے سنٹرل انٹلی جینس کے علاوہ آرمی انٹلی جینس اور دوسرے ذرائع کو استعمال کر کے جواہر لال کو مجھ سے بدظن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بخشی غلام محمد کرن سنگھ اور ڈی پی در نہ صرف خود جاسوسی کرتے تھے بلکہ وہ اس کام میں سردار پٹیل کا ہر طرح سے ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بخشی صاحب نے دوار کا ناتھ کاچرو کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے ایک موٹر کار مفت پیش کی۔ اور اُس کی دوسری ضروریات پوری کرتے رہے۔ بخشی صاحب ان کاموں میں بڑے طاق اور مشاق تھے۔ انھوں نے بامزئی کو بھی اسی قسم کے سلوک سے گانٹھ لیا۔ جواہر لال کے خاص نوکر ہری کو بھی اس کی قیمت ادا کر کے ہموار کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ مسز اندرا گاندھی، فیروز گاندھی، مسز وجے لکشمی پنڈت، جواہر لال کے پرسنل اسسٹنٹ ایم، او متھائی وغیرہ کو بھی مختلف طریقوں سے اپنے شیشے میں اُتار لیا گیا۔ ان کاموں میں ڈی پی در، بخشی صاحب کے خاص ہمراز اور دمساز کی حیثیت سے داد رفاقت دیتے رہے۔ اور کرن سنگھ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔

بات اس سے بھی آگے بڑھ چلی تھی۔ ہم کابینہ میں مختلف امور پر بحث و مباحثہ کر کے جب کوئی فیصلہ لیتے تو ہمیشہ اتفاق رائے سے لیتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ ہمارا کوئی فیصلہ جواہر لال نہرو کو پسند نہیں آیا۔ لیکن میرے ساتھیوں میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں تھی کہ وہ اس فیصلے کی اجتماعی ذمہ داری قبول کرتے۔ اُلٹے وہ ایسے مواقع پر میرے خلاف زہر افشانی کرتے۔ وہ جواہر لال کے پاس جا کر کھسر پھسر کے انداز میں کہتے کہ یہ شیخ صاحب کا فیصلہ ہے اور اُن کے سامنے ہماری کچھ نہیں چلتی۔ اس طرح جواہر لال کے دل میں یہ بات جما دی گئی کہ مجھے اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کرنے کی پرواہ نہیں اور میں ایک آمر مطلق کی طرح کام کر رہا ہوں۔ ان طور طریقوں کا

آخری نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ اور ۱۹۵۳ء کا فوجی نرغہ پیش آیا۔ میرے ساتھی میرے سامنے تو وفاداری کی قسمیں کھاتے تھے لیکن میری پیٹھ پیچھے خنجروں کو تیز کرتے رہے۔ شاید ظفر علی خاں نے اس شعر میں میری حالت کا ہی نقشہ کھینچا ہے۔ ؎

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود ہی دکھلایا ہے میرے چراغاں نے مجھے

▲▲▲

---

* میکاولی :۔ اصل نام نکولو میکاولی۔ ۳ مئی ۱۴۶۹ء اطالیہ کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا اور ۲۲ جون ۱۵۲۵ء کو چل بسا۔ اُس کی کتاب THE PRINCE : سیاسی عیاری کے گُر سکھانے کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ فرانسس بیکن نے اس کے متعلق لکھا "میکاولی ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اُس نے بتایا کہ حکمران کیا کرتے ہیں نہ یہ کہ اُنھیں کیا کرنا چاہیے۔" اقبالؔ نے میکاولی کے متعلق لکھا۔

آں فلارنسائیِ باطل پرست — سرمہ او دیدۂ مردم شکست
فطرتِ او سوئے ظلمت بردہ رخت — در گِلِ ما دانۂ پیکار کشت
باطل از تعلیم او بالیدہ است — حیلہ اندازے فنے گردیدہ است۔

چانکیہ :۔ چندر گپت موریہ کا وزیر کوٹلیہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ارتھ شاستر کا مصنف میکاولی کا مشرقی نیم البدل ارتھ شاستر سیاسی حیلہ گری کا درس دیتی ہے۔

(م۔ی۔ث) ......

(۴۶)

دفعہ ۳۷۰ کا طلوع

خاتمۂ جاگیرداری کے سلسلے میں راجہ پونچھ اور راجہ چنہنی کی جاگیریں بھی گئیں۔ یہ دونوں جاگیردار مہاراجہ کے قرابت دار تھے۔ لیکن مہاراجا اُن سے در پردہ بغض رکھتا تھا۔ اِس لئے اُن کی جاگیریں چلی جانے پر اُس نے خوشی کا اِظہار کیا۔ چنہنی ایک چھوٹی سی جاگیر تھی جس کا علاقہ کُد اور اُدھمپور کے درمیان واقع تھا۔ وہاں کے راجہ نے چنہنی کے مظلوم عوام کا قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ اُس نے بڑے بڑے رقبہ جات کو اپنے نام پر منتقل کر دیا تھا اور اُن کو عوام سے کاشت کروا کے انھیں بس اشک شوئی کے لئے فصل کی تھوڑی سی مقدار دے دیتا تھا۔ وہ ان کے علاوہ اُن کے اہل و عیال سے بھی بیگار لیتا تھا۔ اور اُس نے اُن کی حالت بڑی غیر بنا دی تھی۔ اِن مظالم کا چرچا ہم تک پہنچا تو ہم نے راجہ کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی ــــ جو سردار بدھ سنگھ کی قیادت میں کافی عرصے تک جاری رہی۔ اِس تحریک میں نہ صرف وہاں کے باشندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ جموں تک سے دردمند اور روشن خیال لوگ ایجی ٹیشن کے لئے چنہنی پہنچے۔ اور جموں کے علاقے میں ایک صحیح عوامی تحریک شروع

کی۔ اس سلسلے میں عوام نے بہت سی قربانیاں بھی دیں۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ہم آزادی سے ہمکنار نہیں ہوئے تھے۔ خاتمۂ جاگیرداری کے قانون کے منظور ہوتے ہی راجہ صاحب کا پتہ کٹ گیا اور اُس کی اکڑفوں بھی جاتی رہی۔ وہاں کے عوام صدیوں کے بعد جاگیردارانہ استحصال سے نجات پا گئے۔ پونچھ کا راجہ بھی ایک نیم خودمختار راجہ کی حیثیت سے علاقۂ پونچھ کا خداوند بنا بیٹھا تھا۔ ایک وقت تو اُس نے ایک چھوٹے رجواڑے کے لئے الگ ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کا مضحکہ خیز اقدام بھی کیا تھا۔ وہاں کے عوام کی حالت بھی خراب تھی۔ پونچھ کے لوگ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہیں۔ وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں کچھ اعلیٰ پایے کے دانشور اور صاحبِ فہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ انھوں نے ابتدا سے ہی اپنے آپ کو تحریکِ کشمیر کے ساتھ پوری طرح وابستہ رکھا تھا۔ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر نیشنل کانفرنس کے زمانے میں وہ ہمارے شانہ بشانہ تحریک میں شامل رہے۔ ہم نے اپنی تنظیم کے کئی سالانہ اجلاس پونچھ میں منعقد کئے اور وہاں خون کا بلیدان بھی دیا گیا۔

ہندوستان میں آئین ساز اسمبلی ملک کے آئین کو ترتیب دینے کے کام میں مشغول تھی اِس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی تھی کہ مرکز کو کشمیر کے نمائندوں کی شمولیت کا خیال آیا۔ اُس وقت ہم مہاراجہ کے نافذ کردہ آئین میں ضروری اور مناسب تغیر و تبدل کر کے کسی طرح سے کام چلا رہے تھے۔ لیکن اس بات کو طے کرنا ضروری بنتا جا رہا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد کی صورتِ حال میں ملک کے آئین میں ہماری ریاست کی پوزیشن کیا رہے گی؟ چنانچہ اِس معاملے پر دہلی میں ہمارے اور مرکزی راہنماؤں کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔ ہماری طرف سے بخشی صاحب، بیگ صاحب، میر قاسم اور ڈی پی در نے مذاکرات میں حصہ لیا اور کچھ عرصے کے بعد

میں بھی اُن میں شامل ہوا۔ ہم آپس میں اِس فیصلے پر پہنچے تھے کہ دستاویزِ الحاق کی رو سے مرکز کو جن امور کی ذمہ داری سونپی گئی تھی ہم اُن سے تجاوز نہیں کریں گے۔ لیکن مرکزی لیڈروں کی خواہش یہ تھی کہ ہم ہندوستان کی باقی ریاستوں کی طرح اپنی انفرادی شخصیت کو قربان کر کے اپنے آپ کو یونین کے بڑے دریا میں مدغم کر دیں۔ لیکن ہمارے خاص حالات اور ہماری تحریک کے مقاصد ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے موقف کی وجوہات صاف تھیں۔ اوّل تو کشمیر ہندوستانی یونین میں شامل ہونے والی واحد ایسی ریاست تھی جہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ہماری ریاست تین اطراف سے پاکستان کے علاقے سے گھری ہوئی تھی۔ پاکستان اِس پر اپنا دعویٰ جتا رہا تھا۔ ہندوستان نے رائے شماری کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ جس کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا حتمی فیصلہ کرنا مقصود تھا۔ یہ سارا معاملہ اقوامِ متحدہ کے فورم میں زبردست بحث و مباحثے اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز اور محور بن کر رہ گیا تھا۔ جہاں بار بار ہندوستانی نمائندے بلند آواز سے یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہندوستان کو کشمیر کی سرزمین پر قابض رہنے کی نہ کبھی خواہش تھی اور نہ اب ہے۔ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ ریاست میں اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی رائے شماری کرائی جائے اور یہاں کے لوگوں کو حق دیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کریں آیا وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں؟ یا وہ اپنی ریاست کو آزاد اور خودمختار رکھنے کے حق میں ہیں؟ ان حالات میں ریاست کا ہند یونین میں مکمل انضمام خارج از بحث تھا۔ اِس لئے ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ کی تشکیل دی گئی۔ اگرچہ ہمیں اس کی بعض تفصیلات و اصطلاحات سے اختلاف تھا لیکن جب گوپالا سوامی آئینگر نے اِس کو آئین ساز اسمبلی کے سامنے رکھا تو ریاست کے

نمائندوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یاد رہے کہ اُس وقت ریاست کی طرف سے مندرجہ ذیل نمائندے آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو چکے تھے کیونکہ مرکز ان کی جلد از جلد شمولیت پر مصر تھا۔

راقم الحروف، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ، پنڈت موتی رام بیگڑہ۔

جب میں ایک ممبر کی حیثیت سے پہلی بار آئین ساز اسمبلی میں داخل ہوا تو ایوان میں چاروں طرف پرجوش تالیوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نے بذاتِ خود ایوان کے اندر میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اپنی نشست کے بالکل ساتھ بٹھا دیا۔ ہم نے اُسی دن پورے آداب و رسوم کے ساتھ اپنی رُکنیت کا حلف بھی لیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے دفعہ ۳۷۰ کی تشکیل کے وقت مرکز کے راہنماؤں کے ساتھ ہمارے جو مذاکرات ہوئے اُن میں، میں نے اور بیگ صاحب نے جو ایک ماہر قانون کی حیثیت سے میرے نزدیکی مشیر تھے، یہ تاثر قائم کیا کہ مرکز کے ساتھ ہماری دال سیدھی طرح گلنے والی نہیں۔ مرکزی راہنماؤں کے دلوں میں گرہیں اور اُن کے دماغوں میں تحفظات موجود ہیں۔ وہ چاہے زبان سے کچھ ہی کیوں نہ کہیں دل سے وہ یہی چاہتے ہیں کہ کشمیر کو باقی ریاستوں کی سطح پر لے آئیں۔ اور اسے انہی کے پیمانے سے ناپیں۔ اِن رہنماؤں کا فطری میلان یہی ہے کہ ریاست کی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔ یہ صرف ہمارے اندیشے نہیں تھے بلکہ گوپال سوامی آئینگر نے دفعہ ۳۷۰ سے متعلق تجویز پیش کرتے ہوئے اس بارے میں ہندوستان کے ارادوں کی غمازی بھی کی۔ گوپال سوامی نے کہا تھا:-

"یہ دفعہ جو خصوصی درجہ کشمیر کے لئے تجویز کرتی ہے وہ کشمیر کے مخصوص حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ ریاست ابھی ہندوستان میں انضمام ہونے کی صورت میں نہیں ہے۔ ہر شخص کی یہ توقع ہے کہ آگے چل کر ریاست جموں و کشمیر بھی اس قابل ہو جائے گی کہ وہ یونین میں اُسی طرح ضم ہو جائے جس طرح باقی ریاستیں ہوئی ہیں۔"

غیر منقسم ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں نے آزادی سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ کے راہنماؤں کے ساتھ لمبی چوڑی گفت و شنید کے بعد ایک سمجھوتہ کیا تھا۔ جس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ وفاق میں اُن کی شمولیت کی صورت میں انھیں کیا حیثیت دی جائے گی۔ وہ بنیادیں بھی طے پا گئی تھیں جن کی بنا پر حکمران ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتے تھے۔ طے پایا تھا کہ ریاستیں صرف رسل و رسائل امور خارجہ اور دفاع کے امور مرکز کے سپرد کر دیں گی۔ اور باقی امور میں اپنی خود مختاری برقرار رکھ سکیں گی۔ سردار پٹیل نے اُس وقت یہ یقین بھی دلایا تھا کہ دفاع کے خرچے کا بوجھ ریاستوں پر نہیں ڈالا جائے گا۔ لیکن اقتدار ایک عجیب شے ہوتی ہے۔ جب کانگریسی لیڈروں نے اس کا مزہ چکھا تو اُن کی نیتیں بدل گئیں۔ انھوں نے ہند کے ساتھ الحاق کرنے والی تمام ریاستوں کو یونین میں مدغم کرنے کی پالیسی پر تیزی سے عمل کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلا اقدام اس سمت میں یہ اُٹھایا گیا کہ ان ریاستوں کو اپنی الگ الگ آئین ساز اسمبلیاں قائم کرنے کی بجائے مرکزی آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اِس کا منشا یہ تھا کہ ریاستیں اپنے الگ آئین ترتیب نہ دیں اور مرکزی آئین کو ہی اپنی ریاستوں میں لاگو کریں۔ اِس طریقے سے اُن کی انفرادیت یونین میں ضم ہو گئی۔ اِس غرض کے لئے پہلے مختلف ریاستوں کی الگ الگ گروپ بندی کی گئی اور ہر گروپ کے لئے ایک راج پرمکھ اور ایک اپ راج پرمکھ مقرر کیا گیا۔ اس

طرح راجے مہاراجوں کی کثیر تعداد حقیقی اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ دوسرے مرحلے میں راج پرمکھوں اور اُپ راج پرمکھوں کو انتظامی سربراہی سے الگ کر کے آئینی سربراہ بنا کے رہ دیا گیا۔ اُن کی حیثیت ریاستوں میں گورنروں کی ہوتی تھی۔ تیسرا اقدام یہ کیا گیا کہ راجوں مہاراجوں کو حکومت کی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر دستبردار ہونے پر راضی کر لیا گیا۔ اس رضامندی کی قیمت جیبِ خاص (PRIVY PURSE) دے کر چکا لی گئی۔ اُنھیں بتایا گیا کہ اس طرح سے وہ آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ مہاراجوں کی حیثیت سے اُنھیں جو آرائشی قسم کی سہولیات ملتی تھیں وہ بھی برقرار رکھی گئیں۔ ان اقدامات پر مرکزی حکومت کی نہ ہینگ لگتی تھی اور نہ پھٹکری۔ لیکن راجوں کی فریبانا کا رنگ چوکھا ہو جاتا تھا۔ ان میں توپوں کی سلامی، علیحدہ جھنڈے، سرکاری پہرہ، اور سفر وغیرہ کی مراعات شامل تھیں۔ راجا تو عزتِ نفس اور کردار کی صلاحیتوں سے پہلے ہی بے بہرہ ہو چکے تھے۔ وہ جھانسے میں آ گئے اور اپنے وجود کو ختم کرنے پر راضی ہو گئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے ہندوستانی راہنماؤں کے تیور دیکھ کر بھاگتے چور کی لنگوٹی پر اکتفا کرنے کو ہی غنیمت سمجھا ہو۔ بعد میں مسز اندرا گاندھی کی وزارت نے اُن مفت خوروں کو پریوی پرس اور دوسری بچی کھچی مراعات سے بھی محروم کر دیا۔ راجاؤں کے کردار و عمل کے لئے کوئی احترام نہ رکھتے ہوئے بھی میں اس طریقۂ کار کو ایک غیر اخلاقی اقدام سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جس سکیم کے تحت پریوی پرس کی اختراع کی گئی تھی اس کی رو سے ہر گذرنے والے سال کے ساتھ ساتھ راجا کو ملنے والی رقم میں کمی ہوتی جا رہی تھی۔ چند سال میں قومی خزانے پر اس کا بوجھ خود بخود ختم ہو جاتا اور حکومت ہندوستان اس غیر اخلاقی فعل کے ارتکاب کے الزام سے بچ جاتی۔

کشمیر کی صورتِ حال بالکل الگ تھی۔ اس کے مستقبل کا سوال بین الاقوامی انجمن میں زیرِ بحث تھا۔ اس لئے یہاں اس طرز کی تبدیلیاں کرنا مرکز کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود مرکزی راہنما ہمیں مشورہ دیتے رہے کہ ہم یہاں کے مہاراجا کے ساتھ بھی یہی طرزِ عمل اختیار کریں۔ ہم نے اس مشورے کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ہماری ریاست اتنی خطیر رقم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ مرکز کو اتنی ہی فکر ہے تو اپنے خزانے سے ادا کرے۔ چنانچہ مرکز نے مہاراجہ کے لئے دس لاکھ روپے سالانہ وظیفے کی رقم منظور کی جو یوراج کرن سنگھ بڑی مدت تک بٹورتے رہے۔ اُدھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کی ہوسِ اقتدار اُبھرنے لگی۔ حالات کے دباؤ کے تحت مجبوری کی حالت میں وہ عوامی حکومت کا قیام تو عمل میں لائے تھے مگر اندر ہی اندر حالات کی اس کروٹ پر کُڑھ بھی رہے تھے۔ اُنھوں نے اطمینان کی سانس لینا شروع کی تو ہمارے کام میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ میری کابینہ کے وزیرِ حضور کرنل پیچھانیا بھی کے نامزد کردہ تھے۔ وہ مہاراجا کے ساتھ ہمارا رابطہ تھے۔ لیکن وہ بھی کوئی تعمیری رول ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مہاراجہ کے ساتھ ہمارے تعلقات روز بروز بگڑتے ہی گئے۔ بالآخر تنگ آمد بہ جنگ آمد۔ میں نے مرکز سے کہا کہ حالات کو ٹھیک ڈگر پر لانے کی ایک ہی سبیل ہے کہ مہاراجہ کو ان کی گدی سے الگ کر دیا جائے۔ سردار پٹیل مہاراجہ کے زبردست مددگار اور پشت پناہ تھے۔ لیکن مرکز کے لئے ہم سے ٹکر لینا بھی ممکن نہ تھا۔ اس لئے ہری سنگھ کو رخصت لے کر بمبئی جانا پڑا۔ لیکن گوپالا سوامی نے سردار پٹیل کی رضامندی کے لئے ایک انوکھا طریقہ نکالا یعنی اُنھوں نے ہری سنگھ کے ذریعے اُن کے بیٹے کرن سنگھ کو ریاست کا آئینی سربراہ مقرر کروایا۔ جواہرلال کے کہنے پر ہم اس انتظام پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت بھی مہاراجہ نے سردار پٹیل کو لکھا کہ "میں زیادہ سے زیادہ

تین چار ماہ تک ریاست سے باہر جانے کو تیار ہوں۔ لیکن اس اقدام کو تخت سے دستبرداری کا پیش خیمہ نہیں سمجھنا چاہیے۔" لیکن مہاراجہ کی ہوس اقتدار پھر پوری نہیں ہو سکی۔ اور پھر وہ کبھی اپنے طلائی تخت پر بیٹھنے کی مسرت حاصل نہ کر سکے۔

زندگی کی منطق ایسی ہوتی ہے کہ اس کے متعلق پہلے سے ہی پیش گوئی کرنا بے حد مشکل ہے۔ مہاراجا چلے گئے تو ہمارے یہاں کچھ نئے مسائل نے سر اٹھایا۔ میرے ساتھی ایک دوسرے کے خلاف چھوٹی چھوٹی سازشوں میں لگ گئے۔ ایک وقت بخشی غلام محمد اور مولانا سعید کا اتحاد بنا اور ان کے خلاف غلام محمد صادق، مرزا محمد افضل بیگ، اور گردھاری لال ڈوگرہ صف آرا ہو گئے۔ ڈی۔ پی۔ در ایک رنگ بدلنے والی لومڑی کی طرح کبھی اس گروپ اور کبھی اس گروپ کے ساتھ تھوتھنی ملاتے رہے۔ اس بات پر نکتہ چینی شروع ہو گئی کہ کابینہ میں وزیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے لہذا اس میں کمی کی جانی چاہیے۔ میں نے سب وزیروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ ان کی نظر میں کابینہ میں وزیروں کی کتنی تعداد ہونی چاہیے۔ اس وقت کابینہ میں نو وزرا تھے۔ اب پانچ کی تعداد پر اتفاق ہوا۔ میں نے ہر وزیر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے طور پر پانچ پانچ نام تجویز کریں۔ یہ پانچ نام کاغذ کے اسی پرزے پر لکھ دیں اور پھر اپنے دستخط کر لیں۔ یہ سب کارروائی رازدارانہ طریقے پر کرائی گئی۔ بعد میں جب ان پرچیوں کو کھول کر ووٹ گنے گئے تو حسب ذیل ناموں پر اجماع CONSENSUS ہو گیا۔ راقم الحروف، بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ، گردھاری لال ڈوگرہ اور شیام لال صراف۔

کرنل پیر محمد، سردار بدھ سنگھ، کرنل پٹھانیہ اور غلام محمد صادق سے استعفیٰ طلب کیا گیا۔ صادق صاحب نے استعفیٰ دینے میں کافی لیت و لعل سے کام لیا۔ وہ بخشی غلام محمد

اور مرزا محمد افضل بیگ کی سفارش بھی لے آئے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر ممنون کرنے سے انکار کر دیا کہ پہلے آپ خود مسائل کھڑے کر دیتے ہیں لیکن جب فیصلہ آپ کی منشا کے مطابق نہیں ہوتا تو پھر آپ نہ صرف اپنے کئے پر پشیمان ہو جاتے ہیں بلکہ اصلاحی تدابیر کو بھی ملیامیٹ کرنے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ یہ طریقہ کار کسی لحاظ سے بھی حق بجانب اور درست نہیں۔

صادق صاحب کے لئے اب وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ لیکن اس پردے میں وہ میرے اور میری حکومت کے خلاف ایک مہم چلانے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اپنے چچیرے بھائی خواجہ محی الدین قرہ سے ہاتھ ملایا۔ حالانکہ سیاسی طور پر ان دو کے درمیان میری عداوت کے علاوہ کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ انھوں نے کبھی امن کانفرنس کا سوانگ رچایا اور کبھی پرولتاریوں کی نمائندگی کا ڈھونگ۔ لیکن ان کی ساری اچھل کود اکارت گئی۔ کیونکہ انھیں عوامی تائید کی قیمتی متاع حاصل نہیں تھی۔ صادق صاحب طبعاً ایک شریف آدمی تھے لیکن وہ نہایت کم کوش، آرام طلب اور غیر فعال شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سیاست کا دائرہ زیادہ تر دیوان خانے کی محفوظ فضاؤں تک محدود رہتا۔ جہاں وہ نرم اور ملائم بچھونوں پر بیٹھ کر سیاسیات اور عوامی تحریک پر فتوی صادر کرتے رہتے۔ اور کتابی مباحث میں مشغول رہتے۔ محنت کرنے کی عادت سے کوسوں دور تھے۔ اور عوامی زندگی کی ناہمواریوں اور تکلیفات سے گھبراتے تھے۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے۔ جس کو کبھی آلام روزگار کی کشاکش نے بے قرار نہ رکھا تھا اور جس کی زندگی عیش و آرام میں گذرتی تھی۔ چونکہ تحریک کی ابتدا میں ہمیں پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کی ضرورت تھی لہذا میں مرزا محمد افضل بیگ کی طرح انھیں بھی کالج سے اٹھا کر سیاست میں لے آیا تھا۔ خیالات کے لحاظ سے وہ اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔

لیکن ایک قسم کی ذہنی عیاشی سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ خود اُن کی اپنی زندگی ان کے دعووں کی نفی کرتی تھی۔ وہ میلے کچیلے عوام سے ملنے کو ایک سزا سمجھتے تھے۔ اور اُن کا کبھی عوام کے ساتھ رابطہ ہی قائم نہیں ہو سکا۔ اُن کی اِشتراکیت کا ایک ثبوت البتہ نمایاں تھا۔ یعنی وہ حسبِ ضرورت سچائی سے مُنہ موڑنے میں نہ کوئی جھجک محسوس کرتے تھے اور نہ عار۔ محی الدین قرہ کی یاد اُنھیں لیلائے وزارت کے روٹھ جانے کے بعد ہی آئی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے ہمارے خلاف بخشی غلام محمد سے صرف ہاتھ ہی نہ ملایا بلکہ اُنھیں اُن میں ایسے گُن نظر آنے لگے کہ وہ اپنی محفلوں میں اُنھیں مارشل ستالین کی صفات کا آدمی قرار دینے لگے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ بخشی صاحب کے خلاف طوطے کی طرح رٹ لگاتے رہے تھے اور اُنھیں کنبہ پروری اور بدعنوانی کا نشان سمجھتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں میری غیر قانونی گرفتاری کے بعد صادق صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے اِس فوجی نرغے کی حمایت کرتے ہوئے اسے "برموقع اور برمحل کارروائی" قرار دیا۔ حالانکہ میں نے اُنھیں آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کرایا تھا۔ اور اس مُعزز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے اُنھیں ایک پُروقار غیر جانبداری اور اِنصاف پسندی کی روش زیادہ زیب دیتی۔ بعد میں وہ سرینگر سے لے کر بمبئی تک میرے خلاف گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ پروپیگنڈا کرتے رہے کہ میں امریکی سامراج کا پٹھو بن گیا ہوں اور کشمیر کو دوسرا کوریا بنانا چاہتا ہوں۔ صادق صاحب نے اس سلسلے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ اِس سازش کے سلسلے میں اُن کے پاس ناقابلِ تردید تحریری ثبوت موجود ہے جس کو بہت جلد شائع کر دیا جائے گا۔ لیکن اپنی موت کے لمحے تک وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ کرتے بھی کیسے جب کچھ تھا ہی نہیں۔ البتہ اُن کے جاہ پسند اور خود غرض دماغ کی اختراع ضرور تھی۔ جس کو حقیقت کی پہلی ہی کرن نے دھندلا دیا۔ اپنے آخری برسوں میں وہ پشیمان ہو کر ہر جگہ کہتے پھرتے تھے کہ ۱۹۵۳ء میں

ہمیں سیاسی مالیخولیا ہو گیا تھا اور ہمیں ہر جھاڑی کے پیچھے سامراجی ایجنٹ چھپے نظر آتے تھے۔"

۱۹۵۳ء کے نرغے کے وقت وہ بخشی غلام محمد کو اپنا ملجا و ماویٰ تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کے نام کا کلمہ رٹتے تھے۔ لیکن جب بخشی صاحب کے ساتھ عہدوں کی بندربانٹ پر جھگڑا ہوا تو صادق صاحب نے ایک اور قلابازی کھائی۔ بخشی صاحب سے الگ ہو گئے اور اُن پر ایسی گندگی اُچھالی کہ الامان والحفیظ۔ اُنھوں نے بخشی غلام محمد پر ایسے اِلزامات کی فردِ جرم لگا دی کہ ایسا گمان ہوتا تھا کہ آئندہ بخشی صاحب سے اِتحاد کا سوال تو درکنار وہ اُن کا منہ تک دیکھنے کے روادار نہ ہوں گے۔ اِس دور میں میں کُد جیل میں قید تھا۔ صادق صاحب کو اپنی کسمپرسی میں میری یاد آئی۔ اور اُنھوں نے "کشمیر کو کوریا بنانے والے شخص سے درخواست کی کہ وہ ریاست کو "بخشی غنڈوں کے راج سے بچانے کے لئے جمہوری تحریک کی قیادت سنبھالے"۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے باقاعدہ خط لکھا۔ حالانکہ جب میں نے اُنھیں صدر آئین ساز اسمبلی کی اُن کی حیثیت میں اِسی جیل سے خطوط لکھ کر بخشی دور کی سیاہ کاریوں کے خلاف اُن کی توجہ مبذول کرائی تھی، تو اُس وقت اُنھوں نے ایک بے چہرہ وکیل کی طرح بخشی صاحب کی اِن تمام چیرہ دستیوں کی وکالت ہی نہیں کی تھی بلکہ اُن کا جواز بھی پیش کیا تھا۔ اور پھر اپنے قلم کی بے حیا جنبش سے اُنھیں بری کر دیا تھا۔ میں نے قدرتی طور پر اُن کے متحدہ محاذ کی پیش کش کو اُسی حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ کیونکہ میرے اختلافات بخشی غلام محمد کے علاوہ اُن کے دہلی کے آقاؤں سے بھی تھے۔ جن کی نوعیت بنیادی قسم کی تھی۔ بخشی اور صادق کو تو میں اُن کے آقاؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تصور کرتا تھا۔ جن کی حرکات و سکنات کا دار و مدار دہلی کے آقاؤں کی ترنگ پر تھا۔ جس انداز سے وہاں سے ڈور ہلتی اسی نوعیت کا ناچ ناچتے رہتے۔ بہرکیف غلام محمد صادق جب مجھ سے مایوس ہو گئے اور جب اُنھیں

اندازہ ہوگیا کہ بخشی غلام محمد اُن سے بڑا مداری ہے اور اُسے ہرانا اُن کے بس کی بات نہیں تو صادق صاحب بخشی صاحب کے آستانے پر پھر کورنش بجالانے کے لئے حاضر ہوگئے۔ نئی دہلی کی ہدایت ہی پر بخشی صاحب نے ایک فاتح کی طرح اُن کو وزارت میں پھر شامل کرلیا۔ اور اُن کی نظر میں بخشی غلام محمد پھر ریاست سے سب سے بلند قامت قائد بن گئے۔ الغرض صادق صاحب نے کبھی کسی اصول سے وفاداری نہیں دکھائی۔ ہمیشہ موقع پرستی اور اقتدار پسندی کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی کیفیت میں عالم بقا کو سدھار گئے۔ اُن کے زمانۂ اقتدار میں کشمیر کی اندرونی خود مختاری کو جس قدر زک پہنچی وہ ہماری تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے مگر وہ کرتے بھی کیا۔ اُنھوں نے کشمیر کی عزت کی نیلامی میں بخشی صاحب سے بھی بڑی بولی دی تھی اور اب دہلی کے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنی قوم اور اپنے وطن کو رہن رکھ کر اپنے اقتدار کی گھڑیاں دراز کر رہے تھے۔

جب ۱۹۵۱ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے تو اُس وقت صادق صاحب سیاسی صحرا نوردی کے آبلوں سے بے حال ہو رہے تھے۔ بخشی غلام محمد صادق صاحب سے بیزار تھے۔ اُنھوں نے تجویز کیا کہ حلقۂ امیرا کدل سے ایک بے وقعت شخص غلام قادر خان عرف ناٹہ کو نیشنل کانفرنس کی طرف سے کھڑا کیا جائے۔ لیکن میں نے اِس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ صادق صاحب نے کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ بہر حال ہمارے ایک ساتھی رہے ہیں۔ اور اُن کے مقابلے میں ایک غیر معروف شخص کو کھڑا کرکے نہ ہم اپنے ساتھ انصاف کریں گے اور نہ صادق صاحب کے ساتھ۔ میری ایماء پر صادق صاحب کو پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا۔ اور میری ہی تجویز پر وہ آئین ساز اسمبلی کے صدر چن لئے گئے

صدارت کے لئے اُن کے نام کو تجویز کرتے وقت میں نے اُن کے حق میں بڑی اچھی تقریر کی۔ مجھے اُس وقت کیا علم تھا کہ میری شرافت اور احباب نوازی کا مجھے بہت جلد صلہ ملنے والا ہے اور صادق صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ کر میرے خلوص کا حساب چکتا کر دیں گے۔ جب صادق صاحب ۱۹۷۱ء میں چنڈی گڑھ کے ہسپتال میں آخری گھڑیاں گن رہے تھے تو اُنھوں نے مجھ سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی تھی مگر اُس وقت بہت دیر ہوچکی تھی۔ ؎

نہ پوچھا جائے ہے اُس سے۔ نہ بولا جائے ہے مجھ سے

▲▲▲

۴۷

آئین ساز اسمبلی

میں بتا چکا ہوں کہ سلامتی کونسل کی کارروائی میں کئی بار شریک ہونے کے بعد میں بادلِ ناخواستہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ کشمیر کے تنازعے کا منصفانہ حل اِس بین الاقوامی ادارے کے بس کا روگ نہیں۔ کیونکہ یہ اصولوں کی بجائے مفادات کی بازی گاہ بن کے رہ گیا ہے۔ اس لئے میں نے ریاست کی ایک آئین ساز اسمبلی بُلانے کے لئے فضا ہموار بنانا شروع کر دی۔ دہلی میں اس خیال کی کافی مزاحمت ہوئی۔ جواہر لال بھی اِس معاملے میں شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ اگر آئین ساز اسمبلی بنائی گئی تو پاکستان کے ساتھ ساتھ اقوامِ متحدہ میں بھی شور اُٹھے گا۔ اِس مزاحمت کی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی کے ایوان ہائے اقتدار میں رہنے والے چند حاکم اِس اندیشے کا شکار بھی تھے۔ کہ ریاست کی آئین ساز اسمبلی قائم ہو گئی تو ریاست کی اندرونی خود مختاری پر ان کے حملے بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن نیشنل کانفرنس نے اس سلسلے میں کسی دباؤ کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا۔ نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اس سلسلے میں اکتوبر ۱۹۵۰ء میں اپنی قرارداد میں اعلان کیا۔

"اِس وقت تک سلامتی کونسل نے جس تذبذب اور غیر حقیقت پسندانہ روش کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے ریاست کے لوگ ایک ڈھلمل یقینی کی زندگی کا عذاب سہہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کو اِس بات پر تشویش ہے اور وہ تشکیک، سراسیمگی اور اضطراب کے ان حالات کو جاری رکھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ جنرل کونسل کی رائے میں وقت آ گیا ہے جب عوام کو پھر سے پہل کرنی چاہئے اور اُنہیں اس بے یقینی اور بے کسی کی صورتِ حال کو ختم کرنے کے لئے قدم اُٹھا لینا چاہئے۔ جنرل کونسل اقتدارِ اعلیٰ کے مالک عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ حقِ رائے دہندگی بالغاں کے اصول پر ایک آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کے لئے سرگرم ہوں، جس میں ریاست کے باشندوں کے ہر طبقے اور ہر مکتبِ خیال اور ریاست کی ہر اکائی کے نمائندے منتخب ہو کے آ جائیں۔ جو ریاست کے آئندہ رشتوں اور آئین کی نوعیت کا فیصلہ کریں۔"

بالآخر ہمارے اِصرار کو دیکھ کر دہلی نے آئین ساز اسمبلی بنانے پر رضامندی دکھائی۔ چنانچہ کرن سنگھ نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے ۳۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو حقِ رائے دہندگی کی بنیاد پر ایک آئین ساز اسمبلی بُلانے کا فرمان جاری کر دیا۔ فرمان کا جاری ہونا تھا کہ اقوامِ متحدہ میں آسمان سر پر اُٹھایا گیا۔ اینگلو امریکن بلاک نے سلامتی کونسل میں ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا، جس میں آئین ساز اسمبلی بُلانے پر سخت اعتراض کیا گیا تھا۔ میں نے اس مسودہ قرارداد پر سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی اور اسے کشمیری عوام کی سرداری کے حق پر حملہ قرار دیا۔ میں نے اپنے بیان میں کہا:

"اِس قرارداد کی پُشت پناہوں کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک قوم کی جمہوری نشو و نما پر روک لگا دیں جو اپنی حکومت کے ڈھانچے کی تشکیل ایک جمہوری طریقے سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عوام کی رائے کی ترجمانی

کا سب سے بڑا ادارہ ہوگا اور ہم مزید ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ کر اپنی تقدیر کے فیصلے معطل نہیں رکھ سکتے۔"

بہرحال ہم اِنتخابات کی تیاریوں میں لگ گئے۔ بخشی غلام محمد انتخابی مہم کے ذمہ دار بنا دیئے گئے۔ اسمبلی کے کل ایک سو حلقہ جات بنائے گئے۔ جن میں پچیس نشستیں اُن علاقوں کے عوام کے لئے مخصوص رکھی گئیں جو پاکستان کے قبضے میں تھے۔ باقی پچھتّر حلقوں کے لئے حلقہائے انتخاب کی نشاندہی کی گئی۔ اور رائے دہندگان کی فہرستیں تیار کرائی گئیں۔ وادیٔ کشمیر میں پاکستان کے طرفداروں کو میدان میں آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ حالانکہ میری دِلی خواہش تھی کہ وہ مقابلے میں آئیں۔ اِس طرح سے دونوں فریق عوام کے سامنے جاتے اور دیکھتے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ مگر قبائلیوں نے وادی میں جو طوفانِ بے تمیزی بپا کیا تھا اُس سے پاکستان کی تصویر کشمیر کے مسلمانوں کی نگاہوں میں بے اِنتہا مسخ ہو چکی تھی۔ پاکستان کے طرفداروں کو عوام کے اِن جذبات کا بخوبی اندازہ تھا۔ اِس لئے وہ میدان میں آکر اپنی رُسوائی کی تشہیر نہیں کرانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کنارے پر رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جموں کے ہندو اکثریت والے علاقوں میں پرجا پریشد کا اثر تھا۔ اُنھوں نے اپنے امیدوار مختلف حلقوں سے کھڑے کر لئے۔ لیکن اُنھیں بھی اپنی کامیابی کے بہت کم آثار نظر آتے تھے۔ کیونکہ نیشنل کانفرنس نے جس ہمّت اور شجاعت کے ساتھ ریاست کو قبائلیوں کے چنگل سے بچالیا اور جس پامردی کے ساتھ اقلیتوں کی حفاظت کا فریضہ نبھایا تھا اُس کی وجہ سے اس کا وقار عوام کی نگاہوں میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اِن حالات میں پرجا پریشد کسی بہانے کی تاک میں تھی تاکہ اُسے مقابلے سے بھاگنے کا جواز ملے۔ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے اور پرجا پریشد کو بھی جس حیلے کی تلاش تھی وہ اُس کو مل گیا۔ ریٹرننگ آفیسروں نے تکنیکی

وجوہات کی بناء پر اُن کے چند اُمیدواروں کے کاغذاتِ نامزدگی نامکمل پائے اور انھیں مسترد کر دیا۔ پرجا پریشد اِسی بہانے میدان سے ہٹ گئی۔ بہرحال ستمبر ۱۹۵۱ء میں اِنتخابات ہوئے۔ اور نیشنل کانفرنس کو سو فیصدی کامیابی مل گئی۔ پرجا پریشد نے کافی شور مچایا اور آئین ساز اسمبلی کو غیر نمائندہ اور ڈھونگ قرار دیا۔ بخشی غلام محمد نیشنل کانفرنس کی اِنتخابی مہم کے اِنچارج تھے اور جموں تو بس اُنہی کا دائرہ کار تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کچھ اِنتخابی بے ضابطگیاں وقوع پذیر ہوئی ہوں۔ کیونکہ بخشی غلام محمد جس اُفتادِ طبع کے مالک تھے اُس کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں خارج از اِمکان نہیں تھیں۔ لیکن اگر واقعی ایسی باتیں سرزد بھی ہوئی تھیں تو آئین میں اِس کا انسداد کرنے کے لئے مناسب تدابیر موجود تھیں۔ اور پرجا پریشد اُن کی پناہ لے سکتی تھی۔ لیکن اِنتخابی میدان سے رفو چکر ہونا اور میدان اپنے حریف کے لئے چھوڑ دینا صحیح سیاسی رویہ ہرگز نہیں تھا۔ بعد میں بھی آئین ساز اسمبلی کے تئیں پرجا پریشد کا رویہ گول مول سا ہی رہا۔ جب کوئی ایسا فیصلہ ہو جاتا جو پرجا پریشد کو مُوافق معلوم ہوتا تو وہ آئین ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کی قسمیں کھانے لگتی۔ لیکن جب کوئی فیصلہ اِس جماعت کے مزاج کے خلاف ہوتا تو وہ پھر شور شرابہ کرنا شروع کرتی اور چیختی چلاتی کہ آئین ساز اسمبلی لوگوں کی نمائندہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب آئین ساز اسمبلی میں شخصی راج اور جاگیرداری کو ختم کرنے کے فیصلے ہوئے تو پرجا پریشد نے گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچانا شروع کیا۔ اِس متضاد رویے نے خود پرجا پریشد کو تمسخر کا موضوع بنا کر رکھ دیا۔ بہرکیف۔ آئین ساز اسمبلی وجود میں آ گئی اور اُس نے اپنا کام شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو آئین ساز اسمبلی کا پہلا اِجلاس ہوا۔ اُس دن عوام کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی غلامی کے بند ٹوٹ گئے ہیں اور دِلوں کے ولولے اور ارمان رنگ برنگے پوشاک زیب تن کر کے سڑکوں پر اُمڈ آتے ہیں۔ مجھے اپنی رہائش گاہ سے ایک بھاری جلوس کی صورت

میں دربار گڈھ ہال پہنچایا گیا۔ جہاں مولانا محمد سعید مسعودی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ میں جب ہال میں داخل ہوا تو ایک عجیب وارفتگی کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر میرا استقبال کیا گیا۔ سب سے پہلے ایوان کے مستقل صدر کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ میں نے صادق صاحب کا نام تجویز کیا جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ میں اور مولانا مسعودی صادق صاحب کو اپنے جلو میں لے کر کرسی صدارت تک لے گئے۔ اور انھیں صدر نشین بنا کر لوٹ آئے۔

اسمبلی کے سامنے اُس وقت چار اہم امور تھے۔ جن پر اُسے فیصلہ لینا تھا۔

۱۔ ریاست کے عوام کو اُن کی اُمنگوں اور آرزوؤں کے ہم شکل ایک آئین دینا۔

۲۔ جاگیرداری، چکداری اور بڑی زمینداریوں کے خاتمے کے لئے جو اقدامات کئے گئے تھے، اُن کی توثیق کرنا۔

۳۔ ریاست جموں وکشمیر سے شخصی حکومت کا خاتمہ کرنا۔

۴۔ ریاست کے الحاق پر فیصلہ لینا۔ میں نے اپنی کلیدی تقریر میں ان امور کی نشاندہی کی۔ الحاق کے بارے میں میں نے معزز ممبران کی توجہ اِس بات کی طرف مبذول کرائی۔ ریاست کے الحاق کے سلسلے میں اُن کے سامنے تین راستے موجود ہیں۔ یہ راستے اُس فرمان کے تحت متعین ہوئے تھے۔ جو تاج برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرتے وقت جاری کیا گیا تھا۔ اس فرمان کی رو سے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ریاستوں کے سربراہوں کو ان تین راستوں سے ایک راستہ چُن لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔

(۱) ہندوستان کے ساتھ الحاق۔ (ب) پاکستان کے ساتھ الحاق۔

(۳) ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہنا۔

میں نے اپنی کلیدی تقریر میں ان متبادل راستوں کے حُسن و قبح پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور پھر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ایوان کو مشورہ دیا کہ ریاست کے لئے بہترین راستہ یہی ہوگا کہ وہ دستاویز الحاق کی بنا پر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے۔ آج اس تقریر پر کوئی تیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس مدت میں مجھے اور ریاستی عوام کو کئی پُر آشوب آزمائشوں اور زبردست مصیبتوں سے گذرنا پڑا۔ ہمیں آگ اور خون کے کتنے ہی دریا پار کرنا پڑے۔ لیکن میں وہیں پر کھڑا ہوں جہاں اُس وقت تھا۔ اور میرے خیال میں وہی نسخہ ہمارے مسائل کا بہترین حل ہے۔ جو اُس وقت میں نے پیش کیا تھا۔

اسمبلی نے آئین کے مسودے کی ترتیب کے لئے مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کی۔ جن میں بنیادی اور راہنما اصولوں سے متعلق کمیٹی بے حد اہم تھی۔ اس کے چیرمین بیگ صاحب مقرر ہوئے اور میر قاسم، ڈی پی در اور ہربنس سنگھ آزاد اس کے ارکان چُنے گئے۔

اسمبلی نے تقریباً اپنا پہلا فیصلہ شخصی حکمرانی کو ختم کرنے کی صورت میں لیا۔ سربراہِ مملکت کے سلسلے میں ہم نے گورنر کی تعیناتی پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ ہماری خاص پوزیشن کے منافی ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اِس عہدے کا نام صدرِ ریاست یہ کہہ کر تجویز کیا کہ گورنر اور اِس کا مفہوم ایک ہے۔ طے پایا کہ صدرِ ریاست کا انتخاب ریاست کی اسمبلی کیا کرے گی۔ اور اِس کی میعاد عہدیداری پانچ سال ہوگی۔ بعد میں صدرِ جمہوریہ کامیاب امیدوار کی تقرری کا باضابطہ اعلان کیا کریں گے۔ چنانچہ میری تجویز پر اسمبلی نے کرن سنگھ کو پہلا صدرِ ریاست منتخب کیا۔ مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ کرن سنگھ کو زندگی بھر کے لئے صدرِ ریاست بنایا جائے۔ انھوں نے یہ تجویز کن عوامل کے پیش نظر

رکھی۔ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن میں اصولی طور پر اسے غیر جمہوری سمجھتا تھا اور اس لئے میں نے اُسے قبول کر لینے سے انکار کر دیا۔ بہرکیف کرن سنگھ نے ۱۷ نومبر ۱۹۵۲ء کو پہلے صدرِ ریاست کی حیثیت سے حلف لیا۔ بعد میں اُنھوں نے ۱۹۵۳ء کے فوجی نرغے میں اُس حلف کی مٹی پلید کی۔ جس آئین کی رکھوالی کا انھوں نے حلف لیا تھا اُسے بے رحمی کے ساتھ پاؤں کے نیچے روند ڈالا۔ اِس نرغے نے اُن کا اپنا راستہ بھی صاف کر دیا۔ اور لگ بھگ بیس سال تک اِس عہدے پر براجمان رہ کر وہ زیادہ تر اپنے خاندانی مفادات کی نگہبانی کرتے رہے۔ وہ اپنی جگہ اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کہ انھوں نے اُس تحریک کے بانی کو سیاسی اِقتدار سے الگ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جس تحریک نے اُن کے خاندان کا ایک سو سالہ راج ختم کر کے اُن کے باپ کو گدی سے اُتار دیا تھا۔

آئین ساز اسمبلی کے سامنے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مرکز نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قیام کی منظوری تو دے دی تھی لیکن اِس کا رویّہ ہمارے معاملے میں ایسی ہی بے اعتمادی کا تھا جیسا کہ ایک شکی مزاج خاوند اپنی خوبصورت اور شوخ و شنگ بیوی کے سلسلے میں اِختیار کرتا ہے۔ ہندوستانی زعماء ہمارے کاندھے کی آڑ لے کر کنکھیوں سے آئین ساز اسمبلی کی کارروائی پر نظر رکھتے رہے۔ ہم نے مرکز کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ آئین کو صرف مسودۂ الحاق کی بنیاد پر مرتّب کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ اُن کے نقطۂ نظر کے مطابق دستاویزِ الحاق بہت سے امور میں تشنہ اور نامکمل تھی۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں "اس کے کچھ لوازمات ہیں جن کو پہلے صاف ہونا چاہئے: سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار ریاست پر لاگو ہو گا یا نہیں؟ ریاست کشمیر یونین کے مالی اور عام کے دائرۂ کار کا حصہ بنے گی یا نہیں؟ ریاست میں یونین کے پرچم کی کیا حیثیت

رہے گی۔ ریاست میں مرکزی الیکشن کمیشن کا اِختیار کیا ہو گا۔ وغیرہ۔ اِن نازک امور پر گفتگو میں بڑے مشکل مقامات آئے۔ بعض امور پر غور کرنے کے لئے ہم نے مہلت مانگی تاکہ ہم انھیں اپنے ضمیر و ذہن میں گھما پھرا کے کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ قومی پرچم کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اِس کی تعظیم پورے آداب کے ساتھ کی جاتی رہے گی اور اِسے رسمی مواقع پر لہرایا جاتا رہے گا۔ لیکن ریاست کا پرچم عام موقعوں پر لہرایا جائے گا۔ اور رسمی موقعوں پر بھی اِسے قومی پرچم کے شانہ بشانہ لہرانے کا حق حاصل ہو گا۔

ریاست کا پرچم تحریکِ آزادی کے ہل والے سُرخ پرچم پر تین عمودی سفید دھاریاں ڈال کر بنایا گیا۔ یہ دھاریاں ریاست کے فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ ریاست کی تین تہذیبی اور جغرافیائی اِکائیوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اور یہ پرچم تحریکِ آزادی کی شاندار روایات کے ساتھ ہمارے رشتے کا نشان ہے۔ یہ ہماری ریاست کی انفرادی شخصیت کی بھی علامت ہے۔ چنانچہ ہمارے سیکریٹریٹ میں قومی پرچم اور ریاستی پرچم آن بان کے ساتھ ایک دوسرے کے دوش بدوش لہرا رہے ہیں۔ ریاست کو سپریم کورٹ کے دائرے میں لانے کے بارے میں ہم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ریاست میں ہمارا ایک نظام عدلیہ موجود ہے۔ اور ہائی کورٹ سے اوپر جوڈیشل ایڈوائزری بورڈ بھی قائم ہے۔ اِس بورڈ میں ہندوستان کے لائق ترین جج بیٹھے اور کام کرتے ہیں۔ اِس لئے ہم سپریم کورٹ کے عدالتی نظام کے ساتھ منسلک ہونا لازمی نہیں سمجھتے۔ ہمارا اِستدلال یہ بھی تھا کہ ہماری ریاست کے عوام غریب ہیں اور دہلی سے بہت دور علاقوں میں رہتے ہیں۔ اِس لئے سپریم کورٹ تک پہنچنا اُن کے بس کی بات نہیں ہو گی۔ اور دولت مند اِستحصالیوں کا طبقہ ہی سپریم کورٹ کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال میں لائے گا۔ سپریم کورٹ کو پرے پرے رکھنے کے سلسلے میں ہمارا یہ خیال بھی

کار فرما تھا کہ ہم نے خاتمۂ جاگیر داری وغیرہ جو ترقی پسند اور عوام دوست اقدام اُٹھائے ہیں۔ اُن کی تاب ہندوستان کا متعابلتاً قدامت پسند آئین نہ لا سکے گا اور یہ ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ ہم کوئی اہم پیش قدمی نہ کر سکیں گے اور ہمیں صرف سپریم کورٹ کی غلام گردشوں میں صفائی دینے کے لئے وقت اور سرمایہ ضائع کرنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر گذشتہ ۵۳ء تک ہم سپریم کورٹ سے دور نہ ہوتے تو ہم عوامی بہبود کے وہ سب قدم نہیں اٹھا سکتے جنھوں نے صرف ریاست کے عوام کی ہی تقدیر نہ بدل ڈالی بلکہ دیر سے ہی سہی سارے ملک سے داد حاصل کی۔

جواہر لال ہماری اِس دلیل کے ساتھ متفق ہو گئے لیکن گوپالا سوامی اور دوسرے لوگوں کے کہنے پر معاملہ مزید غور و خوض کے لئے اِلتوا میں رکھا گیا۔ یہی صورت مالی ادغام کے سلسلے میں بھی اختیار کی گئی۔ ہم نے مرکز کو جتایا کہ یہ ایک اُلجھا ہوا ٹیکنیکی مسئلہ ہے اور اس کی تمام باریکیوں پر غور کرنے کے لئے ہمیں فرصت ملنی چاہئے۔ البتہ ہم نے سزائے موت کو معاف کرنے کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ کے حق کو تسلیم کیا۔

اِن مذاکرات کا جو نتیجہ نکلا وہ معاہدہ دہلی (DEHLI AGREEMENT) کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ یونین کے ساتھ ہمارے آئینی تعلقات میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے ہم بھی اِس کو ضمیمے کے طور اس کتاب کے آخر میں منسلک کر رہے ہیں۔

دہلی معاہدے کو آخری شکل دینے کے لئے مرکز کی طرف سے جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، گوپالا سوامی آئینگر اور سر گرجا شنکر باجپائی بات چیت میں حصہ لے رہے تھے۔ اور ریاست کی طرف سے راقم الحروف، بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ حصہ لے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے جب معاہدے کی کسی شق پر زوروں کی بحث ہو رہی تھی تو جواہر لال نے میرے کان میں ایک اندازِ دلربائی کے ساتھ کہا "شیخ صاحب اگر آپ ہمارے ساتھ

بغل گیر ہونے میں تامل کریں گے تو ہم آپ کے گلے میں سونے کی زنجیریں پہنا دیں گے" میں جواہر لال کو ایک لحظے کے لئے دیکھتا رہ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسا کبھی نہ کیجئے گا کیونکہ اس طرح آپ کشمیر سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے" جواہر لال کی اِس ذہنی کیفیت پر میرے ذہن کے مطلع پر اقبالؔ کا یہ شعر روشن ہو گیا تھا۔ ع

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

لیکن جواہر لال ہماری ذہنی کیفیت کے بارے میں صاف طور پر غلط اندازہ لگا رہے تھے۔

معاہدے کے طے پا جانے کے بعد جواہر لال نے پارلیمنٹ کو اِس کے موٹے موٹے خد و خال سے آگاہ کیا۔ لیکن انھوں نے اس کی بعض شقوں کو دانستہ طور پر مبہم رکھا۔ میں نے بھی معاہدہ دہلی کی دستاویز کو اپنے نقطۂ نظر کے ساتھ ریاستی آئین ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا تاکہ مستقبل میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ دہلی سے جب میں معاہدہ کے بعد لوٹا تو میں نے لال چوک کے ایک بھاری جلسے میں عوام کو اِس بارے میں اِعتماد میں لیا۔

قانون ساز اسمبلی میں اس معاہدے کو پیش کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"مرکز اور ریاست دونوں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو کافی حد تک قبول کیا ہے۔ دونوں کی اس آرزو نے رہنمائی کی ہے کہ وہ موجودہ رشتے کو مضبوط بنائیں اور اِس سلسلے میں تمام اِبہام اور رکاوٹوں کو دور کریں ہم پہلے کی طرح آج بھی اِس بات کے قائل ہیں کہ ہمیں ہندوستان کے عوام اور حکومت کی اِس بات کی حمایت حاصل ہے کہ ہم اپنے جمہوری آدرشوں کو

پورا کریں اور اپنے نصب العین کو جا لیں۔"

آئین ساز اسمبلی کے اِنعقاد کے بارے میں جب ہم نے پہل کی تو پاکستان بہت برہم ہوا۔ اُس نے سلامتی کونسل میں شکایت کی کہ ہندوستان چور دروازے سے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کروانا چاہتا ہے۔ اور اِس طرح اِس قرارداد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے جو سلامتی کونسل نے ریاست میں رائے شماری کرنے کے بارے میں منظور کی ہے اور جسے ہند اور پاکستان دونوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ اُس وقت اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کی قیادت سر بی۔ این راؤ کر رہے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے دو بار سلامتی کونسل کے اجلاس میں مداخلت کرتے ہوئے کونسل کو یقین دلایا کہ ہندوستان ایسا کرنے کا کوئی بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ اُس فیصلے پر قائم رہے گا جو کونسل نے ریاست میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کا آئین وِفاق میں شامل ہر ایک ریاست کو آئین ساز اسمبلی بُلانے کا حق دیتا ہے اس لئے ہم اہالیانِ کشمیر کو آئین ساز اسمبلی طلب کرنے سے روک نہیں سکتے۔ آئین ساز اسمبلی اِلحاق کے بارے میں بحث تو کر سکتی ہے لیکن ہند اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں ہو گا۔ ہند کے دوسرے نمائندے راجیشور دیال نے سلامتی کونسل کو یقین دلایا کہ میں از سرِ نو اس بات کو دُہراتا ہوں کہ جہاں تک حکومتِ ہند کا تعلق ہے کشمیر کی آئین ساز اسمبلی بُلانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ کشمیر کا جو سوال سلامتی کونسل کے سامنے ہے اُس کو طے کرنے کی کوششوں میں کوئی رخنہ ڈال دیا جائے یا اس سلسلے میں کونسل کا راستہ روکا جائے۔ اُدھر گوپالا سوامی کی خواہش تھی کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے بارے میں ایک قرارداد پاس کر لیں۔ لیکن جب میں نے ہندوستان کی اِس "معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است" والی

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است ‏ ‏ ‏ با ما شراب خوردہ بہ زاہد نماز کرد

پالیسی کو دیکھا تو میں نے اِلحاق کے معاملے کو آئین ساز اسمبلی میں زیرِ بحث لانا بے کار اور بے فائدہ تصوّر کیا۔ کیونکہ جس ملک کے ساتھ ہم الحاق کرنے کے فیصلے کی تصدیق کرنا چاہتے تھے اُس نے اِس فیصلے کو تسلیم کرنے سے معذوری کا اظہار بین الاقوامی سطح پر کیا تھا۔ ہم یک طرفہ اصرار کرتے رہتے تو ماں نہ ماں میں تیرا مہمان والی کیفیت تازہ ہو جاتی۔ اِس کے باوجود اسمبلی کا افتتاحی اجلاس سرینگر میں شروع ہوا تو گوپالا سوامی کے مُرغے کی ایک ہی ٹانگ تھی کہ الحاق کے متعلق تجویز پاس کی جائے۔ جس وقت آئینگر صاحب نے یہ تجویز پیش کی اس وقت ہم نئی دہلی میں وزیر اعظم کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ بخشی غلام محمد بھی میٹنگ میں موجود تھے۔ آئینگر کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ پنڈت جی پر اپنے مشہورِ زمانہ غصّے کا دورہ پڑا۔ وہ فرطِ غضب سے لال پیلے ہو گئے اور کہنے لگے "میں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ اِس طرح ہندوستان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہم نے بار بار بین الاقوامی سٹیج پر ہندوستان اور خود کشمیری عوام کے سامنے اِس بات کا یقین دلایا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔ ان حالات میں ہم کیسے اپنے عہد و پیمان سے روگردانی کر سکتے ہیں۔ اور دنیا کے طعن و تشنیع کا نشانہ بن سکتے ہیں۔"

پنڈت جی اخلاقی سطح پر بالکل درست کہہ رہے تھے اور اُن کی بات اصولوں کی کسوٹی پر ٹھیک اُترتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت میرے دل میں اُن کے لئے احترام کے جذبات کئی گنا بڑھ گئے اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ گاندھی جی نے صحیح آدمی کو اپنا جانشین بنا لیا ہے اور یہی اُن کی اخلاقی عظمت کو برقرار رکھنے کا دل گردہ رکھتا ہے۔ مجھے گاندھی جی کا وہ قول بھی یاد آیا جب اُنھوں نے کہا تھا کہ اِس

وقت جبکہ میں زندہ ہوں، جواہر لال مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے لیکن میں نہ رہوں گا تو جواہر لال میرا شعار اپنائے گا۔" مجھے کیا معلوم تھا کہ مہاتما گاندھی جیسے بے ریا اور باصفا قلندر ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں اور ہر چمکنے والی چیز پر زرِ خالص کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال ہم پنڈت جی کی اِس پُر جلال للکار سے خاموش ہو گئے اور گوپالا سوامی تو ہونٹ سی کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اُن کے ارشاد کی روشنی میں الحاق کے مسئلے کو آئین ساز اسمبلی میں موضوعِ بحث بنانے سے گریز کیا۔ میں نے کشمیر کے مستقبل کا حل ڈھونڈنے کے لئے جو راستہ چُنا تھا وہ طاق پر ہی پڑا رہا۔ لیکن کمالِ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ۱۶ مئی ۱۹۵۲ء کو جب پنڈت جواہر لال نہرو ہفتہ بھر کے لئے سرینگر آئے تو انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بُلا کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کی توثیق کرا دوں۔ اُس وقت مجھے اُن کی پہلی بات یاد آئی۔ میں اُن کے دلآویز کشمیری چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اُن کی اخلاقی عظمت کا جوہر اِس چہرے کی تاریخ ساز جھرّیوں کے کس خوبصورت گرداب میں کھو گیا ہے؟ جواہر لال نے پھر اپنی بات دہرائی تو میں نے اُن کی خواہش کی تکمیل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

اب یہ میری باری تھی۔ جواہر لال کا حافظہ تازہ کرانے کی اور اُنھیں یہ یاد دلانے کی کہ کشمیر میں رائے شماری کرانے کے سلسلے میں ہم ساری دُنیا اور کشمیر کے سامنے قول ہار چکے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اس قدر پابند (COMMIT) ہو چکے ہیں کہ اب ہم اپنی رُسوائی کی قیمت پر ہی اپنے وعدے سے مُکر سکتے ہیں۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کرلیں تو دُنیا کو کیا مُنہ دکھائیں گے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ کہا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کے راہنما ہیں۔ اور ان کے دم سے ہندوستان کی اخلاقی برتری کا بھرم قائم ہے۔ اگر ہم اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اُن کی شہرت پر دھبّہ اور اُن کی عزت پر بٹّہ لگ جائے گا۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ مجروح اور اس کی اخلاقی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔ اگر ایسا کرنے سے کوئی مثبت اور مفید نتیجہ نکلتا تو بات بھی تھی۔ لیکن آپ نے بہت پہلے سلامتی کونسل نے فورم میں اسمبلی کے فیصلے کو اپنے لئے بے وزن اور بے وُقعت قرار دیا ہے۔ اِس لئے سلامتی کونسل بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گی۔ پاکستان کے ماننے کی بات تو بہت دور رہی۔ دُنیا کی رائے عامہ پاکستان کی ہم نوائی کرے گی۔ خود کشمیری عوام کا آپ پر اعتماد متزلزل ہو جائے گا اور جس تنازعے کو ختم کرنے کے لئے ہم یہ سب کچھ کریں گے وہ ایک شمشیرِ برہنہ کی طرح ہمارے سروں پر بدستور لٹکتا رہے گا۔ میں نے پنڈت جی کو گوپالا سوامی کی تجویز کے جواب میں ان کا ردِ عمل بھی یاد دلایا اور کہا کہ جب ہم نے آئین ساز اسمبلی میں الحاق کے معاملے کی توثیق کے لئے پہل کی تھی اُس وقت تو آپ آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ اب اتنی دور سفر کرنے کے بعد کونسی ایسی بات ہو گئی ہے کہ آپ ہمیں وہی کچھ کر گذرنے کی ترغیب دیتے ہیں جسے آپ خود اتنی حقارت سے ٹھکرا چکے ہیں؟

میں نے دورانِ گفتگو جواہر لال سے یہ بھی کہا کہ کشمیر کے معاملے کو اگر ہم اپنے ڈھنگ اور اپنی ڈگر پر حل کرنا چاہتے ہیں تو اُس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم کشمیری عوام کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کریں۔ ایسا کرنے کی دو تدبیریں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم ایک ایسا دیانتدار اور دردمند انتظامیہ اُن کو دیں جو اُن کے دُکھوں کا مداوا کرنے کی اہلیت رکھ سکتا ہو اور اُن کی زار و زبوں حالت کو شفایابی اور خوش حالی کی منزل کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو۔ دوئم یہ کہ ہم ریاست کی بے مثال غُربت کو مٹانے کے لئے مصروفِ عمل ہوں۔ تاکہ صدیوں سے دبے کچلے اور سسکتے ہوئے عوام کی حالت کچھ تو سنبھل پائے اور وہ گداگری کی سی ہوئی زندگی کو عتاب و عذاب

کی صورت میں نہ سمجھتے رہیں۔ جواہر لال گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ جیسے ہڑبڑا کے جاگے اور کہنے لگے اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ میں نے جواب میں کہا کہ میرے لئے سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ انتظامیہ میں میرے اہم اور قریبی ساتھی رشوت ستانی اور بدعنوانی کی علت کے شکار بن چکے ہیں۔ میرے اس انکشاف سے جواہر لال کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ بہت گھمبیر صورت بناتے رہے۔ میں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں نے بڑا زور لگایا کہ ان سے یہ غلط عادات چھوٹ جائیں لیکن حالات سدھرنے کی بجائے بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے عوام میں ہماری مقبولیت کا گراف بھی زوال کی طرف آ رہا ہے۔ اگر یہی صورت رہی تو ہم لوگوں کے اعتماد سے ہی محروم رہ جائیں گے۔ جواہر لال نے جز بز ہو کر کہا کہ ایسے ساتھیوں کا نام لیجئے۔ میں نے بخشی غلام محمد اور دو ایک ساتھیوں کا ذکر کیا۔ میں نے جواہر لال سے کہا کہ میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ ان ساتھیوں کو کابینہ سے الگ کر دوں۔ لیکن میں پہلے آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ جواہر لال نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فی الحال اپنا ہاتھ روکوں۔ جب تک کہ وہ دولت مشترکہ کی کانفرنس سے، جو چند ہی دنوں کے بعد لندن میں ہونے والی تھی، واپس نہ آ جائیں۔ فضا میں بڑا کھنچاؤ موجود تھا۔ جواہر لال کے تیور بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پہلی جیسی اپنائیت نہیں جھلکتی تھی۔ بلکہ ایک عجیب قسم کا اجنبی پن تھا۔ میں بھی اپنے گرد و پیش کے واقعات اور ساتھیوں کی حرکات و سکنات سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ مجھے ریا کاری کا فن نہیں آتا اور نہ مجھے اپنے چہرے پر نقلی چہرے سجا لینے کا قرینہ معلوم ہے۔ میں اپنے دل کی کیفیات کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتا رہا۔ جب جواہر لال پہلے کبھی تشریف لاتے تھے تو میں ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن اب کے میرا دل ایسا کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اور ہم الگ الگ گاڑیوں میں چشمہ شاہی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جواہر لال کی ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں بھرے بیٹھے ہیں اور مجھ پر ان کے اعتماد کی اینٹ ہل چکی ہے۔ اس لئے میں اپنے آپ کو ان پر ٹھونسنا اور انھیں افسردہ خاطر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جواہر لال نے پچھلے برسوں میں ہمیشہ میرے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھا تھا۔ اور میرے ساتھ بڑی اپنائیت اور شگفتگی سے راز و نیاز کا تبادلہ کیا تھا۔ لیکن اب کے یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے الگ بخشی غلام محمد اور اپنے کچھ اور معتمدوں کے ساتھ کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی شائستگی سے یہ طور طریقے اختیار کرنے کی امید نہ تھی۔ لیکن آثار و قرائن پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔ قصہ مختصر ان دنوں جواہر لال کا رویہ اکبر الہ آبادی کی بیان کردہ کیفیت سے بہت قریب تھا ؎

اِدھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
اُدھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیمان ہوتے جاتے ہیں

بہر حال جواہر لال کشمیر سے واپس گئے تو ان کے طرز عمل نے معاملے کی گتھی اور زیادہ اُلجھا دی تھی۔ بے اعتمادی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور میں اور میرے کچھ ساتھی ایک دوسرے سے اور زیادہ کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ دہلی سے انھوں نے مجھے ایک نوٹ بھیجا۔ جس میں انھوں نے کشمیر کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس نوٹ کو اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھوں اور کشمیر کے مستقبل کے لئے جو ہماری تجاویز ہوں انھیں ان کی لندن روانگی سے پہلے پہلے ان کے پاس بھجوا دوں۔ میں نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا اور اس کے سامنے جواہر لال کا نوٹ پیش کر کے اس پر بحث کی مانگ کی۔ اجلاس میرے نجی دفتر میں ہوا اور جلد ہی ہم کشمیر

اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں سرگرم گفتگو ہو گئے۔ سپریم کورٹ کے کشمیر پر دائرہ اختیار کی توسیع کا ذکر چلا تو بڑی گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔ ایک گروپ کی رائے اس کے حق میں اور دوسرے کی اس کے خلاف تھی۔ مولوی محمد سعید پہلے گروپ کے نفس ناطقہ بن گئے تھے تو بیگ صاحب دوسرے مکتبۂ خیال کے وکیل اور ترجمان۔ جب دلائل کی تلواروں سے چنگاریاں اڑنے کے باوجود کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا تو میں نے تجویز کی کہ بیگ صاحب اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل رکھتے ہیں اُن کو ترتیب دیں۔ دوسرے مکتبِ فکر کی جانب سے دُرگا پرشاد در اپنے دلائل قلمبند کریں۔ میں اِن دونوں دستاویزات کو کسی ماہرِ قانون کے پاس بھیج کر اُس کی رائے اِس بارے میں طلب کروں گا کہ ریاستی عوام کے حق میں اور ریاست کے مفاد میں کس راستے کی پیروی بہتر رہے گی؟ ورکنگ کمیٹی نے کشمیر کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لینے اور اس کے حل کے لئے مناسب تجویزیں تلاش کرنے کے لئے آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا۔ جس کے ارکان یوں نامزد ہوئے۔

(۱) راقم الحروف (۲) بخشی غلام محمد (۳) مولانا محمد سعید مسعودی (۴) مرزا محمد افضل بیگ (۵) خواجہ غلام محمد صادق (۶) سردار بدھ سنگھ (۷) پنڈت گردھاری لال ڈوگرہ، (۸) پنڈت شیام لال صراف۔

ظاہر ہے کہ اس ورکنگ گروپ میں جو ارکان بنائے گئے تھے وہ نیشنل کانفرنس کی صفِ اول کے رہنما تھے بلکہ چوٹی کے تمام لیڈر اس میں اکٹھا کئے گئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ کشمیر کے تنازعے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے جو بھی تجاویز وہ سوچ سکیں اُن کو ورکنگ گروپ میں پیش کیا جانا چاہئے۔ تاکہ ہم اُن پر بھر پور بحث کر سکیں۔ اور پھر باہمی مشاورت اور مصالحت سے کوئی ایسا حل نکال سکیں جس پر سب کا اتفاق ہو۔ پھر

ان تجاویز کو جنرل کونسل کے سامنے پیش کر کے اُس کی منظوری حاصل کریں۔ چنانچہ مہینہ بھر بات چیت اور بحث ہوتی رہی۔ ہر ممبر نے اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں۔ جن کی تعداد بیس بائیس سے اُوپر پہنچ گئی۔ ہم نے ہر تجویز پر غور کیا۔ اور بالآخر چار پر اتفاق رائے ہو گیا۔ جو ترجیح کے اعتبار سے یوں ہیں۔

ا۔ چار جون ۱۹۵۳ء کی میٹنگ میں طے شُدہ شرائط کے مطابق استصواب رائے عامہ۔

ب۔ ساری ریاست کی خود مختاری۔

ج۔ ساری ریاست کی خود مختاری لیکن امور خارجہ اور دفاع پر ہند اور پاکستان کا مشترکہ کنٹرول۔

د۔ ڈکسن پلان۔ استصواب رائے عامہ والے علاقے کی خود مختاری کے ساتھ۔

بخشی غلام محمد نے ڈکسن پلان کی حمایت کرتے ہوئے وادی کو آزاد رکھنے کی تجویز کو سب سے زیادہ پسند کیا۔ بلکہ وہ اِس تجویز کے اس قدر گرویدہ بن گئے کہ اُنھوں نے اِس بات پر زور دیا کہ صرف اسی تجویز کو ورکنگ گروپ کی طرف سے سفارش کے طور پر جنرل کونسل میں پیش کیا جانا چاہئے۔ بخشی صاحب نے اِسے واحد، قابلِ عمل اور آبرو مندانہ حل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اُسے سرِ فہرست رکھا جائے۔ مولانا سعید کی رائے یہی کہ ان تجاویز کی ترتیب اسی طرح رہنی دی جائے۔ غلام محمد صادق کی رائے حسب ذیل تھی۔

"اگر ہندوستان، پاکستان، افغانستان، سوویت یونین اور جمہوریہ چین پانچ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک ایجنسی رائے شماری کی نگرانی اور انتظام کے لئے پیدا کی جا سکے تو اس صورت میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ریاست کے لوگوں کی رائے شماری کا مطالبہ کریں اور اگر ان پانچ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ایجنسی کا مطالبہ پورا نہ ہو سکے تو اس صورت میں ہم کو مطالبہ کرنا چاہئے کہ رائے شماری کی نگرانی کے لئے ایک ایسا کمیشن

مقرر کیا جانا چاہیے جو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے تمام ممبروں پر مشتمل ہو تاکہ ریاست کشمیر میں آزاد اور منصفانہ رائے شماری یقینی بنائی جا سکے۔"

ورکنگ گروپ نے اگرچہ چار چار تجاویز پر پورا اتفاق کیا لیکن اتفاق کرنے والوں میں کچھ دوست کئی چہرے جیب میں لئے پھرتے تھے۔ وہ ہمیں معقولیت اور انصاف پسندی کا تاثر دے رہے تھے۔ لیکن اندر اندر سے کسی اور ہی ناٹک کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ لیکن مجھے اُن کے رویّے سے زیادہ جواہر لال کے بدلتے ہوئے تیوروں پر رنج تھا۔ اُنھوں نے زرعی اصلاحات کے معاملے پر میرے ساتھ خیالات کی ہم آہنگی کے باوجود اِس بارے میں کھلم کھلا اپنے شکوک ظاہر کئے تھے۔ چنانچہ میں نے اس پر احتجاج کیا۔ میرے ذہن میں کون سے خیالات موجزن تھے۔ اُس کا اندازہ اُس خط کے اقتباس سے ہو گا جو میں نے اُنھیں جولائی ۱۹۵۱ء میں لکھا:

"یہ بات طے ہے کہ ہندوستان میں اِس قسم کے طاقتور اثرات کارفرما ہیں جو ہندوستان کو سیکولر مملکت بنانے کے آپ کے آدرش اور آپ کی کشمیر پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتے۔ اُن کی مستقل کوشش ہے کہ آپ کو کمزور کیا جائے۔ اِس مقصد کے لئے وہ اُن سبھی لوگوں کو نیچے گرا دینا چاہتے ہیں جو آپ کے ساتھ وابستہ اور آپ کے وفادار ہیں۔ جہاں میرا احساس ہے کہ میں بھی خوشی آپ کے لئے قربان ہونے کو تیار ہوں وہاں مجھے اندیشہ ہے کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کی تقدیر کے محافظ کی حیثیت سے میں اُن کی محبوب اُمنگوں اور حقوق کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں نے بار بار بیان کیا ہے کہ ہم نے اِس لئے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا ہے کہ یہاں گاندھی جی اور آپ جیسے اُمید اور اُمنگ کے روشن ستارے موجود تھے۔ اس لئے پاکستان کے ساتھ بہت سی مماثلتوں کے باوجود ہم نے اُس کے ساتھ الحاق نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے پروگرام اُن کی پالیسیوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمیں اِس نتیجے پر پہنچا دیا جائے کہ اپنی ریاست کو اپنے مقررہ خطوط اور اپنی خاص اہلیت کی مناسبت سے تعمیر نہیں کر سکتے تو میں نہ تو اپنی قوم کو کوئی جواب دے سکتا ہوں اور نہ اُنھیں اپنا مُنہ دکھا سکتا ہوں۔"

▲▲▲

(۴۸)

سبھی اپنے تھے جن کے ہاتھ پر دھبے لہو کے تھے

معاہدۂ دہلی کو ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے پسند نہیں کیا۔ ہندوستانی اخبارات نے بھی اس کی نکتہ چینی شروع کر دی۔ بعض اخبارات نے طنزاً یہاں تک لکھا کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کا کشمیر کے ساتھ ہوا ہے۔ میری ذات خاص طور پر تنقید اور تعریض کے تیروں کا نشانہ بنا دی گئی اور مجھ پر نکتہ چینی کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ پارلیمنٹ میں تقریباً روزانہ سوالات اُٹھائے جاتے رہے۔ اور جواہر لال کو بھی خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ پرجا پریشد نے جموں میں ایک زبردست تحریک چلائی۔ اس تحریک کے انجن میں روغن ڈالنے کے لئے خاص طور پر مہاراجہ ہری سنگھ اور وہ تمام عناصر فیاضی سے دولت لٹاتے رہے جن کے مفادِ خصوصی پر ہمارے اقدامات سے زد پڑ گئی تھی۔ یہ جماعت تمام ہدایات اور سرپرستی راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور جن سنگھ سے حاصل کرتی رہی۔ ایک دفعہ جواہر لال نہرو اس تحریک کے بارے میں بات کرتے ہوئے بے ساختہ طور پر اپنے دلی خیالات کی غمازی کر گئے۔ انھوں نے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "یہ تحریک بے موقع شروع کی گئی ہے جس سے فائدہ کی بجائے

نقصان کا احتمال ہے البتہ جن مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ تحریک چلائی جا رہی ہے اُن سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کے زیادہ قریب آ جائے۔ لیکن پرجا پریشد اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کر رہی ہے۔ وہ دانش مندی پر مبنی نہیں ہے۔"

اِس طرح کی رائے مولانا آزاد نے بھی ظاہر کی تھی۔ میں نے اس طرزِ فکر پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ جواہر لال اور مولانا آزاد جو کہتے ہیں اس میں اور جن سنگھ کے رویے میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں کا منتہائے مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ اُن کے مابین طریق کار کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتا ہے، دوسرا زمانہ سازی کی نقاب اوڑھ کر مناسب موقع و محل کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کشمیر اور مرکز کے درمیان جو قول و قرار عہد و پیمان اور سمجھوتے ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی رہنماؤں کے نزدیک اُن کا کوئی تقدس نہیں اور وہ اپنے من کی ایک ترنگ سے انھیں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے سے عار نہیں کریں گے۔ مرکزی راہنماؤں کا یہ رویہ اُن کے اس اندازِ فکر کی پیداوار ہے کہ کشمیر کے ساتھ معاہدے دائمی نہیں بلکہ عارضی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اِس بات کا اظہار بھی کیا کہ یہ رویہ مرکز اور ریاست کو ایک دوسرے کو قریب لانے کی بجائے اُن میں شک و شبہے اور بدگمانی کی خلیج پیدا کرے گا۔

میری یہ حق گوئی ان بزرگوں کو بہت گراں گذری اور انھوں نے کئی بار اس کا شکوہ بھی کیا۔ بعد میں جواہر لال کے معتمد اور محکمۂ جاسوسی کے سربراہ بی۔ این ملک نے بھی اپنی کتاب میں اِس بات کی تصدیق کی کہ جواہر لال نے اُن سے کہا تھا کہ انھیں جن سنگھ اور پرجا پریشد کی تحریک کے مقاصد سے پوری ہمدردی ہے وہ کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنے کے لئے اقدامات کرتے لیکن اِس سے سلامتی کونسل میں شور مچ جائے گا۔

ہندوستان میں اس وقت جو فضا بن رہی تھی اُس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جے پرکاش نرائن اور اچاریہ کرپلانی جیسے لیڈر بھی پرجا پریشد کی تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ اور جواہر لال کو اُن سے اپیل کرنا پڑی تھی کہ وہ اس مسئلے میں ٹانگ اڑا کر حالات کو اور زیادہ پیچیدہ نہ بنائیں۔

مرکزی محکمۂ دفاع نے کشمیر میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے پرمٹ سسٹم کا رواج جاری کیا۔ ہر کوئی شخص کشمیر میں آتے وقت یا یہاں سے باہر جاتے وقت یہ پرمٹ حاصل کرنے کا پابند تھا۔ خود مجھے بھی یہ پرمٹ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ یہ طریقہ کار ہمارے مفادات کے لحاظ سے بہت اچھا نہیں تھا۔ اور اس کی وجہ سے ہماری سیاحت کی صنعت پر جو کشمیر کی سب سے بڑی اور قدرتی صنعت ہے، کافی خراب اثر پڑا۔ ہم نے کئی بار چاہا کہ یہ سسٹم منسوخ کیا جائے اور اس سلسلے میں مرکز کی طرف بھی رجوع کیا جائے۔ لیکن محکمۂ دفاع کی ہٹ دھرمی کے سامنے ہماری ایک نہ چلی۔ جن سنگھ کے بانی راہنما ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی جو ہندوستان بھر میں پرجا پریشد کی ہمارے خلاف جاری کی ہوئی تحریک کی پشت پناہی کے لئے مہم چلا رہے تھے۔ اب پرمٹ سسٹم کی آڑ لے کر ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے۔ انھوں نے اِس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر مکرجی ایک بنگالی تھے اور بڑے لائق فائق شخص۔ وہ انگریزی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے مقرر تھے اور پارلیمنٹ میں ان کی تقریر بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی۔ وہ کچھ دیر نہرو حکومت میں سول سپلائز کے وزیر بھی رہے۔ ان کی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے میرے دل میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ وہ مسئلہ کشمیر اور یہاں کے حالات پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے مجھ سے ملے۔ انھیں کشمیر سے تو بس واجبی ہی دلچسپی تھی۔ لیکن جموں کے مستقبل پر وہ آتش زیر پا تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم الحاق کے بارے میں اپنی آئین ساز اسمبلی میں حتمی اور

قطعی فیصلہ لیں اور بین الاقوامی بندھنوں سے آزاد ہوجائیں۔ میں نے انھیں مسئلہ کشمیر کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اس بات کا انحصار مرکز پر ہے اور مرکز کو ہی فیصلہ کرنا ہے کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے کسی فیصلے کو حتمی تصور کرے گا یا نہیں۔ اور جو وعدے اُس نے بین الاقوامی سطح پر کئے ہیں، آیا وہ اُن سے انحراف کے لئے آمادہ ہے؟ میں نے ڈاکٹر مکرجی کو یاد دلایا کہ جب ہم نے آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا اقدام کیا تھا تو گوپالا سوامی آئینگر نے نہرو کو مشورہ دیا تھا کہ حکومتِ ہند ایک خاص اعلان جاری کرکے ہمارے صدر ریاست کے جاری کردہ فرمان کو خلاف قانون قرار دے۔ میں نے انھیں یہ بھی یاد دلایا کہ آئین ساز اسمبلی کا سوال جب سلامتی کونسل کے سامنے آیا تھا تو ہندوستانی نمائندے بی۔ این۔ راؤ نے بانگ دُہل اعلان کیا تھا کہ آئین ساز اسمبلی زیادہ سے زیادہ اپنی رائے کا اظہار کرے گی اور ہندوستان اس کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ اس لئے آپ کو اِس سوال کا جواب ہم سے پوچھنے کی بجائے مرکز سے دریافت کرنا چاہیے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے آئین ساز اسمبلی کو خاص طور پر اِسی سوال کو حل کرنے کے ایک معقول طریقے کی حیثیت سے طلب کیا تھا۔ لیکن تالی صرف ایک ہاتھ سے تو بجنے سے رہی یہ تو دو طرفہ عمل کی طالب ہے۔ انھوں نے کچھ اور معاملات بھی اٹھائے اور میں نے انھیں بے تکلفی کے ساتھ اپنی حکومت کے رویے سے آگاہ کیا۔

جیسا کہ ظاہر ہے پرمٹ سسٹم کو ختم کرنا ریاستی حکومت کے حدِ اختیار میں نہ تھا لیکن اس کے خلاف تحریک چلانے والوں نے جان بوجھ کر ریاستی حکومت کو اپنا ہدف بنایا۔ بالآخر جب محکمۂ دفاع نے اسے ترک کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو شیاما پرشاد مکرجی نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ہوم منسٹر کی حیثیت سے امن و قانون کا قلمدان بخشی غلام محمد کی تحویل میں تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ حالات و واقعات سے یہ بات مجھ پر اچھی طرح آشکارا ہو گئی تھی کہ مرکز اور خاص طور پر جواہر لال اب مجھ سے زیادہ بخشی غلام محمد پر اعتماد کرتے ہیں اس معاملے کا تعلق ہندوستان کے ایک لاقی تنظیم رہنما کے ساتھ تھا اس لئے میں نے بخشی صاحب کو ہدایت دی کہ وہ جواہر لال سے رابطہ قایم کر کے اس بارے میں انہی کے مشورہ پر عمل کریں۔ اُدھر جب شیام پرشاد جی لکھن پور پہنچے، جہاں سے کشمیر کی حدود شروع ہو جاتی ہیں تو حیرت انگیز منظر مجھے بیان کیا گیا کہ پنجاب پولیس کے آفیسر ڈاکٹر مکرجی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی بجائے انہیں خراماں خراماں کشمیر کی سرحد پار کرنے میں مدد کر رہے ہیں۔ اور اس مرحلے کو آسان بنانے کے لئے اس طرح کے جتن کر رہے ہیں جیسے وہ پولیس کے آفیسر نہ ہوں بلکہ جن سنگھ کے رضاکار ہوں۔ بات صاف تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح میری حکومت کو ہندوستان میں بدنام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس غرض کے لئے امرتسر میں تنظیم ہندوستانی انٹلی جنس کے سرگروہ ڈی۔ ڈبلیو مہرہ سے ہدایات حاصل کر رہے تھے۔ بلراج مدھوک نے تو بعد میں اپنی کتاب میں الزام لگایا کہ یہ پولیس آفیسر اس لیے شیام پرشاد مکرجی کے داخلہ کشمیر کے حق میں تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہاں جا کر سپریم کورٹ سے ان کی رہائی کے سلسلے میں کوئی ہدایت نامہ حاصل نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ اس وقت کشمیر پر سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار حاوی نہیں تھا۔ بہر حال اگر یہ بات بھی اُن کے ذہن میں رہی ہو تو اس کا مقصد بھی کشمیر کی حکومت اور اس کے اصولی موقف کے خلاف بدظنی پیدا کرنا تھا۔ یہ اتنی گہری سازش تھی کہ جواہر لال نہرو نے اُسی دن جس دن مکرجی گرفتار ہوئے یعنی ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو اپنے وزیر داخلہ ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو کو ایک سخت خط لکھا جس میں اس طریق کار پر احتجاج کیا۔ انھوں نے ۲۶ مئی ۱۹۵۳ء کو مشرقی

پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھیم سین سچر کو خط لکھ کر اس طریقہ کار پر رنج کا اظہار کیا۔ بہر حال جونہی شیاما پرشاد مکرجی مادھو پور کے پل کو عبور کر کے کشمیر کی سرحد میں گھس آئے تو بخشی صاحب نے اُن کو قانون توڑنے کی پاداش میں گرفتار کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم انھوں نے جواہر لال سے رابطہ قائم کیا تھا یا نہیں، لیکن اُن کے طریق عمل سے یہ بات بعید نہ تھی کہ وہ معاملات کو بگاڑ کر اپنے لئے مواقع پیدا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ وہ دوہری چالیں چلنے میں اُستاد تھے۔ اور یہ ان کے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا سنہری موقع تھا۔ ڈاکٹر مکرجی کو سرینگر لایا گیا۔ جب میں نے یہ خبر سُنی تو میں نے بخشی صاحب سے صرف اتنا کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اور اُن کے مرتبے کے لحاظ سے انھیں راحت و آرام پہنچانے کے لئے تمام سہولیات بہم ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو نشاط باغ کے پاس ایک خوبصورت بنگلے میں رکھا گیا۔ اُن کی دیکھ بھال اور آرام و آسایش کی ذمہ داری جیل خانہ جات کے منسٹر شیام لال صراف کے سپرد کی گئی اور وزیر داخلہ کی حیثیت سے بخشی صاحب سے بھی کہا گیا کہ وہ سارے انتظامات کی دیکھ ریکھ کرتے رہیں۔ میں نے کئی بار ڈاکٹر صاحب کی صحت کے متعلق استفسارات کئے اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ ایک دفعہ پارلیمنٹ کے اسپیکر سردار حکم سنگھ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے کشمیر آئے۔ ملاقات کے بعد مجھ سے ملے تو شکایت کرنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب کو چہل قدمی اور سیر کے لئے بنگلے سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہے اور وہ اجازت ملنے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے متعلقہ وزیر کو بلا کر اُسے سرزنش کی کہ اس کا وطیرہ ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے معزز مہمان ہیں اور اُن کی شخصیت ایسی ہے کہ ہم اُن کے فرار ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لئے اُن کی چہل قدمی پر کوئی روک نہیں لگائی جانی چاہیے۔ البتہ اُن کی حفاظت کے مناسب

اور موزوں انتظامات کئے جانے چاہئیں۔

جن دنوں ڈاکٹر شیاما پرشاد کشمیر میں نظر بند تھے، اُس دوران پنڈت جواہر لال اور مولانا ابو الکلام آزاد یکے بعد دیگرے تشریف لائے۔ وہ یہاں کئی روز فروکش رہے اور چشمہ شاہی کے جس مہمان خانہ میں وہ ٹھہرے تھے وہاں سے ڈاکٹر مکرجی کی نظر بندی کا مقام میل بھر سے دور نہ تھا۔ لیکن انھوں نے ڈاکٹر مکرجی سے ملنے کی کسی خواہش کا اظہار نہیں فرمایا۔ ان کا رویہ دیکھ کر میں نے بھی ڈاکٹر مکرجی سے ملنے سے گریز کیا۔ مبادا اُس وقت کے حالات میں میرا یہ قدم بھی کسی نئی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔ البتہ میرے کانوں میں جب یہ بھنک پڑی کہ ڈاکٹر صاحب تنہائی سے بیزار ہو چکے ہیں تو میں نے ہدایت کی کہ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو جنھیں پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن کے سلسلے میں جموں میں حراست لیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کے پاس لا کر اُن کے ساتھی کی حیثیت سے رکھا جائے۔

ایک دن جبکہ میں گھر میں تھا صبح تڑکے جیل خانہ جات کے وزیر پنڈت شیام لال صراف نے مجھے یہ المناک خبر سنائی کہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب میں نے تفصیل پوچھنا چاہی تو انھوں نے صرف یہ اطلاع دی کہ اُن کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے اس خبر سے زبردست کوفت ہوئی کیونکہ مجھے بار بار یہی بتایا گیا تھا کہ وہ چاق و چوبند ہیں۔ اور اُن کی صحت ٹھیک ہے۔ وزیر متعلقہ نے اس سلسلہ میں کس قدر غفلت کا مظاہرہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر مکرجی رات کو ہی دم توڑ گئے تھے لیکن مجھے صبح تک اس سے بے خبر رکھا گیا۔ یہ محض نالائقی تھی یا کسی خطرناک عزم کو چھپانے کے لئے تجاہلِ عارفانہ میں اُس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن بعد میں اس بات کی خبریں ملنے لگیں

کہ ڈاکٹر صاحب اپنے آخری دنوں میں ایجی ٹیشن واپس لینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس بات کی تصدیق جواہر لال نہرو کے مستند سوانح نگار سروپلی گوپال نے بھی کی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جموں ایجی ٹیشن کے شعلے بھڑکانے رکھنے میں جن عناصر کا مفاد تھا اُنھیں ڈاکٹر مکرجی کے اس ارادے سے کس قدر تشویش ہوئی ہوگی اور اُن کے سیاہ عزائم نے کیا رُخ اختیار ہوگا۔

ڈاکٹر مکرجی کا انتقال ۲۳ جون ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ یہ خبر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں پھیل گئی اور جن سنگھ اور پرجا پریشد نے اسے میرے خلاف خوب استعمال کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے آنکھیں موند لینے کے ساتھ ہی اُن کی سمجھوتے کی کوشش بھی مر چکی تھی۔ اور اب کون اُن کے غمزدہ اور مشتعل عقیدتمندوں کو سمجھا سکتا تھا؟ میں نے مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی سی رائے کو جو ڈاکٹر مکرجی کے خاندانی طبیب رہ چکے تھے، بذریعہ تار اس سانحے کی اطلاع دی اور اُن سے استدعا کی کہ وہ ایک ممتاز معالج کی حیثیت سے بذاتِ خود سرینگر تشریف لائیں اور اس المیے کی تحقیقات کریں۔ لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ بعد میں مجھ پر کچھ حاشیہ نشینوں نے الزام لگایا کہ (ملاحظہ ہو ملک کی کتاب صفحہ ۱۳۸) میں نے اس سلسلے میں بی سی رائے کے تار کا جواب تک دینے کی زحمت نہ کی۔ یہ بالکل لغو الزام ہے۔ چنانچہ میں نے ۴ جولائی ۱۹۵۳ء کو جواہر لال کے نام اپنے خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "میں نے ڈاکٹر بی سی رائے کو تار دے کر کشمیر آنے کی دعوت دی ہے۔ مجھے مغربی بنگال سرکار کا ایک پیغام بھی ملا ہے اور اُس کا جواب بھیج دیا گیا ہے۔" ہم نے ڈاکٹر مکرجی کی نعش کو پورے احترام کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی روانہ کیا۔ میں خود ہوائی اڈے پر گیا اور میت پر اپنے ذاتی احترام کی نشانی کے طور پر ایک عمدہ سفید کشمیری شال چڑھائی۔ بخشی غلام محمد اور

پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ لاش کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ جواہر لال اُن دنوں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے۔ اُنھیں وہیں اس افسوسناک خبر کی اطلاع دی گئی۔ فرقہ پرست جن سنگھی پریس نے حواس باختہ ہوکر میرے خلاف زبردست زہر افشانی کی۔ اور سر کے بدلے سر کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ چنانچہ اُنھی دنوں دُرگا پرشاد در دہلی سے واپس آئے اور اُنھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اس سانحہ کے متعلق ایک بیان اخبارات کو دوں جس میں اس بات کی وضاحت کروں کہ ڈاکٹر مکرجی کی حفاظت کی ساری ذمہ داری وزارت داخلہ اور جیل خانہ جات کی وزارت کی تھی۔ میرا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود واقعات سے چشم پوشی کرکے سارا الزام میرے سر ڈالا جارہا ہے۔ میں نے ڈی پی صاحب کا یہ مشورہ نہیں مانا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اگرچہ واقعاتی طور پر اس معاملے میں میری براہِ راست ذمہ داری نہیں ہے لیکن میں اخلاقی طور پر اِس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ ہم نے مقامی ڈاکٹروں سے بھی، جو ڈاکٹر مکرجی کے علاج و معالجے کے ذمہ دار تھے، باضابطہ طور پر پوچھ گچھ کی۔ اور اُن کے بیانات سے کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی جس سے یہ اخذ ہوسکتا کہ اُن کے علاج میں کوئی کوتاہی کی گئی تھی۔ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ تو بہرحال ڈاکٹر مکرجی کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے ___ اُنھوں نے بھی کسی کمی یا کوتاہی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت پہلے ہی سے کچھ اچھی نہیں تھی۔ شاید کشمیر کی سطح سمندر سے اونچائی اور یہاں کی مرطوب ہوا اُن کو راس نہیں آئی اور اُن کے پھیپھڑے متاثر ہوگئے۔

یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ میں ذاتی طور پر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی گرفتاری کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے یہاں تک بھی چاہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار

کرنے کی بجائے ریاست سے باہر بھیج دیا جائے۔ لیکن معاملہ بحیثیت ہوم منسٹر کے براہِ راست بخشی غلام محمد کے ہاتھ میں تھا۔ اُن کی اپنی مصلحتیں اور اپنے مقاصد تھے۔ اُنھوں نے دہلی سے بھی اِس سلسلے میں سلسلہ جنبانی کی تھی۔ اِس لئے میں نے اِس میں دخل دینا موزوں خیال نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی موت ایک بے حد افسوسناک سانحہ تھی اور مُلک میں اِس معاملے کی تحقیقات کرانے کے لئے آوازیں اُٹھنے لگیں۔ میں اِس مطالبے کی صحت کا قائل تھا اور میں نے مرکز سے استدعا کی کہ ایک دو ممتاز افراد پر مشتمل کمیٹی مقرر کرکے سارے معاملے کی چھان بین کرائی جائے۔ لیکن مرکز نے اِستدعا کو ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کردیا۔ جن سنگھ اور پرجا پریشد صرف اس بات پر زور ڈالتی رہیں کہ مجھے وزارت سے الگ کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اُنھیں ڈاکٹر صاحب کی وفات سے زیادہ اِس وفات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی فکر تھی۔ اُنھیں کشمیر میں میرے سیاسی عزائم سے چِڑ تھی۔ اور وہ ڈاکٹر مکرجی کی موت کی لاٹھی سے مجھے ہانکنا چاہتے تھے۔ اُن کا دیرینہ خواب یہ تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح میدانِ سیاست سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن میں بڑا سخت جان ثابت ہوا اور ہر قسم کی ریشہ دوانیوں کے باوجود میدان میں چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔ اُنھیں یہ دیکھ کر اور بھی تاؤ آتا تھا اور وہ اب آخری بازی لگا کر مجھے ختم کرڈالنے کے درپے تھے۔

آج سالہا سال کے بعد اس واقعے پر ایک واپسیں نگاہ ڈالتے تو مسئلے کی نوعیت یوں بنتی ہے۔ چلئے فرض کرلیا کہ میری ہی ذات تحقیقات میں مانع تھی۔ لیکن اُس کے بعد تو میں نے سالہا سال قیدخانے میں گزارے اُس وقت میرے خلاف ہر قسم کے فرضی اور خیالی الزام لگاکر مقدمات چلائے گئے۔ لیکن اُن میں ڈاکٹر مکرجی کی موت کا الزام

نہیں تھا۔ آخر اس وقت اِس سانحے کی تحقیقات کرانے میں کون سا امر مانع تھا؟

پنڈت جواہر لال بھی فرقہ پرستوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے اُن کی زندگی کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں بھی اُنھیں موصول ہونے لگیں۔ اس مسموم فضا کو درست کرنے کے لئے جواہر لال کے خیر خواہوں نے اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھانا شروع کئے ——

رفیع احمد قدوائی اِس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ پنجاب میں جن سنگھ پرجا پریشد کی تحریک کے حق میں اور میرے خلاف بڑی کڑوی کسیلی قسم کی مہم جاری رکھے ہوئے تھا۔ رفیع صاحب نے اس مہم کا رخ پھیر دینے کے لئے پنجاب جن سنگھ کے صدر پنڈت مولی چند شرما سے رابطہ قائم کر لیا۔ مولی چند شرما کا سارا زور اس بات پر تھا کہ مجھے کشمیر میں حکومت سے الگ کر دیا جائے۔

یہاں پر سلسلۂ کلام کو توڑتے ہوئے اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اُس وقت میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔ بالکل علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق تھا

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ ہم زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

ایک طرف تو حکومت ہند کا بہت ہی بارسوخ طبقہ اور ہندوستان کے فرقہ پرست مجھ سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف پاکستان اور اُس کے امریکی و برطانوی پُشت پناہ مجھے ہٹانے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اِس سے کچھ ہی عرصہ قبل اقوامِ متحدہ کے ایک نمائندے ڈاکٹر فرینک گراہم نے تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر سے تین چوتھائی ہندوستانی فوج نکالی جائے لیکن وہاں شیخ صاحب کو بھی حکومت سے الگ کر کے اقوامِ متحدہ کے افسروں کی حکومت قائم کی جائے۔ حکومت ہندوستان اس وقت یہ ضمانت دینے کے لئے تیار تھی کہ رائے شماری کے لئے پرچار کرنے کے دوران

کسی بھی شخص کو امن و قانون کے مفاد میں بھی گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اور آزاد کشمیر و پاکستان میں مقیم کشمیری لیڈروں کو کشمیر آ کر اپنے حق میں رائے عامہ ہموار بنانے کی اجازت ہوگی۔ ہندوستان مجھ کو اس مرحلے پر ہٹانے کے لئے اس لئے تیار نہ تھا کیونکہ بقول جواہر لال اس سے کشمیری عوام اور دُنیا کو یہ تاثر ملے گا کہ پاکستان نے رائے شماری سے پہلے ہی نصف فتح حاصل کر لی ہے اور ہندوستان کے خلاف نفسیاتی جنگ میں پاکستان کو واضح تقویت حاصل ہو جائے گی۔ بہرکیف پاکستانی حکمرانوں کو میرے وجود سے اس قدر بغض تھا کہ انھوں نے اِس قدر آسان و موزوں شرائط کو صرف اِس لئے چھوڑ دیا کہ مجھے ہٹانے کی ہندوستان نے حامی نہیں بھری تھی۔

آمدم برسرِ مطلب۔ رفیع صاحب جواہر لال کے بڑے قریبی معتمد تھے۔ انھوں نے سردار پٹیل اور پرشوتم داس ٹنڈن کے ساتھ چپقلش میں جواہر لال کی کافی مدد کی تھی وہ عوامی رابطے اور سیاسی جوڑ توڑ کے فن میں بھی طاق تھے اور اِس معاملے میں بخشی غلام محمد اور اُن میں کچھ خصائل ملتے جلتے تھے۔ وہ جواہر لال کے ابتدائی برسوں میں یوپی کی سیاست میں اُن کے ہم رکاب رہ چکے تھے اور انھیں نہرو کی طبیعت میں کافی عمل دخل حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اُن معدودے چند اشخاص میں تھے جنھیں جواہر لال تک براہِ راست رسائی حاصل تھی اور جو کسی بھی وقت اُن کے پاس جا سکتے تھے۔ ہندوستان میں جواہر لال کے خلاف جو تحریک جن سنگھ نے چلائی اُس وقت کے مرکزی وزیرِ داخلہ ڈاکٹر کاٹجو اس سے نپٹنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر کاٹجو عمر اور صحت کی اُس منزل میں تھے کہ وہ سنگین مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا ذہن اور دل گردہ نہ رکھتے تھے۔ اُن کی ضعیف العمری سے فائدہ اُٹھا کر رفیع صاحب نے اُن کے دائرے میں بھی ٹانگ اڑانا شروع کی بلکہ نہرو کو ڈاکٹر کاٹجو کی نااہلیت کا احساس دلاتے ہوئے ۳ مارچ ۱۹۵۳ء

کو لکھا کہ "آپ نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے گھیر رکھا ہے جنھیں تمام طلقوں نے ٹھکرا دیا ہے۔" نہرو اُس وقت جس بے چارگی کی حالت میں تھے اُس کا فائدہ اٹھا کر قدوائی اور بھی شیر ہو گئے۔ رفیع صاحب روس کی لابی کے بھی بہت قریب تھے۔ اُن دنوں بڑے بڑے کمیونسٹ جن میں ریڈ، اے احمد، کے ایم اشرف، راما مورتی، ہری کرشن سرجیت وغیرہ شامل تھے۔ قدوائی کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ یہ کمیونسٹ کشمیر میں اپنے منظورِ نظر جن میں صادق صاحب خاص طور پر شامل تھے کو آگے لانا چاہتے تھے اور اس لئے مجھے منظر سے ہٹانے میں رفیع صاحب کی خوب مدد کر رہے تھے ـــــ بخشی صاحب کو یہ اس غصے کی توپ کی خوراک بنانا چاہتے تھے جو میری گرفتاری سے پیدا ہو سکتا تھا۔ تاکہ بعد میں اُن کے لاڈلے خوب جم کر حکومت کر سکیں۔ صادق صاحب کے ساتھ ڈی گرو، ڈی پی در، قاسم وغیرہ بھی وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ قدوائی نے کشمیر کے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا اور سرینگر آنے کی خواہش ظاہر کی۔

میں ہندوستانی رہنماؤں کی ذہنی تخریب اور اُن کی متضاد وفاداریوں سے بے حد دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ میں نے رفیع صاحب کو جوابی پیغام بھیجا کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اُن کو سدھارنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل انھوں نے کشمیر کے مسئلے میں کوئی براہِ راست حصہ نہیں لیا تھا۔ ہندوستانی راہنماؤں میں کشمیر کے نازک مسئلے کے ساتھ پنڈت جی، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور گوپالا سوامی آئینگر کا ہی واسطہ رہا تھا۔ میں نے خلوصِ نیت سے رفیع صاحب کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اس کے باوجود وہ کشمیر تشریف لانا چاہتے ہیں تو ہم اُن کا خیر مقدم کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر آنے کی ایک تاریخ بھی مقرر کی تھی لیکن پھر نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر وہ تشریف نہ لا سکے۔ اُن کے نہ آنے کی وجہ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ

دہلی میں اس سازش کے پیش کار اور ہدایت کار بن چکے تھے جس کا مقصد مجھے راستے سے ہٹانا تھا۔ ایک طرف تو وہ جن سنگھ کے لیڈروں سے پینگیں بڑھا رہے تھے اور میری امکانی گرفتاری کی شاخِ زیتون دکھا کر اُن کا دل لُبھا رہے تھے دوسری طرف وہ بخشی، صادق، درگا پرشاد اور میرے دوسرے مائل بہ فریب ساتھیوں سے میرے خلاف اُلٹی سیدھی نشتم پشتم اطلاعات جمع کر کے اُنھیں آخری معرکے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ بی۔ این۔ ملک نے اس سلسلے میں اُن کی کارروائی کی اچھی خاصی تفصیل پیش کی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب وہ مجھے زنجیر کا نغمہ سنانے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے تو وہ مجھ سے صلح صفائی کی بات کرنے کے لئے کیسے فرصت نکال سکتے تھے؟

اُدھر جن سنگھ اور پرجا پریشد میری گرفتاری کی قیمت وصول کئے بغیر جواہر لال کے خلاف اپنی معاندانہ روش تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لئے پنڈت جی بھی مجھے بنی اسرائیل کا قربانی کا بکرا بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ اپنی حیثیت اور مرتبے کو بچانے کے لئے جواہر لال دوستوں کو قربان کرنے میں کافی فیاض واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ کرشنا مینن اور اُن کے طریقہ کار کو میں ہمیشہ ناپسند کرتا رہا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں وہ بھی جواہر لال کی ڈیوڑھی پر جواہر لال کی پالیسیوں پر عمل پیرا رہنے کے لیے قربانی کا بکرا بنا دیئے گئے۔ بہرکیف جواہر لال دہلی میں ہمارا آخری قلعہ تھے لیکن اُس پر بھی سازش کا پھریرا لہرا دیا گیا تو پھر جائے امان کہاں تھی؟ فوجی نرغے کا خاکہ بھی دہلی میں بڑی عرق ریزی سے تیار کیا گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کسی غنیم کو زیر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی کی سفارش پر اجیت پرشاد جین کو اس نرغے کے سیاسی پہلو کی نگرانی کے لئے سرینگر مامور کیا گیا۔ فوجی پہلو کی کمان نہرو نے اپنے ایک معتمد بریگیڈیئر بی۔ ایم۔ کول کے سپرد کر دی۔ کول کو اس انتہائی خطرناک یلغار کا اس لئے نگران بنایا گیا کہ ایک تو اُن کی رگوں میں جواہر لال نہرو ہی کی طرح کشمیری پنڈتوں کا خون دوڑ رہا

تھا دوسرے دو کشمیر ملیشیا کے انچارج رہ چکے تھے۔ بی۔ این۔ ملک کو نہرو نے بتایا کہ ملیشیا میں کچھ ناقابلِ اعتبار عناصر موجود ہیں۔ میں کول کو اس لئے بھیج رہا ہوں کہ وہ ان عناصر کی کسی شب خون سے پہلے ہی کانٹ چھانٹ کر سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ جواہر لال کشمیر ملیشیا جس کو میں نے قبائلی حملے کے دوران منظم کیا تھا اور جس کے نوجوانوں نے پاکستانی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے، کے مسلم عناصر سے خائف تھے کہ کہیں مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے نتیجے میں وہ برافروختہ نہ ہو جائیں۔ اور اس لئے چاہتے تھے کہ انھیں ان کی شاندار خدمات اور قربانیوں کا لحاظ کئے بغیر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو میرے خلاف اقدام کرنے سے پہلے ملیشیا کے مسلمان سپاہیوں کو یا تو برخواست کر دیا گیا تھا یا حراست میں لیا گیا تھا۔ ان دونوں والیسراؤں نے سرینگر میں "آپریشن ۹ راگست" کے لئے راستہ ہموار کرنے میں اپنے آقاؤں کی توقعات سے زیادہ سفاکی اور چالاکی دکھائی اور سازشیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۹ راگست ۱۹۵۳ء کے واقعات پنڈت جواہر لال نہرو کی آشیرواد کے بغیر پیش آئے تھے، انھیں اس سلسلے میں بی۔ این۔ ملک کے بیان پر نظر رکھنی چاہئے۔ اس کا کہنا ہے کہ جواہر لال نہرو کشمیر میں ایک چابکدست اور آہنی انداز کے پولیس آفیسر کو موجود رکھنا چاہتے تھے۔ جو وقت پڑنے پر کشمیریوں سے مناسب سلوک کر سکے۔ ملک نے ڈی ڈبلیو مہرہ کی سفارش کر دی، کیونکہ اس نے صوبہ سرحد میں قبائلیوں کو کچلنے میں نام پایا تھا۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہے:

"۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء کو میں اور مہرہ وزیر اعظم سے ان کی کوٹھی پر ملے۔ انھوں نے ہم سے دو گھنٹے تک گفتگو کی۔ انھوں نے کشمیر کے معاملے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب اس بات کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے کہ شیخ عبداللہ کو ہٹا کر اس کی جگہ بخشی غلام محمد کو تعینات کیا جائے۔ وزیر اعظم نے امید ظاہر کی کہ یہ تبدیلی پُرامن ہوگی لیکن انھوں نے ہمیں متنبہ کیا کہ ہمیں بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ شیخ صاحب بلا شک وشبہ کشمیر میں بے حد مقبول ہیں۔ اور اس معاملے میں شیخ نواز عناصر کا ساتھ پاکستان نواز عناصر بھی دیں گے۔ مہرہ کو جموں کشمیر پولیس فورس کی سربراہی سنبھالنے کے لئے اور ضرورت پڑنے پر ناظم اعلیٰ CHIEF EXECUTIVE کا منصب سنبھالنے کے لئے بھی کمربستہ رہنا چاہئے۔ اس صورت میں وہ صدر ریاست کے تحت کام کرے گا۔ ہم دونوں نے نہرو کو اتنے غضبناک موڈ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسے تناور درخت کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں جس کو انھوں نے خود سینچا تھا۔ انھوں نے مہرہ کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے حالات سے مطلع کرتے رہو اور اگر رات کو بھی ضرورت پڑے تو ٹیلیفون کرنے سے گریز نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ہی سرینگر میں فوج کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ٹل کو نہایت خفیہ طور پر پیغام بھیجا گیا کہ وہ فوج کو مداخلت کے لئے چوکنا (ALERT) رکھے اور ملیشیا کے ناقابلِ اعتبار عناصر کو کڑی نگرانی میں رکھے۔"

میں نے آٹھ نفری اعلیٰ سطحی کمیٹی کے فیصلوں سے مرکز کو آگاہ کرنے کے لئے بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی در کو دلی بھیجا تھا۔ بیگ صاحب تو دوسرے تیسرے روز واپس لوٹ آئے لیکن بخشی اور ڈی پی پُراسرار طور پر وہیں رک گئے۔ ان کے دورے کی اس توسیع کا بھانڈا بعد میں جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں مول چند شرما، این سی چٹرجی اور پریم ناتھ ڈوگرہ نے چوراہے پر پھوڑ دیا۔ ان لیڈروں نے اپنے پبلک بیانات میں اعتراف کیا کہ تین دن تک بخشی اور ڈی پی نہ صرف ان تین لیڈروں کے ساتھ

میری حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے بات چیت کر رہے تھے بلکہ رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر کاٹجو کے ساتھ بھی یہ لوگ تقریباً تین روز تک مسلسل سازش کی کھچڑی پکاتے رہے۔ موتی چند شرما نے جو اُس وقت بھارتیہ جن سنگھ کے صدر تھے، کہا کہ اُنھوں نے پرجا پریشد کی جموں ایجی ٹیشن قدوائی کے کہنے پر ہی واپس لی تھی۔ اور اُسی وقت اُن کو میری گرفتاری کا پیشگی سندیسہ سنایا گیا تھا۔ جموں سے پرجا پریشد کے جنرل سکریٹری اوم پرکاش مینگی نے ایک پوسٹر میں جس کو دیوان پریس جموں میں چھاپا گیا تھا، یہ اعلان کیا کہ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ نے دہلی میں بخشی غلام محمد، ڈی پی در، ڈاکٹر کاٹجو اور رفیع احمد قدوائی کے علاوہ جواہر لال نہرو کے ساتھ چار ملاقاتیں کی تھیں جن میں اُن کو آنے والے واقعات کا اشارہ دیا گیا تھا۔
اور اُن کے ساتھ میری برطرفی اور نظر بندی کے سلسلے میں بھی عہد و پیمان کیا گیا تھا۔۔۔

۔۔ جولائی ۵۳ء کو لکھنؤ میں خود پریم ناتھ ڈوگرہ نے کہا کہ "انھیں بخشی غلام محمد نے کہا ہے کہ ہم (پرجا پریشد والے وغیرہ) صبر سے کام لیں۔ کشمیر میں بہت جلد ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن سے ہمارا جی خوش ہو جائے گا۔ اور   اکتوبر یا نومبر تک ساری رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا۔" مگر انھوں نے اس نشانے سے بھی زیادہ جلدی کر دکھائی۔ بعد میں ۹ اگست کو میری گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد نے جموں میں اپنی پہلی تقریر میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ "گذشتہ دو سال سے پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ جو لڑائی جموں میں لڑتے رہے ہیں وہی میں کشمیر میں لڑتا رہا ہوں اور ہمارے مقاصد مشترک ہیں"۔ انہی دنوں بخشی صاحب کے بہروپ کا عجیب نمونہ سامنے آیا۔ جب وہ دہلی سے اپنی بھیانک اور بھونڈی ریشہ دوانیوں کے بعد کشمیر لوٹے تو مجھ سے ملنے اور مجھ تک نئی دہلی کا ردِ عمل پہنچانے کے بدلے اُنھوں نے کشمیر کے مختلف حصوں میں دورے پر جا کر اپنے حامیوں کو منظم کرنا شروع کیا اور وہاں تقریریں کرنا شروع کیں۔ اُنھوں نے ہشت نفری کمیٹی کی اُن سفارشات پر نکتہ چینی

شروع کی جن کی وہ خود تائید کر چکے تھے۔ یاد رہے کہ یہ نتائج ایک ماہ تک مسلسل ہونے والی نشستوں میں اخذ کئے گئے تھے۔ اِن نشستوں کی روئداد باقاعدہ لکھی جاتی تھی اور دوسرے روز اس روئداد کی تصدیق کی جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے بخشی صاحب کو بلایا۔ اس موقعہ پر ہشت نفری کمیٹی کے تقریباً سارے ہی ممبر موجود تھے۔ میں نے بخشی صاحب کو نیشنل کانفرنس کے سرکاری ترجمان "خدمت" میں چھپنے والی ان کی تقاریر کی رپورٹ دکھائی اور کہا کہ "یہ کہاں کی دیانت ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک بات کہیں اور ہماری پیٹھ پر بالکل دوسری۔" بخشی صاحب اپنے خاص انداز اور اسلوب میں حاشا وکلا کہتے ہوئے اُن تقریروں کے متن سے ہی مکر گئے بلکہ بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کے اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

▲▲▲

(۳۹)

ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت

ہم نے ریاست میں ۱۹۳۱ء سے جو معرکۃ الآرا تحریک چلائی تھی وہ عروج وارتقا کے کتنے ہی مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ یہ اولاً مسلم کانفرنس کے زیر سایہ پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ لیکن کشمیر کی ساری فضا لوگوں کی طبیعت اور مزاج اور ان کا طرزِ بود و باش اور جذباتی آمیزہ باہمی محبت، آشتی، امن پسندی، انسان دوستی اور رواداری کے عناصر سے معمور اور سرشار تھا۔ کشمیریوں کے اس صلح کل قومی مزاج اور امن پسندانہ مسلک کے لیے پہلے تو کپل وستو کے سراپا رحم اور پاکباز درویش گوتم بدھ ساکیہ منی کے مذہب نے ضمیروں میں جلا دی تھی۔ بدھ مذہب کشمیر میں کوئی ایک ہزار سال تک شریف اور صالح انسانی قدروں کی آبیاری کرتا رہا جب اس کی کونپلیں دلوں کی سرزمین سے نکل کر کھلنے لگیں تو ہمارے بڑے بڑے ریشیوں اور بزرگوں جیسے للہ عارفہ، شیخ نورالدین نورانیؒ اور دیگر سینکڑوں صوفیوں، سنتوں کی تعلیمات نے انھیں اپنی دلنواز لوریوں سے جوان کیا۔ اسلام یہاں درویشوں اور صوفیوں نے پھیلایا اور اس نے یہاں کے شکستہ تہذیبی ڈھانچے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسلام کشمیریوں کی روحانی نجات کی تلاش کا تسلسل تھا۔ اگر اس نے فکری سطح پر شیخ نورالدین نورانیؒ جیسے باصفا قلندر کو پیدا کیا جس نے کشمیریوں کو خیرِ عام کی پرانی اور دینی قدروں کا آمیزہ ریشی مسلک کی صورت میں پیش کیا تو دوسری طرف سیاسی سطح پر اس نے سلطان زین العابدین کو منظرِ عام پر لایا۔ جو رواداری اور انسان دوستی کے تصور کو فروغ دینے کے سلسلے میں شیر شاہ سوری اور اکبرِ اعظم جیسے شہنشاہوں کا پیش رو ثابت ہوا۔ ہماری تحریک کی رگوں میں صالح روایات کا خون موجزن تھا۔ اس لیے اپنے جنم لینے کے چند ہی سال بعد یہ تحریک ایک ابرِ رحمت کی طرح ساری قوم کو اپنی آغوش میں لینے لگی۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے اسے مشترکہ طور قوت بخشی اور ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت ریاست کے تمام طبقوں اور فرقوں کے لیے ماں کی آغوش کی طرح کھل گئے۔ ہمارے تحریک کے بطن میں جو اصول اور آدرش سیپ کے موتی کی طرح مضمر تھے انھیں ہم نے سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نام دیے اور یہی اس تحریک کے بنیادی ستون قرار پائے۔ ہندوستان نے کانگریس کے پرچم کے نیچے آزادی کے لیے جو بڑی اور کڑی تحریک چلائی اس کے بنیادی اصول بھی ہماری تحریک کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ اس لیے مقاصد کی یہ ہم آہنگی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ ہم آزاد ہوئے تو یہی سمجھے کہ نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی اب آئی کہ اب آئی۔ ہمیں اب امید تھی کہ ان مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ اور دعویٰ و عمل کے درمیان جو خوفناک خلیج حائل تھی وہ خلوص اور نیک نیتی سے پاٹ دی جائے گی۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کے بٹوارے کے بعد دو قوموں کے درمیان بغض و عناد اور بدگمانی و بد اعتقادی کی جو مسموم فضا پیدا

ہو گئی اُس نے عام لوگوں کے ہی کیا بڑے بڑے اولوالعزم لیڈروں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیئے۔ البتہ صرف نیشنل کانفرنس ہی ایسی رہی جو اپنی روایات اور اپنی تاریخ کا روغن جلا کر روشنی بکھیرتی رہی۔ میں نے اس تنظیم کے قائد کی حیثیت سے جان جوکھوں میں ڈال کر نفرت کے جھکڑوں کے آگے اپنا سینہ تان دیا۔ میری جماعت نے اپنی مادرِ وطن کی اس قیمتی میراث کی حفاظت اور شرحِ روشن کے لیے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں اور انسان دوستی کے اس جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ روشنی کی یہ عجیب خاصیت ہے کہ اس کی ننھی سی لو پر چاہے ساری دنیا کا اندھیرا کیوں حملہ آور نہ ہو لیکن وہ روشنی کی اس مقدس لکیر کو مٹا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے فرقہ پرستی اور نفرت کی اس چڑھتی ہوئی آندھی کا منہ اس چھوٹی سی وادی میں موڑ دیا۔ جو اس وقت تک برصغیر میں بڑے بڑے کنگروں کو مسمار کر رہی تھی۔ اُس وقت نیشنل کانفرنس کی قیادت بھی کتنی مضبوط، ہمہ رنگ پہلو دار اور ہمہ گیر تھی۔ بخشی صاحب، بیگ صاحب، مسعودی صاحب، صادق صاحب وغیرہ سب میں اپنی اپنی خصوصیات موجود تھیں اور انہی رنگ برنگی خوبیوں سے ہماری قیادت کا گلدستہ سجا تھا۔ لیکن کشمیر کی سربلندی کے بیریوں کو یہ مضبوط قیادت ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے خوشامد، لالچ اور انتشار کے ہتھیاروں سے اسے درہم برہم کر دیا اور آسے نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔ ایک باغبان اور مالی کی حیثیت سے میرے لیے تسبیح کے اُن دانوں کا بکھرنا کتنا کرب ناک ہو سکتا ہے۔ اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ شاید ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا تھا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاریخ کی منطق کی لازوال اور حقیقت یکتا گواہی کے بل پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کشمیر میں دو قومی نظریے پر پہلی کاری ضرب پڑی۔ اس کے بعد یہ جانبر نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ کچھ دیر تک نڈھال ہو کر لڑکھڑاتا رہا لیکن آخر کار اُس نے دم توڑ دیا اور اس کی روشنی خلیج بنگال کے پانیوں میں سے دوبارہ طلوع ہوئی۔ خود ہندوستان میں سیکولرازم کی مشعل جلائے رکھنے کے لیے کشمیر کی اس بہادرانہ روش نے زبردست حصہ ادا کیا چنانچہ اس سلسلے میں میں نے آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اشارہ کیا تھا۔

"پچھلے چار برس کے تجربے کے بعد یہ میری پختہ رائے ہے کہ کشمیر کی ہندوستان میں موجودگی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہتر تعلقات قائم ہونے کی سب سے بڑی وجہ بنی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی موت سے پہلے یہ الفاظ بالکل بجا اور برحق کہے کہ میں پہاڑوں (کشمیر) کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا ہوں جہاں سے مجھے اخلاقی اور روحانی کمک حاصل ہو رہی ہے۔"

اسی طرح یہ بات بھی محتاجِ ثبوت نہیں کہ کشمیر کی ہندوستان میں موجودگی نے اس کے آئین کے سیکولر رنگ کو اور چوکھا کر دیا۔ کشمیری عوام سیکولرازم پر تکیہ اور اُن کے رضاکارانہ ایثار نے آئین بنانے والے بزرگوں کو ایک ایسے قوت سے بھر دیا جس نے آئینِ ہند کو بھی متوَر اور معطر کر دیا۔ ہمیں توقع تھی کہ ہندوستان کے رہنما بھی عملاً یہی طریقۂ کار اختیار کریں گے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی جان کی جو عظیم قربانی دی تھی۔ وہ فرقہ وارانہ آشتی حاصل کرنے کے لیے ہی تھی۔ اور اس سے ہمیں اپنے فیصلے پر ناز ہونے لگا تھا۔ ہمیں اُمید تھی کہ ہندوستانی حکومت چلانے والے لیڈر ہر اس اقدام سے گریز کریں گے جس سے فرقہ واریت کی بو آتی ہو لیکن فضا میں زہر اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ حکومت کے بیشتر کل پرزوں پر اس زہر کی پھپھوندی لگ آئی

تھی۔ اور اُن کے ہر قدم میں فرقہ پرستی کی نحوس جھنکار سنائی دیتی تھی۔ کشمیر کی اکثریت مسلمان تھی لیکن اُن کا حکمران ایک غیر مسلم تھا۔ اس وجہ سے اکثریتی فرقہ اپنے جائز انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں چاہے وہ فوجی ہوں یا غیر فوجی، مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ بیگار اور جاگیرداری نظام کے دوسرے مظالم نے انھیں کچل کے رکھ دیا تھا۔ اُن کے افلاس، بے چارگی اور بے بسی کی تصویر ہر اُس شخص نے کھینچی جو کشمیر آیا اور جس کے دل میں انسانی درد موجود تھا۔ چنانچہ تاریخ اور سفرناموں کی کتابیں اس قسم کے دردناک مرقعوں سے بھرپور ہیں۔ صدیوں تک ظلم و ستم سہنے کے بعد مظلوم کشمیری توقع رکھتے تھے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ اُن کی تقدیر بھی کروٹ لے گی۔ اور صدیوں تک جو حقوق اُن کے لیے شجر ممنوعہ بنا دیے گئے تھے اُن سے وہ نئے حالات میں مستفید ہو جائیں گے۔ جن کشمیریوں کی بہادری کے افسانے کبھی دنیا بھر میں مشہور تھے۔ جن کے لشکروں نے کبھی للتادتیہ کے پرچم کے نیچے دکن سے لے کر صحرائے گوبی تک اپنی بہادری کے نقش جما دیے تھے اور کبھی سلطان شہاب الدین کی قیادت میں سندھ تک اپنی شمشیروں سے اُجالا کر دیا تھا۔ اُن کو استعمار پسند حکمرانوں نے غیر فوجی اور غیر عسکری قرار دیا تھا۔ اور اُن پر فوج کے دروازے کسی بخیل کی تجوری کی طرح بند کر دیے گئے تھے۔ اِس لیے ہمارے مطالبات میں سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ فوج کی طبقاتی تشکیل نئے ڈھنگ سے کی جائے تاکہ ریاست کے تمام طبقوں اور خاص طور پر کشمیریوں کو اس میں جائز نمائندگی حاصل ہو۔ دستاویزِ الحاق کی رو سے دفاع مرکز کے اختیارات کی ذیل میں آتا تھا۔ جب دفاع کو مرکز کے ہاتھوں میں سونپ دیا گیا تھا تو اس وقت ہمارا اُس کے ساتھ پیمان تھا کہ وہ ان بے جا پابندیوں کو ہٹا کر کشمیریوں کو فوج میں مناسب نمائندگی دے گا۔

اب ہماری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ جب ہمیں مرکزی وزارتِ داخلہ کی طرف سے جاری شدہ ایک خفیہ سرکلر کا علم ہوا جس میں بھرتی کرنے والے آفیسروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہ کریں۔ یہ خبر کسی طرح پھیل گئی۔ مسلمان نوجوانوں کا ایک احتجاجی جلوس غم و غصّہ کا اظہار کرتا ہوا مجاہد منزل پہنچا اور اس سرکلر کی ہم سے ہی وضاحت طلب کرنے لگا۔ بخشی غلام محمد اور مولانا سعید نے جُوں توں کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ لیکن جب مرکزی ہوم منسٹر گوپالا سوامی آئنگر جموں تشریف لائے تو میں نے یہ معاملہ اُن کی نوٹس میں لایا۔ وہ پہلے تو بڑھ چڑھ کر بولنے لگے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب بخشی صاحب اور مولانا سعید نے میری تائید کر کے اُنھیں تفصیلات بتائیں تو اُن کی سٹی گم ہو گئی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ایسے سرکلر کا اجرا آئینِ ہند کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اُنھوں نے خاصی شرمندگی کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ دہلی جا کر اس معاملے کی تحقیقات کرائیں گے۔ اگر یہ واقعی درست ثابت ہوا تو وہ اس کو بلا کسی تاخیر کے منسوخ کرائیں گے۔ میں نے جب آئنگر صاحب سے دریافت کیا کہ ریاستی فوج کو مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بھرتی کے دوران مسلمانوں کا کیا تناسب رہا ہے تو اُن سے اِس سوال کا بھی کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جب ملیشیا کی تنظیم جدید کا کام شروع ہوا تو اگرچہ اس کا انتظام ہمارے ہاتھ میں تھا لیکن اس کا OPERATIONAL عملی اور تنظیمی اختیار مرکز کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت جنرل کری آپا فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ میں نے اُن سے شکایت کی کہ ضلع لداخ کی ملیشیا میں کرگل کے مسلمانوں کو کیوں بھرتی نہیں کیا جاتا۔ جنرل بولے کہ ہندوستان سے اُن کی وفاداری مشکوک ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ اگر صورت حال واقعی ایسی ہے تو ہندوستان کو کیا استحقاق حاصل ہے کہ وہ کرگل پر اپنا قبضہ جمائے رکھے بکری آپا تھا

بولے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن میری صاف گوئی پر مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ یاد رہے کہ اُس وقت لداخ اور کرگل ایک ہی ضلع تھا۔ آبادی کے تناسب میں کرگل کے علاقے کو تھوڑی سی فوقیت بھی حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود ملیشیا میں اُس کی نمائندگی برائے نام ہی تھی۔

محکمۂ دفاع تک ہی کیا محدود۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ مرکزی محکمہ جات تو اس چھوت چھات کی آماجگاہ بن گئے۔ پوسٹل سروس کا ماجرا بھی بہتر نہ تھا کہ اِس سروس میں تو مسلمان پہلے ہی سے عنقا تھے۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ اِس عدم توازن کو دور کر دیا جاتا اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کے سامنے ہندوستانی سیکولرازم کی ایک دل لبھانے والی تصویر اُبھاری جاتی۔ لیکن محکمے کے آفیسروں نے اس کے بالکل برعکس رویہ اپنایا۔ انھوں نے منظور شدہ اُمیدواروں کی ایک فہرست تیار کی۔ جس میں سے مسلمان نام کی ہر ایک چیز کی ایسے کاٹ چھانٹ کر دی گئی جیسے یہ کسی نامراد بیماری کا نام ہو۔ مجھے اِس کا علم ہوا تو میں نے بڑے رنج کے ساتھ متعلقہ محکمے سے اس بات کے لیے احتجاج کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اُن دنوں کشمیر آئے ہوئے تھے۔ اُن کی توجہ میں بھی یہ بات آئی۔ میں نے اُن سے عرض کی کہ مرکزی محکمے سیکولرازم کے مثالی نمونے ہونے چاہئیں۔ لیکن ان محکموں کی بھرتی کے سلسلے میں اگر موجودہ طریقِ کار بدستور برتا جاتا رہا تو مسلمانوں کے دلوں سے ہندوستان کی سیکولر شبیہہ کے سلسلے میں رہا سہا اعتماد بھی اُٹھ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے کشمیر میں ہمارا کام اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ خاص طور پر اِن حالات میں کہ سرحد پار سے ہماری مخالف نشرگاہیں مسلمانوں کے جذبات کو اُبھارنے کے لیے ہر قسم کی مبالغہ آرائیاں کر رہی ہیں اور ریاست میں بھی اُن کے ہمدرد بھانت بھانت کے

نفسیاتی حربے استعمال کر رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میرے اس رویے کی داد دی جاتی کہ میں کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے اُن کے اِنسداد و علاج کی راہ ہموار بنا رہا ہوں لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یعنی میری راست گوئی فرقہ پرستی برتنے والے حاکموں اور اُن کے سرپرستوں کو کھٹکنے لگی۔ انھیں سچائی کے ساتھ ساتھ سچ بولنے والے کے ساتھ بھی عداوت ہونے لگی۔ میرے خلاف اُن کا رویہ سخت ہونے لگا۔ اور وہ مجھے بہت ہی بھیانک رنگوں میں پیش کرنے لگے۔ اگرچہ اب دلی میں سردار نہ رہے تھے مگر سردار جس ذہنیت کی علامت تھے وہ ذہنیت بدستور پھول پھل رہی تھی۔ اِس ذہنیت کے علمبرداروں نے گویا میرے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ میں نے پہلے پہل زبانی اِحتجاجات سے اصلاحِ احوال کرنا چاہی لیکن جب یہ صدائیں بہرے کانوں پر پڑنے لگیں تو میں نے تحریک لطیف ترپیرائے میں اپنی فریاد جاری رکھی۔ مگر وہاں تو میری بات کو اُلٹے معنی پہنانے کا چلن مرغوب و مقبول گیا تھا۔ میں خیالات کو دل میں رکھنے کا قائل نہیں کیونکہ اس طرح سے دلوں میں ملال اور سازش کے پھوڑے پکنے لگتے ہیں۔ کوئی جائز شکایت ہو تو آمنے سامنے بیان کر کے اپنا جی ہلکا کر لیتا ہوں۔ بقول شاعر ؎

ہر کہ در دل گذرد وقفِ زباں دارد شمع

سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

چنانچہ میں نے اس ضمن میں ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو رنبیر سنگھ پورہ میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی۔ جس میں میں نے کچھ ناخوشگوار واقعات کی طرف اِشارہ کیا۔ میں نے کہا کہ ہم نے ہندو اور دوسروں کی طرح ہندسے الحاق نہیں کیا ہے کہ ہمیں ہر ایک حکم نامے پر انگوٹھا لگانے کا حکم دیا جائے۔ ہم ہندوستان سے اصولوں کی ہم آہنگی کی بنا پر ملحق ہوئے ہیں اور اُن اصولوں کا ہندوستان کو احترام کرنا چاہیے۔ میں

نے یہ بھی کہا کہ ہم کشمیر میں ہندوستان کے آئین کو اُس وقت کلیتاً نافذ کرنے کے لیے تیار ہوں گے جب ہم اِس بات کے قائل ہو جائیں کہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کی قبر حتمی طور پر کھودی گئی ہے۔ ابھی ہم اِس پر باور کرنے کے لیے تیار نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی طرح اِس وقت ہندوستان میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاتمہ نہیں ہوا ہے اور اُن کو بھی سیکولرازم کا سبق ہم کشمیری قوم پرستوں سے حاصل کرنا ہے۔ تقریر ہندوستان کے خلاف ہرگز نہیں تھی۔ لیکن اِس میں "خوگرِ حمد" نے تھوڑا سا گلا "ضرور کیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور یگانگت کا پل بننا چاہیے نہ کہ نفرت اور دشمنی کا آتش فشاں۔ یار لوگ تو تاک میں بیٹھے ہی تھے۔ مرکزی انٹلی جنس کے جاسوسوں اور پریس کے رنگے سیاروں نے اس تقریر کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ ایک طرف تو ہندوستانی حکمران مجھ سے بھرے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف اخبارات بھی میری حق گوئی کو سرتابی اور سرکشی سمجھ کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے رنبیر سنگھ پورہ کی تقریر کو خوب اُچھالا۔ اور فضا میں اور بھی زہرناکی اور تلخی پیدا کر دی۔ چنانچہ اس منظم اور دانستہ کردارکشی کی مہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر لال نہرو جیسے دوست، جو میرے ماضی اور میرے رول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے تھے اُنے اپنی ایک چٹھی میں میرے سیکولر نظریہ و کردار پر یوں چھینٹے اُڑائے۔

"میری حکومت اُسی طرح سیکولر جمہوریت کے لیے کام کرتی رہی ہے جس طرح آپ خود اس مقدس کام میں جُتے رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اِس موضوع پر اب آپ کے احساسات کیا ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کشمیر میں اب رجحان اِس کی مخالف سمت میں ہے۔ بدقسمتی سے اِس کا

ہندوستان پر اُسی طرح بُرا اثر پڑے گا جس طرح ہندوستان کے حالات کے کشمیر میں بُرے عواقب ہوتے ہیں۔"

(راقم کے نام مکتوب، ۲۸ جون ۱۹۵۲ء)

میرے اِتنے قریبی اور اِتنے اچھے دوست کی طرف سے مجھ پر یہ الزام تراشی بہت افسوسناک ہی نہیں تکلیف دہ بھی تھی۔ جواہر لال نے ہماری تحریک اور میرے لیے جو کچھ کیا اُس کے ہم شکرگذار رہے ہیں۔ لیکن اُنھیں یہ بھی خوب معلوم تھا کہ جہاں تک سیکولر نظریات سے وفاداری کا تعلق ہے ہم نے "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے" کی عملی تفسیر پیش کی تھی۔ میں نے ذاتی طور پر اس نظریے سے وابستگی کے لیے یارو اغیار سے جو طعنے سہے وہ تاریخ کے حافظے پر رقم ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جواہر لال اب کشمیر میں اپنے نئے دوستوں کو بچانے کے لیے اور اُن کے مکروہ مقصد کی پیروی کرنے کے لیے درج مصلحت آمیز سے کام لے کر معاملات کو گڈمڈ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے ۳ جولائی ۱۹۵۲ء والے خط میں اُن سے شکوہ کرتے ہوئے لکھا۔

"آخر میں آپ کے اُن ارشادات کی طرف آتا ہوں جو آپ نے میری ذات کی نسبت ظاہر فرمائے ہیں۔ آپ کو شاید یہ تاثر ہے کہ میں اپنے موقف سے ہٹتا جا رہا ہوں۔ آپ نے اِس شک کا اظہار بھی کیا ہے کہ آیا میں سیکولر جمہوریت پر اب بھی یقین رکھتا ہوں یا نہیں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ ایک نہایت ہی ناروا الزام ہے۔ جب فضا ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بھری ہوئی ہو اُس وقت ایک شخص کے لیے اپنا دفاع کرنا بے حد نازک اور تکلیف دہ امر بنتا ہے۔ ہندوستانی اخباروں میں میرے خلاف

ہر قسم کے الزامات اور اتہامات عائد کیے گئے ہیں۔ وقت ہی دکھائے گا کہ میں اُن اُصولوں پر کس مضبوطی سے قائم ہوں جن کی خاطر میں نے لڑائی لڑی اور تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ لیکن بلاشبہ مجھے اس وقت سخت کوفت اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے جب آپ جیسے دوست مجھ پر شک کرتے اور مجھے غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن اصولوں کی میں نے ہمیشہ علمبرداری کی ہے اُن پر میرا اعتقاد اُس وقت بھی ڈھل مل نہ ہو سکا جب میں بڑے مصائب کا سامنا کر رہا تھا۔ آپ کا حافظہ تازہ کرنے کے لیے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تو یہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جب ہمیں ظاہری طور پر ایک مسئلہ مقدر کا سامنا تھا اُس وقت بھی میں نے ان اصولوں سے منہ موڑنے کی بجائے اُن کے لیے جان کی بازی لگادی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ سیکولر جمہوریت کے لیے میرا نظریہ نہ تو تنگ نظری پر مبنی ہے اور نہ یک طرفہ وفاداری پر۔ میں عوام کے تمام طبقوں اور حلقوں کے لیے انصاف کا متلاشی ہوں اور میرا رویہ حقائق کی کوکھ سے جنم لیتا ہے نہ کہ آرزو مندانہ سوچ و چار (WISHFUL THINKING) سے۔"

دلّی میں ایک بار مرکزی رہنماؤں کی ایک میٹنگ تھی جس میں جواہر لال کے علاوہ سردار اور مولانا آزاد بھی تھے۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ یوں تو دنیا میں کسی بھی قوم کو خالص زور اور جبر کی بنیاد پر مطیع یا دوست بنایا نہیں جا سکتا۔ لیکن کشمیریوں کے بارے میں یہ بات اور بھی صحیح ہے۔ میں نے اس سلسلے میں پنڈت کلہن کی "راج ترنگنی" کا حوالہ دیتے ہوئے اُس مقام کا حوالہ دیا جہاں وہ لکھتا ہے کہ کشمیر کو روحانی طاقت

کے بل بوتے پر فتح تو کیا جا سکتا ہے لیکن سامانِ جنگ کی قوت سے نہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ مہاتما گاندھی کے اخلاقی اُصولوں نے ہمیں اپنی طرف کھینچا ہے۔ اور یہی اُصول ہمیں ہندوستان کے ساتھ وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ جہاں جواہر لال میرے کہنے پر مسکرا کر رہ گئے۔ وہاں سردار کے چہرے پر ایک ناگوار کیفیت نمودار ہو گئی۔ بہرحال جب دلوں پر تالے پڑ جاتے ہیں تو دلیلیں اور اپیلیں ایسی دعائیں بن جاتے ہیں جو کبھی مستجاب نہیں ہوتیں۔ ہندوستان میں میرے خلاف سازش کا جو تانا بانا تیار ہو گیا تھا اُس کی ڈور سے سرینگر میں میرے ساتھی بھی بندھے ہوئے تھے۔ البتہ اب حیلے بہانے تلاش کر کے مجھے راستے سے ہٹانے کی راہ تلاش کی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب گھٹن اور غیر دوستانہ طرزِ عمل کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اور میرے گرد حلقہ تنگ سے تنگ تر کیا جا رہا تھا۔ اس وقت دلّی والے مجھ سے اصول اور دلیل کی نہیں بلکہ تعمیل اور تسلیم کی توقع رکھتے تھے۔ میں بھی اپنے اصول سے وفاداری برتتے ہوئے حالات کے بہاؤ پر جا رہا تھا۔ مجھے دلّی آنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ گفتگو کے دروازے بند کیے جا چکے ہیں اور اب صرف سر جھکانے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں غالب کے اِس شعر کی ستم ظریفانہ منطق سے دل بہلا رہا تھا۔ ؎

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز!

میں صرف اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ مجھ پر فرقہ پرستی اور اصولوں سے برگشتگی کا الزام لگانے والے کس طرح اپنے خیال و عمل کی ترجمانی کر رہے ہیں! اِس سلسلے میں کون کتنے

پانی میں تھا۔ اس کا ایک اندازہ کرنے کے لیے ایک کشمیری پنڈت ممبر پارلیمنٹ کے اُن تاثرات کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو انھوں نے لوک سبھا کے اجلاس میں اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کیے۔

"مسٹر جناح، جن کے ساتھ کشمیری مسلمانوں نے ۱۹۴۴ء میں بے رُخی کی تھی، اپنی زندگی میں کشمیر کے سلسلے میں دو باتوں کے آرزومند تھے۔ ایک تو یہ کہ کشمیر کو ہندوستان سے دور رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ عبداللہ کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ جناح کی جو آرزو اُن کی زندگی پوری نہ ہو سکی تھی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کو پاکستان کے بعد بھی جو کچھ نصیب نہ ہو سکا تھا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اس ایوان میں جمہوریت کا نام لے کر ہندوستان کا نام لے کر پاکستان کو وہ سب کچھ دیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح سے مسٹر جناح کی محترم روح کو پُرخلوص مدح سرائی کا نذرانہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا۔ ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

▲▲▲

(۵۰)

دغابازی کے خنجر

مرکز کے ساتھ ہماری یہ آویزش ریاست کے اندرونی حالات پر بہت ہی خراب اثر ڈال رہی تھی۔ حکومت کا نظم و نسق میرے کچھ ساتھیوں کی کرتوت کی وجہ سے ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ بخشی غلام محمد "دہلی کے" "مہربانوں" کی پشت پناہی کے نشے میں اپنی من مانی کا سلسلہ دراز کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اپنے بھائی بندوں کو ٹھیکوں اور دوسری مراعات سے مالا مال اور مستفید کر رہے تھے اور بے تحاشا جائیداد بنانے میں مصروف تھے۔ خاص طور پر فوج میں اُن کا طوطی بول رہا تھا اور فوجی ٹھیکہ جات کی سونے کی گنگا اُن کے خاندان کو سیراب کر رہی تھی۔ اس کا اثر سرکاری انتظامیہ کی تندرستی کو روگ لگا رہا تھا۔ اُن کے عزیز و اقارب کی مداخلت سرکاری محکموں میں بالعموم اور بخشی صاحب کے قلمدانِ وزارت میں شامل محکموں میں بالخصوص بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ نالاں تھے۔ اور مطالبہ کر رہے تھے کہ اس صورت حال کا تدارک کیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ بخشی صاحب کے ان بڑھتے ہوئے حوصلوں اور اُن کی بے راہ روی کا اصل سبب دہلی میں اُن کے آقاؤں

کی خفیہ سرپرستی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ بخشی صاحب کے خلاف کوئی اقدام کرنا دہلی کے اربابِ اقتدار کو للکارنے کے برابر ہوگا۔ اور اُس صورت میں ہمیں دہلی کے اربابِ اقتدار سے براہِ راست ٹکر لینا پڑے گی۔ میں ریاستی عوام کے وسیع تر مفادات میں اس تصادم سے حتی الامکان دامن بچانا چاہتا تھا۔ لیکن تقدیر کچھ اور ہی کھیل کھیلنے کی خواہش مند تھی۔

قبائلی حملے کے بعد جب ہم نے دوبارہ اُن علاقوں پر قبضہ کرلیا، جہاں قبائلی وقتی طور پر چھا جانے میں کامیاب ہوگئے تھے تو ہم نے دیکھا کہ گلمرگ میں ہوٹلوں اور دیگر سرکاری مکانات کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا تھا۔ اس مال میں کٹلری، کراکری، قیمتی قالین اور دوسرا آرائشی سامان شامل تھا۔ یہ لوٹ قبائلیوں نے نہیں کی تھی بلکہ اوڑی اور بارہمولہ کے آس پاس کے لوگ قبائلیوں کے بھیس میں یہاں آئے تھے اور ہر چیز پر ہاتھ صاف کر گئے تھے چونکہ اِن لوگوں نے گلمرگ کے ہوٹلوں اور دیگر مکانات میں چوکیداروں یا بیروں کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اِس لیے اُنھیں سامان کے محلِ وقوع اور اِس کی قیمت کا پورا علم تھا۔ ہم نے پولیس کے ذریعے اُن علاقوں میں تلاشی کروائی اور بہت سارا مال و اسباب وصول کر کے بارہمولہ تھانے میں جمع کیا۔ وقت گذرتا گیا اور مجھے ایک دن یہ اطلاع ملی کہ یہ سامان مالکوں کو واپس کرنے کی بجائے کچھ افسروں نے آپس میں بانٹ کھایا ہے۔ میں نے انسپکٹر جنرل پولیس پرتھوی نندن سنگھ کی زیرِ سرکردگی ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تاکہ وہ اِس معاملہ کی چھان بین کرے۔ لیکن خاصی مدت گذرنے کے باوجود کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ میں نے ایک دفعہ آئی جی پی کو اپنے دفتر میں بلایا اور اُن سے اِس تاخیر کے لیے جواب طلب کیا۔ پرتھوی نندن سنگھ نے ایک خندۂ زیرِ لب کے ساتھ

جواب دیا کہ "آپ محکمہ داخلہ اپنی تحویل میں لے لیں تو میں اصلی حالات سے آپ کو آگاہ کروں گا۔ ورنہ میں مجبور ہوں۔ کیونکہ اس معاملے میں بڑے بڑے لوگ ماخوذ ہیں۔" ظاہر ہے کہ اُس کا اِشارہ بخشی غلام محمد کی طرف تھا۔

میری وزارت کے دوسرے ساتھی پنڈت شیام لال صراف صنعت، صحت اور سول سپلائز کے وزیر تھے۔ اُن کے خلاف بددیانتیوں کی مسلسل اور سنگین شکایات موصول ہو رہی تھیں۔ خاص طور ریشم کی خرید و فروخت میں لاکھوں کے ہیر پھیر کی اطلاع ملی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جب دفاتر ابھی جموں سے سرینگر منتقل نہ ہوئے تھے تو صراف صاحب کے نائب وزیر غلام محی الدین ہمدانی کے دفتر کے کمرے سے ایک بڑی گھڑی غائب ہوگئی۔ ہمدانی صاحب غسل خانے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو اپنی میز سے گھڑی غائب پائی۔ اُنھوں نے جمعدار کو بُلا کر اُس سے پوچھ تاچھ کی۔ لیکن اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر ہمدانی صاحب نے اُس کا یقین نہیں کیا اور کہا کہ میرے کمرے میں کوئی اور نہیں آیا۔ اِس لیے گھڑی جمعدار نے ہی چرائی ہوگی۔ اُنھوں نے جمعدار کو بتایا کہ گھڑی واپس کرو ورنہ تمھیں نوکری سے علیحدہ کیا جائے گا۔ اور جیل بھی بھیجا جائے گا۔ جمعدار بے چارہ ڈر کے مارے آنسو بہانے لگا اسی اثنا میں ہمدانی صاحب نے اُسے سگریٹ لانے کے لیے کہا۔ نچلے طبقے میں موجود چپراسیوں نے جب جمعدار کو روتے بسورتے دیکھا تو اُس سے پرسشِ احوال کی۔ اُس نے سارا ماجرا سنایا تو کسی کو یاد آگیا کہ ابھی ابھی منسٹر صاحب یعنی پنڈت شام لال صراف کے سالے میاں کوئی چیز ہاتھ میں لیے ہوئے نیچے آئے تھے۔ اور اُسے صراف صاحب کی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ جمعدار دوڑا دوڑا گاڑی میں دیکھنے کے لیے گیا۔ لیکن اُسے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ وہ اور اُس کے ساتھی اُلٹے پاؤں لوٹے

ہی والے تھے کہ قسمت سے گھڑی کا الارم اچانک بج اٹھا۔ وہ سب چونک کر دوڑے اور انھوں نے گھڑی کو گاڑی کی سیٹ کے نیچے شور مچاتے ہوئے پایا۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ جمعدار خوشی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بھدائی صاحب کے کمرے میں آیا اور گھڑی اُن کی میز پر رکھ دی۔ بھدائی صاحب نے روئداد سنی تو معاملے کی اطلاع اپنے بڑے وزیر صراف صاحب کو دی۔ صراف صاحب نے بھدائی صاحب اور اپنے سیکریٹری میاں غلام محمد پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو صراف صاحب نے اُس پر کوئی کاروائی کرنے کی بجائے اُسے دبائے رکھا۔ البتہ اپنے لاڈلے سالے کو تبدیل کر کے محکمہ تعلیم میں بھیج دیا۔ جو اُن کی ہی قلمرو کا حصہ تھا۔ اور جہاں ہاتھ مارنے کے زیادہ سنہری مواقع موجود تھے۔ مجھے اس معاملے سے قطعاً بے خبر رکھا گیا۔ لیکن جب کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد رپورٹ پر گرد کی کئی تہیں جم گئیں تو بھدائی صاحب اسے میری نوٹس میں لائے۔ میں نے صراف صاحب کو اپنے پاس بلایا اور اُن کے اس طریق کار پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ میں نے صراف صاحب کو بتایا کہ یہ ٹھیک ہے کہ چوری کرنے والا اُن کا قریبی رشتہ دار ہے لیکن اُس کے خلاف تو اس سے پہلے بھی دفتروں سے پردے اور دیگر قسم کا سامان چرانے کی شکایات موجود ہیں۔ اگر آپ اسے پولیس کے حوالے نہ بھی کرتے تو بات سمجھ میں آسکتی تھی لیکن اُسے کم از کم ملازمت سے تو الگ کرنا ضروری تھا۔ تاکہ ہم سب عوام کے سامنے منہ دکھانے کے قابل رہتے۔ لیکن آپ نے جو طریق کار اپنایا ہے وہ نہ صرف آپ کو بلکہ تمام کابینہ کو لے ڈوبے گا۔ صراف صاحب آئیں بائیں شائیں کرتے رہے لیکن مجھے مطمئن نہ کر سکے۔ انھیں ایام میں ایک اور واقعہ میری نوٹس میں آیا۔ پہلگام کے ایک بکروال کی ایک بھیڑ ریوڑ سے بدک کر پہلگام کلب کے احاطے میں چلی گئی تھی۔ چوکیدار اس کو پکڑ کر پھاٹک کی طرف لے جانے لگا۔ راستے میں پہلگام کے ایگزیکٹو آفیسر صاحب نے بھیڑ کو موقع پر ہی ایک ہوٹل والے کے ہاتھ بیچ کر پچاس روپے اپنی جیب میں ڈال دیے۔ شاید اس نے چند سکے چوکیدار کو بھی دیے ہوں گے۔ ہوٹل والا بھیڑ کو لے کر آیا اور اسے اپنے ہوٹل کے برآمدے میں باندھ دیا۔ اتنے میں بکروال گم شدہ بھیڑ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس طرف آنکلا تو اُس نے اپنی بھیڑ کو پہچان لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اُس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بات ایگزیکٹو آفیسر تک پہنچی تو وہ گھبرا گیا۔ اُس نے روپیہ ہوٹل والے کو واپس کر کے بھیڑ لیا اور اُسے بکروال کے حوالے کر دیا۔ بکروال کو چپ کرانے کے لیے اس کی منت سماجت بھی کی۔ لیکن بات پھیل گئی تھی۔ میرے پاس پہلگام سے بہت سے تار آئے جن میں اس معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی اور ابتدائی جانچ سے ہی سراغ ملا کہ ایگزیکٹو آفیسر صاحب کے خلاف یہ پہلی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ اس معاملے میں خاصے مشّاق ہیں اور لوگوں کو اُن سے بہت سی شکایات ہیں۔ صراف صاحب معاملے کو پھر دبانے لگے تو میں نے اس معاملے پر کابینہ میں باز پرس کی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ ایگزیکٹو آفیسر کو کم از کم معطل کرنے میں کونسی چیز مانع تھی؟ صراف صاحب نے جواب دیا کہ اس معاملے میں بخشی صاحب نے مداخلت کی کیونکہ بخشی صاحب کی خواہش تھی کہ آفیسر متعلقہ کو پہلگام میں ہی رکھا جانا چاہیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس آفیسر کے ذریعے بخشی صاحب نے پہلگام میں بڑی بھاری جائداد کھڑی کر لی تھی۔ اور جنگل سے عمارتی لکڑی مہیا کرنے میں آفیسر مدد کرتے۔ بخشی صاحب کے لیے اتنا کام کیا تھا کہ وہ اُس کی شکرگذاری کا صلہ چکانے کے لیے ڈھال بن کر اُس کو بچاتے رہے تھے۔

تیسرا واقعہ صراف صاحب سے متعلق میری توجہ میں لایا گیا۔ جو اور بھی زیادہ سنگین

نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ترقی پسند اقدامات نے کمیونزم کے کیڑوں کی پرورش کے جراثیم ختم کر دیے تھے۔ ہماری انقلاب آفریں زرعی اصلاحات اور قرضہ جات کی معافی سے متعلق اقدامات سے کشمیر میں کمیونسٹوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ اُن کے پاس غریب عوام کو اُکسانے اور اس طرح اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لیے کوئی ہتھیار نہیں رہ گیا تھا۔ صادق صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ ہماری زرعی اصلاحات کو اصلاحات مانتے ہی نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ان اصلاحات کے پیچھے انقلابی تصوّر ضرور کارفرما ہے لیکن جو انقلاب خون خرابے کے سیلاب کے ساتھ موج زن نہ ہو وہ انقلاب ہی کیا! میرا وجود کمیونسٹوں کو راس نہیں آتا تھا۔ وہ ایسے آدمی کو برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتے تھے جو اُن کی پارٹی سے وابستہ ہو اور جس کی ڈور کھینچ کر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکیں۔ اُن کا اُس وقت مقصد یہ تھا کہ کشمیر کی فضا پر چھا کر وہ ہندوستان کی طرف پرواز شروع کر دیں۔ چنانچہ میری گرفتاری میں کمیونسٹوں نے بہت اہم حصہ ادا کیا۔ میری گرفتاری سے پہلے جن کمیونسٹوں کا کشمیر میں داخلہ بند تھا وہ سب اچانک سرینگر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر اشرف تو پہلے سے ہی یہاں براجمان تھے۔ اُن کو میرے بے حد اصرار پر پنڈت جی نے انگلستان سے واپس بلوایا تھا۔ وہ وہاں سے بیمار ہو کر آئے تھے۔ اس لیے میں نے انھیں کشمیر آ کر اپنی صحت بحال کرنے کی دعوت دی۔ لیکن کمیونسٹوں نے اپنی ایک پہچان یہ بھی بنائی ہے کہ وہ کسی مروّت اور کسی محبت کی پرواہ نہ کریں۔ اس کے علاوہ زیڈ۔اے۔احمد، ہری کرشن سرجیت، راما موری اور علی سردار جعفری اپنی "سرخ جنت" کو دیکھ کر یہیں خیمہ زن ہو گئے۔ اُن دنوں حکومت کے پیچھے بھی اہم پالیسی بیانات شائع ہوتے تھے۔ اُن کی ترتیب کامریڈوں کے اس حلقے کے ہاتھ میں تھی بلکہ خود حکومت کی پالیسیاں ان ہی کی اور سے بنوں کی مرہونِ منت تھیں۔ صادق صاحب

اور ڈی۔پی۔ دھر اُن کے خاص رازداروں میں سے تھے۔

جن دنوں ۱۹۴۴ء میں محمد علی جناح صاحب سرینگر تشریف لائے تھے، کنور محمد اشرف بھی اُن دنوں سرینگر میں ہی مقیم تھے۔ میں اُن دنوں عام جلسوں میں دو قومی نظریہ کو آڑے ہاتھوں لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اشرف صاحب تانگے پر میرے ہمسفر تھے۔ اشرف صاحب اچانک میرے ساتھ چیخ کر بولے "میرا بس چلے تو تم کو یہیں پر ختم کر دوں"۔ میں نے سبب پوچھا تو اشرف صاحب نے کہا کہ تم دو قومی نظریے کے دشمن ہو اور اس لیے ترقی پسند تحریک کے بھی دشمن"۔ میں حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگا اور سوچنے لگا کہ جن لوگوں کا نعرہ "دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ" ہے وہ کس بنا پر دو قومی نظریے کے پاسبان بن گئے ہیں۔ لیکن اُن دنوں کمیونسٹوں کا کتابی علم انھیں اس انکشاف پر اُکسا رہا تھا: ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے اور وہ پرولتاری ہیں۔ اس لیے اُن کی حمایت کر کے وہ کمیونسٹ نظریے کے لیے کروڑوں سپاہی چٹکی بجانے میں جیت لیں گے۔ چنانچہ اُن دنوں حقِ خود ارادیت کی خوش نما نقاب کی آڑ میں کمیونسٹ پاکستان کے حق میں فضا ہموار کرنے لگے۔ لیکن جب پاکستان بنا تو سجاد ظہیر صاحب بس اپنی لنگوٹی بچا کر ہندوستان واپس آ گئے۔ اور جواہر لال نہرو نے اپنی پُر لطف طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُنھیں طعنہ دیا "کیوں بنّے بھائی! آ گئے انقلاب برپا کر کے!"

۹ اگست ۱۹۵۳ء کو میری گرفتاری سے ایک آدھ مہینہ پہلے ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد، راما موری اور کوئی اور صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا ہے، مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے اپنی مشکلات کا اُن سے ذکر کیا اور پوچھا کہ جن حالات میں، میں ایک نہایت ہی بنیادی قسم کی آدرش وادی لڑائی لڑ رہا ہوں، وہ جیتنے کی مجھ سے کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے اگر درپیش مسائل کو حل نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ نظریاتی

جنگ کے جس کورو کشیتر میں مجھے لڑنا ہے اس میں اگر مجھے مناسب ہتھیار فراہم نہ کیے جائیں تو میں اس مہا بھارت کا پانسہ کیسے ہندوستان کے حق میں پلٹ سکتا ہوں؟ میں نے اس سلسلے میں مسائل کی نشاندہی کے لیے کچھ کتابچے اُن کو دیے۔ جن میں ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کے ساتھ خط و کتابت کی ایک نقل بھی شامل تھی۔ زیڈ احمد صاحب نے کچھ وقت کے بعد وہ چیزیں پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ میرا شکریہ ادا کیا اور میری مشکلات کا اعتراف کیا لیکن بجائے اس کے کہ مشکلات کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ذاتی یا جماعتی طور پر میرا ہاتھ بٹانے کے لیے آگے آتے وہ الٹا سازش کے خاکے میں رنگ بھرتے گئے۔ یہ بڑی طاقتوں کی آویزش کا بڑا پُر آشوب دور تھا۔ اور جوزف آلسٹن کی "ظلمتِ نیم روز" اپنے عروج پر تھی۔

اس وقت گاندھی جی کو سرکاری طور پر روس میں سامراج کے پٹھو کی حیثیت سے یاد کیا جاتا تھا۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ نیشنل کانفرنس کا منشور "نیا کشمیر" کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں چھپ چکا تھا۔ اس کے سرورق پر نیشنل کانفرنس کے سرخ ہل والے جھنڈے کی تصویر تھی۔ ایک دفعہ جب میں جواہر لال کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو وجے لکشمی پنڈت نے جو اُن دنوں امریکہ میں ہند کی سفیر تھیں، مجھ سے پوچھا کہ کیا اس سرخ رنگ کے جھنڈے کا کوئی تعلق کمیونسٹوں سے ہے؟ کیونکہ اس بارے میں امریکہ میں شبہات پائے جاتے ہیں۔ بعینہٖ اس طرح اگر مجھ سے امریکی سفیر یا سفارت خانہ کا کوئی افسر ملاقات کرتا تو فوراً شبہات پیدا کیے جاتے کہ ہو نہ ہو روس کے خلاف کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔

اس طرح سے ہم دو عالمی طاقتوں کے درمیان چکی کے دو پاٹوں کی طرح پس رہے تھے۔

▲▲▲

۵۴

در آباد، کشمیر برباد

میری گرفتاری کی خبر کشمیر ہی کیا دُنیا بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس کے خلاف کشمیر میں ایسا زبردست عوامی ہیجان پیدا ہو گیا کہ ۱۹۳۱ء کے انقلابی ہنگامے کی یاد تازہ ہو گئی۔ مرد، عورتیں، پیر و جوان، کالجوں اور اسکولوں کے لڑکیاں اور لڑکے دیوانہ وار سڑکوں پر آ گئے۔ اور بخشی غلام محمد کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا ایک سیل بے پناہ اُمڈ آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وادی کے کوہ و کمر سے انسانوں کا ہجوم سیلاب کے پانیوں کی طرح نیچے اتر آیا ہے اور شہر و قصبوں میں موجیں مار رہا ہے۔ لیکن بے چارے بے دست و پا تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھی تک نہ تھی۔ ان کا ٹکراؤ ایک اُبھرتی ہوئی اور تازہ دم طاقت کے ساتھ ہو رہا تھا جس نے اس تحریک کو دبانے کے لیے کئی مہینوں سے منظم اور مسلح کوششوں کی خوب مشق کی تھی۔ کشمیری اپنے دلوں کا لاوا آتش فشاں کی طرح بکھیرنے لگے۔ لیکن وہ ایک بے رحم اور اندھی طاقت کی مضبوط چٹان سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ دو سے تین ہزار کے درمیان بے گناہ کشمیری گولیوں سے بھون ڈالے گئے۔ اور اُن کی بے گور و کفن لاشوں کا کوئی نام و نشان نہ رہا۔ اور وہ صرف اپنے سرخ لہو

کی ردا کا کفن پہن کر بے نام قبروں میں گاڑ دیے گئے۔ شاید ایسے ہی عاشقانِ پاکباز کے لیے غالبؔ نے کہا تھا:

اس خوں چکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

ہزاروں کی تعداد میں گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔ وادیٔ کشمیر ایک تیز انقلابی ریلے کی زد میں آ گئی۔ لوگ تین ہفتوں تک کاروبار سے منہ موڑے رہے اور وادی میں زندگی معطل ہو کر رہ گئی۔ اسی دوران عید آ گئی۔ یہ شاید مدتوں کے بعد ایسی خونی عید تھی جب سرینگر کے عیدگاہ میں نماز باجماعت ادا نہیں کی گئی۔ اور جب چاروں طرف شادیانوں کی بجائے ماتم کا سماں نظر آتا تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں کو تو اندازہ تھا کہ میری گرفتاری سے کشمیر کے خرمنِ امن میں چنگاری پڑ جائے گی۔ لیکن اس کے شعلے اس قدر تند و تیز اور فلک رس ہوں گے اس کا انہیں گمان نہ تھا۔ سازشیوں نے انہیں جھوٹی قسمیں کھا کر یقین دلایا تھا کہ کشمیری عوام مجھے بھول گئے ہیں۔ لیکن جب نتیجہ بالکل برعکس ثابت ہوا تو اب بندوق کے ساتھ طلائی زنجیر کی جھنجھناہٹ کا ساز بج اُٹھا۔ بخشی غلام محمد کی رہائش گاہ میں ایک حراستی کیمپ کھڑا کیا گیا۔ جہاں آئین ساز اسمبلی کے تقریباً تمام ممبروں کو محبوس رکھا گیا۔ انہیں پہلے تو طرح طرح کے لالچ سے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی گئی۔ جو لوگ اس جنگِ زرگری میں پامال نہ ہو سکے انہیں سیدھے جیل خانوں میں ڈال دیا گیا۔ اور بہت سے ممبروں کو مراعات و رعایات کی زنجیروں میں جکڑ کر ذہن و ضمیر کے تقاضوں سے بے خبر بنا دیا گیا۔ بعد میں ان ممبروں سے اسمبلی ہال میں شمشیروں کے سائے میں جمہوریت اخلاق اور آئین کے اس قتل کی منظوری لے لی گئی۔ جن لوگوں نے سرتابی کی جرأت کی انہیں منظر سے ہی ہٹا دیا گیا۔

اس خونیں ڈرامے میں دلی کے خاص ایجنٹ اور معتبر ڈی آئی جی پی در نہتے عوام کے سینوں پر گولیاں چلانے والی فوج کی رہنمائی کر رہے تھے اور کئی جگہ تو ملیشیا کے سربراہ بریگیڈیر ٹھموریا نے گولیاں چلانے والے اسکواڈ کو خود فائر کرنے کے حکم دیے۔

ہندوستان میں بھی اس واقعے سے سنسنی پھیل گئی۔ جس شخص کو کل تک لوگوں کے سامنے ایک ہیرو اور ہندوستان کے ایک سپوت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ جس کی تعریف کرتے کرتے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اور جس کے رول کی مہاتما گاندھی نے بھی سراہنا کی تھی۔ آج وہ یک آن مُلک کا غدار اور وطن کا دشمن کیسے بن گیا! اپنی اس کارروائی کے جواز میں پریوں کی کہانیوں اور بھوتوں کے قصوں جیسے افسانے گھڑے گئے۔ یہاں تک کہا گیا کہ میں گلمرگ پاکستانی افسروں کے ساتھ خفیہ ساز باز کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ جو پاکستان کی سرحد کو پار کر کے گلمرگ آنے والے تھے۔ اس لیے بروقت اقدام کر کے اس سازش کو ناکام بنا دیا گیا۔ لیکن دروغ گو را حافظہ نباشد۔ وہ یہ بات بھول ہی گئے کہ اس سفر میں میرے ساتھ جو افسر تھے وہ سب کے سب ہندو تھے۔

ایک اور افسانہ یہ گھڑا گیا کہ میں نے امریکہ کے ساتھ کشمیر کو آزاد رکھنے کی سازش کی تھی۔ اور میں کشمیر کو ایک دوسرا کوریا بنانا چاہتا تھا۔ "ملاپ" اور اس قماش کے دوسرے فرقہ پرست اخباروں نے تو یہ بے پر کی اُڑائی کہ صدر آئزن ہاور نے مجھے ایک خط بھیجا تھا۔ میں عید کے روز کشمیر کی آزاد مملکت کا اعلان کرنے والا تھا۔ اور امریکہ کی چھاتہ بردار فوجیں ہوائی جہازوں کے ذریعے کشمیر میں اُترنے ہی والی تھیں۔ اور اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے مجھے عین وقت پر گرفتار کیا گیا تھا۔ ان قصے کہانیوں کو عام کرنے میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور

اس غرض کے لیے سٹینڈی سرکل تک قائم کیے۔ صادق صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے میری گرفتاری کو بروقت اور برمحل قرار دیا۔ مولوی سعید میرے جنرل سیکریٹری تھے۔ کشمیر کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ اور میں نے اُنھیں تازہ ترین حالات سے باخبر رکھا تھا۔ لیکن اُنھیں ان واقعات کو پارلیمنٹ کے سامنے لانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اگر چاہتے تو اِس تمام طومار کا پول کھول کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ خود سازش میں ملوث تھے۔ پھر اِس قسم کی روش کیوں اپناتے ؟ اُنھوں نے ابوالہول کی سی چُپ سادھ لی اور اُن خطوط کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی توفیق نہ پا سکے جو میں نے گرفتاری سے پہلے اُن کے نام لکھے تھے۔ وہ میرے حق میں لب کُشائی کیسے کرتے ؟ اُنھوں نے ہمارے دو اور ممبران پارلیمنٹ صوفی محمد اکبر اور خواجہ غلام قادر بٹ کو کشمیر آنے سے روک دیا۔ تاکہ اُن کے آنے سے بخشی مخالف تحریک کو تقویت حاصل نہ ہو سکے۔ اُنھوں نے بخشی صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور اُنھیں مشورہ دیا کہ گرفتاریوں میں شُمار سے زیادہ کوالٹی (QUALITY) پر زور رکھا جائے۔ تاکہ عوام میں ناراضگی عام نہ ہو مگر تحریک کی روح اسیر ہو کر رہ جائے۔ مولوی سعید نے بخشی صاحب کو وزارت سازی کے متعلق بھی مشورے دیے اور یہ بھی بتایا کہ کس شخص کو شامل کیا جائے۔ اور کس کو باہر رکھا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ مولوی صاحب سازش کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں تک تھے۔ بعد میں بخشی نے میر قاسم اور صادق کو بھی کابینہ میں شامل کر لیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس واقعے کے متعلق پارلیمنٹ کے سامنے ایک جذباتی تقریر کی اور اُن واقعات پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی یہ مقطع* بھی لگا دیا کہ اس کارروائی کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔ البتہ اِن کی تقریر سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ گو وہ اِس واقعہ کی وزیرِاعظم کی حیثیت سے ذمہ داری لے رہے ہیں۔ لیکن اُن کے

* غزل کا آخری شعر

ہاتھ اُن کی مرضی کے خلاف باندھ دیے گئے تھے۔

میں وزیرِ اعظم ہونے کے علاوہ جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا صدر بھی تھا۔ مجھے جیل خانہ بھیجنے کے بعد بخشی صاحب نے اِس کی صدارت پر بھی یک طرفہ قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی سعید ابھی جنرل سیکریٹری ہی تھے۔ اِن تبدیلیوں پر آئینی جواز کا غازہ چڑھانے کے لیے بخشی صاحب نے جنرل کونسل کا اجلاس طلب کر لیا اور مولانا سعید کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ دہلی سے تو طمطراق کے ساتھ چلے لیکن حکومت نے اُنھیں رام بن سے آگے آنے نہیں دیا۔ اُنھیں اِس طرح بے حال کرنے میں نائب وزیرِ داخلہ شری ڈی۔ پی۔ در کا شاطرانہ ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اور اِس کا مقصد یہ تھا کہ مولوی سعید کو نیشنل کانفرنس سے دور رکھا جائے تاکہ اس جماعت پر کمیونسٹ کامریڈ بلا روک ٹوک حاوی ہو سکیں۔ مولوی سعید طبیعت کے مولوی ہی تھے۔ اور کمیونسٹوں کے سخت مخالف۔ اس لیے کمیونسٹوں کی آنکھوں میں اُن کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ وزارت سازی کے وقت بھی مولوی سعید نے کوشش کی تھی کہ کچھ کمیونسٹ مخالف عناصر کابینہ میں آ جائیں لیکن کمیونسٹوں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی۔ اس کے علاوہ وہ مولانا صاحب کی فتنہ پرور طبیعت سے واقف تھے۔ اور اُنھیں خدشہ تھا کہ وہ بخشی غلام محمد کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے کمیونسٹوں کو لال جھنڈی نہ دکھائیں۔ بہر کیف۔ مولوی سعید کو خطرہ ہو گیا کہ اِس طرح برسرِ راہ اُن کو روک دیا گیا تو دوسرا قدم اُن کی گرفتاری کا ہو گا۔ اس لیے وہ دُم دبا کر واپس دہلی چلے آئے۔ مولوی صاحب دہلی میں میرے خلاف خاموشی کی سازش میں بدستور شامل رہے اور کسی نہ کسی طرح اربابِ اقتدار کا قرب حاصل کرنے کے لیے داؤں کھیلتے رہے مگر اُن کی کوئی آرزو اُن کے حریفوں کی وجہ سے بر نہ آئی۔ جب کوئی مولوی صاحب سے اُن کی خاموشی کا جواز پوچھتا

تو وہ یہ معنی خیز جواب دیتے کہ میری خاموشی دراصل شیخ صاحب کے حق میں میری جدوجہد ہے۔

کمیونسٹوں نے اب نہایت چالاکی سے بخشی غلام محمد کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ وہ بخشی غلام محمد کو ڈھال بنا کر درپردہ اپنے عزائم پورا کرنا چاہتے تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ اُن کے راستے میں شیخ محمد عبداللہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح حائل ہے۔ لہٰذا اس کو ہٹانے میں انھوں نے اپنا سارا زور صرف کر دیا لیکن اس کا الزام وہ براہِ راست اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے۔ اور وہ یہ سارا دوش بخشی غلام محمد کے کاندھوں پر ڈال کر اُٹھنے سے پہلے ہی اُن کا رنگ زرد کر دینا چاہتے تھے۔ کمیونسٹوں کو معلوم تھا کہ بخشی غلام محمد کی خامیاں اور کوتاہیاں اتنی زیادہ ہیں کہ مناسب وقت پر انھیں راستے سے ہٹا کر صادق صاحب کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن بخشی غلام محمد کی چالاکی کو انھوں نے بہت کم سمجھا تھا۔ بخشی صاحب کچھ وقت تک بے بسی کے عالم میں یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ اور کمیونسٹوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا۔ انھوں نے حکومت پر پوری گرفت حاصل کر لی اور نیشنل کانفرنس کی تنظیم پر اپنے ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید کو بلائے بے درماں کی طرح مسلط کر دیا۔

میری گرفتاری اور کشمیریوں پر ظلم توڑنے کے سارے گھناؤنے ڈرامے میں پنڈت درگا پرشاد در نے بڑا ہی نفرت انگیز رول ادا کیا۔ وہ ہندوستان کے محکمۂ جاسوسی کے ایک ایجنٹ کی طرح کام کرتے رہے اور اُن کا سارا کام میرے خلاف مخبری کرنا اور ٹاپ سیکرٹ رپورٹیں بھیجنا رہ گیا تھا۔ ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ اُن کے روابط کتنے گہرے تھے اُس کا ذکر بی۔ این۔ ملک نے بھی کیا ہے۔

میں نے ڈی۔ پی کو وزارت میں بطور ڈپٹی ہوم منسٹر شامل کیا تھا۔ ایک دفعہ بخشی صاحب اُن سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور میرے پاس آ کر واویلا کرنے لگے کہ اُن کو وزارت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ ایک ساتھی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا اچھا نہ رہے گا۔ اگر آپ اُس کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تو میں اپنے قلمدان میں سے اُسے منصوبہ بندی کا شعبہ سپرد کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ دونوں مجھی کو تختۂ مشق بنائیں گے۔ میرے اور مرکز کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں ڈی۔ پی۔ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ڈی۔ پی۔ کشمیر کے مشہور در خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اور اُن کی طبیعت میں نفاست کا بڑا دخل تھا۔ بڑی دلکش شکل و صورت، قد و قامت اور طرزِ کلام کے مالک تھے خاصے ذہین اور طرار تھے لیکن یہ سب کچھ سطح کے اوپر اوپر ہی تھا۔ ان میں شخصیت کا سوز اور فکر کی گہرائی نہیں تھی اس کے علاوہ بہت سی اخلاقی کمزوریوں نے بھی اُن کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن تھے بڑے زمانہ ساز اور شاطر۔ ۱۹۵۳ء میں کشمیری مسلمانوں پر جو اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں اس ڈرامے کے اصل پروڈیوسر ڈائرکٹر ڈی۔ پی۔ ہی تھے۔ اور وہ بذاتِ خود فائرنگ کرنے والے جیش کی ہدایت کاری اور رہنمائی کرتے بھی دیکھے گئے۔ بعد میں انھوں نے اس قسم کے کمالات کا مظاہرہ ۱۹۶۵ء کے زمانے میں بھی کیا۔ جب بٹہ مالو اور وادی کے کچھ دوسرے دیہات کو آگ لگا کر ہزاروں بے گناہوں کو بے خانماں بنا دیا گیا۔

کشمیری مسلمانوں کے غم و غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہندوستان نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے کرنسی نوٹوں کے انبار لا کر بخشی غلام محمد کے سامنے نچھاور کر دیے گئے۔ بخشی صاحب یہ عالم دیکھ کر پھولے نہیں

سماتے تھے۔ انھوں نے بھی بے دھڑک عوام کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع کر دیا۔ لوگوں کو تقریباً مفت چاول دیئے جانے لگے۔ اُن کے گھٹیا جذبات کو اُبھارنے کے لیے یہ بتایا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ اُن کو ہندوستان کی طرف ہاتھ پھیلانے کی بجائے عزت سے آلو کھانے کی تلقین کرتے تھے۔ بیگ صاحب کو طنز و تشنیع کے ساتھ "موذاگپہ دیو" (قحط کا بھوت) کے نام سے پکارنے لگے۔ جب وہ مال کے وزیر تھے تو چاول اتنے سستے داموں نہیں بکتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگ بھانپنے لگے کہ ہندوستان اور بخشی غلام محمد سستے چاولوں کے عوض اُن کے ضمیر کا نیلام کرنا چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کچھ عرصے تک راشن لینے سے بھی انکار کر دیا۔ لیکن تابہ کے؟ وہ بھی مجبوراً بہتے دریا سے ہاتھ دھونے کے لیے آ گئے۔ ہندوستان ہنسی خوشی یہ سارا خسارہ اپنے خزانے سے پورا کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ خسارے کی یہ رقم تینتیس کروڑ سالانہ تک پہنچ گئی۔ اور ایک عفریت کی طرح ریاست کی خوش حالی اور خود کفالت کو نگلنے کے لیے منہ کھولنے لگی۔ سستے چاولوں سے عوام کو خریدنے کی اسکیم بھی ڈی۔ پی صاحب کے دماغ کی اختراع تھی۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کشمیر کے لوگ سیاست بہت کم جانتے ہیں۔ انھیں تو بس پیٹ بھر کر خوراک چاہیے۔ اس لیے ہمیں بھی شکم کے راستے سے ہی باندھ کر انھیں اپنی طرف مائل کرنا چاہیے۔ چین میں بھی یہ تجربہ اُس وقت ہو چکا تھا جب وہاں بیرونی طاقتوں کی حکمرانی تھی۔ انگریزوں نے افیم کی پینک میں پڑے ہوئے چینیوں کو مفت چاول دے کر اپنا بنانا چاہا تھا۔ اگرچہ یہ تجربہ ناکام رہا تھا لیکن ڈی۔ پی۔ در نے اسی تجربے کو کشمیریوں پر آزمانے کا مشورہ دیا۔

کشمیر میں اس سامراجی ہتھکنڈے کی ایک تاریخی نظیر بھی موجود تھی۔ جب مغل افواج نے کشمیر کی آزادی کو ختم کر کے یہاں کے خود مختار بادشاہوں سے عہد شکنی کی تو اکبرِ اعظم نے کشمیر کے عوام کی بے چینی کو ختم کرنے کے قلعہ ناگر نگر کی عظیم فصیل بنانے کا کام اس لیے شروع کیا اور اُس پر اُس وقت کے سکّے کے مطابق ایک کروڑ دس لاکھ دینار خرچ کیے۔ تاکہ کشمیریوں کو کچھ ٹکے مل جائیں اور وہ اُسی کی مستی میں اپنی متاعِ گم گشتہ سے غافل ہو جائیں۔ چنانچہ ہری پربت قلعہ کی فصیل کے کاٹھی دروازے پر اکبر کے دور کی یہ پالیسی یوں چپتی ہوئی نظر آتی ہے اور آج بھی پتھر پر کندہ ہے۔

کرورو دہ لک از خزان فرستاد
دو صد استادِ ہندی جملہ چاکر
نگیرد ہیچ کس بے کار این جا
تمامی یافتند از خزانہ نش زر

(یہاں کوئی فریاد نہیں کرتا کیونکہ تمام لوگ اُس کے (اکبر کے) خزانے سے روپے پاتے ہیں۔)

میرے خلاف مقامی اور ہندوستانی اخبارات میں جان بوجھ کر کردار کشی کی ایک مہم چلائی گئی تھی۔ یہ الزام لگایا گیا کہ میں ایک رنگیلے مغل بادشاہ کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور میں نے اپنے استعمال کے لیے لاکھوں روپے کی لاگت سے امریکہ سے ایک کیڈلک کار منگوائی تھی۔ حالانکہ یہ بات درست نہ تھی۔ ایک کیڈلک کار حکومت نے ضرور امریکہ سے منگوائی تھی۔ یہ کار منگوانے کے لیے زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے لیے مرکز کے ساتھ لمبی چوڑی خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ لیکن یہ میرے لیے نہیں خریدی گئی تھی۔ بلکہ اُن معزز شخصیات اور مہمانوں کے استعمال کے لیے لی گئی تھی جو ہندوستان سے کشمیر میں وارد ہوتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں جواہر لال کا خاص خیال رکھا گیا تھا کیونکہ جب وہ سرینگر آتے تھے تو وہ کھلی کار میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ہمارے پاس

ایک ہی کار ایسی تھی، جو صدرِ ریاست کے استعمال میں رہتی تھی۔ ہمیں بار بار اُن سے یہ کار مستعار لینا پڑتی تھی اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ کار جلوس کے بیچوں بیچ بگڑ جاتی اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ اِس مشکل کو دور کرنے کے لیے کابینہ نے ایک کیڈلک کار خریدنے کی منظوری دے دی تھی۔ اُس کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لیے میرے سرکاری مکان میں ہی ایک مناسب گیراج موجود تھا۔ چنانچہ یہ کار وہیں رکھی گئی تھی۔ کار کے انجن کو دُرست حالت میں رکھنے کے لیے روزانہ اسے تین یا چار میل چلانا پڑتا تھا۔ شاید ایک آدھ مرتبہ میں بھی اس پر سوار ہوا ہوں۔ بس اتنا ہی تعلق میرا اس کار کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے مخالف گوبلز کی کتاب سے بیشتر اوراق اُڑا لائے تھے۔ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مشہور کیا گیا کہ میں نے یہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے منگوائی تھی۔ حالانکہ اس پر سٹیٹ گیراج کا نمبر درج تھا۔ سرینگر سے دہلی تک سبھی کو معلوم تھا یہ کس غرض کے لیے خریدی گئی ہے۔ بعد میں اس کار کی بڑی ٹھاٹھ اور دھوم دھام کے ساتھ لاٹری کرائی گئی۔ تاکہ کچھ نہ کچھ کیچڑ مجھ پر پھینک ہی جائے۔ اسی طرح کچھ لائبریریوں اور پارکوں کو میرے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ اُن سے میرا نام ہٹایا گیا۔ میری تصاویر دفاتر سے تو خیر تعلیمی اداروں سے بھی غائب کرائی گئیں۔ درسی کتابوں میں تاریخی حوالے کے طور پر میرا نام جہاں بھی آیا تھا وہاں سے اُسے محو کر دیا گیا۔ الغرض میرے نام کو عوام کے حافظے اور کشمیر کی تاریخ سے مٹانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا۔ لیکن فرمودۂ الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ اِنسان کی چالوں سے بہت بہتر اور بہت گہری چالیں جانتا ہے۔ اُن کی یہ ساری کوششیں اکارت گئیں۔ جوں جوں اُن کے ظلم کا ہاتھ دراز ہوتا گیا عوام کا اعتماد بھی اُن سے اُٹھتا گیا اور عوام کو یقین ہو گیا کہ میں ایک محبِ وطن اور عوام دوست بن کر

ہوا ہوں۔ میں جیل میں ایک عجیب سکون اور توکل کے ساتھ حالات کی اس نہج کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ زندگی کے مجاہدے میں اپنا فرض ادا کرنا سب سے بڑی فرحت بخشتا ہے باقی عواقب انسان کے نہیں اس کے خالق کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ اسی لیے میں کبھی کبھی یہ شعر گنگناتا تھا ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

واقعہ یہ ہے کہ ڈی۔ پی۔ در نے اپنی ریشہ دوانیوں سے کشمیریوں میں رائج اس کہاوت کو صحیح ثابت کر دیا تھا کہ در جب عروج پر ہوتے ہیں تو کشمیر پہ زوال آتا ہے۔ اُن کے ہی ایک جدِ بیربل در نے ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ کی فوجیں کشمیر لے آئی تھیں۔ اور کشمیر میں ظلم و ستم کا سیاہ ترین دور شروع کروایا تھا۔ اُن کے یہ اسلاف بعد میں سکھوں کو دغا دے کر گلاب سنگھ کے گماشتے بن گئے۔ اور راج کاک در نے ۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء میں زالڈگر میں ۲۸ شالبافوں کو زندہ ندی میں غرقاب کر کے دم لیا۔ ▲▲▲

۵۴

بخشی برادرس کارپوریشن

بخشی غلام محمد نے کچھ مدت کے بعد اپنی وزارت میں توسیع کر دی۔ شیام لال صراف اور گردھاری لال ڈوگرہ کے علاوہ اس میں میر قاسم اور غلام محمد صادق کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ڈی۔ پی۔ در کہنے کو تو ڈپٹی ہوم منسٹر ہی رہے لیکن وہ درحقیقت وزارت داخلہ کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ غلام رسول رینزو کو لیجسلیٹو اسمبلی کا اسپیکر بنایا گیا۔ لیکن غلام محمد صادق وزارتِ صحت وتعلیم کے ساتھ آئین ساز اسمبلی کی صدارت سے بھی چمٹے رہے۔ پہلے پہلے تو میرے ساتھ گرفتار شدہ آفیسروں، آر اسی ریتہ، جانکی ناتھ زتشی، شیام لال کول، واتھو اور بلدیو پرشاد شرما کو حراست میں رکھا گیا۔ لیکن جس کسی نے اپنی وفاداری تبدیل کی اس کو رہا کر کے پھر ملازمتوں میں لے لیا گیا۔ البتہ جن افسروں نے اپنی وفاداری تبدیل کرنے سے انکار کر دیا اُن کو بدستور جیل خانوں میں بند رکھا گیا۔ ان میں خواجہ غلام احمد عشائی رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی، خواجہ علی شاہ ڈپٹی ریونیو منسٹر، خواجہ محمد امین ڈائریکٹر فوڈ کنٹرول، خواجہ غلام محمد مکین، میر غلام رسول، مرزا غلام قادر بیگ، پنڈت کیشپ بندھو خواجہ غلام محمد شاہ

پیر محمد افضل مخدومی، خواجہ مبارک شاہ اور صدر الدین مجاہد وغیرہ شامل تھے۔ ممبران اسمبلی میں سے ملک غلام حسن لاہر، جانکی ناتھ گگرو، حکیم حبیب اللہ سوپور، مرزا غلام محمد بیگ ذیلدار، محمد مقبول بلہ گامی، غلام رسول ادہ اور بہت سارے ممبران نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں کچھ لوگوں نے سپر ڈال دی اور عافیت کا راستہ اختیار کر لیا۔

بخشی غلام محمد نے اس دستے (پیس برگیڈ) کے نام پر غنڈوں کی ایک جماعت منظم کی اور اُسے سرکاری چھتر چھایا کا اعزاز عطا کیا۔ اس میں وادی کے بدنام عناصر کو بھرتی کیا گیا۔ جس کو وہ اپنے طوفانی دستوں STORM TROOPERS کی حیثیت سے استعمال کرتا رہا۔ اُن کے ہاتھوں لوگوں کو شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ بلکہ بخشی دور کی بدترین غنڈہ گردی کا مظاہرہ اسی برگیڈ نے کیا۔ یہ لوگ عام شہریوں کے لباس میں چلتے پھرتے تھے۔ لیکن اُن کی حرکات و سکنات پر برابر نظر رکھتے تھے۔ اور جس کسی پر ذرا بھی شک گذرتا کہ وہ نئے نظام کا وفادار نہیں ہے اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ شریفوں کی پگڑیاں اُچھال کر دہشت پھیلانا ان کا رائج الوقت سکہ تھا۔ اس برگیڈ کو لوگ حقارت سے "ففتھ فقیر" یعنی "اندھیارے کے رہبر" کے نام سے پکارتے تھے۔ اس ظلم وستم کے لیے پولیس کا سپیشل سٹاف تفتیش اور ایذا رسانی کا شہرہ آفاق مرکز بن گیا تھا اور اس کی باگ ڈور بخشی صاحب کے خاص معتمد سپرنٹنڈنٹ پولیس غلام قادر شیخ عرف گاندربلی کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے کوٹھی باغ تھانے کو ایک ایسے اذیتی کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا کہ نازیوں کو بھی اُس کی سفاکی پر رشک آجاتا۔ وہاں اذیت رسانی کے نت نئے طریقے اختراع کیے گئے تھے۔ جن میں ننگی انسانی پیٹھ پر گرم استری پھیرنا بھی شامل تھا۔ گاندربلی کی سفاکی اور سنگ دلی کے قصے سن کر آج بھی مٹتے

والے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آج بھی مائیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے کسی بدروح کے بدلے گاندربلی کا نام لے کر انھیں سلا دیتی ہیں۔ گاندربلی انتہائی بدتمیز، بدلگام اور بدزبان بھی تھا۔ اور کسی شخص کی عزت اُس کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے ۵۳ء میں اپنی چند روزہ رہائی کے دوران کہا کہ اُس کے شعور و شعار سے صاف مترشح تھا کہ ایک مجرم کو پولیس کی وردی پہنا دی گئی ہے۔ میری ذات اور میرے بال بچے تو اُس کے رکیک حملوں کا خاص طور پر نشانہ بنتے رہے اور وہ چنگھاڑے کر ہمیں گالیاں دیتا رہا۔ لیکن قدرت کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ ایسی عبرتناک موت مرا کہ خدا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اُس کی موت پر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا اور اپنی قوم سے دغا کرنے کا آگے یہ صلہ ملا کہ جب تک کشمیری قوم کی رگوں میں حمیت کا خون جوش مارتا ہے اُس کا نام نفرت و حقارت سے لیا جاتا رہے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ یعنی دیکھو اُسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

بخشی عبدالرشید، بخشی غلام محمد سے قرابت کی وجہ سے سرکار اور تنظیم دونوں پر چھا گیا تھا۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا تھا جس کا ماضی بہت ہی داغدار تھا۔ اُس کا والد قادر خان ایک وقت کشمیر سے لڑکیوں کو بھگا کر پشاور کے بازارِ حسن میں پیشہ کروانے کا دھندا کرتا تھا۔ بخشی رشید خود بھی واجبی طور پر ہی پڑھا لکھا تھا۔ لیکن ابتر ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں کھوکھلی اکڑ فوں اور رعونت بہت زیادہ گھر کر گئی تھی۔ اُس نے بھی عوام کو اپنے ظلم و ستم کا شکار بنا رکھا تھا۔ اُس کے ارد گرد چند بدکار اور بداخلاق اشخاص منڈلاتے رہتے تھے۔ جن کے ہاتھوں کسی لڑکی کی عزت و عصمت تک محفوظ نہیں تھی۔ شراب و کباب اور ناؤ نوش کی محفلیں اُس کے دربار میں

روز بجتی تھیں لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور صبر سے برداشت کرتے تھے کیوں کہ شنوائی کا ہر دروازہ بند تھا۔ یہاں کے لوگوں کی بات ہی کیا۔ ایک بار ہندوستان کے مشہور سوشلسٹ رہنما اشوک مہتہ کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لائے۔ اُن کو لال چوک کے نزدیک سرِ بازار پیٹا گیا۔ اُن کے ساتھ ایک خاتون شریمتی وستا ولیوی بھی تھیں جن کی بے حرمتی کی گئی۔ جب میرے بڑے لڑکے فاروق نے اُسے بچانے کے لیے مداخلت کرنا چاہی تو غنڈے اُس کے پیچھے بھی پڑ گئے۔ اور اُسے ایک دکان میں پناہ لینا پڑی۔ میری بیگم کو بھی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر اُس نے کہیں اپنی زبان کھولی تو اُس کی بھی بے عزتی کی جائے گی۔ بخشی کے ایک پروردہ غنڈے سلیم شال اور اس کے بھائی محمد شال نے، جو محکمہ پولیس میں ایک بڑا افسر تھا، بیگم کو دن دھاڑے گالیاں سنائیں۔ الغرض ہر طرف غنڈہ گردی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ اس سارے خلفشار کے پیچھے کمیونسٹوں کا عیارانہ اور استادانہ ہاتھ کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے فلسفے کو مظلوم کشمیریوں پر آزمانا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب نے عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا اور اُن کے سفلی جذبات کو ابھار کر سیاسی فائدہ اُٹھانا چاہا۔ بمبئی سے مقبول عام فلمی ستاروں کو بلوا کر اُن کے کرکٹ میچ کرائے گئے۔ مختلف جگہوں پر رقص و فحاشی اور "مدھر نغمہ" کی محفلیں آراستہ کی گئیں۔ شگوفۂ بادام کے باغات میں ناچ اور نغمے کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ جہاں بھی لوگوں کی محفلیں ہوتی تھیں، بخشی جیب سے پیسے نکال کر اُن کی طرف پھینکتا تھا۔ فرعون و ہامان کی طرح اُن پر خندہ زن ہوتا تھا۔ بخشی جب غیروں کو اس طرح انعام و اکرام سے نوازتا تھا تو اُس کا جو اپنا عالم ہوتا اُس کے تصوّر کے لیے بڑے زبردست تخیل کی ضرورت نہیں۔ اُس نے خود بھی ناجائز دولت سمیٹنے کا سلسلہ تیز کر دیا۔ کشمیر کے جنگلات

پر خوب ہاتھ ڈالا اور اپنے عزیزوں کو ٹکوں کے عوض سونا اُگلنے والے بڑے بڑے بنگلے الاٹ کر دیئے۔ جو لوگ جھونپڑیوں میں رہتے تھے وہ چشم زدن میں محلات کے مالک بن گئے۔ بخشی صاحب کے زرخیز دماغ نے "روٹ پرمٹ" کی ایک نئی منصب داری کی طرح ڈالی۔ ریاست کی سڑکوں پر گاڑی چلانے کے لیے ایک کاغذ کا پرزہ ہاتھ میں تھما دیا جاتا تھا۔ جس کی قیمت بیس سے تیس ہزار روپے تک ہوتی تھی۔ یا تو لینے والا اُسے ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ فروخت کر کے نقد سودے سے مستفید ہو جاتا تھا یا پرمٹ کسی گاڑی والے کے ہاتھ میں دے کر ہر ماہ پانچ سو سے ہزار روپے تک گھر بیٹھے بٹورتا رہتا تھا۔ بخشی نے رشوت کو ایک فنِ لطیفہ کی شکل دے دی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے نہ صرف اندرونِ ریاست کی ایک پوری نسل کے ضمیر کے چراغ اور دیانت کی شمعیں بجھا دیں بلکہ ریاست سے باہر کے بااثر اور چرب زبان لوگوں کو لالچ سے پھنسا بنالیا۔ اُن میں پنجاب کے کچھ وزیر، پارلیمنٹ کے اسپیکر، مرکزی وزراء کے سیکریٹری، کچھ صحافی اور دوسرے اہم لوگ شامل تھے۔ اِس طرح سے وہ اپنی ناجائز حکومت کی طنابیں ہر سمت اور ہر جانب سے مضبوط باندھنا چاہتا تھا۔ لیکن مشیتِ ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ سارے ہتھکنڈے بے اثر ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ثابت ہونے لگے اور اُن کی بدنامی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ اُن کے متعلق شکایات جواہر لال نہرو کو ملنے لگیں۔ لیکن بھلا وہ اس کا کیوں اور کیسے مداوا کرتے اُنھوں نے تو بخشی کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ سے میری گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد نے خوب پینگیں بڑھائی تھیں۔ اور ان سے کہتا رہتا تھا کہ شیخ عبداللہ کو ہم نے آپ ہی کے ساتھ زیادتی کرنے کی وجہ سے جیل بھیج دیا ہے۔ اس کے علاوہ پریم ناتھ جی اور ان کے حواریوں کو بھی مراعات و عنایات سے مالا مال کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ

اس کی کارستانیوں کا رونا روتے تھے۔ ایک دفعہ ڈوگرہ صاحب نے پنڈت جواہر لال سے شکایت کی کہ بخشی غلام محمد بے تحاشا جائداد بنا رہا ہے۔ پنڈت جی نے جواب میں کہا کہ "جائداد ہی تو بناتا ہے اور یہ جائداد بہرحال ہمارے ملک کی زمین و آسمان کے درمیان واقع ہے اس کو لے کر کہاں چلا جائے گا"؟ پنڈت پریم ناتھ جواہر لال جیسے بلند کردار رہنما کی زبان سے یہ بات سن کر ششدر رہ گئے اور خاموشی سے چلے آئے۔ بخشی غلام محمد نے اس سلسلے میں اپنا ضابطۂ کردار اسقدر واضح کر دیا تھا کہ اس نے ایک دفعہ سرکاری ملازموں کے ایک بڑے مجمع میں کھلے بندوں اُن سے یہ کہا کہ اگر میرے وقت میں تم دولت نہیں بنا سکتے تو تم سے زیادہ بدبخت کوئی اور نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہر سرکاری ملازم نے خوب ہاتھ مارنا شروع کر دیئے اور حکومت ایک بازاری طوائف بن کر رہ گئی۔ جس کو غرض مند سرکاری ملازم نیلام پر چڑھا کر دھن دولت بٹورا کرتے تھے۔ حرام اور حلال فضول اور فرسودہ قدریں بن کر رہ گئیں۔ بددیانتی اور بے ایمانی کا ننگا ناچ عام ہو گیا۔

اِن حالات میں شاید پنڈت جواہر لال کے دل میں اُن کی سوئی ہوئی شائستگی نے آنکھ کھولی اور اُنھیں میری وہ بات یاد آگئی ہوگی جو میں نے اُنھیں بخشی غلام محمد کی بے راہ رویوں کے متعلق بتائی تھی۔ اُنھوں نے اپنے ایک پرانے دوست پی سبرائن کو میرے پاس بھیجا۔ میں سب جیل کُد میں نظر بند تھا۔ پی۔ سبرائن موہن کمارمنگلم (جو بعد میں ایمرجنسی کے دوران ملک کے وزیر قانون بنے) اور جنرل کمارامنگلم کے والد تھے۔ اُن کے ساتھ میری دیرینہ جان پہچان تھی۔ یہ کسی کام کے بہانے سے سرینگر آئے تھے۔ لیکن وہاں سے سیدھے میرے پاس کُد پہنچے۔ یوں تو وضع داری نبھاتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ میں خود شوقِ ملاقات کی وجہ سے آیا ہوں۔ لیکن اُن کی حرکات و سکنات سے ظاہر

تھا کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" وہ مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے گذشتہ ناخوشگوار واقعات کو بھول جانا چاہئے۔ اور پھر کشمیر کی عنانِ حکومت کو قبول کر لینا چاہئے۔ بھرائین صاحب بڑے تاسف آمیز لہجے میں کہنے لگے کہ ہندوستان یوں تو کشمیر کی ترقی اور کشمیری عوام کی بہتری کے لیے گراں قدر رقومات کشمیر بھیج رہا ہے۔ لیکن اِس میں سے نصف سے بھی کم جائز مقاصد پر صرف کیا جاتا ہے۔ باقی سب خرد بُرد کیا جاتا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں نے انہی لوگوں کی نشاندہی پنڈت جی کے سامنے کر دی تھی۔ اس وقت بس مرض کی کونپل ہی پھوٹ رہی تھی اور اُس کا بروقت مداوا کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پنڈت جی نے ان کو راہِ راست پر لانے کی بجائے اُنھیں کے سپرد سارا انتظامِ مملکت کر دیا اور مجھے غالب کے اس شعر کے مصداق چلتا کر دیا ؎

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

اب تو رشوت کی ننھی کونپل ایک تناور درخت بن چکی ہے اور اس کو اکھاڑ پھینکنا ایک بے حد مشکل امر بن گیا ہے اور پھر مسئلے کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ میں نے جو کچھ پنڈت جی سے کہا تھا اس میں میری ذاتی خود غرضی کو دخل نہ تھا۔ میں نے محض اپنا فرض نبھاتے ہوئے اُنھیں حقائق سے روشناس کیا تھا۔ فیصلہ اُن کا تھا اور اُنھوں نے فیصلہ کر لیا اب اُنھیں اِس فیصلے کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے سب سے بڑے منصف یعنی وقت کا انتظار کروں گا۔ تاکہ یہ خود میری بریت اور معصومیت کا فیصلہ صادر کر دے۔ بیچارے بھراگن صاحب یہ سُن کر چپ ہوئے اور رُخصت چاہی۔

اور کہا گیا ہے کہ بخشی صاحب نے کشمیریوں کے سِفلانہ جذبات کو اُبھار کر اپنا اُلّو

سیدھا کرنے کی کوشش کی اور اُن کے باطن کی روشنی بجھانے میں اپنی بلاشبہ بڑی زبردست صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اُس وقت وہ بھول گئے کہ ہمیں قوم کے جذبۂ خودی کو بیدار کرنے کے لیے ہم نے اِتنی صعوبتیں اُٹھائیں اور بے مثال قربانیاں دی تھیں اور ہزاروں شہیدوں نے سرزمین کشمیر کو اپنے پاک خون سے لالہ زار بنا دیا تھا اُس کو اُنھوں نے کس طرح پامال کر دیا۔ اور ہماری تحریک کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔ ؎

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

فطرت کا یہ دستور رہا ہے کہ کبھی کبھی برائیوں میں بھی بھلائی کا ایک پہلو مضمر رہتا ہے۔ بقولِ غالب ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

بخشی صاحب کے دور میں کچھ اچھے کام بھی ہوئے۔ ریاست میں پہلی بار میڈیکل کالج اور ریجنل انجینئرنگ کالج کی بنیادیں پڑیں۔ تعلیم کو پرائمری سے یونیورسٹی سطح تک مفت بنا دیا گیا۔ اِس کے نتائج آئندہ کے لیے یکساں طور پر اچھے نہ رہے کیونکہ تعلیم یافتہ بے روزگاری بڑھتی گئی اور سب کے لیے ملازمتوں اور روزگار کا بندوبست کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی چونکہ کشمیر کے لوگ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے تھے لہٰذا مجموعی طور پر اس کا اثر ٹھیک ہی ہوا۔ بخشی صاحب نے کچھ تعمیری کام بھی کیے۔ سرینگر میں نیا سیکرٹیریٹ، ٹورسٹ ریسپشن سنٹر، سٹیڈیم، ٹیگور ہال اور کچھ دوسری اہم عمارتیں بنوا دیں۔ جموں شہر کو بے حد وسعت دی۔ وہاں کے گلی کوچوں کو کشادہ کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ بڑی بڑی سڑکیں بنوائیں۔ وہاں بھی سیکرٹیریٹ اور اسمبلی کی شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔ دیہات میں آمد و رفت کے لیے بڑی بڑی سڑکیں اور پُل بنوا دیئے کشمیر یونیورسٹی کو رہائشی دانش گاہ بنوانے کے لیے اِبتدائی ڈھانچہ کھڑا کیا۔ لیکن انھوں نے

اتنی ساری عمارتیں کھڑی کرنے کے باوجود ایک ایسی عمارت کو ڈھا دیا جو تاج محل اور اہرام مصر سے زیادہ قیمتی اور اہم ہوتی ہے اور وہ تھی کشمیریوں کے کردار کی عمارت ؎

توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

بخشی صاحب ذاتی طور پر کچھ انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن کی طبیعت میں متضاد دھارے بہتے تھے مثلاً وہ بڑے سنگ دل اور ظالم بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اُن کا ایک بڑا وصف اُن کی سخاوت تھی۔ اپنی وزارت عظمیٰ کے دور میں اُنھوں نے اس کے کئی مظاہرے کیے۔ بہت سے بے نواؤں اور تنگ دستوں کو بھی چھوٹے چھوٹے فائدے پہنچائے اور گھر میں بھی دسترخوان اور لنگر جاری رکھا اس کی وجہ سے ایک مخصوص طبقے میں اُن کے تئیں حسنِ ظن بھی پیدا ہوا اور بعض لوگ آج بھی اُن کے اچھے کاموں کو یاد کرتے ہیں۔

وقت گذرتا گیا اور میں اُدھمپور کے محل میں کسی نہ کسی طرح تنہا رہا۔ مجھے جیل خانے میں اخبارات بھی ملنے لگے۔ اور ایک ریڈیو بھی دیا گیا جس کے تمام اسٹیشن سرینگر کے سوا بند تھے۔ تاکہ میں صرف ریڈیو کشمیر سن سکوں لیکن شاید ریڈیو کو مہر بند کرنے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ میں نے سائنس میں ڈگری لی تھی۔ میں نے یہ مہر توڑ دی اور ساری دنیا کے اسٹیشن بجنے لگے۔ اُدھر میری بیوی کو الاؤنس کی پیش کش کی گئی تھی لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن جواہر لال نے مداخلت کی تو ایک سال کے بعد میری بیوی کو مجبوراً الاؤنس قبول کرنا پڑا۔

کچھ عرصے بعد حکومت نے میرے ساتھ قید کاٹنے کے لیے دو تین ساتھی اور بھیج دیے۔ جن میں غلام محمد شاہ اور غلام محمد بٹ بھی تھے۔ میرے بال بچوں کو بھی میرے پاس آنے کی اجازت اور کبھی کبھار وہاں ٹھہرنے کی اجازت دی گئی۔ جواہر لال

کے رویے سے ظاہر تھا کہ اُنھیں اپنے کیے پر رنج ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب اس اقدام کو غلط قرار دینے کا یا واپس لینے کا یارا اُن میں نہیں تھا۔ اگرچہ وہ برابر کہتے رہے کہ اُنھیں میری گرفتاری سے بے خبر رکھا گیا بلکہ یہ قدم ایک عملِ ناگزیر FATE ACCOMPLI کے طور پر اُن کے سامنے پیش کیا گیا لیکن عقل سلیم کو اِس عُذر کے ماننے میں تامّل ہوتا ہے۔ میری گرفتاری ایک معمولی بات نہ تھی کہ ملک کا کوئی بڑے سے بڑا حاکم ملک کے وزیرِ اعظم کو باخبر رکھے بغیر اس کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ اس کے بین الاقوامی مضمرات تھے۔ یہ ساری دنیا کے لیے ایک بڑی خبر بن گئی۔ اور دنیا بھر کے اخبارات اور نشرگاہوں نے اسے خوب اُچھالا اور اس پر ایسے تبصرے کیے جس سے ہندوستان کی اخلاقی شبیہ مجروح ہو کر رہ گئی۔ یہ درست ہے کہ رفیع صاحب جواہر لال کے بہت ہی قریبی معتمد تھے۔ لیکن اُن کے لیے بھی وزیرِ اعظم کی مرضی کے خلاف ایسا اقدام کرنا مشکل تھا۔ اگرچہ کچھ دیر کے لیے فرض بھی کر لیا جائے کہ مجھے پنڈت جی کی بے خبری میں گرفتار کر لیا گیا تھا تو وہ آخر ملک کے وزیرِ اعظم تھے وہ اس غلطی کو درست بھی کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا پھر یہ بات بھی تو ہے کہ پہلے بی۔ این۔ ملک نے اور اب سروپلی گوپال نے، جنھیں پہلی بار مسز اندرا گاندھی نے جواہر لال کے ذاتی کاغذات دیکھنے کی اجازت دی بھانڈا چوراہے پر پھوڑ دیا ہے اور میری گرفتاری میں جواہر لال کے علم و آگہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہر حال جب ۱۹۶۴ء میں کوئی گیارہ سال کے بعد اُن سے دہلی میں ملا تو جواہر لال نے پھر اس بات کو دُہرایا کہ میری گرفتاری اگرچہ اُن کی لاعلمی میں ہوئی۔ لیکن بہ حیثیتِ وزیرِ اعظم وہ اس کی اجتماعی ذمہ داری سے کیسے نکل سکتے ہیں!

میری گرفتاری میں نوکرشاہی کے کچھ پُرزوں کے اوپر سیاسی سطح پر جو دو بڑے لوگ

نے جواہر لال کے ہاتھ مضبوط کیے وہ مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی تھے۔ دونوں اصحاب کی قائدانہ صلاحیتوں کا زمانہ قائل ہے۔ لیکن دونوں کو اپنے فرقے میں کوئی عوامی بنیاد نہیں مل سکی تھی۔ رفیع صاحب کے آبائی صوبے اتر پردیش کے مسلمان تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ انھیں پاکستان بننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے کے طور پر کام کرتے رہے۔ اور مولانا آزاد کو مجبوراً مرکزی اسمبلی میں پہنچنے کے لیے صوبہ سرحد میں خان بادشاہ کے سامنے دامن پھیلانا پڑا۔ شاید دونوں بزرگوں کو میری اپنے فرقے کے لوگوں پر گرفت بہت پسند نہیں آئی تھی اور وہ مُسلم قیادت کے ضمن میں مجھ کو خواہ مخواہ اپنا رقیب و حریف تصوّر کرتے تھے۔ اس لیے "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شُدی" کے مصداق وہ مجھ کو ہٹانے میں ایک نفسیاتی اور اعصابی تسکین محسوس کرتے رہے۔

میں اودھمپور جیل میں ہی قید تھا کہ پنڈت جیا لال کِلم وہاں مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ کِلم صاحب تحریک میں ہمارے پرانے ساتھی رہے تھے۔ اور میں نے آزادی کے بعد انھیں کشمیر کی عدالتِ عالیہ کا ایک جج مقرر کرنے میں پہل کی تھی ۱۹۵۳ء میں وہ اس منصبِ جلیلہ پر ہی فائز تھے۔ وہ بڑے خوش مذاق اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اور ان سے گفتگو ہمیشہ ایک پُر لطف ورزش ہوا کرتی تھی۔ ہنسی مذاق کے بعد انھوں نے معاملات کو سلجھانے کے لیے پہل کرنے کی پیش کش کی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں اِس قسم کا کوئی اقدام کرنے سے منع کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ "گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر" جو کچھ بھی ہوا ہے اب اس سے ابتر اور کیا ہوگا۔ پنڈت جی کو اب نئے دوست مبارک ہوں۔ وقت خود ان پر واضح کرے گا کہ میں نے نہ ہندوستان سے بے وفائی کی اور نہ پنڈت جی کی ذات سے۔ میں نے حالات

کو من وعن اُن کے سامنے رکھا اور فیصلہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مستغیث کو ملزم قرار دیا اور ملزم کو اپنا اعتماد دے کر نظامِ مملکت اُن کے سپرد کر دیا۔

اودھمپور میں گرمی کا زمانہ آ گیا۔ اور ہم نے مطالبہ کیا کہ ہمیں کسی نسبتاً ٹھنڈے مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ کچھ دیر کے بعد ہی کُد میں حکومت نے کچھ مکان کرائے پر لیے۔ وہاں نظربندی کا ایک کیمپ قائم کیا۔ اور ہمیں وہاں منتقل کر دیا۔ یہ کیمپ کُد پہاڑ کے جنگل میں واقع تھا۔ حکومت نے یہ کیمپ بنانے کے لیے بے شمار دولت خرچ کی۔ عارضی بارکیں ہمارے کیمپ کے ارد گرد تعمیر کی گئیں۔ بلکہ خاردار تار کے ایک نہیں بہت سے جنگلے کھڑے کر دیے گئے۔ کُد میں بجلی کا کال تھا۔ اس لیے کیمپ پر نگرانی رکھنے کے لیے چاروں طرف گیس لیمپ نصب کرنے کے لیے بیسیوں کھمبے کھڑے کیے گئے۔ گیس لیمپ تو گھنٹہ بھر کے بعد ہی بجھ جاتے تھے۔ مگر اس بہانے حکومت کے منظورِ نظر لوگوں کی خوب چاندی ہوتی تھی۔ کچھ دن کے بعد بیگ صاحب، مرزا غلام محمد بیگ، خواجہ غلام احمد عشائی، صوفی محمد اکبر، خواجہ حبیب اللہ زرگر اور خواجہ علی شاہ کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ مکان کے ارد گرد خاردار تار کا جنگلہ لگا دیا گیا اور سنٹرل ریزرو پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا مگر ہم قید میں ہنستے کھیلتے دن کاٹتے رہے۔

ایک دفعہ میرا فرزند فاروق پھٹے پرانے کپڑوں میں مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور نہایت بے چارگی کے عالم میں کہنے لگا "پاپا! ہم کیا کریں۔" میں نے جواباً کہا کہ اگر تمھارا پاپا کسی حادثے میں کام آ جاتا تو تم کیا کرتے؟" اس نے کہا "پھر خدا پر بھروسہ کرتے۔" میں نے کہا "آج بھی وہی خدا ہے۔ وہی تمھاری مشکلات آسان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اُسی کی طرف لو لگاؤ اور یہ فکر مندی چھوڑ دو۔"

▲▲▲

۵۵

اسیرِ بے تقصیر

نظربندی کیمپ میں ہم اپنے عوام سے دور، اپنے گھر سے دور بلکہ دنیا و جہاں سے دور مظلومیت کے دن کاٹ رہے تھے۔ لیکن بھلا یہ بات بھی صاحبانِ اقتدار کو کہاں گوارا ہوتی۔ انھوں نے وہاں بھی ہماری نیندیں حرام کرنے کی ٹھان لی۔ مرزا غلام محمد بیگ پر کوآپریٹو سوسائٹی اننت ناگ میں خرد برد کرنے کا الزام لگا کر اُن کے خلاف خواجہ مبارک شاہ نقشبندی سیشن جج پر مشتمل ایک یک نفری تحقیقاتی کمیٹی قایم کی۔ مرزا غلام محمد بیگ ایک آزمودہ کار، شریف اور جہاندیدہ نیشنل کانفرنسی کارکن تھے۔ راجوارہ شاہی میں ذیلدار رہے تھے۔ اس لیے اُن کے اندر عوام کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے، لین دین اور بات چیت کرنے کا بڑا سلیقہ موجود تھا۔ بے چارے بڑے پریشان ہوگئے اور الزامات کا جواب لکھنے کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ ہماری موجودگی اُن کے لیے کافی حوصلے کا باعث بنی۔ یہ سب کارروائی انتقامی جذبے کے تحت کی گئی تھی اور اِس کا مقصد مرزا صاحب پر دباؤ ڈالنا تھا۔ لیکن جج نے اُن کو بری کر دیا اور اس طرح بخشی صاحب کا یہ وار خالی گیا۔

جیل میں ہم اپنا وقت پڑھنے لکھنے، دوست احباب کے خطوط کا جواب لکھنے یا

کھیل کود میں گذارتے تھے۔ جیل کے اندر آنے یا باہر جانے کے وقت سخت تلاشی لی جاتی تھی۔ میرے دو لڑکے فاروق اور مصطفیٰ جے پور میڈیکل کالج میں تربیت حاصل کرنے کے لیے داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے جس ناسازگار اور ناموافق فضا میں اپنی تعلیم پوری کی وہ بھی ایک دکھ بھری داستان ہے۔ ہر کوئی اُن کی طرف انگلیاں اُٹھاتا تھا۔ ایک دفعہ تعطیلات پر فاروق گھر جاتے ہوئے اِدھر سے گذرے اور ملاقات کے لیے گدسب جیل کا رُخ کیا۔ بیچارے کی تلاشی اِس سختی سے لی گئی کہ اُس کے چھکّے چھوٹ گئے۔ اس کے پاس گالف کھیلنے کی کچھ گیندیں تھیں۔ تلاشی لینے والوں نے اِس شک کا اِظہار کیا کہ یہ بم کے گولے ہیں۔ فاروق نے بڑی کوشش کی کہ جیل کے داروغہ پر اصل کیفیت کھل جائے۔ لیکن وہ رٹ لگاتے رہے کہ یہ بم ہیں۔ اِس پر فاروق نے کہا کہ اِن کے دو حصے کر دو تو تمھیں اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ آخر خدا خدا کر کے اُس کو اندر آنے دیا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اُس نے یہ ماجرا ہمیں سنایا تو شفقتِ پدری نے جوش مارا۔ ہم نے کیمپ کے افسران کو جلی کٹی سنائی اور پنڈت جی کے نام ایک اِحتجاجی تار بھی روانہ کیا۔ راتوں رات کیمپ میں متعین سی۔ آر۔ پی کی ٹکڑی کو بدل دیا گیا اور نئی ٹکڑی نگہداشت کے لیے آگئی۔ ظاہر ہے کہ پنڈت جی ہمیں تکلیف میں نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مقامی صوبیداروں یعنی بخشی اور اُن کے ساتھیوں کی پالیسی بہت ہی اِنتقامانہ تھی۔

کشمیر کے عوام بے بس تو کر دیے گئے تھے۔ لیکن میری یاد اُن کے دِلوں سے کسی طرح کم نہ ہوتی تھی وہ ہمارے لیے تڑپ رہے تھے اور بخشی صاحب اور اُن کے ساتھی یہ کہہ کر اُن کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے کہ اب شیخ عبداللہ اور اُس کے ساتھیوں کو قیامت کے روز ہی دیکھ پاؤ گے۔ یہ لوگ طاقت کے نشے میں بدمست تھے کہ جن عہدوں

پر انھوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے وہاں سے انھیں کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ لیکن بخشی صاحب کو بے رحم تاریخ کے اس خندۂ زیرِ لب کا کیا علم تھا جو مستقبل کے بطن میں پوشیدہ تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ وقت آنے والا ہے جب انھیں کے ساتھی انھیں گرفتار کر کے انھیں اسی جگہ پر پہنچا دیں گے جہاں انھوں نے اپنے محسن اور مربی کو پہنچایا تھا اور جن بدعنوانیوں کا اِلزام وہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر تھوپ رہے تھے اُن سے بدرجہا بدتر بدعنوانیاں اُن کے ماتھے پر چپکا دی جائیں گی۔ بعد میں انھیں بدعنوانیوں کی جواب دہی کے لیے ایننگر کمیشن کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا اور اپنے گناہوں کا حساب چکانا پڑا۔ شائد ایسے ہی موقع کے لیے غالب نے کہا تھا؎

اِک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اِنسانی فِطرت کی جلوہ سامانیاں اور بوالعجبیاں کیا خلوت کیا جلوت اور کیا آزادی و کیا اسیری ہر جگہ اپنی پھلجھڑیاں چھوڑتی رہتی ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں صبح تڑکے کیمپ کے تار کے جنگلے کے ساتھ ساتھ ٹہل رہا تھا۔ میں نے جنگلے سے باہر پہرہ دینے والے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی کو اپنے اُستاد سے سبق لیتے ہوئے دیکھا۔ مجھے بھی کچھ دِلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں نے چھپ چھپ کر سننے کی کوشش کی کہ اُستاد اُن کو کیا درس دے رہا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے سُنا کہ اُستاد سپاہیوں کے دِل میں مسلمانوں کے خلاف خوب زہر بھر رہے تھے۔ اور تاریخ کی ٹانگیں توڑ رہے تھے۔ وہ انھیں بتا رہے تھے کہ کس طرح محمود غزنوی نے سومناتھ اور دوسرے ہندوستانی مندروں کو لوٹا اور مسمار کر دیا۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں پر کیا کیا ستم توڑے۔ علیٰ ھٰذا القیاس ظاہر ہے کہ جن سپاہیوں کو بے گناہ شہریوں کی عزت و عصمت، جان و مال

کی حفاظت کے لیے بھرتی کیا گیا ہو اُن کے دِلوں میں جب یہ آتش گیر مادہ بھر دیا جائے تو اُس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ اِس ناعاقبت اندیشی کے عواقب سارے مُلک میں نظر آ رہے ہیں۔ جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس نے منظم طریقے سے نظم و نسق کے ہر شعبے میں اپنے آدمیوں کی دراندازی کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر بی۔ ایس۔ ایف، سی۔ آر۔ پی اور فوج اُن کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ بہرکیف۔ میں کچھ دیر یہ درس سنتا رہا اور دل ہی دِل میں سوچتا رہا کہ جس مُلک میں ایسے مکتب اور ایسے مُلا موجود ہوں وہاں بچوں کا کام تمام نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا؟

ایک دفعہ ہم کیمپ میں بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی گپ ہانک رہے تھے کہ پنڈت کیشپ بندھو جی بولے کہ بخشی حکومت نے خوراک پر سبسڈی، یونیورسٹی سطح تک مفت تعلیم اور دوسرے عوامی بہبودی کے اِقدامات کا جو اعلان کیا ہے اُس سے ہماری جماعت کو کافی نقصان پہنچے گا اور لوگ شاید ہمیں بھول ہی جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ شائد وقتی طور پر ایسا ہو لیکن اِن اقدامات سے آئندہ جب ریاست کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اُس وقت لوگوں کو یاد آئے گا کہ اِن معاملات کے بارے میں ہمارا موقف کتنا صحیح تھا۔ کسی قوم کے ضمیر کو اِن شعبدہ بازیوں سے خریدنے کے طریقے اگر چین جیسے ممالک میں ناکام رہے ہیں تو یہاں بھی اُن کی ناکامی کی پیش گوئی کرنا مشکل نہیں۔ کسی قوم میں مفت خوری کی جتنی عادت ڈال دی جائے اس کا دستِ سوال اُتنی قدر دراز ہوتا جائے گا۔ وہ خود رزقِ حلال کمانے سے عار کرے گی اور بالآخر یہ سارا بوجھ مرکز کو اُٹھانا پڑے گا۔ یہ مالی بوجھ چونکہ سال بہ سال وزن میں بھاری سے بھاری ہوتا جائے گا۔ اِس لیے مرکز کی گردن بھی اُس کے وزن سے جھکتی چلی جائے گی۔ بالآخر مرکز اِس کو حتی کی پیٹ جان کر اپنے آپ کو اِس کے پھندے سے آزاد کرنے کی کوشش کرے گا اور لوگ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اِسی طرح اعلیٰ

سطح تک مفت تعلیم کے جو نتائج معیارِ تعلیم کے زوال اور تعلیم یافتہ بے روزگاری کی صورت میں برآمد ہوں گے وہ بھی اُودھم مچا دیں گے۔ ہمیں صبر و تحمل سے کام لے کر حالات پر نظر رکھنا ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ زیادہ دیر نہیں گذری جب کہ یہ حالات پیش آنے لگے اور ریاست کی کشتی اِقتصادی اور اخلاقی بحران کی طوفانی لہروں پر ڈولنے لگی۔

کُدجیل میں مجھے بہت سے دوستوں کے خطوط روزانہ موصول ہوتے تھے میں نے اُن کے جوابات بھی لکھے جن میں سے بعض ایک مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ تحریک کے واقعات کو قلم بند کرنے کا خیال بھی مجھے آیا۔ چنانچہ میں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کئی نوٹ بُک بھی لکھوائے۔ غلام محمد شاد میری زبان سے واقعات سُن کر قلم بند کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۵۸ء میں جب مجھے چند ہفتوں کے لیے رہا کیا گیا تو یہ سارے نوٹ بُک پولیس کی چیرہ دستیوں کی نذر ہو گئے۔

۱۹۳۱ء میں تحریکِ آزادی سے قبل میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جس کا نتیجہ ظاہر ہونے میں ۳۳ سال کا عرصہ لگا۔ کُد کیمپ میں بھی میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بیاہ کسی ہندو گھرانے کی ایک لڑکی کے ساتھ رچایا جاتا ہے۔ جب دُلہن کو لے کر میں اپنے گھر کی طرف سفر شروع کرتا ہوں تو راستے میں ایک معزز ہندو وزیر تیج رام رازدان (جن کا مارچ ۱۹۶۸ء میں جموں میں اِنتقال ہو گیا) مجھ سے مِلتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ اُن کے خاندان کی عورتیں اپنے مکان میں بیٹھی ہوئی ہیں اور وہ مجھ کو دیکھنا چاہتی ہیں اور دست بوسی پیش کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے برات کو نیچے اِنتظار کرنے کے لیے کہا اور خود اُوپر چلا گیا۔ وہاں عورتوں نے طلائی اشرفیوں کا نذرانہ پیش کیا اور میں نیچے چلا آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساری برات معہ دُلہن کے غائب ہے اور اِس بات کا بھی کوئی سُراغ نہیں کہ اُنھوں نے کونسا راستہ لیا۔

بہرحال میں نے اکیلے اکیلے سفر شروع کر دیا۔ اور دامن کوہ میں ایک پگڈنڈی پر ڈگ بھرنے لگا۔ اتنے میں گھوڑے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کچھ گھبرانے لگا۔ لیکن پھر خود ہی سوچا کہ شاید کوئی شکاری اپنا شوق پورا کر رہا ہے۔ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں لیکن بارات کا کوئی نام و نشان نہیں پاتا آخر یہ پگڈنڈی ایک شاہراہ کے ساتھ مل گئی۔ شاہراہ پر گاڑی کے پہیوں کے کچھ نشان دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اب میں اصل ڈگر پر آچکا ہوں۔ میں دائیں جانب کو مڑ گیا۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں میرا گھر ایک عالی شان محل کی صورت میں کھڑا ہے۔ میری کسی شخص کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی میں اُس کو مکان کا غسل خانہ دکھانے کے لیے لے گیا۔ اور شیشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہنے لگا کہ یہ شیشہ سوئٹزرلینڈ سے منگوایا گیا ہے۔ میں مکان کے دالان سے گذرتا ہوا کئی کمروں میں گیا۔ ایک کمرے میں، میں نے طلائی کرسیاں بچھی ہوئی دیکھیں میں اُسے تخت گاہ CROWN CHAMBER سمجھا۔ میں کمرے سے باہر آ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی خوش دامن اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دیں۔ اُنھوں نے میرے کاندھے پر ایک نرم و نفیس دوشالہ اوڑھا دیا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مجھے کلام پاک قرأت و خوش اِلحانی کے ساتھ سنانے کے لیے کہا۔ میں نے سورۃ البقر کی آخری آیتِ کریمہ بڑے لحن کے ساتھ سنائی اور خود زار و قطار رونے لگا اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اُس کا اندازہ شاید مجھ سے بہتر قارئین کرام لگا سکیں گے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرا خواب بے معنی ہرگز نہیں تھا اور مستقبل کی بشارت لیے ہوئے تھا۔

میری خوش دامن میر جان بیگم ایک پارسا اور خدا ترس خاتون تھیں۔ وہ ایک نہایت ہی خوش اِعتقاد بی بی تھیں۔ اور اُن کی تربیت کا اثر میری بیگم پر بڑا گہرا ہے۔ میری خوش دامن میری اسیری کے دوران ہی دلّی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال

گئیں اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے آستانے کے بیرونی احاطے میں مدفون ہیں۔ میں نے جیل سے اُن کے تعویذِ مزار کے لیے اقبالؔ کے چند اشعار بھیجے تھے۔ چنانچہ میری غیر حاضری میں ہی اُنھیں مرحومہ کی تربت پر سنگِ مرمر کی ایک تختی پر کندہ کرا کے نصب کر دیا گیا۔

میں نے جیل میں مرغیاں بھیڑ وغیرہ پالنے کا تجربہ بھی کیا۔ وہاں بہت گھاس اُگتی تھی۔ اور جانوروں کی افزائش بہت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد اُن پیارے پیارے بے زبانوں کا ایک پورا کنبہ میرے ارد گرد جمع ہو گیا۔ جن سے میں جی بہلاتا رہتا۔ بعد میں کچھ رہائی کے وقت اپنے ساتھ لے آیا۔

بخشی حکومت آئینی اور قانونی لحاظ سے ایک ناجائز اولاد کی حیثیت رکھتی تھی۔

اس کا جنم اور اس کی پرورش گناہ اور رازداری کے اسی ماحول میں ہوئی اور ہندوستان کو اس ایک جھوٹ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے کتنی ہی کذب بیانیاں کرنا پڑیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ میرے چند ساتھیوں کو اصولی معاملات یا پالیسی میں مجھ سے کچھ اختلافات تھے، جس کی اطلاع مجھے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی صبح تک نہیں دی گئی تھی تو اس کے لیے انھیں مسلّمہ قواعد کا سہارا لینا چاہیے تھا۔ جمہوریت میں ایسے مواقع کے لیے باقاعدہ دستور العمل موجود ہے۔ انھیں اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جانا چاہیے تھا اور اسمبلی کے اندر میرے خلاف باضابطہ عدمِ اعتماد کی قرارداد پاس کرنا چاہیے تھی۔ اگر اس قسم کی تحریک پاس ہوتی تو دنیا خود جان جاتی کہ میں کتنے پانی میں تھا۔ اور مجھے فوراً اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا پڑتا۔ لیکن پارلیمانی جمہوریت کے ان اصولوں اور مسلّمات کو ٹھکرا دیا گیا اور صدرِ ریاست نے کسی آئینی اختیار کے بغیر مجھے برخاست کیا۔ بخشی غلام محمد کو وزیرِ اعظم بنانے کی کارروائی بھی قطعی غیر آئینی تھی۔

اس بحران کے وقت چونکہ یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ کس لیڈر کے ساتھ کتنے ممبران اسمبلی ہیں اس لیے صدرِ ریاست کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کی حمایت میں اسمبلی کے اندر کتنے لوگ ہیں۔ بنابریں اُن کے اس اقدام سے فوری طور ظاہر ہو گیا کہ اُنھوں نے ریاست کے ایک آزاد آئینی سربراہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مکمل طور پر سازش کے ایک شریکِ کار کی طرح عمل کیا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی شک تھا بھی تو وہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو میری گرفتاری کے بعد رفع ہو گیا۔ جب کشمیری عوام نے بیک آواز نئی حکومت کے ناجائز ہونے کا اعلان کیا اور بے نظیر مظاہروں سے واضح کر دیا کہ وہ جمہوریت کے اس قتل کے صریحاً خلاف ہیں۔ اُنھوں نے اپنے بے گناہ سینوں کے کواڑ کھول دیے۔ اور گولیوں کے سامنے اپنی چھاتیاں تان دیں۔ لیکن دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ کس کے حامی اور طرفدار ہیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ حکومت پیدا ہوتے ہی اپنی موت آپ مر چکی اور عوام سے زمین بوس ہو چکی ہوتی۔ لیکن فوج سی آر پی ملیشیا اور دوسری مسلح طاقتوں نے اسے تیغ و تفنگ کی بیساکھیوں سے کھڑا رکھا۔

جب ستمبر ۱۹۵۳ء میں میری گرفتاری کے بعد پہلی مرتبہ اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا تو اس کا مقصد یہی تھا کہ ان اقدامات کی توثیق کی جائے جو رات کی تاریکی میں کیے گئے تھے۔ مجھے اپنے حریفوں کی نازک صورتِ حال کا علم تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ریت کی یہ دیوار آوازۂ حق کی ایک ہی پکار سے ڈھ جائے گی۔ اس لیے میں نے اسمبلی کے صدر کو ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو حسبِ ذیل برقیہ بھیجا۔

"معلوم ہوا ہے کہ اسمبلی کا اجلاس ۵ اکتوبر کو شروع ہونے والا ہے چونکہ میرے رتبہ اور موقف کے متعلق سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس لیے

میں آپ سے اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے حقوق و مراعات کی نگہبانی کا واسطہ دلاتے ہوئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اجلاس میں میری اور باقی نظربند ممبرانِ اسمبلی کی حاضری کے انتظامات کیے جائیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے صدرِ جمہوریہ ہند اور وزیرِ اعظم کی خدمت میں حسبِ ذیل تار بھیجا۔

"کشمیر اسمبلی کا اجلاس ۵ اکتوبر سے شروع ہو رہا ہے۔ اِس بات کا امکان ہے کہ اس میں میری پوزیشن اور حیثیت کے بارے میں اہم امور زیرِ بحث لائے جائیں۔ میں نے سپیکر سے درخواست کی ہے کہ اجلاس میں میری موجودگی کے انتظامات کیے جائیں۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ آپ اپنے مشورے اور رہبری سے اِس بات کو ممکن بنائیں۔ جو امور اسمبلی میں زیرِ بحث آئیں گے وہ آئین اور جمہوریت سے متعلق ہیں اور یہ ساری باتیں پہلے سے آپ کے محبوب مقاصد میں شامل ہیں۔"

لیکن میری اِن کوششوں کا نتیجہ معلوم تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میری موجودگی سے اسمبلی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اور وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اس لیے انھوں نے انتہائی من مانے طریقے سے میرے مسلّمہ حق کو پامال کیا۔ میرے خلاف ایوان سے جو تحریک یک طرفہ فیصل کر دیا گیا اور مجھے اپنے آپ کو نہایت ہی سنگین الزامات کے خلاف دفاع کرنے کا ابتدائی انسانی حق دینے سے بھی صاف انکار کر دیا گیا۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ پر ایک واپسیں نگاہ ڈالتے ہوئے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جو روایت اس طرح قائم کی گئی اُس نے ہندوستان میں جمہوریت کی جامدری

کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جس کی لپیٹ میں بعد میں ملک کی دوسری ریاستیں بلکہ خود مرکز بھی آ گیا۔ جس منطق کو ۱۹۵۳ء میں حق بجانب ٹھہرایا گیا اُس نے خود بچھو بوٹی کی طرح پھیل کر ہندوستانی آئین کے ساتھ کھلواڑ کے سیلابی دروازے کھول دیے۔ جو رہنما ۱۹۵۳ء میں جمہوریت کے قتل پر مصلحتاً خاموش رہے آخر اِسی سیلاب کی لہروں میں خود بہہ گئے۔ اور لوگوں کی بات تو رہنے دیجیے خود جواہر لال کو اس جرم کی سنگینی کا احساس تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے دنیا اور ہندوستان میں جمہوری اخلاقیات کا جو طلسم قائم کر رکھا تھا اُس پر کشمیر میں میرے ساتھ روا رکھا گیا رویّہ ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سروپلی گوپال نے اُن کی مستند سوانح عمری میں جسے مسز اندرا گاندھی کا اسناد اور اعتبار حاصل ہے، صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ بات نہرو کے ضمیر میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ انھوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو مجھے جو خط لکھا اُس میں اس بے قراری کا عکس صاف جھلکتا ہے۔

"ہم جو بڑی ذمہ داریوں کے انچارج ہیں، کو ہر قسم کی کارفرما قوتوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اکثر وہ ہماری مرضی کے بغیر اپنی شکل اختیار کرتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی دنیا میں بڑے بڑے مدبر، جو خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک قوم کی تقدیر پر قابو رکھتے ہیں، اپنے سے بڑی کارفرما طاقتوں کے تھپیڑوں سے تنکوں کی طرح اِدھر سے اُدھر بھٹکتے ہیں۔"

یہاں پر ہمیں پھر تاریخ کی طرف مراجعت کر کے دیکھنا پڑے گا کہ دلّی کے کسی حکمران کی کشمیر کے ساتھ یہ پہلی وِشواس گھات نہیں تھی اور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ اکبر اعظم جیسے اولوالعزم شہنشاہ نے ۱۵۸۶ء میں اِسی طرح یہاں کے آخری خود مختار شہنشاہ یوسف شاہ چک کو جُل دے کر دہلی بلایا اور وہاں سے تمام

اخلاق و آداب کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظر بند کر دیا۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کے مشہور مصنف ونسنٹ سمتھ کو لکھنا پڑا کہ یہ اکبر اعظم کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔

بہر کیف بخشی حکومت نے اب زر و جواہر اور تیغ و تفنگ کے امتزاج سے کشمیر میں قبرستان کی سی خاموشی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اُدھر ہندوستان جلد از جلد ادغام اور انضمام کے معاملے کو آگے لے جانا چاہتا تھا۔ میں اُن کے راستے کا بڑا پتھر تھا۔ اِس لیے جب میں ہٹ گیا تو اب اس کام میں دیر کیوں ہوتی! پھر روس کے کرُوسچوف اور بلگانن نے ہندوستان کی کشمیر کے معاملے میں سرینگر آکر پیٹھ ٹھونکی تھی۔ لہٰذا آئین سازی کے کام میں غیر شائستہ تعجیل کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اِس مقصد کے لیے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ آئین ساز اسمبلی کے تمام ممبروں کو جیل خانوں سے رہا کر دیا گیا۔ ایک میں تھا کہ جسے رہا کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ رہا شدگان میں مرزا محمد افضل بیگ بھی شامل تھے۔ میں نے آئین ساز اسمبلی کے صدر غلام محمد صادق کو پھر لکھا کہ وہ مناسب جمہوری ماحول کی بحالی کے بغیر اتنے اہم کام کی تکمیل میں جلدی نہ کریں۔ میں نے انھیں بتایا۔

"وقتاً فوقتاً اور اکا دکا جو اخباری اطلاعات ہم تک پہنچتی ہیں اُن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت جلد ریاست جموں و کشمیر کے لیے ایک آئین بنانے کے ارادے سے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بُلایا جا رہا ہے صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی تاریخ میں اِس اقدام کو ایک خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ بنا بریں میں ملک کے دبائے ہوئے لاکھوں لوگوں کی طرف سے اور ساتھ ہی اس عظیم الشان عوامی تحریک کے نام پر جو گذشتہ ایک چوتھائی صدی سے چلتی آئی ہے، اپنے آپ پر فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو اُن خطرناک نتائج

سے آگاہ کروں جو آپ کے اس اقدام سے متوقع ہیں۔ اگرچہ اس میں کافی تاخیر ہوئی ہے لیکن مجھے پھر بھی اُمید ہے کہ آپ جلدبازی سے کام لینے کی بجائے توقف کریں گے جس نے رائے عامہ کو مفلوج بنا ڈالا ہے اور جمہوریت کی صحیح نشوونما کو کافی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ میں اس خط میں اُن واقعات کو دُہرانا چاہتا ہوں کہ ریاست کے عوام اِس وقت جن حالات سے دوچار ہیں اور ریاست کے اندر جو فضا موجود ہے کیا اُس کے ہوتے ہوئے عوام کی خواہشات اور اُمنگوں کے مطابق کسی آئین کی تکمیل کی ذمہ داری پوری کی جا سکتی ہے؟"

میں نے صادق صاحب سے درخواست کی کہ میرے بنیادی جمہوری حق کے مطابق وہ مجھے آئین ساز اسمبلی کے اِجلاس میں شمولیت کا موقع فراہم کریں۔ صادق صاحب نے کافی اِنتظار کے بعد میرے خط کا جواب دیا۔ اور اس دوران وہ دہلی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں شرکت کے بہانے سے بھی گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے خط کا جواب دہلی کے اعلیٰ ایوانوں کے بڑے بڑے وثیقہ نویسوں نے تیار کیا تھا اور صادق صاحب نے محض ربڑ کی مہر کی طرح اِس پر تابعداری کے ساتھ اپنے دستخط کیے تھے۔ غالب کے اس شعر کے محل استعمال کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا:

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

خط کے جواب الجواب میں، میں نے ایک اور مکتوب صادق صاحب کی خدمت میں بھیجا جس کا جواب بھی انھی وجوہات کی بنا پر بہت دیر کے بعد موصول ہوا۔ یہ ساری خط و کتابت ایک الگ کتابچے کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ میں نے صادق صاحب کو ایک چٹھی

میں یاد دلایا تھا کہ اُن سے بہ حیثیت صدر آئین ساز اسمبلی کے کس باوقار طرزِ عمل کی توقع تھی اور اُنھوں نے کس طرح اپنے عہدے کی توقیر کو مٹی میں ملا دیا۔ میں نے لکھا تھا۔

"رائے دہندگان کے حقوق و مراعات کے نگہبان کی حیثیت سے آپ کے فرائض اور ذمہ داریاں نہایت اہم اور انتہائی نازک تھیں۔ ہر وہ شخص جو اس عہدے پر فائز ہوتا ہے جمہوریت کی مسلّمہ روایات کے تحت اس کی تقرری کے ساتھ اُس کے سارے جماعتی تعلقات ختم متصوّر ہوتے ہیں، اور اُس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ پوری احتیاط سے کام لے کر اپنی غیر جانبداری اور علیحدگی کا ثبوت دے کر اعتدال اور توازن کی بہتر صورت قائم رکھے...... لیکن کیا آپ نے ۹ اگست ۱۹۵۳ء اور اس کے بعد اپنے فرائض کی انجام دہی اور طرزِ عمل میں اس اونچے معیار کو قائم رکھا یا نہیں؟..... آپ پہلے شخص تھے جس نے میری گرفتاری کے فوراً بعد ۹ اگست کے اقدام کو برمحل، بروقت اور موزوں قرار دیا۔ آپ نے بمبئی اور دہلی جا کر مجھ پر یہ الزامات لگائے کہ میں نے کشمیر کو دوسرا کوریا بنانے کے لیے کچھ غیر ملکی طاقتوں سے سازباز کی۔ آپ نے اُس وقت دھمکی دی کہ حکومت کے پاس یہ الزامات ثابت کرنے کے لیے ایسی شہادت موجود ہے جس کی تردید نہیں ہو سکتی۔ ان سنگین الزامات کے متعلق آپ کی اس نام نہاد شہادت کو بھی اب تین سال سے زائد کا عرصہ گذر گیا لیکن ابھی ان کو دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ آپ کی اس لمبی چٹھی میں جس کا جواب میں دے رہا ہوں کہیں بھی طوطے کی طرح رٹی ہوئی اس غیر ملک کے ساتھ سازش کی کہانی کا ذکر تک موجود نہیں۔"

میں نے صادق صاحب کو برسبیلِ تذکرہ یہ بھی لکھا تھا کہ ۹ اگست کے بعد ریاست میں جو مظالم روا رکھے گئے اُن سے ریاست میں آئین سازی کا سارا ماحول متاثر ہو گیا ہے اور اسمبلی کا نمائندہ کردار بھی مشکوک بن گیا ہے۔ صادق صاحب نے بڑی ڈھٹائی سے اِن مظالم کے وقوع پذیر ہونے سے ہی انکار کر دیا۔

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

چنانچہ اُنھوں نے لکھا کہ "میں نے کسی جگہ اور کسی موقع پر یہ نہیں دیکھا کہ ہندوستانی فوج کو مظاہرین کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔"

ظاہر ہے کہ صادق صاحب مسلّمہ حقائق کی تکذیب کر رہے تھے۔ یہ نظر کا قصور تھا یا نیت کا فتور۔ وہ تو خود وہ جانیں۔ لیکن میں نے لارڈ برڈ وڈ کی کتاب "دو قومیں اور کشمیر" کا یہ مشاہدہ اُنھیں یاد دلایا۔

"فوج کی رخصت روک لی گئی تھی اور جوانوں کو خبردار و چوکس رہنے کی ہدایت ملی تھی۔ سرینگر کے بازاروں میں ۹ اگست کی صبح سے ہی ٹینک دکھائی دیے اور علاقہ کے مختلف تھانوں اور مرکزی مقامات پر شہرت یافتہ گورکھا بٹالین کو مامور کیا گیا تھا۔"

چنانچہ میں نے صادق صاحب کو لکھا۔

"آپ مجھے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ آپ نے کہیں بھی کسی موقع پر ہندوستانی فوج کے جوانوں کو فسادات کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ میں آپ سے یہ پوچھ نہیں سکتا کہ آپ اُنھیں کیوں نہ دیکھ سکے۔ لیکن میرے لیے مشکل ہے کہ میں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کروں۔ مجھے جب گرفتار کیا گیا تو بادامی باغ چھاؤنی سے اودھمپور نظربندی کیمپ تک میرے ساتھ پورے طور پر مسلح

ہندوستانی فوج کا ایک بھاری دستہ تھا۔"

بہرکیف۔ صادق صاحب اور اُن کے آقاؤں سے حقائق کا کیا جواب بنتا۔ وہ اِدھر اُدھر کے معاملات کرید کر خلط مبحث کرتے رہے۔ چنانچہ میں نے اُن سے مطالبہ کیا کہ:

"موجودہ حکومت اور اسمبلی کے اندر آپ کی پارٹی نے مکمل طور پر رائے دہندگان کا اعتماد کھو ڈالا ہے اور وہ کسی بھی صورت میں عوام کی سیاسی، اقتصادی، خواہشات یا تمناؤں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اِس لیے آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ عوام پر کوئی آئین ٹھونس دیں۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے ارادوں پر بضد ہیں تو آپ کے لیے واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں اور مکمل طور پر آزادانہ فضا میں غیر جانبدارانہ اہتمام سے رائے دہندگان کا ووٹ حاصل کریں اور اس طرح دنیا کو اپنی نمائندہ حیثیت کا ثبوت دیں۔"

میں نے اُن سے یہ گذارش بھی کی تھی کہ مجھے آئین ساز اسمبلی کے اِجلاس میں شمولیت کا موقع دیا جائے۔ لیکن اُن کے جمہوری ضمیر نے دم توڑ دیا تھا۔ وہ ان جائز اور معقول گذارشات کو نظر انداز کر گئے۔ بھلا جو حکومت ایوان کے قائد اور وزیر اعظم کو اپنی بے گناہی کی وضاحت میں دو لفظ بولنے کی اجازت دینے سے انکار کر دے اُس کے ممبروں سے مستعفی ہونے کی کیسے توقع رکھی جا سکتی تھی۔ بعد میں بی۔ این۔ ملک نے اپنی کتاب "نہرو کے ساتھ میرے سال" میں یہ بے بنیاد دعویٰ کیا کہ آئین ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے غلام محمد صادق مجھ سے آئین ساز اسمبلی کے زیر غور مسائل کے سلسلے میں جموں جیل میں ملے تھے٭ حقیقت یہ ہے کہ انھیں نہ اِس کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ جرأت

٭ ملک صفحہ ۶۵)

لیکن میرے ساتھیوں کی جیل سے رہائی سے قبل ہم نے آئندہ کے پروگرام کے متعلق آپس میں مشاورت کی۔

باہر نیشنل کانفرنس پر بخشی گروپ نے مکمل طور پر قبضۂ غاصبانہ جما لیا تھا ہمارے ہمدرد کارکن کسی نام کا ڈھانچہ کھڑا کر کے منظم ہونا چاہتے تھے اور تحریک کو آگے لے جانا چاہتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ تحریک کا کس نام سے اِنتساب کیا جائے؟ میری ذاتی رائے تھی کہ ہمیں نیشنل کانفرنس کی وراثت سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہوا اگر چند غاصبوں نے توپ و تفنگ کے ساتھ اس پر اور اس کے اداروں مثلاً مجاہد منزل، اِخبار "خدمت" وغیرہ پر قبضہ جما لیا ہے۔ نیشنل کانفرنس کا ماضی شاندار رہا ہے اور اس کے کارنامے بھی قابل فخر ہیں۔ ہمیں اِس ساری میراث کو غاصبوں کے سپرد کر کے تماشائی بن کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ لیکن نیشنل کانفرنس جس جوار بھاٹے سے دوچار ہوئی تھی اس سے اِس کی ساکھ عوام میں کافی گر چکی تھی۔ اس لیے میری بات نہیں مانی گئی۔ اور بیگ صاحب نے اپنی پہلی رہائی کے دوران ۹ اگست ۱۹۵۵ء کو محاذ رائے شماری کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس پر راہنماؤں کا اِجماع ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ میرے عزیز ساتھیوں نے جو بدعہدی کی تھی اس نے مجھے اتنا دل برداشتہ کر دیا تھا کہ کسی تنظیم کے ساتھ براہ راست منسلک ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ اِس لیے میں اِس نئی تنظیم سے رسمی طور پر الگ ہی رہا۔ اگرچہ میری سیاسی اور اخلاقی تائید و حمایت اُس کے ساتھ تھی۔ بیگ صاحب نے سرینگر کے ایک جلسے میں اِس کا اعلان کیا اور خود اس کے بانی صدر بن بیٹھے۔

آئین ساز اسمبلی میں بیگ صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے آئین سازی کے

کام کو ہاتھ میں لینے کے لیے کچھ مہلت مانگی۔ لیکن حکمران پارٹی دہلی کی لاٹھی سے ہانکی جارہی تھی اور تعمیل میں تھی۔ اِس پر بیگ صاحب اور اُن کے گروپ نے اسمبلی کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا۔ بیگ صاحب سرینگر سے اپنے آبائی گھر اسلام آباد واپس جارہے تھے کہ انھیں لیتہ پورہ کے قریب گرفتار کیا گیا۔ اس طرح وہ رہائی کے ٹھیک پانچویں روز وہیں پہنچے جہاں سے انھیں چھوڑا گیا تھا۔ انھیں فوراً گڈسب جیل پہنچایا گیا۔ اُن کے گروپ کے باقی ارکان بھی قید کر لیے گئے۔

بیگ صاحب کے ساتھ بخشی صاحب کی رقابت اُن کی سیاسی رفاقت کے آغاز سے ہی شروع ہوئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی خوبیاں رکھتے تھے۔ اور دونوں کے اوصاف تحریک کے مختلف پہلوؤں میں الگ الگ طور پر جھلکتے اور اثاثہ ثابت ہوتے تھے۔ بخشی صاحب ایک ماہر منتظم تھے اور اُن کی تنظیمی صلاحیتوں سے جماعت کو بڑی تقویت ملی تھی۔ انھیں عوام کی نفسیات پر گہرا عبور حاصل تھا اور رسمی تعلیم کی کمی کے باوجود عوامی تعلقات میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بے پناہ حافظے کے مالک بھی تھے۔ اور اِس سے اُن کی شخصیت میں ایک گہرائی پیدا ہوگئی تھی۔ مرزا محمد افضل بیگ ایک ماہر قانون دان ہیں۔ اور اُن کی قانونی موشگافیوں اور نکتہ دانیوں سے بھی تحریک کو کافی فائدہ ملا۔ وہ اپنے شباب میں ایک اعلیٰ پایے کے پارلیمنٹیرین تھے۔ اور انھوں نے کچھ اہم پارلیمانی معرکے سر کیے۔ ان میں جذبۂ قربانی بھی تھا۔ اور وہ مالیات اور دیگر شعبوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے دونوں دوسری اہم ترین پوزیشن حاصل کرنے کی تگ ودو میں رہتے تھے اور ایک دوسرے سے چشمک رکھتے تھے۔ دونوں کے دِلوں میں زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ بھی موجزن تھا۔ دونوں کے خاندان وسیع تھے۔ جو اپنی ان سرخیل ہستیوں کے

منصب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب کو میں نے اپنا نائب وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ بیگ صاحب اور اُن کا کنبہ یہ سمجھتے تھے کہ تعلیمی قابلیت اور قربانیوں کے ریکارڈ کی حیثیت سے یہ دراصل بیگ صاحب کا حق تھا۔ بخشی صاحب کو بیگ صاحب کے اِن احساسات کا علم تھا۔ اور اِس لیے وہ اُن کو اپنے عزائم کی شاہراہ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب کو سیاسیات میں کوئی اخلاقی مصلحت پریشان نہیں کرتی تھی اور وہ اس مشہور مقولے کے قائل تھے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ وہ اگرچہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اُن کی ذہنی ساخت چانکیہ کے بے رحم سیاست کار کے قالب میں ڈھلی تھی اور چانکیہ سیاسی حریفوں کو قتل اور فریب سے ہٹانے کا باضابطہ فتویٰ دائر کرتا ہے۔ چنانچہ بخشی صاحب نے بیگ صاحب کو کئی بار جانی نقصان بھی پہنچانا چاہا۔ ایک دفعہ جب بیگ صاحب ہمارے ایک مشترکہ دوست لکھن پال کے ساتھ کار میں اسلام آباد سے سرینگر آرہے تھے تو لیتہ پورہ کی چڑھائی پر ایک تیز رفتار ٹرک اچانک اُن کی کار سے جا ٹکرایا۔ یہ کوئی اِتفاقیہ بات نہ تھی بلکہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ بیگ صاحب اور اُن کے ساتھی بال بال بچ نکلے۔ البتہ کار تباہ ہوکر رہ گئی۔ دوسرا قاتلانہ حملہ اُن پر اِسلام آباد میں ہی ہوا لیکن یہاں بھی وہ بچ نکلے۔ گنڈ میں ڈاکٹر گنجو ہمارے وارڈن جیل تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب کو اِس خوفناک راز سے آگاہ کیا کہ بخشی صاحب نے انھیں (ڈاکٹر گنجو) اِس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ بیگ صاحب کو دینے والی دوائیوں میں کوئی ایسی بھی دوائی شامل رکھیں جس سے بیگ صاحب آہستہ آہستہ ملکِ عدم کی طرف کوچ کرجائیں۔

لیکن موت و حیات کے معاملے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ اس لیے انسانی ارادے یہاں بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سطور کی تحریر کے وقت ۵۳ء کی سازش کے اہم ستون بخشی صاحب، صادق صاحب اور درگا پرشاد در کب کے منزلِ عدم تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بیگ صاحب ابھی فضلِ ایزدی سے زندہ و سلامت ہیں۔

▲▲▲

۵۶

روسی ریچھ کشمیر میں

گو میں ہم نظر بندی کے دن گزارتے رہے، کیمپ کمانڈنٹ کے ذریعے مفاہمت کا راستہ ہموار کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس کے پیچھے دہلی کا ہاتھ تھا یا وہ خود ایسا چاہتے تھے۔ لیکن کوشش ضرور جاری رہی۔ جواہر لال ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ یاروں کے یار تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کان کے کچے بھی تھے۔ جواہر لال کی شخصیت خود اُن کے کہنے کے مطابق دوہری شخصیت (SPLIT PERSONALITY) تھی۔ نظریاتی طور پر وہ جمہوریت پسند اور روشن خیال تھے اور بائیں بازو کی طرف اُن کا واضح رجحان تھا۔ وہ یوں تو فیبین* سوسائٹی کے نظریات سے ہم آہنگ تھے مگر لینن کے عملی تجربات کو پسند کرتے تھے۔ الغرض اُن کے تصوّر پرست ذہن نے سوشلزم اور جمہوریت کا ایک عجیب آمیزہ تیار کیا تھا، جس کی روپ ریکھا پر گاندھی واد کا اثر بس سطحی سا تھا۔ اُن کی تربیت رئیسانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ خوشامد سے متاثر ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر اگر کوئی شخص اُن کے مزاج میں دخیل ہو کر بالواسطہ

---

* FABIAN

قسم کی ذہانت آمیز خوشامد کرتا تو ضرور بہت لُطف اندوز ہوتے تھے۔ اُنھوں نے ساری عمر اس قسم کے مصاحبوں کو اپنے ارد گرد رکھا۔ وہ شعر فہم اور کتب بین بھی تھے۔ لیکن اُن کے مزاج میں آمریت کو بھی دخل تھا۔ وہ اختلافِ رائے کو بلعموم پسند نہیں کرتے تھے۔ کئی ایسے مواقع آئے جب میں نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو آشکار دیکھا۔ ایک دفعہ میں الٰہ آباد میں اُن کے والد کے بنائے ہوئے مشہور آنند بھون میں اُن سے ملنے گیا لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پروفیسر مکرجی ایک اعلیٰ پایہ کے دانشور تھے۔ وہ دونوں کسی مسئلے پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ پروفیسر صاحب نے جواہر لال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ جواہر لال آتش بازی کی طرح بھڑک اُٹھے اور اُنھوں نے اس قدر تُرش زبان میں پروفیسر کو ڈانٹا کہ خود میں عرقِ انفعال میں ڈوب گیا۔ جواہر لال کے منہ میں چلاتے چلاتے جھاگ بھر آیا اور کہنے لگے "یہ سب بکواس ہے، بالکل بکواس" ERRANT NONSENSE " کہتے کہتے وہ مٹھیاں بھینچنے لگے۔ پروفیسر بیچارہ ہکا بکا رہ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے جواہر لال کو دیکھنے لگا۔ لیکن جواہر لال کا غصّہ حسبِ معمول جلد ہی اُتر گیا۔ اس کے ساتھ اُنھیں اپنے طرزِ کلام پر ندامت بھی ہوئی اور اُنھوں نے پروفیسر سے ایسے اندازِ دلربائی کے ساتھ معافی مانگی کہ اُن پر خواہ مخواہ پیار آنے لگا تلافیِ مافات کے طور پر اُنھوں نے پروفیسر صاحب کی تواضع چائے سے بھی کی۔ اسی طرح وہ میری موجودگی میں گوپالا سوامی آئینگر پر ایک دفعہ ساون کی گھنگھور گھٹا کی طرح گرجے بھی اور برسے بھی۔ گوپالا سوامی نے تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی ہند کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی توثیق کی قرارداد منظور کرے۔ گوپالا سوامی آئینگر جو عمر میں نہرو سے بڑے تھے وزیر اعظم کا یہ جلال دیکھ کر بُت بن کر رہ گئے جواہر لال

کے مزاج کے اس میلان سے لوگ واقف تھے۔ اس لیے بہت کم اشخاص کو اُن کے منہ پر اُن سے اختلاف کرنے کی ہمت پڑتی تھی۔ بہرکیف۔ میں کہاں سے کہاں نکل آیا۔ گُدسب جیل میں مجھے یہ اشارہ بھی ملا کہ میں چاہوں تو جواہر لال خود گُدکیمپ میں مجھ سے ملنے کا موقع نکالنے کے لیے کوئی بہانہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے من پر کُہر سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اسی دوران اُس وقت کے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد براستہ بانہال کشمیر جانے والے تھے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ اگر میں چاہوں تو وہ سفر کے دوران گُد میں ٹھہریں گے اور مجھ سے ملیں گے۔ لیکن میں نے ادب کے ساتھ معاملے کو ٹال دیا۔ میں ایک ذہنی پیچ و تاب سے گزر رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اُنھیں میری پیٹھ میں چھرا گھونپنا تھا سو گھونپ چکے۔ اُنھیں میری کردار کُشی کرنی تھی۔ سو اُس میں اُنھوں نے مُلک کی ساری گندگی استعمال کی اب بعد از جنگ واویلا تو بس وہی معاملا ہوا۔ کہ

> کی میرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی کشمیر کی خصوصی حیثیت سے خوش نہ تھے۔ وہ بھی ریاست کے مُلک کے ساتھ مکمل ادغام کے حامی تھے۔ اگرچہ طبعاً بڑے نیک، حلیم اور منکسر المزاج تھے لیکن خیالات میں بے حد قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ سردار پٹیل کے ساتھ ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ لیکن نہرو سے بہت کم بنتی تھی۔ چنانچہ سردار کی ہی قوتِ بازو سے وہ صدارت کے راج سنگھاسن پر کمند پھینکنے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ جواہر لال چکرورتی راج گوپال اچاریہ کے حق میں تھے۔ جن کے ساتھ ان کی بڑی ذہنی قربت تھی۔ لیکن سردار پٹیل بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ اُنھوں نے نہرو کی ایک نہ چلنے دی اور راجندر پرشاد صدر بن گئے۔ البتہ نہرو اور اُن کے درمیان آخری وقت تک

چپقلش اندر ہی اندر سُلگتی رہی اور نہرو اُن کے مشوروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ انھوں نے صدرِ جمہوریہ کے منصب کو ہندو دھرم کی رسوم و روایات سے جس طرح جوڑ دیا اُس پر نہرو کو اُبکائیاں آتی تھیں۔ راجندر پرشاد کی زندگی میں ہی نہرو نے اپنے پرانے دوست ڈاکٹر رادھا کرشنن کو صدرِ جمہوریہ بنا دیا۔ اور اُن کے ساتھ اُن کی اچھی رہی۔ اگرچہ چینی حملے کے وقت رادھا کرشنن نہرو کے نکتہ چین بھی بنے۔

دِن گذرتے گئے اور بین الاقوامی حالات نے ایک نئی کروٹ لے لی۔ دُنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت روس کی آپسی رقابت تیز ہونے لگی۔ امریکہ کے وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس ایک بڑی طاقت ور شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے امریکی صدر آئزن ہاور کے اعصاب پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیا کہ وہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ اُنھوں نے خارجی تعلقات میں انتہاپسندی یعنی (BRINK - MANSHIP) کے رجحان کو اس قدر تقویت دی کہ اُن کی پالیسی کی کسوٹی یہ مشکوک بات بن گئی کہ جو ملک ہمارا دوست نہیں ہے، وہ ہمارا دشمن ہے۔ اس کے برعکس جواہر لال نہرو نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد نا وابستگی کے اصول پر رکھی تھی اس لیے وہ ان عظیم طاقتوں کے تئیں ہند کی پوزیشن کا توازن برقرار رکھنے کی ڈگر پر گامزن تھے۔ لیکن اِس بات سے بھی کلیتاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذہنی طور پر وہ سوشلسٹ ملکوں سے زیادہ قرابت محسوس کرتے تھے۔ امریکہ اُن کے اس میلان کو پسند نہیں کرتا تھا۔ پاکستان کی بنیاد چونکہ کسی مثبت نظریے کی بجائے نفرت اور ردِ عمل REACTION پر رکھی گئی تھی لہٰذا اُس کی پالیسی کسی واضح اور جامع اصول کی بجائے اِس انداز سے وضع ہوتی تھی کہ ہندوستان کیا رُخ اختیار کرتا ہے؟ ہندوستان کسی مسئلے کے متعلق جو موقف اختیار کرتا پاکستان تقریباً لازمی طور پر اس کی مخالف سمت میں دوڑنے لگتا۔

اس بین الاقوامی جنگ زرگری میں اُسے امریکہ کے ہند مخالف رویہ میں جائے اماں نظر آئی اور اُس کو اپنے سائز اور اپنے ذرائع کی جسامت نے جس احساس کمتری اور عدم تحفظ کے جذبے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اُس کو تسکین دینے کے لیے اُس نے امریکہ جیسی عظیم طاقت کی چھتر چھایا میں پناہ لینے میں خیریت سمجھی۔ چنانچہ امریکہ اور اُس کے اتحادی ملکوں کے ساتھ اس کے کئی فوجی معاہدات طے پائے۔ جن میں سیٹو اور سینٹو نام کے معاہدے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں نے پاکستان کو ایک اور مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ یعنی پاکستان کی اس روش سے رُوس سخت برہم ہو گیا۔ اور اُس نے اپنی اس بیزاری کو پردہ راز میں رکھنے کی بجائے اِسے سر بازار بیان کر دیا۔ اس کا سب سے فوری اور اہم نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اقوام متحدہ میں جہاں مختلف عوامل کے تحت پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر واضح برتری حاصل ہو گئی تھی۔ اور اس نے ہندوستان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ پانسہ واضح طور پر پلٹ گیا۔ رُوس تو اُس وقت تک اقوام متحدہ میں صاف "چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں" کا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ مگر اب وہ کھلے بندوں پاکستان کو سبق سکھانے کے لیے آگے آ گیا۔ ہندوستان کے لیے تو یہ "اللہ دے اور بندہ لے" والی بات تھی۔ اُس نے ان حالات سے فائدہ اُٹھایا اور اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے کو سرد خانے میں رکھنے کی ابتدا یہیں سے ہو گئی۔ اُدھر رُوس بھی مارشل اسٹالین کی علیحدگی پسندی کا حصار توڑ کر اب زیادہ سے زیادہ ملکوں کو اپنے اثر و رسوخ میں لانے کی ایک عظیم مہم شروع کر رہا تھا۔ جو اسٹالین شکنی (DE-STALINATION) کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ جواہر لال نہرو کی دعوت پر کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ نکیتا خروشچوف اور روس کے وزیر اعظم نکولائی بلگانین ہندوستان آ گئے۔ ہندوستان میں رُوسی رہنماؤں کا نہایت عالی شان پیمانے پر سواگت کیا گیا۔ انھیں ملک کے اہم شہروں میں گھمایا گیا۔

جہاں اُن کی خوب آؤ بھگت اور خاطر تواضع ہوئی۔ ہندوستان نے اس وقت بین الاقوامی حکمتِ عملی کے محاذ پر ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل کی جب رُوسی رہنماؤں نے اقوامِ متحدہ میں مسئلہ کشمیر کی سماعت کو طاقِ نسیاں کی نذر کر کے اور پاکستان اور اس کے اتحادی امریکہ کے ردِ عمل سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر کشمیر کا دورہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ وہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں سرینگر آئے۔ اُن کا خاص جہاز جب اگوائی کرنے والے جیٹ جہازوں کے حلقے میں دہلی سے سرینگر آیا تو یہ آسمانی قطار کدکیمپ کے اوپر سے بھی گذری۔ اور ہم اپنے قفس سے اِن آزاد طائروں کو دیکھتے رہے۔ ہندوستان کو علم تھا کہ اس دورے کی کامیابی یا ناکامی سے اُس کی خارجہ پالیسی کے کتنے امکانات وابستہ ہیں۔ چنانچہ سرینگر میں اُن کے استقبال اور پذیرائی کے لیے زبردست کوششیں شروع کی گئیں۔ دسمبر کی برفانی ہواؤں میں رات رات بھر محرابیں کھڑی کر دی گئیں۔ دیودار کے سرسبز و شاداب درخت جنگلوں سے اکھاڑ کر جلوس کی سڑکوں پر ایستادہ کر دیے گئے۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہائے گئے۔ وادی کے اطراف و اکناف سے مفت گاڑیوں میں لوگ سرینگر لائے گئے اور اُنھیں دن بھر کا نقد معاوضہ بھی پیش کیا گیا۔ مہمانوں کا دریائی جلوس بھی نکالا گیا۔ رات کو سرینگر کی ملحقہ پہاڑیوں پر چراغاں کرنے پر بے دریغ روپیہ بہایا گیا۔ جھیل ڈل میں آتش بازی چھوڑ کر ڈوگرہ زمانے کے ایک رنگیلے صوبیدار کرپا رام کی جسے مقامی لوگ "کرپہ شروڈ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، یاد تازہ کی گئی۔ مہمانوں کو کشمیر کی شہرۂ آفاق لذیذات خوانچے اور ضیافتیں کھلانے میں بھی زرِ کثیر صرف کیا گیا۔ چنانچہ ایک تقریب میں بخشی غلام محمد نے کرسچوف کے منہ میں کشمیر کا مشہور گشتابہ ٹھونس دیا اور اس فوٹو کو ہندوستان کے تشہیری ذرائع سے دنیا بھر میں خوب اچھالا البتہ حکمرانوں کی حالت اُس وقت مضحکہ خیز بھی بن گئی جب عوام کہیں کہیں شیر کشمیر زندہ باد کے نعرے

بلند کر رہے تھے۔ یہ وہ بڑی معصومیت سے کر رہے تھے۔ کیونکہ اُنھیں تحریک کے آغاز سے ہی اس نعرے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بالآخر شیر گڈھی سرینگر کے باغ میں جسے کسی جشن تاج پوشی کے سے انداز میں سجایا گیا تھا۔ ایک بڑی تقریب میں اُنھیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ریاستی حکمرانوں کے علاوہ مسز اندرا گاندھی بھی اپنے نامور والد کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے موجود تھیں۔ دہلی کے حکمرانوں کی دور اندیشی اور سرینگر کے تابعداروں کی خدمت گذاری رنگ لائی اور نکیتا کرسچوف نے روسی زبان میں اپنی تقریر کرتے ہوئے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ "روس کشمیر کو ہندوستان کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔" انھوں نے کشمیریوں کو یہ بھی بتایا کہ رُوس اُن کا اتنا نزدیکی پڑوسی ہے کہ اگر اُنھیں کبھی روس کی امداد کی ضرورت محسوس ہو تو وہ پہاڑ پر چڑھ کر سیٹی بجائیں۔ ہم فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ نکیتا کرسچوف کا یہ اعلان ساری دنیا میں ایک اہم خبر بن گیا۔ دنیا کی ایک عظیم طاقت کے سربراہ کی طرف سے اس قسم کا دوٹوک اعلان دراصل پاکستان کے منہ پر ایک انتقامی چپت تھی۔ اور اس کی صدائے بازگشت سے ساری دنیا گونج اُٹھی۔ بعد میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ پاکستان نے روسی رہنماؤں کو ہندوستان سے واپسی پر پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ جس کو کرسچوف نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب تک پاکستان امریکہ کے ساتھ اپنے فوجی معاہدات کا رشتہ نہیں توڑتا ہم اسے منہ نہیں لگائیں گے۔

رُوسی رہنماؤں کا یہ دورہ مسئلہ کشمیر کی ہی نہیں بلکہ برصغیر کی سیاسیات میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس سے ہند کے ساتھ رُوس کے اس قریبی تعلق کی بُنیاد استوار ہو گئی جس نے بعد میں چین کے خلاف ایک نئے عالمی اتحاد کی میدان تیار کی اور امریکہ کے ارادوں کے آگے بھی بند باندھ دیا۔ کشمیر کے سوال پر ہندوستان کو

سلامتی کونسل میں مغربی ملکوں نے کافی پریشان کر رکھا تھا۔ اب آسے ایک اہم عالمی طاقت کی کھلم کھلا پشت پناہی حاصل ہو گئی اور اُس نے ویٹو کی نہایت ہی غیر عقلی اور غیر منصفانہ طاقت کا استعمال کر کے دنیا کی رائے عامہ کو لاچار و بے بس کر دیا۔ حیرت ہے کہ اپنے آپ کو انصاف، جمہوریت اور تہذیب کی علمبردار کہنے والی بڑی طاقتوں نے ویٹو کے وحشیانہ اور غیر عقلی ہتھیار کی اختراع کی اور وہ اِس کے بل بوتے پر انصاف، عدل اور جمہوریت کا قتل کرتی رہی ہیں اور پھر بھی اپنے جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ شاید ویٹو کے ہی غیر عقلی اور نامنصفانہ ہتھیار کا تصور کر کے علامہ اقبالؔ نے لکھا تھا۔ ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

اور اُنھوں نے جمیعتہ الاقوام پر جو زوردار پھبتی کسی تھی وہ اقوامِ متحدہ پر بھی پوری طرح چسپاں کی جا سکتی ہے ؎

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

بہرکیف۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات روسی لیڈروں کے دورے کی ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دورہ کشمیری عوام کے خلاف نفسیاتی جنگ کا ایک حربہ تھا اور اِس کا مقصد اُنھیں جذباتی طور پر مغلوب اور مرعوب کرنا تھا۔ ماننا پڑتا ہے کہ اس میں جواہر لال نہرو کو کسی حد تک کامیابی نصیب ہو گئی اور ہندوستان اپنے ارادوں میں اور زیادہ دلیر ہو گیا۔

ہندوستان کے گلے میں حق خود ارادیت کی جو گرہ پھنس کر رہ گئی تھی وہ اُسے کسی نہ کسی طور پر نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے کوئی مناسب حیلہ نہیں مل رہا تھا۔

نہرو نے صرف کشمیر کے عوام کو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے ملکوں کو بار بار یقین دہانیاں کرائی تھیں کہ ہندوستان کشمیر کو ہڑپ نہیں کرنا چاہتا۔ کشمیر میں اُس نے صرف اس لیے فوج بھیجی کہ وہاں کے عوام کے حق خود ارادیت کی حفاظت کی جائے اور اُن کو آزادانہ رائے شماری کے ذریعہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں یا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کو یہ بہانہ معاہدۂ بغداد اور دوسرے دفاعی معاہدات میں پاکستان کی شمولیت نے فراہم کر دیا۔ اِس میں امریکہ خاص طور پر اُس کا حلیف تھا۔ پاکستان کو جب خطرہ درپیش ہوا تو امریکہ نے اُسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر اپنا راستہ لیا لیکن فوری طور پر اس کا فائدہ ہندوستان نے اُٹھایا۔ روس کی حمایت سے شہہ پا کر اس نے اعلان کیا کہ اِن دفاعی معاہدات میں پاکستان کی شمولیت نے صورت حال کو اِس حد تک تبدیل کر دیا ہے کہ اب ہندوستان کشمیری عوام کے ساتھ اپنے کیے ہوئے بین الاقوامی وعدوں پر پابند نہیں رہ سکتا۔ یہ عجیب منطق تھی کشمیریوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اُنھیں دوسروں کے گناہوں کے لیے سزا دی جا رہی تھی۔ یعنی بالکل اُس کشمیری کہاوت کے مفہوم کو سچ ثابت کیا جا رہا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ ایک اونٹ نے جنوبی کشمیر کے گاؤں کھنہ بل میں کپاس پر ہاتھ صاف کیا اور اس کی پاداش میں شمالی کشمیر کے گاؤں کھادن یار میں ایک جلاہے کی ناک کاٹ لی گئی۔ کیونکہ کپاس اور جلاہے کا آپس میں دور کا رشتہ ہوتا ہے۔ پاکستان کے اعمال کی جزا و سزا اُسے ملنی چاہیے تھی لیکن سزا ملی بے چارے کشمیری عوام کو یعنی یہ مقولہ سچ ثابت کر دکھایا گیا۔

بے جُرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے جواہر لال منقسم شخصیت رکھتے تھے وہ جمہوری قدروں

کے احترام کے درس دیتے۔ جب کبھی ان کا ضمیر جاگ رہا ہوتا تو وہ ان قدروں کو پامال کرنے سے باز رہتے تھے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اُن کا یہ ضمیر کبھی کبھی اردگرد کی لوریاں سُن کر بعض اوقات اُونگھنے لگتا۔ اور اس وقت وہ اپنے ہی مقرر کردہ معیار سے انحراف کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ لیکن اُن کے طرزِ عمل کی ستم ظریفی اس سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔ انھوں نے اعلان تو کیا کہ بین الاقوامی صورتِ حال بدل جانے سے ہندوستان اب اُن ذمہ داریوں اور وعدوں کا پابند نہیں ہے جو اُس نے کشمیر کے معاملے میں تسلیم کیے تھے۔ لیکن اُنھوں نے دروازے کو بالکل بند بھی نہیں کیا۔ جب ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان پر حملہ کرکے ہندوستان کے لیے ایک نہایت نازک صورتِ حال پیدا کر دی تو نہرو کو پھر پاکستان کی دوستی کا خیال آیا۔ کچھ تو اپنی سرحدوں پہ پاکستان کا دباؤ کم کرنے کے لیے اور کچھ مغربی طاقتوں کے کہنے سُننے پر، جو چین کے خلاف ہندوستان کو مسلح کرنے کے لیے سامانِ حرب و رسد بھیج رہے تھے۔ نہرو نے پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کرنے سے گریز نہیں کیا۔ حالانکہ اِس کا اصل مقصد اِس کڑے کوس پر مغربی طاقتوں کو چکمہ دینا اور پھر مناسب مرحلے پر انھیں آنکھیں دکھانا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ چینی حملے کے وقت پاکستان کی بس کشمیر کے معاملے میں چھوٹ گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس نے کشمیر سے ہاتھ دھو لیے۔ چینی حملے کے وقت ہندوستان کے دفاعی انتظامات اور اُس سے زیادہ اس کے حوصلے کی وہ حالت تھی کہ اگر پاکستان میدان میں کوئی دلیرانہ پہل کرتا تو اس کے نتیجے کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن صدر ایوب خاں کی کمیل مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں تھی وہ وعدۂ فردا کے تصور میں مست رہے۔ ہندوستان نے ابتدا میں بڑی برادرانہ شفقت دکھائی۔ بھٹو اور سورن سنگھ

نے برطانیہ کے وزیر ڈنکن سینڈیز کی لگائی بجھائی پر طویل مذاکرات کیے۔ کشمیر کی چناب کی سرحدی لکیر کے مطابق بندربانٹ کا سوال بھی بڑی سنجیدگی سے زیرِ بحث رہا۔ لیکن جونہی چین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ہندوستان نے بھی گفتگو کی میز کو اُلٹ دیا۔ پاکستان نے کشمیر کا سوال پھر سلامتی کونسل میں اٹھایا۔ اس بار وی۔ کے۔ کرشنا مینن نے ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔ اُس نے ہندوستانی موقف کے سلسلے میں سلامتی کونسل کے سامنے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ جو اپنی طوالت کے باعث اقوامِ متحدہ کی کتابوں میں اب بھی ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کرشنا مینن نے ایک ماہر پینترے باز کی طرح ہندوستانی موقف پر اعتراض کرنے والے ممالک کی اپنی کمزوریوں کو اُجاگر کیا اور اُنھیں "دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ" کہہ کر للکارا۔ اپنی گرم گفتاری کی رو میں کرشنا مینن نے سلامتی کونسل کے پلیٹ فارم پر پہلی بار ہندوستان کے دیئے ہوئے تمام قول و قرار کی نفی کر دی۔ اُنھوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ بین الاقوامی حالات نے اتنا بڑا پلٹا کھایا ہے کہ ہندوستان کے لیے اپنے وعدوں کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ کرشنا مینن نے بڑے ڈرامائی انداز میں تقریر کی۔ اِس نے کونسل کے ممبروں کو خوب لتاڑا۔ اُدھر اُن کے دلائل بھی بڑے بھونڈے تھے اِس لیے اُن کی تقریر کا بالکل الٹا اثر ہوا۔ سلامتی کونسل میں ایک قرارداد پیش ہوئی۔ جس میں ہندوستان کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تھا۔ کونسل کے گیارہ میں سے نو ممبروں نے اس کے حق میں ووٹ دیے۔ لیکن روس نے ویٹو کا خفیہ گرز دامن سے نکال کر پہلی بار کشمیر کے معاملے میں استعمال کیا۔ قرارداد پاس ہونے سے پہلے ہی غیر قدرتی موت مر گئی۔ کونسل کے ممبران ہاتھ ملتے رہ گئے۔ چنانچہ معاملے کو التوا میں رکھا گیا جہاں یہ آج تک طاقِ نسیاں کی زینت بنا ہوا ہے۔

▲▲▲

۵۷

ظالموں کے چھکے چھوٹ گئے

۱۹۵۳ء میں مجھے جن حالات میں گرفتار کیا گیا تھا اس سے ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو سخت دھکا لگا تھا۔ لیکن مجھے بغیر مقدمہ چلائے سال ہا سال تک نظر بند رکھنے اور اس کی وجوہات کے بارے میں چپ سادھ لینے سے تو ہندوستان کی آبرو پر بھی حرف آگیا۔ اور دنیا بھر میں اس کے بلند بانگ اخلاقی اور جمہوری دعاوی کا بھرم بھی کھل گیا۔ ان دنوں جب بھی جواہر لال یا ہندوستان کا کوئی اور نمائندہ ملک سے باہر جاتا تو ان سے ہر جگہ اس بات کی وضاحت طلب کی جاتی اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں۔ کچھ ایسے بین الاقوامی لیڈر بھی ہندوستان آئے جنھوں نے جواہر لال کو مشورہ دیا کہ اگر وہ دنیا میں ہندوستان کا اخلاقی بھرم بنائے رکھنا چاہتے ہیں تو کشمیر کے نظر بندوں کو یا تو رہا کر دیں یا ان کو عدالت کے سامنے پیش کریں۔ کرشنا مینن جب سلامتی کونسل کے اجلاس کے بعد وطن لوٹے تو انھوں نے بھی اسی قسم کے تاثرات ظاہر کئے اور مشورہ دیا کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو باضابطہ فوجداری کیسوں میں ماخوذ کر کے مقدمات میں الجھا دیا جائے۔ تاکہ ہماری گرفتاری کے بارے میں دنیا کے سامنے کوئی جواز پیش

کیا جا سکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں بھی پریشان رکھا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان بھی کیا کہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر فوجداری کے مقدمات عائد کیے جا رہے ہیں۔ واپس آکر انھوں نے ان جھوٹے دعاوی کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کردی۔

اس مہم کے پہلے حصے کے طور پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں پر مشتمل کشمیر کمیٹیاں قایم کی گئیں۔ ان کمیٹیوں میں سرکار کے حاشیہ نشین اور منظور نظر مسلمانوں سے تجاویز پاس کرائی گئیں۔ جن میں ہندوستان کے موقف کی حمایت اور کشمیر کے حالات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ حیرت یہ تھی کہ کشمیر کے حالات کے بارے میں سینکڑوں ہزاروں میل دور رہنے والوں سے جو پہلے ہی اقلیتی ہراس (MINORITY COMPLEX) کے بوجھ کے تلے ہانپ رہے تھے۔ شہادت دلوائی جا رہی تھی۔ لیکن ہندوستان کو اس وقت کسی نہ کسی طرح عالمی رائے عامہ کے سامنے اپنا جھوٹا سچا مقدمہ پیش کرنے کی فکر تھی۔ چنانچہ ان کارروائیوں اور قراردادوں کی خوب تشہیر ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ کرائی گئی۔ اس کا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کشمیر کی پالیسی کے سلسلے میں حکومت ہند کے ہم نوا ہیں۔ اس سلسلے میں کل ہند پیمانے کی ایک بھاری کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کرائی گئی۔ جس میں ہندوستان کے مسلم ممبران پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے مسلمان ارکان نے شرکت کی۔ اس کے کرتا دھرتا حافظ محمد ابراہیم تھے جو اس وقت مرکزی کابینہ کے ایک "معصوم" وزیر تھے۔ بخشی غلام محمد اور اس کے کشمیری حواریوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بخشی صاحب کو سرکاری خزانے کی قیمت پر اپنی عنایات خسروانہ کی نمائش کا خوب موقع ملا۔ لیکن یہ بیل بھی منڈھے

نہیں چڑھ سکی کہ جھوٹ کی تقدیر ہی میں نامرادی لکھی ہوتی ہے وقل جا الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (القرآن)

پنڈت جواہر لال نہرو میری مسلسل نظربندی سے خوش نہیں تھے۔ لیکن اس بارے میں کوئی دوٹوک رویہ اختیار کرنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ میری نظربندی کے دوران اُنھوں نے کئی بار بخشی صاحب کو مجھے رہا کرنے کی صلاح دی۔ بخشی حیلے حوالے کر کے یوم حساب کو ٹالتا رہا۔ لیکن جواہر لال بنیادی طور پر ایک شائستہ آدمی تھے۔ اور بقول راج گوپال آچاریہ ہندوستانی رہنماؤں میں سب سے زیادہ مہذب۔ اُن کے سینے پر میری بے گناہ قید کا وزن ایک آسیب کی طرح مستولی ہونے لگا۔ انھوں نے ۱۱ر جنوری ۵۶ء کو کرن سنگھ کے نام لکھا۔ جو اُن دنوں کشمیر کے معاملوں میں کافی دخیل تھا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میرا ضمیر کسی شخص کو بغیر مقدمہ چلائے نظربند رکھنے کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ میں نے ماضی میں اس پر اتنی بار اعتراض کیا ہے کہ میرے اس کو ناپسند کرنے پر کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔"

اُسی سال اُنھوں نے ۱۵ر اگست کو بخشی غلام محمد کو لکھا۔

"یہ نظربندی بجائے خود عدم استحکام کا ایک زبردست سبب بن جائے گی۔ اور ہمارے خلاف ہند اور ہند سے باہر بڑا ناخوش گوار رد عمل ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کا اثر کشمیر پر بھی کچھ بہت اچھا نہ ہوگا۔"

آخر دسمبر ۱۹۵۵ء میں جواہر لال میری گرفتاری کے بعد پہلی بار سرینگر آئے اور وزیر اعظم کی رہائش گاہ میں بخشی نواز عناصر کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں ۵۳ء کے بعد اس لیے نہیں آیا کیوں کہ مجھے شیخ عبداللہ کی گرفتاری

کا دکھ ہوا تھا۔ اور میں اُن کی عدم موجودگی میں کشمیر آنے پر مائل نہیں ہو پاتا تھا۔ اُنھوں نے اس جلسے میں میری امکانی رہائی کا ایک ہلکا سا اشارہ بھی کیا۔ جواہر لال کے اس قسم کے بہت سے اشاروں کو بخشی صاحب نے شاطرانہ چالبازی سے ناکام بنا دیا تھا۔ اس لیے کچھ ہی دن میں یہ بات بھی فراموش ہو گئی۔ ۸ر جنوری ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ کشمیر کا انسپکٹر جنرل پولیس ڈی۔ ڈبلیو مہرہ اچانک کُد جیل میں مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور مجھ سے رخت سفر باندھ لینے کو کہا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ آپ کو سرینگر جیل میں تبدیل کرنے کے احکامات صادر ہوئے ہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کو وہاں پہنچاؤں۔ گاڑی باہر کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔"

میں نے مہرہ کی بات سن کر اُسے فوراً بتایا کہ میں قیدی کی حیثیت سے کبھی بانہال پار نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے کُد میں نہیں رکھنا چاہتے تو بے شک مجھے صوبہ جموں کی کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیجیے۔ لیکن میں کبھی اس حالت میں کشمیر نہیں آؤں گا۔ مہرہ صاحب کو اس پر تاؤ آگیا اُنھوں نے بڑے رعونت آمیز لہجے میں کہا کہ اگر میں نہ مانوں تو وہ طاقت کے ذریعے اپنے حکم کو عملی جامہ پہنائیں گے۔"

میں نے جواباً کہا کہ "آپ بلاشبہ طاقت استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں میں اپنی جان دے دوں گا اور آپ میری لاش جواہر لال نہرو کو تحفے کے طور پر بھیج سکتے ہیں"۔ مہرہ نے عمر بھر جی حضوری کی روٹیاں توڑی تھیں اور BULLY بھی تھا۔ لہٰذا میرے مستحکم لہجے سے ذرا سہم گیا اور نرمی سے کہنے لگا کہ سرینگر لے جاکر شاید مجھے رہا کر دیا جائے گا" میں نے کہا کہ "اگر حکومت نے میری رہائی کا فیصلہ کیا ہے، تو مجھے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ میں خود جانے کا بندوبست کروں گا۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت چل کر آدھی رات کو کشمیر میں داخل ہونے میں کیا بھید ہے۔ آدھی رات کو گھر پہنچوں گا اور لوگ

مجھ سے ملنے آئیں گے۔ سروی میں پڑوسی عورتیں آئیں گی تو اس غنڈہ گردی کے دور میں کسی کی بے عزتی ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اِس لیے روانگی کا یہ وقت موزوں نہیں ہے۔" اس بحث مباحثے میں کافی وقت صرف ہوا۔ مہرہ نے اپنی حکومت سے رابطہ قایم کیا اور اُنھیں ان حالات سے آگاہ کیا۔ بات جواہر لال نہرو تک پہنچ گئی —— چنانچہ اُن کے کہنے پر طے ہوا کہ مجھے کُد میں ہی رہا کر دیا جائے۔ مہرہ پھر مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور کہنے لگے کہ "اگر ہم اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں تو ٹرانسپورٹ کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ لیکن آپ چونکہ ہمارے ساتھ کشمیر آنا نہیں چاہتے اِس لیے آپ کو ٹرانسپورٹ کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔" شام ہو چکی تھی۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ میں نے مہرہ صاحب سے کہا کہ گاڑیاں تو آپ ساتھ لے ہی آئے ہیں۔ رات کو اُنھیں یہیں رہنے دیجیے۔ صبح ہم انہی میں کشمیر چلے جائیں گے۔ لیکن اُنھوں نے ایک نہ سُنی۔ میں نے اُن سے کہا کہ بصورتِ دیگر ہمارے لیے پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا اِنتظام کیا جائے کیوں کہ کُد میں ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہیں۔ لیکن مہرہ صاحب نے معذوری ظاہر کی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ہم کو رات بسر کرنے کے لیے سب جیل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اُنھوں نے اِس کو بھی نہیں مانا اور کہا کہ "آپ کا نام آج ہی جیل کے رجسٹروں سے خارج ہونا چاہیے۔ لہٰذا آپ یہاں سے اِسی وقت چلے جائیے۔" بہر حال ہمارا تمام سامان کُد کے ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔ اور میں خواجہ علی شاہ اور صوفی محمد اکبر کے ساتھ ڈاک بنگلے آ گیا اور یہیں سے مہرہ صاحب بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شیخ فیروز الدین ہمارے سپرنٹنڈنٹ جیل تھے اُنھوں نے ٹرانسپورٹ کا اِنتظام کرنے میں کوئی دلچسپی نہ دِکھائی۔ البتہ سفر خرچ کے لیے ہم تین نفوس کو فی کس ایک ایک سو روپے دیدیے۔ اب ہم کُد میں ٹرانسپورٹ کا

انتظام کریں تو کیا کریں؟ جموں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو ٹیلی فون کو بند پایا۔ سرینگر کا بھی یہی حال تھا۔ جموں سرینگر روڈ کو ٹریفک کے لیے بند کر دیا گیا۔ مجبوراً ڈاک بنگلے میں ہی پڑے رہے۔ ہماری رہائی کی خبر کو دُنیا بھر کی نشر گاہوں اور اخبارات نے بڑھ چڑھ کر شائع کیا۔ دہلی سے ملک کے اندر اور باہر کے بہت سے ممتاز صحافی اور اخباروں کے ایڈیٹر کُد پہنچنے لگے۔ اور وہاں ایک بڑی اخباری کانفرنس میں میں نے اُن کے سوالات کے جواب دیے۔ میں نے اُن سے کہا کہ "مجھے نہ تو معلوم ہے کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اور نہ یہ معلوم ہے کہ مجھے کیوں رہا کر دیا گیا ہے۔ البتہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۵۳ء میں نے ہندوستان کو نہیں بلکہ ہندوستان نے مجھے دھوکا دیا۔ اور اگر مرکزی حکومت میں جرأت ہے تو وہ میرے خلاف بیرونی طاقتوں سے ساز باز کرنے کے الزام کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کرائے۔" میں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ "۱۹۳۱ء میں جب میں نے آزادی کی جدوجہد شروع کی تو ہندوستان کے کچھ حلقوں نے مجھے کٹر فرقہ پرست کہا لیکن ۱۹۴۷ء میں عین اُس وقت جبکہ گردوپیش میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا میں نے ثابت کر دکھایا کہ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ اب اگر پھر کوئی اِمتحان آئے تو میں اپنے عمل سے دکھا دوں گا کہ میں ثابت قدم ہوں۔ شیخ عبداللہ اپنے ضمیر کا سودا عہدوں اور روپے کے عوض نہیں کر سکتا اور نہ وہ فوجوں سے ڈرتا ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے جھک سکتا ہے۔ وزارتِ عظمیٰ میرے لیے مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے بجائے خود منزل نہیں ہے۔" میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ "مجھ پر بیرونی طاقتوں کے ساتھ ساز باز کرنے کے جو الزامات لگائے گئے ہیں اُن کی تحقیقات کی جانی چاہیے۔ اگر آج بھی میں اِس الزام میں قصوروار ثابت ہوں تو ہندوستان کے ایک ایک شہری

سے معافی مانگنے پر تیار ہوں۔ ورنہ برسرِ اقتدار طبقے پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کردار کشی کی تلافی کرے۔" میں نے ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی اچانک موت کی تحقیقات اور اصل مجرموں کی نشاندہی کا مطالبہ بھی کر دیا۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ جب ۱۹۴۷ء میں دوسری جگہوں پر بے گناہ لوگوں کا قتل کیا جا رہا تھا میں نے گاندھی جی کے آدرش کی پیروی کی۔ میں اب بھی اِس پر کاربند ہوں۔ گاندھی جی مجھے روشنی کا ایک مینار دکھائی دیتے تھے اور وہی ایک ایسی شخصیت تھے جو سچائی اور اصولوں کے لیے زندہ رہے اور انہی کے لیے شہید ہو گئے۔ کسی اخبار نویس نے مجھ سے کہا کہ کرشنا مینن نے سلامتی کونسل میں کشمیر کے بارے میں جو زبردست بحث کی اُس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ مینن ایک وکیل ہیں۔ قانونی موشگافیوں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ لیکن اگر کشمیر کو قانونی موشگافیوں کے ذریعہ جیتا جا سکتا تو پاکستان کے چودھری ظفر اللہ خان یہ معرکہ کب کا سر انجام دے چکے ہوتے۔

کشمیر ایک اصولی اور انسانی مسئلہ ہے اور اُس کو اُسی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے اِس لیے کشمیریوں پر مینن کی بجائے گاندھی جی کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور میں خود ۱۹۴۸ء میں وردھا ونوبا جی کے پاس روشنی اور سکون پانے کے لیے گیا۔ ہفتہ وار اخبار "بلٹز" بمبئی کے مدیر روسی کرنجیا بھی جو میرے پرانے واقف تھے، آئے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کشمیر جانے کی بجائے دہلی کا رخ اختیار کروں، اور جواہر لال سے ملوں۔ کسی اخبار نویس نے کچھ کہا تو کسی دوسرے نے کچھ اور۔ میں نے اُن سے کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک چھوٹی جیل سے نکل کر بڑی جیل میں آ گئے ہیں۔ میں نے آئی۔ جی۔ پی۔ کے سلوک کے بارے میں بھی اخبار نویسوں کو اعتماد میں لیا۔ کسی اخبار نویس نے مذاق میں پوچھا کہ اگر ڈاک بنگلے سے آپ کو تین دن کے بعد، جو قاعدے کے مطابق ڈاک بنگلے

میں رہنے کی سب سے زیادہ مدت ہے، نکالا جائے تو آپ کہاں جائیں گے؟ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ کُد میں کوئی مسجد نہیں ہے مگر گوردوارہ ساتھ ہی ہے۔ ہم وہاں جا کر پناہ لیں گے۔ گورو کا لنگر تو کسی پر بند نہیں۔ اور اگر اس میں بھی کوئی رکاوٹ آگئی تو میں ونوبا بھاوے کی طرح پدیاترا کرتے ہوئے کشمیر کی طرف چل پڑوں گا۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور کانفرنس خوشگوار ماحول میں ختم ہو گئی۔ لیکن ایک بہت بڑے اخبار "ٹائمز آف انڈیا" نے دوسرے دن ونوبا کے ذکر کو اس بات سے جوڑ دیا کہ میرے ذہن میں کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے ایک اِنقلابی منصوبہ ہے اور میں کشمیر جا کر گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو اِنقلاب پر اُبھاروں گا۔ ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

ہماری کُد جیل سے رہائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ تھی۔ موسم انتہائی سردی کا تھا۔ جسے کشمیر میں چلۂ کلاں کہتے ہیں۔ بخشی صاحب نے ہندوستان کے بہت سے اخبارات کے نمائندوں کو ڈی۔ ڈے (D-DAY) سے پہلے ہی سرینگر بُلا لیا تھا۔ اور نیڈوز ہوٹل میں اُن کے قیام و طعام کے علاوہ ناؤ و نوش کا بھی بہت اعلیٰ انتظام کر رکھا تھا۔ منصوبے کے تحت ہم کو پولیس کی نِگرانی میں سرینگر پہنچا دیا جانا تھا۔ اور وہ بھی شام کے وقت۔ جب لوگ سردی اور اندھیرے سے بچنے کے لیے اپنے گھروں میں گھس گئے ہوں اور ہمارے اِستقبال کے لیے کہیں کوئی آواز ہی بلند نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی اجتماع لگ سکے۔ اخبار نویس جب یہ کیفیت دیکھ لیں گے تو تمام ہند میں اس خبر کا چرچا کریں گے کہ لوگ ہمیں بھول چکے ہیں۔ اور ہمارے حق میں پانچ سال کی نظربندی کے بعد زندہ باد کا ایک نعرہ بھی نہ لگا۔ لیکن انسان جب اپنی چالوں پر اُتر آتا ہے تو وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ منشائے الٰہی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کُد میں ہم کئی

روز رُکے رہے۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری سرینگر واپسی کب ہوگی؟ اس لیے سری نگر میں رُکے ہوئے اخبار نویس مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگئے۔ انھوں نے اس ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں ہی لَدّ کا رُخ اختیار کیا اور وہیں مجھ سے ملاقات کی۔ اُدھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ میرا برادرزادہ شیخ عبدالرشید کسی کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ وہ بذریعہ موٹر جموں سے سرینگر کی طرف آرہا تھا۔ کہ اودھمپور میں اُسے بھی روک دیا گیا۔ لیکن دوسرے دن اُسے آگے بڑھنے کی اجازت دیدی گئی۔ لَدّ پہنچ کر وہ مجھ سے ملا اور میں نے اُسے تاکید کی کہ وہ سرینگر میں ٹرانسپورٹ کا انتظام کرکے لَدّ بھجوادے شیخ عبدالرشید سرینگر پہنچا تو اس نے دوسرے دن ہمارے لیے ٹرانسپورٹ بھجوادیا۔ اور ۱۱ جنوری کو ہم سرینگر کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ سنٹرل ریزرو پولیس پھیلادی گئی ہے۔ دکانیں بند ہیں اور لوگوں کو اکٹھا ہونے کی اجازت نہیں۔ خوف و دہشت کی فضا چاروں طرف طاری ہے۔ ہم اسی حال میں سفر کرتے ہوئے بانہال پہنچے۔ وہاں اس خوف و دہشت کے باوجود جوں ہی ہمارے آنے کی خبر پھیلی تو جامع مسجد میں ایک بڑا جمگھٹا ہوگیا۔ میں نے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ اس کے بعد ہم درۂ بانہال کو عبور کرنے کے لیے آگے بڑھے جھٹپٹے کا وقت ہورہا تھا۔ ہم نے رات ویری ناگ کے ڈاک بنگلے میں گذارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جو بانہال کے اس پار پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ اننت ناگ سے کچھ دوست ہماری اگوائی کے لیے آگئے تھے۔ اور اُن کے چہرے بُشرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑے سہمے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دوست حاجی غلام محمد کوچک نے میرے کان میں کہا کہ انھوں نے رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن ڈاک بنگلے کے تمام دروازوں کو مقفل کردیا گیا ہے۔ میں نے قافلے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا

اور کہا کہ موقع پر ہی حالات سے نپٹ لیں گے۔ کچھ دیر کے بعد ہم ویری ناگ کے ڈاک بنگلے پر پہنچ گئے۔ میں نے پوچھ تاچھ کی تو ڈاک بنگلے کے چوکیدار نے جواب دیا کہ بخشی صاحب کے آدمیوں نے سارا ڈاک بنگلہ ریزرو کرلیا ہے اور دروازوں پر تالے لگاکر چلے گئے ہیں۔ مجھے یہ کمینہ پن بہت کھلا اور میں جان گیا کہ بخشی صاحب کے آدمیوں کو تو یہاں رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں البتہ وہ ہماری نیندیں حرام کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں تالے توڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ پیچھے رہیں۔ کیونکہ میں خود تو الٹے پاؤں جیل جانے کے لیے کمربستہ تھا۔ لیکن میں اپنے ساتھیوں کو مبتلائے مصیبت نہیں کروانا چاہتا تھا۔ آخر کار خدا خدا کرکے ہم کمروں میں داخل ہوگئے۔ حاجی غلام محمد صاحب نے، خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑی محنت سے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ اور ہم نے شدید جاڑے میں کشمیری ضیافتوں کا خوب لطف اُٹھایا۔ اُدھر سرینگر سے بھی کچھ ساتھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے وہاں کے حالات سناتے ہوئے کہا کہ ہر طرف سی۔ آر۔ پی بچھادی گئی ہے اور لوگوں کا گھروں سے نکلنا تک مشکل کردیا گیا ہے۔ پُلوں اور سڑکوں پر پولیس اور غنڈے تعینات کیے گئے ہیں۔ اور لاریوں، بسوں اور تانگوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹیں کھڑی کردی گئی ہیں۔ تاکہ لوگ ہمارے استقبال کے لیے جمع نہ ہوسکیں۔ مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام محی الدین ہمدانی بھی سرینگر سے تشریف لائے۔ ۱۹۵۳ء میں اور اس کے بعد انھوں نے جو رول ادا کیا میں نے اُس پر اُن کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب میرا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا تو میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ واقعی اپنے کیے کرائے پر پشیمان ہیں تو ہمیں ماضی کے گلے شکوؤں کو لپیٹ کر ایک نیا ورق پلٹنا چاہیے۔ اور یہ موقعہ ہے کہ آپ سرینگر جاکر لوگوں کا حوصلہ اُبھاریں

اور اُن کے دلوں میں جاگزیں دہشت کو دور کرنے کی سعی کریں۔ میں نے انھیں ہدایت کی کہ وہ سرینگر کی دو تین نمایاں جگہوں پر اپنی نگرانی میں محرابیں کھڑی کروادیں اور پھر تمام شہر میں لوگوں کا حوصلہ عود کر آئے گا اور بخشی ٹولے کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے انھیں کچھ اور مشورے بھی دیئے اور وہ واپس سرینگر کی طرف چل پڑے۔

دوسرے دن یعنی ۱۲ جنوری کو ہم ناشتے کے بعد نکلے۔ جنوری میں عام طور پر وادی میں موسم ابر آلود رہتا ہے مگر اُس دن کھل کر دھوپ نکلی ہوئی تھی اور جاڑے کا آسمان کشمیر کی فیروزی فضا پر کسی یاقوتی نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہم پہلے ڈورو پہنچے تو اچانک جھنڈوں اور جھاڑیوں سے جیسے لوگ پھوٹ پڑے۔ ڈورو میں ۱۹۵۳ء میں گولیوں سے ایک درجن سے زیادہ فرزندانِ کشمیر کو جام شہادت پلایا گیا تھا۔ ان شہیدوں کو جس جگہ پر دفن کیا گیا تھا، اُس کا نام و نشان مٹانے کے لیے وہاں ایک پارک سجادی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے یہیں پر عوام سے خطاب کیا۔ میں نے کہا:

"مجھے آپ سے ایک طویل مدت تک جُدا رکھا گیا۔ ہمارے مخالف گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے تھے کہ کشمیریوں نے مجھے بھلا دیا ہے لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے لوگوں کو مفت چاول دے کر ان کے ایمان کو خرید لیا ہے۔ لیکن میں کہتا تھا کہ میری قوم کو چاول کی خیرات خرید نہیں سکتی۔ آج میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جھوٹے تھے اور میں سچا۔ خُدا نے پھر ہمیں ایک دوسرے سے مِلا دیا ہے۔ دُنیا کی کوئی طاقت دِلوں کے رشتوں کو توڑ نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے زر اور جبر، فوج اور لالچ ہر ایک جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر کے آپ کے اور میرے اس تعلق کو توڑنے کی سر توڑ کوشش کی گئی۔ لیکن اُنھیں نامرادی اور ناکامی کے سوا

کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ جو لوگ آپ کو ڈرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود بزدل ہیں اور اپنے من کے چور سے سہمے ہوئے ہیں۔ آپ کو اُن سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ سچائی اور نیکی کا شعار اپنایئے۔ پھر آپ کو کوئی طاقت مرعوب نہیں کر سکتی۔ آپ نے تحریص اور استبداد دونوں کا مقابلہ جس جگرداری سے کیا ہے وہ کشمیر کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ مورخ اس بات کو فخر سے بیان کرے گا کہ جب آپ کے سفلانہ جذبات کو ابھارنے کے لیے نہایت کمینہ حرکات کی جا رہی تھیں تو آپ نے استقامت اور اصول کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح اپنی اور اپنے وطن کی عزت اور لاج بچالی۔"

یہاں سے اننت ناگ کی طرف چلے تو گاؤں گاؤں میں مرد و زن، بچے بوڑھے اور جوان سبھی سڑکوں پر امنڈ آئے اور بخشی صاحب کی تمام شاطرانہ چالیں اکارت ہوگئیں۔ دیالگام کے بڑے جلسے کے بعد اننت ناگ میں بہت بڑا اجتماع تھا۔ اور مکانوں کی چھتیں تک لوگوں سے اٹ گئی تھیں۔ یہاں کے مشہور شیر باغ میں جو شیرِ کشمیر کے لقب کی مناسبت سے پکارا جاتا ہے، ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کا مجمع تھا۔ میں نے یہاں پر بھی تقریر کی اور لوگوں سے کہا کہ "میرے قید کیے جانے کے بعد حکومت ہند نے تجوریوں کے دہانے اور ٹھیکوں کے منہ کھول دیئے تاکہ آپ کا رشتہ ہم سے کٹ جائے مگر خلوص اور وفا کا رشتہ کتنا مضبوط ہے اس کا اندازہ آج سبھی کو ہو رہا ہے۔" پھر بج بہاڑہ، اونتی پورہ، پانپور الغرض جہاں جہاں آبادی تھی وہاں وہاں میرے پہنچ جانے پر نقشہ ہی پلٹ جاتا تھا۔ جو لوگ میرے آنے تک دیواروں کی آڑ اور مکانوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے ہوتے میری جھلک پاتے ہی خوشی سے پھدک کر باہر آجاتے۔ حکومت نے پلوں پر پہرے بٹھادیے تو لوگ کشتیوں کو لے کر کناروں تک آ گئے۔ الغرض انقلاب

کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر طرف لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آتے تھے۔ مجھے جگہ جگہ لوگوں سے خطاب کرنا پڑا اور اُن کی وحشت دور کرنا پڑی۔ لیکن اب ایک اور مشکل پیدا ہو گئی۔ جنوری میں کشمیر میں بڑے چھوٹے دن ہوتے ہیں۔ یعنی پانچ بجے شام ہو جاتی ہے اور میں وہاں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ بعد میں دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کو اندھیرے اور کڑاکے کی سردی سے زحمت نہ ہو۔ لیکن لوگ مجھے اس طرح گھیرے ہوئے تھے کہ میرے لیے آگے بڑھنا محال ہو جاتا۔ طوعاً و کرہاً میں نے اپنے ہاتھوں میں ایک موٹا سا ڈنڈا لیا اور لوگوں کو بتانے لگا کہ وہ مجھے راستہ نہ دیں گے تو میں اسی سے ان کی تواضع کروں گا۔ لیکن واہ رے کشمیری عوام! وہ اس کو میری ادا سمجھنے لگے اور میری گاڑی کے آگے اس طرح بچھ بچھ گئے کہ اُن ہی پر ڈنڈے کا وار ہو۔ مجھے اُن کی اس سادگی اور خلوص پر بڑا پیار آیا۔ لیکن مجبوری تھی۔ میں نے خدا کا نام لے کر ڈنڈے کو علامت کے طور پر فضا میں اُچھالنا شروع کیا اور ہماری گاڑی سرینگر کی حدود میں داخل ہو گئی۔ اس استقبال کا ماجرا لفظوں میں نہیں سما سکتا۔ لوگوں کی والہانہ عقیدت میرے تئیں اُن کی پروانہ وار محبت اور حکومت وقت کے خلاف اُن کی بیزاری اور نفرت اُن کی ایک ایک حرکت سے ٹپکی پڑتی تھی۔ عجب نظارہ تھا۔ پانچ سال تک ظلم و جبر اور مکر و ریا کا مینار ہزاروں شہیدوں کی ہڈیوں، بے شمار مال و زر اور سنگ و آہن کے ہتھیاروں سے تعمیر کیا گیا تھا وہ عوامی ابھار کے ایک ہی ریلے میں حرفِ غلط کی طرح نابود ہو کر رہ گیا۔ اسی دن کی بات ہے کہ بخشی غلام محمد بڈشاہ چوک میں تاج ہوٹل کے ایک کمرے کو کمین گاہ بنا کر اور دوربین آنکھوں پر لگا کر چوری چھپے جلوس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کے ایک اور ساتھی تھے۔ جب بخشی صاحب نے انسانی سروں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور

اس کی پُر جوش موج زنی دیکھی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ساتھی سے کہا کہ میری ساری عبادت اور ریاضت رائیگاں ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ساتھ ایک نفس بھی نہیں ہے۔ اس صورت کو بدلنے کے لیے کوئی اور طریقہ آزمانا پڑے گا اور شیخ صاحب کو پھر جیل واپس بھیجنا پڑے گا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔"

ویری ناگ سے سرینگر تک کوئی چودہ پندرہ گھنٹے مجھے تقریباً ایستادہ رہنا پڑا اور لوگوں کے پیار و محبت کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دینا پڑا۔ درجنوں مقامات پر تقریر کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ لاکھوں عقیدت مندوں کے جوش و خروش سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اس محنت و مشقت سے میرا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم خانقاہ معلّیٰ کے صحنِ پاک میں پہنچے۔ وہاں میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور نماز ادا کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس وقت ہندوستانی اخبارات کس طرح یا تو شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا کر حقائق سے آنکھیں چرا رہے تھے یا جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے تھے اُس کا اندازہ مجھے دوسرے دن کے اخبارات سے ہوا۔ جس دن میں سرینگر پہنچا اس دن اتفاق سے اتوار تھا۔ لیکن سارا شہر ہی کیا بلکہ آدھا کشمیر سڑکوں پر امڈ آیا تھا۔ مگر دلی کے سرکردہ اخبارات نے خبر یوں دی: "شیخ عبداللہ سرینگر میں۔ چھٹی منانے والے ہجوم نے نعرے بلند کیے۔" البتہ بمبئی کے ہفتہ وار "بلٹز" نے جھوٹ کی قلعی کھول دی اور لکھا کہ "یہ غلط بیانی خود ہندوستان کو لے ڈوبے گی کیونکہ شیخ صاحب کا ایک مردِ آہن ہیرو کی طرح استقبال ہوا اور ان کی راہوں میں کشمیریوں نے آنکھیں بچھا دیں۔" اسی طرح میری آمد کی خبر پا کر کچھ غیر ملکی ٹیلی ویژن اور

نشریاتی اداروں نے جو خاص ٹیمیں بھیجی تھیں، انھوں نے اِس عظیم جوش وخروش اور استقبال کی عکس بندی اور صدا بندی دنیا بھر کے نشریاتی سلسلوں پر پیش کرکے صورتِ حال کو آئینہ دکھا دیا۔ ▲▲▲

(۵۸)

قصہ لیلیٰ اور مجنوں کی فوجداری کا

میری غیر حاضری کے دوران بخشی صاحب اور صادق صاحب ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تھے اور بقولِ شاعر نوبت "لیلی اور مجنوں میں آخر فوجداری ہوگئی" تک آپہنچی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان دو کے درمیان اِقتدار کے لیے گٹھ جوڑ کے علاوہ اور کوئی قدرِ مشترک موجود نہیں تھی۔ چوں کہ دونوں کا خیال تھا کہ جب تک میں واقعات کے مرکز میں ہوں اُن کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتے۔ اِس لیے دونوں میرے خلاف سازش میں جٹ گئے تھے۔ لیکن جب یہ رکاوٹ دور ہوگئی تو اُن کے دلوں کی کدورت اپنا رنگ دکھانے لگی۔ صادق صاحب کے ساتھ ان کے دوسرے ساتھی درگا پرشاد در، میر قاسم، گردھاری لال ڈوگرہ، ترلوچن دت، موتی لال مصری، رام پیارا صراف، کرشن دیو سیٹھی وغیرہ بھی بخشی کی نیشنل کانفرنس سے الگ ہوگئے اور انھوں نے جمہوری نیشنل کانفرنس کے نام سے اپنی الگ دُکان سنبھالی۔ جس بخشی غلام محمد کو انھوں نے سنہ ۵۳ء میں اپنا مسلّمہ رہنما مان لیا تھا اور اُس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے تھے اب اُسی بخشی کو وہ ایسی ایسی صلواتیں سنانے

لگے کہ تو یہ کھیل۔ حقیقت میں وہ اپنے سالہا سال کے جانے بوجھے منصوبے کی تکمیل کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اُن کا بنیادی مقصد کشمیر میں طاقت و اقتدار پر چھا جانا تھا۔ اور پھر کشمیر کو بنیاد بنا کر سارے ملک میں کمیونسٹ نظریے کی توسیع و استحکام کرنا تھا۔ میری ذات کو بخشی کی مدد سے ہٹا کر وہ سمجھتے تھے کہ راستے کا سب سے بڑا پتھر لڑھک گیا ہے اب وہ دھیرے دھیرے بخشی کا بھی پتہ کاٹنا چاہتے تھے۔ بخشی غلام محمد کی جن خامیوں کا احتساب میں نے ۱۹۵۳ء میں شروع کیا تھا اور جن کی وجہ سے میں اُس کو الگ کر دینا چاہتا تھا، اب اشتراکیوں نے اُنھی خامیوں کو اچھالنا شروع کیا اور بخشی کو نکالنے کے لیے جتن کرنے لگے۔ اُنھوں نے ۱۹۵۳ء کے واقعات و سانحات کے لیے بھی بخشی کو کوسنا شروع کر دیا۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں کشمیر میں جو حادثات پیش آئے اور جو مظالم ڈھائے گئے اُن کا محرّک اور منبع یہی کمیونسٹ ٹولی رہی تھی۔ اُنھوں نے ہی تحریروں کی بغاوت کو کچلنے کا خونیں باب لکھا اور اس میں اُن کے پیش رو اور رہبر ڈی۔ پی۔ در تھے۔ لیکن یہ ٹولی اس بات پر تکیہ کر رہی تھی کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اس لیے وہ ۱۹۵۳ء کی کالی کرتوت کو بخشی کے سر تھوپ کر اپنے آپ کو نجات دہندگان میں شمار کروانا چاہتے تھے۔ بخشی غلام محمد ان سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہوئے اُنھوں نے ایک طرف کمیونسٹوں کی کمزوریوں کو بھانپ کر انھیں ناؤ نوش اور عیش و مستی میں غرق کر دیا اور دوسری طرف اندر ہی اندر اپنی طاقت کو مستحکم اور مضبوط کرنے لگے۔ کمیونسٹوں کا خمار ٹوٹا تو انھیں ہوش آیا۔ اُنھوں نے بخشی سے علیحدہ ہو کر کھلم کھلا اِن کے خلاف صفیں ترتیب دیں۔ بخشی غلام محمد نے کمیونسٹوں کی مشاورت سے جن برگیڈوں کا جو غنڈہ لشکر منظم کیا تھا اُس کو اُنھی کے خلاف اُکسایا اور کئی مقامات پر صادق صاحب، ڈی۔ پی۔ در اور میر قاسم کی پٹائی بھی کروا دی۔ لیکن جب نئے انتخابات

کا موقع آنے لگا تو صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ حکومت سے الگ رہے تو بخشی صاحب انھیں اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں گے اور اس طرح سے اُن کی سیاسی تجہیز و تکفین مکمل ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ جواہر لال نہرو کی سفارش لے کر بخشی صاحب کے چرنوں میں پہنچ گئے۔ صادق صاحب نے اعلان کیا کہ بخشی صاحب کے ساتھ ان کے برادرانہ اور خاندانی تعلقات ہیں اور وہ انھیں بدستور اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ قاسم صاحب نے کہا کہ بخشی صاحب کے پاس آکر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے گھر میں واپس آگیا ہوں۔ چنانچہ بخشی صاحب نے صادق صاحب، ڈی۔ پی۔ در، گردھاری لال ڈوگرہ اور میر قاسم کو پھر اپنی وزارت میں لے کر کچھ وقت کے لیے رام کر لیا۔ اور یہ بخشی صاحب کے پھر سے گُن گانے لگے۔ بہرحال بات ۱۹۵۸ء کی ہو رہی ہے۔ صادق صاحب اُس وقت بخشی سے برسرِپیکار تھے اور کمیونسٹوں کی اخلاقیات کے مطابق وہ اب مجھے بھی بخشی صاحب کے خلاف جنگِ زرگری میں استعمال کرنے کی ٹھان رہے تھے چنانچہ میری رہائی سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے جیل میں ہی مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کا لب و لہجہ اُن خطوط سے بالکل بدلا ہوا تھا جو انھوں نے صرف ایک ڈیڑھ سال قبل آئین ساز اسمبلی کے معاملات کے سلسلے میں مجھے لکھے تھے۔ اب اقتدار کے ساتھ ساتھ اُن کی رعونت اور نشۂ اقتدار بھی چلا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں مجھے لکھا کہ "تحریکِ آزادی کی ابتدا سے میں قوم کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا مرکز اور محور تھا۔" انھیں اب اس تذکرے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ "جب سارا برصغیر نفرت کے شعلوں میں جھلس رہا تھا تو آپ نے دو قومی نظریے کو شکست دینے کے لیے جو تاریخ ساز معرکے انجام دیے وہ قومی آزادی کی تاریخ میں عزت و احترام کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اب ہمیں چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو بھول کر متحد ہو جانا

چاہئے۔ اُن کے خط کا ایک جملہ یہ تھا: ”تفصیلات میں کسی جگہ ہمارا آپس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان اختلافات کو آزادانہ مباحثے اور باہمی مشورے کے جمہوری طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔“

میں نے ۱۹۵۵ء میں صادق صاحب سے اسی جمہوری حق کا احترام کرنے کی درخواست کی تھی۔ تو انھوں نے حکومت کے نشے اور نخوت میں ٹھکرا دی تھی۔ اب انھیں یہ سب کچھ اُس وقت یاد آیا تھا جب بخشی صاحب نے اُن کو کرسی سے لڑھکا دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے خلاف سامراجی سازشوں کے بنیادی اختلافات کو بھی بھول گئے تھے۔ دروغ گو را حافظہ نباشد۔

میری رہائی کے فوراً بعد صادق صاحب نے اپنے ایک ساتھی موتی لال مصری کو بھی میرے پاس قاصد بنا کر بھیجا۔ انھوں نے یہ پیش کش کی کہ میں بخشی کے خلاف مجوزہ متحدہ محاذ کی قیادت سنبھالنا قبول کروں۔ انھوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ میں بخشی کے خلاف اُن کو سہارا دوں تو وہ برسرِ عام میرے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے لیے معافی مانگنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے اُن پر اعتبار نہ کیا اور خالی ہاتھ واپس لوٹا دیا۔ لطیفہ ملاحظہ ہو کہ جب مصری کئی گھنٹے تک مجھے منوانے میں ناکام ہو کر واپس صادق کے پاس چلے گئے تو صادق نے اُن سے بڑی تشویش کے ساتھ پوچھا: ”کیا تم اب بھی ہمارے ہی ساتھ ہو یا ندی پار کر گئے؟“ اُن ہی دنوں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رہنما زیڈ۔ اے۔ احمد بھی سرینگر آئے اور انھوں نے مجھ سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ زیڈ۔ احمد نے ۱۹۵۳ء کے نرغے کو منظم کرنے اور اس کے بعد کشمیریوں پر ظلم و ستم روا رکھنے کے لیے مشیر اور وزیر کا رول ادا کیا تھا۔ اب وہ کائیاں بن کر بڑی ڈھٹائی سے مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اُن

سے صاف کہہ دیا ؎

میں باز آیا محبت سے اُٹھا لو پاندان اپنا

البتہ جب مجھے تین ساڑھے تین مہینے کے بعد ۲۹ر اپریل ۱۹۵۸ء کو پھر گرفتار کر لیا گیا تو صادق صاحب نے میری اس گرفتاری کی بڑی مذمت کی۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ:

”شیخ صاحب کی گرفتاری سے کشمیر کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں جب کہ وہ عوام کو پُر امن رہنے کی اپیل کر رہے تھے سیاسی حالات روبہ اصلاح ہو رہے تھے اور پُر امن و معتدل حالات میں یہ اقدام قطعاً غیر منصفانہ ہے۔“

میں نے اپنی رہائی کے فوراً بعد محسوس کر لیا تھا کہ میری رہائی دراصل میری نئی اور طویل گرفتاری کا ریہرسل ہے اور بقول شاعر ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

لیکن میری طبیعت نے اس جبر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ظلم و جبر کے شکنجے میں جکڑی ہوئی قوم کو پھر سے للکارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرینگر پہنچنے کے دوسرے روز حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عرس حضرت بل میں منایا جا رہا تھا۔ اس دن میں بھی وہاں گیا اور میں نے ایک عظیم اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بخشی حکومت کی غنڈہ گردی کا نقاب تار تار کیا۔ میں نے عوام سے کہا کہ ”اُن کی عزت و آزادی پر ڈاکہ ڈالنے والے آخر کار ناکام و نامراد ثابت ہو جائیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں عزم و ایمان کی شمعیں روشن رکھیں۔ میں نے کہا کہ کشمیر کا فیصلہ نہ کراچی میں ہو سکتا ہے نہ دلی میں۔ نہ ماسکو میں اور نہ واشنگٹن میں۔ کشمیر کے اصل مالک اس کے عوام ہیں

اور وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔" اس کے بعد شہر میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے خانقاہ معلیٰ، جامع مسجد اور تحریک حریّت کے قدیم مراکز پر لوگوں سے خطاب کیا۔ لوگ زمہریری سردی کے باوجود لاکھوں کی تعداد میں آتے۔ میں تلاوتِ قرآن کریم کے بعد علامہ اقبال کی کوئی نظم خوش الحانی کے ساتھ سناتا۔ چنانچہ جامع مسجد میں اُن کی مشہور غزل ؏

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سناتا تو مجمع پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ غرض سارے کشمیر میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو رہا تھا اور جمود کی جو سخ بستہ رات چھا گئی تھی اس میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے عوام کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے ایک اور پروگرام شروع کیا یعنی سرینگر شہر میں جن کنبوں کے افراد ۱۹۵۳ء اور اس کے بعد ظالموں کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے یا جن کنبوں کے افراد جیلوں میں اپنی زندگی کے بہترین ایام گزار رہے تھے، میں نے ان کے گھر جا کر ان کے لواحقین اور پسماندگان کی مزاج پرسی کرنا شروع کر دی۔ اس طرح میں شہر کے مختلف محلوں میں جاتا رہا۔ میں جہاں بھی جاتا آناً فاناً میرے آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی اور فوراً محلّے میں ایک زبردست بھیڑ جمع ہو جاتی۔ خاص طور پر عورتیں آنِ چشم زدن میں پرے باندھ لیتیں اور اپنے خاص انداز میں گیت گانے لگتیں مجھے یاد ہے کہ میں مائسمہ بازار کے اندرونی محلّے میں گیا تو لوگ فوراً جمع ہو گئے اور عورتوں نے چھتوں پر دائرے بنا کر "وَنہ وُن" شروع کر دیا۔ اسی محلّے کی زندہ دل عورتیں تھیں جنھوں نے تحریک کے ابتدائی برسوں میں ڈوگرہ فوجوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ایک بار جب شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا اور مہاراجہ کے سپاہی رسالہ گھوڑوں پر سوار ہو کر محلّے میں گشت لگایا کرتے تھے۔ مائسمہ کی عورتوں کو ایک عجیب گُر سوجھا۔ انھوں نے اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر خالی ٹین کے کنستر زور زور سے بجانا شروع کر دیے۔ یہ آوازیں رسالہ گھوڑوں کے لیے نامانوس تھیں۔ چنانچہ وہ فوراً ہی بدک گئے اور بدحواسی میں سرپٹ بھاگنے دوڑنے لگے۔ کئی سپاہی تو زر و بکتر باندھے ہوئے گھوڑوں سے گر کر زمین پر آ رہے۔ باقی نے یہ حال دیکھا تو ڈر کے مارے اپنے گھوڑوں کو لے کر رفوچکر ہو گئے۔ اور پھر انھیں اس طرف آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

ان محلہ وار جلسوں میں لوگوں نے مجھ سے بخشی حکومت کی تاناشاہی اور غنڈہ گردی کی شکایت کی اور غلام قادر گاندربلی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی وحشیانہ ایذارسانیوں کا رونا رویا۔ قادر گاندربلی بخشی غلام محمد کا خاص معتمد بن گیا تھا۔ اس نے سرینگر کی سب سے بارونق سڑک ریذیڈنسی روڈ پر سپیشل سٹاف کے نام سے اپنی ایذارسانی کا اڈہ قائم کیا تھا۔ جہاں شریف شہریوں اور اُن لوگوں کو جن پر میری طرفداری کا شبہ ہوتا ایسی ایسی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے واقعہ یہ ہے کہ گاندربلی میں ایک مجرم کی روح حلول کر گئی تھی۔ بہرکیف، انسانی تاریخ کے تاریک دوروں میں ایسے سیاہ کردار قوم کے جسم پر پھوڑوں کی طرح ابھر آتے ہیں۔ میں نے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ محلّہ وار شہری دفاع کی کمیٹیاں بنائیں۔ جس میں محلّے کے معزز ترین لوگ شامل ہوں۔ اور جب غنڈے کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں تو یہ شہری کمیٹی ان کا سامنا کرے۔ اس طرح سے بربریت کا یہ ماحول ختم ہو جائے گا۔

انہی دنوں مہاتما گاندھی کا یومِ شہادت آ گیا۔ ہندوستان ہم پر جو مظالم ڈھا رہا تھا ان کے باوجود میرے دل میں مہاتما کے تئیں عزت و احترام کے جذبات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مجھے وشواس تھا کہ گاندھی کی روح ان کے جانشینوں کے ہاتھوں کشمیر

میں روا رکھے گئے ظلم و تشدد سے مغموم اور مضطرب ہوگی۔ اور میں یہ بھی سوچتا تھا کہ قسمت نے ہندوستان اور ہمیں طاقت آزمائی کی جس رسہ کشی میں مبتلا کر رکھا تھا اس میں مہاتما گاندھی اور اُن کے اصولوں کا آشیرواد اور خیر و برکت ہمارے ساتھ تھی چنانچہ میں نے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اِس سرزمین سے، جہاں سے گاندھی کو روشنی کی کرن نظر آئی تھی یہ بیان جاری کیا:

"مہاتما گاندھی جدید زمانے کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے زندگی بھر بنی نوعِ انسان کی آزادی اور سچائی اور عدم تشدد کے اصولوں کے لیے جدوجہد کی۔ انھوں نے تشدد، فرقہ وارانہ منافرت اور جھوٹ کی گولیوں کے آگے مسکراتے ہوئے اپنی چھاتی پیش کر کے دنیا کو یہ سبق دیا کہ اِن اصولوں کا پرچم بلند رکھنے کے لیے زندگی جیسی متاع بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ گاندھی جی کی شہادت کی دسویں برسی کے موقع پر میں برصغیر بھر میں اُن کے کروڑوں مداحوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ کشمیر کے معاملے میں صرف سچائی اور عدم تشدد کو اپنا پیمانہ بنائیں اور اِس مسئلے کو اُن ہی دو اصولوں کی بنیاد پر حل کرنے میں مدد کریں۔" ▲▲▲

(۵۹)

حضرت بل قتل کیس

میری ان سرگرمیوں سے لوگوں کا دبا ہوا حوصلہ بحال ہونے لگا اور انھوں نے حالات پر ایک صحت مند ذہن کے ساتھ نظر ڈالنا شروع کی۔ یہ صورت حال بخشی غلام محمد کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ وہ خوف، ڈر اور سازش کی بیساکھی پر زندہ رہ رہے تھے چنانچہ انھوں نے بڑے جتن کے ساتھ صورتِ حال کو بگاڑنے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ میں رضاکاروں کو بھرتی کر کے کشمیر میں بغاوت برپا کرانے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ اُن کے اس جھوٹ کو طاقت پرواز بخشنے کے لیے انٹیلی جینس کا ڈائریکٹر بی۔ این۔ ملک اور ہندوستانی اخبارات کے کچھ زرخرید نمائندے پیش پیش تھے۔ ملک نے تو اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مجھے رہا کرنے میں دراصل حکومت کی ایک مصلحت تھی۔ وہ مجھے کسی نہ کسی سازش میں ملوث کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے ایک تو مسلسل جیل میں رکھ سکے دوسرے دنیا کو یہ بھی باور کرا سکے کہ میری قید دراصل مجرمانہ سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ اپنی کتاب "نہرو کے ساتھ میرے برس" میں وہ لکھتا ہے:

"تب شیخ صاحب کو رہا کیا گیا تو ہمیں یقین تھا کہ وہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ

لیں گے جن سے ہمیں اُن کے خلاف مزید ثبوت مل جائیں گے۔ اِس لیے ہم نے اُن کے خلاف کیس دائر کرنے میں جلدی نہیں کی۔"

میری سرگرمیاں پُر امن تھیں۔ مگر ان سے ریاست میں جوش و خروش کی لہر پیدا ہو رہی تھی۔ اس لیے بخشی غلام محمد نے جارحانہ طریقے سے مجھے مشتعل کرنے اور خرمن امن میں آگ لگا دینے کی کوششیں شروع کیں۔ ۱۰ جنوری کو میں نے شہر میں اپنے پروگرام کے مطابق ایک جلسہ پتھر مسجد میں کرنے کا اعلان کیا تھا۔ پتھر مسجد ہماری تحریک کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اور یہیں پر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا تاریخی فیصلہ لیا گیا تھا۔ پتھر مسجد کے ساتھ ہی مجاہد منزل کی عمارت بھی واقع ہے جو ہماری تحریک کا اعصابی مرکز رہا تھا۔ اور جس پر اُس وقت بخشی صاحب نے ہندوستانی فوج کی مدد سے قبضہ کیا تھا۔ میرے پتھر مسجد کے جلسے کا اعلان ہونا تھا کہ بخشی غلام محمد نے دہلی کے حکمرانوں کو اطلاع کر دی کہ دراصل میں رضاکاروں کے ساتھ مجاہد منزل پر دھاوا بولنے والا ہوں۔ انھوں نے فریاد بھی کی کہ اگر مجاہد منزل اُن کے ہاتھوں سے چلا گیا تو اُن کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ملک اور جاسوسی کے دوسرے ذرائع نے یہ پروپیگنڈہ زور و شور سے کیا اور جواہر لال اور وزیر داخلہ پنڈت پنت کو بے حد پریشان کر دیا۔ چنانچہ حکومت نے فوج کو بھاری مشین گنوں اور کیل کانٹے سے مسلح کر رکھا تھا۔ وہ پتھر مسجد میں معصوم عوام کے اِجتماع کا انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ کسی حیلے بہانے سے صورتِ حال کو بگاڑ دے اور اِس علاقے کو خون کے دریا میں غرق کر دے۔ اس طرح سے ایک تو کشمیریوں کے تازہ ہوتے ہوئے حوصلے پھر سو جاتے اور دوسری طرف مرکزی حکومت کو بھی میری گرفتاری کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ میں نے یہ اطلاعات سنیں تو میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں دشمن کے پھیلائے ہوئے

جال میں نہیں پھنسنا چاہیے۔ نہ ہمیں اپنے معصوم عوام کا ناحق خون خراب کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔ اور نہ ہی امن و امان میں خلل ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ اِس قسم کے ماحول میں صرف بخشی اور اس کے عوام دشمن حواری ہی پنپ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے جلسہ حضرت بل میں کرنے کا اعلان کر دیا اور اِس طرح سے بخشی اور ملک اینڈ کو بھری ہوئی بندوقوں کو ہاتھوں میں لیے کفِ افسوس ملتے رہ گئے اور دہلی میں جواہر لال نہرو کا تناؤ کم ہو گیا اور انھوں نے چین کی سانس لی۔ لیکن بخشی ٹولے نے اپنا یہ داؤں خالی ہوتے دیکھا تو انھوں نے از خود حملہ آور ہونے کی چال سوچی تاکہ کسی نہ کسی طرح کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ ۲۱ فروری کا دن تھا۔ حضرت بل میں معراج شریف کی جمعہ کو ایک نہایت عظیم اجتماع ہوا۔ اُسی دن دہلی میں مولانا ابو الکلام آزاد بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ہم نے اس بڑے اجتماع میں اُس عظیم عالم دین اور مجاہد آزادی کی صحت یابی کی ایک قرار داد منظور کی۔ بخشی صاحب نے اسی دن ایک شرارت آمیز منصوبے کے تحت آثار شریف کے شمال کی طرف جہاں آج کل یونیورسٹی ہے اپنی ایک ٹولی بھیج دی۔ جہاں انھوں نے لاؤڈ سپیکر لگوائے اور اناپ شناپ تقریریں شروع کر دیں۔ اِس کارروائی کا صاف مقصد اس متبرک دن پر صورتِ حال کو کشیدہ کرنا اور تصادم کی صورت پیدا کرنا تھا۔ مجھے بھی حضرت بل کے اِجتماع کے سامنے خطاب کرنا تھا۔ میں نے تقریر شروع کی تو لاکھوں کا مجمع موجود تھا۔ چنانچہ جب میں تقریر کر رہا تھا۔ تو جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کچھ لوگوں نے جو صاف طور پر بخشی حکومت کی شہ پر آئے تھے ہلڑ بڑ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں کا بے پناہ اژدحام تھا اور وہ چوکنا بھی تھے۔ اِس لیے شرپسندوں کی ایک نہ چلی اور وہ عوام کے تیور دیکھ کر رفو چکر ہو گئے۔ بہر کیف جلسہ ختم ہوا۔ نماز ادا ہوئی اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لوگ بھی

زیارت کرکے واپس جا رہے تھے کہ خبر آئی حضرت بل میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے اور بخشی غلام محمد کے ایک طرف دار کو چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ حالانکہ بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ دراصل اس بدنصیب آدمی محی الدین پانڈے کو خود اُس کے ساتھیوں نے بکرۂ بنی اسرائیل بنا دیا تھا کہ ہمارے خلاف جبر و ظلم کی کوئی تازہ مہم شروع کرنے کا جواز مل جائے بس پھر کیا تھا بخشی صاحب کی ساری پولیس حرکت میں آگئی اور انھوں نے مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کا لمبا سلسلہ شروع کر دیا۔ حضرت بل قتل کیس کے سلسلے میں صوفی محمد اکبر، مولانا محمد سعید اور خواجہ علی شاہ جیسے ضعیف العمر اور معزز بزرگوں کو بھی دھر لیا گیا۔ میرے اکثر ساتھی تو جیل میں ہی پڑے تھے۔ اب بچے کھچے ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈالا گیا کہ میں بالکل یکہ و تنہا رہ جاؤں۔ پالیسی یہی تھی کہ میرے تمام پر کاٹ دیے جائیں اور اُس کے بعد مناسب وقت پر مجھے پھر پابہ جولاں کر دیا جائے۔ اس کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ کرشنا مینن جو بخشی غلام محمد کو بہت پسند کرتے تھے اور اس کی تعریفیں کرتے رہتے تھے، کے اس دعوے کے لیے بھی مصالحہ فراہم کر دیا جائے کہ میرے خلاف بہت سے فوجداری مقدمات موجود ہیں۔ حکومت نے شہر میں فسادات کی آڑ میں دفعہ ۱۴۴ اور دوسرے تعزیری قوانین لاگو کر دیے۔ میں نے اپنا وقت گذارنے کے لیے صورہ میں ایک مسجد کی تعمیر جدید شروع کی۔ صبح و شام لوگوں سے ملتا رہتا، اور دن بھر مسجد کی تعمیر کے کام کی نگرانی کرتا رہتا۔ اسی دوران عید الفطر کی تقریب سعید آگئی۔ میں ایک کھلی جیپ میں اپنے گھر سے نوشہرہ، زینہ کدل، مہاراج گنج، بلبل لنگر، نواکدل اور سیکہ ڈافر سے ہوتا ہوا عیدگاہ کی طرف چلا۔ راستے میں سڑک کے دونوں طرف لاتعداد لوگ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں والانوں، برآمدوں اور کھڑکیوں میں عید روف گا کر مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ اُن کے رنگ برنگ کے ملبوسات سے فضا میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں

راستے میں کئی زیرِ عتاب ساتھیوں کے گھر عید مبارک کہنے کے لیے بھی گیا۔ میری جیپ کے عقب میں ہزاروں لوگ نعرے لگاتے تکبیریں پڑھتے جا رہے تھے۔ اور لوگوں کا اس قدر اژدحام تھا کہ اب جیپ ڈرائیور نہیں چلا رہا تھا بلکہ اَن گنت ہاتھ اُس کو کھینچ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ آج پانچ سال کے بعد کشمیری مسلمان اس شان سے عید منا رہے ہیں۔ سردی کے باوجود کوئی تین لاکھ کا مجمع عیدگاہ میں موجود تھا۔ جس میں مستورات کی بھاری تعداد بھی شامل تھی۔ حکومت نے انسپکٹر جنرل پولیس ڈی۔ ڈبلیو۔ مہرہ کی سرکردگی میں مسلح پولیس کے کئی بٹالین تعینات کئے تھے اور آہنی ٹوپیاں پہنے ہوئے پولیس کے سپاہی ایک فوجی کیمپ کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سارا کشمیر اُس وقت حقیقت میں فوجی کیمپ ہی بنا ہوا تھا۔ اس اجتماع کی ایک خاص بات یہ تھی کہ بخشی غلام محمد کو وہاں آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میری قید کے دوران وہ پولیس کے پہرے میں باقاعدہ عیدگاہ آکر نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن اُن دنوں مسلمانوں کی کم ہی تعداد وہاں موجود ہوتی تھی اُس دن انھوں نے پانچ سال کے بعد اپنا معمول توڑ دیا۔ وہ عید سے ایک دن پہلے جموں چلے گئے۔ وہاں نماز عید ادا کی اور پھر سرینگر پہنچ گئے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ آتش و آہن اور زر و جواہر کے ہر ممکن ہتھیار سے سہارا دے کر جس تیس مار خان کو خالدِ کشمیر کے نام سے کشمیری عوام کی مسلّمہ قیادت کے مقابل پیش کیا جا رہا تھا۔ اُس کے پیر کتنے کچے اور کمزور مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے عیدگاہ میں عوام کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"اے مسلمانانِ کشمیر! آج میں عید الفطر کے موقع پر اپنی طرف سے اپنے ساتھیوں کی طرف سے اور اپنے رفیقوں کی طرف سے جو ہم سے جدا قید و بند کی سختیاں برداشت کر رہے ہیں آپ کو عید مبارک پیش کرتا ہوں۔ اور

ساتھ ہی درخواست کرتا ہوں کہ اُن ساتھیوں کے حق میں دعا کی جائے جو حمایتِ حق کی پاداش میں ہم سے اور اپنے اہل و عیال سے دور ہیں۔ دُعا کیجیے کہ خدا انھیں صحیح سلامت رکھے اور انھیں صبر و برداشت عطا کرے۔"

میں نے اس موقع پر عوام کو یہ بھی بتایا کہ "آج صبح میں آپ کو پیامِ عید دینے کے لیے کسی نکتے کی تلاش میں تھا کہ قرآن مجید کو کھولوں اور جو سب سے پہلی سورۃ نکلے اُسی سے اپنا پیام اخذ کروں۔ چنانچہ وہاں میری نظر سب سے پہلے القصص کی سورۃ پر پڑی۔ اس سورۃ میں بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے ساتھ ان کی کشمکش اور پھر اُن کی فتح کا ماجرا بیان کیا گیا ہے۔" بعد میں سی۔ آئی۔ ڈی۔ والوں نے اسے عوام کو اُکسانے والی ایک نہایت ہی اشتعال انگیز تقریر قرار دیا۔ اُنھوں نے کہا کہ میں حکومت کو فرعون کہہ کر پکار رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حکومت اس خطاب کی ہر طرح سے مستحق تھی۔ واپسی پر میں پھر جیپ میں ایستادہ ہو کر تاروبل چشمہ بل اکرن نگر امیرا کدل اور ڈل گیٹ کے راستے واپس گھر آیا۔ اور اُس وقت بھی سڑک کے دونوں طرف ہزار ہا مرد و زن میری آگوانی کے لیے کھڑے تھے۔ اس سے بخشی کی گھبراہٹ میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کی مہم اور تیز کر دی گئی۔

میں نے اس صورتِ حال پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور مولانا سعید کو دہلی جانے اور وہاں میرا ایک بیان اخبارات کے نام جاری کرنے کی ہدایت دی میں نے اُنھیں جواہر لال وغیرہ سے ملنے کی بھی تاکید کی۔ تاکہ وہ اُن کے مافی الضمیر کو جان لیں۔ پیر محمد مقبول گیلانی بھی اُن دنوں دہلی میں تھے۔ اُنھوں نے مجھے دہلی آنے کی صلاح دی۔ لیکن میں ابھی حالات کا جائزہ ہی لے رہا تھا اور اس سوچ میں تھا

کہ میرا وہاں جانا کس حد تک مفید رہے گا؟ البتہ میں نے جواہر لال کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں میں نے اپنے موقف اور خیالات کے متعلق کچھ باتوں کی وضاحت کی۔ خط کا متن درج ذیل ہے۔

"سرینگر۔ ۱۱ اپریل ۱۹۵۵ء

محترمی پنڈت جی!

جب سے مجھے نظر بندی سے رہا کیا گیا ہے بخشی غلام محمد اور اُن کے ساتھی اپنی گذشتہ غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میری سرگرمیوں کو قصداً و عمداً غلط طریقے پر پیش کر رہے ہیں۔ یہ بے حد افسوسناک بات ہے کہ اس پروپیگنڈے کی آڑ میں مختلف طبقوں کے سینکڑوں کشمیریوں کو جن میں وکیل، ڈاکٹر، تاجر، ریاست کے سابق وزراء اور سابق ممبران لوک سبھا بھی شامل ہیں، بلا کوئی جرم عائد کیے ہوئے حراست میں رکھا گیا ہے۔ یا جھوٹے اور بے بنیاد فوجداری مقدمات میں پھنسا دیا گیا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ اس سے بھی بُرا ہے جو جیل کے حکام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پولیس جان بوجھ کر کسی عدالت میں اُن کا چالان نہیں کرتی۔ تاکہ گرفتار شدگان کو زیادہ مدت تک اپنی تحویل میں رکھ کر انھیں روحانی و جسمانی اذیتیں پہنچاتی رہے۔ معزز شہریوں کو انٹی جینس بیورو میں رکھا گیا ہے جہاں انھیں اذیتیں دی جاتی ہیں کہ نازی کیمپوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے جھوٹے بیانات دیں یا ایسے بیانات پر دستخط کریں جن سے عوامی رہنماؤں کو بغاوت کے جرم میں پھنسایا جا سکے۔ ڈیفنس رولز کی دفعہ ۵۰ کی رو سے عام جلسوں پر بھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور ساری وادی کو شہرِ خموشاں میں تبدیل کر دیا گیا ہے

سی آئی ڈی، پولیس، بریگیڈ، ملیشیا اور پولیس کو عوام کے ذہنوں میں خوف و دہشت پیدا کرنے کے لیے شہروں میں ہی نہیں وادی کے طول و عرض بلکہ ضلع ڈوڈہ تک پھیلایا گیا ہے..... میں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا ہوں کہ اس حصے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندوستان کی جمہوری مشینری کیسے چل رہی ہے۔ مگر میری خاموشی اور ساتھ ہی کچھ نہ کرنا بھی ۱۹۵۳ء کی سازشیوں کی نیندیں حرام کر رہا ہے اور وہ پھر اس جوڑ توڑ میں ہیں کہ کس طرح مجھے دوبارہ جیل میں ڈالا جائے۔

مجھے تعجب ہوا جب بخشی غلام محمد نے حال ہی میں حیدر آباد اور بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے مجھ پر یہ بے بنیاد الزام لگایا کہ میں رضا کاروں کی بھرتی کر رہا ہوں اور اس کے لیے روپیہ جمع کر رہا ہوں تاکہ کسی موزوں و مناسب وقت پر پوری طاقت کے ساتھ حکومت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر دیا جائے۔ یہ ایک ایسے شخص کی ایک اور دماغی اختراع ہے جس نے نہ صرف کشمیری عوام سے بے وفائی کی بلکہ آپ کو بھی خود اقتدار حاصل کرنے کے لیے دغا دی تاکہ رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے اپنے خاندان کے لیے دولت اکٹھی کر سکے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ کو اور آپ کے کچھ رفقائے کار کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کا نتیجہ اسی سال ۹ اگست کے سانحہ کی صورت میں رونما ہوا۔ پھر مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں ریاست کو خود مختار بنانے کے لیے ایک غیر ملکی طاقت سے ساز باز کر رہا ہوں۔ اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے وہ خط و کتابت شائع کرنے کی دھمکی بھی دی جو میں نے مرحوم ابوالکلام آزاد، مرحوم رفیع احمد قدوائی اور آپ کے ساتھ کی تھی۔ میں نے انھیں جیل سے بھی لکھا کہ وہ اس خط و کتابت کو شائع کریں، لیکن انھیں یہ شائع کرنے کی آج تک ہمت نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ اس جھوٹے الزام کو وہ باور

نہیں کرا سکے اس لیے اب وہ پھر وہی پرانا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور دہلی و کشمیر میں اپنے معاون سازشیوں کی مدد سے میری سرگرمیوں کے متعلق ملک کے اندر شر انگیز فضا پیدا کرنے کی کوششوں میں لگے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ایک ایسے شخص سے دھوکا نہ کھائیں گے جو ادب و اخلاق سے بھی عاری ہے۔ آپ تو بخوبی واقف ہیں کہ میں سازشوں اور دروغ بیانیوں میں کبھی نہیں پڑتا۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے حکومت ہند کی اس پالیسی سے اختلاف ہے جو کشمیر کے باب میں اس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اپنے ان خیالات کو میں نے کسی سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس دس سالہ جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے میرے خیال میں یہی صحیح طریقہ ہے کہ کشمیری عوام کو ان کا حق خود ارادیت دیا جائے۔ یہ وہ مطالبہ ہے کہ جس کی تائید و حمایت ایک زمانے میں آپ بھی بڑے جوش و خروش سے کرتے آئے ہیں اور جس کے تحفظ کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۴۷ء میں اپنی مسلح فوج بھی بھیجی تھی۔

باوجود ان تمام واقعات کے جو اگست ۱۹۵۳ء میں رونما ہوئے تھے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کنجی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کی اختیار کردہ پالیسی سے آپ دھوکا نہ کھائیں ورنہ یہ آخر کار سب کے لیے تباہ کن ہوگا۔

آپ کا مخلص شیخ محمد عبداللہ"

اس خط کے لکھنے کے چند ہی روز بعد مسز وجے لکشمی پنڈت سرینگر آئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جواہر لال نہرو نے انھیں میرا خط دیکھنے کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھیں۔ پنڈت کیشپ بندھو نے ان سے رابطہ قائم کر لیا اور انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا کہ بخشی صاحب کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی۔ ان کا سارا محل جھوٹ اور فریب کاری پر کھڑا تھا۔ انھوں نے بھانپ لیا کہ اگر میں نے مسز پنڈت سے رو برو گفتگو کی تو شاید ان کی دروغ گوئی کا پردہ فاش ہو جائے گا اور ریت کا بنایا ہوا محل زمین بوس ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ملاقات کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ اور مجھے ۹ر اپریل ۵۸ء کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ میرے گھر کی تلاشی لینے کے لیے قادر گاندربلی کو تعینات کیا گیا۔ اس نے گھر کے کونے کھدروں کی نہایت سختی کے ساتھ تلاشی لی۔ میرے تمام ذاتی کاغذات اور دوسرا ریکارڈ سب کچھ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔

مولوی محمد سعید کو میں نے دہلی جو ہدایات دے کر بھیجا تھا ان کو اس نے وہاں پہنچتے ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے کوئی اخباری کانفرنس نہ بلائی۔ البتہ میرے بیان کو اخباروں میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ جواہر لال اور مولانا آزاد کے تاثرات مجھ تک پہنچائیں۔ لیکن انھوں نے وہاں سے آ کر چپ سادھ لی۔ مجھے گرفتاری کے بعد پھر کٹھ جیل پہنچا دیا گیا۔ مولوی صاحب کو بھی کچھ دیر کے بعد وہیں پہنچا دیا گیا تو اس وقت انھوں نے مجھے بتایا کہ جب مولانا آزاد سے ملاقات کرنے کے بعد میں واپس جا رہا تھا تو مولانا آزاد نے دروازے سے آواز دے کر مجھے بلا لیا اور کہا "شیخ عبداللہ کی مدد کی جانی چاہیے۔" مولانا بہت کم بولتے تھے۔ اور ان کا ہر جملہ جہان معنی لیے ہوتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بخشی غلام محمد کی چالاکیوں کو بھانپ چکے تھے اور ان کا مداوا کرنا چاہتے تھے۔ شاید رفیع صاحب کی طرح انھیں بھی اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اور وہ اصلاح احوال کے خواہشمند تھے۔ لیکن انھیں موت نے فرصت نہ دی۔ میں ابھی باہر ہی تھا کہ ان کی بیماری کی خبر ملی۔

لیکن ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اور چند ہی دنوں کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ یاد رہے کہ رفیع صاحب کا میری نظربندی کے دوران ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان کی میت پر بخشی اور صادق صاحب قیمتی شالیں چڑھانے کے لیے دلی اور بارہ بنکی گئے۔ لیکن یہ ماتم سے زیادہ مسکرانے کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ کیونکہ رفیع صاحب اپنے آخری دنوں میں بخشی اور صادق کے دکھائے ہوئے سبز باغ کی حقیقت جان چکے تھے اور وہ میرے ساتھ روا رکھی گئی زیادتی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے سامنے کیا تھا۔

جب میں ابھی جیل سے باہر ہی تھا تو خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ حکومت ہمارے خلاف نام نہاد سازش کا مقدمہ تیار کرنے کے لیے جتن کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کئی تقریروں میں اس لغو سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا اور ان وحشیانہ طور طریقوں کی مذمت بھی کی۔ جو ہمارے ساتھیوں کے ساتھ اذیت رسانی کے کیمپوں میں برتے جا رہے تھے تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح مقدمے کے لیے کسی طور کوئی بنیاد فراہم کر سکیں۔ ▲▲▲

۶۰

مقدمۂ سازش

میری گرفتاری کے بعد دہشت گردی کا سلسلہ پھر عام ہو گیا میرے ساتھیوں کو چن چن کر حضرت بل قتل کیس کے جعلی مقدمے میں ماخوذ کر لیا گیا۔ اور اُن پر طرح طرح کی سختیاں روا رکھی گئیں۔ اُدھر ریاستی حکومت مرکزی محکمۂ جاسوسی کی مدد سے ہمارے خلاف سازش کا ایک فرضی مقدمہ گڑھنے میں بھی مصروف تھی۔ اور اِس سلسلے میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ میں جیل سے باہر ہی تھا کہ ہمیں اطلاع ملی کہ ہمارے جیل کے ساتھیوں پر زبردست سختیاں کی جا رہی ہیں تاکہ ان سے جھوٹی گواہی حاصل کی جا سکے۔ بہر حال، کشمیر سازش کیس کے کاغذات جواہر لال نے دہلی منگوائے اور وہاں اُن کی کوٹھی پر پنڈت گوبند ولبھ پنت اور محکمۂ جاسوسی کے بہت سے آفیسران نے ان کا ملاحظہ کر کے مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء کو جموں کے سپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر دفعہ ۱۲۱، الف اور ۱۲۰، ب رنبیر پینل کوڈ اور زیر دفعہ ۳۲ سیکورٹی رولز مرزا محمد افضل بیگ اور اُن کے پچیس دیگر ساتھیوں کے خلاف مقدمہ سازش دائر کیا گیا۔ جس کے تحت ملزموں کو عمر قید اور

سزائے موت سنائی جا سکتی تھی۔ ملزموں میں بیگ صاحب کے علاوہ خواجہ علی شاہ، غلام محمد چکن، امیر غلام رسول، محمد امین وکیل، مرزا غلام قادر، پیر مقبول یمہ گامی، پیر محمد افضل مخدومی اور پیر مقبول گیلانی بھی شامل تھے۔ پیر مقبول گیلانی نے گرفتاری سے بچنے کے لیے پاکستان کی طرف راہِ فرار اختیار کی اور کئی برس کی جلاوطنی کے بعد وہیں اپنے مولا سے جا ملے۔ گیلانی صاحب کشمیر کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خانیار شریف کی اہم زیارت کے سجادہ نشین تھے۔ تحریک کی ابتدا سے ہی وہ ہمارے ساتھ رہے۔ اُن کے اثر و رسوخ کثیر وسائل اور فہم و فراست نے تحریک کی آبیاری کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کیا اور کئی آڑے وقتوں میں تحریک کے بہت کام آئے۔ وہ بہت ہی احباب نواز فیاض اور سخی بزرگ تھے۔ وہ ہمارے غریب اور نادار ساتھیوں مثلاً بخشی صاحب کی صرف مالی مدد ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے قیمتی کپڑے بھی بخشتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں مزاح تھا۔ اور بہت خوش مزاج آدمی تھے۔

۱۹۴۷ء کے قبائلی حملے کے بعد جب ہم اوڑی تک پہنچ گئے تو علاقہ اوڑی کے ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے انھوں نے بہت اچھا کام کیا۔ اور فوج کے ساتھ نہایت اچھے تعلقات قائم کیے۔ وہ ناز و نعم سے پلے ہوئے تھے اور اُن کے ہاتھوں کسی کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا لیکن بھلا ہو بخشی غلام محمد کا۔ تحریک کے اِس جیالے سرپرست اور اپنے اس بچپن کے مربی کو بھی نہیں بخشا اور انھیں طرح طرح سے ستایا حالانکہ بخشی صاحب اپنی ناداری کے دِنوں میں گیلانی صاحب کے دستِ سخا سے کافی مستفید ہوئے تھے۔ پیر مقبول صاحب کا واحد قصور یہ تھا کہ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد انھوں نے بخشی غلام محمد کے دام میں آنے سے انکار کر دیا۔

سازش کیس دائر کرتے وقت مجھے اور بیگم صاحبہ کو بھی اِس میں ماخوذ کرنے

کی کوشش کی گئی۔ بخشی صاحب نے بیگم صاحبہ کو ماخوذ کرنے سے ہچکچاہٹ ظاہر کی اور کہا کہ انھیں کشمیر بھر میں مادرِ مہربان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر بیگم صاحبہ کو اس میں شامل کیا گیا تو وہ کشمیر میں کسی کو مُنہ دِکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اِس کے علاوہ جواہر لال کی طبعی شرافت بھی کام آئی اور انھوں نے ایک معزز خاتون کو ملزموں میں شامل کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت نہرو کچھ دیر تک مجھے بھی ملزموں میں شامل کرنے کے بارے میں شش و پنج میں رہے لیکن جب زیادہ دباؤ بڑھ گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق "کم سے کم مزاحمت" کا راستہ اپنا کر ہاں کر دی۔ میرے خلاف ایک ضمنی چالان ۲۳؍اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پیش کیا گیا۔ اور میں نے سازش کے پہلے ملزم کی حیثیت سے مرزا محمد افضل بیگ کی جگہ لے لی۔ چنانچہ میں ۲۳؍اکتوبر کو پہلی بار عدالت میں ملزموں کے کٹہرے میں پہلی نشست پر بیٹھ گیا۔

سازش کا مقدمہ جموں میں شروع کیا گیا۔ وہاں نہر کے قریب جو اکھنور کے پاس چناب سے نکالی گئی ہے، ایک سپیشل جیل بنایا گیا۔ سپیشل جیل دراصل قیمتی جڑی بوٹی "کوٹھ" کا ایک گودام تھا۔ جس میں محکمۂ جنگلات نے گیراج بنا رکھے تھے۔ ان ہی گیراج میں کوٹھ کا ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ اب اُن گیراجوں کو مناسب ترمیم و تجدید کے بعد کمروں میں تبدیل کیا گیا تھا اور اُس کے آگے ایک ٹین پوش ورنڈا بنایا گیا تھا، جس سے گرمیوں میں آگ برستی تھی۔ چار پانچ کنال کے قریب صحن بھی تھا اور اس احاطہ کو ایک اونچی دیوار تعمیر کرکے الگ کر دیا گیا تھا۔ ہر طرف سی۔ آر۔ پی۔ کے مسلح سپاہی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ بلکہ دیواروں پر بنے ہوئے اونچے برجوں سے مسلح سپاہی جیل کے اندرونی حصے پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اِس جیل میں میرے علاوہ بیگ صاحب اور بعد میں ہمارے دوسرے ساتھیوں کو منتقل کرایا گیا۔ پنڈت

نیل کنٹھ ہاکو سپیشل جج مقرر کیا گیا۔ کلکتہ کے ایک بڑے بیرسٹر مسٹر مِترا کو استغاثہ کا بڑا وکیل بنایا گیا۔ بخشی صاحب نے سرینگر اور جموں بار کے چیدہ چیدہ وکیلوں کو بڑی بڑی رقوم دے کر استغاثے کی ٹیم میں داخل کر لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں صفائی کے لیے کسی قابل وکیل کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں۔ بہرحال ہم نے محمد لطیف قریشی ایڈووکیٹ کو وکیلِ صفائی مقرر کیا۔ مرزا محمد افضل بیگ بھی اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے اور خواجہ مبارک شاہ اور خواجہ غلام محمد شاہ بھی معاونت کرتے رہے۔ ہم نے ہندوستان کے بڑے بڑے وکیلوں کو وکالت نامہ لینے پر راضی کرانا چاہا، لیکن حکومتِ ہند اپنا اثر و رسوخ پوری طرح کام میں لا رہی تھی۔ اِسی لیے ہمیں ہر ایک نے ٹکا سا جواب دیا۔ آخر میں رانچی بہار کے ایک وکیل مسٹر محی الدین احمد نے ہمارا وکالت نامہ قبول کیا۔ جب ہندوستان سے ہمیں کوئی اور قابل وکیل دستیاب نہ ہو سکا تو میں نے جواہر لال نہرو کو خط لکھا۔ اُس میں مَیں نے اس ستم ظریفی کی طرف اشارہ کیا کہ ۱۹۴۶ء میں "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کے سلسلے میں جب مجھ پر بغاوت کا مقدمہ مہاراجہ کی حکومت نے دائر کر دیا تھا تو خود آپ نے اور آپ کی تحریک پر مسٹر آصف علی، دیوان چمن لال اور پٹنہ کے مسٹر سہائے نے ہمارے وکالت نامے قبول کیے تھے۔ اور آپ خود بھی پہلی بار بیرسٹر کا گون زیب تن کرکے میرے دفاع میں عدالت کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ آج پھر میں ایک سازش کیس میں ملوث کر دیا گیا ہوں۔ لیکن سارا ہندوستان چھان مارنے کے باوجود ہمیں ایک قابل وکیل صفائی دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔ اب جب کہ آپ ہندوستان کے وزیرِ اعظم ہیں میں آپ سے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ میرے وکیلِ صفائی بنیں، لیکن اِتنی سی توقع ضرور

رکھوں گا کہ آپ کسی قابل وکیل کو اشارہ کر کے اُسے میرا صفائی کا کیس تیار کرنے کی ترغیب دیں گے۔ جواہر لال نے اِس خط کا جواب تو بھیج دیا اور ایسا لگتا تھا کہ اُن کے نکتہ شناس ذہن کو اِس اُلجھی ہوئی بات نے متاثر بھی کیا تھا۔ لیکن اِقتدار کی مصلحتوں کے پیشِ نظر اُنھوں نے اِدھر اُدھر کی معذرت کر کے معاملہ گول کر دیا۔ مجھے اُن سے کسی مدد کی اُمید نہیں تھی۔ محض "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے جذبے کے تحت میں نے اُنھیں شوخی سے مخاطب کیا تھا۔ اُن کے جواب سے ظاہر تھا کہ تیر نشانے پر لگ گیا ہے اور میرے لیے اتنی ہی تسکین بہت تھی۔

میں نے ذاتی طور پر اپنا اِنفرادی دِفاع کرنے کی پرواہ نہیں کی اور نہ کسی جرح کا جواب دیا۔ بلکہ جب اِستغاثہ بار بار سازش کی رٹ لگا رہا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور ایک مرتبہ میں نے کہہ دیا کہ میں نے کبھی تشدّد میں یقین نہیں کیا ہے اور نہ سازش میرے خمیر میں شامل ہے۔ لیکن اگر آپ پھر بھی جھوٹ بولنے پر مُصر ہیں تو مجھ سے سُن لیں کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کسی کی مدد حاصل کرنا سازش نہیں ہے۔ ولادیمیر لینن کو بھی ایک وقت جرمنی کا ایجنٹ کہا گیا تھا۔ لیکن وہ بیسویں صدی کے ایک عظیم اِنقلاب کا بانی ثابت ہوا۔"

ہندوستان سے مایوس ہو کر ہم نے لنڈن کے ایک مشہور بیرسٹر مسٹر ڈنگل فٹ کو اپنا بڑا وکیل صفائی مقرر کیا۔ اُنھوں نے اپنے جونیئر بے کلیک کو بھی ساتھ لایا۔ اس طرح ہم نے بھی اِدھر اُدھر کے وُکلاء جوڑ کے اپنے بچاؤ کے لیے ایک ٹیم ترتیب دی اور اپنے دِفاع میں جُت گئے۔ اِستغاثہ نے اپنی رام کہانی شروع کی۔ ہم پر بھانت بھانت کے اِلزام لگائے گئے۔ جن کی تان اِس بات پر ٹوٹتی تھی کہ ہم نے پاکستان سے رابطہ قائم کر کے پاکستان سے روپے، اسلحہ اور بم حاصل کیے اور ہم کشمیر میں ایک

خونی اِنقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ فرضی دستاویزات بڑی محنت سے گڑھی گئی تھیں اور جھوٹے گواہوں کو بڑی رقمیں دے کر پٹی پڑھائی گئی تھی۔ اُن کی جھوں کے ایک مہمان خانے میں خوب خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔ اور وہاں عیش و عشرت کے تمام اسباب بہم رکھے گئے تھے۔

مقدمہ کی وجہ سے ہمارا جیل کا معمول بدل گیا۔ جس طرح ملازم صبح سویرے دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ ہم بھی نہا دھو کر دس بجے کے قریب کمرۂ عدالت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ جو کہ جیل سے ملحق ایک مکان میں قائم کیا گیا تھا۔ شام کے وقت تک اور بعض اوقات اس کے بعد بھی عدالت کی کاروائی جاری رہتی۔ اِستغاثے کی طرف سے پراسیکیوشن اور وُکلاء کا ایک پورا لشکر عدالت میں حاضر رہتا تھا۔ ہم بھی ان پر جرح کرتے رہتے۔ اور اِس طرح دن گُذرتے جا رہے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اِستغاثے کی طرف سے ایک مشہور وکیل نگیشور پرشاد بڑے وکیل بنا دیئے گئے۔ کچھ مدّت کے بعد جواہر لال نے اپنا ذاتی رسوخ استعمال کر کے گوپال سروپ پاٹھک صاحب کو (جو بعد میں ملک کے نائب صدر بنائے گئے۔) اِستغاثہ کا بڑا وکیل مقرر کر لیا۔ پنجاب کے ایک بڑے پبلک پراسیکوٹر ایم۔ ایل۔ سَندھو اِستغاثے کی کمان سنبھالے رہے اور بھی کئی مقامی و غیر مقامی وُکلاء کی اِس مقدمہ میں خوب چاندی ہوئی۔ چنانچہ کُل اخراجات کا حساب لگایا گیا تو خرچے کا بِل چار، پانچ کروڑ روپیہ کے لگ بھگ بنا۔

میری کمرۂ عدالت میں کبھی کبھی وُکلائے اِستغاثہ اور جج سے خوب نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ ہم اِس اِستغاثے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ ہمیں معلوم تھا یہ سب جھوٹ پر مبنی ہے اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ لیکن قُدرت نے ہمیں

ہندوستان کے رہنماؤں کی فریب کاری اور دوغلی پالیسی کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک بہت اچھا فورم بخشا تھا اور ہم اس کا خوب فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ استغاثہ کی بحث کا ختم ہونے کے بعد جب دفاع کی باری آئی تو جج تبدیل ہو گیا۔ مسٹری موہن کرشن ٹکو جو کہ سیشن جج تھے مقدمہ کی سماعت کے لیے سپیشل جج مقرر ہوئے۔ ٹکو صاحب نیشنل کانفرنس کے کارکن رہ چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب میں نے عنانِ حکومت سنبھالی تو ٹکو صاحب کی بحیثیت منصف تقرری کی گئی تھی۔ وہ ترقی کرتے کرتے اب سیشن جج ہو گئے تھے۔ اور انہی کے سامنے ہم ملزموں کی حیثیت سے پیش ہو رہے تھے۔ دُنیا کے بھی کیا نیارے رنگ ہیں۔ بہرحال ایک جج کی حیثیت سے ٹکو صاحب کی شہرت اچھی تھی۔ ہم نے اپنا دفاع شروع ہی کیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات نے ایک زبردست پلٹا کھایا۔ ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے لگاتے ہوئے ہندوستانی حکمران اپنے گلے خشک کرتے آئے تھے۔ لیکن اچانک چین کے ساتھ ان کی لداخ اور نیفا کی سرحدوں پر ایسی ٹھن گئی کہ فوج کشی کی نوبت آگئی۔ چین نے تبت اور سنکیانگ کے صوبوں کو ملانے کے لیے لداخ کے اقصائے چین علاقے سے ایک شاہراہ چوری چھپے تعمیر کر لی تھی۔ اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے علاقوں میں گھس آئے تھے۔ لڑائی ہوئی تو ہندوستان کو زبردست پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اور اسے اپنے علاقے میں اندر تک دھکیل دیا گیا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کی بڑی تعداد کو چینیوں نے جنگی قیدی بنا لیا اور ان کے کثیر سامانِ حرب پر قبضہ کر لیا۔ نیفا میں چین کی پیش قدمی ایسی تیزی سے ہوئی کہ ایک وقت ہندوستان نے آسام کو خالی کرنے کا منصوبہ بنایا اور کلکتہ کو غیر محفوظ سمجھا جانے لگا۔ ہندوستان چونکہ پاکستان کو اپنا پہلے نمبر کا دشمن سمجھتا تھا،

اس لیے اس کی بہت سی بہترین فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر تعینات تھیں ہندوستان کو کھٹکا تھا کہ اگر اس نے ان فوجوں کو وہاں سے ہٹا کر چینی سرحدوں پر جھونک دیا تو کہیں پاکستان کشمیر پر حملہ آور نہ ہو۔ اس لیے نہرو نے بڑی پریشانی میں امریکہ سے استدعا کی کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے اور اس سے یہ یقین دہانی حاصل کرے کہ وہ ہند چینی جنگ کے دوران کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائے گا جس سے ہندوستان کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ قدرت کے کام بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نہرو کو شمال سے آنے والے خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خبردار کیا تھا اور اس خطرے کے تدارک کے لیے ہندوستان و پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی تھی اس کا جواب نہرو نے بڑے غرور کے ساتھ دیا تھا کہ "مشترکہ دفاع کس کے خلاف؟" انھیں چین کے ساتھ اپنی دوستی پر اتنا گھمنڈ تھا کہ وہ پاکستان کے صدر کی اس تجویز کو خاطر میں ہی نہ لائے۔ لیکن اب وہی ہندوستان امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں میری جواہر لال سے ایک لمبی گفتگو ہوئی۔ کرشنا مینن پر ان کا کافی اعتبار تھا۔ اور وہ ان کو بیرونی ملکوں کے دوروں پر روانہ کرتے رہتے تھے۔ کرشنا مینن خود ایک کمیونسٹ کارڈ ہولڈر تھے۔ اس لیے ان کو بڑے طمطراق سے کہتے تھے کہ دنیا میں ہندوستان کا صرف ایک دشمن باقی رہا ہے اور وہ ہے پاکستان۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کو شکایت تھی کہ پاکستان چین کے ساتھ کیوں گٹھ جوڑ کر رہا ہے؟ میں نے اپنی بات چیت میں پنڈت جی کے سامنے یہی سوال چھیڑ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان ایشیا میں ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے اردگرد جتنے بھی ملک ہیں وہ اس سے چھوٹے ہیں۔

اس لیے ان کو یہ خطرہ ہمیشہ دامن گیر رہے گا کہ کہیں ہندوستان کی بڑی مچھلی کسی وقت اُن کو نگل نہ جائے۔ اس لیے اگر ہندوستان یہ چاہتا ہے کہ یہ ہمسایہ ممالک اُس کے ساتھ دوستی کے بندھن میں بندھے رہیں تو اُس کے لیے بس ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان اُن کو اپنے قول و فعل سے یہ وثوق دِلاتا رہے کہ ہندوستان کو اُن کی آزادی چھین لینے سے نہیں بلکہ اس آزادی کو مضبوط کرنے سے دلچسپی ہے اور اِس غرض کے لیے وہ اُن کی اِمداد کرنے کو بھی تیار ہے۔ تبھی یہ ممالک ہندوستان کے سچے دوست بن سکیں گے۔ اور اِس کے اِردگرد گھومتے رہیں گے۔ لیکن اِس کے برعکس اگر ہندوستان نے "بڑے بھائی" کے دم خم اِختیار کر لیے اور وہ ہر وقت اُن کے معاملات میں جائز و ناجائز طور پر ٹانگ اڑاتا رہا تو ان کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے اور وہ ایشیا کی ایک اور عظیم طاقت چین کی گود میں پہنچ جائیں گے۔ اگر جواہر لال کا نمائندہ اور معتمد ترین ساتھی بار بار یہ اعلان کرتا پھرے کہ اُس کا دنیا میں صرف پاکستان دشمن ہے تو پاکستان کی نظریں بھی اپنے سہارے کے لیے کسی اور طاقت کی طرف اُٹھتی رہیں گی۔ اور وہ طاقت یا تو چین ہو گا یا امریکہ۔ میں نے پنڈت جی کو یہ چیتاونی بھی دی کہ ہندوستان دُنیا کے تمام ممالک سے جن میں چین ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، دوستی بڑھانا چاہتا ہے لیکن اِس دوستی کے اظہار میں ہمیں ایک توازن قائم رکھنا چاہیے۔ ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے کی رٹ لگوا کر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف ممالک میں دوستی باہمی مفاد کی بُنیاد پر اُستوار ہوتی ہے۔ لیکن چین اور ہند کے درمیان حالات کا جو تناظر ہے اُس کے مطابق تصادم کے اِمکانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک لمبی سرحد ہے جو کئی علاقوں میں غیر متعین اور غیر واضح ہے۔ ہندوستان اور چین

کی تجارتی منڈیاں مشترک ہیں۔ بلکہ چین پُرانے زمانے میں اُن پر قابض بھی رہ چکا ہے۔ اور وہاں چینیوں کی بڑی بڑی آبادیاں اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً ملائشیا، انڈونیشیا بلکہ سارا جنوب مشرقی ایشیا اس کی مثال ہے۔ چین کو کبھی یہ گوارا نہ ہو گا کہ ہم اُس کی ان مخصوص منڈیوں میں گھس جائیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حالات اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کی دوستی کے پودے کو بڑی احتیاط اور تدبیر سے پروان چڑھایا جانا چاہیے۔ جواہر لال بولے کہ برّاعظم ایشیا کو مغربی سامراج کے اِستحصال سے صرف ہند اور چین کی دوستی ہی بچا سکتی ہے۔ میں نے اس پر اُن سے پوچھا کہ کیا نفسیاتی طور پر چین ہند کو اپنے برابر درجہ دینے پر راضی ہو گا؟ چین تو پرانے کال سے ہی اپنے آپ کو ایک آسمانی حکومت کے روپ میں پیش کرتا آیا ہے وہ اپنی تہذیب کو سب سے قدیم اور عظیم سمجھتا ہے اور باقی دنیا کو نیم وحشی تصور کرتا رہا ہے۔ ایشیا میں تو وہ اپنی بڑائی میں کسی کی شرکت کا بالکل ہی روادار نہیں۔ ان حالات میں ہندوستان کو اپنے اندر اِس قسم کی مقناطیسی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اُس کے اِردگرد کے ممالک اُس کے محور کے گرد گھومیں اور چین کی گود میں نہ جا پڑیں۔ جواہر لال کے مُنہ پر اِس طرح کی کھری کھری کہنا کالے ناگ کو چھیڑنے والا معاملہ تھا۔ لیکن انھوں نے میری باتوں کو صبر و سکون سے سُنا۔ بہرکیف۔ چین نے ہند پر حملہ کیا تو میں نے جموں سپیشل جیل سے جواہر لال کو ایک خط لکھ کر اِن باتوں کی یاد تازہ کرائی اور اِس بات پر زور دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلّقات بڑھانے کی مبذول کریں۔ اور اِن ممالک میں پاکستان کا نام پہلا آتا ہے۔ چین کے حملے نے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی کہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے سے جُدا نہیں رہ سکتے۔

اِن کا دفاع مشترک اور اُن کی اِقتصادیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ اُن کی زبان، ثقافت، رہن سہن اور خون مشترک ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم تنگ نظری کی سطح سے اوپر اُٹھ کر آپس کے اختلافات حل نہیں کر سکتے۔ جواہر لال کو چین کے حملے تک یقین تھا کہ ہند چین دوستی کے بعد پاکستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک کی نہ کوئی مجال ہے اور نہ اہمیت۔ لیکن ہند چین جنگ نے اس نظریے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا۔

پنڈت نہرو کو چین کے حملے نے ہلا کے رکھ دیا۔ اُن کی خارجہ پالیسی کی بُنیاد ہی سرک گئی تھی۔ ہندوستان کا بین الاقوامی وقار ماند پڑ گیا تھا۔ اور اس کی علاقائی سالمیت کے لالے پڑ گئے تھے۔ جواہر لال نے دنیا کے تمام دوست مُلکوں کے نام مدد کے التجا نامے روانہ کیے اور بہت سے مُلکوں میں اپنے خاص ایلچی بھی بھیج دیئے۔ امریکہ سے خاص طور پر فوجی مدد طلب کی گئی اور اُس نے آمنا کہتے ہوئے جدید ترین اسلحہ کی کئی کھیپیں اپنے دیو ہیکل ٹرانسپورٹ طیاروں کے ذریعے رات دن ہندوستان پہنچا دیں۔ اِدھر دوسری طرف، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، امریکہ اور برطانیہ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کو کوئی شرارت کرنے سے باز رکھا۔ پاکستان کشمیر پر نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے بھی اپنا کشکول بڑھا دیا۔ نہرو نے اس مجبوری میں بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ اِتنے میں چین نے اچانک یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ چین نے ہندوستان کے فوجی غرور کا بھرم توڑ کے رکھ دیا تھا اور اب بے مثال فیاضی کا مظاہرہ کر کے اُس کو دُنیا میں اور بھی شرمندہ کر رہا تھا۔ بہر حال اپنے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کو ساکن ہوتے دیکھ کر جواہر لال نے چین کی سانس لی۔ ہندوستان کے سر پہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی۔

جب گند جیل میں چینی حملے کی خبر پہنچی تو ہمیں قدرتی طور پر کافی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ہماری ریاست کی سرزمین پر ہند پاکستان کے علاوہ چین کے پالیے کی بین الاقوامی طاقت کیل کانٹے سے لیس ہو کر معروف جنگ تھی۔ اور ظاہر ہے کہ چین کے خاص حالات اور سیاسی موقف کے پیشِ نظر اب روس اور امریکہ کے لیے بھی اس تنازعہ سے الگ رہنا ممکن نہ تھا۔ قسمت نے ہمیں اس اہم اور نازک گھڑی میں جیل خانے میں بے بس قیدیوں کی حیثیت سے ڈال رکھا تھا۔ لہٰذا ہم اپنا فریضہ ادا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں جو خیالات تلاطم مچا رہے تھے اُن کو میں نے جواہر لال نہرو کے نام اپنے ۵ر نومبر ۱۹۶۲ء کے خط میں اِس طور پر قلمبند کیا۔

"ہماری شمالی سرحدوں پر اچانک دھماکے کے ساتھ جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اُس سے سارا مُلک ایک گمبھیر حالت سے دو چار ہو گیا ہے۔ اِس موقعہ پر مادرِ وطن کے تمام فرزندوں کو اِس صورتِ حال کی طرف توجہ کرنا ہے اور حالات کو نبھانے اور سُدھارنے کے لیے کمربستہ ہو جانا ہے...... مجھے اندیشہ ہے کہ ہم سبھی نے حالات کی خطرناکی کا پورا اندازہ نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ خطرہ اُس سے کہیں زیادہ مستقل اور پُر آشوب ہے۔ جتنا یہ سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ ہم سب کو قربانیوں اور کٹھنائیوں کے لیے تیار ہونا ہے۔ تاکہ صورتحال میں موجودہ خطرے کا مقابلہ کریں۔ کوئی سرسری نظریہ کوتاہ بینی کا ثبوت اور خودکشی کا باعث بنے گا...... آزادی ناقابلِ تقسیم ہے اور اسے سارے برصغیر کے لیے مشترکہ اور مستقل طور پر محفوظ بنانا ہے اِس لیے ہمیں اختلافات کی وجوہات کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو ہمسایہ ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کو کشیدہ بنائے ہوئے ہیں۔ برصغیر کی گذشتہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے مصائب ہمیشہ ہمارے اندرونی تفرقوں سے پیدا ہوئے۔ یہی تفرقات اور

تنازعات غلط فہمیاں اور غلط اندیشیاں تھیں۔ جن سے حوصلہ پاکر بیرونی حملہ آوروں کو برِصغیر پر حملہ کرنے کی جرأت ہوئی اور بعد میں وہ یہاں کے آقا بن کے رہ گئے۔

..... تقسیم نے یقینی طور پر ہمارے وطن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ایک مصنوعی جغرافیائی دیوار دونوں کے درمیان حائل کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم اس دیوار کو دونوں کے دل اور دماغ کا بٹوارہ کرنے کی اجازت نہ دیں۔ افسوس یہ ہے کہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تقسیم نے ہند اور پاکستان کے درمیان ایسی ہی ذہنی دیواریں حائل کر دی ہیں۔ اس کے پیچھے نفرت اور بے اعتمادی کا غبار پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر اِس مشترکہ مصیبت کا متحدہ طور پر مقابلہ کرنا ہے تو تمام متعلقہ عناصر کو یک جا ہو کر صفیں آراستہ کرنی چاہئیں۔ ہندوستان ایک وسیع اور وشال ملک ہے۔ اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی اِسی لحاظ سے بڑی ہیں۔ ہندوستان کا منصب ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ ممالک میں اعتماد اور بھروسے کی لہر پیدا کرے۔ اُسے اگر اس سلسلے میں پہل بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ آزادی اور عزت کی مشترکہ میراث بچ جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان ایسا کر سکتا ہے اور اس کے ہمسایہ ملک بھی خندہ پیشانی سے اِس کی دوستی کا ہاتھ تھام لیں گے۔"

سپیشل جیل میں اب ہم نے گھر کا سا ماحول قائم کر دیا تھا۔ حکومت اگرچہ روپیہ پانی کی طرح بہا کر ہمیں مجرم ثابت کرنا چاہتی تھی لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے گواہوں پر جاری دُھواں دار جرح نے مقدمے کے بخیے اُدھیڑ دیئے تھے۔ خود مستغیث علے کے چہروں پر بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور اُن کے ماتھے پر ناکامی کی لکیریں جلی قلم سے تحریر نظر آ رہی تھیں۔

جیل میں دن گذارنے کے لیے ہم نے اپنا ایک داخلی نظامِ حیات سا ترتیب دیا تھا۔ مختلف امور کے لیے کمیٹیاں مقرر کی گئی تھیں۔ مثلاً لنگر کمیٹی۔ اِس کا کام خورد و نوش کی اشیا منگوانا، اُن کو چیک کرنا، کھانا پکانے کی نگرانی کرنا، ساتھیوں کے سامنے روزمرہ کھانے کا مینو پیش کر کے اُن کی پسند و ناپسند کی روشنی میں اُس کی مناسب ترمیم و اصلاح کرنا وغیرہ شامل تھا۔ یہ تین افراد پر مشتمل ہوتی۔ اور مہینہ کے بعد اپنی جانشین کمیٹی کو چارج دیتی۔ ڈیفنس کمیٹی۔ اس کا کام مقدمہ کے کاغذات کا مطالعہ اور اُن کی پیروی کرنا ہوتا۔ وکیلوں سے مشورے اور گواہوں کے بیانات کے متضاد اور کمزور پہلو نکالنا بھی اِس کے فرائض میں شامل تھا۔ اِطلاعات کمیٹی کا کام اخبارات جیل والوں سے حاصل کر کے انھیں جیل کے رُفقا میں تقسیم کرنا ہوتا۔ یہ ریڈیو کی خبریں سُن کر اُن کے متعلق بھی ہمیں آگاہ کرتی۔ طبی کمیٹی کا کام روزانہ ساتھیوں کی صحت کے متعلق پوچھ گچھ کرنا، دوا دارو کا انتظام کرنا اور بیمار ساتھیوں کی غذا کے متعلق لنگر کمیٹی کو اطلاع دینا ہوتا۔ اِس کے علاوہ جیل کے باغ کی ترتیب و تہذیب کے لیے تمام ساتھیوں کی ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ نماز کے اہتمام کے لیے پیر عبدالغنی اور مستری نذیر کو اذان اور دوسرے واجبات کی ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ صبح سویرے ہم اذان کی آواز پر اُٹھتے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو جاتے جسے مسجد کے طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ باہر نور کی ندیاں آہستہ آہستہ رات کی ظلمت کو دھونے لگتیں اور اندر میری امامت میں نماز شروع ہو جاتی۔ میں قرأت اپنی پُرسوز آواز میں کرنے لگتا تو کبھی کبھی کچھ اصحاب پر رقت طاری ہو جاتی اور ان کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔ پھر ہم اِنھی مقدس کلمات اور اوراد و اذکار پڑھتے۔ تو عجیب سرور و حضور کا عالم پیدا ہو جاتا اور ہمارے دل جیسے پاکیزگی کے چشموں میں نہا لیتے۔ اس سکون و طمانیت کی لذت بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر کلامِ مجید کی تلاوت

کرتے اور اپنی روحوں کو اس سرچشمۂ عرفان کی کرنوں سے منوّر اور معطّر کرتے۔ اس کے بعد میں اپنے ہاتھ میں کدال لے کر صحن کی پتھریلی زمین میں پھول کھلانے کے لیے مصروف ہو جاتا۔ باغبانی میرا محبوب مشغلہ ہے اور مجھے لق و دق زمینوں کو نرم کر کے اُن میں رنگ اور نکہت آراستہ کرنے میں ایک عجیب لُطف آتا ہے چنانچہ جموں جیل کی محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیابان ایک مہکتے اور چہکتے گلستان میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف پھولوں کے تختے، سبزے کی روشیں اور کلیوں کے چمن لہرا رہے تھے۔ سرو و شمشاد کے پاسبان اس چمن کی نگہبانی کرتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اور گلابوں کے رنگ برنگے پھول شاخِ گُل پر کسی مست شباب کی طرح لہکتے رہتے۔ اور تو اور ہم نے جموں کی سنگلاخ سرزمین پر چنار اُگانے کا تجربہ بھی کیا اور یہ نازک مزاج پودا، جو کشمیر کی لطافت آمیز اور نرم و نازک فضاؤں کا ناز پروردہ ہے، جموں کی چٹانوں میں ہماری محنت سے بار آور ہونے لگا چنانچہ آج بھی چنار کے اُن درختوں کو وہاں سرسبز و جوان دیکھا جا سکتا ہے۔ غرض جیل کا گلشن سارے جموں میں مشہور ہو گیا۔ جیل کا احاطہ پھول پتی کے رنگ سے رشکِ گلزار اور اُن کی مہک سے طبلۂ عطار لگتا تھا۔ اکبر کا درباری شاعر فیضی وہاں آتا تو یہ عالم دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتا۔ ع

درین گلشن ز جوشِ خندۂ گُل
نمی آید بگوشش آوازِ بلبل

ہم نے جموں میں ہونے والی پھولوں کی نمائش میں جیل کے داروغہ کی معرفت پھولوں کے نمونے بھیجے اور وہاں سے انعامات بھی حاصل کیے۔ جب ہمیں یہ انعامات ملتے تھے تو ہم بچپن کے سے جذبات کا لُطف حاصل کرتے اور خوب چہکتے تھے۔

پھولوں کے علاوہ ہم نے سبزی ترکاریوں کے بیج بھی کشمیر بلکہ بیرونی ممالک سے منگوائے۔ احاطے کو ہموار کرنے اور اس کو چمن زار بنانے میں خوب لُطف آتا تھا۔ میر غلام رسول جو ریاست کے چیف انجینئر رہ چکے تھے اپنے کاندھوں پر مٹی کے ٹوکرے اُٹھائے نظر آتے۔ اور ہمارا ہاتھ بٹاتے۔ شاید اُن کو پہلی بار زندگی میں یہ معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا کہ مزدوروں پر اس قسم کی مشقت کرتے ہوئے کیا گذرتی ہے۔ جلد ہی جیل کے صحن میں کشمیری ساگ کے پتّے، ٹماٹر، مٹر، پالک، پودینہ، دھنیا اور بینگن بافراط اُگنے لگے۔ بعد میں ہم اپنے باغ کی سبزیاں شوق سے کھاتے تھے اور اُن میں ہمیں جو لذّت حاصل ہوتی وہ ٹکوں کے عوض حاصل کی گئی سبزی باجی میں کہاں! جموں کے لوگوں میں باغبانی اور پھول اُگانے کا کم ہی شوق ہے لیکن ہماری کوششوں سے وہاں اُس طرف کچھ توجہ ہونے لگی۔

ہم جیل میں کھیل کود کے انتظام میں بھی لگے رہے۔ چنانچہ وہاں بیڈمنٹن باقاعدگی کے ساتھ کھیلی جاتی تھی۔ لیکن جب میری ٹانگ کا پٹھا کھنچ جانے سے ٹوٹ گیا تو میں اِس کھیل میں حصہ نہ لے سکا۔ اُن ہی دنوں مجھے پٹھوں اور ٹانگوں میں تکلیف کی شکایت رہنے لگی۔ میں نے فوراً اپنی غذا میں کمی کر لی۔ یہاں تک کہ میں نے چاول اور چپاتی تک کھانا ترک کر دیا۔ بہت جلد میرا وزن گھٹ گیا اور مجھے افاقہ محسوس ہونے لگا۔

عیدین پر جیل میں خاص اہتمام ہوتا۔ ہم لوگ بال بچوں سے دور، قوم سے مہجور، جیل کی سلاخوں کے پیچھے یہ دن مناتے۔ دلوں میں جذبات کا طوفان اُمڈ آتا۔ لیکن کسی کے چہرے بشرے پر مایوسی نظر نہ آتی۔ اور سبھی جذبات کے سیلاب پر صبر و ضبط کے بند باندھے رہتے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں عیدین کے لیے سرینگر سے وازہ وان منگوانے کا انتظام کروا لیتا لیکن ایسا نہ ہو سکتا۔ تو ہم جیل میں بھیڑ منگوا کر اُسے ذبح کروا لیتے

اور تازہ گوشت حاصل کر کے خود وازہ وان کے تمام سالن بنا لیتے۔ مجھے پکوان بنانے کا کچھ تجربہ ہے اور میں اُس دن خود باورچی خانہ کا اِنتظام سنبھال لیتا۔ خاص طور پر گوشتابہ تیار کرنے میں کافی محنت درکار ہوتی۔ کشمیر کا آب گوشت شیرِ خام میں چربی والے گوشت کو پکانے سے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب ہم آب گوشت تیار کر رہے تھے تو خواجہ علی شاہ تشریف لائے اُن کو وازہ وان کھانے کا خوب تجربہ ہے۔ وہ بولے کہ کشمیری آشپاز اس میں تھوڑی سی چینی بھی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے کہنے پر جب اُس کے شوربے میں چینی ڈالی گئی تو بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ ہم آب گوشت کے بدلے کھانڈ میں تیار کیے گئے قہوے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ عید کے دن ہم بڑے اہتمام سے ڈائننگ ہال میں ضیافتیں سجاتے اور کھانا کھاتے۔ افسرانِ جیل کو مدعو کرتے۔ قیدیوں میں کھانا تقسیم کرتے اور طعام کے بعد شعر و شاعری، لطیفوں اور قہقہوں کا دور چلتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں جیل کے سبزہ زار میں باغبانی میں مصروف تھا کہ انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر مہرو آ گئے۔ مہرو صاحب کو بخشی غلام محمد نے خوب سر چڑھا رکھا تھا اور مقدمہ سازش کی وجہ سے ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔ اس لاڈ پیار سے اُن کا دِماغ آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ اور وہ اپنی اوقات بھول کر غیر متعلقہ معاملات میں ٹانگ اڑانے لگتے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ ”شیخ صاحب کتنا اچھا ہوتا کہ آپ جواہر لال نہرو کے ساتھ مصالحت کرتے۔“ میں نے مسکرا کر مگر مضبوطی کے ساتھ جواب دیا، کہ آپ ملازم سرکار ہیں اپنا کام کیجیے اور اپنی تنخواہ حاصل کیجیے۔ سیاسیات کے بکھیڑے میں اُلجھنے سے باز رہیے۔ لیکن مہرو کے سر پہ بھوت سوار تھا۔ بھلا نرم باتوں سے کیا اُترتا۔ لگا اصرار کرنے۔ اس پر مجھے تاؤ آ گیا اور میں نے اُنھیں ایسا ڈانٹا کہ وہ میرے سامنے سے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ

اور آئندہ احتیاط کا دامن تھامے رہے۔

کبھی کبھی جیل کے اندر رفیقوں میں معمولی باتوں پر رنجشیں واقع ہوتیں اور معاملہ رُوٹھنے منانے تک آ جاتا۔ یہ رنجشیں تاش کے پتّوں، کھانے پینے کی چیزوں وغیرہ پر بھی ہوتیں۔ دراصل جیل میں آدمی کی نگاہ محدود ہو جاتی ہے۔ اُس کی طبیعت میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ انسان کے دل کی عجیب کیفیت ہے بلندیوں کی طرف مائل پرواز ہو تو احسن تقویم اور پستیوں کی طرف لڑھکنا شروع کر دے تو اسفل السافلین۔ جگر نے کیا خوب کہا ہے ؎

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے اِنسان
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

عدالت کے کمرہ میں بھی مقدمے کا سوانگ جاری تھا۔ اب اس کی تمام سنجیدگی زائل ہو چکی تھی اور یہ ایک ڈھونگ بن کر رہ گیا تھا۔ میں کورٹ کی کارروائی کے دوران اکثر کوئی کتاب یا اخبار لے کر مطالعہ میں مصروف رہتا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز لیکن جب عدالت میں استغاثہ کی طرف سے کوئی برداشت سے باہر نامعقولیت کا مظاہرہ سامنے آ جاتا تو میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتا اور کہہ اُٹھتا کہ ”ہمارے نزدیک اس کارروائی کی حقیقت ایک ناٹک سے زیادہ نہیں ہے۔ جو دہلی کے مشورے پر یہاں کھیلا جا رہا ہے۔“ اس پر استغاثے کے وکیلوں کو مرچیں لگ جاتیں۔ وہ خوب شور و غوغا کرتے۔ لیکن بعد میں خود اپنے ہی اُبلتے ہوئے خون میں تل بھن کے رہ جاتے۔

کبھی کبھی کوئی گواہ ایسی بے پر کی سُناتا کہ میں اس پر طیش میں آ جاتا۔ مجھے قانونی موشگافیوں سے کم ہی دلچسپی رہی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں گواہوں پر جرح کرتا۔ اُن کی حالت ایسی غیر ہو جاتی کہ وہ ساری پڑھائی ہوئی پٹی بھول جاتے اور لشتم پشتم

بکنے لگے۔

۵/ دسمبر کو ہر سال میرے رفقاء جیل میں میری سالگرہ خوب دھوم دھام سے مناتے۔ میں اگرچہ اس دن کچھ جذباتی سا ہو جاتا تھا مگر یہ تقریب عید کی سی تقریب میں تبدیل ہو جاتی۔ کئی مرتبہ تو رفیقوں پر ایسی حالت طاری ہو جاتی کہ وہ آنسو بہانے لگتے میں انھیں دلاسا دیتا اور کہتا کہ یہ آزمائشیں راہِ حق میں اِستقلال کا اِنعام ہوتی ہیں اور اِبھی سے ہماری قوم کی جبین پر روشن مستقبل کی تحریر آجانے کے حروف میں رقم ہو رہی ہے۔

ہم جموں جیل میں ہی تھے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے بمبئی میں اِنتقال کی خبر آئی۔ اُن کی وصیت کے مطابق اُن کی استھیاں جموں کے شہر پر ہوائی جہاز کے ذریعے بکھیر دی گئیں۔ شاید وصیت کرتے وقت مہاراجہ کو یاد نہیں رہا کہ اُن کے خاندان اور خود انھوں نے کشمیر پر ایک سو سال ٹھاٹھ سے حکومت کی تھی۔ یہاں کے نظاروں کا خوب لُطف اُٹھایا تھا اور یہاں کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ استھیوں کے معاملے میں بھی انھوں نے اپنی جانبداری دکھائی۔ مجھے اس موقعے پر کشمیر کے عظیم حکمران زین العابدین کی یاد آگئی۔ زین العابدین کے نِکاح میں جموں کے راجہ کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے آگئی تھیں۔ جب یہ رانیاں دسہرہ کا تہوار مناتیں تو سلطان کے ماتھے پر تلک لگانے کی خواہش کرتیں۔ اگرچہ سلطان شرع کے پابند بڑے پاکباز مسلمان تھے۔ لیکن وہ مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں بڑی خندہ پیشانی سے اس مذہبی روایت کی پاسداری کی اِجازت دیتے۔ اس سلسلے میں مجھے زین العابدین کے کردار اور رعیت نوازی کی ایک اور مثال یاد آرہی ہے۔ وہ جھیل وُلر کے درمیان بنے ہوئے مصنوعی جزیرے "زینہ دیپ" میں مقیم تھا کہ اسے

دور دامنِ کوہ میں ایک پالکی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے اپنے کسی درباری سے پوچھا کہ یہ کس ماتا کی سواری ہے؟ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ یہ راجوری کے راجا کی، جو ایک ہندو تھا، بیٹی ہے۔ جسے اُس نے خیرسگالی کے طور بادشاہ کے حرم میں داخل کرنے کے لیے بھیجا ہے لیکن بادشاہ نے اُس کو اپنی منکوحہ بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نادانستگی میں ہی سہی اِس کو ماتا کہہ چکا ہوں۔ اب اس کے ساتھ شادی اخلاق سے بعید ہوگی۔ چنانچہ اس کو پوری تعظیم کے ساتھ انعام و اکرام دے کر واپس بھیج دیا گیا، اور اس طرح اخلاقی بلندی کی ایک مثال چھوڑ دی۔ بہر حال ہم نے جموں جیل میں مناسب الفاظ میں اظہارِ غم کیا۔ میں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آنجہانی مہاراجہ سے ہم ڈٹ کر لڑے تھے۔ لیکن ان کی طبعی خودداری قابلِ تعریف تھی۔ انھیں جموں و کشمیر کی الگ اور اِنفرادی شخصیت کا احساس تھا۔ اِس کے علاوہ جب وہ ریاست سے باہر چلے گئے تو پھر اُن کے غرور نے واپس آنا برداشت نہ کیا اور نہ وہ کبھی حکومتِ ہند کے حاکموں کے دروازے پر دیکھے گئے۔ البتہ اُن کے یہ اوصاف اُس نِظام کی بھینٹ چڑھ گئے جس کے وہ نمائندے تھے اور جو گل سڑ چکا تھا۔ اُس دن عدالت ہماری تجویز پر کوئی کارروائی کیے بغیر اُٹھ گئی۔

عدالت میں باہر سے ہمارے ملنے والے کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمیں وہاں کاشی ناتھ بامزئی نظر آئے۔ غالباً وہ مجھ سے جواہر لال کی ایما پر کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے دور سے ہی ہاتھ ہلا کر اُن کے سلام کا جواب دے کر بات کو ٹال دیا۔ اسی طرح راجستھان کے ایک لیڈر جے نراتن ویاس مجھ سے ملنے کے لیے آئے وہ میرے پُرانے دوست تھے۔ وہ سٹیٹس پیوپلز کانفرنس میں ہمارے ساتھ کام کر چکے تھے۔ لیکن اب وہ جواہر لال نہرو کی نگاہوں سے گر چکے تھے۔ جس کا ذِکر میں پہلے کہیں

کر چکا ہوں۔ میں شمیم احمد شمیم سے پہلی بار عدالت کے کمرہ میں ملا۔ مجھے یہ نوجوان اپنی رفتار، گفتار اور اطوار کے لحاظ سے آفت کا پرکالہ نظر آیا۔ میں اس کے فصیح اور پُراعتماد لب ولہجہ اور تیزی وطراری پر عش عش کر اٹھا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی کشمیر میں ایسے جگنگ جلگ کرنے والے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں؟ لیکن اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ بعد میں اس کے کردار کا کیف وکم پوری شدّت کے ساتھ سامنے آگیا۔

اِس طرح کئی اور ساتھی اس مقدمے میں دل چسپی لیتے تھے۔ اور اُن سے عدالت کے کمرے میں ہی ملاقات رہتی تھی۔ بلراج پوری ایک ایسے ہی شخص تھے۔ کبھی کبھی کمرۂ عدالت میں کچھ دلچسپ واقعات بھی رونما ہوتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ استغاثے کا ایک گواہ عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ یہ پونچھ کے علاقے کا ایک گوجر تھا جس کو استغاثے کے کسی نقطے پر شہادت دینے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ہم نے اس سے سوال کیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے کس سے تمھیں زیادہ محبت ہے؟ اگرچہ وہ ایک ان پڑھ گوجر تھا لیکن اس نے ایک بڑا برجستہ اور شگفتہ جواب دیا کہ مجھے سب سے زیادہ اپنی بھینس سے محبت ہے۔ اِس پر ساری عدالت قہقہے سے گونج اٹھی۔

اُنھی دنوں کا ایک اور واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میری سالگرہ کے دن مجھے مِسں مردولا سارا بھائی کی طرف سے مبارکباد کا ایک خط موصول ہوا۔ اُنھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم بھیجی تھی۔ نظم میرے حالات اور میری ذہنی کیفیت کی ایسی سچی ترجمانی کرتی تھی کہ میں اس کو پڑھ کر پھڑک اٹھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے خود رابندر ناتھ نے میری رُوح میں بیٹھ کر یہ نظم قلمبند کی ہے۔ شاید یہی وہ شاعرانہ اعجاز ہے جس کی طرف غالب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ؂

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نظم اتنی زوردار اور مستقل افادیت کی حامل ہے کہ میں اس کا اردو ترجمہ درج کرنا ایک خوشگوار فریضہ خیال کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان تھا "اکیلے چلو رے"۔ متن یوں ہے:۔

"اگر تمھاری پکار سننے کے لیے کوئی نہ آئے تو تم اکیلے چلو
اگر تم سے کوئی بات نہ کرے
اگر سب اپنا منہ پھیر کر چلیں
تب بھی راستے کے کانٹوں کو تم اپنے لہولہان پیروں سے روندتے چلو
اگر تمھارے لیے چراغ نہ جلیں
اگر آندھی، برسات اور اندھیری رات میں سب لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیں
تب بھی تم اپنے غم کی آگ سے اپنے دل کو سلگاتے اور سہلاتے ہوئے آگے بڑھو
اور اسے اکیلے ــــ اکیلے ہی روشن رہنے دو۔"

سپیشل جیل میں دن گزرتے گئے۔ میرے رفیق مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا اور اس کے راہنماؤں نے ہماری دوستی کا جو جواب دیا ہے اس کے بعد ہم کیوں اور کس بات کے لیے اپنا رشتہ اس ملک کے ساتھ قائم رکھ سکتے ہیں؟ اُن کا شکوہ ٹھیک تھا اور گلہ بجا۔ مگر میں نے اُن سے کہا کہ ہم نے اپنا رشتہ ہند کے ساتھ آدرشوں کی یکسانیت پر جوڑا ہے اور جب تک ہندوستان ان آدرشوں کی علمبرداری کا دعویٰ کرتا ہے ہماری جگہ کہیں اور نہیں ہے۔ چاہے اُن کا عمل اُن کے قول سے کتنا ہی متضاد کیوں نہ ہو۔ ہم آدرشوں کے لیے جدوجہد

کر سکتے ہیں اور اُن کے لیے فضا سازگار بنا سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کا وجود تو اُن آدرشوں پر قائم ہی نہیں ہوا۔ لہٰذا سوشلزم، سیکولرازم اور جمہوریت کے لیے وہاں گنجائش نہیں۔ ہم نے جو خواب کشمیر میں دیکھے ہیں اُن کا تو پاکستان میں شرمندۂ تعبیر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اِس لیے ہمیں ہندوستان میں ہی رہ کر اپنے آدرشوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی۔

ہمارے ساتھیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کو کسی خاص وجہ کی بنیاد پر تو نہیں البتہ بخشی صاحب کی ناراضگی کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اُن کا قصور صرف یہ تھا۔ بخشی صاحب اُن کو اپنے شیشے میں اُتار نہ سکے تھے۔ ان پر بے انتہا مظالم توڑے گئے۔ اُنھیں پوچھ گچھ (انٹروگیشن) مراکز میں عذاب کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر برداشت کرتے تو کہاں تک؟ اُن کے مزاج میں یہ سختیاں جھیلنے کی صلاحیت واجبی حد تک نہ تھی۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح گلو خلاصی حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگے۔ چنانچہ اُنھوں نے حکومت سے رابطہ قائم کر لیا اور بالآخر رہائی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ نہ صرف کھوئی ہوئی ملازمتوں پر بحال ہو گئے بلکہ بقایاجات کی رقومات بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے اِن ساتھیوں میں جند حوچی، غلام محمد مچکن، میر غلام رسول اور محمد امین آبی گذر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

(غالب)

▲▲▲

۶۱

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کشمیر کے سٹیج پر سازش کیس کا سوانگ رچانے کے لیے مرکز اور بخشی سرکار نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ لیکن تقریباً پانچ سال کا عرصہ گذر جانے اور کوئی ڈھائی کروڑ روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود کیس کی چال اُلٹی پڑ رہی تھی۔ دروغ گو کا حافظہ نہیں ہوتا اور یہ پرانی کہاوت کمرۂ عدالت میں سماعت کے ہر روز دوہری قوت کے ساتھ صحیح ثابت ہوتی جاتی تھی۔ اِستغاثہ نے کذب و افترا کا جو جال بُنا تھا وہ اب تار تار ہوتا جا رہا تھا اور یہ مقدمہ ساری دنیا میں مذاق اور تمسخر کا موضوع بن گیا۔ جس میں خود ہندوستان کی گت بن رہی تھی۔ چنانچہ دُنیا کے اس موڈ کی ترجمانی لندن کے مشہور اخبار "آبزرور" نے اپنی ۱۶ دسمبر ۶۲ء کی اشاعت میں اِس شاہ سُرخی کے تحت شائع ہونے والی خبر میں کی۔

"شیخ عبداللہ پر مقدمہ لیکن کٹہرے میں خود ہندوستان"

SHEIKH ABDULLAH ON TRIAL BUT INDIA IN THE DOCK

جواہر لال سے لاکھ اختلاف ہوں۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ وہ بڑی مشکل میں

تھے۔ بقول راج گوپال آچاریہ وہ اپنے دور کے ہندوستانی سیاست دانوں میں سب سے زیادہ شائستہ اور مہذب تھے۔ چنانچہ وہ اپنی اور اپنے ملک کی شبیہ کی اس دُرگت پر اندر ہی اندر کُڑھتے رہتے۔ وہ بار بار بڑبڑاتے رہتے کہ اس سازش کیس کو تا ٹک ختم کیا جائے۔ لیکن اُن کے ارد گرد بخشی صاحب اور اس کے حواریوں نے اپنے طرفداروں کی ایسی فصیل کھڑی کی تھی کہ وہ صرف پھڑ پھڑا کر رہ جاتے۔ وہ جون اور جولائی ۱۹۶۳ء میں خلافِ معمول کشمیر آئے اور بخشی کو اشاروں اور کنایوں سے اپنے دل کا ماجرا سُنانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن حیلہ سازی اور بہانہ بازی کے پینتروں سے بخشی اُن کی ہر پہل کو مات دیتا رہا۔ جواہر لال قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق بار بار آپے سے باہر ہوتے رہے اور اپنے ضمیر کے کانٹے کی خلش سے بے قرار ہو کر انھوں نے بخشی صاحب کو یہ کہہ کر اختلاج قلب میں مبتلا کر دیا کہ وہ یہاں سے سیدھے جموں جا کر مجھ سے قید میں ملاقات کریں گے۔ بخشی صاحب پھر بھی ٹال مٹول کرتے رہے تو جواہر لال نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ اُن کا پتہ کاٹ دیں گے اب اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک موزوں گھڑی کا انتظار تھا اور بس۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی صحت ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے بعد ہی گرنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنی غلط پالیسیوں کے تباہ کن عواقب دیکھ رہے تھے ان کی خیالی دنیا کا سارا ڈھانچہ مسمار ہو رہا تھا۔ خارجی معاملات میں ہندوستان کا وقار انتہائی پست ہو گیا تھا۔ اور داخلی محاذ پر بھی جواہر لال کی دیوتا جیسی شخصیت کا طلسم ٹوٹتا جا رہا تھا۔ انھوں نے پہلے کرشنا مینن اور جنرل کی۔ این۔ کول کا بلیدان کر کے اس سیلاب کا رُخ موڑنا چاہا لیکن انھیں خود اپنی کابینہ میں اپنے رقیبوں اور حریفوں کے سائے لہراتے ہوئے نظر آنے لگے۔ یہ بے زبان حریف جو اُن کے سامنے

اُن کے عروج میں بھیگی بلی نظر آتے۔ اب اُن کو آنکھیں دکھانے لگے۔ چنانچہ وہ اُن سا تھیوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے جتن کرنے لگے۔ انھوں نے اس سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پھر اپنی چانکیہ نیتی کا پُر کار اور اُستادانہ ہاتھ اس چالاکی سے کھیلا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی سالم رہی۔ کانگریس کی مسمار ہوتی ہوئی عمارت کو پھر سے استادہ کرنے کے لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مرکزی کابینہ کے کچھ سینئر اور بزرگ وزیروں کے علاوہ ریاستوں کے کچھ جغادری وزرائے اعلیٰ کو اپنے سرکاری عہدے ترک کر کے تنظیم کو مضبوط کرنے کے کام میں جُٹ جانا چاہیے۔ مدراس کے کامراج نادار نے، جو اپنی ریاست میں ایک لمبے عرصے تک وزیر اعلیٰ رہنے کے بعد اب شاید اس عہدے سے اُوب سے گئے تھے۔ یہ فارمولا پیش کیا کہ سبھی سینئر کانگریسی جو مرکز یا ریاستوں میں اقتدار کی کرسی پر موجود ہیں۔ اپنے استعفے وزیر اعظم کو پیش کریں۔ اور اس کے بعد اس بات کا فیصلہ وزیر اعظم پر ہی چھوڑ دیا جائے کہ وہ کس کو وزارت کے منصب پر برقرار رہنے کی اجازت دیتے ہیں اور کس کا استعفیٰ منظور کر کے اُسے تنظیمی محاذ پر بھیج دیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس تجویز کو جواہر لال کی ایما پر پیش کیا گیا تھا۔ ورنہ کامراج کی کیا مجال تھی۔ اور بقول جگر کے

چلتا بغیر اذن مری کیا مجال تھی
ورنہ وہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

یہ تجویز کانگریس ہائی کمان کی ایک میٹنگ میں پیش ہوئی۔ جو اگست ۱۹۶۳ء کے اواخر میں ہوئی۔ بخشی غلام محمد بھی اس میں موجود تھے۔ جب سبھی ممبروں نے اپنے استعفے جواہر لال کے ہاتھ میں تھما دیے تو بخشی صاحب سے کیسے نچلا بیٹھا رہا جا سکتا تھا۔ اُن کے مزاج میں ایک جواری کی طرح ہر بیتی BLUFF کا عنصر غالب رہا تھا۔ اور حسنِ اتفاق سے اُن کی کچھ بازیاں سیدھی بھی پڑ گئی تھیں۔ چنانچہ وہ ایک اور داؤ کھیلنے کے

لیے کمربستہ ہو گئے اور ترنگ میں آکر اپنا استعفیٰ جواہر لال کو پیش کر دیا۔ بخشی صاحب کا گمان یہ تھا کہ کشمیر میں انھوں نے مکر و فریب کا پھندا پھیلانے میں مرکزی حکومت کی جو امداد کی ہے اس کے پیش نظر جواہر لال اُن کو مستعفی ہونے کی اجازت نہ دیں گے اور وہ لہو لگا کر مفت میں صفِ شہیداں میں شامل ہو جائیں گے۔ جب جواہر لال نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر اُن سے سوال کیا کہ آپ تو کانگریس کے ممبر نہیں ہیں پھر آپ پر اس فیصلے کا اطلاق کیسے ہو گا تو بخشی صاحب کی باچھیں کھل گئیں کہ جواہر لال پر اُن کا جادو چل گیا ہے چنانچہ انھوں نے بڑے طمطراق سے چار آنے کا ایک چمکتا اور کھنکھناتا ہوا سکہ جیب سے نکال کر یہ کہتے ہوئے ہوا میں اُچھال دیا کہ یہ رکنیت کی فیس ہے اس کو قبول کر کے مجھے کانگریس کا ابتدائی ممبر بنایئے۔ جواہر لال نے ایک مشاق کھلاڑی کی طرح صیاد کو خود اپنے ہی دام میں پھنستے ہوئے دیکھا تو خاموشی سے استعفیٰ وصول کر کے اپنی مسل میں رکھ دیا۔ جب دوسرے دن جواہر لال کے فیصلے کا اعلان ہوا تو ایک سیاسی دھماکے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے مرار جی ڈیسائی، لال بہادر شاستری، جگ جیون رام، کامراج ناڈار، چندر بھان گپتا کے ساتھ ساتھ بخشی غلام محمد کو بھی چلتا کر دیا تھا۔ بخشی غلام محمد نے جواہر لال کا فیصلہ دلی میں سنا اور ہاتھ ملتے رہ گئے۔ دوسرے دن وہ علی الصبح اور اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ سرینگر آئے اور یہاں اپنی سلطنت کا تختہ اُلٹتے دیکھ کر اور بھی حواس باختہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے حامیوں سے جلسے کرائے اور پھر اُن جلسوں میں نعرے لگوائے "پنڈت جی پھر سوچو، استعفیٰ واپس لو" لیکن خلیل خان کے فاختہ اُڑانے کے دن چلے گئے تھے۔ اُن کی دال نہ گل سکی۔ اور وہ وزیر اعظم کے اُس سنگھاسن سے بے آبرو ہو کر محروم کر دیئے گئے جس کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنے محسن سے ہی کیا، اپنی قوم سے بھی دغا کی

تھی۔ انھوں نے یہ حال دیکھا تو مرکزی حکومت کو لکھا کہ انھیں اپنا قلمدان اپنے جانشین کے سپرد کرنے سے پہلے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن جواہر لال بھی گولیاں نہ کھیلے تھے وہ جانتے تھے کہ بخشی یہ سب کچھ اپنی لٹی ہوئی لاج کا کچھ حصہ بچانے کے لیے کر رہا ہے اور یہ ہارے ہوئے جواری کا داؤں ہے۔ انھوں نے اس اقدام کا سہرا اُن کے سر باندھنے سے انکار کر دیا اور انھیں تاریخ کے کٹہرے میں اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔

بخشی غلام محمد کو اقتدار کی جو چاٹ لگی تھی وہ انھیں بار بار کسی نہ کسی روپ میں اس کے ساتھ چمٹے رہنے پر اُکسا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہرو کے منظورِ نظر آلۂ کار اور اپنے پرانے رقیب صادق صاحب کو وزیر اعظم بننے کا موقع نہیں دیا۔ اور اپنے ایک غیر معروف کٹھ پتلی شمس الدین کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ لیکن طاقت کا چسکا ایسا تھا کہ انھوں نے نہ سرینگر اور نہ ہی جموں میں وزیر اعظم کی رہائش گاہ خالی کی بلکہ وہ بدستور ریاست کے پلاننگ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے براجمان رہے۔ نئے وزیر اعظم کو دفتر جانے سے پہلے ضروری کاغذات ایک میر منشی کی طرح اُن کی توجہ میں لانے پڑتے تھے۔ اور بعد میں دفتر پہنچ کر وہ اُن ہی کے زبانی احکامات کے مطابق کاروائی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بخشی صاحب کا دن بھر کا مشغلہ افسروں کو براہ راست فون کر کے غلط سلط سفارشیں کرنا بن گیا۔ چونکہ افسر جانتے تھے کہ اصل اقتدار اُن کے ہی پاس ہے۔ لہٰذا وہ شمس الدین کٹھ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ نیشنل کانفرنس اور اوقافِ اسلامیہ کے سربراہ بھی بنے رہے۔ دوسری طرف ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید بھی سرکاری کام کاج میں برابر دخل اندازی کر رہے تھے اور شمس الدین کی ٹکی انتظامیہ چکی کے اِن دو پاٹوں کے درمیان پستی جا رہی تھی۔

صادق صاحب، ڈی۔پی اور اُن کے ساتھی اِس صورت حال کو کب تک برداشت کرتے اُنھیں معلوم تھا کہ دہلی کا دستِ شفقت اُن کی پیٹھ سہلا رہا ہے اور مرکز شمس الدین سرکار کو ایک ناجائز اولاد کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک قیامت کی چال چلی گئی۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۳ء کی صبح کو کشمیری قوم اِس ہوش ربا خبر سے بھونچکی رہ گئی کہ آثار شریف حضرت بل سے حضور پیغمبر اسلامؐ کے موئے مقدس اپنی قرار گاہ سے غائب پائے گئے ہیں۔ درگاہِ حضرت بل اور اس میں موئے مبارک کے قیام کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ موئے مبارک شیشے کی ایک نلی میں نصب تھے جو چاندی کے ایک ظرف میں پیچھے سے پیوست کیے گئے تھے۔ شیشہ ایک طرف سے تھرمامیٹر کی طرح اِس طرح بنا ہے کہ اُس جانب سے کچھ بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔ البتہ سامنے سے موئے مبارک نظر آ سکتے ہیں۔ یہ صورت ۱۷۰۰ء سے قائم تھی۔ افغانوں کے عہد میں ایک فرعون مزاج صوبیدار آزاد خان نے موئے مقدس کی اِس خاصیت کی کہ یہ آگ کے شعلوں میں بھی محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کی آزمائش کرنا چاہی۔ روایت کے مطابق اُس نے موئے مبارک کو چاندی کے ظرف سے الگ کرنے کے لیے بڑا زور مارا لیکن ناکام رہا۔ البتہ اس کشمکش میں موئے مبارک کے اوپری حصے میں خفیف سا خم آگیا ہے۔ مقدس تبرک کے پائیں میں اسے نمایاں و دیدہ زیب بنانے کے لیے گچھوں کی طرح کے آویزے بنائے گئے ہیں، جنھیں کشمیری زبان میں "غلطی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ دیدار کے وقت زیارت کا مجاور اسی تبرک کو طہارت و تطہیر کے بعد سبز عبا پہن کر مشتاقان دید کے سامنے لاتا ہے۔ اس تبرک کو سبز مخملی غلاف اور اخروٹ کی چوب کاری کے ایک صندوقچے میں رکھ کر زیارت کے بیچوں بیچ واقع ایک بڑے کمرے میں رکھا جاتا ہے، جس کے دروازے پر مضبوط تالے لگائے جاتے

ہیں، چابیاں مجاور کے پاس امانت رہتی ہیں۔

اِس دلدوز واقعہ سے پہلے ۲۰ر دسمبر کو اِس کا دیدار عام درگاہ کے بڑے مجاور مرحوم عبدالرحیم شاہ بانڈے نے کرایا تھا۔ اور ۲۶ر دسمبر کو کسی صاحب اثر و رسوخ کے کہنے پر مجاور مذکور نے ہی اِس کو نجی طور پر موئے مبارک کا دیدار کرایا۔ یہ موسم کشمیر میں سردیوں کے نقطۂ عروج یعنی چلۂ کلان کا زمانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اطلاعات کے مطابق اس رات عشا کی نماز کے بعد زیارت میں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ صبح دم جب رحیم شاہ زیارت میں پہنچا تو وہاں یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ دروازے کا تالا توڑ دیا گیا ہے اور اُس چوبی صندوقچے کو جس میں موئے مبارک رکھے ہوئے تھے، کھلا چھوڑ دیا گیا ہے لیکن اس صدف کے بطن میں جس مقدس شے کا گوہر آبدار چمکتا تھا وہ غائب کر لی گئی ہے۔ بس پھر کیا تھا یہ خبر ایک صاعقے کی طرح بجلی اور جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ وادی میں برف باری ہو رہی تھی۔ لیکن اس وحشت ناک اطلاع نے دلوں میں جذبات کے الاؤ روشن کر دیے۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ زن و مرد، پیر و جوان، گریاں اور نوحہ کناں سڑکوں پر اُمڈ آئے۔ چلۂ کلان کی زمہریری ہوائیں عقیدت کے شعلوں کو بجھانے کی بجائے اُنھیں اور بھڑکانے لگیں۔ ساری وادی میں کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ احتجاجی اور ماتمی مظاہروں کا بے نظیر سلسلہ شروع ہوا۔ حکومت عضو معطل بن کر رہ گئی۔ عوام کے قہر و غضب کے سامنے دس سال کا وہ استبدادی نظام تھر تھر کانپنے لگا۔ جس کو نئی دہلی نے فولادی ہتھیاروں اور سونے کی چمک دمک سے اپنی دانست میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ شمس الدین اور اس کے سارے حواری موالی اپنی سرکاری کوٹھیوں میں بے بس قیدیوں کی طرح محبوس ہو گئے۔ عوام کا ایک عظیم جلوس جب مظاہرے کرتا

ہوا لال چوک پہنچا تو بخشی دور کا سامراج پہلوان بخشی رشید ایک جیپ میں فرّانے بھرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو، وہ عقل کا اندھا تو تھا ہی۔ نہ مجمع کے تیور پہچان سکا اور نہ تقدیر کی منطق بھانپ سکا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ اس عوامی سمندر کی غضب ناک لہر ہے جس کے خروش کے سامنے بڑے بڑے فرعون و ہامان تنکوں کی طرح ایسے بہہ گئے ہیں کہ پھر تواریخ کی غلام گردشوں میں اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہ سکا ہے۔ اِس نے اپنی بھونڈی آواز سے کچھ جتلانے کی کوشش کی کہ مجمع میں سے ایک آتش بار کانگڑی حضرت داؤد کے چھینکے کی طرح پر کھولتی ہوئی آئی اور بخشی رشید کے جالوت نما وجود کے ساتھ ہی اُس سارے طاغوتی نظام کے لیے پیغام اجل بن کر گری جس کی بنیاد ۱۹۵۳ء کے جانباز اور جاں نثار شہیدوں کی جوان قبروں پر رکھی گئی تھی۔ بقولِ شاعر ؎

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب

عبدالرشید بخشی جو ظلم کا ایک قطب مینار نظر آ رہا تھا اِس لہر میں ایسا ڈوبا کہ پھر اُس کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا۔ عوام کا بپھرا ہوا ہاتھی چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے بخشی برادران جنھیں عوام طنزاً بی۔ بی۔ سی (بخشی برادرس کارپوریشن) کہہ کر پکارتے تھے کے وہ سینما ہال اور ہوٹل نذرِ آتش کر دیئے، جن کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی قومی وفاداری اور ذاتی دیانت کا نیلام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خشمناک عوام نے ریڈیو کشمیر سرینگر کا وہ جھوٹ گھر بھی نذرِ آتش کر دیا جہاں سے مرکزی سرکار اور بخشی انتظامیہ نے کشمیری عوام اور اُس کی قیادت کے خلاف کردار کشی اور بہتان تراشی کا زہر دس سال تک اُگلا تھا۔

وادی کے اِن تلاطم خیز واقعات سے دِلّی کے ایوانوں میں ہولناک زلزلہ آ گیا اور خوابِ خرگوش میں مست دِلّی کے حکمران جو بخشی کی پالی ہوئی حرص و ہوس کی قیمتوں

کے اشارے پینک میں تھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ خبر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی اور دنیا بھر کے نشریاتی اور اطلاعاتی اداروں نے اِسے خوب تشہیر دی۔ نہرو حالات کی کروٹ سے گھبرا گئے۔ انھوں نے خود ریڈیو سے کشمیری عوام کے نام بڑی نپی تلی دار اپیل نشر کروائی۔ لیکن جو دریا جھوم کر اُٹھتے ہیں وہ تنکوں سے کہاں ٹالے جا سکتے ہیں۔ بدحواسی میں نہرو نے پھر بخشی کو جو دہلی کے ایوانوں میں ہی کاسۂ گدائی لے کر مارا مارا پھر رہا تھا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق سرینگر حالات پر قابو پانے کے لیے بھیجا۔ بخشی صاحب سرینگر آئے۔ اور ریڈیو پر تیس مار خانی بگھارنے لگے۔ لیکن جونہی عوام کو اُن کی آمد کی اطلاع ملی اُن کی رہائش گاہ پر دھاوا بول دیا گیا جس کو بچانے کے لیے پولیس اور فوج نے اُن کی کوٹھی کے عین سامنے کتنے ہی سرفروشوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ لیکن اس کے بعد بخشی کو عوام کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ بھی ہندوستانی سنگینوں کے سائے میں اپنی رہائش گاہ میں ایک قیدی کی طرح اسیر ہو کر رہ گئے۔

نہرو نے آگ کے شعلوں کو فرو کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر آزمائی۔ ایک مرحلے پر مرکز سے پولیس، فوج اور پروپگنڈا کے بڑے بڑے سرغنوں پر مشتمل ایک بھاری ٹاسک فورس سرینگر اس غرض کے لیے روانہ کیا گیا کہ وہاں شمس الدین کی کٹھ پتلی حکومت کا رسمی طور پر انتم سنسکار کرنے کے بعد گورنری راج قائم کیا جائے۔ لیکن عین وقت پر مصلحت آڑے آ گئی۔ اُس وقت کرن سنگھ کشمیر کا صدرِ ریاست تھا۔ ہندوستان نے اگست ۱۹۵۳ء میں آئین اور قانون کی بلادریغ عصمت لوٹ ہی لی تھی لہٰذا آئینی نزاکتوں کو بالائے طاق رکھنے میں اُسے کوئی گُریز نہ تھا۔ لیکن یہ بات کہ انتظام کی باگ ڈور براہِ راست ریاست کے اُس مہاراجے کے ولی عہد کے ہاتھ میں دی جائے جسے

کشمیری عوام کی بے مثال قربانیوں نے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا' میکاولی سیاست کے علمبرداروں کے حسبِ منشا نہ تھی۔ کیونکہ اس طرح سے ایک طرف تو دنیا میں یہ کھلا تاثر قائم ہوتا کہ موئے مبارک کو کرن سنگھ کی گدی بحال کرنے کے لیے غائب کرایا گیا ہے۔ اور دوسری طرف جالکیہ نیتی کو اپنے چہرے سے نقاب ہٹا کر پردۂ مجاز میں سامنے آجانا پڑتا۔ بھلا اگر پردے کے پیچھے رہ کر اس سے زیادہ گھناونی چالیں کھیلی جا سکتی ہوں تو اپنے سر الزام لینے کی کیا تک ہے؟ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۴ فروری ۱۹۶۴ء کو اچانک ریڈیو سرینگر سے اعلان کیا گیا کہ موئے مبارک کی بازیافت ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات اُس وقت تو کیا' آج تک عام نہیں کی گئی ہیں۔ یہ کس نے غائب کیے تھے اور پھر کیسے اچانک واپس مل گئے' یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ایک وقت پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا کہ سازش کا سراغ لگا لیا گیا ہے اور چند لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں اُنھیں پھر رہا کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ سارے معاملے کو خاموشی کی ایک سازش کا کفن پہنا کر دفن کر دیا گیا۔ اُدھر سوویت یونین نے اپنی تان لگائی کہ یہ امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے۔ کی کارستانی ہے اور ہندوستان کے بہت سے حلقوں نے اس کا رشتہ پاکستان کی تخریب پسندی سے جوڑا۔ بعض حلقوں نے اس کا اصلی مجرم بخشی غلام محمد اور اُس کے خاندان کو قرار دیا۔ اور اس کی یہ تاویل پیش کی کہ وہ اقتدار سے محروم ہو کر بے حد بوکھلا گیا تھا۔ وہ حالات کو اس قدر بگاڑنا چاہتا تھا کہ بگڑی کو بنانے کے لیے نہرو اُس کو وزارتِ عظمیٰ کا پروانہ عطا کرے اور اُسے معلوم تھا کہ اِس قسم کا ہنگامہ موئے مبارک جیسی جذبات انگیز شے کو چھیڑ کر ہی بپا کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور حلقے اِس واردات کے پیچھے صادق' ڈی۔ پی۔ در اور ان کے اشتراکی ٹولے کی شاطرانہ چال کارفرما دیکھتے ہیں۔ اِن حلقوں کے

اِستدلال کے مطابق صادق اور اُن کے حواری سیاسی صحرا نوردی میں مبتلا ہونے کے بعد سخت سراسیمہ ہو گئے تھے۔ وہ سینہ کوٹ رہے تھے کہ دِلّی کی آشیرواد کے باوجود اور بخشی غلام محمد کے سیاسی بن باس کے باوصف وہ بدقسمتی کے مجذوبی رہے اور اقتدار کی گلفام حسینہ سے دور و مہجور رہے۔ چونکہ وہ مذہب نام کی کسی شے کے شیفتہ نہیں تھے۔ اُنھیں موئے مبارک سے کوئی جذباتی وابستگی یا دلبستگی نہ تھی۔ اِس لیے اُنھوں نے اس کی حرمت و تقدس سے آنکھ چرا کر اپنا داؤ لگا لیا۔ الغرض بھانت بھانت کی بولیوں میں یہ معاملہ اور بھی زیادہ اُلجھ گیا۔ بقولِ شاعرؔ

شد پریشان خواب من از کثرتِ تعبیر من

کشمیر کے سوال کے لاینحل ہیں یہ عقدہ بے حد پُر اسرار ہے اور اب تک راز سربستہ ہی رہا ہے۔ اگرچہ بھولا ناتھ ملک نے جو اُس وقت مرکزی محکمۂ جاسوسی کے ڈائریکٹر تھے اور کشمیر میں اس معاملے میں تفتیش میں خود سرگرم تھے' اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ اُن کو اس راز کا علم ہے۔ لیکن یہ مرتے دم تک اُن کے دل میں ہی مدفون رہے گا۔ کون جانے یہ مجذوب کی بڑ ہے یا کسی خوفناک حقیقت کو چھپانے کی چال۔

موئے مبارک کی اِس طوفان خیز تحریک نے جواہر لال نہرو کے پہلے سے ہی تنے ہوئے اعصاب کا بُرا حال کر دیا۔ کشمیر کے معاملے میں اُنھوں نے جو قلابازی ۱۹۵۳ء میں کھائی تھی اُس کا احساسِ گناہ اُنھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ ضمیر کے کانٹے کی یہ چبھن موئے مقدس کی ایجی ٹیشن نے اور زیادہ تیز اور نوکیلی بنا دی کیونکہ اُن کے بیدار شعور کو اِس جھٹکے نے یہ سمجھا دیا تھا کہ کشمیر میں اُن کا ہر قدم غلط پڑا ہے اور اُنھیں رہزنوں اور چاپلوسوں نے لوٹ لیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس ہیجان کی تہہ میں مذہبی عقیدت مندی کے جذبات تو ہیں ہی لیکن اس کے پیچھے سیاسی نا آسودگی کی

وہ جوالا بھی دہک رہی ہے جو ۱۹۵۳ء کے بعد روشن ہوگئی تھی۔ چنانچہ بی۔ این۔ ملک خود بیان کرتا ہے کہ اُن دنوں جواہر لال کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کشمیر کے تازہ ترین واقعات سے انھیں دن میں چار مرتبہ سرینگر سے براہِ راست مطلع کیا جاتا تھا اور انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر اس سلسلے میں انھیں رات کو گہری نیند سے بھی جگانا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ نہرو اُن دنوں اکثر اداس رہتے اور خود اپنے ہی آپ سے بڑبڑاتے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ۴ جنوری ۱۹۶۴ء کو موئے مبارک کی بازیافت کا اعلان ہونے کے صرف ایک دن بعد یعنی ۵ جنوری ۱۹۶۴ء کو جبکہ وہ بھوبنیشور اڑیسہ میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اُن پر دماغ کے فالج کا پہلا حملہ ہوا اور پھر نہرو کبھی پوری طرح تندرست نہ ہو سکے۔ کشمیر اور موئے مبارک نے اُن کے سارے اعصابی نظام کو تتر بتر کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بات اُن کے حق میں جاتی ہے کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد انھوں نے تلافیِ مافات کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے لیکن اب اُن کا وقت چلا گیا تھا اور اگرچہ وہ چار پانچ مہینے اور جیئے مگر یہ اصل جواہر لال نہیں تھے ایک چلتا پھرتا کھنڈر تھے۔ ▲▲▲

۶۲

... بدلا ہوا زمانہ تھا

موئے مقدس کی بازیافت کا اعلان تو کیا گیا لیکن لوگوں کے دلوں میں بدگمانیوں اور شبہات کا ایک طوفان بپا ہو گیا تھا۔ وہ بڑی مشکوک نظروں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ موئے مبارک واقعی اصلی موئے مبارک تھے یا نہیں۔ یہ مرحلہ نازک تھا۔ لیکن مولانا محمد سعید مسعودی نے اس موقع پر ہندوستان کی بڑی خدمت کی۔ انھوں نے اپنی چرب زبانی کا سارا طلسم بروئے کار لا کر سید میرک شاہ کاشانی اور چند دوسرے بزرگوں سے اِس کے اصل ہونے کی تصدیق کرائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شناخت کرنے والوں میں نابالغ میر واعظ مولوی محمد فاروق بھی شامل تھے۔

اس سارے سانحے کے پیچھے کس قسم کی سفاکانہ ذہنیت کام کر رہی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت نے پارلیمنٹ میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا کہ اس نے مجرموں کا سراغ لگا لیا ہے چنانچہ اس سلسلے میں مجاور درگاہ رحیم شاہ بانڈے اور ایک معمولی سرکاری ملازم عبدالرشید کو ماخوذ بھی کیا گیا۔ لیکن بعد

میں وہ مقدس مو بھی گاؤ خورد ہوگیا۔ اور آج تک اُس کے انجام کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں۔

ہم جیل خانے سے اس المناک سانحے کا تشویش اور تذبذب کے ساتھ مشاہدہ کر رہے تھے۔ میں ذاتی طور پر حضرت بل کی تعمیر و استقلال کے کام سے سالہا سال سے وابستہ رہا تھا۔ اور اوقاتِ اسلامیہ کے بانی اور صدر کی حیثیت سے میں نے اس بقعۂ عالیہ کی ظاہری تراش خراش اور تزئین و تہذیب میں بے حد محنت کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کشمیری مسلمانوں کی اجتماعیت اور مرکزیت کی علامت ہے اور اگر اس باسعادت مرکز کے جذب و کشش میں کوئی فرق آگیا تو وہ شیرازہ ہی منتشر ہوجائے گا جس نے کشمیری مسلمانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو کر ان میں وحدتِ ملی کا ایک روح افزا احساس پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس بہیمانہ کارستانی کے پیچھے اس سازش کے خوفناک سائے لہراتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ قوم کا جو موڈ تھا وہ زندان کی سلاخوں کے پیچھے بھی ہمارے دلوں کو مضطرب کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے قید خانے سے ہی اس واردات اور اس کی آڑ میں کشمیریوں کو دبانے کی کوشش سخت احتجاج کیا اور جواہر لال نہرو کو تار روانہ کیے کہ اس سانحے کی گہرائی کے ساتھ تحقیقات کی جائے۔ اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ اس سلسلے میں میرے اُس خط کا اقتباس ان محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے جو میں نے ۳ر جنوری ۱۹۶۴ء کو سپیشل جیل جموں سے صدرِ ہندوستان ڈاکٹر رادھا کرشنن کو لکھا۔

"میری جچی تلی رائے ہے کہ یہ بہیمانہ کارروائی کوئی الگ تھلگ وقوعہ نہیں ہے۔ جس کا کشمیر کے ماضی قریب کے واقعات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ گذشتہ برسوں میں کشمیر ایک غیر انسانی صورتِ حال سے دوچار ہوگیا ہے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کو ضمیر کی کسی خلش کا احساس کیے بغیر بھاڑ میں جھونکا جارہا ہے۔ یہ عمل واقعتاً ۱۹۵۳ء میں شروع کیا گیا جب کشمیر میں جمہوریت کا بے شرمانہ قتل کیا گیا۔ اُس کے بعد اخلاقی اقدار کی دھجیاں برسرِ عام اڑائی جاتی رہیں اور اس کارروائی کو کشمیری حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل رہی۔ قانون اور انصاف کے تئیں حقارت کی جاتی رہی اور عوام کی زندگی اور عزت سفاکانہ غنڈہ گردی کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ اس عمل کو روکنے کی کوشش کرنا تو درکنار ہندوستان کے خزانۂ عامرہ کا کروڑوں روپے کشمیری عوام کو کرپٹ کرنے اور ان کی روح کچل دینے کے لیے خرچ کیا جاتا رہا۔ تاکہ ان کے احساس حمیت کو افیون پلاکر سلا دیا جائے۔ ۱۹۵۳ء کی اس سیاسی کارستانی کا مقصد اگر کشمیری عوام کی سیاسی زندگی کا شیرازہ بکھیرنا تھا تو تازہ واردات کا مقصد کشمیریوں کو ان کے اُس روحانی مرکز سے محروم کرنا ہے جو انھیں آزمائش اور ابتلا میں سکون و اطمینان بخشتا آیا ہے۔ یہ کشمیری عوام کے سیاسی، روحانی اور اخلاقی انتشار کا عمل مکمل کردے گا اور ان کو بعد میں گونگے چوپائیوں کی طرح ہانکنا آسان بن جائے گا۔ مجھے یقین واثق ہے کہ آپ اس تناظر میں موجودہ المیے کی سنجیدگی اور اس کے تباہ کن اثرات کا بہ خوبی اندازہ کرسکیں گے۔"

سانحہ موئے مقدس کے سلسلے میں مولوی محمد فاروق پہلی بار سیاسی میدان میں سامنے آئے۔ انھیں دو ایک سال پہلے ہی بخشی غلام محمد نے اپنی ایک شاطرانہ چال کے تحت میرواعظ کی مسند پر بٹھایا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں اس سبزہ آغاز، نوخیز، نوآموز اور دین و دنیا کے علوم و رموز سے بے خبر نوجوان کے سر پر عمامۂ فضیلت باندھ دیا

تھا۔ اور اُس کے نازک ہاتھوں میں مہندی رچائی تھی۔ اُس کے بعد میرواعظ خاندان اور اس کے مداحوں کی میرے ساتھ روایتی دشمنی کے شعلوں کو پھر سے بھڑکانا شروع کیا تھا۔ وہ مولوی فاروق اور اُس کے اتالیقوں اور اقارب کی دامے اور درمے بھی خاطر تواضع کرتا رہا۔ لیکن نوآموز میرواعظ سیاسی میدان میں کیا جمتے۔ انھیں گلی ڈنڈا کھیلنے اور سینما گھروں کے طواف کرنے کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ اسی کا نشہ اُتارنے میں کئی برس لگ گئے۔ اور کبھی کبھی اپنی عادت سے مجبور اور بے بس ہو کر وہ عربی برقعہ میں چھپ کر سینما دیکھنے جاتے رہے۔ لیکن موئے مبارک کی طوفان خیز تحریک میں ایک لہر کے تھپیڑے سے یہ تنکا کشمیر کی سیاسی سطح پر اُبھر آیا۔ مولوی محمد سعید نے عوام کے جوش و خروش پر بند باندھنے کے لیے ایک مجلس عمل یا ایکشن کمیٹی تشکیل دی۔ حسنِ اتفاق سے ان کی اور بخشی غلام محمد کی پسند کے دائرے پھر ایک ہی محور پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے یعنی مولوی صاحب کی نظر انتخاب بخشی صاحب کے چہیتے مولوی فاروق پر مرکوز ہو گئی اور انہی کی درپردہ کوششوں سے نوعمر مولوی ایکشن کمیٹی کے چیئرمین بن گئے۔ ایکشن کمیٹی میں عام طور پر مختلف مذہبی گروہوں اور تنظیموں کے نمائندے شامل کیے گئے تھے۔ میرے فرزند ڈاکٹر فاروق نے بھی اِس کی کاروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن مولوی مسعودی نے بڑی ہوشیاری سے محاذ رائے شماری کے کارکنوں کو اِس کمیٹی سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ مولوی سعید نے تو عوام کو، جو میری رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے، مشورہ دیا کہ وہ شیر کشمیر زندہ باد کا نعرہ بھی نہ دیں۔ کیونکہ اُس سے بقول اُن کے اس مذہبی معاملے کو سیاسی رنگت حاصل ہو جائے گی۔ اور اُلجھن پیدا ہو گی۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ مسلمانانِ کشمیر کی رہنمائی کرنے کا حق صرف مذہبی علماء کو ہے اور وہ اندر ہی اندر یہ کھچڑی پکا رہے تھے کہ کشمیر میں مُلاؤں کی اجارہ داری کو فروغ دیا جائے تا کہ وہ خود اِس

قحط الرجال میں مرکز و محور بن کر چھائے رہیں لیکن مُلا آج تک متحد نہ رہ سکے۔ بقول اقبالؔ

ہے بد آموزیٔ اقوام و مِلل کام اِس کا

یہ اشتراک زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ مولوی فاروق نے اس پلیٹ فارم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اِستعمال کرنا چاہا وہ اس پر تاحیات چھائے رہنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن بہت سے اہل الرائے ارکان کو یہ منظور نہ تھا اس لیے مولوی فاروق اپنے طبقاتی رول اور خاندانی روایت کے عین مطابق رسی تڑا کر بھاگ گئے۔ انھوں نے عوامی ایکشن کمیٹی کے نام سے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی۔ لیکن اِس کا ذکر بعد میں

موئے مبارک کی تحریک نے دہلی کے ایوانوں کو زیروزبر کر ڈالا تھا۔ اور انھیں اپنی دس سالہ کشمیری پالیسی کی غلط اندیشی کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ جواہر لال نہرو کا تو بہت ہی بُرا حال تھا۔ انھیں اب اندازہ ہو گیا تھا کہ کشمیریوں کو زر کے لالچ یا بندوق کے خوف سے دبایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ وہ کشمیر میں سیاسی سطح پر ایک نئی اِبتدا کر کے زخمی دلوں پر پھاہا رکھنا چاہتے تھے۔ بی۔ این۔ ملک نے مرکزی کابینہ کی ایمرجنسی سب کمیٹی کی ایک ہنگامی میٹنگ کی روداد قلمبند کرتے ہوئے نہرو کے اُن احساسات کا نقشہ کھینچا ہے۔

"وزیر اعظم نے کہا کہ اگر پندرہ سال تک ہمارے ساتھ رہنے کے باوجود کشمیر اس غیر مستحکم صورتِ حال میں مبتلا ہے کہ موئے مقدس جیسے بظاہر سادہ معاملے پر لوگ اِس قدر مشتعل ہو جائیں کہ وہ حکومت کا ہی تختہ اُلٹ دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں مسئلے کی گرہیں سلجھانے کے لیے ایک نیا اپروچ اختیار کرنا چاہیے اور کشمیر کے متعلق اپنے اندازِ فکر اور زاویۂ نظر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر لینی چاہیے۔ انھوں نے اِس بات

پر مایوسی ظاہر کی کہ ہم نے کشمیر کے لوگوں کے لیے اتنا کچھ کیا لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔ وزیر اعظم نے کہا شیخ محمد عبداللہ کا کشمیری عوام پر بھی زبردست اثر ہے اور بدلے ہوئے حالات میں کشمیر میں کسی ایسے سیاسی سمجھوتے کے متعلق نہیں سوچا جا سکتا۔ جس میں وہ شامل نہ ہوں۔"

اُدھر ہندوستان میں بھی چکرورتی راج گوپال آچاریہ اور جے پرکاش نرائن کے علاوہ ممبران پارلیمنٹ کی ایک بھاری تعداد نے بھی میری رہائی کو کشمیر کی افراتفری ختم کرنے کی واحد کلید قرار دے کر اُن پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک دن جواہر لال نے اپنے وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ کو جو کشمیر میں سخت گیری کے حامی اور کشمیریوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے والے گروہ کے سرغنہ تھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ مقدمہ سازش کب تک یونہی بے پتوار کی ناؤ کی طرح بھٹکتا رہے گا اور شیطان کی آنت کی طرح طوالت پکڑے گا؟ یہ صورت حال ناقابل برداشت ہے اور ہم کب تک اِن لوگوں کو تفنن طبع کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھ سکتے ہیں؟ گلزاری لال نندہ نے جواب دیا کہ اگر مقدمہ واپس لیا گیا تو ہم سب لوگوں کے ساتھ ساتھ حکومت کی پوزیشن بھی مضحکہ خیز بن جائے گی۔ جواہر لال نہرو بیماری کے تابڑ توڑ حملوں سے بے دم ہو گئے تھے۔ لیکن اُن میں اب بھی اِتنا کس بل باقی تھا کہ اُن کے آگے اُن کے کسی مشیر یا وزیر کو مجالِ سخن نہ تھی۔ ان کی خاکستر میں اب بھی کوئی چنگاری بھڑک کر دھماکہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ جواہر لال نے اپنے شہرۂ آفاق غصّے کے زیرِ اثر لال پیلے ہو کر مقدمے کی فائل اُن کے منہ پر دے ماری اور زِچ ہو کر دہاڑے "جہنم میں جائے یہ فائل۔ میں شیخ محمد عبداللہ کو جلد از جلد قید سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں۔" جواہر لال کا فیصلہ اٹل تھا اور فوراً ہی حالات اِسی کے مطابق رُخ اختیار کرنے لگے۔

موئے مبارک کی ایجی ٹیشن کے سیلاب میں بخشی غلام محمد کے ساتھ ساتھ اُن کے صنم شمس الدین بھی ایسے ڈوبے کہ نابود ہو کر رہ گئے۔ جواہر لال نے اپنے خاص معتمد لال بہادر شاستری کو جموں بھیجا اور اُن کے ایک ہی اشارۂ ابرو پر شمس الدین کا سنگھاسن اُلٹ گیا۔ شاستری کی موجودگی میں بخشی غلام محمد کے گھر میں حکمران جماعت کا ایک اجلاس ہوا جس میں غلام محمد صادق کو پارٹی کے پارلیمانی پارٹی کا نیا لیڈر چن لیا گیا۔ بخشی کی بے کسی کا یہ عالم تھا کہ جس رقیب کو اقتدار سے دُور رکھنے کے لیے اس نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا اب اپنے دلبری ولی نعمت کے اِشارے پر وہ اُسی کا نام وزارت اعظمیٰ کے لیے تجویز کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ عجب نہیں وہ غالب کا یہ شعر گنگناتے رہے ہوں۔ ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تیری رہ گذر کو میں

بہرکیف صادق صاحب نے بخشی کے مقابلے میں بازی جیت لی اور نئی دہلی کو یہ اطمینان حاصل ہو گیا کہ جس منظورِ نظر کو وہ بڑی کوششوں کے باوجود برسرِ اقتدار نہ لا سکے تھے وہ اس تلاطم میں اندر گھس آیا اور وزیر اعظم بن بیٹھا۔ میری رہائی کا جو سہرا نئی دہلی نے بخشی کے سر باندھنے سے اِنکار کر دیا تھا وہ اس نے اِنعام کے طور پر صادق کے حق میں منظور فرما دیا تاکہ اس نووارد آلۂ کار کی کچھ توقیر بن جائے۔

۸ اپریل ۱۹۶۴ء کو ہم حسب معمول جیل کے احاطے سے عدالت کے کٹہرے میں آئے تو وہاں اچانک ہمارے خلاف مقدمہ سازش واپس لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان غیر متوقع نہیں تھا بلکہ واقعات کی منطق صاف طور پر اس سمت کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن جب واقعی مقدمے کو واپس لینے کا اعلان

ہوا تو میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ جھوٹ کی بظاہر عالی شان عمارتِ کس طرح سچائی کے ایک ہی جھونکے سے ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتی ہے اور اس فرمانِ خداوندی میں کتنی صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وقل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ بہرکیف۔ خوشی اور شادیانوں نے مجھے فوراً اس ذہنی مراقبے سے باہر نکالا۔ ہمیں باعزت طور بری کر دیا گیا تھا۔ میں بیگ صاحب صوفی محمد اکبر، خواجہ علی شاہ اور دوسرے ہم نفسوں کے ساتھ باہر آیا تو کچھ اور ہی عالم نظر آیا۔ بقولِ شاعر ؎

مجھے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

ظلم و تشدد کے بادل چھٹ گئے تھے اور فضا میں ایک نئی تبدیلی کی بشارت رس گھول رہی تھی۔ جموں کے ہی نہیں سرینگر اور دوسرے دور افتادہ علاقوں سے ہمارے محب اور احباب ہمیں مبارکباد دینے کے لیے جیل کی دہلیز پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ ابھی ہم کھلی فضا میں اڑنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ جواہر لال نہرو کی طرف سے اُن کا ایک خاص ایلچی میرے پاس اُن کا مکتوب لے کر آیا۔ یہ صاحب خط لے کر دو دن پہلے جموں پہنچ گئے تھے۔ لیکن اُنھیں مجھ سے ملنے کے لیے فوری موقع نہ دیا گیا۔ اس لیے انھیں امانت مجھ تک پہنچانے کے لیے شکستِ زندان کی گھڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے لفافہ چاک کر کے خط پڑھا تو مجھے جواہر لال کا لب و لہجہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ اُنھوں نے بڑے ہی محبت آمیز انداز میں مجھے دہلی آنے۔ اُن کا ذاتی مہمان بننے اور پھر بے تکلف تبادلۂ خیال کی دعوت دی تھی۔ لیکن میں سرینگر جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اور دہلی جانے سے پہلے قوم کے مزاج اور حالات کی میزان کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے جواب میں فوری طور دہلی آنے سے معذرت ظاہر کی۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی

واضح کر دیا کہ جونہی سرینگر سے فراغت ہوئی میں دہلی آنا چاہوں گا۔

جیل سے باہر آتے ہی مقامی شہریوں نے ہمیں ایک جلوس کی شکل میں گھمایا۔ سارے جموں شہر نے ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ہم ایک بڑے جلوس کے آگے آگے ڈاک بنگلے پہنچے۔ جہاں ہمارا ڈیرہ لگ گیا۔ شام کو نئے وزیر اعظم غلام محمد صادق مجھ سے ملنے کے لیے ڈاک بنگلے آئے اور بیگ صاحب نے اُنھیں اپنی بذلہ سنجی سے خوب ستایا۔ یہ ۱۹۵۳ء کے بعد میرا اُن سے پہلا آمنا سامنا تھا اور ہم خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے رہے۔ اُدھر کشمیر میں عوام نے اگلی دن اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک جشنِ چراغاں کیا۔ صرف مکانوں اور دکانوں پر ہی نہیں بلکہ ہاؤس بوٹوں اور کشتیوں میں بھی لاکھوں چراغ روشن ہو گئے۔ یہ چراغاں کشمیر کی تاریخ میں بے مثال بن گیا۔ نئی دہلی کے بدلے ہوئے تیوروں کا اندازہ دلی اور سرینگر کے ریڈیو سے ہو گیا، جنھوں نے ۱۹۵۳ء کے بعد پہلی بار ہماری حمایت میں ہونے والے مظاہروں کی بھی خبریں دینا شروع کیں۔

بخشی غلام محمد اُن دنوں جموں میں ہی رہائش پذیر تھے اور اُنھوں نے وہ سرکاری بنگلہ اُس وقت تک بھی خالی نہیں کیا تھا۔ جو وزیر اعظم کی حیثیت سے اُن کی قیام گاہ تھا۔ ان کی والدہ کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے تعزیت کے لیے اُن کے یہاں جانا مناسب خیال کیا۔ یہ گیارہ سال کے بعد ہماری پہلی ملاقات تھی۔ بخشی صاحب کے چہرے بشرے سے نقاہت اور اُن کی آنکھوں سے ندامت کا اظہار ٹپک رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے مجھ سے آنکھیں بھی چار نہ کر سکے۔ چنانچہ ہماری گفتگو رسمی علیک سلیک اور مزاج پرسی تک ہی محدود رہی۔ دوسرے روز جموں کے شہریوں نے ہمارے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا جس میں صادق صاحب، بخشی صاحب، پنڈت

پریم ناتھ ڈوگرہ اور کتنے ہی پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ میری ملاقات ہوئی۔
میں نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ "ہمیں ماضی کی تلخیوں کو بھول کر نہ صرف کشمیر میں نئے دور کا آغاز کرنا چاہیے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کو بھی ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوششیں کرنی چاہییں کیونکہ دوستی اور مصلحت میں ہی ہند، پاکستان اور کشمیر کے عوام کی بھلائی ہے۔" کشمیر کی یخ بستہ سیاسی صورتِ حال جو جھوٹ پر ہزاروں بے گناہوں کے لہو اور بے شمار روپے کے صرفِ بے جا سے قائم کی گئی تھی حقیقت کی ایک ہی کرن سے پگھل کر رہ گئی۔ بی۔ این۔ ملک تقریباً بین کرنے کے انداز میں اپنی مٹی کے دیوتاؤں کے اوندھے منہ گر پڑنے کا یہ منظر ان دردناک الفاظ میں کرتا ہے۔

"اُس کے (یعنی راقم الحروف کے) سارے مخالف سر کے بل اُس کے استقبال کے لیے دوڑے اور اُسے کشمیر کا شیر کہہ کر پکارا۔"

پرانی تلخیاں اب گلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئی تھیں اور ہم ایک نئی فضا پیدا کرنے کی لگن میں تھے۔ جموں میں چند روز قیام کے بعد ہم سڑک کے ذریعے کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جگہ جگہ ہمارا والہانہ استقبال کیا گیا۔ میں گیارہ بارہ برس کے بعد ڈوڈہ اور کشتواڑ گیا۔ اور وہاں کے عوام نے اپنے التفات سے مجھے باغ باغ کر دیا۔ وہاں سے پھر رُخ وادیٔ کشمیر کی طرف ہوا۔ اور ۱۰/اپریل کو ہم وادی میں داخل ہوئے۔ ہمارے ساتھ سرکردہ اخبار نویسوں، فوٹوگرافروں اور دنیا بھر سے آئے ہوئے ٹیلی ویژن کمپنیوں کے نمائندوں کی ایک بڑی ٹیم بھی ہم سفر تھی۔ بانہال سے لے کر سرینگر تک عوام کا ایک لامتناہی سمندر تھا۔ اور ہم گویا ان کی محبت کی لہروں پر رواں دواں جا رہے تھے۔ سرینگر میں ایسی آرائش تھی کہ مکانوں کی دیواریں تک نظر نہ آتی تھیں۔ عوام کے ہجوم میری زندگی کے ہر موڑ پر کبھی خنداں کبھی گریاں نظر آئیں گے لیکن

اُس دن کا سماں ہی کچھ اور تھا شاید فیض نے کسی ایسے ہی معجزہ رستاخیز کے متعلق کہا ہوگا ؎

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

جب رات کو جُٹ بجے کے وقت میں مجاہد منزل پہنچا تو وہاں عوام ایک زلزلہ کی سی لے میں نعرے لگا رہے تھے "لانگ لیو شیخ عبداللہ"۔ ایک قومی جشن کا سا عالم تھا۔ اور میں نے بہت سی خواتین و بزرگوں کے چہروں پر خوشی کے آنسوؤں کی دھاریں بہتی ہوئی دیکھیں۔ اس بے پناہ مظاہرے نے مجھے تقریباً مبہوت کر کے رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ قوم جو گیارہ سال کے جبر و تشدد کے بعد اس طرح اپنے ارمانوں اور اُمنگوں کی مانگ سجا رہی ہے اس کی قسمت میں سربلندی اور ارجمندی مقدر ہو چکی ہے۔ بہر حال میں نے اپنے اندرونی جذبات پر قابو پا کر اپنے آپ کو سنبھالا اور عوام کی محبت کا شکریہ ادا کر کے اُنھیں رُخصت کیا۔ میرے ذہن میں قدرت کی کارسازی اور اس کی رحمت پر اعتماد کرنے کے انعامات کا عجیب نقشہ اُبھر رہا تھا۔ عوام تو ہمیشہ میری آواز کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ پاتے رہے لیکن جو چہرے شکنجے میں میری گرفتاری سے پہلے کھنچے رہتے تھے ان کی رعونت نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ بی۔ این۔ ملک نے اپنی مٹی کے مادھوؤں کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ اس فریاد بھرے لہجے میں کھینچا ہے "اُس کے تمام سابقہ و موجودہ دشمن اُس کے سواگت میں اُس کے پاؤں پر ماتھا رگڑنے لگے ـــــ

فاعتبرو یا اولی الابصار۔ دوسرے دن حضوری باغ میں ہمارے اعزاز میں ایک عظیم استقبالیہ اجلاس منعقد ہوا، جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔ مولوی محمد سعید نے استقبالیہ ایڈریس پیش کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں عوام کو واقعات کی تازہ کروٹ سے

✣ LONG LIVE ABDULLAH

آگاہ کیا اور کہا کہ "جب تک ہند اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے مسئلہ کشمیر میں گرہیں موجود رہیں گی۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کے مفادات اسی بات میں مضمر ہیں کہ یہ ہمسایہ ملک ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سیکھیں اور ایک دوسرے کے قریب تر آجائیں۔ اس سلسلے میں میں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے مجھے اس رول کے لیے شاید بچا کے رکھا ہے۔ لہٰذا اگر میں اس اہم ترین کام میں کسی کام آسکوں۔ تو میں اپنا حقیر حصہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔" ▲▲▲

٦٣

مُلّا کی اذاں اور مُجاہد کی اذاں اور

پچھلے صفحات میں کئی مقامات پر میر واعظ خاندان کی مجھ سے ذاتی چشمک اور تحریک آزادی کے بڑے دھارے سے اُن کی عداوت کی طرف اِشارے کیے گئے ہیں۔ اِس خاندان کی خاص روش نے کشمیر کی سماجی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں بڑے گل کھلائے ہیں، اور فتنے بپا کیے ہیں۔ اِس لیے مناسب ہے کہ اس اِجمال کی کچھ گرہیں کھول دی جائیں میر واعظ صاحبان کے خاندان کا طلوع انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوا۔ اور تراں سے آئے ہوئے ایک بزرگ شخص کے دو بیٹوں نے آپس میں سرینگر کی مسجدوں اور زیارت گاہوں میں وعظ کرنے کا بٹوارہ کیا۔ ایک بیٹا راز ویری کدل میں مقیم ہوا اور میر واعظ کلاں کہلایا۔ جبکہ دوسرا کلاشپورہ میں بس گیا اور میر واعظ خورد یا میر واعظ ہمدانی کہلانے لگا۔ ان میں جلد ہی مفادات کی کشمکش شروع ہوگئی۔ میر واعظ ہمدانی کے پیروؤں کو ترکیہ اور میر واعظ کلاں کے پیروؤں کو کوتہ کہہ کر یاد کیا جاتا رہا۔ اور ان کی آپس میں نہایت ہی فروعی مسائل پر سرپھٹول بھی ہو جاتی تھی۔ اگرچہ راز ویری کدل کے میر واعظ صاحب اپنے آپ کو میر واعظ کشمیر کہہ کر پکارتے لگے لیکن عملاً اُن کا رسوخ شہر کے

بعض مضافات تک محدود تھا۔ اس خاندان میں پہلے قابلِ ذکر شخص واعظ محمد یحییٰ ہوئے۔ جن کے زمانے میں اس خاندان کو شہرت ملی۔ ان کے فرزند میر واعظ رسول شاہ نے نصرت الاسلام سکول کی بنیاد رکھی۔ مولوی رسول شاہ کا مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اُن کے جانشین میر واعظ احمد اللہ اپنی درویش صفتِ طبیعت کی وجہ سے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور ان کے نکتہ چین تک اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ سرینگر کی جامع مسجد کو سلطان سکندر نے پانچ سو سال پہلے تعمیر کیا تھا۔ اس مرکزی عبادت گاہ کے میر واعظ کی حیثیت سے اس خاندان کا ایک مرتبہ بن گیا تھا اور خاص طور پر مہاراجہ کے دربار میں اُسے رسائی کے علاوہ کچھ مراعات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ خود ہمارا خاندان اُن کا معتقد تھا اور میں اُن کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کی مذہبی پیشوائی اور بزرگی سے قطع نظر اُن میں قومی درد بھی تھا۔ مگر دُھندلا دُھندلا۔ جس پر ذاتی اور خاندانی عافیت کی مصلحتیں غالب آجاتی تھیں۔ چنانچہ جب لارڈ ریڈنگ کشمیر آئے اور کچھ مسلم عمائدین کے ایما پر خانقاہ معلیٰ میں ایک مظاہرہ ہوا اور میمورنڈم وائسرائے کو پیش کیا گیا تو اُس کے ساتھ میر واعظ خاندان، مفتی شریف الدین صاحب وغیرہ کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر وائسرائے کے جانے کے بعد ڈوگرہ سرکار نے سختی شروع کی۔ تو میر واعظ اور مفتی حاشا وکلا کہتے ہوئے اس میں اپنے رول ہی سے منکر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نزلہ خواجہ سعد الدین شال اور نور شاہ نقشبندی پر گرا جنھیں نہ صرف ریاست بدر کر دیا گیا بلکہ جن کی جاگیریں بھی ضبط کر لی گئیں اور میر واعظ و مفتی صاحبان صاف بچ نکلے۔ میر واعظ احمد اللہ کی وفات کے بعد میر واعظ یوسف شاہ نے منبر سنبھالا۔ وہ دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ اور اُن میں ابتداء میں اپنے مادرِ علمی کی روایات کے مطابق کچھ قومی خیالات و جذبات بھی موجزن تھے۔ چنانچہ میں اس بات کا

بار بار اعتراف کرتا ہوں کہ ۱۹۳۱ء کے ابتدائی مہینوں میں اُنھوں نے جذبۂ قومی سے سرشار نوجوانوں کی اُس جنبش کی حتی المقدور حوصلہ افزائی بھی کی، جس کی راہنمائی میں کرتا تھا۔ واقع یہ ہے کہ انہی کے طفیل ہمیں جامع مسجد کے سٹیج سے قوم کے ساتھ مکالمہ شروع کرنے کا موقع ملا۔ میر واعظ یوسف شاہ نے ابتدا میں خود عوام کو بتایا کہ وہ ہماری دکھائی ہوئی راہ کو اختیار کریں۔ یہ ابتدائی مصافحہ مستقبل کی مستقل رقابت و عداوت کی تمہید ثابت ہوگا اس کا تصور بھی ہم نہ کر سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولوی یوسف شاہ ذاتی سرشت کے لحاظ سے ایک سادہ لوح اور بھولے بھالے آدمی تھے۔ لیکن اپنے خاندان کے سرخیل کی حیثیت سے وہ اس کے طبقاتی مفادات کے پاسدار بھی تھے۔ اور پھر اُن کے گرد کٹھ ملاؤں، استحصالیوں، رجعت پسندوں اور حاشیہ نشینوں کا ایسا گھیرا تھا جو اُن کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھنے پر بضد تھا۔ جوں جوں تحریک کی لو اونچی ہوتی گئی سچے سرفروشوں اور مصنوعی غازیوں کی پہچان ہونے لگی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہونے لگا۔ میری لگن اور خلوص اور سب سے زیادہ فضلِ خداوندی نے مجھے تحریک کے صدر نشین تک پہنچا دیا۔ مولوی یوسف شاہ اور اُن کے حواری اس صورت حال سے پریشان ہونے لگے۔ ان کے حاشیہ نشین اُنھیں جتانے لگے کہ اگر اس طرح ایک "عامی" عوام کے دلوں پر چھا رہا تو میر واعظ کی عزت و وجاہت خاک میں مل جائے گی۔ مولوی یوسف شاہ انسان ہی تھے اس بہکاوے میں آگئے اور اُنھیں غالب کے الفاظ میں "سایۂ شاخِ گل" بھی "افعی" نظر آنے لگا۔ اُن کے اپنے مفادات بھی خطرے میں تھے۔ اُدھر حکومت کا چالاک صیاد تاک میں بیٹھا تھا۔ اس نے جال پھینکا۔ طبیعت طبیعت سے جا ملی اور بقول غنی کاشمیری ع

دام ہم رنگِ زمین بود گرفتار شدیم

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے   سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے   (غالب)

۱۹۳۱ء کو جب مجھے ڈوگرہ سرکار نے دوسری بار گرفتار کر لیا تو ساری وادی میں احتجاج کا طوفان اُمڈ آیا۔ راجہ ہری کشن کول نے کچھ دن پہلے ہی وزارتِ عظمیٰ کی گدی سنبھالی تھی۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے میر واعظ یوسف شاہ پر ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خاندان لوگوں کے نذر و نیاز پر پلتا آیا ہے۔ اِسی لیے اِس کو شاخِ زیتون کی ہلکی سی جھلک دِکھا کر ہی شیشے میں اُتارا جا سکتا ہے۔ اور پھر "رشد و ہدایت" کے اِس ظاہری منبع کو ہی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے ناسور کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اِس حکمتِ عملی کے مطابق ہری کشن کول ایک طرف عوام پر قیامت توڑتا رہا اور دوسری طرف اُس نے میر واعظ کے دو مصاحبین عمہ پنڈت اور ماکھہ پنڈت کے ذریعے اُنھیں اپنی کوٹھی پر بلایا۔ اس نے خوشامد کا پُرانا مگر کارگر نسخہ آزماتے ہوئے میر واعظ کو کشمیر میں مہاراجہ کے بعد سب سے قابلِ احترام شخص قرار دیا۔ میر واعظ کی رگِ انا عوام کی بے نیازی اور بے مہری سے سخت دُکھ رہی تھی۔ چنانچہ شاطر سرکاری افسر کا تیر نشانے پر لگا۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے پرچے پر دستخط کر دیے جو وائسرائے ہند کے نام بھیجا جانا مقصود تھا اور جس کا مضمون یہ تھا کہ "کشمیر کے مسلمان مہاراجہ کے وفادار ہیں۔" یہ قوم کے خلاف میر واعظ صاحب کا پہلا وار تھا۔ اور پھر واقعات گواہ ہیں کہ اُنھوں نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ جب میں رہا ہو کر آ گیا تو مولوی صاحب نے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن میرا پیمانِ وفا بندھ چکا تھا اور اب میرے لیے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب ناراض ہو گئے اور اُنھوں نے پہلی مرتبہ مہاراج گنج سرینگر کی کانی مسجد میں مجھ پر براہِ راست تیر پھینکے۔ "بغیر داڑھی مونچھوں کے لوگ مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی پیشوائی کا ان لوگوں کو کیا حق ہے جو سنّت کی پیروی نہ کرتے ہوں؟"

جب اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جموں و کشمیر مسلم پولیٹیکل کانفرنس کا پہلا اجلاس پتھر مسجد

میں ہوا تو مندوبین نے تقریباً یک رائے ہو کر مجھے اِس کی صدارت کا شرف بخشا چنانچہ مولوی صاحب کے ہم جلیسوں نے اسے اُن کی حق تلفی قرار دے کر اُنھیں خوب اُکسایا۔ اُس وقت وہ حسد کی آگ کو سینے میں ہی دباتے رہے۔ لیکن بہت جلد وہ مسلم کانفرنس سے الگ ہو گئے۔ اور اُنھوں نے ڈوگرہ سرکار اور اُس کے نمک خواروں کے اِشارے اور سہارے سے جلد ہی آزاد مسلم کانفرنس کی سیاسی دوکان کا سائن بورڈ لگا لیا۔ یہ ہماری تحریک میں پہلا شگاف تھا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ اس کی پشت پر وہ بزرگ تھے جو اپنے آپ کو کشمیری مسلمانوں کی قومی اور مِلّی نجات کا علمبردار قرار دیتے تھے۔

آزاد مسلم کانفرنس دراصل مہاراجہ اور اُس کے وظیفہ خواروں کے مفادات کی رکھوالی کے لیے عوام میں تفرقہ ڈالنے اور بیرونی توجّہ کو مہاراجہ کی حکومت کی کارستانیوں سے ہٹا کر فروعی معاملات اور ذاتیات میں اُلجھانے کا کام کرتی رہی۔ اِس میں مولوی یوسف شاہ کے خاص مشیروں منشی اسداللہ وکیل اور دوسروں کے علاوہ درپردہ مہاراجا کے ایجنٹ بلہ کاک دَر وغیرہ بھی تار ہلاتے رہے۔ کسی شاعر نے یوسف کنعان اور مولوی یوسف شاہ کی ہم نامی کا جوڑ ملا کر کیا نفیس چوٹ کی۔ ؎

یوسفؑ تو مصر میں بکا سونے کے تول سے
یوسف نے سستی بیچ دی آزاد پارٹی

مولوی یوسف شاہ کے حامی جب عوامی سطح پر مسلم کانفرنس کا بال بیکا نہ کر سکے تو وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے۔ اُنھوں نے غنڈہ گردی شروع کر دی۔ شہر میں بلوے شروع کر دیے۔ اور بار ہا قتل و غارت کی نوبت بھی آئی۔ عوامی ذہن نے مولوی صاحب کے حامیوں کے لیے "بکرا" اور ہمارے حامیوں کے لیے "شیر" کی اصطلاحیں وضع کیں۔ ہمارے حامی تو خیر میرے لقب "شیرِ کشمیر" کی مناسبت سے "شیر" کہلانے لگے۔ بکرے

اس لیے بکرے کہلائے کیونکہ ایک تو وہ شیروں کے مقابلے میں بڑے بزدل تھے اور دوسرے وہ لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ انگریزی میں داڑھی کو "GOATEE" کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے اور یہ تناسبت بکرے کی مرہونِ منت ہے۔ شیر بکرا فسادات نے بار بار شہر کی فضا کو مکدر کر دیا۔ آئے دِنوں کی بات ہے کہ اگر ہماری جماعت کا کوئی ہمدرد میرواعظ کے حمائتیوں کے گڑھ میں چلا جاتا وہاں اس کا اثاثہ لوٹ لیا جاتا۔ اور اُس کی مارپیٹ بھی کی جاتی تھی۔ "نعرۂ حیدری۔ اسپِ گرگ چھوڑ داوری" کہہ کر اس کی چادر تک اُتاری جاتی۔ پھر اس کی اطلاع شیر محلوں میں پہنچ جاتی تو وہاں میرواعظ صاحب کے حمائتیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا۔ ایک لطیفہ اِس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے ایک دیہاتی شہر آیا۔ کسی علاقے سے جا رہا تھا جو "بکروں" کی آماج گاہ تھا۔ انھوں نے اُسے پوچھا کہ تم بکرا ہو کہ شیر اُس بچارے کو غیب کا حال کیا معلوم تھا۔ اُس نے کہا کہ "شیر ہوں" بس پھر کیا تھا یہ لوگ اُس پر ٹوٹ پڑے اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ بچارہ خاک جھاڑتا ہوا آگے بڑھ گیا یہ اِتفاق سے شیروں کا علاقہ تھا۔ انھوں نے بھی دیہاتی سے یہی سوال کیا۔ اُس نے اب کے جان بچانے کے لیے کہہ دیا کہ "بکرا" ہوں۔ چنانچہ اُس کی نئے سرے سے مرمت ہوئی۔ اُس نے کسی طرح گلوخلاصی کرلی اور تیسرے محلّے میں جا پہنچا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی یہی سوال اس سے پوچھا تو اپنے تلخ تجربے کی بِنا پر اُس نے بھولے پن سے جواب دیا "نہ شیر اور نہ بکرا میں تو مادہ بھیڑ ہوں"۔ اُس کی توقع کے عین مطابق اب کی بار اُسے کسی نے نہ مارا اور نہ پیٹا۔

تحریکِ حرّیت کشمیر میں جن حرّیت پسندوں کو سزائے قید یا جرمانے کی سزا دی جاتی تھی ان کو گرفتار کرنے میں یوسف شاہی پیرو خفیہ جاسوسوں کا رول ادا کرتے تھے۔ کچھ مجاہدین پر جرمانہ عائد ہوتا تھا اور وہ یہ جرمانہ ادا نہ کر پاتے تھے۔ ایسے موقعوں

پر ان کی جائدادیں بحق سرکار ضبط کرکے اُنھیں نیلام پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یوسف شاہی پیرو نیلامی کے وقت بڑھ چڑھ کر بولیوں میں حصہ لیتے اور جائدادوں پر قبضہ جما لیتے۔

جوں جوں عوامی تحریک میں اُبھار آتا گیا، مولوی یوسف شاہ الگ تھلگ ہوتے گئے اور اپنی رہائش گاہ کے اِرد گِرد چند محلّوں تک اُن کا اثر و رسوخ سِمٹ کر رہ گیا۔ وہ مایوسی میں حکومت کی طرف جھکتے چلے گئے اور آخر کار اُنھوں نے ایک دفعہ جامع مسجد میں مہاراجہ کشمیر کو خدا کا سایہ (ظلِ اللہ) قرار دیا اور اُن کی اِطاعت کا مشورہ دیا۔ یہ دیوبند کے اُس فارغ التحصیل کا سجدۂ سہو تھا جس کی مادرِ علم نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن جیسے مجاہدینِ آزادی پیدا کیے تھے۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی جابر اور ظالم حکومت سے ٹکر لینے میں گذاری۔ شاید مولوی یوسف شاہ کو سارے دیوبندی قبیلے میں یہ مشتبہ فخر حاصل ہے کہ اُنھوں نے عوام کے خلاف برسرِ پیکار حکومت سے وظیفہ حسنِ خدمت حاصل کرنے میں کوئی ننگ نہ سمجھی۔

مولوی یوسف شاہ کے پیرو ہی تھے جنھوں نے ۱۹۴۶ء میں تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ مہاراجہ کے سپاہیوں کے نیزے کشمیری سرفروشوں کے جگر چیر رہے تھے اور مولوی یوسف شاہ اور ان کے پیرو اُن کو "مرحبا مرحبا" کہہ رہے تھے۔ جب پنڈت جواہر لال کشمیریوں کی تحریک کی حمایت کے لیے کوہالہ پہنچے تو وہاں جن لوگوں نے اُن کے خلاف مظاہرے کیے ان میں جموں کے مہاسبھائیوں اور کشمیر کے پنڈت فرقہ پرستوں کے ساتھ ساتھ میرواعظ صاحب کے بکرے بھی شور و غوغا کر رہے تھے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ میرواعظ پارٹی کو اِس "وفاداری" کے لیے کشمیر دربار کی طرف سے پورا پورا معاوضہ دیا گیا۔ میرواعظ صاحب واقعتاً ایک سیاسی آدمی تھے ہی نہیں

لیکن منصب اور اکرام کی ہوس میں وہ ہماری تحریک کو سبوتاژ کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے آلۂ کار بن گئے۔ جناح صاحب کی بھی اُن کے متعلق یہی رائے تھی۔ جب وہ ۱۹۴۴ء میں کشمیر آئے تو ہمارے ساتھ اُن کے اختلافات نے بڑی نزاعی صورت اختیار کی۔ مولوی یوسف شاہ نے اُن کا خوب ساتھ دیا۔ لیکن اِس کے باوجود اُن کی مولوی صاحب کے متعلق جو رائے تھی اس کے متعلق چودھری غلام عباس خان جیسا گواہ کہاں ملے گا؟ چودھری صاحب اپنی کتاب "کشمکش" میں جناح صاحب کے ساتھ اپنی اور مولوی یوسف شاہ کی ایک مشترکہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے بغیر کسی تمہید کے میر واعظ کو اُردو میں مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ سیاست سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور اِس حیثیت سے ہم آپ کی اُسی طرح عزت کریں گے جس طرح آرچ بشپ آف کنٹربری کا انگریز کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح آرچ بشپ سیاست سے الگ تھلگ رہتا ہے آپ کو بھی رہنا چاہیے۔"

بعد میں تو جناح صاحب نے مولوی صاحب کو کشمیر کی سیاسیات کا ROTTEN EGG کہہ کر بھی پکارا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جب پاکستان میں کشمیر پر چڑھائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو ان کے کچھ ایلچی میر واعظ کے پاس آئے اور پاکستان کے عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ جب حملہ آور فوج فاتح کی حیثیت سے سرینگر میں داخل ہو تو آپ اُن کا استقبال کریں اور اِس کے لیے آپ کو پاکستان آنا پڑے گا۔ مولوی صاحب رات کی تاریکی میں پاکستان چلے گئے۔ جب حملے کا رُخ ہی پلٹ گیا تو وہ وہیں رہ گئے۔

لیکن وہاں بھی اُن کا مولویانہ مزاج اُن کے ساتھ رہا۔ روایت کے مطابق حکومت پاکستان انھیں "آزاد کشمیر" کا پہلا صدر بنانا چاہتی تھی۔ لیکن مولانا نے یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا کہ اس طرح اُن کے عیال کو کشمیر میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعد میں جب حالات ذرا سنبھلے تو دیکھا کہ وہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور یارانِ تیز گام آگے نکل گئے ہیں، چنانچہ اُنھوں نے سردار ابراہیم جیسے نوآموز کے ماتحت وزارت تعلیم کا قلمدان سنبھالنے کو بھی غنیمت جانا۔ بعد میں مولانا یوسف شاہ آزاد کشمیر کے صدر بھی بنے اور پاکستان کے موقف کی حمایت کے لیے اُنھوں نے عرب ملکوں کا وسیع دورہ بھی کیا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے مولوی صاحب کا کنبہ سرینگر میں ہی رہ گیا تھا۔ اُن کی خواہش کے مطابق ہم نے میر واعظ صاحب کی بیگم اور بچوں کو پورے احترام و عزت کے ساتھ پاکستان جانے کی اجازت دی۔ اپنے آخری دنوں میں میر واعظ صاحب کشمیر آکر اس کی شفیق مٹی میں خوابِ ابدی میں لیٹ جانا چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی حالات نے اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

تقسیم کے بعد بکرا پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا لیکن اس کے گنے چُنے حامی اپنی روش سے باز نہ آئے اور موقع کی تاک میں رہے۔ تاکہ پھر سے اپنا وجود منوا سکیں۔ ۱۹۵۳ء میں جب بخشی غلام محمد اور اُن کے ساتھیوں نے مجھے گرفتار کر دیا تو بخشی صاحب کی عیار اور زمانہ ساز نگاہوں نے پرانے زخموں کو کریدنا شروع کر دیا۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ بکرا پارٹی کسی اعتقاد یا نظریاتی اساس پر کام نہیں کرتی۔ انھیں تو چند ٹکڑوں کی ضرورت ہے اور راقم الحروف کی ذات سے بغض و عناد ہی اُن کا مقصدِ حیات ہے۔ اُدھر بخشی بڑے جتن کرنے کے باوجود نہ تو اپنے آپ کو عوامی سطح پر قابلِ قبول بنا سکے تھے اور نہ ہی میری ذات کو کشمیری عوام کے دلوں سے محو کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے میر واعظ منزل کی طرف پھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں وہاں اُنھوں نے پرانے

حواریوں کو للچائی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھے کہ سہ

حضرتِ واعظ ہیں راضی رقص پر

دیر کیا ہے اب پڑے طبلے پہ تھاپ

مولوی عتیق اللہ تو خیر پہلے ہی گوشہ نشین تھے۔ اب وہاں میر واعظ بنے تو کون؟ بخشی صاحب نے اپنی سیاست گری میں آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چودہ پندرہ سالہ کھلنڈرے لڑکے کے سر پر دستارِ فضیلت باندھ دی اور اُسے میر واعظِ کشمیر قرار دیا۔ یہ مولوی فاروق تھے۔ جو اس وقت تک لڑکپن کے تقاضوں کے تحت گلی کوچوں میں اُچھلتے کودتے رہتے تھے۔ اور جن کے پاس نہ علم قدیم اور نہ علم جدید کی کوئی سند تھی۔ بہرحال بخشی صاحب بڑی لگن اور صبر سے اس پودے کو سرکاری سرپرستی اور روپے پیسے کے پانی سے سینچتے رہے اور انھوں نے میر واعظ خاندان کے نمک خواروں کو بھی نوازنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ بیل بہت دنوں تک منڈھے نہ چڑھ سکی۔ موئے مبارک کی ایجی ٹیشن میں یہ تکہ لگ گیا اور اب کی بار اس کو اُستوار کرنے میں مولوی محمد سعید مسعودی کا فتنہ انگیز ذہن کامیاب رہا۔ جو مہم بخشی غلام محمد کا اقتدار سر نہ کر سکا اسے مولوی مسعودی کے احساسِ محرومی نے پورا کر دکھایا۔

مولوی مسعودی کے متعلق اِشارہ ہو چکا ہے کہ ان کی سرشت میں فتنہ انگیزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور انھیں بشیر لڑانا خوب آتا ہے۔ اپنی قربانیوں، سادہ زندگی اور علم و فضل کے باوجود وہ کشمیری عوام میں اپنے لیے جگہ نہ بنا سکے اس لیے ان کی ساری صلاحیتیں سازشوں کی طرف مرکوز ہو گئیں اور وہ خود نہ سہی اپنے کسی مہرے کے ذریعے میرے اور تحریک کے ساتھ اپنی کینہ پروری کا حساب چکانے کی کوششیں کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ بخشی کے مشیرِ خاص تھے۔ انھوں نے نہ صرف میری گرفتاری پر اس کی پیٹھ ٹھونکی بلکہ وزارت سازی میں بھی مشورہ دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی طلاقتِ لسانی اور قوتِ گفتار کو بالائے طاق رکھ کر پارلیمنٹ میں، جس کا ہم نے انھیں ممبر بنا کر بھیجا تھا، کشمیر کے حالات اور کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں چپ سادھ لی۔ جب کوئی ان سے اس کی توجیہہ طلب کرتا تو وہ عجیب و غریب جواب دیدیتے کہ "میری خاموشی ہی میری گفتگو ہے اور میری چپ میری قربانی"۔ بعد میں بخشی اور صادق نے اقتدار میں شرکت کے خوف سے مسعودی صاحب کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن وہ بھی موقعے کی طاق میں رہے۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے بخشی صاحب کے ساتھ حساب چکا دیا اور مولوی فاروق کو کسی سند و صفت کے بغیر ایکشن کمیٹی کا صدر بنوایا۔ اُن دنوں مولوی صاحب گھنٹوں میر واعظ منزل میں صرف کر کے سیاست کے نئے طفلِ مکتب کو گھٹنوں گھٹنوں چلنے کے گُر سکھاتے رہتے۔ مولوی فاروق نے انھیں مایوس نہیں کیا اور انھوں نے بعد میں کشمیری قوم میں انتشار پیدا کرنے کے روایتی اور خاندانی رول کو پھر سے سنبھالا۔ مجھ سے ذاتی دشمنی کے الاؤ پھر روشن کر دیے اور شہر میں مدت کے بعد شیر بکرا کی علت پھر سے پھوٹ پڑی۔

مولوی فاروق کو اپنی بساط و اوقات سے بڑھ چڑھ کر اچھالنے میں دہلی کے بعض حلقوں کا ہاتھ بھی کارفرما رہا ہے۔ جب محاذِ رائے شماری یا میں نے کشمیری عوام کی جدوجہد کو اونچی کرنے کی کوششیں کیں تو دہلی کے اُن حلقوں کے اشارۂ ابرو پر مولوی فاروق اپنی بے سُری راگنی چھیڑتے رہے اور معاملات سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے رہے جب ۱۹۷۵ء میں ہم نے کشمیر ایکارڈ کیا تو مولوی فاروق نے اس کے خلاف مسز بھٹو کی اپیل پر ہڑتال کروانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حالانکہ خود اُن کے عمِ بزرگ نے میرے ۱۹۶۴ء کے دورۂ پاکستان میں مجھ سے وہاں کشمیریوں کی حالتِ زار کا ذکر ابیان کیا تھا اور خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دوں جن سے اُن کے

لیے کشمیر آنا ممکن بن جائے۔ اور وہ وہیں پر اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام گذار سکیں۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے ۱۹ جولائی ۱۹۵۸ء کو جواہر لال نہرو کے نام ایک خط میں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی واضح طور پر حمایت کی تھی۔ اس خط کے کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں:۔

"مسئلہ کشمیر کے دس سالہ تعطل اور مختلف النوع حالات و واقعات نے اب ایسے مسائل و حقائق سامنے لا رکھے ہیں جن کا تصور بھی دس سال پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے عقائد و خیالات میں ترمیم و نظرِ ثانی کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دس سالہ ذاتی تجربہ و مشاہدات اور بدلے ہوئے حالات میں آپ سے اس موضوع پر بات چیت کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ بہ حالاتِ موجودہ کشمیر کا انڈیا کے ساتھ الحاق بہتر حل ہے۔ اِس حل کو آخری اور قطعی شکل دینے کے لیے مؤثر کام کرنا اب ہمارا مشترکہ مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارا باہمی تعاون بھروسے اور اعتماد کے ساتھ عمل کرنا لازمی ہے۔۔۔۔۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہ دس سالہ تنازعہ اب جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ تاکہ اہلِ کشمیر بھی انڈیا کے دوسرے باشندوں کی طرح اپنی ترقی اور خوش حالی کے لیے ہمہ تن متوجہ ہوں۔ آپ کے دِل میں کشمیر اور اہلِ کشمیر کی فلاح و بہبود کے لیے جو نیک جذبات و خواہشات موجود ہیں ہم اُن سے بخوبی واقف ہیں اور پھر آپ کے اور ہمارے درمیان ہم وطنیت کا جو مستحکم رشتہ ہے، یہ چیز کشمیریوں کے اعتماد و اطمینان کے لیے بڑا سامان ہے۔"

مقطع میں البتہ یہ سخن گسترانہ بات لانے کی ضرورت ہے کہ مولوی صاحب نے یہ خط جولائی ۱۹۵۸ء میں لکھا جب میں بخشی اور اس کے دہلوی آقاؤں کے خلاف سب سے شدید لڑائی میں مصروف تھا۔ ہمارے خلاف کشمیر سازش کیس دائر ہو چکا تھا اور بخشی کی حکمرانیاں عروج پر تھیں۔ مولوی خاندان کا چونکہ مجھ سے کوئی نظریاتی جھگڑا نہیں تھا اور وہ صرف میری ذات کے مخالف تھے۔ اِس لیے انھیں یہ موقع اپنی نظریاتی ڈبکی لگانے کے لیے غنیمت نظر آیا تھا تاکہ وہ کشمیر آکر میری طرف سے مطمئن ہو کر داد عیش دے سکیں۔ لیکن قدرت کو کیا منظور تھا۔ اس کا مولوی صاحب اندازہ نہیں کر سکے۔ اور یہ چال بھی اُلٹی پڑ گئی۔

یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اصل بات ۱۹۷۵ء میں مولوی فاروق کے رول کی ہو رہی تھی۔ جونہی ہم نے اقتدار سنبھالا وہ ایکارڈ کی مخالفت بھول گئے۔ اور کانگریسیوں نے ہمارے خلاف کینہ پروری اور کردار کشی کی جو مہم چلائی اُس میں اُن کے ساتھ گانٹھ لیے گئے۔ اُن کے بیانات کو دہلی اور سری نگر کے ریڈیو نے خوب اُچھالنا شروع کیا۔ اور اس طرح وہ کانگریس کے قریب تر آتے گئے۔

لیکن ۱۹۷۷ء کے عام چناؤ میں جب شمالی ہندوستان سے کانگریس کا صفایا اور مرکز میں کانگریس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تو مولوی صاحب کو ایک لمحے کے لیے بھی ضمیر کی کسک محسوس نہ ہوئی۔ اور وہ جنتا کی گاڑی پر چڑھ گئے۔ انھوں نے میرے روائتی مخالفین کے عظیم اتحاد میں شمولیت ہی نہیں کی بلکہ اِس کے سرخیل بن گئے۔ اِس سلسلے میں انھوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے اُس کی تفصیل آگے آئے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی فاروق صاحب نے اپنے سیاسی آتالیقوں بخشی اور مسعودی کی توقعات بڑھ چڑھ کر پوری کی ہیں۔ ▲▲▲

(۶۴)

جواہر لال کے ساتھ آخری ملاقات

ہمارے سلسلۂ بیان کا دھاگہ ۱۹۶۴ء میں جیل سے ہماری رہائی اور سرینگر میں آمد تک پہنچ گیا تھا کہ بیچ میں کچھ اہم معاملات پر خامہ فرسائی کرنا پڑی۔ آمدم بر سرِ مطلب سرینگر میں چند روز قیام کرنے کے بعد میں نے اور بیگ صاحب نے جواہر لال کی باضابطہ دعوت پر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ پالم کے ہوائی اڈے پر جواہر لال کی طرف سے میرا مخلصانہ اور پُرجوش استقبال کیا گیا۔ پنڈت جی نے اپنی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی، نائب وزیر خارجہ راجہ دنیش سنگھ اور وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کو مجھے لینے کے لیے ہوائی اڈے پر بھیج دیا تھا۔ ہوائی اڈے سے میں اندرا جی کے ساتھ سیدھا تین مورتی ہاؤس چلا گیا۔ پنڈت جی بڑے تپاک سے ملے لیکن وہ پہلے کے سے پنڈت جی کہاں رہے تھے۔ میں انھیں گیارہ سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ شعلے کی طرح لال بھبوکا اور گرم تھے۔ شاعر نے کشمیریوں کو لالہ رُخ کہہ کر پکارا ہے اور جواہر لال کو دیکھ کر اس تشبیہ کی صداقت اور لطافت کا بادر ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ مُرجھا گئے تھے۔ ان کی کمر خمیدہ تھی۔ اُن کے چہرے پر پژمردگی اور اُن کے گالوں پر جھریاں اُبھر آئی تھیں۔ بھونیشور میں فالج کے حملے کے اثرات

موجود تھے۔ اور اُن کا سارا جسمانی نظام متاثر ہو گیا تھا۔ یہ بات اُن کی ہر ادا سے آشکار ہو رہی تھی ؎

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل!
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بہرحال فوٹو گرافروں کے اصرار پر برآمدے میں، جہاں جواہر لال میرے استقبال کے لیے خاص طور آئے تھے کچھ تصویریں کھنچوائی گئیں اور اس کے بعد ہم اوپر کے کمرے میں چلے گئے۔ پنڈت جی نے بڑی دلسوزی اور لجاجت سے گذشتہ واقعات پر معذرت ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ہوا وہ میری مرضی و منشاء کے خلاف ہوا اگر مجھے اس پر کافی افسوس ہے لیکن بہ حیثیت وزیر اعظم میں اس کی حتمی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتا۔ باقی دل کا حال جو ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ پنڈت جی بڑی دلفریب اداؤں کے مالک تھے۔ اور جس حالت اور جس گلوگیر آواز میں انھوں نے یہ باتیں کہیں اس سے میں آبدیدہ ہو گیا۔ مجھ پر بھی ایک گہری جذباتی کیفیت طاری ہو گئی میں نے ان سے کہا کہ میں انھیں وزیر اعظم سے زیادہ اپنا بھائی سمجھتا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ گذری ہے وہ میرے لیے اس لحاظ سے انتہائی خلافِ توقع تھا کہ میں جواہر لال نہرو کے راج میں اس قسم کے سلوک کی امید نہ رکھتا تھا۔ بقولِ شاعر ؎

"یوسف کو قید اور زلیخا کے عہد میں"

لیکن یہ اس زندگی کے لوازمات ہیں جو میں نے اپنے لیے اختیار کی ہے اور اس ڈگر پر ایسی کھائیوں اور خندقوں کا درپیش آنا مجھ جیسے مسافر کا مقدر ہے۔ بہرحال اگر میں آپ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو سکا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی فریب یا دغا نہیں کی تھی اور نہ ہندوستان کے ساتھ بے وفائی تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ

کٹھن اور لمبی تپسیا رائیگاں نہیں گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ جو کچھ ہوا وہ گھناؤنی سازش کا نتیجہ تھا جس میں ہماری بدقسمتی سے آپ جیسا مہاپرش بھی اُلجھ گیا۔ لیکن اب ماضی کے دکھڑے رونے اور انتقام گیری کی راہ اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر ہم ماضی میں ہی اُلجھے رہے تو مستقبل ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ ہندوستان کو ابھی گمبھیر مسائل کا سامنا ہے اور ان کو آپ کی زندگی میں حل نہ کیا گیا تو یہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جائیں گے اور اس لیے ہماری زندگی کی جتنی ساعتیں بھی باقی ہیں، ہمیں پورے عزم و ارادے سے ان مسائل کو حل کرنے کی طرف لگانا ہوں گی۔" میں نے مسئلۂ کشمیر کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں یہ سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔ چین اور ہندوستان کی باہمی ٹکر نے میرے اس نظریہ کو اور زیادہ تقویت پہنچائی ہے کہ ہندوستان کو اپنے چھوٹے پڑوسی ملکوں کے ساتھ فراخ دلانہ اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ تاکہ اُن کے اندر یہ خیال پیدا ہو کہ ہندوستان اُن کا ہمدرد دوست ہے اور اُس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں ہم اُن چھوٹے پڑوسیوں کو اپنا ممد و معاون بنا سکتے ہیں۔ ان ممالک میں پاکستان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ہند اور پاکستان دونوں ملکوں کا دفاع ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہے اور دونوں کی مشترکہ کوشش کا طلب گار اور محتاج۔ دونوں کی تجارت بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور دونوں میں رہنے والے باشندے جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے ایک ہی ملک کے باشندے تھے۔ اُن کی زبان، رہن سہن، کلچر ایک دوسرے کے ساتھ رشتے داریاں ایسے ناطے ہیں جس کے شیرازہ میں وہ اس طرح ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں کہ زمین پر بٹوارے کی جو لکیر کھینچ دی گئی ہے وہ سراسر بناوٹی اور مصنوعی لگتی ہے۔ وقت آگیا ہے جبکہ ہندوستان کو ایک فراخ دل بڑے بھائی کی طرح پہلا قدم اٹھانا چاہیے اور کشمیر کی گتھی کو سلجھانے میں پہل کرنی چاہیے کیوں کہ اسی نے اُن دو کے درمیان

کدورت کی دیوار حائل کر دی ہے۔ پنڈت جی نے کہا کہ میں اِن احساسات سے پوری طرح متفق ہوں اور اپنی زندگی کی شام میں یہ کام سرانجام دینا چاہتا ہوں جو بہت پہلے طے ہونا چاہیے تھا۔ انھوں نے کہا کہ شاید قدرت نے آپ سے قربانیوں کا اتنا بڑا خراج اس لیے وصول کیا ہے کہ آپ اِس معاملے میں پُل کی حیثیت انجام دیں۔ چنانچہ آپ اس اچھے کام کے لیے سلسلہ جُنبانی کرنے کے لیے اِس وقت سب سے موزوں شخص ہیں۔" بہر حال طے یہ ہوا کہ میں پاکستان جا کر صدر پاکستان فیلڈ مارشل صدر ایوب خاں کو دہلی آنے کے لیے آمادہ کروں اور یہاں دونوں ملکوں کے نمائندے میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر کشمیر کے اس تنازعے کو نپٹانے کے لیے عملی کوشش کریں۔" پنڈت جی نے کہا کہ اُن کی صحت کا جو عالم ہے اُس کی وجہ سے وہ خود راولپنڈی جانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ لیکن اگر فیلڈ مارشل ایوب خان دہلی آئیں تو کام آسان ہو سکتا ہے۔ آج تک کشمیر کے معاملے کو حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ دونوں ملکوں کے دوست ملکوں یا خود دونوں ملکوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں اُن میں ہر ایک کو زیرِ غور لایا جائے گا اور متبادل تجاویز کو یکے بعد دیگرے جانچ کر کسی قابلِ قبول اور معقول حل پر انگلی رکھی جائے۔ اور اِس کو بنیاد بنا کر اِس معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیا جائے گا۔ میں نے جواہرلال کے لہجے کے خلوص کو محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا کہ اب وہ صدقِ دل سے معاملہ نپٹانے پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ میں نے پاکستان جانے پر حامی بھر لی۔

دہلی میں جب ہم گفتگو میں مصروف ہی تھے تو فیلڈ مارشل ایوب خان کے تار جواہرلال اور میرے نام آئے کہ کشمیر کے معاملے میں پاکستان بھی ایک فریق ہے لہٰذا جو بھی فیصلہ اس کی غیر حاضری میں ہوگا وہ اُس کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگا۔ انھوں نے مجھے پاکستان آنے کی دعوت بھی دے دی۔ اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اِس لیے پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اسی دوران مدراس کا دورہ کیا جہاں میں نے ہند اور پاکستان کی دوستی کے قدیمی علمبردار راج گوپال اچاریہ کی اپنے نازک مشن کے لیے آشیرواد چاہی۔ راج گوپال اچاریہ نے خوف و رعایت کے بغیر جواہر لال کی غلط پالیسیوں کی مخالفت کی تھی اور پاکستان و کشمیر کے بارے میں وہ بار بار اُن کو ٹوکتے رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بزرگ سیاستدان میں صرف عقل و اندیشے کی دور بینی ہی نہ تھی بلکہ اخلاقی جرأت کا بھی جوہر تھا۔ اس خوبی نے انھیں اپنی قوم کا ضمیر نگار CONSCIENCE KEEPER بنا دیا تھا۔ اور اس لیے میں اُن کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بڑی گرم جوشی سے ملے۔ اُنھوں نے واقعات کی نئی کروٹ پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ جواہر لال نے اُن کی صحیح رائے کو نظر انداز کر کے چاپلوسوں اور مصاحبوں کے آگے سپر ڈال دی تھی اس لیے یہ صورت حال پیش آئی۔ بہر حال صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ اور جواہر لال میں ابھی اس قدر دم خم ہے کہ اُن کے جیتے جی کوئی ان کے فیصلے پر انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ میں پونا آشرم بھی گیا اور اچاریہ ونوبا بھاوے سے بھی ملا۔ وہ بھی اس مشن کی کامیابی کی دعا کرنے لگے۔ جے پرکاش نرائن میرے دیرینہ دوست تھے اور ہند پاک آشتی کے بڑے زبردست حامی۔ میں اُن سے بھی ملا اور انھوں نے بھی اس پہل پر مجھے حوصلہ دیا۔ اس کے علاوہ میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اور نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین سے بھی ملا۔ اور دونوں نے اس مشن کے لیے خیر سگالی کا اظہار کیا۔ اُدھر پنڈت جی اپنی خرابی صحت کے باوجود دلی سے باہر کی مصروفیات کے لیے بھی طوعاً و کرہاً رضامندی ظاہر کرتے تھے۔ اور اپنے نحیف و نزار جسم کے لیے اور زیادہ بوجھ لے لیتے تھے۔ وہ اُن ہی دنوں نیپال کی سرحد پر کسی کارخانے کا افتتاح کرنے کے لیے بھی گئے۔ بمبئی اُنھی دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا اور جواہر لال وہاں بھی پہنچ گئے۔ وہاں کچھ کٹرپنتھی لوگوں نے جواہر لال

اور میری گفتگو پر خیال آرائی کی تو جواہر لال نہرو نے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے ایک تقریر بھی کر ڈالی۔ یہ زندگی میں اُن کی آخری عام تقریر تھی اور یہ کلیتاً کشمیر سے متعلق تھی۔ میرے مجوزہ دورہ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ "شیخ عبداللہ سیکولرازم کے اصول پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے اُن اصولوں کو کسی نوع کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ وہ اس دو قومی نظریے کو بھی نہیں مانتے جو قیام پاکستان کی اساس ہے۔ تاہم اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندوستان کے لیے اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے بھی پاکستان کے ساتھ امن و آشتی کی زندگی گذارنا ناممکن نہ ہونا چاہیے۔ اور اس طرح کشمیر کی گتھی بھی سلجھ سکتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی کوششوں میں ہم کامیاب ہی ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو ہندوستان کو پاکستان کے ساتھ مسلسل تصادم کے بوجھ کو اور اُن تمام نتائج کو جو اس میں مضمر ہیں برداشت کرتے رہنا ہوگا۔ مجھے توقع ہے کہ ہندوستان سے ہراساں ہونے اور اس سے نفرت کرنے کے جذبے سے بھی پاکستان کو نجات حاصل ہو سکے گی۔ مجھے اس کی بھی امید ہے کہ دونوں ملکوں کے لیے ایک دوسرے سے قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم کرنا بھی ممکن ہو سکے گا۔ اور اس میں دونوں کی بھلائی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اگر یہ کرا سکے تو وہ دونوں ملکوں کی عظیم خدمت سرانجام دیں گے۔ اس مقصد کے حصول کی کوشش میں ہم ہر طرح امداد کرنے کو تیار ہیں۔"

بمبئی سے واپس دلی آئے تو ہم اُن سے پھر ملے۔ وہ کچھ دنوں آرام کرنے کے لیے ڈیرہ دون جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُن کو رخصت کرنے کے لیے ہم بھی ہوائی اڈے پر گئے۔ جہاز میں رخصت ہونے سے پہلے اُنھوں نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا تو اُنھوں

نے اپنے ضعف کے باوجود میرا ہاتھ محبت سے دبا دیا۔ اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا خالی پن اور سنجیدگی تھی۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ کشمیر کی مٹی کی مہک سے شرابور اس عظیم سپوت اور میرے نہایت ہی پیارے دوست اور بڑے ہی زبردست حلیف کے ساتھ یہ میرا آخری مصافحہ ثابت ہوگا۔ وہ کئی بار جہاز تک جاتے رہے اور پھر واپس آکر ہمارے ساتھ ہاتھ ملاتے رہے ایسا لگتا تھا کہ اُن پر موت کا سایہ پڑ چکا تھا اور اُن کو اس کی پیش قیاسی (PREMONITION) گھما رہی تھی۔ بہرکیف وہ ڈیڑھ دن روانہ ہو گئے۔ اور ہم دوسرے دن ایک پاکستانی طیارے کے ذریعہ راولپنڈی کی طرف پرواز کر گئے۔ میرے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ، مولوی محمد سعید مسعودی، خواجہ مبارک شاہ دربار ہول، خواجہ مبارک شاہ نقشبندی، چودھری محمد شفیع باغسیری اور میرے فرزند فاروق بھی شامل تھے۔ اور اس کے علاوہ چند ہندوستانی اخبارات کے نمائندے جانے سے قبل میں نے اپنی پاکستان یاترا کی غرض و غایت کے متعلق ایک بیان جاری کیا تھا۔ جس کے کچھ حصے یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔

"دونوں ملکوں کے تعلقات کی کشیدگی نے ایک مسلسل تناؤ پیدا کر رکھا ہے۔ جو اکثر درندگی کا روپ دھار لیتا ہے اور بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے چنانچہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں بدترین دہشت زدگی کا شکار ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اچھے شہری کی زندگی گذارنے کی صحت مندانہ اہلیت کھوتی جا رہی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان جس تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اس کی رفتار کو اگر روکا نہ گیا تو ایشیا میں اقتدار کا توازن درہم برہم ہوگا اور پورا برصغیر تباہی کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ ہم ایک بھیانک صورتِ حال کی لپیٹ میں ہیں۔ اور اگر ہم نے دونوں ملکوں کے تعلقات میں خرابی کو بڑھنے دیا تو ہماری آنے والی نسلیں

ہمیں معاف نہ کریں گی۔ تعلقات کی خرابی کی رفتار روکنا دونوں ملکوں کے لیڈروں کا اہم ترین فرض ہی نہیں بلکہ ایسے ذرائع ڈھونڈنا اور اُن پر عمل پیرا ہونا بھی اُن کے لیے ضروری ہے۔ جن سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان میل جول اور دوستی پیدا ہو۔ اس سلسلے میں مسئلہ کشمیر مسلسل طور پر سترہ برسوں سے دونوں ملکوں کو مشتعل کرتا رہا ہے چنانچہ ہماری کوششیں یہ ہونی چاہئیں کہ اشتعال کا یہ سبب دور ہو اور اس مسئلے کا کوئی دوستانہ حل نکل آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایسا حل ہونا چاہئے جس سے نہ تو کسی ملک کو شکست کا احساس ہو اور نہ ہندوستان کی سیکولر بنیادیں ہی کمزور ہوں نیز اس سے ریاست کے عوام کی آزادی کی تکمیل بھی ہو سکے اور انھیں باعزت مقام مل سکے میں اس غرض کے لیے پاکستان جا کر صدر ایوب خاں اور وہاں کے دوسرے لیڈروں سے بھی بات چیت کروں گا۔" ▲▲▲

۶۵

....ٹوٹی کہاں کمند

راولپنڈی پہنچے تو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ ابھی میں جہاز کے دروازے سے نکل کر پہلی دوسری سیڑھی پر ہی قدم رکھ پایا تھا کہ سب سے پہلے میر واعظ یوسف شاہ نے میرا استقبال کیا۔ وہ طیارے کی سیڑھیوں پر چڑھ آئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ وہاں ہمارے کچھ اور بھی دیرینہ دوست اور شناسا آئے ہوئے تھے، جن میں چودھری غلام عباس خان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ ہم سے جوانی میں جدا ہو گئے تھے اور اب ہم بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ صدر ایوب نے اپنے جواں سال وزیرِ خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو میرے خیر مقدم کے لیے بھیج دیا تھا۔ کشمیریوں اور ہمارے دوسرے ہمنواؤں کا بھی بڑا ہجوم تھا۔ سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک کتنے ہی برسوں کے بعد ملنے آئے تھے۔ اس لیے جذبات پر قابو نہ تھا۔ بڑے تپاک سے نعرے لگا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارا خیر مقدم کیا گیا۔ مجھے ایک بند کار میں شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں دو طرفہ لوگ قطاریں باندھے کھڑے تھے اور کئی جگہوں پر بھیڑ فٹ پاتھوں کا پیمانہ لبریز کر کے سڑک پر بھی

در آئی تھی۔ لوگ مجھے فرطِ اشتیاق سے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن دیکھ نہیں پاتے تھے۔ مجھ سے اُن کی مایوسی کا ماجرا دیکھا نہ گیا۔ اس لیے میں نے سیکورٹی فورس سے پوچھے بغیر کار کو رکوا لیا اور ایک کھلی جیپ میں سوار ہو گیا۔ بھٹو صاحب بیچارے بھیڑ میں پیچھے رہ گئے۔ پاکستان سیکورٹی پولیس نے میرے اس اقدام کو پسند نہیں کیا لیکن اس سے لوگوں کے چہرے پھول کی طرح کھلنے لگے اور یہی میرا انعام تھا۔ آخر کار ہم مختلف شاہراہوں سے گزر کر صدرِ پاکستان کے سرکاری مہمان خانے میں پہنچ گئے۔ جہاں ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہم فیلڈ مارشل ایوب خاں سے ملنے کے لیے ایوانِ صدر گئے۔ صدر ایوب بڑی محبت سے پیش آئے اور ازراہِ لطف یہ بھی کہا کہ اُن کا جی تو چاہتا تھا کہ وہ میرے استقبال کے لیے بذاتِ خود ہوائی اڈے پر آئیں لیکن پروٹوکول اور رسمیات کی بندشوں نے انھیں بے بس بنا دیا۔ ہمارے ڈیلی گیشن کے ممبران کے متعلق ان کا کیا تجزیہ تھا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ایک نجی ملاقات میں صدر نے مولوی محمد سعید کے متعلق اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اور ہمارے وفد میں اُن کی شمولیت کا ذکر ایسے طریقے پر کیا جیسے انھیں یہ بات پسند نہ آئی ہو۔ صدر باقی لوگوں سے کافی تپاک کے ساتھ ملے۔ اور کچھ تحفے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اور چیزوں کے علاوہ کشمیر کی صوفیانہ موسیقی میں استعمال ہونے والا ساز سنطور بھی اُن کے لیے لے گئے تھے۔ ایک سو تاروں پر مشتمل یہ دلنواز ساز کشمیر میں مسلمان لائے تھے اور سارے ہندوستان میں صرف یہیں استعمال ہوتا رہا۔

میں نے صدر ایوب کو مسئلہ کشمیر کا پس منظر کافی تفصیل سے سنایا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں دلائل کے ساتھ اس بات کا ذکر بھی کیا کہ پاکستان کے اربابِ حل و عقد نے کس طرح کوتاہ اندیشی سے کام لے کر اس مسئلے کو الجھا دیا۔ صدر ایوب نے بڑے تحمل اور تدبر سے میرے استدلال کو سنا اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے تسلیم کیا کہ اُن کے ملک سے غلطیاں سرزد

ہوتی آئی ہیں لیکن اب غلطیوں کی راکھ کریدنے سے کچھ نہ ملے گا۔ البتہ اُن کا مداوا ڈھونڈھنا ہوگا۔ صدر ایوب نے اچانک کہا کہ کنفیڈریشن اس کا علاج ہرگز نہیں ہے میں اُن کی اس بات سے چونک گیا اور میں نے ان سے کہا کہ نہ معلوم آپ کنفیڈریشن کا قصہ کیوں لے بیٹھے۔ میں نے تو کنفیڈریشن کی تجویز پیش نہیں کی۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ پنڈت جی کے ساتھ میز پر آمنے سامنے آجائیں اور اُن تمام تجاویز پر باہمی تبادلہ خیال کریں جو اس گتھی کو سلجھانے کے سلسلے میں آج تک سامنے آئی ہیں۔ اور جن میں کنفیڈریشن کا قیام بھی شامل ہے۔ صدر ایوب خاں اپنے ملک کے سیاسی اتار چڑھاو کے پیش نظر کنفیڈریشن کے سلسلے میں بار بار ایسی ہی کہتے رہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں جو ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، میری طرف کچھ ایسی باتیں منسوب کیں جو سراسر غلط تھیں۔ چنانچہ میں نے ریکارڈ کو درست کرنے کے لیے یکم ستمبر ۱۹۶۷ء کو انھیں ایک خط لکھا تھا۔ جس کا ایک اقتباس یوں ہے:-

"آپ نے اپنی کتاب میں کنفیڈریشن کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے آپ کے اس بیان میں مجھے تناقض نظر آتا ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری اس گفتگو کو اپنے ذہن میں تازہ کریں جو مرزا محمد افضل بیگ کی معیت میں آپ سے ہوئی تھی...... کشمیر کے تصفیے کی کوئی بندھی ٹکی تجویز ہم اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے اور حق تو یہ ہے کہ جواہر لال نہرو نے بھی ہمیں کوئی مخصوص تجویز آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ ہم اُس مٹی کے بنے ہوئے لوگ نہیں ہیں...... میرا سارا زور اس پہلو پر تھا کہ طرفین اپنی بے لوچ روش ترک کر کے دوسروں کا نقطہ نظر بے ظن و گمان سننے پر آمادہ ہوں۔"

صدر ایوب نے میرے مراسلے کا جواب نہ دے کر اس بات کا خاموش اقرار

کر لیا کہ انھوں نے جو بات کہی تھی وہ حقائق سے دور تھی۔

بہر کیف۔ بات صدر ایوب سے میری گفتگو کی ہو رہی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان تجویزوں پر غور کرنے کے بعد آپ ہی فیصلہ کریں آیا کوئی ایسی تجویز ہے جس کو مناسب تبدیلی اور کاٹ چھانٹ کے بعد سمجھوتے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی تجویز نکل آئی تو بہت بہتر اور خدانخواستہ اگر کچھ نہ ہو سکا تو بھی آپ کا کچھ نہ بگڑے گا۔ کم از کم یہ آپسی پردہ ہٹ جائے گا اور آپ ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے جس سے دونوں ملکوں اور اُن کے عوام کو فائدہ ہی فائدہ ملے گا۔ حالات میں تناؤ کم ہو جائے گا اور اگر اس سمت کوششیں خلوصِ نیت سے جاری رہیں تو کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور کسی معقول حل کی رہگذر سامنے آئے گی۔

صدر ایوب نے جواہر لال ہی کی طرح میرے محسوسات سے اتفاق کیا اور دہلی تشریف لانے کی میری تجویز کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ اس ملاقات کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ جس کی اطلاع میں نے دہلی بھیج دی اور اس کے متعلق باقاعدہ سرکاری اعلان بھی شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ یہ ملاقات جون کے وسط میں ہوگی۔ میرے پاکستان آنے کا مشن کامیاب ہو گیا تھا اور میں اب اطمینان سے آنے والی چوٹی کانفرنس کی طرف مشتاقانہ نگاہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔

اسی رات راولپنڈی کے مشہور لیاقت باغ میں، جسے تقسیم سے پہلے کمپنی باغ کہا جاتا تھا اور جہاں ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان ایک قاتل کے ہاتھوں گولی لگنے سے جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے، میرے اعزاز میں ایک شہری استقبالیہ منعقد ہوا۔ لیاقت باغ کا چپہ چپہ خلقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف انسانی سروں کا ایک سمندر نظر آرہا تھا۔ اخبار "پاکستان ٹائمز" کے اندازے

کے مطابق دو لاکھ کی حاضری تھی جن میں برقعہ پوش خواتین بھی تھیں۔ چودھری غلام عباس نے مجھے خوش آمدید کہا اور حسبِ معمول ایک جذباتی تقریر کر ڈالی۔ مقامی مسلم لیگ کے صدر کی جانب سے ایک لاکھ روپے کا چیک ہماری خدمت میں پیش کیا گیا جس کو میں نے یہ کہتے ہوئے شکریہ کے ساتھ واپس کیا کہ اسے کشمیری مہاجرین کی بہتری کے لیے خرچ کیا جائے۔ محمد یوسف قریشی نے ہمارے لیے ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ چودھری غلام عباس نے اپنی تقریر میں چین اور پاکستان کی دوستی کو خوب اُچھالا۔ اور اس کے مقابلے میں ہند اور پاکستان کی دوستی پر چھینٹے اُڑائے۔ انھوں نے چین کو مسئلہ کشمیر کا ایک فریق بھی قرار دیا۔ چودھری صاحب نے رنگ میں آکر مجھے برصغیر کا عظیم ترین رہنما اور مسلمانوں کا سب سے بڑا بہی خواہ قرار دیا۔ میں جب تقریر کرنے کے لیے اُٹھا تو مجمع فرطِ شوق سے تقریباً بے قرار ہو گیا۔ میں نے تلاوتِ کلام پاک شروع کی تو جلسے میں فوراً سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے یہ نظم ؎

"کسی کے آگے نہ خم ہو سکی میری گردن
کسی جگہ میری آواز آج تک نہ دبی"

ترنم سے سنائی تو لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ بہرحال میں نے اپنی تقریر میں پاکستان کے لوگوں پر واضح کیا کہ تجربے نے اُن کو یہ بات سکھلا دی ہوگی اور انھیں خود اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اُن کے لیے مناسب یہی ہے کہ کشمیر کے حل کے لیے وہ کسی بیرونی ملک پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنی نگاہیں ہندوستان کی ہی طرف اُٹھائیں۔ اُن کا مفاد اسی تدبیر میں پوشیدہ ہے۔ اس سے پہلے پاکستان امریکہ اور برطانیہ پر بھروسہ کرنے کا خمیازہ بھگت چکا ہے۔ اب چین کو اپنا مشکل کشا ماننا غلطیوں کو تکرار کرنے کے برابر ہوگا۔ بین الاقوامی سیاسیات میں دوستی کی بنیاد مشترکہ مفادات ہوتے ہیں۔

وہ ختم ہو گئے تو دوستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان اور پاکستان کو جغرافیہ اور تواریخ نے ایک دوسرے کا ہمنوا رکھا ہے۔ اُن کے مفادات مشترکہ ہیں۔ فضا میں وقتی طور چاہے کتنی ہی کشیدگی کیوں نظر نہ آئے وہ حقائق سے بھاگ نہیں سکتے۔ کسی نہ کسی دن ہند اور پاکستان کے عوام اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوں گے اور وہی اُن کی نجات کا دن ہوگا۔ رات کو صدر ایوب خاں نے ہمارے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں پاکستان کے سرکردہ اشخاص کے علاوہ چودھری غلام عباس میرواعظ یوسف شاہ اے۔ ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر اور اسلام آباد کے دوسرے عمائدین نے شرکت کی۔

میں نے راولپنڈی میں ایک پُرہجوم اخباری کانفرنس سے بھی خطاب کیا اور دنیا بھر کے اخباری نمائندوں کے سامنے اپنے دورے کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ میں نے اسی پریس کانفرنس میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ پاکستان کے صدر ہندوستان کے وزیراعظم سے ملنے کے لیے دہلی آنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ یہ خبر حسبِ توقع ساری دنیا میں اوّلین اہمیت حاصل کر گئی اور شاہ سرخیوں کے ساتھ بین الاقوامی پریس میں چھپ گئی۔ راولپنڈی میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں میرواعظ یوسف شاہ سے ملنے ان کے مکان پر بھی گیا۔ وہاں اُن کے برادرزادہ مولوی نورالدین بھی موجود تھے۔ مولوی یوسف شاہ پاکستان سے کافی دل برداشتہ نظر آئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے لیکن اب وہ اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ کشمیر کی نجات اُس کی مکمل آزادی میں مضمر ہے اور یہ کہ مجھے اس مقصد کے حصول کے لیے کام کرنا چاہیے۔ میں چودھری غلام عباس کے مکان پر بھی اُن کے بال بچوں سے ملنے کے لیے گیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا کوئی سیاسی گفتگو نہ ہو سکی۔ رسمی سلیک علیک

پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ چلتے چلتے مولوی عبدالرحیم اور کچھ اور پرانے احباب سے بھی آمنا سامنا ہوگیا۔

میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی میرے نام ایوانِ صدر کی معرفت تار برقیوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ پاکستان کے کونے کونے سے جن میں لالہ موسیٰ، سیالکوٹ، پشاور، کوہاٹ، کوئٹہ، بنوں، گجرانوالہ، وزیر آباد، ملتان، لائلپور، خیرپور، کراچی، حیدرآباد لاہور اور کتنے ہی دوسرے شہر شامل تھے۔ مجھے وہاں آنے کی دعوتیں وصول ہو رہی تھیں۔ یہ دعوتیں مقامی کشمیری باشندے، پرانے مجاہدین آزادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی تنظیمیں بھیج رہی تھیں۔ بعض ذاتی دوست اس بات پر مُصر اور زور دے رہے تھے کہ میں اُن کے شہر آتے وقت اُن کے گھر آنے کی فرصت ضرور نکال لوں۔ مشرقی پاکستان (جو اس وقت بنگلہ دیش نہ تھا) سے مسلمانوں اور غیرمسلموں کی طرف سے مجھے ڈھاکہ، چاٹگام، کومیلا اور دوسری جگہوں کا دورہ کرنے کی دعوتیں مل رہی تھیں۔ ایک دعوت تو مجھے میجر جنرل حبیب اللہ کی طرف سے پیکنگ سے بھی ملی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنا چین کا دورہ ادھورا چھوڑ کر واپس کراچی پہنچ رہے ہیں تاکہ میری وہاں آمد کے موقع پر موجود رہیں۔ میں چاہتا تو تھا کہ جتنے زیادہ مقامات پر ممکن ہو چلا جاؤں۔ لیکن وقت کم تھا پھر بھی میں آزاد کشمیر، لاہور، سیالکوٹ اور ایک آدھ دوسرے شہروں میں جانے پر مُصر تھا۔ لیکن "ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال۔"

میں نے بہرحال مظفرآباد جانے کو اولیت دی۔ یہ کشمیری تارکینِ وطن کا صدر مقام تھا۔ اور میں اپنی آنکھوں سے اُن کی حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اور اُن کے دلوں کو ٹٹولنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۹۶۴ء کی پُرآشوب تاریخ کو میں مظفرآباد کے لیے روانہ ہوگیا۔ میرے ساتھ پاکستان کے عمائدین کے علاوہ پریس نمائندگان کی بڑی جمعیت

بھی تھی۔ ابھی ہم راستے ہی میں تھے کہ یہ ہوش رُبا خبر ملی کہ جواہر لال نہرو کا انتقال ہوگیا ہے اور ہمیں فوراً راولپنڈی واپس آجانا چاہیے۔ میں یہ خبر سن کر سکتے میں آگیا اور کچھ دیر کے لیے جیسے مجھے اس پر یقین ہی نہ آیا۔ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ میں نے جگر تھام کر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ہم چونکہ مظفرآباد کے بالکل نواح میں پہنچ گئے تھے۔ لہٰذا واپس آنے کی کچھ تُک معلوم نہ ہوئی۔ مظفرآباد کے تمام رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا۔ بہرحال ہم نے صدر آزاد کشمیر کے۔ ایچ۔ خورشید کے ساتھ جیسے تیسے کچھ نوالے زہر مار کیے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑے اجتماع میں خطاب کرنا پڑا۔ یہ جلسہ جو میرے استقبال کی خوشی میں بلایا گیا تھا اب جواہر لال کا سوگ منانے کا ماتمی جلسہ بن گیا۔ میں نے گلوگیر آواز کے ساتھ جواہر لال کی موت پر اظہارِ رنج و غم کیا اور کہا کہ یہ کشمیر کی بدقسمتی ہے کہ اس تاریخ ساز موڑ پر جب جواہر لال اس معاملے کو سلجھانے کے لیے کمربستہ ہوگئے تھے، انھیں دستِ اجل نے ہمارے درمیان سے اُٹھا لیا۔ میں نے پاکستان آنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے غمزدہ سامعین کو تسلی دی کہ انھیں اس سانحے سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ شاید اللہ کو کچھ دیر اور ہماری آزمائش منظور ہے۔ ہمیں اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ شام کو ہم اُلٹے پاؤں راولپنڈی پہنچے۔ وہاں بھی سیاسی مطلع پر غم کی کالی بدلی چھا گئی تھی۔ افق پر اُجالے کی جو روپہلی لکیر نمودار ہونے لگی تھی وہ جواہر لال کی موت سے ایک دم کملا گئی اور پاکستان کے زعما ششدر تھے کہ اب کیا پیش آنے والا ہے۔ میرا کراچی، لاہور اور سیالکوٹ کا دورہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اطلاعات کے مطابق اُن شہروں میں میرے استقبال کے لیے بڑی لمبی چوڑی تیاریاں کی گئی تھیں۔ اور لوگ بڑی مشتاقانہ نگاہوں سے میری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ خود میں بہت سے دوستوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن قدرت کو اس وقت یہ ملنا منظور نہ تھا۔

رات کو میری ملاقات فیلڈ مارشل ایوب خان کے ساتھ ہوئی، جس میں ذوالفقار علی بھٹو بھی موجود تھے۔ صدر ایوب کی نگاہیں جیسے خلاؤں کو گھور رہی تھیں۔ میں نے اُن کو مشورہ دیا کہ اب ہمیں کچھ وقت کے لیے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ نئی دہلی میں نئی حکومت زمام اقتدار سنبھال لے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کی کوشش کریں تاکہ مناسب وقت پر پھر چھوڑے ہوئے دھاگے جوڑنے کی سعی کی جا سکے۔

صدر ایوب ہندوستان میں جواہر لال کی جانشینی کے بارے میں تذبذب میں مبتلا تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ جانشینی کی جنگ میں شاید ہندوستان میں عدمِ استحکام پیدا ہو اور پھر کشمیر کے مسئلے کو سلجھانا تو دور رہا نئے حکمران کہیں اندرونی معاملات سے توجہ ہٹانے کے لیے پاکستان پر فوج کشی نہ کر بیٹھیں۔ میں نے صدر ایوب کو مشورہ دیا کہ وہ ان وسوسوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔ البتہ اس وقت جواہر لال کی شان کے شایان ایک اعلیٰ سطح کا سرکاری ڈیلی گیشن دہلی بھیج دیں۔ جو جواہر لال کی آخری رسومات میں پاکستان کی نمائندگی کرے۔ چنانچہ اُنھوں نے میری بات مان لی اور ذوالفقار علی بھٹو کو جو اُس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ اور صدر کے بعد وہاں کی سب سے اہم شخصیت تھے، ہمارے ہی ساتھ نئی دہلی جانے کا فریضہ سونپا۔ چنانچہ ہم لوگ اکٹھے ایک ہی جہاز میں دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اگرچہ موقع کی سنجیدگی کی وجہ سے راستے میں بھی اپنے اپنے خیالات میں گم رہے اور کوئی بات چیت نہ ہو سکی کسی کو معلوم تھا کہ یہ اس چلبلے ذہین اور تیز نوجوان کے ساتھ ہماری آخری ملاقات ہوگی اور جس شخص کا مستقبل اُس وقت اس قدر شاندار نظر آ رہا تھا وہ آخر کار راولپنڈی میں ہی سُولی کے رسّے پر جھول کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دے گا۔

صدر ایوب خان ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ شکل و صورت کی

جاذبیت اور قد و قامت کی وجاہت انسان کو فوراً اپنی جانب کھینچ لیتی ہے وہ مردانہ وجاہت کا مجسم پیکر تھے۔ دراز قد، فربہ جسم اور چوڑے چکلے ہاڑ کے بارعب انسان ان کی مونچھیں بڑی نستعلیق تھیں گویا سونے کے تار سلیقے سے جوڑ دیے گئے ہوں۔ انھوں نے اپنی ساری عمر فوج میں گذار دی تھی۔ اُن کی مسکراہٹ بڑی دل موہ لینے والی تھی۔ لیکن بات کرنے میں وہ نفاست اور مصلحت پسندی نہیں رکھتے تھے۔ جو ایک ڈپلومیٹ کا خاصہ ہوتی ہے۔ جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا لگی لپٹی کے بغیر اُسے زبان پر لاتے۔ اور اس میں سے خلوص کی خوشبو آتی۔ انھیں پاکستان کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ اور اپنے ملک کو خوش حال اور فرخندہ فال دیکھنا چاہتے تھے۔ میرا ذاتی طور پہ تاثر یہ تھا کہ بڑی پریشانیوں کے بعد پاکستان کو ایک مسیحا مل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اُس کا اظہار لیاقت باغ کے جلسے میں بھی کیا۔ جس سے اگرچہ کچھ پیشانیوں پر بل بھی پڑے لیکن یہ میرے خیال میں اظہار حق کے بمنزلہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر صدر ایوب کو وقت مل گیا تو وہ پاکستان کو آہستہ آہستہ سیاسی اور اقتصادی ابتری کے بھنور سے باہر لے آئیں گے۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کے گرد چاپلوسوں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا اور اُن کا تعلق عوام سے بڑی حد تک ٹوٹ گیا۔ وہ چاپلوسوں کی عینک سے ہی اپنی قوم کی حالت دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ جو بالآخر ان کے زوال کے ساتھ ساتھ پاکستان کے حصے بخرے ہونے کا باعث بن گیا۔

اِس کے برعکس ذوالفقار علی بھٹو کی تربیت ایک دوسرے ہی قسم کے ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر سیاسی شطرنج پر چالیں چلنے میں گذری تھی۔ اِس لیے بیٹے پر بھی اس چیز کا اثر تھا۔ اُنھوں نے خود بھی بڑی تیز و طرار طبیعت اور ذہن رسا پایا تھا۔ اور سیاسی میدان کی بازیگری سے بھی خوب واقف تھے۔ دورۂ

پاکستان کے دوران مجھے اُن سے گفتگو کا کم ہی موقع ملا۔ مارشل ایوب کے ساتھ ہماری جو ملاقات ہوئی اس میں اگرچہ بھٹو صاحب موجود تھے لیکن وہ سعادت مندی کے انداز میں چپ ہی سادھے رہے۔ انسانوں کے ظاہر اُن کے باطن سے کبھی کبھی کسقدر مختلف ہوتے ہیں۔ اُس وقت کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ سعادت مندی دراصل اُن کے عزائم کو چھپانے کا ایک پوز (POSE) بلکہ نقاب ہے۔ بہرکیف، حکومت پاکستان نے میرا یہ مشورہ صدق دل سے تسلیم کر لیا کہ جب تک نئی دہلی میں نئی حکومت اپنے پاؤں نہ جمالے اُس وقت تک پاکستان کو صبر سے کام لینا چاہئے اور مذاکرات شروع کرنے پر زور نہ دینا چاہئے۔ ▲▲▲

۶۶

فریضۂ حج اور بیرونی ممالک کی سیر

دہلی واپس پہنچ کر میں سیدھا تین مورتی ہاؤس گیا۔ سوگواروں نے ساری کوٹھی اس کے وسیع باغ بلکہ سڑک تک کو گھیر لیا تھا۔ کچھ آنکھوں میں سچی دردمندی کے آنسو تھے مگر بہت سے لوگ جیسے تماشائی بن کر ٹہل رہے تھے۔ میں اُس کمرے میں گیا جہاں جواہر لال کا جسد خاکی ہندوستان کے سہ رنگی قومی جھنڈے میں لپٹا ہوا درشنوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ اُن کے چہرے پر ایک دلنواز تبسّم تھا۔ جونہی میری نظر اُن کے مُردہ چہرے پر پڑی میرے اندر سے آنسوؤں کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اِس شخص کے ساتھ میری کتنی ہی قومی اور ذاتی یادیں، تلخ اور شیریں دونوں وابستہ تھیں۔ اِسی کی شخصیت کے جادو نے ہمیں کانگریس کے قریب لایا تھا۔ اِسی کو ۱۹۴۷ء میں سارے ہندوستان کو چھوڑ کر مظلوم کشمیریوں کی حمایت کے لیے کوہالہ میں نیزوں کی محراب سے گزرنا پڑا تھا۔ اِسی نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۴ء تک ہمیں قیدی بنا ڈالا تھا۔ اور اب اِس وقت جب کہ یہ سارے داغ مٹا دینا چاہتا تھا۔ اِسے پرلوک کا بُلاوا آگیا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور مجھے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لینا پڑا۔ بہر حال تقدیر سے کس کو مفر ہے؟ اُن کا آخری درشن

کرتے ہوئے میں نے اُن کے چہرے پر حسرت انگیز نظر ڈالی۔ ہندوستان کا جواہر اور کشمیر کا لال چل بسا تھا۔ اور یہ ہندوستانی تاریخ کے ایک دور کا خاتمہ تھا۔ بعد میں میں نے اُن کی ارتھی کے جلوس میں شامل ہو کر شانتی ون میں اُن کی آخری رسوم میں بھی حصہ لیا۔ برطانیہ کی نمائندگی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور روس کی ایلکسی کوسی گن کر رہے تھے۔ اور بھی سرکردہ بین الاقوامی شخصیتیں موجود تھیں۔ کشمیر سے بخشی اور صادق دونوں آئے ہوئے تھے۔ بعد میں اُن کی استھیوں کا ایک حصہ سرینگر سے آیا اور اُن کی خواہش کے مطابق اسے سرینگر سے متصل دریائے سندھ اور جہلم کے سنگم میں بہا دیا۔ اُن کی یاد میں پرتاپ پارک میں ایک بڑے ماتمی جلسے سے بھی میں نے خطاب کیا۔

جواہر لال کی موت کے فوراً بعد پہلے تو گلزاری لال نندہ نے سب سے سینئر وزیر کی حیثیت میں قایم مقام وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ لیکن بعد میں لال بہادر شاستری صدر کانگریس کامراج نادار کی مدد سے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے شاستری ایک شریف انسان اور اعتدال پسند مُدبّر تھے۔ اُنھوں نے وزیرِ اعظم بننے کے فوراً بعد اپنی پہلی پالیسی تقریر میں جواہر لال کے نقشِ قدم پر چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ جب چند دنوں کے بعد میں اُن سے پہلی بار مِلا تو میں نے ان سے بھی یہی التماس کی کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو جوں کا توں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور پھر موزون وقت پر دو ملکوں کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جائے جہاں سے یہ جواہر لال کی اچانک وفات کی وجہ سے کٹ گیا تھا۔ شاستری نے وعدہ تو کیا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن گلزاری لال نندہ کا کابینہ میں خاصا اثر تھا۔ اُنھوں نے حالات کو جوں کا توں رہنے نہیں دیا۔ بلکہ ہندوستان میں کشمیر کے ادغام کی رفتار تیز تر کرنے کے درپے رہے۔ اِس حد تک کہ اُنھوں نے ہندوستانی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کا جس کے تحت کشمیر کو ایک خصوصی

حیثیت حاصل تھی، اثر زائل کرنے کے لیے کئی قوانین پاس کروائے اُنھوں نے ہر اُس روزن کو بند کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ جہاں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان روشنی اور مکالمے کا تبادلہ ہو سکتا تھا اور بہتر تعلقات قائم کرنے کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ ریاست کے اندر بھی اُنھوں نے بخشی دور کے طور طریقوں کو پھر سے رواج دینے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اُس آزادی کی شمع کو گل کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں جو موئے مبارک کی تحریک میں کشمیریوں نے اپنے خون سے روشن کی تھی۔

اُدھر ریاست کے اندر صادق صاحب اور بخشی صاحب کے درمیان اقتدار کی رسّہ کشی تیز ہو گئی۔ نہرو کی موت کے بعد بخشی نے پھر داؤ لگانے اور طالع آزمائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اُنھوں نے ریاستی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر اپنی جوڑ توڑ کی صلاحیتوں کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ممبران کی اکثریت کو اپنے ساتھ گانٹھ لیا اُن کا ارادہ دوسرے دن اسمبلی کے فرش پر حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر کے اس کا قلع قمع کرنا تھا۔ لیکن ڈی۔ پی۔ در اور کرن سنگھ نے کشمیر میں دہلی کے نگران اُفیسر جگل ریذیڈنٹ وشنو سہائے کی مدد سے راتوں رات نئی دلی سے رابطہ قایم کر کے پانسہ اُلٹ دیا۔ بخشی غلام محمد کو علی الصبح گرفتار کر کے اسی جگہ پہنچا دیا گیا جہاں ٹھیک گیارہ برس قبل اُنھوں نے مجھے قید کر لیا تھا۔ یعنی تارا نواس اور محمود بخشی کا قفس بن گیا۔ ؎

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

اُسی صبح ایک ڈرامائی اعلان کے ذریعے کشمیر اسمبلی کا سیشن برخواست کر دیا گیا اور بخشی غلام محمد کی بدعنوانیوں اور بددیانتیوں کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن کی تقرری کا اعلان کر دیا گیا۔ بخشی غلام محمد کے دل پر اس یلغار سے کیا گذری اس کا اندازہ کرنا

مشکل نہیں۔ خاص طور جب یہ بات نظر میں رکھی جائے کہ اُن کے پیشِ نظر کوئی اعلیٰ مقصد نہ تھا۔ محض ذاتی اقتدار کی بحالی تھی۔ لیکن کشمیر میں ۱۹۵۳ء کے بعد جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہر اخلاقی اور قانونی معیار سے ناجائز تھا۔ لہٰذا بخشی صاحب کو شکایت کا کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے کشمیر کو اندھیر نگری بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں اس غیر جمہوری اور غیر آئینی طرزِ عمل کی مذمت کی۔ کیوں کہ بخشی صاحب کے ساتھ میرے لاکھ اختلافات سہی میں کشمیر کو ایک نوآبادی کی طرح سے دیکھنے کی ذہنیت کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اور اِس اقدام سے اسی نوآبادیاتی ذہنیت کی بو آتی تھی۔ بعد میں سپریم کورٹ کے ایک سابق جسٹس آئینگر پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی نے بخشی صاحب کو شدید بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دیا۔ اس کمیشن کی ایک ضخیم رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ جس میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک کشمیر میں بخشی کی کارستانیوں کا سارا کچا چٹھا درج ہے۔ بخشی کے ساتھ اس طرح سے ہندوستانی آقاؤں نے حساب چکا دیا کہ غالب کے اس شعر کا ماجرا سامنے آ گیا ؎

اِک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

بخشی صاحب دو تین مہینے ہی جیل میں رہے تھے کہ اُن پر دل کا دورہ پڑا۔ جس شخص کو ہندوستان نے دس سال تک "کشمیر کے مردِ آہن" اور "خالدِ ہند" کے روپ میں آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ چند مہینوں میں ہی بلکنے اور تڑپنے لگا۔ بعد میں اُن کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن اقتدار کی جو دیوی اُن سے روٹھ گئی تھی۔ ہزار ڈورے ڈالنے کے باوجود وہ اُن پر دوبارہ مہربان نہ ہوئی اور وہ اس کے فراق میں چند سال تک رقصِ بسمل کا مظاہرہ کرتے کے بعد انتقال کر گئے۔

جب کچھ ماہ گذر گئے اور دہلی میں نئی حکومت جواہر لال کی موت کے دھچکے کے بعد ٹھکانے سے کام کرنے لگی تو میں پرسشِ احوال کے لیے پھر دہلی گیا۔ میں نے وہاں وزیر اعظم شاستری اور کچھ دوسرے مرکزی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی ساری فضا بدلی ہوئی ہے۔ وہاں کشمیر کے معاملے کو پھر برف خانے میں رکھ دیا گیا تھا۔ شاستری جی بڑے اخلاق سے پیش آئے مجھے لگا کہ اُن کا بس چلتا تو وہ جواہر لال کے آغاز کو انجام تک پہنچانے میں ہی خوشی محسوس کرتے۔ لیکن وہ جواہر لال کی سیاسی اور عوامی طاقت سے محروم تھے۔ اور وہ اپنے رفقاء کو اپنا ہم نوا بنانے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ کچھ کچھ اُن سے دبتے بھی تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس حالت میں فی الحال کسی فیصلہ کن اقدام کی توقع فضول ہے اور صورتِ حال اقبال کے اس شعر کے مترادف ہے ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟

دریں اثنا میں نے وہ فریضہ ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا جو سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے اور جس کا دامن ایک عظیم ترین قربانی سے پیوستہ ہے حرمین شریف جانے کی حسرت میرے دل میں تھی اور میں جلد سے جلد اس فرض کو پورا کرنا چاہتا تھا میری بیگم بھی اس فریضے سے سبکدوشی کے لیے بیقرار تھیں چنانچہ ہم حج بیت اللہ کی تیاریوں میں لگ گئے۔ مرکزی حکومت نے ہمارا پاسپورٹ جاری کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی اور ہم فروری ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں سرینگر سے روانہ ہو گئے۔ میرے ساتھ بیگم صاحبہ کے علاوہ مرزا محمد افضل بیگ، پیر عبدالغنی اور ایک باورچی غلام محمد تھے۔ پیر عبدالغنی کو بیگ صاحب کی دیکھ بھال کے لیے خاص طور پر ساتھ رکھا گیا تھا۔ حج کے ساتھ ساتھ ہم بلادِ اسلامیہ کے کچھ اور ملکوں کا دورہ بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ

ہمارے پروگرام میں الجزائر، مصر، اُردن، عراق، ایران اور افغانستان جانا بھی شامل تھا۔ اور ہم فرانس اور انگلستان جانے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ ہم پہلے قاہرہ پہنچے۔ پھر وہاں سے لندن، پیرس اور قاہرہ سے ہوتے ہوئے حج کے موقعے پر پھر جدہ پہنچ گئے۔ اس وقت وہاں مدحت کامل قدوائی ہند کے سفیر تھے۔ مدحت کامل ۱۹۵۳ء میں ہمارے چیف سیکرٹری رہ چکے تھے۔ جب پہلی بار ہم جدہ پہنچے تھے تو اُنھوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی تھی۔ اُنھوں نے ہمیں اپنی رہائش گاہ پر دعوت دی۔ ہمیں کھانا کھلایا اور ہماری خاطر خواہ دیکھ بھال کرتے رہے لیکن اب دوسری بار جدہ پہنچنے پر اُن کے تیور بدلے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ نہ صرف ہم کو ٹالنے کی سعی کرتے نظر آئے بلکہ ہمارے سایے سے بھی ڈرنے لگے۔ وجہ صاف تھی۔ جونہی ہم نے ساحلِ ہند کو چھوڑا تھا ہمارے خلاف پروپگنڈا کی زبردست مہم شروع کر دی گئی تھی۔ یہ مہم ان تمام ممالک میں جاری کی گئی تھی جہاں ہم جانے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔ ہندوستان کے سفارت خانوں کے ذریعے ان ملکوں کی حکومتوں بلکہ سربراہوں پر زبردست دباؤ ڈالا گیا تھا کہ وہ نہ ہماری طرف التفات کریں اور نہ ہی ہمیں شرفِ ملاقات بخشیں۔ ان ملکوں کے اخبارات کو ہمارے خلاف خصوصی پروپگنڈہ مواد بھیجا گیا تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں ہم نے ہندوستان کے حق میں کیا کچھ کہا تھا اور پاکستان کی مخالفت میں کیا کچھ۔ ہم جس ملک میں بھی گئے ہم نے اس پروپگنڈے کا جال تنا ہوا دیکھا۔ لیکن اِنھی سرتوڑ کوششوں اور بے حساب ذرائع کے استعمال کے باوجود ہم بے سروسامان درویشوں کے مقابلے میں ہندوستانی وزارتِ خارجہ کو منہ کی کھانی پڑی۔ ہم جس ملک میں بھی گئے ہماری خاطر خواہ آؤ بھگت کی گئی۔ اگرچہ ہماری کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی لیکن ہمیں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔

مجھے اس تعلق میں مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر کے ساتھ ملاقات کی یاد آتی ہے۔ اُنھوں نے ہم سے ملتے ہی اس بات پر سخت تعجب کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے نمائندے اُن پر کیوں اس طرح زور ڈال رہے تھے کہ وہ ہمیں شرفِ ملاقات نہ بخشیں اور نہ ہماری پذیرائی کریں۔ عبدالناصر نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ ہمیں بتایا کہ اُنھوں نے ہندوستانی کارندوں کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا۔ صدر ناصر نے ہم سے یہ بھی کہا کہ وہ میری آؤ بھگت ایک عظیم مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس میں کوئی دخل نہ دینا چاہیے تھا اور اگر اس نے دیا ہے تو میں اس کو خاطر میں نہیں لا سکتا۔ اُنھوں نے ہمیں شیریٹن ہوٹل میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے رکھا۔ ہمارے استعمال کے لیے سرکاری گاڑیاں رکھی گئیں۔ اور خاص سرکاری آفیسر کو ہماری اعانت کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا۔ وہاں کے مقتدر اخبار "الجمہوریہ" نے مجھے کشمیر کی تحریکِ آزادی کا سپہ سالار کہہ کر پکارا۔ کشمیر کے حالات پر صدر ناصر سے گفتگو ہوئی۔ اُنھوں نے کہا کہ مصر برِصغیر ہندوستان کے استحکام میں خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کے پھن مارتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے برِصغیر ہندو پاک ایک سدِ آہن اور فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے مصر کے عوام کی دلی خواہش ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان جو بھی تنازعہ ہو اُس کو خوش اسلوبی سے حل کیا جائے اور ہم اس کے لیے نہ صرف برابر کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس سلسلے میں حسبِ منشا ہر قسم کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں۔

صدر ناصر ایک سادہ اور شفاف زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں بھی ہر طرح سے سادگی ٹپکتی تھی۔ مرحوم ناصر شکل و صورت، قد و قامت اور اندازِ تکلم کے لحاظ سے ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی نشست و برخواست اور اندازِ کلام میں کھوکھلی

مجھے اس تعلق میں مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر کے ساتھ ملاقات کی یاد آتی ہے۔ انھوں نے ہم سے ملتے ہی اس بات پر سخت تعجب کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے نمائندے اُن پر کیوں اس طرح زور ڈال رہے تھے کہ وہ ہمیں شرفِ ملاقات نہ بخشیں اور نہ ہماری پذیرائی کریں۔ عبدالناصر نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ ہمیں بتایا کہ انھوں نے ہندوستانی کارندوں کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا۔ صدر ناصر نے ہم سے یہ بھی کہا کہ وہ میری آؤ بھگت ایک عظیم مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس میں کوئی دخل نہ دینا چاہیے تھا اور اگر اس نے دیا ہے تو میں اس کو خاطر میں نہیں لا سکتا۔ انھوں نے ہمیں شیرٹن ہوٹل میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے رکھا۔ ہمارے استعمال کے لیے سرکاری گاڑیاں رکھی گئیں، اور خاص سرکاری آفیسر کو ہماری اعانت کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا۔ وہاں کے مقتدر اخبار "الجمہوریہ" نے مجھے کشمیر کی تحریکِ آزادی کا سپہ سالار کہہ کر پکارا۔ کشمیر کے حالات پر صدر ناصر سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مصر برصغیر ہندوستان کے استحکام میں خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کے پھن مارتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے برصغیر ہندو پاک ایک سدِ آہن اور فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے مصر کے عوام کی دلی خواہش ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان جو بھی تنازعہ ہو اُس کو خوش اسلوبی سے حل کیا جائے اور ہم اس کے لیے نہ صرف برابر کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس سلسلے میں حسبِ منشا ہر قسم کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں۔

صدر ناصر ایک سادہ اور شفاف زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں بھی ہر طرح سے سادگی ٹپکتی تھی۔ مرحوم ناصر شکل و صورت، قد و قامت اور اندازِ تکلم کے لحاظ سے ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی نشست و برخواست اور اندازِ کلام میں کوئی بھی رعونت اور اکڑفوں نظر نہیں آتی تھی، بلکہ اس میں سادگی کی شان ٹپکتی تھی۔ بیگم جمال عبدالناصر بھی سادگی اور شرافت کا مجسمہ نظر آتی تھیں، اور لاگ اور لگاوٹ سے بہت دور۔ قاہرہ میں ہم نے کچھ اور شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ جن میں انوار السادات جو اس وقت مصر کی قانون سازیہ کے سپیکر اور اب وہاں کے صدر ہیں، اور جامعہ ازہر کے شیخ اعظم شامل تھے۔ محمد حسنین ہیکل سے ہم کئی بار ملے۔ وہ اُس وقت مصر کے سب سے بڑے اخبار "الاہرام" کے چیف ایڈیٹر تھے، اور صدر ناصر کے قریبی معتمد اور مشیر۔ ہیکل بڑے ذہین اور طباع آدمی ہیں۔ اُس وقت عرب دنیا میں اُن کی ایک قابل ترین صحافی کی حیثیت سے دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور انھیں بڑے بڑے امیروں، وزیروں اور لیڈروں سے زیادہ وقار اور اثر و رسوخ حاصل تھا۔ سعودی عرب میں ہم نے شاہ فیصل مرحوم سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ ہم نے نیازمندی کے طور پر اُن کی خدمت میں کشمیر کے کچھ تحائف بھی پیش کیے، جنھیں انھوں نے بڑی شکرگزاری کے ساتھ قبول فرمایا۔ وہ ایک قابل، ذہین، روشن دماغ اور بیدار مغز بادشاہ تھے۔ اس کے علاوہ اپنی گفتگو میں وہ بھی خاصے صاف گو واقع ہوئے تھے۔ بڑی عزت افزا بات تھی کہ حرمین شریف کی کلیدیں اُن کے ہاتھوں میں تھیں۔ عرب ملکوں بلکہ دنیائے اسلام کو اُن سے کافی اُمیدیں تھیں، اور اُن کے خلوص و ذہانت سے اُمیدیں تھیں کہ وہ اسلام کے احیائے نو میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔ لیکن عمر نے اُن کے ساتھ وفا نہیں کی۔ وہ اپنے ہی فاتر العقل عزیز کے ہاتھوں اجل کا جام پی گئے۔ کشمیر کے سوال پر انھوں نے لگی لپٹی کے بغیر کہا کہ سعودی عرب کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کا حامی ہے اور حامی رہے گا، کیونکہ سعودی عرب کی حکومت اور عوام سمجھتے ہیں کہ یہی قرینِ انصاف ہے اور یہی معقولیت کا تقاضا بھی۔ انھوں نے

ہماری بڑھ چڑھ کر آؤ بھگت اور تعظیم کی اور ہمارے آرام و آسایش میں ذاتی دلچسپی دکھائی۔ حج کی رسومات میں غسل کعبہ کو بہت توقیر و تقدیس حاصل ہے۔ اور اس موقع پر خاصانِ بارگاہ کو ہی وہاں پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ مرحوم شاہ کی شفقت تھی۔ کہ اُنھوں نے غسل کعبہ کی اس خاص الخاص تقریب میں ہمیں اپنے شانہ بشانہ رکھا۔

حج کے زمانے میں پاکستان سے آئے ہوئے دوستوں سے بھی ہمارا سلام کلام رہا ہمارے دیرینہ اور مخلص ساتھی پیر محمد مقبول گیلانی صرف ہم سے ملنے کے لیے وہاں آگئے تھے۔ چنانچہ اُن سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ اس زندگی میں ہم اُن کے ساتھ آخری بار مل رہے ہیں۔ کیونکہ واپس پاکستان لوٹ جانے کے بعد وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے۔ اُن کی بڑی شدید تمنا تھی کہ وہ اپنے محبوب وطن کشمیر آکر اس کی بیج اور شفیق آغوش میں ہمیشہ کے لیے سما جائیں۔ لیکن یہ معصوم سی آرزو ہندوستانی حکمرانوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔ بالآخر وہ اس تمنا کو اپنا داغِ جگر بنا کر دیارِ غیر میں اِس دُنیا سے چل بسے۔

پاکستان کے افسروں میں جن لوگوں سے مُلاقات ہوئی ان میں ایر مارشل نور خان قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کیا مجال کہ اُن کے منہ سے کوئی ہلکا اشارہ بھی اس قسم کا ملا ہو کہ پاکستان ہندوستان کے خلاف کسی اقدام کے تانے بانے بُن رہا ہے۔ مکہ معظمہ میں اپنے قیام کے دوران میں نے وہاں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ ہماری اگرچہ کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی لیکن ہمیں ممتاز مجاہدین آزادی کی حیثیت سے اِس میں مدعو کیا گیا تھا۔ کانفرنس کی رسمِ افتتاح شاہ فیصل نے خود انجام دی اور اس کی صدارت اُن کے برادر شہزادہ عبدالعزیز نے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کانفرنس میں جب ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو ہوئی تو میں نے بڑی بےباکی

سے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے وطن کے معاملات و مسائل سے اپنے آپ کو گہرے طور پر شامل رکھیں۔ اور وہاں غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کو مضبوط بنائیں میرے اِس بیان پر چند ممالک کے نمائندوں نے اگرچہ تیوریاں چڑھائیں لیکن کانفرنس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کوئی ریفرنس منظور نہ کرنے کے متعلق میرے مشورے سے اتفاق کر لیا۔ کانفرنس میں اُن مسلم ممالک میں جہاں آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی تھی آزادی کی تحریک کو تقویت دینے کے معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی۔ جس میں میرے علاوہ عراق کے ایک سابق وزیر اعظم ڈاکٹر فاضل جمالی فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی مرحوم اور پاکستان کے ڈاکٹر فضل الرحمن بہ حیثیت ارکان مقرر کیے گئے۔

الجزائر میں بھی ہمیں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ ہماری مُلاقاتیں الجزائر کے مختلف لیڈروں سے ہوئیں۔ جن میں وزیر خارجہ بوطو فیقا، کرنل حوری بومدین اور خود صدرِ مملکت احمد بن بیلا کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ابھی ہم الجزائر پہنچے ہی تھے کہ دوسرے دن اچانک چین کے وزیر اعظم چو این لائی وہاں پہنچے۔ صدر مملکت نے ایک عظیم مہمان کی حیثیت سے اُن کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ دیا۔ جس میں مجھے اور بیگ صاحب کو خاص طور مدعو کیا گیا تھا۔ استقبالیہ میں الجزائر کے بیشتر وزرا سرکردہ رہنما، فوجی افسر اور عمائدین موجود تھے۔ کرنل بومدین ایک کونے میں خاموش ایستادہ تھے۔ ان کے ساتھ علیک سلیک ہوئی تو ہم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ ان کے چہرے سے ایک سنجیدگی اور تجیدگی برس رہی ہے۔ جیسے وہ ہجوم افکار میں گم سُم ہوں۔ ایسی محفلوں میں جہاں اس قسم کی چہل پہل ہو چہروں پر جو بشاشت نظر آتی ہے اُن کا چہرہ اُس سے یکسر خالی تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی وہ صدرِ مملکت کو ہی گرفتار کر کے خود الجزائر کے سیاہ و سفید

کے مالک بن جائیں گے اور اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے الجزائر کو استحکام بخشیں گے۔ بن بیلا اُن کے برعکس ایک جھلستی اور چہکتی مہکتی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ الجزائر کی زبردست جنگ آزادی کے ہیرو اور انقلاب کے ایک جری قائد مانے جاتے تھے۔ اور خود اُن کی طبیعت میں نمود و نمائش کا رجحان تھا۔ بوطو نیقا کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ جب ہم اُن سے ملنے کے لیے ان کے دفتر گئے تو انھوں نے کہا "آپ ہی کی طرح ہم نے بھی بہت دیر تک اپنی اُمیدیں اقوام متحدہ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن وہاں ہمیں کھوکھلی اور خالی باتوں کے سوا اور کچھ نہ ملا چنانچہ وہاں سے مایوس ہو کر ہم نے اپنے قوت بازو کو آزمانا چاہا اور میدان کارزار میں کود پڑے۔" اس کے بعد انھوں نے کھڑکی سے باہر ایک وسیع و عریض قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ اُن ہزاروں شہیدوں کے خون کا فیض اور فضل ہے کہ ہم اس وقت آزاد ہیں۔ الجزائر کے عوام کی آزادی کا اعلان اِن ہی شہیدوں کے خون کی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ چو۔ این۔ لائی کو دیے گئے استقبالیہ میں وہ بن بیلا کے ساتھ مہمانِ خصوصی کے جلو میں ایک طرف کو بیٹھے ہوئے تھے۔ اور خاص مدعوئین کو چو۔ این۔ لائی سے تعارف و تکلم کے لیے الگ الگ بلا رہے تھے، چنانچہ مجھے بھی بلایا گیا۔ میری چو۔ این۔ لائی کے ساتھ علیک سلیک ہوئی انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور شام کو مجھے الگ ملنے کے لیے وقت دیا۔ چنانچہ جب میں اور بیگ صاحب وقت مقررہ پر ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب اور پُر اسرار مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ ہم نے اُن سے اُس معاہدے کے متعلق دریافت کیا جو انہی دنوں چین اور پاکستان کے مابین گلگت کے سرحدی معاملات کے متعلق ہوا تھا۔ گلگت ہماری ریاست کا ایک حصّہ تھا اور ہمیں اِس کے معاملات

سے قدرتی طور گہری دلچسپی تھی۔ چو این لائی نے ٹھہر ٹھہر کر لیکن مستحکم لہجے میں جواب دیا کہ "چین اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ تمام جھگڑوں کو جن میں سرحدوں کے جھگڑے بھی شامل ہیں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہنسی خوشی نپٹانا چاہتا ہے۔ کشمیر کے شمال کی طرف گلگت کا علاقہ اِس وقت پاکستان کی تحویل میں ہے اس کی سرحد چونکہ چین کے ساتھ ملتی ہے اس لیے اس کا تعیّن چین کے نقطۂ نگاہ سے ضروری تھا۔ لیکن اس معاہدے میں ہم نے ایک شرط یہ لگادی ہے کہ یہ معاہدہ اُسی وقت تک برقرار رہے گا جب تک کہ گلگت پاکستان کی تحویل میں ہے۔ اگر کسی سمجھوتے کی وجہ سے آئندہ حالات بدل جائیں تو ہندوستان یا کسی اور فریق کو جو گلگت کا والی بن جائے' حق حاصل ہوگا کہ وہ اس معاہدے میں ترمیم و تبدّل کا مطالبہ کرے۔"

اِس کے بعد چین اور ہندوستان کے تعلّقات پر بات چلی اور ہم اُن کی وسعتِ مُطالعہ پر دنگ رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان خود ایک توسیع پسند ذہنیت رکھتا ہے۔ لیکن اُلٹا الزام چین پر تھوپتا ہے۔ چین اتنا وسیع ملک ہے اور اس کے پاس اس قدر علاقہ ہے کہ مزید زمین ڈھونڈنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ فرصت۔ انھوں نے جواہر لال نہرو کی لکھی ہوئی کتابوں کے کچھ اقتباسات کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ خود تحریری طور پر ہندوستان کے توسیع پسندانہ عزائم کا خاکہ کھینچ چکے ہیں اور اب ہندوستان اُن خاکوں میں رنگ بھرنے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے علاقوں تک ہی کیا جافنا اور سماٹرا کو اپنے سامراجی محور کے علاقے خیال کرتے ہیں اور اپنی ظاہری روشن خیالی کے غلاف میں قدیم ہندو راج کی تجدید اور توسیع کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ چو این لائی ایک ہوشیار اور ذی فہم شخص تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ گفتگو کی سنجیدگی سے ماحول کسی قدر بوجھل ہوگیا ہے تو انھوں نے فوراً موضوع کا رُخ بدل ڈالا اور ہم سے بالکل

خلاف توقع سوال کیا "کیا آپ کبھی چین گئے ہیں؟" جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انھوں نے بڑی اداکاری سے تعجب ظاہر کیا اور کہا کہ چین تو آپ کا اس قدر قریبی پڑوسی ہے کہ آپ اپنے مکان کی چھت سے اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں گن سکتے ہیں۔ اور پھر چین اور کشمیر کے ماضی میں بہت سے روابط رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں چین آکر وہاں کی سیر کرنے اور کشمیر کے متصل چینی علاقوں کے حالات دیکھنے کی دعوت دی۔ اُن دنوں انڈونیشیا کے صدر سکارنو کے ساتھ چینیوں کی پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ چنانچہ چو۔ این۔ لائی نے ہمیں صلاح دی کہ ہم انڈونیشیا پہنچ جائیں وہاں سے ہمیں چین پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ ہم نے محتاط الفاظ میں اُن کا شکریہ ادا کیا اور تکلفاً کہا کہ چین جانے کا شوق کس کو نہیں اور مناسب وقت پر ہم ضرور چین دیکھنے کے لیے وقت نکالیں گے۔ اس کے بعد ملاقات ایک خوشگوار انداز میں ختم ہوئی اور چینی وزیر اعظم نے اپنی پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔

میں نے اپنی پہلی فرصت میں اس ملاقات کی تفصیل الجزائر میں مقیم ہندوستانی سفیر کو بھیج دی لیکن چینی وزیر اعظم کے ساتھ جو نامہ نگار تھے انھوں نے اسی اثنا میں خبر پیکنگ بھیج دی اور پیکنگ ریڈیو نے اُسے بڑھا چڑھا کر نشر کیا۔ اُدھر مغربی ممالک کے سرکردہ اخبارات نے اس خبر کو شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا اور ایسا کرنا ہندوستانی حکمرانوں کے لیے سانڈ کو لال کپڑا دکھانے کے برابر اشتعال انگیز ثابت ہوا۔ اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ ہندوستانی اخبارات کے تیور بدل گئے۔ ہندوستانی حکومت کا ذہن اور دہن بدل گیا اور مُلک میں ہمارے خلاف نفرت پھیلانے اور کردار کشی کی مہم نقطۂ عروج کو پہنچا دی گئی۔ پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر ہم پر طرح طرح کے الزام عائد کیے گئے۔ کسی نے ہمیں ہندوستان بدر کرنے کا سجھاؤ دیا تو کسی نے ہمیں

ہندوستان طلب کر کے زندان کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کی تجویز پیش کر دی۔ الغرض ہمارے سفرِ حج پر فوراً رضامندی ظاہر کرتے ہوئے گلزاری لال نندہ اور اس کے ہم خیالوں نے جس سازش کا پھندا تیار کیا تھا اُس کو ہمارے گلے میں لگانے کے لیے اب مُلک کے اندر اور باہر عوام کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ اور اس سلسلے میں ہر قسم کی تہمت تراشی اور بہتان تراشی جائز اور برحق سمجھی جا رہی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران ہم نے وہاں کے وزیر اعظم یا حکومت کے کسی اور عہدے دار سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اُن کی طرف سے کوئی پہل ہوئی۔ البتہ وہاں مختلف اداروں اور انجمنوں نے ہمارے اعزاز میں کئی استقبالیہ تقاریب کا انتظام و انصرام کیا بلکہ ہوائی اڈے پر بھی ہمارا بڑا پُرجوش عوامی استقبال ہوا۔ ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کی کہانی کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ جُڑا ہوا ہے۔ ہم ہندوستان کی سرکاری ایرلائن ایئر انڈیا کے جہاز میں لندن جا رہے تھے۔ ہندوستانی حکّام کو خوب معلوم تھا کہ ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے ایک بڑا اژدحام موجود ہے اور ہمارے استقبال کو بڑی پبلسٹی ملے گی۔ چنانچہ جنیوا کے اڈے پر جہاز کو کئی گھنٹے تک روکے رکھا گیا۔ اور عذر یہ کیا گیا کہ جہاز کا کوئی پرزہ خراب ہو گیا ہے۔ ہمیں صبح سویرے لندن پہنچنا تھا۔ اور حکومتِ ہند کے کارندوں کا خیال تھا کہ کچھ گھنٹوں کے انتظار کے بعد منتظر لوگ تھک ہار کر چلے جائیں گے۔ اسی بنا پر شام کو جہاز لندن پہنچا۔ لیکن ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوئے لوگ بڑے سخت جان تھے۔ وہ بارہ گھنٹوں کی تاخیر کے باوجود وہیں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے تھکن کے باوجود ہمارا بڑی محبت اور خلوص سے خیر مقدم کیا۔ انگلستان کا پریس بھی غضب کا مستعد اور آزاد ہے اور ہم پریس کی توجہ کا خاص مرکز بن گئے۔ ہندوستانی

ہائی کمیشن کی ساری کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور وہاں ہماری سرگرمیوں کی تفصیلات برابر چھپتی رہیں۔ انگلستان میں ہزاروں کشمیری باشندے روزگار تعلیم وغیرہ کے سلسلے میں مُقیم ہیں۔ اور اُن میں زیادہ تعداد پونچھ اور میرپور کے تارکینِ وطن کی ہے یہ لوگ کافی عرصے تک سمندری جہازوں میں کام کر کے روٹی روزی کماتے رہے اور بالآخر انگلستان کے مختلف شہروں میں پہنچ گئے جہاں یہ مقامی کارخانوں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی جفاکشی کی بدولت بڑی بڑی جائدادیں بنالی ہیں۔ چنانچہ برمنگھم، ناٹنگھم، گلاسکو، شفیلڈ، بریڈ فورڈ اور مانچسٹر اور ایسے ہی صنعتی شہروں میں اُن کا خاصا اثر ہے۔ انھوں نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہمیں اپنے شہروں میں لے گئے۔ وہاں ہمارا استقبال کیا اور ہمیں مختلف عوامی تقریبات میں بولنا پڑا۔ الغرض لندن کے قیام کا زمانہ ہمارے لیے خاصی مصروفیات کا وقت رہا۔

اُدھر ہندوستان میں شدت پسندوں اور کٹر پنتھیوں نے ہمارے خلاف طوفانِ بے تمیزی بپا کر دیا۔ اس حد تک کہ اس کے تھپیڑے سات سمندر پار انگلستان کے ساحل پر ہمارے سکون میں خلل ڈالنے لگے۔ ایک دفعہ انگلستان میں اُس زمانے میں ہندوستان کے ہائی کمشنر ڈاکٹر جیوراج مہتہ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور مجھ سے شکایت آمیز لہجے میں بولے کہ میں یہاں ہندوستان کے خلاف مہم چلا رہا ہوں اور اس کے سبب ہندوستانی وزارتِ خارجہ نئی دہلی سے روز اُن کی بازپرس کرتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ لندن میں جو کچھ بھی کرتا یا کہتا ہوں اُس کا خلاصہ یہاں کے اخبارات میں روز چھپتا ہے۔ ہمارے جلسوں میں ہندوستانی اخبارات کے نامہ نگار بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ براہِ کرم اس بات کی نشاندہی کیجیے کہ ہم نے کون سی بات

ہندوستان کے خلاف کہی ہے۔ جس پر ہندوستانی وزارتِ خارجہ کو تاؤ آتا ہے۔ مہتہ صاحب نے بڑی سنگینی سے جواب دیا کہ اخبارات میں تو ایسی کوئی بات نہیں ملتی میں نے فوراً جواب میں کہا پھر آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اپنی حکومت کو یہ جواب دیجیے کہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر اُن کو کونسی آکاش وانی آتی ہے کہ میں ہندوستان کے خلاف لندن میں مہم چلا رہا ہوں۔ جیوراج مہتہ کہتے تو کیا کہتے۔ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہندوستان میں ہمارے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مہم چلائی جا رہی تھی اور ہماری شبیہ کو اس لیے مجروح کیا جا رہا تھا کہ کشمیر کے سلسلے میں جو پہل جواہر لال نہرو نے کی تھی اس کا ہر امکان ختم کر دیا جائے۔ اور ہمارے خلاف سخت اقدامات کے لیے نفسیاتی فضا تعمیر کی جائے۔ اُدھر کشمیر میں محاذِ رائے شماری کے خلاف پولیس ایکشن شروع کیا گیا تھا۔ حج پر روانہ ہونے سے قبل میں نے عوام سے کہا تھا کہ وہ اُن کالی بھیڑوں سے جو قوم کے جسم سے جونکوں کی طرح چمٹی ہوئی ہیں اور اس کا خون پی پی کر موٹی ہو رہی ہیں کوئی واسطہ نہ رکھیں اور اُن کے ساتھ ترکِ تعلقات کر کے ان کو اخلاقی اثر میں لانے کی کوشش کریں۔ تاکہ انھیں احساس ہو کہ وہ اپنے پانچویں کالم جیسی سرگرمیوں سے کس طرح قومی مفادات کو زک پہنچا رہے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے اس پر عمل شروع کیا۔ تو اُن کالی بھیڑیوں کی حالت قابلِ رحم بن گئی۔ اُن کو حجامت بنوانے کے لیے نائی نہ ملتا تھا۔ اور وہ مر جاتے تو اُن کو اگرچہ مشکل سے قبرستان تک مُردہ پہنچانے کے لیے چند آدمی بھی میسّر ہو جاتے پھر بھی اُن کے جنازے میں کوئی شامل نہیں ہوتا تھا اس طرح یہ بات دنیا کے سامنے آگئی کہ قوم کے بڑے دھارے سے ہٹ کر یہ لوگ کتنے بے توقیر بن گئے — یہ لڑائی گھروں کی چاردیواریوں میں بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ قومی جذبے سے معمور کئی باعزت دخترانِ کشمیر نے اپنے بے ننگ و

ناموس شوہروں کے ساتھ گذر بسر سے بھی انکار کر دیا۔ اور اپنے مایکے چلی گئیں۔ وہلی میں اس تحریک سے ایک ہذیان کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ تحریک مہاتما گاندھی کے عدم تشدد اور ترکِ موالات کے اصولوں کے عین مطابق تھی اور اس میں تشدد کا کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن دہلی میں سادھو سماج کے بڑے مہنت گلزاری لال نندہ جیسے لوگ بیٹھے تھے۔ انھیں بھلا گاندھی واد سے کیا دلچسپی تھی؟ وہ صرف طاقت کی زبان سے واقف تھے۔ چنانچہ محاذ کے کارکنوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی شروع کر دی گئی اور کوئی دو ہزار نفوس کو کال کوٹھڑیوں میں دھکیل دیا گیا۔

ہندوستانی حکمران بڑی چالاکی سے یہ ناٹک کھیل رہے تھے۔ وہ ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ یا تو ہم ڈر کر ہندوستان کی طرف رُخ ہی نہ کریں گے اور اس طرح سے انھیں ہمیشہ کے لیے اس دردِ سر سے خلاصی ہو جائے گی اور کشمیر کے لوگ بھی ہمیں بھول جائیں گے یا اگر بالفرض محال اس طوفانی فضا میں ہندوستان لوٹنے کی ہمت بھی کی تو پھر بھی حکمرانوں کو میری گرفتاری کے لیے جواز مل جائے گا۔ بعد میں مجھے دوستوں نے بتایا کہ لال بہادر شاستری نے کابینہ کے اجلاس میں رائے دی تھی کہ میں ہندوستان ضرور واپس آؤں گا اور میں ایسا آدمی نہیں کہ ڈر کے مارے میدان سے بھاگ جاؤں۔ لیکن گلزاری لال نندہ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ میں سہم جاؤں گا اور ہندوپاک کی سرزمین پر قدم رکھنے سے گریز کروں گا۔ اندرا گاندھی اس وقت کابینہ کی ایک رُکن تھیں۔ انھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے خلاف رائے دی تھی۔ چنانچہ سبھی لوگ ڈھلمل یقینی کا شکار ہو گئے۔ بہرحال جب ہم نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو حکومت یہ طے نہ کر سکی تھی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ کشمیر سے مولانا محمد سعید مسعودی ہم کو سندیش بھیج رہے تھے کہ آپ کا واپس

وطن آنے کی بجائے باہر رہنا ٹھیک رہے گا۔ مولوی صاحب شاید ہمیں منظر سے ہٹا کر اپنی قیادت کا بجھا ہوا چراغ جلانا چاہتے تھے کیونکہ ہمارے ہوتے ہوئے اُن کی دال نہیں گلتی تھی۔

اُدھر ہمیں ہندوستانی سفارت خانے کی طرف سے بتایا گیا کہ اگر ہم فوری طور دورہ ادھورا چھوڑ کر واپس نہ لوٹے تو ہمارا پاسپورٹ منسوخ کر دیا جائے گا اور ہمارے سفر کی دستاویزات کی توسیع سے بھی انکار کر دیا گیا۔ ہم نے فوراً فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس وطن روانہ ہونا چاہیے۔ اور قضیہ زمین بر سرِ زمین کے مصداق وہیں نئی آزمائشوں کے آگے سینہ سپر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ جب ہم واقعتاً ہندوستان جانے والے جہاز میں پرواز کر رہے تھے تو اس کی اطلاع دہلی گئی۔ اب وہ کریں تو کیا کریں۔ فوراً رات گئے کابینہ کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ لال بہادر شاستری نے نندہ کو یاد دلایا کہ اُنھوں نے جو کچھ میرے بارے میں کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا ہے اور میں نے راہِ فرار اختیار کرنے سے انکار کر دیا ہے بہرحال میری نظربندی کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ ہمارا جہاز صبحِ صادق کے وقت پالم پر اُترا۔ اس وقت ستارۂ سحری جگمگ کر رہا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہوائی اڈہ ایک پولیس کیمپ بن گیا ہے۔ اور اسلحہ واسباب سے لیس پولیس ہماری منتظر ہے جونہی ہمارا جہاز ٹھہرا پولیس نے اُسے گھیر لیا۔ اُدھر اخباری نمائندوں کو بھی ہماری آمد کی بھنک مل گئی تھی۔ وہ ہماری تصویر لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ پولیس والوں نے ڈنڈے اور ڈھالیں اس طرح کھڑی کر دیں کہ ہمارے وجود انہی کے عقب میں چھپ گئے اور یہی فوٹو اخباروں میں چھپ گئے۔ بہرکیف مجھے اور بیگ صاحب کو ایک دوسرے جہاز کی طرف لے جایا گیا اور بنگلور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

بہرکیف۔ بیگم صاحبہ اور ہمارے دو اور ساتھیوں کو دہلی جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن بیگم صاحبہ کے کشمیر میں داخلے پر پابندی عائد کی گئی۔ البتہ پیر عبدالغنی اور باورچی کو گھر لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ مِردولا جی اور ہمارے کچھ اور دوست ہوائی اڈے کے باہر کھڑے تھے۔ بیگم صاحبہ اُن کے گھر چلی گئیں۔

اُدھر کشمیر میں بیک وقت زبردست اقدامات کیے گئے۔ کوئی ایک درجن اخبارات جن میں محاذِ رائے شماری کے وہ اخبارات بھی شامل تھے جنھیں ہم نے ۱۹۶۳ء میں رہائی کے بعد شروع کیا تھا، بند کر لیے گئے۔ بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اس اقدام پر کشمیریوں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ لوگوں کو گولیوں اور لاٹھی سے کچل دیا گیا۔ یہاں تک کہ جامع مسجد کے ایک جلسے میں اس قدر تابڑ توڑ لاٹھیاں برسائی گئیں کہ مولوی محمد سعید مسعودی اور خواجہ محی الدین قرہ کے چہروں پر بھی لاٹھیاں پڑیں اور اُن کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ انھیں بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ▲▲▲

٦٧

جلاوطنی کی صعوبتیں

جب ہمارا جہاز بنگلور پہنچا تو وہاں سے ہمیں ایک موٹر کار میں بٹھا کر اوٹاکمنڈ پہنچا دیا گیا جو تامل ناڈو میں نیلگری پہاڑیوں میں واقع ہے۔ راستے میں سرنگاپٹنم پڑتا تھا جو سلطان ٹیپو کا دارالسلطنت رہ چکا ہے اور جہاں اُن کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ مجھے اُن کے مزار پر حاضری دینے کا شوق تھا۔ چنانچہ ہم نے کار رکوالی اور اس عظیم ہندوستانی کی تربت پر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ٹیپو نے ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی زندگی گذارنے کے ساتھ ساتھ دکن میں ایک سچی سیکولر سٹیٹ قایم کی تھی۔ وہ انگریزوں کے خلاف آخری دم تک لڑے۔ اگر خود اُن کے ہم وطنوں نے اُن سے غداری نہ کی ہوتی تو آج شاید ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔ بہرحال اُسی دن ہم اوٹی پہنچ گئے۔ اب ہم تھے اور پھر وہی تنہائی۔ اور بال و پر کٹنے کا ماتم۔ لیکن ہم نے اس پر صبر و شکر کے ساتھ اپنی زندگی کے معمولات شروع کر دیے۔ ابھی مشکل سے ہمارے قیام کو مہینہ بھر گذرا تھا کہ بیگم صاحبہ کی صحت بگڑ گئی اور ڈاکٹری مشورے کے مطابق انھیں سرینگر منتقل کر کے نشاط باغ کے قریب ایک بنگلے میں نظربند رکھا گیا۔ اوٹاکمنڈ ایک بارونق جگہ ہے۔ وہاں سیاحوں کی ریل پیل رہتی ہے اور وہاں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ہر جمعہ کو میں نماز کے لیے جامع مسجد جاتا تو وہاں ایک مجمع لگ جاتا تھا اور لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ مجھے اوٹی کی میونسپل

حدود میں نقل و حرکت کی آزادی تھی۔ کسی ذی تفکر اس قسم کے منسٹر نے مرکز کو بتایا کہ اوٹی ایک غیر محفوظ جگہ ہے اور وہاں ہزاروں آدمی مجھ سے ملنے کے لیے آجاتے ہیں۔ اس لیے مجھے کوڈائی کنال جیسے الگ تھلگ مقام میں رکھا جائے۔ جہاں لوگوں کی آمد و رفت نسبتاً کم ہے اور میری حفاظت کے بہتر انتظامات ہو سکتے ہیں۔

اوٹی کے مختصر قیام کا ایک واقعہ ابھی تک میرے صفحۂ ذہن پر تازہ ہے جب میں وہاں جامع مسجد میں نماز کے لیے جایا کرتا تو مرکزی محکمہ سراغ رسانی کے کارندے میرے دائیں بائیں منحوس پرچھائیوں کی طرح منڈلاتے رہتے اور کسی کو میرے ساتھ بات کرنا تو درکنار میرے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی نے جو شکل و صورت سے کشمیری لگتا تھا، مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب سلام دیا اور کشمیری میں اُس کی خیر و عافیت پوچھی۔ جس کا اس نے کشمیری میں ہی جواب دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ محکمہ سراغ رسانی کے عقل کے اندھے یہ سمجھے کہ میں نے اپنی زبان میں اسے کوئی خفیہ اور خطرناک پیغام دیا ہے۔ اصلیت یہ تھی کہ یہ شخص ایک خانساماں تھا جو کسی انگریز کے ساتھ اوٹاکمنڈ میں کام کرتا تھا۔ مجھے سلام کرنا اس کے لیے بہت مہنگا ثابت ہوا۔ اُس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس کے شناختی کاغذات کشمیر بھیج دیے گئے۔ جب تک وہاں سے پوچھ تاچھ کا جواب نہ آیا اس بے گناہ کو حوالات کی ہوا کھانا پڑی۔ جب مجھے خبر ملی تو میں نے بہت احتجاج کیا۔ اسی طرح ایک برطانوی صحافی مسٹر سٹراسی کو بھی اسی شبہے پر کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے اوٹی میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اُسے دہلی پہنچایا گیا اور وہاں جاکر ہی اس کی جان چھوٹی چنانچہ ان تمام عوامل کے نتیجے میں مجھے اوٹاکمنڈ سے اٹھا کر کوڈائی کنال پہنچایا گیا۔ وہاں ایک جنگل "کوہ نور" نامی میری قیام گاہ تھی۔ اب میں کوہ نور میں اکیلا دندنا رہا تھا۔ لیکن جلد ہی بیگم صاحبہ کو بھی میرے پاس آنے کی اجازت دی گئی اور وہ ہمارے فرزند نسبتی

غلام محمد شاہ کے ساتھ میرے پاس پہنچ گئیں۔ وقتے وقتے سے میرے بچے اور بچیاں بھی وہاں آتی رہیں اور باقاعدہ اجازت حاصل کر کے میرے پاس ہفتے دو ہفتے گذارتے رہے اگست ۶۵ء کے دوسرے ہفتے میں کشمیر کے متعلق اطلاعات آنے لگیں کہ پاکستان نے اپنے دراندازوں کو وہاں بھیجا ہے۔ اتفاق سے پہلی خبر ۹ اگست کو آئی۔ جو کشمیر میں میری خلاف آئین برطرفی اور گرفتاری کی ۱۱ویں برسی کے طور پر منایا جا رہا تھا۔ ساری ریاست میں اتھل پتھل مچ گئی اور حکومت ہند کو بھاری فوجی کمک کشمیر پہنچانا پڑی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس موقع پر میں کشمیر سے ہزاروں میل دور کوڈائی کنال میں پڑا ہوا ہوں۔ ورنہ گلزاری لال نندہ کی قماش کے لوگ مجھ پر ہی سازباز اور سازش کا الزام تھوپ دیتے اور کہتے کہ حج کے دوران میں نے ہی پاکستانی افسروں کو کشمیر میں درانداز بھیجنے کی ترغیب دی تھی۔

بعض اوقات انسان کو واقعات کی سطح بڑی ناگوار اور کڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ بعد میں یہی کڑواہٹ اُس کے حق میں شہد اور انگبین کا کام کرتی ہے۔ شاید اس تازہ ابتلا کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔

میں نے کوڈائی کنال میں کوئی تین سال جیسے تیسے کر کے گذار لیے۔ جے پرکاش نرائن اس دوران مجھ سے ایک مرتبہ ملنے کے لیے تشریف لائے۔ کوڈائی کنال ایک خوبصورت اور خاموش جگہ ہے۔ جہاں یورپ اور امریکہ کے بہت سے مشن کام کرتے ہیں۔ "کوہ نور" کے پاس ہی ایک کانونٹ واقع ہے۔ وہاں کی اُستانیاں ہمارے لیے بڑی ہمدردی اور دردمندی کے جذبات رکھتی تھیں۔ اور کبھی کبھی کالج کی تقریبات میں ہمیں بلایا بھی کرتی تھیں۔ وہاں زیر تعلیم بچیاں دور دور سے تعلیم کے لیے آتی تھیں جیسے بمبئی وغیرہ۔ وہ بھی ہم سے گھل مل گئی تھیں۔ اور ہمیں پیار کرتی تھیں۔ ہمیں ان سے

کافی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہم ہر روز پولیس کے کڑے پہرے میں کوڈائی کی بہت ہی سُندر جھیل کے ارد گرد گھوما کرتے تھے اس جھیل میں سیر کرنے کے لیے کشتیاں وغیرہ بھی رکھی ہوئی ہیں اور ہم نے بھی کئی بار جھیل میں کشتی پر بیٹھ کر سیر کی اور کشمیر کے جھیلِ ڈل کی یاد تازہ کر لی۔ کبھی کبھی سیر کرتے ہوئے کوئی راہ گیر ہم سے علیک سلیک کی کوشش کرتا لیکن بعد میں اسے پولیس کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ الغرض پولیس کسی کے میرے ساتھ سلام کلام کی روادار نہیں تھی۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ مشہور فلمی اداکار محمد یوسف خان جو دلیپ کمار کے فلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں ہم سے ایک سماجی تقریب میں ملے وہ ہمارے پاس چلے آئے اور ہماری خیر و عافیت معلوم کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے سلام دُعا کا تبادلہ کرنے کی جسارت کی پاداش میں اس پائے کے فنکار کو بھی اربابِ اقتدار کے عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۹۶۵ء میں جب ہند پاکستان جنگ چھڑ گئی تو ہمارا مکان سے نکلنا ہی بند کر دیا گیا۔ کسی منچلے نے مرکزی حکومت کو یہ اطلاع دی کہ پاکستان مجھے ہیلی کاپٹر بھیج کر اغوا کر کے لے جائے گا۔ اور مرکز کے لال بجھکڑ جغرافیہ کے سارے سبق بھول کر اپنی ضعیف الاعتقادی کو آشکارا کر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو تھوڑی بہت ورزش ہمیں روزانہ سیر کرنے کے بہانے میسّر ہوتی تھی اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب ہلنا جُلنا بند ہو گیا تو میرے جسم میں شکر کی مقدار بڑھنے لگی۔ ورزش اور چہل قدمی سے فاضل شکر خرچ ہوتی ہے لیکن ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے خون میں اس کی سطح بڑھنے لگتی ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا اور ذیابیطس کی پریشان کن بیماری کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ جب بیماری نے نازک صورت اختیار کر لی تو مجھے دہلی لا کر آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں علاج و معالجے کے لیے داخل کر دیا گیا۔ میں وہاں ایک مہینہ رہا صحت یابی کے بعد مجھے دہلی کے ہی ایک

مکان ۳۔ کوٹلہ لین میں نظر بند کر دیا۔ مکان کے ارد گرد بہت اونچائی تک خاردار تار کا جنگلہ لگایا گیا تھا اور پولیس کا زبردست پہرہ بٹھایا گیا تھا۔ میں اندر بیٹھا ہوا دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت کے لیڈروں کے لچھن دیکھ رہا تھا اور صبر و شکر کے ساتھ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اسی دوران باہر کی دنیا میں کچھ اہم واقعات ہوئے۔ کشمیر میں دراندازی نے ہندوستان کی پوزیشن ہلا کے رکھ دی۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ میں پہلی مرتبہ کشمیر کی لڑائی کشمیر سے باہر دو ملکوں کی بین الاقوامی سرحد تک جا پہنچی۔ ٹینکوں کی کچھ خوفناک لڑائیاں لڑی گئیں اور فضا میں مانگے تانگے کے ہوائی جہازوں کی ٹکریں DOG FIGHTS ہوئیں۔ دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے شہروں پر بم برسائے ہندوستانی فوج کے جنرل چودھری کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ رات کا کھانا لاہور کے جم خانہ کلب میں کھائیں گے، اچھوگل کنال کے کنارے اٹک کر رہ گئی۔ آخر اربوں روپیہ اور بے شمار جانوں کی قربانی کے بعد جنگ تھم گئی۔ ۱۹۶۶ء کی ابتداء میں روس نے ایک سفارتی معرکہ مار کر وزیر اعظم شاستری اور صدر ایوب کو تاشقند کی سرزمین پر گفتگو کے لیے آنے پر راضی کر لیا۔ اسی کانفرنس میں صدر ایوب اور بھٹو کے راستے الگ الگ ہونے کی بنیاد پڑ گئی۔ کافی لے دے کے بعد سمجھوتے کا اعلان ہوا۔ لیکن سمجھوتے کا اعلان ہونے کی رات کو ہی لال بہادر شاستری دیارِ غیر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے اور ہندوستان میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ آخر کار نئے بادشاہ گر کامراج نادار کی مدد سے جواہر لال کی بیٹی مسز اندرا گاندھی وزارتِ اعظمیٰ کے اُمیدوار مرارجی ڈیسائی کو شکست دے کر برسرِ اقتدار آ گئیں۔

اسی دوران کشمیر میں ۱۹۶۷ء کی ابتدا میں انتخاب کا ایک اور ڈھونگ رچایا گیا۔

اُس وقت محاذ کی تقریباً ساری قیادت جیل کے اندر تھی۔ بلامقابلہ کامیابیوں کا یہ دنگل جیتنے کے بعد بیگ صاحب اور دوسرے لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن میں پھر بھی اپنے قفس میں بدستور بند رہا۔ ۲ر جنوری ۱۹۶۸ء کو نئی دہلی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر شنڈن اچانک میرے زندان خانے میں آئے اور اُنھوں نے مجھے رہائی کا پروانہ دیا۔ مجھے جس دن رہا کر دیا گیا اس دن عید کا روز سعید تھا چنانچہ میں نمازِ عید کے لیے عید گاہ گیا جہاں میری رہائی کی خبر پہنچ گئی تھی۔ مجھے ایک بھاری اجتماع نے گھیر لیا اور میں نے نماز کے بعد تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میرا مقصدِ حیات یہ ہے کہ اس برِصغیر میں رہنے والے عوام تشویش اور اضطراب سے آزاد ہو کر اطمینان و سکون کی زندگی گذار سکیں چنانچہ اِس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہند اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب آکر نفرت کی دیوار کو ڈھا دیں۔ میں نے کچھ دنوں بعد وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ پہلے میں اُنھیں اپنے دوست جواہر لال کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ بھی خاندان کے ایک فرد اور بزرگ کی حیثیت سے میرا احترام کرتی تھیں اور یہ خوشگوار بات تھی کہ ایک ایسی خاتون ہندوستان کی وزیر اعظم مقرر ہوئی تھیں جن کی رگوں میں کشمیری خون موجود ہے اور جو کشمیر کی تحریکِ آزادی اور اس مسئلے کے سارے نشیب و فراز کا گہرا علم رکھتی تھیں۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے دو سال کے عرصے میں ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک آزاد ذہن اور زبردست قوتِ فیصلہ کی مالک ہیں۔ اُنھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں اور سیاسی فراست کا مظاہرہ کر کے اپنے جہاں دیدہ حریفوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ جب کانگریس سنڈی کیٹ نے مسز گاندھی کو مرارجی جیسے ضدی طبیعت کے رہنما کے خلاف چنا تھا تو اُن کا خیال تھا کہ وہ اس "گونگی گڑیا" کو سنگھاسن پر بٹھا کر اپنی من مانیاں کر سکیں گے لیکن حکومت پاتے ہی اچانک اس گونگی گڑیا کی کایا پلٹ

گئی اور اُس نے ان بادشاہ گروں کو اُن کی اوقات دکھا دی۔ چنانچہ مسز گاندھی کو اس نئے رول میں دیکھ کر نہرو خانوادے سے متعلق میری کتنی ہی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں نے ان کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ اور کشمیر کی گتھی کو سلجھانے کے متعلق اپنا عندیہ پیش کیا۔ اپنی رہائی پر میں نے ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی اور پاکستان جا کر اُن دھاگوں کو پھر سے جوڑنے کا عزم ظاہر کیا۔ جو نہرو کی موت کی وجہ سے ٹوٹ گئے تھے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ حکومتِ ہند کو میرے اس دورے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے بھی اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔

رہائی کے بعد کچھ دن میں نے دہلی میں ہی قیام کیا۔ اور مرکزی حکومت نے پیش کش کی کہ میں اسی بنگلے میں ٹھہر سکتا ہوں جس میں مجھے نظر بند رکھا گیا تھا۔ میں نے مناسب کرایہ دینے پر رضامندی ظاہر کی اور یہ کافی برس میری تحویل میں رہا۔ البتہ بعد میں کشمیر گورنمنٹ نے اُسے حاصل کر لیا۔ بیگ صاحب کو بھی نواح میں نمبر ۴ کوٹھا لین کرایہ پر لینے کی اجازت دی گئی۔ اس دوران میں نے پھر جے پرکاش نرائن، راج گوپال اچاریہ اور ونوبا بھاوے سے ملاقاتیں کیں۔ وہ حالات کی نئی نہج سے کچھ خوش نظر نہ آرہے تھے اور اُنھوں نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا۔

میں ۴ مارچ کو سرینگر کے لیے بذریعہ طیارہ روانہ ہوا۔ کشمیری عوام نے پھر میرے لیے عقیدت کا بے پناہ مظاہرہ کیا اور نہایت ہی گرمجوشی اور تپاک سے میرا استقبال کیا۔ میں نے عوام سے ملنے کے لیے کشمیر کا دورہ شروع کیا اور دیکھا کہ وہ کشمیر کے سیاسی نظام سے بدستور ناراض و نالاں ہیں۔ میں نے اُن کی ہمت بندھائی اور اُنھیں یقین دلایا کہ وہ دن دور نہیں جب کشمیری عوام پر بے ضابطہ انتخابات کے ذریعے ایجنٹ ٹھونسنے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور وہ ریاست میں اقتدار کے حقیقی مالک و مختار بن جائیں گے۔ ▲▲▲

۶۸

.... اور جائوت ہار گیا

یہ ہماری آزادی کا نیا دور تھا۔ ہم نے تنظیم کے تتر بتر ڈھانچے کو پھر سے جوڑنا شروع کر دیا۔ محاذ رائے شماری کی صفوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے کئی کارروائیاں کیں۔ اس کے علاوہ میں نے اوقاف اور دیگر خیراتی کاموں کی ترتیب و تدوین میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسی زمانے میں میں نے حضرت بل کی تعمیر جدید کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور شہر و دیہات میں اس کی تعمیر کے لیے نقدی و جنسی رقومات اکٹھا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ میری سالگرہ پر میرے کچھ عقیدت مندوں نے نذرانے کے طور پر کئی لاکھ روپے جمع کر کے مجھے تھیلی کی صورت میں پیش کیے لیکن میں نے اس رقم کو سرینگر میں جدید ساز و سامان اور طبی سہولیات سے آراستہ پیراستہ ایک ہسپتال کی تعمیر کے لیے مخصوص کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس غرض کے لیے آنچار جھیل کے کنارے ایک کشادہ اور پر فضا جگہ چن لی گئی۔ اور شیر کشمیر نیشنل میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا خیال ذہن کی خلوتوں سے باہر آ کر سنگ و خشت کے پیکروں میں ڈھلنے لگا۔ ایمان کی بات ہے کہ کشمیر سرکار نے بھی اس کام میں نہ صرف ہمارا حوصلہ بڑھایا بلکہ اس کے لیے زمین مہیا کرنے پر رضامندی بھی دکھائی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارا ہاتھ بٹانے میں پیش پیش رہی چنانچہ ہم نے کام چلانے کے لیے صورہ میں ایک پالی کلینک POLY CLINIC ۲۰۰ بستروں پر مشتمل ایک ہسپتال اور مولانا آزاد روڈ پر ایک پاتھولوجیکل لیبارٹری (PATHO-LOGICAL LABORATORY) اور دوسرے کام شروع کیے۔ ساتھ ہی ساتھ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا جامع منصوبہ یعنی ماسٹر پلان مکمل کر کے اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس کی تعمیر کا کام آج دس بارہ سال گذرنے کے بعد بھی جاری ہے۔ ساز و سامان کے لیے آرڈر دیے جا رہے ہیں۔ اور ڈاکٹروں کا انتخاب مرحلہ وار کیا جا رہا ہے امید ہے کہ تین چار سال کے اندر ریاست کی یہ بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی۔

اس ہسپتال کی تعمیر کا تخم کیسے پھوٹا؟ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ تحریک میں چونکہ ہمارے مسلمان ہم وطن ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تھے۔ اس لیے وہی اکثر حکومت اور پولیس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ یہ صورتِ حال برابر جولائی ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی اور اُس وقت تک جاری تھی جب وہ گولیوں اور لاٹھیوں کا شکار ہو کر لہولہان ہو جاتے تھے تو اُن کے فوری علاج معالجے کے لیے سرکاری شفاخانوں کے کواڑ اُن پر ظالموں کے دلوں کی طرح بند ہو جاتے تھے۔ اگر کسی کو اتفاق سے داخلہ مل بھی جاتا تو بھی اس کے ساتھ ہمدردی کی بجائے سنگدلی اور بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس پر کچھ حساس مسلمانوں کی رگوں میں غیرت نے جوش مارا اور انھوں نے اپنا ایک ہسپتال بنانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ رقومات بھی بنک میں جمع کرائی گئیں۔ مگر میری دوسری مصروفیات کی وجہ سے یہ کام ادھورا ہی رہا۔ لیکن جب میری سالگرہ پر میرے عقیدت مندوں نے ایک خطیر رقم یہ کہہ کر میرے حوالے کی کہ میں جس کام میں بھی چاہوں یہ روپیہ استعمال کر سکتا ہوں تو میں نے اُن کی اس دیرینہ خواہش

کو پورا کرنے کے لیے اِس ہسپتال کی تعمیر کو اولین ترجیح کا مستحق جانا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب یہ ایک تیم سرکاری ہسپتال کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے۔ اس پر موجودہ اندازوں کے مطابق بیس کروڑ کی لاگت آئے گی۔ حضرت بل کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور اس بُقعۂ عالیہ کی عمارت کشمیر میں اپنے طرز کی پہلی عمارت ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے خدوخال اگرچہ اُبھر آئے ہیں لیکن اس کی تکمیل میں کچھ اور وقت درکار ہوگا۔ لیکن جب یہ پورا ہوگا تو بہت سی سہولیات اور خصوصیات کی وجہ سے یہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کا ایک اِنفرادی اور امتیازی شفاخانہ ہوگا اور کشمیر کے لوگوں کو ریاست کے باہر کے شہروں اور ہسپتالوں میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کی خفت اور صعوبت سے نجات دلائے گا۔

اِس دوران اوقاف کی تنظیم اور اس کے اثاثوں کی توسیع کی طرف بھی میں نے کافی توجّہ دی اور شہر و دیہات میں بہت سی مساجد، دکانات و مکانات تعمیر کیے گئے۔ اس سے نہ صرف اوقاف کے لیے آمدنی کے نئے ذرائع پیدا ہو گئے۔ بلکہ زائرین کی سہولیات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ سرینگر کے انجینیرنگ کالج میں فرقہ وارانہ گڑبڑ شروع ہو گئی۔ یہ کالج مرکزی حکومت کے اہتمام سے کھولا گیا ہے۔ اور درگاہ حضرت بل کی بغل میں واقع ہے۔ طلباء نے حضرت بل جانے والی سڑک پر ٹریفک روک دیا۔ جب ریاستی حکومت عاجز ہو گئی اور فرقہ وارانہ وبا کے جراثیم پھیلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تو میں نے تماشائی بننے کی بجائے میدان میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اکیلے انجینیرنگ کالج گیا اور وہاں طلباء کو اِس قسم کی قابلِ نفرت سرگرمیوں سے دور رہنے کی اپیل کی میں نے اُنھیں بتایا کہ یہ سوال کشمیریوں کی قومی روایت کے احترام کا ہے اور اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ باز نہ آئے تو میں معاملہ عوام کے سپرد کر دوں گا۔ اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے کب سڑک کھلوا دی اور ٹریفک کو بحال کرنے میں مدد دیتا رہا۔

نتیجہ یہ رہا کہ اُسی دن جمعہ کی نماز باجماعت حضرت بل میں ہزاروں شہریوں نے ادا کی اور صورتِ حال معمول پر آ گئی۔

سیاسی محاذ پر ہم نے محاذِ رائے شماری کو تقویت دینے کے ساتھ ساتھ ریاست کے مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والی شخصیات، دانشوروں اور جماعتوں کا ایک نیشنل پیوپلز کنونشن مجاہد منزل میں منعقد کیا۔ اس کنونشن میں اگر ایک طرف محاذ کے مرزا محمّد افضل بیگ شامل تھے تو دوسری طرف نیشنل کانفرنس کے بخشی غلام محمّد بھی تھے ایک طرف عوامی ایکشن کمیٹی کے مولوی محمّد فاروق تھے تو دوسری طرف جموں کے بلراج پوری تھے۔ اس کے علاوہ مولانا محمّد سعید مسعودی، خواجہ غلام محی الدین قرہ، پنڈت پریم ناتھ بزاز وغیرہ بھی کنونشن میں آئے اور کشمیر کی گتھی کو سلجھانے کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ مجھے اِتفاقِ رائے سے کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ کنونشن کے افتتاح کے لیے ہم نے شری جے پرکاش نرائن کو دعوت دی۔ یہ اُن کا پہلا دورۂ کشمیر تھا۔ اِس سے پہلے وہ ۱۹۴۶ء میں جب میں "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے سلسلے میں قید کاٹ رہا تھا جنہی میں چلائی جانے والی ہماری کسان تحریک کی حمایت کے لیے وہاں آئے تھے مگر وادی کا یہ اُن کا پہلا دورہ تھا چنانچہ محاذِ رائے شماری نے ہماری روایت کے مطابق ایک معزز ہندوستانی اور سرکردہ مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے اُن کا استقبال کیا۔

شری نرائن نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں خود کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا حامی رہا ہوں اور اُن قربانیوں کی دل سے داد دیتا ہوں جو شیخ صاحب کی قیادت میں کشمیریوں نے دی ہیں۔ لیکن ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے بعد صورت حال میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اس لیے مسئلہ کشمیر کا حل اب ہندوستانی آئین کی چاردیواری کے اندر ڈھونڈنا ہی ممکن ہے۔ آپ اس چاردیواری کے اندر ہر قسم کے حقوق اور تحفظات طلب

کرنے کے مجاز ہیں جس کی سارے ملک کے محبِ وطن حمایت کریں گے۔ جے پرکاش نرائن نے کہا۔

"تقسیم برصغیر کے وقت جب تمام ملک کے مسلمان جناح صاحب کے پرچم تلے جمع ہو کر دو قومی نظریے کے حامی بن گئے تھے۔ دو چمکتے ہوئے ستارے اس رجحان کی متضاد رو کے ترجمان بنے۔ جموں و کشمیر اور صوبہ سرحد، ان دو حصوں میں رہنے والے مسلمانوں نے دو قومی نظریے کے سیلاب میں بہہ جانے سے انکار کر دیا۔ اس معجزے کا ظہور دو بہت ہی مذہبی عقیدہ رکھنے والے اعلیٰ قد و قامت اور پُرکشش مسلمانوں کی قیادت کی وجہ سے ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ اور خان عبدالغفار خاں ــــــ یہ شیخ محمد عبداللہ کی ثابت قدمی، جراٗت، غیر فرقہ وارانہ نظریے اور روشن خیال قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ جس کی وجہ سے آج کسی ہندوستانی کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ وہ کشمیر کو ہندوستانی سیکولرازم کی ایک شائستہ مثال کے طور پر پیش کرے ...... حال ہی میں انجینئرنگ کالج سرینگر میں جو واقعات پیش آئے اُن میں بھی شیخ عبداللہ نے اپنے غیر متزلزل غیر فرقہ وارانہ نقطۂ نظر کا ثبوت دیا...... اگر کوئی شخص فضول خیال آرائی کا شکار نہیں بننا چاہتا تو یہ بات، جو بہت سے لوگوں کے لیے کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، ماننا پڑے گی کہ شیخ عبداللہ کشمیر میں اب بھی کلیدی حیثیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا اس وقت تک کشمیریوں کی بڑی تعداد کے لیے کشمیر کا کوئی حل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو شیخ صاحب کی رضامندی حاصل نہ ہو۔"

اس موقع پر بخشی غلام محمد کے خطبے کے چند اقتباسات منہ کا مزہ بدلنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ جو شخص کشمیر میں ناجائز سیاسیات اور فریب کارانہ انتخابات کا باوا آدم تھا، جو مرکزی الیکشن کمیشن کے دائرہ کار کو ریاست پر توسیع پذیر کرنے کو

ایک امرت دھارا سمجھتا تھا۔ وہ اب اقتدار سے محروم ہو کر کس حالتِ زار کے ساتھ منمنا رہا تھا۔

"ہم نے ریاست کے لوگوں کو جمہوریت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ جن عام انتخابات کو ہم خوب بانس پر چڑھا کر پیش کرتے ہیں، ان کے متعلق یہ ایک واقعہ ہے کہ ریاست کے عوام کو خوف کے بغیر ریاست کے حکمران چننے کا کوئی آزادانہ موقع فراہم نہیں کیا جا سکا ہے۔ مرکزی الیکشن کمیشن کے تحت جو انتخابات ہوئے اُن میں افسروں اور اہلکاروں کے طریق کار کو ریاستی عدالتِ عالیہ نے قابلِ ملامت قرار دیا...... ہمیں کشمیری عوام کے اس تاثر کو محو کرنے کے لیے کوششیں کرنا ہوں گی کہ اُن کے حکمران کسی اور مقام سے نامزد کیے جاتے ہیں...... ہمیں لوگوں کے دلوں میں جاگزیں اس احساس کو دور کرنا ہوگا کہ صرف وہی اپنی قسمت کے مالک ہیں۔ صرف وہی اپنے حکمران چننے کا حق رکھتے ہیں اور یہ حکمران صرف اُن کے اعتماد کے بل بوتے پر ہی اقتدار میں رہ سکتے ہیں۔" شاید کسی ستم ظریف نے ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا تھا ؏

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بہرکیف میں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا۔

"یہ محل اور موقع جو اس کنونشن میں حصہ لینے والے معززین کو میسر ہے، ایسا نہیں کہ اس کو ماضی کے گڑے مُردے اُکھاڑنے، نکتہ چینیوں یا الزام تراشیوں اور اُن کا جواب دینے کے لیے استعمال کیا جائے جو بیتا سو بیت چکا۔ اس پر ہمیں نہ غصہ ہے نہ کینہ۔ ہم اس کنونشن میں اگر ماضی کے واقعات کا جائزہ لیں گے، جو ہمیں لینا ہی ہوگا کیونکہ اس کے بغیر مستقبل کی صحیح تصویر مرتب نہیں ہو سکتی تو یہ جائزہ لینے سے ہمارا

مقصد صرف یہ ہوگا کہ ہم موجودہ تعطل کا کوئی حل نکال لیں۔ ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہم اس بنیادی مسئلے پر سوچیں کہ یہاں کے عوام کی مشکلات کیسے ختم کی جائیں۔ کونسا طریقہ اس گتھی کو سلجھانے کے لیے اختیار کیا جائے تاکہ عوام غربت، جہالت، علالت اور ان کے مفلوج کن اثرات سے نجات حاصل کریں...... میں یہ بات دکھ اور رنج کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ جنگ بندی لائین کے اس پار سے ہم نے بچھڑے ہوئے جن بھائیوں کو اس اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی تھی ان کو ضروری سہولیات میسر کرنے میں ارباب اقتدار نے بخل سے کام لیا جس سے وہ اس کنونشن میں شامل نہ ہوسکے۔ مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جنگ بندی لائن کے دوسرے طرف سے آنے والوں کی اس اجلاس میں موجودگی ہمارے کام کو آسان کرنے کا موجب ہوتی۔"

اس کنونشن میں بہت سے بچھڑے اور بکھرے ہوئے ساتھی مدت کے بعد ایک چھت کے نیچے جمع ہوئے۔ کوئی اڈھائی سو ڈیلی گیٹ ریاست کے کونے کونے سے آئے تھے اور لندن سے بھی وہاں کے کشمیریوں کے نمائندے آئے۔ ہندوستان کے کچھ ممتاز دانشوروں اور صحافیوں نے مبصرین کی حیثیت سے شرکت کی۔ لیکن اس کنونشن نے غلام محمد صادق کے دعوؤں کو بے نقاب کر دیا وہ بار بار دعوت مبارزت دیتے رہے تھے کہ کشمیر کے معاملے پر استدلال اور مکالمے کو بنیاد بنانا چاہئے۔ اور مخالفین کو سیاسی مباحث کے ذریعے قائل کیا جانا چاہئے۔ وہ ابتدا میں اس کنونشن کے حامیوں میں سے تھے لیکن آخر پر وہ اقتدار کے قلعے میں محصور ہو کر یہاں آنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکے۔

اس کنونشن سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ سیاسی فضا میں ایک خوشگوار اتھل پتھل پیدا ہو گئی اور سماجی اور ذاتی سطح پر تناؤ کم ہو گیا۔ بلکہ بخشی صاحب نے اپنے مکان

واقع الشبر نشاط میں سبھی کتب خیال کے نمائندوں کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت طعام منعقد کی۔

دوسرے دن حضوری باغ میں ایک عام جلسہ ہوا۔ میں نے زوردار لہجے میں حق خود ارادیت کو قوموں کا بنیادی حق قرار دیتے ہوئے کہا کہ آزادی دی نہیں جاتی چھینی جاتی ہے اور نامساعد حالات سے نوجوانوں کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہئے۔ شری جے پرکاش نرائن کو، جو سٹیج پر موجود تھے، میری یہ تقریر ناگوار گذری۔ لیکن وہ یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت کشمیر کے لوگوں کا حوصلہ قایم رکھنا تھا۔

وقت گذرتا گیا۔ حکومت کشمیر نے اپنی پکڑ دھکڑ اور دار و گیر کا سلسلہ جاری رکھا اور یہاں کے نوجوانوں کو مختلف فرضی اور جعلی مقدموں میں ماخوذ کر کے ان پر سختیاں روا رکھیں۔ وہ ان الزامات کو عدالت کے سامنے کبھی ثابت نہ کر سکے۔ لیکن اس سے کھینچا تانی کا ماحول قایم ہونے میں ضرور مدد ملی۔

اتنے میں پارلیمنٹ کے وسط مدتی انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ برصغیر میں صورتحال ہیجان خیز تھی۔ یحییٰ خان کے عدم تدبر اور سیاستدانوں کی متلون مزاجی نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصوں کے درمیان خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اور ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں مشرقی بنگال میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔

الیکشن کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا۔ ہم ان دنوں دہلی میں تھے۔ چنانچہ الیکشن کی صورت حال کے لیے تیار رہنے اور اس سلسلے میں تنظیمی مشورہ کرنے کے لیے میں نے سرینگر میں کارکنوں کا ایک اجلاس طلب کر لیا۔ ۸ جنوری کو میں

واپس سرینگر آنے کے لیے جہاز میں بیٹھا۔ ہم لوگ پرواز کی تیاری میں لگ گئے اور پیٹیاں وغیرہ باندھنے لگے۔ اچانک ایر ہوسٹس کا یہ اعلان سن کر ہم حیران رہ گئے کہ پرواز سرینگر نہیں جا سکے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی نے بم رکھ دیا ہے۔ اس طرح سے ہمارا سامان جہاز سے اُتارا گیا اور ہم واپس اپنے ڈیرے پر آ گئے۔

میرا ماتھا اعلان سنتے ہی ٹھنکا تھا کہ دال میں ضرور کالا ہے اور بم وغیرہ رکھنے کا ایک بہانہ کیا گیا ہے جس کے پردے میں اصل عزائم کو چھپانا مقصود ہے۔ حکومت ہند کی اس "راست گفتاری" کا نمونہ دوسرے دن سامنے آ گیا۔ ہم علی الصبح جاگ کر نماز وغیرہ میں معروف تھے کہ ہماری رہائش گاہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ہمیں تحریری طور مطلع کیا گیا کہ ریاستی حکومت نے پبلک سیکورٹی ایکٹ کے تحت ہمارے داخلہ کشمیر پر پابندی لگا دی ہے۔ اُدھر مرکزی وزارتِ داخلہ نے اعلان کیا کہ محاذ رائے شماری کو خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ خواجہ غلام محمد شاہ بھی دلی میں ہی رہ گئے۔ جموں سے اطلاع آئی کہ ریاست بھر میں وسیع پیمانے پر محاذ کے کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں اور اس کے دفاتر کو مُہر بند کیا گیا ہے۔ اِدھر بیگ صاحب سرینگر جانے کے لیے جموں سے آگے روانہ ہو چکے تھے۔ اُن کی کار کو اودھمپور کے پاس روک لیا گیا اور انھیں بھی ریاست بدر کر دیا گیا۔ اِس ساری کارروائی کے مقاصد صاف تھے کہ محاذ رائے شماری الیکشن کے میدان سے ہٹا لیا جائے۔ تاکہ بندوق کی نوک پر خاموش کیے گئے کشمیری عوام صندوق کے ذریعے اِس ساری فریب کاری اور جعل سازی کا تختہ اُلٹ کر نہ رکھ دیں اور اُن کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کی رُسوائی کا سامان نہ ہو جائے۔

ہماری بڑی خواہش تھی کہ ہماری جماعت بھی انتخابات میں حصہ لے۔ ہیں نے

بڑی کوشش کی اور سرینگر قاصد اور ایلچی بھیجے کہ ہماری جماعت کے ہمدرد الیکشن میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ لیکن وہ حکومت کے جبر و ستم سے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ کسی کو پر مارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مولوی محمد سعید، غلام محی الدین قرہ، حاجی محمد سبحان، خواجہ غلام محمد بٹ بسنت باغ الغرض سبھی نے میدان میں کود پڑنے سے گریز کیا۔ مولوی محمد سعید نے مخصوص لہجے میں کہلا بھیجا کہ بخشی غلام محمد کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مرکزی حکومت اس کی پشت پر ہے اور اُس کو ہر قیمت پر کامیاب کرائے گی۔ چاہے اسے فوج ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔ اُن کا یہ جملہ مجھ تک پہنچا کہ سرینگر کی پارلیمانی نشست پر کانگریس کی کامیابی ہندوستان کے لیے کشمیر کے ڈیفنس کا ایک جزو ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ بخشی غلام محمد کو چند ہی دن پہلے کانگریس ہائی کمان نے صادق صاحب کی پرواہ کیے بغیر سرینگر کی پارلیمانی نشست کے لیے اپنا اُمیدوار چن لیا تھا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ بخشی غلام محمد ہر حالت میں اس اہم نشست پر کامیاب ہو جائے گا۔ بہر حال بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن اچانک شمیم احمد شمیم ہمارے پاس آئے اور کہا کہ انھوں نے سرینگر میں بخشی غلام محمد کے خلاف چناؤ لڑنے کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کر دیے ہیں اور ہماری امداد کے طالب ہیں۔ شمیم احمد کا ہماری جماعت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ یہ بخشی کے ہی آوردہ اور پروردہ تھے۔ بخشی سے رشتہ توڑنے کے بعد اُس نے صادق صاحب سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ اس لیے ہمارے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا کہ ان پر اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ کیونکہ اُن کا سارا وجود شکوک و شبہات کی دھند میں لپٹا ہوا تھا اور بیگ صاحب و شاہ صاحب دونوں اُن کی مدد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن میں نے اُن سے کہا کہ اِس وقت سیاسی نقطۂ نگاہ سے بخشی کو ہرانا ایک اہم بات ہے اور ہم صرف ایک سیٹ پر اُن کو ہرا کر کشمیر کے عوام



کے اصل جذبات سے دُنیا کو آگاہ کر سکتے ہیں اور علامتی طور پر ہندوستان کی کشمیر کی پالیسی کے خلاف کشمیری عوام کے عدمِ اعتماد کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اِس لیے کوئی بھی شخص جو بخشی غلام محمّد کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے ہماری اِمداد حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے کہ بخشی غلام محمّد کی مقبولیت کا جو بھرم قایم کیا گیا ہے اُس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اب سوال تھا کہ کشمیریوں کو شمیم کی حمایت کے لیے کیسے آمادہ کیا جائے اور اُنھیں کیونکر یہ باور کرایا جائے کہ اُسے ہماری تائید و حمایت حاصل ہے؟ چنانچہ ہم نے انتخابی مہم کی قیادت کے لیے بیگم صاحبہ کو بڑی ہم آہنگی اور خاموشی کے ساتھ سرینگر روانہ کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے موسم کی ناساعدت، برف باری، بارش اور جاڑے کی سختی اور ذرائع کی کمی کے باوجود ایسی زبردست انتخابی مہم چلائی کہ بخشی چاروں شانے چت ہو گئے اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔ ساری دنیا کو معلوم تھا کہ اس جالوت٭ (GOLIATH) کے پیر کتنی کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک علامتی (SYMBOLIC) لڑائی تھی۔ مرکزی حکومت کے نامزد کیے ہوئے ایک ایسے آدمی کو جس نے کشمیر میں مسلسل ۱۰ سال تک حکومت کی تھی بے پناہ ذرائع کے باوجود ہمارے نامزد کیے ہوئے ایک عام امیدوار نے جسے مولانا مسعودی نے کھمبا کہہ کر پکارا تھا، شکستِ فاش دی۔ اِس سے ہمارے لوگوں میں بھی ایک نیا حوصلہ اور اُمنگ پیدا ہو گئی۔ ▲▲▲

٭ جالوت (GOLIATH) ، قرآن مقدس میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ باطل کا نمائندہ تھا، جو حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جو طالوت کی فوج کے ایک رکن تھے۔ مارا گیا۔ (م۔ ی۔ ٹ)

۶۹

کشمیر اکارڈ — حکمتِ عملی کی تبدیلی

پاکستان میں صورتِ حال مزید بگڑ گئی اور بنگلہ دیش کے قیام کے لیے صورتِ حال سازگار ہو گئی۔ ادھر اب پھر ہمارے لیے نظربندی اور جلاوطنی کی صعوبت شروع ہو گئی۔ میری چھوٹی لڑکی ثریا کی شادی ہونے والی تھی۔ تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ میں نے حکومت سے درخواست کی کہ مجھے اِس میں شمولیت کرنے کی اجازت دی جائے لیکن حکومت تو انسانی جذبات سے عاری ہو گئی تھی۔ کچھ ایسی شرائط اس کے ساتھ وابستہ کی گئیں کہ میں ہرگز انھیں قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے دہلی سے ہی اپنی عزیز بیٹی کو ٹیلی فون پر رخصتی کہنا پڑی۔ میرے بچے مجھے اِس خوشی کے موقع پر اپنے درمیان نہ پا کر تڑپ رہے تھے۔ لیکن صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ اِس میدان کا اسمِ اعظم ہی صبر ہے اور وہ بھی صبرِ جمیل۔ یعنی انسان کو ہر مصیبت کو کسی رنج کا احساس کیے بغیر خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ اِنَّ اللہ مع الصابرین۔ اب برصغیر کے حالات اور زیادہ بگڑ گئے تھے۔ مشرقی بنگال میں کھلم کھلا خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ہندوستان اس میں زیادہ ملوث ہو تا گیا۔ ادھر ہندوستان میں احمد آباد، بھونڈی وغیرہ

میں زبردست فسادات ہوئے۔ جن میں مسلمانوں کو بڑا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ خان عبدالغفار خان گاندھی جی کی صدسالہ تقریبات کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے۔ مسٹری جے پرکاش نرائن نے ان کے دورے کا انتظام کیا تھا اور وہ گاندھی فاؤنڈیشن کے مہمان رہے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی بھی گئے اور احمد آباد بھی۔ جہاں انھوں نے اِن فسادات کے لیے حکومت کو ذمہ دار ٹھہرا کر حکومتِ ہند کے لیے شرمندگی کا سامان پیدا کر لیا۔

میں بھی تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ اُن سے ملاقات کر رہا تھا۔ اپنے دیرینہ دوست کو میں نے جسمانی لحاظ سے تو کافی کمزور پایا۔ لیکن ان کا ذہن خوب چاق و چوبند تھا۔ انھیں کانگریس کی قیادت سے زبردست شکوے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کے نظریات سے اُن کی غیر متزلزل وفاداری کے باوجود وقت آنے پر کانگریسی رہنماؤں نے انھیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریسی رہنما اصولوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کی پہلی بو سونگھتے ہی وہ سارے اصول آدرش بھول گئے۔ ان میں بوئے وفا نام کو نہ رہی اور اقتدار پانے کے بعد وہ ساری آدرش اور اصول بھول گئے۔

خان عبدالغفار خاں کے شاندار ماضی اور اُن کی قربانیوں کی وجہ سے ملک کے عوام میں اُن کے لیے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ جہاں جاتے اُن کا شاندار استقبال کیا جاتا اور اُن کی خدمت میں تھیلیاں پیش کی جاتیں۔ دہلی میں بھی انھوں نے ایک عوامی اجتماع سے خطاب کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں عوامی زندگی کے گرتے ہوئے معیار اور سیاسیات میں بددیانتی کے اثرات پر سخت تشویش ظاہر کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں اُن کی خدائی خدمت گار تحریک کے طرز پر ایک جماعت

تشکیل دی جائے۔ مجھ کو بھی اس نئی جماعت کے ابتدائی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے خدائی خدمت گار کے نام کے ساتھ اتفاق تو نہیں کیا لیکن انسانی برادری کے نام پر ایک جماعت کی تشکیل دے دی گئی۔ شری جے پرکاش نرائن اس کے صدر اور میں اس کا نائب صدر منتخب ہوا۔ اس تحریک کی شروعات بہت اچھی ہوئیں اور اس کے ساتھ عوام کی بہت سی توقعات وابستہ ہوگئیں۔ خیال کیا جانے لگا کہ یہ ہندوستان سے فرقہ پرستی کے سمِ قاتل کو دور کرنے کے لیے کافی ممد و معاون ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ بھی بنگلہ دیش کے بحران کی نذر ہوگئی۔ جے پرکاش نرائن نے خلافِ معمول اس کے کام کو غلط سمتوں میں وسعت پذیر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس درازدستی کی تاب نہ لاکر روشنی کی یہ کرن کجلا کر رہ گئی۔ ابھی دنوں مجھے شری نرائن کے اس بیان سے بھی بڑا اچنبھا ہوا جب انھوں نے احمد آباد کے انسانیت سوز فسادات کی ذمہ داری یہ کہہ کر اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں پر ڈال دی کہ وہی ان میں پہل کرتے ہیں۔ ایک اقلیت جو اپنی جان کے لیے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے لڑ رہی ہو کیسے خود اپنی تباہی کے لیے پہل کر سکتی ہے۔ اس کا شری نرائن نے کوئی خیال نہیں کیا اور نہ اس حقیقت کا کہ ان ننگِ انسانیت فسادات میں جانی اور مالی نقصانات کا اوسط اور تناسب کون سی کہانی زبانِ حال سے بیان کرتا ہے۔ کیا شری نرائن سیاسیات میں الگ تھلگ رہنے کے بعد اب مقبولیت کے لیے گیلریوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔؟

بادشاہ خان کچھ دیر ہندوستان میں رہنے کے بعد واپس کابل جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ جو رقومات ان کو پیش کی گئی تھیں ان کی مالیت چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ یہ مردِ قلندر یہ رقم تو اپنے ساتھ لے گیا اور اس کو زرمبادلہ میں تبدیل کرالیا البتہ اپنے جلسوں میں اس نے ہندوستانی لیڈروں کو خوب کوسا کہ وہ آزادی کے اتنے

برس گذر جانے کے بعد بھی فرقہ واریت کے زہر کو نہیں مٹا سکے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے کو میں نے ہمیشہ ایک نہایت ہی سنگین معاملہ گردانا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس میں معصوم بے گناہ اور قیمتی جانوں کا اتلاف ہوتا ہے۔ باحیا اور پاک دامن بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے۔ جائیداد اور اقتصادی اثاثوں کو غارت کیا جاتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں تعصب، نفرت اور تنگ نظری کا کینسر موجود ہے۔ اس لیے میں نے ہمیشہ اس زہریلے سانپ کا سر کچلنے میں کبھی رو رعایت سے کام نہیں لیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں تحریک کا آغاز ہوا تو اس وقت اس کا ظاہری خول مسلمانوں کی مظلومیت کی ترجمانی تھا۔ لیکن ہم نے اس وقت بھی فرقہ وارانہ آشتی کے بڑے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ اسلام میں گائے کا بھی ذبیحہ جائز ہے اور اس وقت سارے برطانوی ہند میں اس پر کوئی قانونی پابندی عائد نہ تھی۔ لیکن میں نے اپنے چند انتہا پسندوں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے ہم مذہبوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ہمیں اپنے غیر مسلم بھائیوں کے لیے خیرسگالی کے جذبے کے طور پر اس ذبیحے پر پابندی ہٹانے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ صورت آج بھی قائم ہے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اس ذبیحے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود کسی بھی حکومت نے اس صورت کو نہیں بدلا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس آشتی اور خیرسگالی کی جڑیں کشمیر کی عظیم روایات میں بہت گہری چلی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اس سوال پر مثال خود اپنے گھر سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے کشمیر میں جتنے کشمیری پنڈتوں اور دوسرے غیر مسلم بھائیوں کی حفاظت کو اوّلین اہمیت دی اور ان کا بال بیکا نہ ہونے دیا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد جبکہ میں اقتدار سے بہت

دورِ عتاب کی سختیاں سہہ رہا تھا میں نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کی۔ جب کشمیر میں ۱۹۶۳ء میں "موئے مبارک" اور دوسرے واقعات کی بازگشت میں شر پسندوں نے فرقہ وارانہ منافرت کے الاؤ کو بھڑکانا چاہا تو واقعات گواہ ہیں کہ میں نے اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس دھارے کا رُخ موڑ دیا۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلوں کو مہاتما گاندھی نے اپنے مقدس خون سے تھوڑی دیر کے لیے بجھا دیا لیکن یہ سات سروں والا اژدھا بار بار اپنا سر نکالتا رہا ہے اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اس نے ہمیشہ میرے سکون و اطمینان کے خرمن میں آگ لگائی ہے۔ نفرت کا بیوپار نفرت اور تعصب کے سوا اور کچھ پیدا نہیں کر سکتا اور انسان کا یہ ایک ابتدائی فرض ہے کہ وہ حیوانیت کو روکے۔ لیکن کشمیری ہونے کے ناطے ہمارا ردِ عمل اس سلسلے میں بڑا ہی تیز ہوتا ہے۔ جس کو شاید کشمیر سے باہر پورے طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ کشمیر میں ہندوستان اور ہم صرف زمین کی لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں۔ یہ دو سیاسی اقدار اور دو روحانی رویّوں کے درمیان کشمکش ہے کشمیر سیکولرازم کی لیبارٹری اور ہندوستان کے اس ملے جلے معاشرے اور تمدن کی علامت بھی ہے اور میدان جنگ بھی۔ جو رنگ رنگ کے پھولوں سے ایک خوبصورت گلدستے کی طرح پرو دیا گیا ہے اس گلدستے میں دراوڑی نسل کے خیالات بھی ہیں۔ اس میں آریاؤں کی روحانی طہارت بھی ہے۔ اس میں عرب کا سوز بھی ہے۔ اس میں عجم کا ساز بھی ہے۔ اس میں دنیاوی ذہن کے مغرب کی روشن خیالی بھی ہے۔ اور اس میں باطن نگر مشرق کی روحانیت کا جلوہ بھی۔ اگر اس شیرازے کا ایک موتی بھی گر گیا تو یہ ساری مالا بیکار ہو کر رہ جائے گی۔ ہم نے اپنی طرف سے دل و جان کی بازی لگا کر مسلم اکثریت کے کشمیر کو دو قومی نظریے کے جبڑوں سے نکال کر سیکولر ہندوستان کے گلدستے کا گل

سر سبد بنا دیا۔ لیکن اگر نفرت کی آگ جلتی ہی رہے تو یہ سارا گلدستہ جھلس کے رہ جائے گا۔ جو سیکولرازم اور اس کی علامت کشمیر کی موت بھی ہوگی۔

نفرت کا یہ بیوپار کس قدر خطرناک ہے اُس کا اندازہ دو قومی نظریے کے سب سے بڑے علمبردار محمد علی جناح کو بھی تھا۔ چنانچہ جب پاکستان وجود میں آیا تو دوسرے ہی دن اُنھوں نے اعلان کیا کہ پاکستان میں غیر مسلم اور مسلم کی کوئی تفریق نہ ہوگی۔ کیونکہ ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ جناح صاحب کو یہ اعتراف حق اس احساس نے کرا دیا کہ باہمی نفرت کسی قوم کی تعمیر کی اساس نہیں بن سکتی۔ اس کے علاوہ مغرب کی آزاد خیالی کی جس لہر نے اُن کا خمیر بنا تھا — وہ اب اقتدار حاصل کرنے کے بعد اُن کو صحیح راستہ دکھا رہی تھی۔

ہندوستان جب ہمارے ورثے میں آیا تو یہ صرف کسی خاص نسل یا مذہب کی آماجگاہ نہ تھا۔ اس کی آزادی کے لیے اگر بھگت سنگھ نے خون بہایا تو راج گرو نے بھی جان کی قربانی دی اور اسی طرح اشفاق اللہ جیسے ہزاروں مسلمان مجاہدوں نے بھی گردنیں کٹوائیں۔ ہندوستان کی آزادی کے جرنیلوں میں بہادر شاہ ظفر، جرنل بخت خان، مولانا فضل الحق خیر آبادی، بدرالدین طیب جی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، علی برادران اور مسلمانوں کے عظیم دینی پیشوا شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور کتنے ہی مشاہیر کی آہِ سحر گاہی اور قربانیوں کا نم موجود ہے۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں سے خطائیں سرزد ہونے کا امکان موجود ہے لیکن اُن پر پہل کا الزام لگانے سے پہلے اُن کی نفسیات کا صحیح سماجی اور سیاسی تناظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں پہل چاہے کوئی بھی کرے۔ یہ کوئی اچانک اور بے ربط معاملہ نہیں ہوتا

پہل محض دیا سلائی کی ایک تیلی کا کام کرتی ہے۔ اُس کے لیے مواد برسوں نہیں تو مہینوں سے جمع ہوتا رہتا ہے اور اسی جمع شدہ مواد میں شکست خوردگی، مایوسی اور افسردگی کا روغن احمد آباد جیسے فسادات کے شعلے بھڑکا تا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان ہمارے ملک میں اقلیت میں ہیں۔ اگر اُس کی مخالف سمت سے کوئی پہل ہوتی ہے تو اُسے خاموش رہنے کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ اکثریت کی پہل سے آنکھ چرانا خود اُس کے مفاد میں ہے۔ البتہ اگر کہیں اس کی طرف سے تھوڑی بھی خطا ہوئی تو ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ سوچنا بے محل نہ ہوگا کہ کیا مسلمان پر کسی احساسِ مرگ DEATH WISH نے اپنا تصرف جمایا ہے جو وہ پہل کر کے اپنی اجتماعی خودکشی کا سامان فراہم کرے؟ اس سلسلے میں فسادات کے ہلاک شدگان کے اعداد و شمار بہت سے حقائق سے پردہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ سارے جانداروں کی خصلت یہ ہے کہ وہ اُس وقت حملہ کرتے یا جھپٹ پڑتے ہیں جب اُنھیں اپنی جان کا خوف ہو۔ نفسیاتی اعتبار سے ہر خوف زدہ آدمی ایک امکانی قاتل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کے احساسِ جرم کو کُند کرنا مقصود ہو تو اُس کو خوف کی نفسیات سے نجات دِلانی چاہیے۔ خوف کے زیرِ اثر ابنِ آدم انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آتا ہے۔ جس طرح وحشی جانور خوف کے زیرِ اثر اوسان کھو کر حملہ کرنے میں پہل کرتے ہیں اسی طرح انسان خوف کے اندھیارے میں عقل و خِرد کی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اُنھیں سماجی، سیاسی، اِقتصادی اور ثقافتی سطح پر تحفظ اور مساوات کا یقین دلایا جائے۔ ایسا کرنے سے صرف اُنہی کی نفسیاتی صحت بحال نہ ہوگی بلکہ سارے ہندوستانی کنبے کی ذہنی، روحانی اور جسمانی شفایابی کے سامان پیدا ہو جائیں گے۔

بنگلہ دیش کا بحران شدید ہوتا گیا اور اس کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء میں ہند اور پاکستان کی جنگ چھڑ گئی اور نزلہ بر عضوِ ضعیف کے مترادف کشمیر میں پھر جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ لیکن اب کی بار پاکستان کو میدان میں واضح طور پر شکست ہوئی۔ یحییٰ خاں کا پتّا کٹ گیا اور مسٹر بھٹو ایک ریخت خوردہ اور لوٹے لنگڑے پاکستان کے صدر بنائے گئے۔ کشمیر کے وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق ایک لمبی بیماری کے بعد چنڈی گڑھ کے بڑے ہسپتال میں اِنتقال کر گئے اور سید میر قاسم کے ہاتھوں میں اقتدار سونپ دیا گیا۔ شملہ میں مسز اندرا گاندھی اور مسٹر بھٹو کے درمیان ملاقات ہوئی اُس میں راز و نیاز بھی ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان کو بنگلہ دیش میں قیدی بنائے گئے نوّے ہزار فوجی واپس دیے گئے۔ آزاد کشمیر کے کچھ علاقوں پر بھی ہند نے قبضہ کر لیا تھا، اُن کو واپس لوٹا دیا گیا اور طے پایا کہ وہ اِس سوال پر آئندہ بھی باہمی گفت و شنید کریں گے۔ اسی دوران کشمیر میں اسمبلی کے انتخابات منعقد کرنے کا وقت آیا۔ ہماری جماعت کے پر اِس لیے کاٹ دیے گئے تھے کہ وہ عوامی اِنتخابات میں حصّہ لے کر جمہوری ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کر کے ہندوستان کی شکتی ذرا سے۔ چنانچہ ہمارے جماعتی طور پر انتخابات میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ اب کے خواجہ محی الدین قرہ اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے ہماری حمایت سے اِنتخاب لڑنے کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کیے۔ بخشی غلام محمد کو جس طرح ہم نے شکستِ فاش دی تھی اُس سے اُن لوگوں کے مرجھائے ہوئے حوصلے پھر جوان ہو گئے تھے اور اب سیاسی مطلع پر محی الدین صاحب کے قرابت دار اور مولوی مسعودی کے دوست صادق صاحب بھی نہ رہے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے اِنتخابی جنگ لڑنے کے لیے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ خواجہ محی الدین قرہ اور خواجہ مبارک شاہ تو دِلّی بھی آئے اور ہم سے بات چیت بھی کی لیکن واپس لوٹتے ہی اُنھیں مولانا مسعودی

اور ہر کسی ایسے سیاسی کارکن کو جیل میں بھر دیا گیا جس پر ذرا بھی شبہ تھا کہ وہ انتخابات کے اس قریب میں حکمران جماعت کے لیے کسی قسم کی مشکل پیدا کر سکے گا۔ بخشی غلام محمد کی شکست کے تجربے نے حکمرانوں کو ہراساں کر دیا تھا چنانچہ انھوں نے کسی قسم کی "واردات" کے لیے گنجائش ختم کرنے کے لیے اب کی بار بیگم صاحبہ کی کشمیر واپسی پر بھی پابندی کا حکم صادر کر دیا۔ اور محاذِ رائے شماری کو خلافِ قانون جماعت قرار دیا گیا۔ اس کے دفاتر پر تالے چڑھا دیے گئے اور کارکنوں کی پکڑ دھکڑ بھی کی گئی۔ البتہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کشمیر میں جماعتِ اسلامی کے کچھ ممبران کو حکمران جماعت کے ساتھ مفاہمت سے بدولت اسمبلی میں پہنچنے کی اجازت دی گئی۔ اسمبلی انتخابات طے پا گئے تو ہندوستان کے لیڈروں اور اُن کے کشمیری حاشیہ نشینوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہندوستان میں میرے بہت سے ہمدرد دوست بھی تھے۔ اُن کی طرف سے مجھ پر دباؤ بڑھتا گیا کہ ماضی کی تلخیوں کو بھول کر پھر سے قومی دھارے میں شامل ہو جاؤں۔ دوسری طرف جموں و کشمیر کا نظم و نسق بھی بگڑتا جا رہا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ریاست کے نئے وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم نے کئی عام تقریبات میں برملا طور کہا کہ صرف شیخ محمد عبداللہ ہی ریاست کی بگڑتی ہوئی حالت کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔

میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہا کہ میرا ہندوستان کے ساتھ الحاق کی واقعیت پر اختلاف نہیں ہے۔ البتہ الحاق کی حدود پر ضرور اُن کے اور میرے درمیان اختلافِ رائے ہے۔ ہم نے ۱۹۵۲ء میں الحاق کی حدود طے کر کے آپسی معاہدات کی رو سے جس طرح دفعہ ۳۷۰ کی شکل میں طے کیا تھا۔ ہندوستانی رہنماؤں نے زبردستی اور غیر آئینی طور پر اس کو من مانی کرتے ہوئے مسخ کر لیا ہے۔ یہی امر ہمارے راستے جدا ہونے کی بنیاد بنا۔ اب اگر اُن حدود کو پھر سے بحال کیا جائے تو ہمارے آپسی اختلافات

رفع ہو سکتے ہیں۔ ان بنیادوں پر اگر وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں تو میں اپنی طرف سے رضامند ہوں۔ چنانچہ وزیرِ اعظم نے اس سلسلے میں پہل کی۔ انھوں نے اپنے سیکرٹری پی۔ این۔ ہاکسر کو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ بھیجا، جہاں میں اُن دنوں زیرِ علاج تھا۔ ملاقات کا وقت طے ہوا اور میں انسٹی ٹیوٹ سے وزیرِ اعظم سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گیا۔ انھوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ کشمیر کے معاملات پر گفتگو ہوئی۔ مسز گاندھی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "شیخ صاحب! جو کچھ بھی ہوا ہے، اُس کو بھول جانے کی ضرورت ہے۔ ہم پھر ایک نیا باب شروع کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا کہ "اگر آپ کا ارادہ ہے تو میں آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھام لینے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں نے جو کچھ بھی سہا اور برداشت کیا ہے وہ ایک مقصد کے حصول کے لیے تھا۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں اور اگر ہم اب بھی ایک صحیح سمت کی طرف گامزن ہو سکیں تو اس سے زیادہ خوش آیند بات اور کونسی ہو سکتی ہے۔"

اس تمام گفتگو کے نتیجے میں صورتِ حال میں بہتری پیدا ہونے لگی۔ مسز گاندھی کے ساتھ طے ہوا کہ معاملات کا جائزہ لینے اور انھیں سلجھانے کی تجاویز مرتب اور پیش کی جائیں۔ اس دوران محاذِ رائے شماری پر سے پابندی ہٹائی جا چکی تھی بیگم صاحبہ اور بیگ صاحب کو بھی کشمیر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ مجھے ۵ رجون ۱۹۷۲ء کو رہا کیا گیا۔ مسز گاندھی کے ساتھ میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۰ رجون کو میں کشمیر آیا۔ یہاں میرا پُر محبت بھرا استقبال کیا گیا اور حضوری باغ میں حسبِ دستور ایک عظیم اجتماع میں مجھے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ میں نے جلسے میں لوگوں کو بتایا کہ "شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ میری جو ملاقات ہوئی ہے اُس میں ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم کشمیر اور ہندوستان کے تعلقات میں ماضی کی تلخیوں کو بھول کر ایک نیا باب شروع کریں گے۔

اور یہ کوشش کی جائے گی کہ جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کو دور کرنے کے لیے ایک باعزت راستہ تلاش کیا جائے۔ کچھ لوگ پاکستان کے اس مسئلے کا فریق ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا پاکستان نے اپنے وکیل ہونے کا وکالت نامہ یہاں کس کو دیا ہے۔ اگر پاکستان میں طاقت اور ہمت ہے تو وہ اپنی یہ پوزیشن منوا سکتا ہے۔ میری اپنی قوم سے یہی درخواست ہے کہ وہ اپنی نجات کے لیے پاکستان یا چین یا کسی اور ملک کی طرف نہ دیکھیں۔ ہمیں خود اپنی تقدیر کی اُلجھن سلجھانا ہو گی۔ یہ ملک ہمارا ہے اور اس کے فیصلے صرف ہم کر سکتے ہیں۔" میں نے اس جلسے میں مرزا افضل بیگ کو اپنی طرف سے وزیر اعظم ہند کے نمائندے جی پارتھا سارتھی سے مذاکرات کے لیے نامزد کر دیا۔ پارتھا سارتھی جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے سابق وائس چانسلر اور کشمیر کے ایک سابق وزیر اعظم گوپالاسوامی آئنگر کے صاحبزادے ہیں۔ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ اور فراخ نظر دانشور ہیں۔ اور ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر تعصب کی عینک چڑھا کر بات کرنے پر اصرار نہیں کریں گے۔

ہم نے اپنی لڑائی کوچہ و بازار سے اب کانفرنس کی میز پر منتقل کر دی تھی۔ یہ مقاصد کی نہیں بلکہ حکمتِ عملی کی تبدیلی تھی۔ یہ مذاکرات بھی بڑے صبر آزما ثابت ہوئے۔ برس ہا برس کی پڑی ہوئی گرہوں کی عقدہ کشائی کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن دونوں نمائندوں نے کافی عرق ریزی سے کام لیا۔ اس دوران میری ہندوستان کی وزیر اعظم اور دوسرے لیڈروں سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا نقطۂ نظر بہتر طور پر سمجھا جانے لگا۔ مجھے صرف اس بات کی خلش تھی کہ وزیر اعظم اسمبلی توڑ کر ہمیں صحیح اور صحت مند طریقے پر ریاست میں جمہوری فضا تعمیر کرنے سے گریز کر رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس مرحلے پر انتخابات سے کچھ لوگوں کو گڑے

مُردے اُکھاڑنے اور اعتماد کی فضا کو مکدّر کرنے کا موقع ملے گا۔ بہر کیف۔ فروری ۱۹۷۵ء میں یہ مذاکرات ایک انجام کو پہنچے اور دونوں نمائندوں نے اپنے سربراہوں (PRINCIPALES) کو اپنی اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس پر میں اور مسز اندرا گاندھی دہلی میں ملے۔ اور ہمارے درمیان اُس مفاہمت کا اعلان ہوا جسے "کشمیر مفاہمت (اکارڈ)" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کشمیر میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ▲▲▲

۷۰

.... وہ اپنی خو نہ بدلیں گے

۲۴ فروری ۱۹۷۵ء کو میں دہلی سے ٹرین کے ذریعے جموں پہنچا تو سٹیشن پر عوام کا ایک بڑا ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ فضا میں ایک نئی تبدیلی کے آثار تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ظلمت کی لمبی رات کا خاتمہ ہو رہا ہے اور افق پر ایک نئی صبح کی کرنیں روشن ہو رہی ہیں۔ لیکن میرا ذہن مستقبل کے اندیشوں میں کھویا ہوا تھا۔ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی رات کی تاریکی میں جو شب خون مارا گیا تھا اس کے اثرات نے ساری ریاست میں اخلاقی جذام کے سے حالات پیدا کر دیئے تھے اور اس کا اثر سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے سرچشموں کو بھی زہر آلود بنا رہا تھا۔ بائیس سال کی من مانیوں کے بعد یہ علت پیدا کرنے والے خود راہ فرار اختیار کر رہے تھے اور ہمارے کندھوں پر اس کے انسداد و علاج کی حوصلہ آزما ذمہ داریاں ڈال رہے تھے۔ پھر میں خود پہلے کی طرح نہ جوان تھا اور نہ میری صحت ویسی رہی تھی۔ لیکن کشمیر کی تقدیر پر میرا اعتماد اب بھی غیر متزلزل تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید قدرت نے مجھے ان کٹھن آزمائشوں میں ڈال کر بھی اس لیے محفوظ رکھا تھا کہ میں اس نازک مرحلے پر

اپنی قوم کے کام آجاؤں۔ اس تصور سے مجھے ڈھارس ملی اور میں نے خود اعتمادی کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو نئے فرض کی انجام دہی میں جھونک دیا۔

جموں میں میرا قیام سرکاری مہمان خانے میں رہا جو مہاراجہ کے وقت میں ایک پُرفضا باغ میں تعمیر کیا گیا ہے اور جو اس خاص جیل سے معمولی مسافت پر واقع ہے جہاں مجھ پر کشمیر سازش کیس کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اسی دن سہ پہر کو وزیر اعلیٰ کے نجی دفتر کی عمارت میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کی ایک خاص نشست ہوئی جس میں مجھے اتفاق رائے سے پارلیمانی پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ اس نشست میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر دیو کانت بروا بھی موجود تھے۔ میرا نام سبکدوش ہونے والے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے پیش کیا اور اس کا بظاہر گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن مجھے صورت حال کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر کرن سنگھ کی موجودگی بھی ایک عجیب رنگ میں موقع کی اہمیت کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو جب مجھے وزارتِ اعظمیٰ سے غیر قانونی طور پر الگ کر دیا گیا تھا تو انہی کے دستخطوں کا حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور اب وہی ہاتھ میرے گلے میں نئی ذمہ داری قبول کرنے پر پھولوں کے ہار ڈال رہے تھے۔ میں نے کشمیر اکارڈ کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے دوران وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے کہا تھا کہ اگر کشمیر کے متعلق واقعی ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے تو اسمبلی کے نئے اور بالکل آزادانہ انتخابات منعقد کیے جانے چاہئیں۔ اس طرح عوام ایک جمہوری عمل کے تحت اپنی پسند کے نمائندے چنیں گے اور ہر طبقۂ خیال کو اظہار کی آزادی نصیب ہوگی۔ میں سمجھتا تھا کہ ۱۹۵۳ء میں عوامی اعتماد کی جس امانت پر ایک سازش کے تحت ڈاکہ ڈالا گیا تھا۔ اس کو پورے آداب و انصرام کے ساتھ عوام کو واپس لوٹا دیا جانا چاہئے تاکہ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں پر ان کا کھویا ہوا اعتماد

پھر بحال ہو جائے۔ الغرض عام انتخابات ریاست کے مریضانہ سیاسی ڈھانچے کی شفایابی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھیں گے۔ لیکن وزیرِ اعظم نے اِس مشورہ کو قبول کرنے میں تامّل سے کام لیا۔ اُنھوں نے کہا کہ فی الحال کانگریس پارلیمانی پارٹی مجھ کو قائد چن لے گی اور میری پالیسیوں، پروگراموں اور فیصلوں میں کسی قسم کا رخنہ پیدا نہ کرے گی۔ اُن کا رویّہ، یہی اسمبلی کے بارے میں کچھ ایسا تھا کہ مجھے میر تقی میرؔ کا یہ ستم ظریفانہ شعر یاد دلاتا تھا ؎

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی
لے اے زبان دراز تو سب کچھ ہوا کے گُل

میری سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ میں نے اِس جھوٹی قسم پر اعتبار کر لیا اور اپنے گزشتہ تجربے کو پسِ پشت ڈال کر خلوصِ نیّت کے ساتھ اشتراک پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے اس غلطی کی تلخی کا از سرِ نو اندازہ ہونے والا تھا۔

میں نے لیڈر چنے جانے کے بعد اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ دہلی اکارڈ کو میں اِس اعتماد کی بحالی سے تعبیر کرتا ہوں جس میں ۱۹۵۳ء میں بال آگیا تھا اور میرے دل میں کوئی تلخی موجود نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تحریک اور تاریخ کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر جدا ہونا اور پھر ملنا کوئی انوکھی باتیں نہیں ہیں۔ میرے ساتھ میرے ساتھیوں نے جو معاملہ کیا وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اِس کے کیف و کم پر فیصلہ صادر کرنا میں مؤرخ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میں اپنی نئی ذمہ داری پورے خلوص کی بنیاد پر سنبھال رہا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ دوسری جانب سے بھی وسوسوں اور شواش کھات کی تاریخ دہرائی نہ جائے گی۔

اس روز پارلیمنٹ میں کشمیر اکارڈ کی دستاویزات پیش کی گئیں اور ایوان کے ہر حلقے نے اِسے ایک بہت اہم کارنامہ قرار دیا۔ مسز اندرا گاندھی نے ٹیلی فون پر مجھے

اکارڈ کی توثیق کی خبر سنائی اور مبارکباد دی۔ لیکن رات کو آل انڈیا ریڈیو نے اپنی روایات کے عین مطابق اِس اکارڈ کو کچھ ایسے یک رُخے پن سے پیش کیا جیسے کانگریس پارٹی نے کوئی بڑا قلعہ فتح کیا ہو اور جیسے مرکزی حکومت نے اپنی طرف سے کوئی اقرار نہیں کیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ اگر ابتدائے عشق میں ہی ایسی اعتماد شکنی سے کام لیا گیا ہے تو آگے کیا کچھ پیش آئے گا۔ دوسرے دن صبح کو دہلی ریڈیو نے اپنی چابک دستی کو مکرر کر دیا۔ اور میرے اندیشوں کو کچھ اور تقویت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ جب تک نئی دہلی سے اِس طرزِ عمل کے بارے میں دریافت نہ کیا جائے۔ میرے حلف لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اُدھر راج بھون میں ایک بارونق تقریب کے انتظامات مکمل کیے جا چکے تھے اور حلف لینے کے لیے دس بجے صبح کی ساعت مقرر کی گئی تھی۔ کسی طرح سے میری سوچ کی بھنک سیّد میر قاسم اور کچھ اور اصحاب کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ میرے پاس چلے آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ اگر بسم اللہ ہی بے اعتمادی سے کی جاتی ہے تو میں اقتدار سے دور اپنے خرقۂ فقر میں ہی ٹھیک ہوں۔ قاسم صاحب نے ریڈیو کی شرارت آمیز کوتاہی کو تسلیم کر لیا اور کہا کہ نیچے کی سطح پر بھی اس کے رُونما ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ لیکن اس کی سزا ریاست کے عوام اور اُن کے خیر خواہوں کو نہیں دی جانی چاہیے۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کی طرف وزیرِ اعظم کی توجہ مبذول کرائیں گے۔ کچھ اور رفیقوں نے بھی اسی قسم کی دلیل پیش کی اور میں مقررہ وقت سے کوئی پونا گھنٹہ دیر سے راج بھون پہنچا۔ جہاں گورنر شری لکشمی کانت جھا نے مجھے وزارت کا حلف دلوایا۔ میرے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ، ٹھاکر دیوی داس اور صوفم ترپو نے بھی کابینہ کے وزیروں کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی کانگریس پارٹی سے تعلق نہ رکھتا تھا اور نہ ریاستی قانون سازیہ کا رکن تھا۔ میرے خیال میں یہ پارلیمانی جمہوریت

کی تاریخ میں ایک انوکھی مثال تھی کہ قانون سازیہ کے دو ایوان موجود ہوں اور اُن سے کابینہ کا کوئی ممبر متعلق نہ ہو۔ بیگ صاحب تو میرے دیرینہ ساتھی تھے ہی۔ ۹ اگست کو انھیں میرے ہی ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جبکہ وہ میری کابینہ میں مشیرِ مال تھے اور اب وہ پھر میرے ساتھ اپنا منصب حاصل کر رہے تھے۔ ٹھاکر دیوی داس اور اور صوتم زبو نہ کانگریس سے وابستہ تھے اور نہ ہماری جماعت محاذِ رائے شماری سے ان کو میں نے اس لیے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تاکہ اس کے کسی رُکن کی شہرت پر کوئی انگشت نمائی نہ کر سکے اور نہ اس کا ۱۹۵۳ء کے بعد ہونے والی بے راہ روی سے کوئی واسطہ رہا ہو۔ اس کے علاوہ ٹیم کے ارکان کی ذاتی خوبیاں اور لیاقت بھی مسلّمہ ہوں اور وہ جماعتی تعصبات کی چھوت چھات سے بھی پاک ہوں۔ تاکہ وہ ریاست کی اخلاقی اور سیاسی تعمیرِ نو کے سلسلے میں میرے خوابوں کے خاکوں میں رنگ بھر سکیں۔ ٹھاکر دیوی داس جموں کے ایک اچھے وکیل رہ چکے تھے اور اس وقت ہائی کورٹ کے جج تھے۔ میں جموں سے کسی نیک نام قابل آدمی کو، جس کا دامن داغدار نہ ہو، اپنی کابینہ میں لینا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سے دوستوں سے رائے لی تو بریگیڈیر گھنسارا سنگھ اور ٹھاکر دیوی داس کے نام اُبھرے۔ بریگیڈیر صاحب کو میں جانتا تھا لیکن وہ اب عمر کی اس منزل میں تھے جہاں ان سے اس حوصلہ آزما کام میں ہاتھ بٹانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ٹھاکر دیوی داس کا نام تو میں سن چکا تھا۔ لیکن ان کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُن کی ذہانت اور لیاقت کی تعریفیں مجھ تک پہنچیں تو میں نے ان کو سندیسہ بھیجا کہ اگر وہ اپنے لوگوں کی خدمت کے نیک کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں تو انھیں اپنا آرام دہ منصب چھوڑ دینا ہوگا۔ انھوں نے خوشی خوشی میری پیش کش منظور کر لی۔ پھر جب عدالتِ عالیہ میں اُن کے رفقاء انھیں الوداعیہ دے

رہے تھے تو مجھے بھی اس تقریب میں بلایا گیا۔ میرے ساتھ ہی بیگ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ میں اس سے قبل نہ ٹھاکر دیوی داس سے ملا تھا اور نہ اُن کو پہچانتا تھا اس لیے میں نے بیگ صاحب سے دھیمے لہجے میں پوچھا کہ ٹھاکر دیوی داس کون صاحب ہیں؟ پھر اُنھوں نے مجھے ٹھاکر صاحب کی شکل دکھا دی اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ صوتم زبو لداخ کے باشندے تھے اور ریاست کی انجینئرنگ سروس میں کافی مدت تک خدمات انجام دینے کے بعد اچھی شہرت حاصل کر کے سُبکدوش ہو چکے تھے اور اکارڈ کے وقت ہندوستان کی طرف سے بیرونی منگولیا میں سفیر کی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ اُنھوں نے میری دعوت پر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنا اعلیٰ منصب ترک کر دیا اور ہمارے قافلے میں شامل ہو گئے۔ مجھے اس سلسلے میں وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی سے بھی درخواست کرنا پڑی کہ وہ زبو صاحب کو سفارتی عہدے سے سبکدوش کر دیں جو اُنھوں نے بلا تامّل قبول کر لی۔

حلف اُٹھا لینے کے بعد ہم کو جلوس کی صورت میں جموں کے سیکریٹریٹ تک پہنچایا گیا جہاں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرنے کے بعد میں نے نئی کابینہ کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اولین میٹنگ میں ہی ہم نے سیاسی بے راہ روی اور انتظامی افراتفری کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ پُرخطر مگر جرأت مندانہ اقدامات اُٹھا لینے کا اصول طے کیا۔ انتظامیہ کا سارا بالائی ڈھانچہ نئی تبدیلی سے خائف تھا۔ اور ہمیں اپنے اقدامات کی عمل آوری کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم اُٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے ہم نے چند دنوں تک انتظامیہ کے مسائل کی تشخیص اور اُن کے انسداد کے لیے موثر اور کارگر اقدامات سوچنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔ میں نے اسی روز کوئی بائیس برس کے بعد ریڈیو سے ریاستی باشندوں کے نام اپنی ایک نشری تقریر میں نئے مرحلے

کی ذمہ داریوں اور اُس کی کیفیت کے بارے میں کہا:

"اکیس سال کے طویل وقفے کے بعد میں آج ایک اور بار ریاستی انتظامیہ کی ذمہ داریاں سنبھال رہا ہوں۔ اس دوران مجھ پر، میرے ساتھیوں پر اور آپ پر کیا گذری اس سے سبھی واقف ہیں اور میں یہ شکایت دہرا کر آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا...... میں اس مرحلے پر اُن واقعات و شخصیات پر بھی کوئی فیصلہ صادر کرنے سے احتراز کروں گا، جو اگست ۱۹۵۳ء میں میری گرفتاری اور اُس کے بعد رُونما ہونے والے حالات کے ذمہ دار تھے۔ میں یہ فیصلہ مستقبل کے مؤرخ اور آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہی اس بارے میں بے لاگ اور غیر جانب دارانہ رائے دینے کے اہل ہو سکتے ہیں...... میری ساری زندگی چند بُنیادی قدروں کے تحفظ اور اپنے ہموطنوں کی عزت و آبرو کے لیے وقف ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ اکیس سال پہلے اقتدار کو ٹھکرا کر آج اکیس سال بعد زمام اقتدار سنبھالنا میری نگاہوں میں اُنھیں قدروں کے تحفّظ اور مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ گذشتہ بیس بائیس برسوں کی بدانتظامی اور بے راہ روی سے پیدا شُدہ صورت حال کے تصور نے مجھے بہت دنوں تک اس کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا کہ آیا مجھے ان حالات میں وزارت کی ذمہ داریاں سنبھالنا چاہئیں یا نہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ میں ایک نقاد یا تماشائی بن کر دوسروں کی غلطیوں پر حرف گیری کرتا اور حبُّ الوطنی، احساسِ فرض اور دیانت داری کا تقاضا تھا کہ ذاتی عافیت اور مصلحت کی سطح سے بلند ہو کر بگڑی ہوئی صورت حال کو مزید بگڑنے سے روکنے اور غریب عوام کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے مجھے حالات کی سنگینی اور مسائل کی پرواہ کیے بغیر آگے آنا چاہیے۔ ایک فرار کا راستہ تھا اور دوسرا پیش قدمی کا اور ماضی گواہ ہے کہ میں نے ناسازگار حالات سے گھبرا کر کبھی فرار کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی میں نے انتہائی ناسازگار اور پیچیدہ ترین صورتحال میں نئی ذمہ داریاں سنبھالنے سے گریز نہیں کیا ہے۔"

چند دن جموں میں اہم معاملات کی نبض ٹٹولنے کے بعد میں کابینہ کے ساتھیوں کے سمیت سرینگر کی طرف روانہ ہوا۔ سارے راستے میں لوگوں کا ایک طوفان اُمڈا ہوا تھا۔ اور ہر جگہ گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ ۳ مارچ کو ہم بانہال پار کر کے وادیٔ کشمیر میں پہنچے۔ بہار کی آمد آمد تھی اور کشمیر سرما کی لمبی رات کے بعد رنگ اور خوشبو کے خوبصورت دفتر پھر کھول رہا تھا۔ اس روح پرور فضا میں عوام نے سرینگر تک سارے راستے کو سجایا تھا اور ہر جگہ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آ رہے تھے اُس دن سہ پہر کو سرینگر کے لال چوک میں عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جمع ہو گیا تھا جسے ایک مقامی اخبار نے گرامر کی کلائی مروڑتے ہوئے "تاریخ کا سب سے عظیم ترین اجتماع" قرار دیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

"اس امر کے باوجود کہ بعض لوگوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر آپ کو پریشان کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ آپ نے میرا پُر محبت استقبال کر کے اُن سب کو برجستہ جواب دیا ہے۔ سرحد کے پار پاکستان کے حکمرانوں نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہئیں۔ لیکن آپ نے اُن کو خاطر میں نہ لایا۔ آج سے چند دن پہلے پاکستان کے بڑے حکمرانوں نے اپنے "آزاد کشمیر" کے دورے میں کہا تھا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قرار دادیں

ردی کاغذ کے پُرزے ہیں۔ تو میں نے اُس پر سخت اِحتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ کشمیری عوام نے اپنا خون بہا کر اقوامِ متحدہ سے یہ حق منوالیا ہے اور ہم اس کی قراردادوں کو ردی کا کاغذ نہیں سمجھتے ہیں پاکستانی حکمرانوں سے پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام کے حقِ خود ارادیت کی بات کرتے ہوئے کیا اُنھیں یہ خیال آیا کہ وہ اُن پندرہ لاکھ کشمیریوں کو، جو آزاد کشمیر میں رہتے ہیں، حقِ خود ارادیت دیں؟ وہ پہلے اپنے گھر کو سنبھالیں اُس کے بعد ہماری غمگساری کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد رہا ہے۔ اُنھیں کشمیر کی خوبصورتی سے دلچسپی ہے یہاں کے عوام کی فلاح وبہبود سے نہیں۔ میں کشمیری عوام کو اُن مصائب سے نجات دلانا چاہتا ہوں جو ایک مصنوعی قیادت اور فریب انگیز نظام کو اُن پر مسلط کرکے پیدا کردیئے گئے ہیں۔ اِس وقت قانون کی عملداری اور دیانتدارانہ اِنتظام کی بحالی قوم کی فلاح و بقاء کا اوّلین تقاضہ بن گئے ہیں۔"

کچھ ہی دنوں میں اِنتظامیہ پر ایک نظر ڈالنے اور مسائل کا حتی المقدور جائزہ لینے کے بعد ہم نے اِصلاحِ احوال کا بیڑا اُٹھالیا۔ سیکرٹریٹ حکومت کا دل ہوتا ہے لیکن اس کو ایک اچھا خاصا مچھلی بازار بنادیا گیا تھا۔ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت سیکرٹریٹ میں دندنا سکتا تھا اور کچھ بدنام قسم کے عناصر ہر وقت اِس کے برآمدوں میں اپنی توتھنیاں اُٹھاتے ہوئے اودھم مچاتے نظر آتے تھے۔ اس کا زہر سیکرٹریٹ کے کارپردازوں میں بھی سرائیت کرگیا تھا۔ اور دفتر کے کمروں میں ایک غیر سنجیدہ ماحول نظر آتا تھا۔ ہم نے اس ابتری کو ختم کرنے کے لیے سیکرٹریٹ میں داخلے کے قواعد بنائے اور فوری طور پر نافذ کردیئے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں میں سیکرٹریٹ اور دوسرے

دفتروں کی حاضری میں باقاعدگی اور کام کرنے میں قرینہ پیدا ہونے لگا۔ قہوہ خانے جہاں سرکاری ملازم اوقاتِ کار میں بھی گپ شپ کرتے رہتے تھے، سنسان پڑ گئے۔ تعلیمی اداروں اور امتحانی مراکز میں جہاں نقل کرنے کو تقریباً قانونی جواز عطا کیا گیا تھا صورت حال سدھرنے لگی۔ میں نے خود امتحانی مراکز کا دورہ کیا اور نگران عملے کو ہدایت کی کہ نقل کی بدعت کا سختی سے سدِّباب کریں۔ چنانچہ دیکھتے ہی نقل کا روگ، جو صرف ہفتہ بھر قبل ناقابلِ علاج معلوم ہوتا تھا، تقریباً جڑ سے اُکھیڑ دیا گیا۔

ہم نے ریاست کے اقتصادی ڈھانچے کی صحت بحال کرنے کے لیے ریاست کے لائق گورنر شری بخشی کانت جھا کی صدارت میں ایک ڈیولپمنٹ ریویو کمیٹی بنائی۔ جھا صاحب، جنھیں میں اُن دنوں سے جانتا ہوں جب وہ جواہر لال کا ہاتھ بٹاتے تھے، ایک لائق اور قابل ہستی ہیں۔ چنانچہ اس کمیٹی میں جھا صاحب کے علاوہ ملک کے کچھ پہلی صف کے ماہرینِ اقتصادیات بھی شامل کیے گئے۔ کمیٹی نے ہمارے مسائل کا دوررس نظر سے جائزہ لیا اور اِس کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں بعد میں نئے منصوبوں کے خاکے تشکیل دیئے گئے اور اُن پر عمل آوری کا کام شروع کردیا گیا۔

۱۹۵۳ء میں میری گرفتاری کے بعد ریاست کی اقتصادیات کو ایک بڑا ناسور لگادیا گیا تھا۔ جس کی بنیاد سیاسی رشوت ستانی پر تھی۔ بخشی غلام محمد اور اُن کے کتابی طرز کے اشتراکی کامریڈوں نے سیاسی مسائل کی تیز آنچ کم کرنے کے لیے کشمیریوں کو ضمیر کے بدلے شکم کے راستے سے ہموار بنا لینا چاہا تھا۔ چنانچہ اُن کو سستے چاول راشن پر فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ دلی کے حکمرانوں کو بتایا گیا کہ اگر کشمیریوں کو سستے چاول فراہم کیے گئے تو وہ سیاسی مسائل اور شیخ محمد عبداللہ کو بھول جائیں گے۔ حکومت خود تو ہندوستانی مارکیٹ سے مہنگے داموں چاول

خریدتی تھی لیکن انھیں ریاست میں بہت کم نرخوں پر بیچتی تھی اور اس طرح خزانہ عامرہ پر کروڑوں روپے کا گھاٹا لادا جا رہا تھا۔ بخشی صاحب اس سستی شکم پروری کو اپنی سیاسی حکمت عملی کا نہایت کارگر نسخہ سمجھتے تھے۔ جس وقت ہم نے ۱۹۷۵ء میں حکومت سنبھالی اس وقت خوراک پر دیے جانے والے اس خسارے جسے عرف عام میں سبسڈی (SUBSIDY) کہہ کر پکارا جاتا تھا کی مالیت بیاسٹھ کروڑ سالانہ سے تجاوز کر گئی تھی اور ریاست کی آمدنی کے ذرائع کو گھن کی طرح کھوکھلا کر رہی تھی۔ میں سب سڈی کی سیاسی اور اقتصادی جوازیت کو مشکوک سمجھنے کے علاوہ اس کی اخلاقی اساس کو مہلک سمجھتا تھا۔ کیونکہ اس طرح سے سرکار قومی سطح پر بھکاری پن کی سرپرستی کر رہی تھی اور قوم کی حمیت کی رگ کو کاٹ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو مرحلہ وار سبھی ختم کرنے کی ٹھان لی میں نے اس غرض کے لیے تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی کانفرنس طلب کرلی جس میں پردیش کانگریس کے سرکردہ عہدیدار بھی شامل تھے۔ سبھی شرکا نے سب سڈی ختم کرنے کے اصول کی سرگرم حمایت کی۔ پردیش کانگریس کے نمائندوں نے اس کی پوری حمایت کی۔ چنانچہ ہم نے اُن کے قول پر اعتبار کرکے اس کے مرحلہ وار خاتمے کا آغاز کر دیا اور اس طرح سے بچائی ہوئی رقم کو ترقیاتی اور روزگار فراہم کرنے والے کاموں پر صرف کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن بہت جلد یہ بات آشکارا ہوگئی کہ ہمارے مخالفین اور خاص طور پر ہمارے کانگریسی اتحادیوں نے اپنے قول و قرار سے منحرف ہو کر سب سڈی کے معاملے پر عوام کو جھانسہ دے کر انھیں ہمارے خلاف اُکسانا شروع کر دیا لیکن یہ بات بڑی امید افزا تھی کہ اس مخالفانہ، معاندانہ اور بے اصولانہ مخالفت کے باوجود عوام نے ہمارے اس اقدام کی معنویت اور اس کے صحت مند پہلو کو بھانپ لیا۔ اور ابتدا میں کچھ مشکلات سہہ لینے کے باوجود اس قدم کے اصلاحی پہلو

کو پسند کر لیا۔ کانگریسیوں کی مخالفت کا ڈھنگ اُن کی روش کے مطابق منافقانہ تھا۔ وہ ہمارے سامنے تو اس اقدام کے دوررس فوائد کی حامی بھر لیتے تھے۔ لیکن پیٹھ پیچھے اسے عوام دشمن اقدام قرار دیتے تھے۔ اگرچہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کانگریسیوں کے ایک جماعتی کنونشن میں سب سڈی ہٹائے جانے کے فیصلے کو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف اور جرأت مندانہ قرار دیا۔ پھر بھی مقامی کانگریسی لیڈر اپنی سی ہانکتے رہے۔

نئی سوچ کو روبہ عمل میں لانے کے لیے سرکاری انتظامیہ ایک انتہائی اہم اوزار کی حیثیت رکھتا تھا مگر بائیس سال کے سیاسی زوال اور انتظامی افراتفری نے اس کی رگ رگ میں کوڑھ کا زہر بھر دیا تھا۔ یک لخت تو اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ لیکن اپنے مقاصد کا ثمر دینے کے لیے ہم نے اعلیٰ عہدوں پر مامور کچھ "شہرت یافتہ" افسروں کو یا تو چلتا کر دیا یا انھیں ریاست کی چراگاہ سے واپس بھیج دیا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انتظامیہ کی ہر سطح پر اس کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔ یوں دیانتداری، محنت اور قابلیت کی بھولی بسری قدروں کا چرچا پھر سے ہونے لگا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد میں نے اپنی کابینہ میں پہلی توسیع کی۔ ہم نے نئے تقاضوں کی روشنی میں جو اصلاحی اور تعمیری کام شروع کیے تھے اُن کی وجہ سے بوجھ بڑھنے لگا تھا اور کابینہ کے وزیروں کا ہاتھ بٹانے کے لیے نئے اور نوجوان ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریسی اقتدار سے الگ ہو کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے اور کئی بار مرکز نے اُن کی اس بڑھتی ہوئی بے چینی کی طرف میری توجہ مبذول کرائی تھی۔ توسیع کے وقت میں نے صرف وزرائے مملکت اور نائب وزیروں کی سطح پر تقرریاں کیں۔ ہمارے ساتھیوں میں سے عطاء اللہ سہروردی، الحکیم حبیب اللہ، غلام محمد شاہ، غلام نبی کوچک اور کانگریسیوں میں سے منگت رام، رنگیل سنگھ، بھجو رام،

چودھری محمد اسلم، کاچو محمد علی اور زینب بیگم کی تقرری کی گئی۔ اس کے علاوہ پنڈت موہن کشن ٹکو، جو مقدمہ سازش میں ہمارے جج رہ چکے تھے، بھی ایک وزیر مملکت بنا دیے گئے۔

انتظامیہ کے علاوہ ایک فعال اور مستعد سیاسی جماعت کا وجود ہمارے مقاصد اور منشور کی بجاآوری کے لیے نہایت اہم درجہ رکھتا تھا۔ نئے حالات میں محاذ کے کارکنوں نے محسوس کیا کہ ان کا دائرہ کار، مفہوم، معانی اور مقاصد کے اعتبار سے بدل گیا ہے۔ چنانچہ محاذ کے خصوصی اجلاس واقع مجاہد منزل سرینگر میں ایک عظیم اکثریت کے ساتھ محاذ کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب نئی تنظیم بنانے کا سوال آیا۔ تو میں نے نیشنل کانفرنس کو پھر سے زندہ کرنا مناسب خیال کیا۔ ۵۳ء میں میری گرفتاری کے بعد نیشنل کانفرنس پر بخشی غلام محمد نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ریاست میں غنڈہ گردی اور اخلاقی پستی کے جو مظاہرے کیے گئے تھے اس کی وجہ سے یہ جماعت خاصی بدنام ہو گئی تھی۔ اُدھر غلام محمد صادق اور ان کے ساتھیوں نے دلی دربار کو اپنی وفاداری کا زیادہ یقین دلانے کے لیے ریاست میں کانگریس کی شاخ منظم کی تھی۔ لیکن یہ جماعت کبھی بھی عوامی سطح پر مقبول نہ ہو سکی۔ حالانکہ اسے دلی کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل رہی اور اس کو مرکز اور آل انڈیا کانگریس کے خزانے سے بھاری رقوم کے انجکشن بھی دیے جاتے رہے۔ لیکن میں بہرحال نیشنل کانفرنس کی احیائے نو کا حامی تھا چنانچہ میں نے محاذ کے صدر مرزا افضل بیگ اور پردیش کانگریس کے رہنما سید میر قاسم کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خیالات کا تجزیہ پیش کیا۔ میں نے بیگ صاحب کے نام لکھا۔

"اب جبکہ آپ نے محاذ کو توڑنے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے، ایک نئی

سیاسی جماعت کے قیام کا مسئلہ ایک ذہنی ورزش نہیں بلکہ ایک ٹھوس اور فوری ضرورت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ موجودہ سیاسی خلاء دور ہو اور ہم ریاستی عوام کے سامنے ایک مثبت اقتصادی پروگرام اور صحت مند سیاسی نظام کا وہ خاکہ پیش کر سکیں جس کی خاطر ہم نے اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ نئی جماعت کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے بنیادی مقاصد، اپنی جدوجہد کی تاریخ، اپنے سیاسی رول کی اہمیت، اپنی انفرادیت اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ ہمیں کسی قیمت پر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ایک شاندار ماضی اور قابل فخر میراث کے مالک ہیں اور ہمیں اس تاریخی تسلسل کو درہم برہم نہیں کرنا چاہیے۔ جس پر ہماری عزت اور عظمت کا مینار قائم ہے کیا ہم اپنے ماضی سے صرف اس لیے دست بردار ہو جائیں کہ ہماری جدوجہد کے ایک اہم موڑ پر کچھ رہزنوں نے ہمارے قافلے پر شب خون مارا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہ دوست جو نیشنل کانفرنس کے اُس دور سے خائف ہیں کہ جو ۵۳ء کے بعد اس سے وابستہ ہے اُن کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ۴۷ء کے خون آشام دور میں بہت سے مندروں، مسجدوں اور عبادت گاہوں پر بھی غاصبوں اور لٹیروں نے جبراً قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اس قبضے سے نہ ان عبادت گاہوں کی تاریخ مسخ ہو گئی اور نہ ان کا تقدس!"

قاسم صاحب کے نام میرے خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

"میں پورے خلوص اور صدق دلی کے ساتھ آپ کو اور آپ کے دوسرے ساتھیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ فروعی اختلافات، ذاتی ترجیحات، ماضی کی تلخیوں اور وقتی اندیشوں کو بھول کر آپ بھی نیشنل کانفرنس میں شامل

ہو کر اپنی اُس عظیم میراث کے وارث بن جایئے کہ جو ہم سب کے لیے باعثِ افتخار اور قابلِ اعتبار سرمایہ ہے..... مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ اِس وقت ایک ایسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہیں جو اپنی شاندار روایات کے اعتبار سے ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم حیثیت کی مالک ہے۔ لیکن اگر اس کے باوجود میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے تعلقات میں ہمیشہ رقابت کی بجائے رفاقت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف نیشنل کانفرنس کو ہمیشہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سپہ سالاروں کی حمایت اور تعاون حاصل رہا۔ اِسی طرح کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان باہمی اعتماد، تعاون اور اشتراکِ عمل کی ایسی فضا قایم تھی کہ اس بات کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں جماعتوں کو مدغم کیا جائے..... ۱۹۵۳ء کے بعد نیشنل کانفرنس کے رول اور ۱۹۶۵ء میں نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں مدغم کرنے کے فیصلے کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا ان میں سیاسی تقاضوں کا نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کا دخل تھا۔ اب جبکہ خوش قسمتی سے فضا بدل گئی ہے اور آپ کے اور ہمارے سامنے وہ مجبوریاں نہیں ہیں ہمیں اپنی محبوب تنظیم نیشنل کانفرنس کا ازسرِنو احیا کر کے اُن قدروں کو پھر سے زندہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنا چاہیے کہ جن سے ہماری تاریخ اور ہماری آنے والی نسلوں کی تقدیر وابستہ ہے۔"

محاذ کے کارکن تو خیر میری آواز پر لبیک کہہ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔

لیکن پردیش کانگریس کے منصب دار بھلا کیوں اپنے مفادات سے دست بردار ہو کر جاری کی اِس بہتی ہوئی گنگا سے کنارہ کش ہو جاتے جو پردیش کانگریس کے نام پر مرکزی سرچشمے سے پھوٹتی تھی اور اُن کے گھروں کو سیراب اور شاداب کرتی تھی۔ دوسرے وہ میرے اِقتدار سنبھالنے کو ایک عارضی دور سمجھتے تھے اور اُن کے ایک گھر کے بھیدی کے مطابق جس نے اشرفیوں کی بندر بانٹ پر استعفیٰ دے کر اُن کے خلاف متوازی تنظیم کھڑا کر لی وہ دہلی کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ پر آس لگائے بیٹھے تھے کہ میری صحت مجھے چند ماہ سے زیادہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دے گی اور اس کے بعد وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت حاصل کر پائیں گے۔ اُنھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ڈھانے پر آمادگی ظاہر نہیں کی لیکن نیشنل کانفرنس اپنے قیام کے فوراً بعد ریاست بھر میں مقبول ترین عوامی تنظیم بن گئی۔ اُنہی دنوں مسز اندرا گاندھی سرینگر آگئیں تو اُنھوں نے ایمپوریم باغ میں کانگریسیوں کے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جا سکتا اور اگر یہاں صرف ایک ممبر اس کے ساتھ رہے تو پھر بھی یہ جماعت یہاں قایم رہے گی۔ کانگریسی حکومتوں کے خلاف یہاں بددیانتی اور بدعنوانی کے شدید الزامات تھے۔ مسز گاندھی نے اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان کی ایک ہی جنبش سے اپنے لاڈلوں کو یہ کہہ کر بری کر دیا کہ "گندگی کہاں نہیں ہوتی۔ کسی عالیشان قالین کا کونہ اُٹھا کر دیکھئے۔ اس کے نیچے گرد کی موٹی تہہ جمی نظر آئے گی۔" مسز گاندھی کی اس تقریر نے میرا سارا تامل دور کر دیا اور اس کے چند ہی روز بعد لال چوک میں نیشنل کانفرنس کا ایک عظیم جلسہ منعقد ہوا۔ جہاں میں نے برسرِعام نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم بھر کر اس میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ میں نے جلسے میں کہا:

"جہاں مسز اندرا گاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے وجود

اور اس کی تشکیل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں وہاں اس فیصلے کو حتمی طور پر قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار صرف یہاں کے لوگوں کو ہے اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت اُن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس سکتی۔ نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہماری تحریک اور تاریخ کے سنہرے لمحے وابستہ ہیں اور ہم اپنا راستہ اختیار کر کے اسی تنظیم کو مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں یہی مسز اندرا گاندھی کے چیلنج کا میری طرف سے جواب ہے۔"

میں نے اسی جلسے میں نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رکنیت کا فارم حاصل کیا۔ نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں اُس وقت اور استحکام پیدا ہوگیا جب ۱۹۷۶ء میں جموں کے سالانہ اجلاس میں مجھے اس کا پھر سے صدر چُن لیا گیا میرا نام اس صدارت کے لیے سبکدوش ہونے والے صدر بیگ صاحب نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ میں اُس وقت انتظامیہ کے کام کاج کے ساتھ تنظیم کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا خاصا مشکل خیال کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اِس کا اظہار اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں کیا:

"آپ اپنی محبت اور عقیدت کے جوش میں میری عمر، میری صحت اور میری غیر معمولی مصروفیات کو بھی نظر انداز کر گئے۔ آپ شاید بھول گئے کہ میری عمر کو پہنچ کر انسان کا جسم اور اُس کے کاندھے بہت زیادہ بوجھ اُٹھانے کے اہل نہیں رہتے۔ آپ نے اُن ذمہ داریوں کو بھی ملحوظِ خاطر نہیں رکھا جو ریاستی حکومت کی سربراہ کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتی ہیں۔"

بہر کیف۔ مجھے تنظیم کے رفیقوں کی خواہش ماننا پڑی اور اس طرح سے اس تنظیم کا فولادی ڈھانچہ کھڑا ہوگیا۔ جس نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ایک چٹان کی طرح بادِ مخالف کے طوفانی جھونکوں کا رخ موڑ کر رکھ دیا اور ہماری تحریک کے چراغ کو

روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

نیشنل کانفرنس کی تنظیم نو سے کانگریسی حلقوں کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں کچھ اور شدت پیدا ہوگئی۔ اُنھوں نے حکومت اور نیشنل کانفرنس کے خلاف مہم تیز کر دی۔ وہ اُس قول و قرار سے ضمیر کی کسی خلش کے بغیر منحرف ہونے لگے۔ جو اُنھوں نے مجھے اقتدار کی ذمہ داریاں سونپتے وقت اور کابینہ میں اپنے نمائندے بھیجتے وقت کیا تھا۔ اُنھوں نے بڑی ڈھٹائی سے اُن راشی افسروں کی حمایت بھی شروع کر دی جنھیں ہم نے انتظامیہ کی تطہیر کے مقصد سے چلتا کر دیا تھا۔ اسی دوران اُنھوں نے اپنی پارلیمانی پارٹی کا ایک علیحدہ لیڈر بھی چُن لیا تھا۔ جس نے اعلان کیا کہ ان افسروں کو کانگریس کے ساتھ روابط کی بنا پر نکال دیا گیا ہے۔ کانگریس مخالفت کے جوش میں اس حد تک گئی کہ اُنھوں نے اناج کی خوش خرید مہم کو ناکام بنانے کے لیے بھی ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کے پاس اناج کا ذخیرہ جمع نہ ہونے پائے اور اس طرح سے غذائی قلت کا ماحول پیدا ہو جائے۔ اُنھیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس طرح عوام کے لیے مصیبتیں کھڑی ہو جاتیں۔ وہ تو کسی قیمت پر حکومت کے لیے پریشانی کے اسباب بہم کرنا چاہتے تھے۔ صورت حال کو بگاڑنے میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی، سرینگر اور جموں سٹیشنوں نے بھی اُن کی خوب ہمت افزائی کی اور اُن کے غلط سلط بیانات کو خوب اُچھالا۔ آخر کار اس تصادم اور ٹکراؤ کی آوازیں دہلی کے ایوانوں میں گونجنے لگیں۔ کانگریس ہائی کمان کی نگاہ میں اس تصادم کو روکنے کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ کانگریسی لیڈروں کو کابینہ کے درجے کا وزیر بنایا جائے میں نے اِس شرط پر ایسا کرنے کی حامی بھری کہ پھر نیشنل کانفرنس کے کچھ ساتھیوں کو بھی کابینہ کے درجے کا وزیر مقرر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں اپنی ٹیم کے لیے کانگریسیوں کا انتخاب کرتے وقت اپنی

پسند سے کام لوں گا۔ یہ جمہوری روایات کے عین مطابق تھا۔ لیکن دہلی کے حکمرانوں کو کشمیر میں اپنی من مانیاں کرنے کا جو چسکہ پڑ گیا تھا اُس کی وجہ سے یہ اُن کے حسبِ دلخواہ نہیں تھا۔ بہر صورت کانگریسی علی محمد نائیک اور عبدالغنی گونی وغیرہ کی تقرری پر اصرار کرنے لگے۔ میں نے نیشنل کانفرنس کی ترجمانی کرنے والے وزیروں کا درجہ بڑھانے کا فیصلہ کیا اور نئے وزراء کے حلف لینے کے لیے راج بھون میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ معاملہ بالکل طے تھا اور میں راج بھون جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ دہلی سے اطلاع آئی کہ کانگریسی نامزدگان کو حلف نہ اُٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اگر نیشنل کانفرنس کے وزیروں نے ہی حلف اُٹھایا تو صورتِ حال بگڑ جائے گی۔ اس سارے معاملے کی ہدایت کاری مسز اندرا گاندھی بہ نفسِ نفیس انجام دے رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ اُس واضح پیمان کو فراموش کر رہی تھیں۔ جس کے تحت اُنھوں نے مجھے یہ کہہ کر کانگریس پارٹی کی قیادت پر آمادہ کیا تھا کہ مجھے اپنی ٹیم چننے کا مکمل اختیار ہوگا۔ یہ صاف دِشواس گھات تھی۔ لیکن حالات کی نزاکت اور کانگریسیوں کے ارادوں کا اندازہ کر کے میں نے اِس اشتعال انگیزی کو نظرانداز کرنا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو راج بھون میں مقررہ تقریب پر میں نے کہا:

"مجھے اُمید تھی کہ آج کی تقریب وزارتی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شرکت سے مسرت انگیز بنے گی اور میں نے اِس مقصد کے لیے کانگریس کے چار سرکردہ ارکان کو کابینہ کی سطح پر ہاتھ بٹانے کی دعوت دی تھی۔ لیکن موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدر ہو گئی ہے اور میں نے محسوس کیا کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت کے اُس مقصد کے حصول میں رکاوٹیں

پیدا ہوں گی۔ اِسی لیے میں نے گورنر سے اِستدعا کی کہ اس تقریب کو ملتوی کیا جائے۔"

کانگریسیوں کی اس دغابازی کا پس منظر یہ تھا کہ وہ گردھاری لال ڈوگرہ جیسے لوگوں کو کابینہ میں لے آنا چاہتے تھے۔ ڈوگرہ صاحب نے ۱۹۵۳ء میں جو رول ادا کیا تھا اُس کی وجہ سے میرا اُن پر اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ اس لیے میں نے اُن کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پردیش کانگریس کے کچھ اہم ممبرانِ اسمبلی جیسے محمد شفیع اوڑی، محمد اشرف خان وغیرہ شامل تھے۔ پردیش کانگریس میں ہونے والی دھاندلیوں سے متنفر ہو کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے۔ میں ان نوجوانوں کی صلاحیتوں کو بھی مفید طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کانگریسی اُن کو انتظامیہ کی کوئی ذمہ داری سونپنے پر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ اِسی طرح ہم نے سرینگر میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان بھی کر دیا تھا اور وزارت کے اتحادیوں کی حیثیت سے کانگریسیوں کو وہ سیٹیں پیش کی تھیں اور اُن سے کہا تھا کہ ہم ان سیٹوں کے لیے نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار کھڑے نہیں کریں گے۔ کانگریس کی شہر میں کوئی ساکھ نہ تھی۔ لیکن وہ دہلی کی پشت پناہی کی بنا پر آسمان میں اُڑ رہے تھے۔ اُنھوں نے اس معاملے کو بھی وجہ نزع بنا لیا۔ چنانچہ ۲۲ر اکتوبر کو دہلی میں وزیر اعظم کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں دیو کانت بروا، ام مہتہ، میر قاسم اور مفتی سعید نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں حلف لینے کی تقریب کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اِس کی اطلاع سرینگر میں موجود کانگریسیوں تک پہنچائی گئی۔ کانگریسی رہنماؤں کی یہ عہد شکنی اُن کے اصل ارادوں کا پتہ دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ ۱۹۵۳ء کے زیادہ بھیانک ڈرامے کی صرف ابتدائی ریہرسل تھی۔

ہماں نے دباؤ میں آ کر کانگریسیوں کو مشتعل کرنے سے انکار کر دیا۔ ۳۰ اکتوبر کو حضرت بل شریف کے ایک عوامی اجتماع میں، میں نے چیتاؤنی دی کہ ہم مفاہمت کے نام پر کسی کو اپنی قسمت سے کھیلنے کی اجازت دیں گے اور نہ ہی دباؤ میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کابینہ میں توسیع پر رضامندی خیر سگالی کے جذبے کے طور پر ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن کانگریسیوں نے جس وطیرے کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیش نظر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب کابینہ میں قطعی طور پر کوئی توسیع نہ کی جائے گی۔ ▲▲▲

(۱۰۱)

دُوسرا شب خُون

۱۲ جون ۱۹۷۵ء کو جب الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جگ موہن سنہا نے مسز اندرا گاندھی کے خلاف دائر شدہ انتخابی عذرداری کا تاریخی فیصلہ سنایا۔ تو اس وقت کے صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب سرینگر میں تھے۔ اسی دن علی الصبح ماسکو میں ہندوستان کے سفیر دُرگا پرشاد دھر کے دہلی میں انتقال کی خبر آئی تھی۔ اور ان کے جسدِ خاکی کو آخری رسوم کے لیے سرینگر پہنچانے کے انتظامات ہو رہے تھے فخرالدین صاحب نے مسز گاندھی کے خلاف فیصلے کی خبر سنی تو اس کے امکانی عواقب کا خیال کر کے ان کو دہلی لوٹنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ لیکن دہلی سے فوراً ہی اطلاع آئی کہ ان کے لوٹ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مرکزی وزیر داخلہ برہمانند ریڈی جو سرینگر آئے ہوئے تھے واپس روانہ ہو گئے۔ ڈی۔ پی۔ دھر کی آخری رسوم میں شرکت کے بعد میں ۱۴ جون کو دہلی پہنچا تو وہاں مجھے ایمرجنسی کی پوری شدت کا اندازہ ہو گیا۔ مسز گاندھی سے میں نے پرسشِ احوال کی تو انہوں نے کہا کہ ملک میں حالات قابو سے باہر ہو رہے تھے اور حزبِ اختلاف انتشار اور بحران کے شعلوں کو بھڑکا رہا تھا۔ لیکن خود میں پوری

طرح مطمئن نہ ہوا۔ جے پرکاش نرائن اور مرارجی بھائی کی سیاست سے اختلاف ممکن تھا۔ لیکن انھیں وطن دشمن قرار دینا زیادتی تھی۔ انھیں جن حالات میں حراست میں لیا گیا تھا وہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک افسوسناک اور اندوہناک باب کا اضافہ تھا۔

کشمیر میں ایمرجنسی کا اثر کچھ واجبی سا ہی رہا۔ اگرچہ وفاق کی ایک اکائی کی حیثیت سے ہمیں باقی کنبے کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا تھا لیکن عملی طور پر یہاں ایمرجنسی کی افراط و تفریط سے احتراز کیا گیا۔ خاص طور پر اخبارات کی سنسر شپ کے معاملے میں تو یہ فرق نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔ ہم نے اخبارات پر سنسر کی پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ لیکن مرکزی وزارتِ اطلاعات برابر اصرار کرتی رہی کہ ہم اس معاملے میں مرکز کے نئے قواعد کی پیروی کریں۔ ریاستی اخبارات مرکزی اور ریاستی معاملات پر نسبتاً آزادی سے رائے ظاہر کرتے رہے۔ جس سے مرکزی وزارت اطلاعات کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات وی۔ سی شکلا تو اس قدر طیش میں آ گئے کہ انھوں نے ایک ملاقات میں مجھ سے کہا کہ وہ ریاست میں سنسر شپ کے نئے قواعد کا نفاذ ریاستی انتظامیہ کی بجائے مرکزی محکمۂ اطلاعات کی مقامی ایجنسیوں سے کروائیں گے۔ میں نے شکلا صاحب کو مسکراتے ہوئے مگر مضبوطی سے جواب دیا کہ وہ جو چاہیں کریں۔ لیکن ریاستی حکومت سنسر شپ کے اطلاق کے سلسلے میں ان کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ آخر کار انھیں اپنا غصہ پی لینا ہی پڑا اور ریاستی اخبارات سنسر کی قینچی سے بچ گئے۔ ان دنوں ریاست میں اتنا آزادانہ ماحول قایم تھا کہ میرے بہت سے ہندوستانی دوستوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ میری نظربندی کے زمانے میں جب وہ پٹھان کوٹ سے جموں یا سرینگر پہنچے تھے تو انھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ روشنی سے تاریکی میں آ گئے ہیں۔ لیکن اب اس کے برعکس وہ جموں یا سرینگر پہنچتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ گھٹن سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ شمیم احمد شمیم ان دنوں پارلیمنٹ میں سرینگر کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کو میرا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ جب انھوں نے ایمرجنسی پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے تو اس کے ڈانڈے میری ترغیب کے ساتھ ملائے گئے۔ مرکزی حکومت ان کو قید کرنے کے لیے سوچنے لگی۔ وہ چونکہ سیاسی طور پر میرے ساتھ منسوب تھے لہٰذا میری صلاح لینا مناسب سمجھا گیا۔ میں نے مرکز کو اس سے باز رکھا اور کہا کہ انھیں آزاد خیالی کی ہر کرن کو اس طرح بجھانے کے لیے کمربستہ نہیں رہنا چاہیے۔ البتہ ان حالات کا اندازہ کر کے میں نے ممبر مذکور کو صلاح دی کہ وہ دانشمندی اور احتیاط کے ساتھ اپنی آزادی کا استعمال کرے۔

مئی ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ میرا دہلی جانا ہوا۔ کچھ ہی ہفتے پہلے ترکمان گیٹ کا المناک سانحہ پیش آیا تھا۔ لیکن سنسر شپ کی وجہ سے اس کی پوری تفصیلات سامنے نہ آئی تھیں۔ دہلی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین مسٹر جگ موہن مجھے دہلی میں تعمیر ہونے والی کچھ نئی بستیاں دکھانے کے لیے لے گئے۔ جب میں کھچڑی پور کی بستی میں پہنچا تو میں نے سینکڑوں لوگوں کو کسی انتظام کے بغیر ایک وسیع میدان میں ڈیرہ جمائے پایا۔ میں نے اس بدانتظامی کی وجہ دریافت کی تو چیئرمین صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ یہیں پر کچھ مقامی نے ترکمان گیٹ کی قہر سامانیوں کا ذکر کیا تو میں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اپنے ساتھ دو آدمیوں کو ہمراہ لیا۔ جن کے مکانات ترکمان گیٹ کے نرغے میں مسمار کیے گئے تھے۔ جب میں ترکمان گیٹ پہنچا تو وہاں منٹوں کے بعد ایک اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔ ان کے چہروں پر خوف اور گھبراہٹ کے علاوہ تشویش اور فکرمندی کے آثار بھی صاف نمایاں تھے۔ میں ابھی لوگوں سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ کھچڑی پور سے آئے

ہوئے ایک آدمی نے مجھے اطلاع دی کہ اُس کے دوسرے ساتھی کو پولیس پکڑ لے گئی ہے۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی لیکن استفسار پر معلوم ہوا کہ اطلاع صحیح ہے میرے ہمراہ وزیر اعظم کے خصوصی ایلچی محمد یونس بھی تھے۔ انھیں جب اس بات کا علم ہوا تو وہ کافی سٹپٹائے لیکن اُن کی مداخلت سے گرفتار شدہ آدمی رہا ہو گیا۔ میں نے لوگوں کو تسلی دی اور اُن کی زبانی قتل و غارت کی دلدوز کہانیاں سنیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ترکمان گیٹ کے سانحے کے ذمہ داروں اور کچھ بڑے بڑوں کو میرا یہ دورہ کافی ناگوار گذرا تھا۔

ایمرجنسی لاگو ہوئی تو مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ملک کی سیاسی فضا کی تدریجی کے لیے اس کڑوی دوائی کا استعمال کچھ عرصہ کے لیے ضروری ہے۔ لیکن دن گذرتے گئے اور ایمرجنسی کے وہ محدود فائدے جو پہلے پہل محسوس کیے گئے تھے زائل ہونے لگے۔ فضا میں تلخی ابھرنے لگی۔ میں نے انہی دنوں ایک تقریر میں کہا کہ قومی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے اور ٹکراؤ یا تصادم کا رویہ اختیار کرنا فریقین کے لیے ہی نہیں پوری قوم کے لیے نقصان دہ ہے۔ میں نے کہا کہ جے پرکاش نرائن اور مرارجی ڈیسائی جیسے لیڈروں کی حب الوطنی اور دیش بھگتی شک و شبہ سے بالاتر ہے اور ان کی قربانیوں کا ریکارڈ انھیں ملک میں عزت و احترام کی جگہ دلانے کا ضامن ہے۔ انہی دنوں کانگریس کے تازہ وارد اور طالع آزما ممبر پارلیمنٹ ششی بھوشن سرینگر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کانگریسیوں کے ایک جلسے میں مجھے مشورہ دیا کہ مجھے جے پرکاش نرائن کی مذمت کرنی چاہیے۔ اس موقع پر اس نصیحت پر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے چرارِ شریف کے ایک بھاری اجتماع میں کہا کہ جے پی کے ساتھ ہمارے لاکھ اختلافات ہوں لیکن ہم اُن کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اگر کچھ لوگوں کی نگاہ میں اپنی وفاداری کا اظہار کرنے کے لیے جے پی کو گالیاں دینا ضروری ہیں تو میں اس

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ جے پی اِس وقت ہندوستان کی جنگ آزادی لڑ رہے تھے جب ششی بھوشن پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ ان بیانات سے ایمرجنسی کے علمبرداروں کے ابرو کھنچ گئے لیکن میں نے اُس کو زیادہ خاطر میں نہ لایا۔ میں جے پی کی رہائی کے بعد دسمبر ۱۹۷۵ء میں بمبئی کے جسلوک ہسپتال میں اُن کی عیادت کو گیا اور بعد میں بمبئی کے ایک پبلک جلسے میں میں نے ایمرجنسی کو ہٹانے کی تجویز بھی پیش کی جس کو سنسر کی پابندیوں کے باوجود اخبارات نے شائع کیا اور ایمرجنسی کے خلاف یہ اس سطح پر اور سرکاری منصب پر فائز کسی عوامی لیڈر کی پہلی آواز تھی۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ توڑ کر عام انتخابات کا اعلان کیا۔ جو میں نے پٹنہ میں سنا۔ جہاں میں کشمیر کے آخری خود مختار سلطان یوسف شاہ چک کے چار سوویں جشنِ تخت نشینی میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ یوسف شاہ چک کو مغل بادشاہ اکبر نے گفت و شنید کے لیے دہلی بلایا تھا۔ اکبر کی نگاہیں مدت سے کشمیر پر تسلط حاصل کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کی فوجوں کو بار بار کشمیریوں کی شجاعت کے سامنے منہ کی کھانی پڑی تھی چنانچہ جہاں شمشیر ناکام ہوئی وہاں اُس نے تدبیر آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور یوسف شاہ کو ضمیر کی کسی خلش کے بغیر اور معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بہار کے علاقہ بسوک میں جلاوطن کر دیا۔ اُس کی موت وہیں پر ہوئی اور چار سو سال کے بعد کشمیری عوام کے نمائندے اس عظیم محبِ وطن اور فنونِ لطیفہ کے قدردان کی عزت افزائی کے لیے جا رہے تھے۔ میں نے وہاں اُس کے مزار پر کلچرل اکادمی کے تیار کیے ہوئے ایک کتبے کی نقاب کشائی کر کے چار سو سال کا قرضہ چکانے کی ایک معمولی کوشش کی۔ بعد میں میں نے جے پرکاش نرائن سے جو اپنے قدم کنواں کے مکان میں رہتے تھے، نئی صورت حال پر گفتگو کی۔ جے پی اپنی خراب صحت کے باوجود میدانِ جنگ میں کود پڑنے کے لیے

پھڑپھڑا رہے تھے اور اس کو جمہوریت کی بحالی کے لیے آخری معرکہ سمجھتے تھے۔ نئی دہلی پہنچ کر جب میں مسز اندرا گاندھی سے ملا تو میں نے انھیں اس نئی پہل کے لیے مبارک باد دی اور اُمید ظاہر کی کہ اس سے جمہوری اداروں کا وقار پھر سے بحال ہو جائے گا۔ مسز گاندھی نے خواہش ظاہر کی کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس پارلیمانی انتخابات میں انتخابی مفاہمت کر لیں۔ چنانچہ ہم نے ریاست کی چھ نشستوں میں سے تین پر نیشنل کانفرنس اور تین پر کانگریس کے اُمیدوار کھڑا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ انتخابات میں میری بیگم سرینگر سے اُمیدوار چنی گئیں کیونکہ جماعت میں سابق ممبر شمیم احمد شمیم کی مخالفت عروج پر تھی۔ بیگم صاحبہ کے مقابلے پر اگرچہ ہمارے پرانے اور نئے سبھی دشمن اکٹھا ہو گئے لیکن وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئیں۔ کانگریس نے اپنی لیڈر کی یقین دہانی کے برعکس ہر جگہ درپردہ اور کئی صورتوں میں کھلم کھلا نیشنل کانفرنس کے اُمیدواروں کی مخالفت کی۔ بیگم صاحبہ کے خلاف انتخاب لڑنے والے اُمیدوار محمود توتی انتخاب بھی کانگریس کی وساطت سے ہی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے تھے اور کانگریسی ممبروں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

پارلیمنٹ کے نتائج کا اعلان ہوا تو ملک میں ایک بھونچال سا آگیا۔ برسرِ اقتدار کانگریس عبرتناک شکست سے دوچار ہو گئی اور آزادی کے بعد پہلی بار مرکزی حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ خود وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی اپنے فرزند سنجے گاندھی اور ایمرجنسی کے بڑے بڑے مشعل برداروں، بنسی لال، ودیا چرن شکلا وغیرہ کے ساتھ ہار گئیں۔ شمالی ہندوستان سے گویا کانگریس کا صفایا ہو گیا۔ یہ ایمرجنسی اور اس کی زیادتیوں کے خلاف عوام کے غیظ و غضب کا بھرپور اظہار تھا۔ اس مرحلے پر چاہیے تو یہ تھا کہ کانگریسی عبرت حاصل کر کے اپنے زوال کے اسباب جاننے کی کوشش کرتے لیکن ریاست کے کانگریسیوں پر اس کا بالکل اُلٹا اثر پڑا۔ انھوں نے مرکز میں اپنی سرپرستی کے قلعے کو

زمین بوس ہوتے دیکھا تو ان پر حواس باختگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور انھوں نے ایک اور سیاسی شب خون کے لیے زرہ بکتر پہننا شروع کر دیے۔ یہ شب خون اپنے عزائم اور خون آشامی کے لحاظ سے ۱۹۵۳ء کے ترشے سے بہرطور کم نہ تھا۔

جونہی مرکز میں جنتا پارٹی کی وزارت کے قیام کے امکانات روشن ہو گئے پردیش کانگریس کے لیڈروں نے ریاست میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ میں مرکزی لیڈروں سے گفتگو کرنے کے لیے دہلی چلا گیا تو میری پیٹھ پیچھے کانگریسیوں نے جموں میں گورنر کو مراسلہ بھیجا کہ ان کی پارلیمانی پارٹی نے مجھ سے اعتماد واپس لے لیا ہے۔ انھوں نے پردیش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید کو لیڈر نامزد کر کے گورنر کو درخواست کی کہ وہ اس کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دیں۔ اس کے علاوہ گردھاری لال ڈوگرہ کو نائب وزیرِ اعلیٰ بنانے کا بھی اعلان کیا گیا۔ انھیں اقتدار کی کرسیاں سنبھالنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ آئین میں اپنی بنائی ہوئی متعلقہ دفعہ کو بھی بھول گئے۔ ریاستی آئین کی دفعہ ۵۳ ب میں صاف تشریح کی گئی تھی کہ ایسے حالات میں گورنر کے لیے وزیرِ اعلیٰ کا مشورہ ماننا لازمی ہے لیکن آئین کا وہ مسودہ تو دہلی سے بن کر آیا تھا۔ اب انھیں متعلقہ دفعہ یاد آتی تو کیسے۔ انھوں نے تیس وزیروں پر مشتمل کابینہ تشکیل بھی دے رکھی تھی اور حلف اٹھانے کی تقریب کے لیے شیروانیاں تک سلوا دی تھیں۔

دہلی میں، میں نے مسز اندرا گاندھی اور دوسرے لیڈروں سے کہا کہ وہ ایک اور بار مجھ سے اعتماد شکنی کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اپنا پنڈ چھڑایا کہ وہ چونکہ اختیار کھو چکی ہیں اور شکست خوردہ ہیں اس لیے ریاستی کانگریس اب ان کا کہا نہیں مانتی۔ دراصل کانگریسی ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو وہ حکومت پر قابض

ہونا چاہتے تھے دوسرے اُن کا اندازہ تھا کہ مجھ کو وزارتِ اعلیٰ سے الگ کرنے کے نتیجے میں ریاست میں افراتفری پیدا ہو جائے گی اور وہ اس گڑبڑ کا الزام مرکزی حکومت اور جنتا پارٹی پر عائد کریں گے۔ اکارڈ کے بعد اول اول تو اُن کا خیال تھا کہ مجھ سے وہ مشکل اور غیر مقبول اقدامات کروائیں گے۔ پھر ۱۹۷۵ء کی طرح اندرا گاندھی جیسے حوالے کی آڑ لے کر مجھے نظر بند کر کے اُن کی حکومت بنائے گی۔ لیکن جب مرکزی کانگریسی وزارت ہی ڈوب گئی تو انھوں نے آخری داؤ یہ کھیلا کہ کشمیر میں ہی کانگریسی حکومت قائم کر کے جنتا پارٹی کے لیے مشکل صورتِ حال پیدا کریں۔ اس کھلی ہوئی بدعہدی کو دیکھ کر میں نے اپنے آئینی حق کا استعمال کرتے ہوئے گورنر سے اسمبلی برخواست کرنے اور نئے اِنتخابات کرنے کی سفارش کر دی۔ معاملہ دہلی تک جا پہنچا۔ نئے وزیرِ اعظم مرار جی ڈیسائی نے مجھ سے کہا کہ وہ کشمیر اسمبلی کو، جہاں کانگریس کی اکثریت ہے برخواست نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ کانگریسی آسمان سر پر اُٹھائیں گے کہ اِقتدار میں آتے ہی ہم نے پہلا قدم یہ اُٹھایا کہ ایک ایسی اسمبلی کو برخواست کر دیا جہاں کانگریسی اکثریت میں تھی۔ میں نے وزیرِ اعظم کی توجہ ریاستی آئین کی دفعہ ۵۳ (ب) کی طرف دِلائی۔ اُنھوں نے اس معاملے کی نسبت اپنی وزارتِ قانون کی رائے طلب کی۔ وہاں سے اُنھیں وہی مشورہ ملا جس کی وضاحت میں نے کر دی تھی۔ اس کے بعد اُن کے لیے کوئی اور چارہ کار نہ رہا۔ اس طرح سے گورنر نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو اسمبلی توڑ کر نئے اِنتخابات کا اعلان کر دیا۔ ریاست پہلی بار گورنری راج کے تحت آگئی اور کانگریسی بوالہوسوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اگرچہ کانگریسی لیڈروں کا یہ شب خون بے حد رنج دہ اور حد درجہ غیر اخلاق تھا لیکن قدرت کے کھیل بھی کتنے نرالے ہوتے ہیں کہ ان کی اس ناشائستہ حرکت سے ہی ایک عوامی اسمبلی کے اِنتخابات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا جیسا کہ میں

اِشارہ کر چکا ہوں۔ میں نے اِس اِنتخاب کے لیے دہلی اکارڈ کی گفت و شنید کے دوران ہی کئی بار مسز اندرا گاندھی سے اِستدعا کی تھی۔ لیکن وہ اس کو ہر بار ٹالتی رہی تھیں۔ اِس کے بعد جو اِنتخابات منعقد ہوئے اُن میں پردیش کانگریس کے یہ سورما نہ صرف چاروں شانے چِت کر گئے بلکہ وادی سے بھی کانگریس کی مصنوعی تنظیم کا مکمل صفایا ہو گیا۔ ▲▲▲

(۷۲)

جنتا کی یلغار پسپا ہو گئی

گورنر راج کے قیام کے بعد ہمارے لیے نئی آزمائشوں کا ایک صبر آزما دور شروع ہوا۔ ریاست میں ۱۹۵۳ء کے بعد انتخابات کی تاریخ نہایت سیاہ رہی تھی اور اکثر حالات میں ہم کو بڑی ڈھٹائی سے انتخاب کے میدان سے دور رکھا جاتا تھا اور پھر چھری چکاری سے اپنے منظورِ نظر اُمیدواروں کو منتخب قرار دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی نصیبوں کا مارا اس کھلی ہوئی بے ایمانی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا تو اُسے طرح طرح کی دھاندلیوں سے مات دی جاتی۔ کچھ دھاندلیاں تو اس قدر طبع زاد تھیں کہ بڑے بڑے شاطر بھی عش عش کر اُٹھتے۔ کاغذاتِ نامزدگی کی مِسلوں اور حلف ناموں کی چوری تو روزمرہ کی باتیں بن چکی تھیں۔ مخالف اُمیدواروں کا اغوا بھی لگ بھگ معمول ہی بن چکا تھا۔ نئے حالات میں صورت حال کچھ اور مخدوش بن گئی تھی۔ مرکز میں جو حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی اُس کے بہت اہم اراکین کے ساتھ میرے نظریاتی اختلافات چلے آرہے تھے۔ یہ بات بھی صیغۂ راز میں نہ تھی کہ اُن میں سے کچھ ذاتی طور پر بھی مجھ سے پرخاش رکھتے تھے۔ گورنر راج کے بعد جب میں دہلی گیا اور میں نے مرکزی رہنماؤں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ریاست میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ انتخابی اشتراک کریں تو اُنھوں نے اِس کو تسلیم نہیں

کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر وہ پنجاب میں اکالیوں سے ایسا اشتراک کر سکتے ہیں تو نیشنل کانفرنس کے ساتھ ایسا کرنے میں کیا مضائقہ ہے تو آئیں بائیں شائیں کر کے معاملے کو ٹال گئے۔ اُنھوں نے صرف یہ کہا کہ نیشنل کانفرنس کو توڑ دیا جانا چاہیے۔ لیکن میں نے اِس تجویز کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ اب معاملہ الیکشن کے میدان میں ہی طے ہوگا۔ یوں لگتا ہے کہ اُنھیں کشمیر سے کچھ نو جنتائیوں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ "جنتا لہر" پیر پنچال کو عبور کر کے کشمیر میں بھی موجیں مار رہی ہے اور اس کا زور نیشنل کانفرنس کے خیمے کی طنابیں ڈھیلی کر رہا ہے۔ نئی حکومت کے لیڈروں کو اپنی تازہ کامیابی کے نشے میں یہ خوش خبری بڑی سہانی معلوم ہوئی وہ اس خیال سے ہی پھولے نہ سماتے تھے کہ شیخ عبداللہ اور اُس کی جماعت جنھیں مرکز میں اُن کے کانگریسی پیش رو طاقت یا دولت سے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے، کو نئے حالات میں کشمیری عوام کے ذریعے ہی نیچا دکھایا جائے گا اور اس طرح سے اُن کے سر وہ سہرا بندھ جائے گا۔ جس کی آرزو جواہر لال کو بھی رہی تھی اور مسز اندرا گاندھی کو بھی۔ میں جانتا تھا کہ ان کو یہ خوش فہمی مہنگی پڑے گی۔ لیکن اس وقت وہ سچی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے اور عجب نہیں کہ اُنھوں نے انتخابی اشتراک کے متعلق میری تجویز کو میری کمزوری سے بھی تعبیر کیا ہو۔ میں ۱۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو سرینگر لوٹا تو وہاں میرا استقبال بڑی گرم جوشی سے ہوا۔ لال چوک کے ایک بہت بڑے اجلاس میں، میں نے نئی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ جنتا پارٹی میں میرے کچھ پرانے دوست موجود ہیں لیکن میں کشمیری عوام کی تقدیر جنتا پارٹی کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ میں نے کانگریسیوں کی وشواس گھات کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا کہ صرف نیشنل کانفرنس ہی ریاستی عوام کی عزت، آبرو اور آزادی کی حفاظت کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتی ہے۔

نئی صورتِ حال کی بُو سونگھ کر وادی میں میرے اور نیشنل کانفرنس کے تمام نئے پُرانے روایتی اور تازہ دم رقیب اور حریف ایک ناپاک اتحاد میں جُٹ گئے۔ ایک طرف جموں کے جن سنگھی فرقہ پرست اور پٹے ہوئے جاگیردار اپنے پھن لہرانے لگے اور دوسری طرف کشمیر میں مولوی فاروق اور اُن کے پیرو اپنی دُم فاتحانہ انداز سے ہلانے لگے۔ سالہاسال سے کنجِ تنہائی میں دبکے ہوئے مولانا سعید کی شاخِ اُمید پھر لہلہانے لگی۔ حالانکہ ۱۹۶۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں جب میں نے انھیں بخشی غلام محمد کے خلاف لڑنے کی دعوت بھیجی تھی تو وہ ڈر کے مارے کنی کترا گئے تھے۔ انھوں نے اُس وقت یہ کہہ کر راہِ فرار اختیار کی تھی کہ بخشی غلام محمد کی جیت ہندوستان کی دِفاعی حکمت عملی کا ایک حصّہ ہے۔ بھلا میں کیسے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال سکتا ہوں؟ مولوی صاحب مرکز میں میرے چند نکتہ چینیوں کو برسرِ اقتدار دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے اور اُن کی دبی ہوئی محرومیاں سطح پر آ کر اب للچائی ہوئی نظروں سے مسندِ اقتدار کو تاک رہی تھیں۔ محی الدین قرہ صاحب بھی برسوں کے خوابِ خرگوش سے ہڑبڑا کر جاگ اُٹھے اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کے لیے اپنے سفید بالوں میں جتنا مار کے خضاب کرنے لگے۔ قرہ صاحب اپنے چچیرے بھائی غلام محمد صادق کی وزارتِ اعلیٰ کے زمانے میں سفارشوں کا بہت اہم مرکز و محور تھے اور اِس طرح بالواسطہ اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے۔ جب ۱۹۷۱ء میں میں نے مولانا سعید کے انکاری ہو جانے پر قرہ صاحب کو بخشی غلام محمد کے مقابلے میں کھڑے ہو جانے کی دعوت دی تو وہ بھی حیلے حوالے کر کے میدان سے رفوچکر ہو گئے۔ لیکن اب اُن کو پھر اقتدار کی دیوی مُسکراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور انھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہمارے مقابلے میں کود گئے۔ پریم ناتھ بزاز جو برسہابرس سے نئی دہلی میں اپنا قصر سجانے اور اپنا کاروبار چمکانے کے شغل میں کشمیر کو بھول بیٹھے تھے راتوں رات

سرینگر پہنچ گئے اور شیخ مخالف محاذ کے اتالیق بن بیٹھے۔ وہ یہ بات بڑی آسانی سے فراموش کر گئے کہ جس مرارجی بھائی اور اٹل بہاری باجپائی کی قیادت وہ قبول کر رہے ہیں ان کو وہ بار بار ہندو راج قایم کرنے والے جنونی اور رجعت پسند قرار دیتے رہے ہیں۔ ان تمام شکست خوردہ جرنیلوں کا نصب العین صرف ایک نُقطہ پر مشتمل تھا ——— نفرت ——— شیخ عبداللہ اور اُس کی جماعت سے نفرت۔ اس کے علاوہ اُن کے مابین کوئی قدرِ مشترک موجود نہ تھی۔ بلکہ یہ اکثر بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے تھے۔ چونکہ نفرت کسی پائیدار جماعت یا فتح یابی کا اینٹ گارا نہیں بن سکتی۔ اس لیے اُن کا انجام بھی معلوم تھا۔ لیکن ان عقل کے اندھوں کو گُمان تھا کہ نیشنل کانفرنس کی مخالف مرکزی حکومت کی چھتر چھایا میں وہ پھر سے بخشی غلام محمد کی سُنت تازہ کر سکیں گے اور میرے خلاف اپنا آخری مگر فیصلہ کن معرکہ جیت سکیں گے۔ واقعات گواہ ہیں کہ معرکہ کس کا واٹرلو ثابت ہوا؟

کشمیر میں جنتا کی شاخ قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے اشوک مہتہ، نانا جی دیش مکھ، بھانو پرتاپ سنگھ وغیرہ پر مشتمل ایک وفد سرینگر آیا۔ انھوں نے مولانا سعید، مولوی فاروق، محی الدین قرہ اور دوسرے لوگوں سے لمبی لمبی ملاقاتیں کیں اور ۵ اپریل کو اشوک مہتہ نے سرینگر میں مولانا سعید کے جنتا پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔

ہمارے دوسرے مخالفین نے بھی دھڑا دھڑ جنتا پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ ان میں بخشی غلام محمد کے بھائی بند اور شام لال صراف جیسے پٹے ہوئے مُہرے بھی شامل تھے۔ جو پارٹی اب وجود میں آ رہی تھی وہ سچے معنوں میں بھان متی کے کنبے سے مشابہت رکھتی تھی۔ بھلا کشمیر کے مولوی فاروق اور جموں کے چمن لال گپتا میں کونسی چیز مشترک تھی؟ صرف یہ کہ وہ نظریات، اعتقادات اور اصولوں کو فراموش کر کے میری ذات اور میری جماعت کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ انہی دنوں اٹل بہاری باجپائی

جارج فرنانڈیس اور دوسرے جنتائی حکمران کشمیر آتے رہے اور نیشنل کانفرنس کی شکست کے لیے اپنے مقامی دوستوں کے ساتھ کھچڑی پکاتے رہے۔ اشوک مہتہ کو میں کافی دیر سے جانتا تھا۔ چنانچہ اُن کے قیام سرینگر کے دوران میں نے اُنھیں اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ اُس وقت میرے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ اور ٹھاکر دیوی داس بھی تھے۔ مہتہ صاحب نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ اُن کی جماعت بنیادی اور اصولی طور پنڈت جواہر لال نہرو کی کشمیر پالیسی کے خلاف ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ جواہر لال کی پالیسی کی مخالفت کشمیر کی اُس اندرونی خود مختاری کی مخالفت کا دوسرا نام تھا جس کی ضمانت آئینِ ہند کی دفعہ ۳۷۰ میں دی گئی ہے۔ چنانچہ جنتا پارٹی کا یہ عندیہ زیادہ دیر تک چھپ نہ سکا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا اظہار میرے محترم دوست جے پرکاش نرائن نے محی الدین قرہ کے نام ایک انتخابی مکتوب میں کیا۔ جے پرکاش جو ۱۹۵۱ء میں آئینِ ہند کی چاردیواری میں کشمیر کے لیے ہر ممکن اندرونی خودمختاری کی وکالت کرچکے تھے اب اپنے مکتوب میں لکھا تھا:

"کشمیر نے آج تک ہندوستان کے ساتھ ایک قسم کی علیحدگی کا رُجحان ظاہر کیا ہے اور مجموعی طور پر وہاں کی سیاست ملک کے بڑے سیاسی واقعات کے دھارے سے ہم آہنگ نہیں رہی ہے۔ اب جبکہ آپ کشمیر میں جنتا پارٹی قائم کرنے کے لیے سرگرم ہیں، مجھے اُمید ہے کہ یہ سیاسی خلیج پاٹ دی جائے گی۔"

ابھی اس بیان کی صدائے بازگشت محو نہ ہوئی تھی کہ جنتا پارٹی کے ایک اور روشن چراغ سبرامنیم سوامی نے اعلان کیا کہ وہ دفعہ ۳۷۰ کی تنسیخ کے لیے ہر ممکن زور لگائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اب آنے والی لڑائی کی حدود واضح ہوگئی تھیں۔ اندر سے ہماری تحریک کے بھگوڑے ساتھی اور روایتی اور نظریاتی دشمن اپنے ناپاک عزائم پورا

کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لینا چاہتے تھے اور باہر سے ہماری تحریک اور تنظیم کے بنیادی اصولوں اور مقاصد کو نشانہ بنایا جارہا تھا۔ ریاست میں جنتا پارٹی گورنری راج کے نظام کو اپنی یلغار کے طوفانی دستے کے طور پر استعمال کررہی تھی۔ انتظامیہ بحیثیت مجموعی ہمارے مخالفین کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ ایک غیر ریاستی ریٹائرڈ آفیسر ستاروالا کو گورنر کا مشیرِ اعلیٰ بناکر بھیج دیا گیا تھا یہ وہی ستاروالا ہے جس کے کارنامے بیان کرکے کسی نے مرزا محمد افضل بیگ کو ڈرانا چاہا بیگ صاحب نے اپنی حاضر جوابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ "گھبرایئے نہیں وہ اگر ستاروالا ہے تو ہم اٹھاراں والا ہیں۔" یہ بات عام تھی کہ اُنھیں نیشنل کانفرنس کو کسی نہ کسی طرح مات دلانے کا مشن سونپ دیا گیا تھا۔ جنتا پارٹی کے صدر دفتر کے لیے شہر کے بارونق ترین علاقے میں "فارسٹ لاج" کا عالیشان بنگلہ الاٹ کیا گیا جس کو سرکاری سیکریٹریٹ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی جارہی تھی۔ جنتا کے لیڈر ہر مرحلے پر حکومت کے معمولات میں ٹانگ اڑاتے رہتے تھے اور ہر وقت حکمرانوں کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہتے تھے۔ حکومت نے اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کا قافیہ تنگ کرنا شروع کردیا۔ میری پُرانی تصویریں دفاتر اور دوسری عام جگہوں سے رات کے اندھیرے میں غائب کردی گئیں۔ اُدھر سے جنتا کی مرکزی کمان نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے اور لاکھوں روپے کے کرنسی نوٹ کشمیر کے جنتائی لیڈروں کی جیبوں میں پہنچائے گئے۔ جیپوں، پوسٹروں اور دوسرے انتخابی ساز وسامان کی یورش شروع ہوگئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کشمیر کی سیاسی فوج کشی میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں نیشنل کانفرنس کے ذرائع بڑے محدود تھے۔ نشرواشاعت کے تمام اداروں پر ہمارے مخالفین کو بالادستی حاصل

تھی اور ہماری آواز بلند کرنے والا کوئی ترجمان موجود نہ تھا۔ اس بے سروسامانی میں اگر کوئی چیز ہمارے آڑے آئی تو وہ کشمیری عوام کی سیاسی بصیرت اور اُن کا قومی شعور تھا عوام نے مخالفین کے اُڑائے ہوئے غبار کو اپنی بصارت میں حائل نہیں ہونے دیا۔ اُنھوں نے اپنے سیاسی شعور کی عینک لگا کر یہ بات بھانپ لی کہ جنگ دراصل اُن کی قومی خودداری اور اس کے اتلاف کے مابین ہے۔

ہمارے مخالفین کے ہتھکنڈے جس قدر سخت ہوتے گئے ہمارے عوام کو نیشنل کانفرنس سے اُسی قدر زیادہ وابستگی پیدا ہوگئی۔ اُن دنوں قاضی گنڈ سے بارہمولہ تک سُرخ رنگ کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ یہ پھریرے دراصل اُن کی بیدار ہونے والی غیرت کی اُمنگ کا ظاہری مگر جوشیلا اظہار تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے جاڑے میں ہی کشمیریوں کے جذبۂ آزادی کے شگوفے انارکلی کے رنگ میں لہلہا اُٹھے ہوں۔ لیکن جوش کی یہ لہر جوں جوں اُبھرتی جاتی تھی جنتا پارٹی کے لیڈر اُسی قدر بوکھلا رہے تھے۔ ذرائع نشر و اشاعت پر جنتا نے اس قدر اجارہ حاصل کر لیا کہ نیشنل کانفرنس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اُدھر ہمارے مخالفین نے ہمارے کارکنوں پر تشدّد آمیز حملے شروع کر دیے۔ ۲۰ر جون کو نیشنل کانفرنس کے دو کارکن موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ گلستان کے ایک سرکردہ نیشنل کانفرنسی عبدالخالق بٹ کو گاڑی کے نیچے لایا گیا اور پھر اُس کی مارپیٹ کر کے اُسے پانی میں ڈبو دیا گیا۔ نارہ بل کے نزدیک نیشنل کانفرنس کے ایک اور کارکن عبدالاحد بٹ کو چھری گھونپ کے قتل کر دیا گیا جب وہ اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر ٹنگمرگ کی طرف جا رہا تھا۔

اُدھر ذاتِ ایزدی ہم سے کچھ اور آزمائشوں کا خراج حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے مئی کے آخری ہفتے میں مجاہد منزل کے ایک جلسے میں نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم کا آغاز

کرتے ہوئے پارٹی کے اُمیدواروں کی فہرست عوام کے سامنے رکھی میں نے اِس بات کا اِعادہ بھی کیا کہ کشمیر کی اندرونی خودمختاری کے سوال پر کوئی سودے بازی نہیں ہوسکتی اور ہم کسی دباؤ سے مرعوب نہیں ہوسکتے۔ ۳ر جون کو گاندربل جا کر میں نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر لیے اور پھر دیہات کے دورے کا پروگرام بنا لیا۔ اُسی ہفتے میں علاقۂ بڈگام کے دورے پر روانہ ہوا۔ راستے میں ایک جگہ ہمیں گھوڑوں پر مسافت طے کرنا تھی۔ میں بچپن سے گھوڑسواری کا شوقین رہا ہوں اور اپنی سیاسی زندگی میں میرا خاصا وقت گھوڑے کی پیٹھ پر صرف ہوا ہے۔ مگر وہ وقت ہے جب کہ آتش جواں تھا۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا لیکن جب جلسے کے بعد واپس آیا تو میں نے چھاتی میں درد کی ٹیسیں اُٹھتی محسوس کیں۔ پھر گھر پہنچا تو درد کی شدّت بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا اور معلوم ہوا کہ مجھ پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا ہے یہ میرے لیے انتخابی مصروفیات سے علیحدگی کا سگنل تھا۔ چند دن کے بعد جب میری حالت بگڑ گئی تو دہلی سے ڈاکٹر مہاجن اور ڈاکٹر بجاج میرے علاج کے لیے سرینگر آئے۔ اُن دنوں میری بیگم ڈوڈہ ضلع کے دورے پر تھیں جب میری حالت نازک ہونے لگی تو گورنر جھا نے جو ایک مردِ شریف ہیں، حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کر کے اُن کو وہاں سے واپس بلانے کے لیے ہیلی کوپٹر بھجوا دیا اور وہ ہمارے فرزند ڈاکٹر فاروق کے ہمراہ اپنا دورہ ادھورا چھوڑ کر واپس آگئیں۔ اُن کو واپس گھر میں دیکھ کر مجھے ایک سکون سا ہوا۔ لیکن اگلے ڈیڑھ ماہ کے لیے میں صاحبِ فراش ہی رہا۔ اس دوران کشمیریوں نے جلسے اور جلوسوں کا اہتمام کر کے میری صحت مندی کی دعائیں کیں اور خیر و برکت کی مجلسوں کا بھی اہتمام کیا۔ آخرکار کشمیری عوام کی والہانہ اور پُرخلوص دعاؤں نے اپنا اثر دکھایا اور میں بیماری پر آہستہ آہستہ قابو پانے لگا۔ میں اپنے ہم وطنوں کے خلوص اور محبت کے مظاہرے سے بے حد ممنون ہوا۔ اُنھوں نے نہ صرف

رات دن میری صحت یابی کے لیے دعائیں کیں بلکہ جانوروں کی قربانی اور مالی چڑھاوے پیش کر کے بے مثال ایثار دکھایا۔

میری حالت میں تھوڑا سا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تو نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم کی طرف پھر سے توجہ مبذول کی جانے لگی۔ میں تو خیر بستر میں کروٹیں بدلنے اور دعا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ لیکن میری بیگم کو اس وقت بے اندازہ محنت اور دوڑ دھوپ سے کام لینا پڑا۔ ایک تو انھیں میری صحت کی فکر دامنگیر تھی دوسرے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس نے بڑے تحمل اور خندہ پیشانی کے ساتھ یہ صعوبتیں سہہ لیں۔ بیگ صاحب، غلام محمد شاہ، ڈاکٹر فاروق اور دوسرے ساتھیوں نے بھی بڑی محنت کی اور مادی وسائل کی کمی کے باوجود عوام کا حوصلہ برقرار رکھنے کے جتن کیے۔

ادھر جنتا پارٹی کا پارہ خوب چڑھا ہوا تھا۔ کشمیر کی سیاسی فتح کے لیے اس نے اپنی بڑی بڑی توپوں کو میدان میں جھونک دیا۔ جنتا کے بڑے بڑے جگادری جوق در جوق کشمیر آ کر اپنے مقامی صوبیداروں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اٹل بہاری باجپئی، چرن سنگھ، جگ جیون رام اور پھر وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی بذات خود انتخابی مہم میں جان ڈالنے کے لیے آئے۔ مجھے ان سرگرمیوں کا شکوہ تو نہیں۔ لیکن یہ بات میرے لیے کوفت کا باعث تھی کہ کشمیر آ کر انھوں نے انسانی تعلقات کے کچھ ابتدائی آداب کا رکھ رکھاؤ مناسب نہیں سمجھا۔ مرارجی بھائی، جگ جیون رام اور چرن سنگھ بھی میرے دیرینہ شناسا اور دوست تھے۔ وہ سیاسی طور پر مجھے مات دینے کے لیے جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ قابل فہم تھا۔ لیکن سری نگر میں قیام کے باوجود انھیں میری بیمار پرسی کی توفیق نہیں ہوئی۔ حالانکہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے کبھی انسانی تعلقات میں وضعداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔ اور ہمیشہ سیاسی اور ذاتی تعلقات کو

ایک دوسرے سے الگ رکھا۔ یہ بات کتنی عجیب تھی کہ جب مرارجی بھائی کو لندن میں میری بیماری کی اطلاع دی گئی تھی تو انھوں نے گورنر کے نام اپنے برقیے میں کہا کہ "ملک کو ابھی شیخ صاحب کی بڑی ضرورت ہے اور ان کی بیماری سے مجھے سخت تشویش لاحق ہوئی ہے۔" لیکن جب وہ سری نگر آئے تو وہ میری عیادت کے لیے چند منٹ نہ نکال سکے۔ حالانکہ اس دورے میں وہ مولوی فاروق صاحب کے یہاں ضیافت کھانے کے لیے گئے۔ جہاں مولوی صاحب نے انھیں بڑے فخر سے اس کرسی پر بٹھایا جس پر تینتیس[۳۳] سال پہلے ان کے چچا مولوی یوسف شاہ مغفور نے محمد علی جناح مرحوم کو بٹھایا تھا۔ اس موقع پر مولوی فاروق کے یہاں جمع ہونے والے طائفے نے مرارجی بھائی کا لوک گیت کے ان بولوں سے خیر مقدم کیا۔

سبز دستار س تجی چھے راشتی   پاکستانک غازی آو

(تمھارے سبز دستار پر حضرت پیغمبر اسلام کی مرحبا ہے۔ ہمارے یہاں
پاکستان کے غازی نے قدم رنجہ فرمایا ہے)

اس سلسلے میں وہ مکالمہ دلچسپ ہے جو مولوی فاروق اور مرارجی بھائی کے مابین میرواعظ منزل میں ہوا۔ مولوی فاروق نے مرارجی کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ جس کرسی پر آپ تشریف فرما ہو گئے ہیں اس پر کبھی جناح صاحب بیٹھے تھے۔ مرارجی نے جھٹ پٹ کہا اشور کی کرپا سے اس کرسی کو بھی ہم نے فتح کر ہی لیا۔ بہر حال شاید مرکزی لیڈروں کی اس بے رخی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریاستی جنتا پارٹی کے لیڈر انھیں میرے پاس آنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ لیکن کچھ اخلاقی قدریں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کسی قسم کے دباؤ میں توڑا نہیں جانا چاہیے۔ جگ جیون رام اور چرن سنگھ نے سری نگر کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے مجھ پر بڑے ناروا حملے کیے۔ چرن سنگھ نے

یہ کہا کہ اگر شیخ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ پھر حکومت سنبھال سکیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ جگ جیون رام نے "ازراہِ شفقت" مجھے سیاست سے ریٹائر ہونے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ مجھ پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا تھا۔ مجھے جگ جیون کے اس بیان سے اس لیے بڑا کرب ہوا کہ ان جیسے شائستہ بزرگ سے اِس سطح پر بات کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے دوسرے دن ان حملوں کے جواب میں اپنے بسترِ علالت سے بیان جاری کیا۔

"میں نے ہمیشہ جگ جیون رام اور چرن سنگھ کی عزت کی ہے اور وہ پوری طرح مجھ سے اور میری زندگی سے واقف ہیں۔ دوستی کا تقاضا تھا کہ وہ حالیہ دوروں کے وقت اپنے بیمار دوست کی عیادت کو آتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس طرزِ عمل سے مجھے مایوسی ہوئی۔ انھوں نے جنتا پارٹی کے کارکنوں پر حملے کا ذکر تو چھیڑا لیکن نیشنل کانفرنس کے دو کارکنوں کی موت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مسٹر جگ جیون رام نے مجھے ایسا مشورہ دیا جو وزیرِ دفاع کے منصب کے روایتی آداب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ انھیں ان کی صحت اور عمر کے بارے میں یاد دہانی کرانے کی ضرورت نہیں اگر جگ جیون کو اس وقت جبکہ وہ ڈھاکہ میں شدید بیمار ہو گئے تھے، سیاست سے ریٹائر ہونے کا مشورہ دیا جاتا تو یہ کتنی ناشایان بات ہوتی۔"

وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی آخر میں کشمیر آئے اور انھوں نے ہیلی کوپٹر کا استعمال کر کے شوپیان، کولگام، اسلام آباد، بیجبہاڑہ، اونتی پورہ، پانپور، پٹن، ہندوارہ، ترہگام اور آخر میں سرینگر میں تقریریں کیں۔ لیکن یہ بات ان کے حق میں جائے گی کہ مولوی فاروق کے یہاں رس ملائی اور گاجر کے حلوے سے لطف اندوز ہونے کے باوجود انھوں نے انتخابات کو ملتوی کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔ یہ تجویز جنتا کے مقامی لیڈروں نے پیش کی تھی۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے عبرت ناک انجام کو تاڑ گئے تھے اور اب انتخابات ملتوی کرا کے دھاندلیاں کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ لیکن وزیرِ اعظم نے ان کی توقعات پر اوس پھیر دی۔

ووٹ ڈالنے کی تاریخ جوں جوں نزدیک آتی جا رہی تھی ہمارے مخالفین کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نفسیاتی جنگ کے غیر اخلاقی حربے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ نیشنل کانفرنس کارکنوں کا حوصلہ توڑنے اور عوام میں انتشار پیدا کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی گئی کہ میرا انتقال ہو گیا ہے اور میرے جسد کو برف میں محفوظ رکھا جا رہا ہے۔ اِس قسم کی افواہیں زیادہ تر دیہات میں پھیلائی گئیں۔ میں نے ووٹ ڈالنے کے دن سے دو چار دن پہلے اپنے بسترِ علالت سے ایک خاص اپیل جاری کی۔ جس میں عوام کو ان ہتھکنڈوں سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ میں نے اپنی اپیل میں یہ بھی کہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے نکلیں۔ تاکہ انتخابی بے ایمانیوں کے مواقع کم سے کم باقی رہیں۔ میں نے اپنی نحیف اور کمزور آواز میں اس اپیل کو صدا بند بھی کروایا اور اسے نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم کے اختتام پر گاندھی پارک کے جلسے میں سنوا دیا گیا۔ اس اپیل کے اثر کے متعلق دہلی کے ایک سرکردہ اخبار "ٹائمز آف انڈیا" نے لکھا:

"شیخ عبداللہ نے بسترِ علالت سے جو اپیل ووٹروں کے نام جاری کی ہے اس سے نیشنل کانفرنس کے حق میں پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اس اپیل سے مخالف جماعتوں کے امیدواروں کا سارا اثر زائل ہو کر رہ گیا ہے۔"

۳ جولائی کو لوگ جوق در جوق ووٹ ڈالنے کے لیے نکلے۔ حالانکہ ساری وادی میں بارش ہو رہی تھی۔ ۵ جولائی کو جب پہلے نتائج آنا شروع ہو گئے تو ساری دنیا کو

اندازہ ہو گیا کہ جنتا پارٹی نے جن سورماؤں کو رستم و سام کی شکل میں پیش کیا تھا، اُن کے پیر کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ سارے بُت ایک ایک کر کے اوندھے مُنہ گرتے گئے۔ ہمیں شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ اُن حلقوں میں جنھیں ہمارے مخالف اپنا مضبوط گڑھ سمجھتے تھے، اُن کے پہلوانوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ چنانچہ عوامی نفرت کے اس سیلاب میں محی الدین قرہ، مولوی افتخار، مفتی سعید، غلام رسول کار وغیرہ تنکوں کی طرح بہہ گئے جہاں نیشنل کانفرنس کو اسمبلی میں پچھتّر میں سے پچاس نشستوں پر کامیابی مل کر قطعی اکثریت حاصل ہو گئی وہاں ہمارے مخالفین نے اپنی ضمانتیں ضبط کروانے میں ریکارڈ قایم کر لیا۔ یہ نتائج اتنے دھماکہ خیز تھے کہ دہلی کے ایوان بھی ہل گئے۔ کشمیر میں ہمارے مخالفین عوامی غیظ و غضب سے بچنے کے لیے رُو پوش ہو گئے اور حکومت کو اُن کی حفاظت کے لیے اُن کے گھروں پر پولیس کا پہرہ بٹھا دینا پڑا۔

اِنتخابی نتائج سامنے آ گئے تو ساری ریاست خاص طور پر راجدھانی سرینگر میں جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نیشنل کانفرنس نے سجدۂ شُکر ادا کرنے کے لیے پولو گراؤنڈ میں، جو جنتا کے بڑے لیڈروں کے جلسوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا، جلسہ طلب کر لیا۔ میری جسمانی حالت اس قدر ٹھیک نہ تھی کہ میں جلسہ گاہ تک پہنچ سکتا۔ لیکن عوام کی بے پناہ محبت اور ساتھیوں کے بے پناہ اِصرار پر ڈاکٹروں نے مجھے اِنتہائی احتیاط کے ساتھ جلسہ گاہ تک جانے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ مجھے اپنی قیام گاہ سے ہی بس کی چھت پر ایک صوفے پر دراز کر کے جلسہ گاہ تک پہنچایا گیا۔ عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جوش و خروش میں موجزن تھا۔ میں تقریر کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن میں نے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت کرنے کے بعد علامہ اقبالؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

جب عشق سِکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کُھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اس کے بعد اپنا ہاتھ اوپر اُٹھا کر عوام کی مُحبّت کا جواب دیا۔ جب مجمع خوشی سے لہریں مارنے لگا تو میں واپس گھر آ گیا۔

اِسی اثنا میں نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے مجھے اپنا قائد چُن لیا اور مجھے گورنر صاحب کی دعوت پر حکومت بنانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ ۹ جولائی کو میں اپنی بیگم کے ساتھ صبح دس بجے کے قریب راج بھون پہنچا اور وہاں اپنی ذمہ داری کا حلف اُٹھا لیا۔ میرے آگے پھر مُستقبل کے چیلنج تھے اور میں خُدا کا نام لے کر اس مُسلسل سفر کے لیے پھر کمر بستہ ہو کر گامزن ہو گیا۔ مجھے علامہ اقبالؔ کا ایک شعر یاد آ رہا تھا ؎

سفرِ زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

▲▲▲

(۷۳)

آں برہمن زادگانِ زندہ دِل

اس باب کا عنوان اقبالؔ کے ایک شعر سے لیا گیا ہے جو کشمیری پنڈتوں کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ "اِن زندہ دل برہمن زادوں کے چہرے سرخ گُل لالہ کو بھی اپنی آب و تاب سے شرما دیتے ہیں۔ ان کا خمیر ہماری خاک سے اُٹھا ہے اور اِن ستاروں کا مطلع ہمارا محبوب کشمیر ہے۔"

کشمیر کے خاص سیاسی تناظر میں کشمیری پنڈت طبقے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اُن کے متعلق تفصیل سے بات کیے بغیر نہ کشمیر کی شبیہہ کے ساتھ اِنصاف ہوگا اور نہ اس ذہین طبقے کی لیاقت اور کارناموں کے ساتھ۔ وادی میں اُن کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن نمک کی یہ چاشنی نہ ہو تو کشمیر کا مزہ ہی پھیکا پڑ کر رہ جائے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں وہ ظلم و جبر کے آلات (INSTRUMENTS OF TYRANNY) کی حیثیت سے سامنے آتے رہے ہیں اور اِس لیے اُن کا سیاسی کردار متنازعہ رہا ہے۔ کسی ستم ظریف نے کشمیری پنڈتوں کی کشمیر میں اہمیت کا ذکر اُس وقت ایک دلچسپ ڈھنگ میں کیا جب کشمیر کے مسئلے

پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان رسہ کشی عروج پر تھی۔ اس نے کہا کہ کشمیر کا جھگڑا دراصل کشمیری پنڈتوں کا گھریلو جھگڑا ہے۔ ایک طرف علامہ شیخ محمد اقبالؔ ہیں جنھوں نے پاکستان کے خیال کو جنم دیا اور دوسری طرف جواہر لال نہرو ہیں جو ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں۔ اقبال نے خود اپنے نسب کے متعلق کہا ہے ؎

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است

یعنی پاکستان کے جنم داتا اقبالؔ بھی کشمیری پنڈتوں کی نسل سے ہیں اور ایک اور عظیم کشمیری پنڈت — نہرو — کے ملک سے کشمیر کے مسئلے پر جھگڑ رہا ہے۔ میں خود مسلمانوں کی اُس صنف سے تعلق رکھتا ہوں جن کے آباو اجداد کشمیری پنڈت رہے ہیں اور جن کی رگوں میں اِسی برادری کا لہو گردش کر رہا ہے۔ میرے اسلاف چار پانچ پشتوں پہلے کشمیری پنڈت تھے۔ اپنی ساری زندگی میں اس طبقے کے ساتھ میرا ربط و رشتہ بقول رابرٹ فراسٹ دو پریمیوں کا سا رہا ہے "کبھی تلخ اور کبھی شیریں"۔ کشمیری پنڈتوں کے متعلق رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ لیکن اُن کی ذہانت، اُن کی لیاقت اور اُن کی خوبصورتی کے متعلق کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اُنھوں نے ماضی اور حال میں کشمیر کی اور اس کی تاریخ میں جو رول ادا کیا ہے اُس پر ایک نظر ڈالنے سے خود کشمیر کی پیچیدہ گتھی کی چند گرہیں کھول جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر اِس پس منظر میں کہ خود کشمیری پنڈتوں کی نفسیات کشمیر کے حالات کے اتار چڑھاؤ سے ایک عجیب معجون مرکب بن گئی ہے۔

"کشمیری پنڈت" کی اصطلاح دو سو سال سے کچھ زیادہ پرانی ہے۔ یعنی اسے

دلی کے زوال پذیر مغل شہنشاہ محمد شاہ نے تراشا اور وہ بھی اپنے ایک درباری جے رام بھان کی استدعا پر۔ جے رام بھان ایک کشمیری برہمن تھے۔ ان برہمنوں کے سرخیل جنھوں نے مغل بادشاہوں کی سرپرستی کی خاطر کشمیر چھوڑ دیا تھا اور دلی، آگرہ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان پنڈتوں نے اپنی خداداد قابلیت سے مغل دربار میں زبردست رسوخ حاصل کر لیا تھا اور وہ ہندوستان کے باقی برہمنوں سے اپنے آپ کو بزرگ و برتر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے ساتھ خطِ امتیاز وضع کرنے کے لیے ایک فرمان کے ذریعے منادی کرا دی گئی کہ آئندہ سے اُنھیں کشمیری پنڈت کہہ کر پکارا جائے۔ کشمیری پنڈتوں میں اپنی جنم بھومی کشمیر سے وابستگی کا اِتنا فخریہ جذبہ تھا کہ اُنھوں اپنا الگ دھرم کشمیری شیومت اختراع کیا اُنھوں نے کشمیر میں اپنے لیے باقی ہندوستان سے الگ رسوم اور تہوار مقرر کیے۔ مشہور کتاب "دبستان مذاہب" کے مصنف ملا محسن فانی کشمیری نے بھی لکھا ہے کہ کشمیری پنڈتوں نے اپنے سارے تیرتھ اور تہوار کشمیر میں محدود کر دیے وہ دیوالی نہ مناتے تھے مگر شیوراتری مناتے تھے۔ اُنھوں نے کشمیر میں ایک متوازی گنگا ایک الگ سنگم تیرتھ اختراع کیا۔ اُن کے کھانے پینے اور ملبوسات بلکہ زیورات اور شادی بیاہ کے رسوم تک باقی ہندوؤں سے الگ تھلگ رہے جو آج تک بھی اپنے اِنفرادی خدوخال رکھتے ہیں۔ امرناتھ، کھیر بھوانی اور شارکیا کے مقامی تیرتھ اِس کے علاوہ ہیں۔ جن کو اب بیرونِ کشمیر کے غیر مسلم دوست بھی عقیدت سے پوجتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں نے اِس پہل کا جواب یوں دیا کہ وہ کشمیری پنڈتوں کے رسوم و رواج اور عادات و خیالات کے اس قدر قریب رہے کہ اُن کے اور پنڈتوں کے درمیان سماجی سطح پر امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ کشمیری پنڈت نسب لیکن پنجابی ماحول میں

پلے ہوئے علامہ اقبال کو کشمیری مسلمانوں کی اس خاصیت و خصلت سے بڑی اُلجھن ہوتی تھی اور اُنھوں نے اُن کی "پنڈت سرشت" پر یوں پھبتی کسی ؎

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بُتے مے تراشد ز سنگِ مزارے

(کشمیری کو بُت پرستی کا اِتنا چسکہ لگا ہوا ہے کہ وہ قبر کے پتھروں سے بھی مورتیاں تراش لیتا ہے۔)

واقعہ یہ ہے کہ کشمیر میں پنڈت اور مسلمان کا بھید بھاؤ ہی نہ تھا اور اُن کی یک جہتی اور یک سوئی کی حقیقت مہجور کے اِس شعر میں بیان ہوتی ہے ؎

نتہ وُچھ مے اکی پے مشید گران ہیندی تہ مسلمان
ایہ کھو تہ بہ گیاہ لولہ کے شہر چ خبر وتے

(میں نے وہاں ہندو اور مسلمان کو ایک ہی جگہ سجدے کرتے دیکھا اور یہی پریم نگری کی سب سے بڑی خبر ہے۔)

یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ جہاں مسلمان آج بھی ریشیوں اور منیوں کی عزت کرتے ہیں وہاں پنڈت آج بھی شیخ نور الدینؒ اور حضرت مخدوم حمزہؒ کی زیارتوں پر مرادیں مانگتے ہیں۔ لل دید دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور وہ اب تک یہی فیصلہ نہیں کر پائے کہ وہ ہندو مری یا مسلمان؟ جہاں پنڈت شاعروں نے فارسی اور اسلامی ادب میں اضافے کیے وہاں مسلمان شاعروں نے شاستر اور شیومت کے فلسفے کا کھلم کھلا پرچار کیا۔

کشمیری پنڈتوں کا الگ طبقہ تاریخِ کشمیر میں شہمیری دور کے آغاز سے ہی نظر آتا ہے۔ کشمیر میں اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ تبلیغ اور پرچار سے۔ اِسلام

کے کشمیر میں طلوع سے پہلے ہی یہاں کی زندگی میں تناؤ اور کشاکش پیدا ہوگئی تھی اور بودھوں اور برہمنوں کے درمیان زبردست آویزش جاری تھی۔ چنانچہ ہرش دیو کے وقت باقاعدہ خانہ جنگی کی نوبت آئی اور کلہن پنڈت نے ہرش دیو کو "ترشکا"[1] قرار دیا۔ ہرش دیو اگرچہ ہندو تھا لیکن اس نے مندر توڑے اور سونے چاندی اور پیتل کی مورتیوں کو پگھلا کر ان کے سکے ڈھالے۔ واقع یہ تھا کہ اس سماج میں استحصال اور عدم توازن سے زوال کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور یہ اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے کھوکھلا ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب اسلام آیا تو اس پر مفاداتِ خصوصی کی چکی میں پسنے والے عوام کی اکثریت نے لبیک کہا۔ اسلام اس وقت ایک ٹوٹتے ہوئے جاگیرداری سماج کی دم گھوٹنے والی فضا میں ذہن سہمے کرنے والی جنتا کے لیے نئے خیالات اور نئے ضابطۂ حیات کے تازہ جھونکے لے کر آیا تھا۔ اسی وجہ سے اسے قبولِ عام بھی حاصل ہوا۔ اور اس نے کشمیریوں کی تخلیقی اور ارتقائی قوتوں کے سرچشمے پھر جاری کر دیے۔ رہی سہی کسر صوفیوں اور ریشیوں نے اپنے پاکیزہ کردار، نیک نفسی، عوام دوستی اور انسان پسندی سے پوری کر دی۔ نچلی ذات کے دبے کچلے ہوئے عوام اگرچہ اسلام پر ایمان لے آئے لیکن برہمنوں کا اعلیٰ طبقہ عموماً بدستور اپنے روایتی دھرم اور مسلک پر ڈٹا رہا۔

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ سلطان سکندر کے وقت میں ایک کشمیری برہمن سہہ بٹ نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے اپنی دختر سلطان کے نکاح میں بھی دے دی۔ اس نے اپنا نام سیف الدین رکھا۔ سہہ بٹ کے خلاف کشمیری برہمنوں نے بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ چنانچہ اس نے ان کا زور اور اقتدار ختم کرنے کی ٹھان لی وہ گھر کا بھیدی تھا اور اسے معلوم تھا کہ مندروں اور استھانوں کے ساتھ

---

[1] ترشکا کشمیری۔ بھوت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

Suhu Bhat

مفاداتِ خصوصی کا ایک بڑا سلسلہ ہی جڑا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ طاقت کے متوازی مرکز بننے کی صلاحیت اور ذرائع بھی رکھتے ہیں۔ اس نے مندروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور برہمنوں کو بھی ہراساں کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنا عزیز وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور سارے بھارت ورش میں تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے۔ وہ سہہ بٹ کے متعلق بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

لیکن سکندر کے فرزند سلطان زین العابدین نے سہہ بٹ کی اس پالیسی کو ترک کر دیا اور اس کی تلافی مافات بھی کر دی۔ اس نے جگن ناتھ پنڈت، دہلی اور گجرات تک اپنے مشن بھیجے اور روٹھے ہوئے کشمیری برہمنوں کو واپس کشمیر آنے پر آمادہ کر لیا۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے خاص نسخے جن میں "اتھرو وید" کا نادر نسخہ بھی شامل ہے خاص تلاش سے کشمیر لایا۔ کشمیر میں ان برہمنوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا اور ان کو جاگیریں دیں۔ وہ اگرچہ ایک راسخ الاعتقاد مسلمان تھا مگر خود ان کی مذہبی کتابوں "نیل مت پران" اور دوسرے شاستروں کا پاٹھ عقیدت سے سنتا تھا۔ وہ برہمنوں کے خاص تہواروں میں شریک ہوتا تھا اور وہاں اپنے ماتھے پر تلک بھی لگاتا تھا۔ اس کی برہمن نوازی اس حد تک عام تھی کہ اس کا درباری مورخ جونراج صاف لکھتا ہے کہ وہ برہمنوں کا کھلم کھلا طرفدار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں صحیح قسم کی سیکولر روایات کی بنیاد سلطان زین العابدین بڈشاہ ہی نے ڈالی۔ اس سلسلے میں حسن مجم کے ساتھ سوزِ ہند کا آمیزہ تیار کرنے میں کشمیر کے اس عظیم فرزند کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

صحیح قسم کی سیکولر روایات کی بنیاد سلطان زین العابدین بڈشاہ ہی نے ڈالی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس عظیم کشمیری کے کارناموں کو ابھی تک جائز جگہ نہیں ملی ہے۔ اس کے ایک سو سال بعد مغلِ اعظم اکبر بادشاہ نے محض اس کی تقلید کی۔ زین العابدین کی برہمن نوازی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جیا لال کلم کے لکھنے کے مطابق اس کا لقب ہی "بٹہ شاہ" (پنڈتوں کا بادشاہ) ہو گیا۔ جو اب کثرتِ استعمال سے بڈشاہ بن گیا۔ اس نے گاؤکشی پر قانونی پابندی لگا دی۔ جو آج بھی کشمیر میں موجود ہے۔ عوام نے اس جذبے کی صدائے بازگشت میں گائے کا گوشت ہی نہ کھایا اور وہ آج بھی گائے کے گوشت سے کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ اسلام کے طلوع سے پہلے کشمیری برہمنوں نے عظیم ہستیاں پیدا کیں۔ جن میں حکیم چرک، ابھنوگپت، کھیمندر، اُتپل دیو اور کلہن پنڈت جیسے طبیب، عالم، فلسفی اور مورخ شامل ہیں۔ کشمیری برہمنوں کی علمی اور تہذیبی کامیابیاں اتنا رنگ لائیں کہ قدیم ہندوستان میں دکن بلکہ تامل دیش کے لوگ اس کو شاردا پیٹھ تسلیم کرتے تھے اور شاردا علم کی دیوی سرسوتی کا ہی ایک اور نام ہے۔ ان دور دراز جگہوں پر اب بھی رواج ہے کہ جب کوئی برہمن اعلیٰ تعلیم (سری ودیا) ختم کرتا ہے تو وہ کشمیر کی طرف منہ کر کے سات قدم اٹھاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ اس رسم کو "ست پدی" کہتے ہیں۔ خود بڈشاہ کے وقت میں اس کا افسر الاطباء شری بٹ تھا۔ جس نے اس کی جان بچا کر اپنے طبقے کے لیے خاص مفادات حاصل کیے۔

مغل بادشاہ اگرچہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان تھے لیکن کشمیر میں ان کی سیاسیات کا سارا انداز سامراجیوں کا جیسا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمان امرا اور جاگیرداروں سے ان کی بالادستی کی مزاحمت کی ہے۔ اس لیے انھوں نے کشمیری پنڈتوں پر زیادہ انحصار رکھا

اور سب سے پہلے کشمیریوں میں افتراق کا بیج اسی سیاست گری کی مصلحتوں کے مطابق بویا گیا۔ پنڈتوں کی سرپرستی کر کے مغل بادشاہوں نے ان کی اقلیتی گرہ MINORITY COMPLEX کو ابھارا اور انھیں دہلی کے مخبروں کی حیثیت سے بڑھاوا دینا شروع کیا۔ چونکہ کشمکش مذہب کی بنیاد پر نہ تھی، سیاست کی بنیاد پر تھی۔ لہٰذا انھوں نے کشمیر میں اقتدار کے امیدواروں مسلمان امرا کو نیچا دکھانے کے لیے کشمیری پنڈتوں کو اپنا حلیف بنا لیا۔ اکبر بادشاہ جو دور اندیش اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ اس نے پنڈتوں کے تہواروں میں شرکت کی اور انھیں جاگیریں دیں۔ اس کے علاوہ اس نے ان کے جذبۂ امتیاز کو تقویت بخشنے کے لیے آدتیہ بٹ نامی پنڈت کو ان کی مراعات کی نگہداشت پر مقرر کیا۔ اس نے کمراز اور مراز (شمالی و جنوبی کشمیر) کے گورنر کشمیری پنڈت بنا دیے۔ جادوناتھ سرکار جیسا بے لاگ مورخ لکھتا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں بہت کم کشمیری مسلمان اعلیٰ عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کو جان بوجھ کر امورِ سلطنت سے الگ رکھا جاتا تھا۔ مگر کشمیری پنڈت پر بہت اعتبار کیا جاتا تھا تاکہ کشمیر کے بطن میں مغل سلطنت کا ایک قابلِ اعتبار پانچواں کالم پیدا کیا جا سکے۔ مسلمانوں پر مغل فوج کے عہدے بند تھے۔ لیکن پنڈتوں پر کھلے تھے۔ خاص طور کشمیر کے سرحدی مقامات میں جہاں صرف مسلمانوں کی آبادی تھی۔ کشمیری میرو پنڈت کو ملکہ نورجہاں کی ذاتی محافظ فوج (BODY GUARD) کا نگران اعلیٰ بنا دیا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے جہلم کے قریب اس وقت کمال قابلیت سے جہانگیر کو مہابت خان کی اسیری سے رہا کیا جب مہابت خان نورجہاں سے خار کھا کر اس کے تخت و تاج کے درپے ہو گیا تھا۔ میرو پنڈت کو بعد میں کشمیر میں بڑی بڑی جاگیریں ملیں۔ پنڈتوں کی یہ بالادستی اورنگ زیب جیسے بادشاہ نے بھی قائم رکھی۔ چنانچہ اس کے وقت

ہیں مہیش شنکر داس پنڈت کا تخلص پورا تھا۔ کشمیری پنڈتوں نے فارسی اسی وقت سے سیکھنا شروع کر دی تھی۔ جب سے وہ سلطان زین العابدین کے وقت میں اقتدار پر چھانے لگے تھے۔ پہلے پہلے جن لوگوں نے فارسی کی طرف رجوع کیا اُن کو "کارکن پنڈت" کہا جانے لگا اور انھیں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ بڑے بڑے پنڈت "بھاشا" یعنی سنسکرت سے ہی لو لگائے بیٹھے رہے انھیں "باچھ بٹ" کہا جانے لگا۔ بہت جلد اس طبقے نے دیکھا کہ "کارکن" حکومت کے قرب میں پھل پھول رہے ہیں اور اقتصادی میدان میں اُن کی شرافت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ چنانچہ پھر انھوں نے بھی ڈبکی لگائی اور اس طرح درباری زبان فارسی میں مہارت حاصل کر لی۔ اُدھر دہلی کے مغلوں کی امورِ مملکت کی مصلحتیں اُن کے آڑے آئیں اور اس طرح سے یہ لوگ دفتروں پر چھا گئے۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی نوکر شاہی کے آغاز و ارتقا کا سنگِ میل ثابت ہوا۔

افغانوں کا دور کشمیر میں ظلم و ستم کے سیاہ ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی کشمیری پنڈت اپنی لیاقت کے بل پر عوام الناس سے کٹ کر ظالموں کی صفوں کے زیادہ نزدیک رہے۔ بلند خان صدوزئی نے کیلاش در پنڈت کو اپنا وزیراعظم بنایا اور حاجی کریم داد خان نے پنڈت دِلّارام کو اپنا پیش کار مقرر کیا۔ اس دِلارام پنڈت کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس سے اس کی زیرکی اور حاضر جوابی کے ساتھ اُس کے طبقے کی موقع شناسی اور شیریں گفتاری کا پتہ بھی چلتا ہے۔ کابل کے حکمران تیمور شاہ درانی نے اُسے کابل طلب کیا۔ پنڈت ماتھے پر قشقہ لگائے ہوئے اس کے دربار میں حاضر ہوا تو افغان حکمران نے پنڈت سے چھیڑ کرتے ہوئے سوال کیا "ماتھے پر یہ قشقہ کیوں کھینچا ہے؟" پنڈت نے بڑی نرمی سے جواب دیا "یہ قشقہ الف کی شکل کا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ جس کا کوئی شریک و ثانی نہیں

ہے۔" تیمور شاہ نے یہ برجستہ جواب سُنا تو زچ ہو کر دوسرا سوال کیا "مگر پھر دو کانوں پر قشقے کا نشان کیوں لگایا ہے؟" پنڈت نے بڑے اطمینان سے کہا "یہ دو گواہ ہیں جو شریعت کی رو سے اس بات کی شہادت کے لیے ضروری ہیں کہ میرا بیان صحیح ہے۔" تیمور شاہ کو یہ وار بھی خالی گیا تو اس نے آخری توپ داغ دی "لیکن پھر حلق پر قشقے کے اس نشان کا کیا مطلب ہے؟" پنڈت دلارام نے کسی کلفت کے بغیر کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو میرے بیان پر شک ہو وہ اِسی جگہ میرے حلق پر تلوار چلائے۔"

افغان حکمران لاجواب ہو گیا تو پنڈت دلارام نے یہ شعر پڑھا ؏

بر چہرہ ام نظر کن و پیشانیم ببیں
داغِ غلامی شہِ مولاست بر جبیں

تیمور شاہ اس فصاحت سے ایسا خوش ہوا کہ اُس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ اس سلسلے میں کشمیری پنڈتوں کی طباعی کا اندازہ اُس واقعہ سے بھی ہو جاتا ہے جب ایک مسلمان شاعر نے شمع کی تعریف میں یہ شعر کہا ؏

سوزِ او در کعبہ و بت خانہ یکساں دیدہ ام
من نمیدانم کہ ہندو یا مسلمان است شمع

زیرک کشمیری پنڈت یہ کہاں ٹلنے والا تھا۔ یہ استدلال کر کے شمع کو اپنا ہم مذہب بنا لیا ؏

قشقہ دارد بر جبیں زنّار دارد در گلو
صاف ہندو می نماید کے مسلمان است شمع

افغانوں کے زمانے کی ہی بات ہے کہ ایک کشمیری پنڈت نند رام ٹکو کابل چلا گیا۔

وہاں اپنی لیاقت سے ایسا رسوخ پیدا کر لیا کہ وہاں کے دربار کی جان بن گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالے جس پر یہ مصرع کندہ تھا :

"سیم از معبود و ضرب از نند رام"

اس نند رامی روپے کا چلن قبائلی علاقوں میں ۱۸۹۰ء تک جاری تھا۔ اسی زمانے میں ولیم مورکرافٹ لکھتا ہے کہ "کابل سے کشمیر تک صرف کشمیری پنڈت حکومت پر چھائے نظر آئے۔ جیا لال کلم کا کہنا ہے کہ افغانوں کے وقت میں سیاسی طاقت کشمیری پنڈتوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ خوش تھے۔ صورت حال اس حد تک پہنچی کہ جب کشمیریوں کے ایک ہمدرد اور غم خوار افغان صوبیدار عطا محمد خان نے، جس نے شیخ نورالدین رشی ؒ کے نام کا سکہ ڈھالا تھا' کابل کے مظالم سے تنگ آکر کشمیر میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور کشمیریوں کو انتظامیہ میں حصہ دینے لگا تو کشمیری پنڈت اُمراء کابل پہنچے اور اُس کی سرکوبی کی درخواست کی۔ چنانچہ کابل سے ایک بڑا لشکر آیا اور عطا محمد خان کو کچل دیا۔

کشمیری پنڈتوں نے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی کشمیر بُلایا۔ اُس کو ایک بار کشمیر کی مہم میں سخت ہزیمت اُٹھانا پڑی تھی۔ مگر پنڈت بیربل در نے اُسے ایسی پٹی پڑھائی کہ وہ کشمیر پر حملہ آور ہو گیا اور قابض بھی۔ کشمیر میں سکھوں کی حکومت کا زمانہ اپنے مظالم کے لحاظ سے افغانوں سے بھی بازی لے گیا۔ مگر کشمیری پنڈت اس دوران بھی راج سنگھاسن کے قریب ہی رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے مشہور در خاندان کا عروج اُسی زمانے میں ہوا۔ اسی دور میں کشمیری پنڈت بادشاہ گر KING MAKERS بنے رہے۔ مہانند جو در اُن کا خاص معتمد اور کشمیر کا زبردست حاکم تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات پر سکھ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا تو کشمیری پنڈتوں نے انگریزوں اور گلاب سنگھ کے چڑھتے ہوئے سورج کی طرف رُخ موڑ لیا۔ بیربل در پہلے ہی گلاب سنگھ کا دوست بن چکا تھا۔ گلاب سنگھ نے اُس کے بیٹے راج کاک در کو کشمیر کا گورنر بنا دیا جس نے اپنی سختیوں سے داغ شال کی آمدنی چار لاکھ سے بارہ لاکھ روپے سالانہ تک پہنچا دی اور اسی کی بیداد کے نتیجے میں زلدگر میں موجودہ دنیا کی پہلی مزدور بغاوت ہوئی جہاں درجنوں شالباف ندی میں غرق کر دیئے گئے۔ گلاب سنگھ کے کشمیری پنڈتوں پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اس نے پنڈت مہانند جو در کو جموں کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن جب ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو معزول کر کے ریجنسی کونسل بنا دی تو ایک ممتاز کشمیری پنڈت سورج کول' ریذیڈنٹ مشیر مال بنا دیئے گئے۔ اس زمانے میں بھی سر والٹر لارنس کے قول کے مطابق جو اس وقت کشمیر میں بندوبست اراضی کے کمشنر تھے "ساری قوت برہمنوں کے جو کشمیری پنڈت کہلاتے ہیں' ہاتھ میں تھی۔ مسلمان کاشت کاروں کو برہمنوں کے آرام و آسائش کے لیے بیگار پر مجبور کیا جاتا تھا۔" پنڈت کا لفظ ہی حکمران کے مترادف تھا۔ چنانچہ دیہات میں اب بھی اُنھیں حاکم اور "مہراز" (مہاراجہ کا مخفف "مہا راجہ" = راجہ) کہہ کر پکارنے کا محاورہ ٹکسال باہر نہیں ہوا۔ موجودہ صدی کی ابتدا سے ہی کشمیری پنڈت اپنی موقع شناسی کی بنا پر انگریزی تعلیم میں آگے رہے اور انتظامی عہدوں پر چھانے لگے۔ لیکن اُنھیں جلد ہی پنجاب سے آنے والے عہدہ داروں کا سامنا کرنا پڑا تو اُنھوں نے سٹیٹ سبجیکٹ کا نعرہ لگایا جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست میں ملازمتوں پر ریاستی باشندوں کا حق فائق تسلیم کیا جائے۔ ریاستی باشندوں کا مطلب عملاً کشمیری پنڈتوں سے ہی تھا کیوں کہ وہی تعلیم میں آگے تھے۔ اُدھر جموں کے راجپوت ڈوگرے مہاراجوں کی سرپرستی سے آگے بڑھ رہے

تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے آخری زمانے کی بات ہے اُن دنوں اُس کے طالع آزما بھتیجے ہری سنگھ کی اُس کے ساتھ سیاسی آویزش چل رہی تھی۔ چنانچہ ہری سنگھ اور اُس کے زیرِ اثر جموں کے چند عناصر نے کشمیری پنڈتوں کے ساتھ مل کر اِس تحریک کو خوب اُچھالا اور آخر کار یہ تحفظات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ بہت جلد مفادات کے چکر میں وہ خود اپنے اسی منتہا و مقصد کی مخالفت کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔

جب ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تو مہاراجہ کی انتظامیہ پر کشمیری پنڈتوں کا غلبہ تھا۔ سر تیج بہادر سپرو، پی۔ کے۔ واتل، اے۔ کے۔ واتل۔ اور کیلاش نرائن ہکسر کی مہاراجہ کے ساتھ کاڑھی چھنتی تھی۔ چنانچہ جب یہاں کے عوام نے اپنی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی تو ڈوگرہ مہاراجوں نے کشمیری پنڈتوں کو اپنے مفادات کی ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور انھیں اِس بات کی شہہ دی کہ در اصل یہ ہندو مہاراجہ کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت ہے۔ ایک پرانے کشمیری پنڈت راجہ ہری کرشن کول کو وزیرِ اعظم مقرر کرکے اُس کے ہاتھوں ظلم و ستم کا دور روا رکھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایک عرصے تک کشمیری پنڈت جیسے روشن خیال لوگ اس جھانسے میں رہے اور انھوں نے سارے ہندوستان کے ہندو پریس میں "کشمیری پنڈت خطرے میں" کا شور بپا کر ڈالا۔ مگر ہم بار بار انھیں یقین دلاتے رہے کہ یہ تحریک ہرگز غیر مسلموں یا کشمیری پنڈتوں کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ظالم و مظلوم کی لڑائی ہے۔ جہاں ظالموں میں غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی موجود ہیں وہاں مظلوموں کی صف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اور کشمیری پنڈت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کچھ معقول سرکاری نوکریاں

مسلمانوں کو بھی ملنے لگیں تو پنڈت صاحبان گھبرا گئے کہ اب اُن کے رزق کا آخری نوالہ بھی چھین جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اِس کے خلاف "روٹی ایجی ٹیشن" کے نام سے ایک ہنگامہ کھڑا کر لیا لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ جلد ہی ایک مذاق میں تبدیل ہو گیا۔ اور اپنی موت آپ مر گیا۔ انھوں نے مہاراجہ کو میمورنڈم پیش کیا۔ اس میں کشمیری پنڈتوں کے لیے علاقہ کونگام میں ایک الگ پنڈت وطن (R EGION) بنانے کی مانگ بھی کی۔ آخر کار تاریخ کی منطق اس طبقے کے چند ترقی پسند نوجوانوں کو اپیل کرنے لگی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے گلینسی کمیشن میں کہا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کشمیری پنڈتوں کی حالت بہت بہتر ہے۔ کیشپ بندھو، جیالال کلم اور دوسرے لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہونے لگے اور آخر کار مسلمان اور پنڈت لیڈروں کے مشترکہ دستخطوں سے وہ قومی منشور NATIONAL DEMAND • والی دستاویز سامنے آگئی جو نیشنل کانفرنس کے قیام کا پہلا پتھر ثابت ہوئی۔ جب ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس کا وجود میں آیا تو کچھ عرصہ کے لیے پنڈت ہمارے کاندھے سے کاندھا ملاتے ہوئے آگے آئے لیکن انھیں جب یہ احساس ہونے لگا کہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی اکثریت کو اُن کے حقوق ملیں گے اور سوءِ اتفاق سے اِس اکثریت میں مسلمانوں کا حصہ بڑا تھا تو انھیں اپنی طبقاتی برتری پر زد پڑنے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے بہانوں سے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے لگے اگرچہ اس کے باوجود بھی بعض روشن خیال اور دور اندیش پنڈت نوجوان نیشنل کانفرنس کے کام میں جوش و خروش سے شریک رہے لیکن سچ تو یہ ہے اُن کی حیثیت طبقاتی سے زیادہ ذاتی اور انفرادی تھی۔ طبقاتی حیثیت سے تو وہ مجموعی طور پر نیشنل کانفرنس اور تحریکِ آزادی کے بڑے دھارے سے کٹے ہی رہے۔

چنانچہ خود جواہر لال نہرو کو کشمیری پنڈتوں کے گروہ۔ شیخ ناتھ۔ میں جاکر اُنھیں فہمائش کرنا پڑی اور اُنھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ ظالم و مظلوم کی اس جدوجہد میں ظالموں کے خلاف کھل کر آجائیں اور نیشنل کانفرنس کی صفوں کو مضبوط بنائیں۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کشمیری پنڈت سماجی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات سے پرہیز کریں۔ اُس وقت تو پنڈت خاموش رہے لیکن دوسرے روز جواہر لال کے پاس ایک وفد آیا اور اُن سے کہا کہ اُنھوں نے سماجی سطح پر چھوت چھات کی جو بات کہی تھی وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے شادی بیاہ میں ماشکی اور دوسرے مزدور مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جواہر لال نے ایک قہقہہ لگا کر کہا کہ "جی ہاں، ماشکی تو ہوتے ہیں۔ لیکن رسوئی میں اور دسترخوان پر اُنھیں آنے کی اجازت نہیں۔"

پنڈت صاحبان نے نہرو جی کی یہ فہمائش تو اپنے روایتی اخلاق سے سُنی۔ مگر "پرنالہ وہیں کا وہیں بہے گا۔" کے مصداق مطلق العنان حکومت کی پیٹھ ہی ٹھونکتے رہے۔ اتفاق سے ۱۹۴۵ء میں مہاراجہ نے اپنے ایک مُلازم رام چند کاک کو وزیرِ اعظم مقرر کر دیا۔ رام چند کاک صرف کشمیری پنڈت ہی نہ تھا۔ بلکہ کشمیری زبان بولنے والا بھی۔ بس پھر کیا تھا نوکر شاہی کو دیوتا سمجھنے والے کشمیری پنڈت سمجھنے لگے کہ اب اُنہی کا راج ہے اور اُنہی کے ٹھاٹھ ہیں۔ چنانچہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی مخالفت میں محمد علی جناح اور مسلم کانفرنس کے ساتھ کشمیری پنڈت بھی (چند مُعزز استثنایات کو چھوڑ کر جو انگریزی کہاوت کے مطابق قاعدے کو ہی سچ ثابت کرتے ہیں) ہم آواز اور ہم آہنگ ہو گئے۔ یہ بات بڑی فکر انگیز ہے کہ کشمیر میں تحریکِ آزادی اور خاص طور پر کشمیر چھوڑ دو کے زمانے میں جتنے شہید پولیس اور فوج کی گولیوں سے جان بحق ہو گئے۔ اُن میں شاید ایک آدھ کشمیری پنڈت

بھی نہ ہوگا۔ بہرکیف۔ یہ صورتِ حال اس وقت اپنی ستم ظریفانہ انتہا کو پہنچ گئی جب جواہر لال نہرو ڈوگرہ مہاراجہ کی مخالفت اور کشمیری عوام کی حمایت کے لیے ۱۹۴۶ء میں کوہالہ آئے۔ اس وقت جہاں مہاراجے کی فوج سنگینوں سے اُن کا راستہ روک رہی تھی وہاں اُن کو "واپس جاؤ" کے نعرے سُنانے والوں میں مولوی یوسف شاہ کے پیرو، جموں کے مہاسبھائی ہندو اور جواہر لال نہرو کے ہم نسب اور ہم گوتر کشمیری پنڈت بھی شامل تھے۔ اُنھیں کوئی احساس نہ تھا کہ اپنے خون، اپنے آدرش اور اپنے وطن کا ساتھ دینے کی بجائے وہ ایک ریت کی دیوار اور ظلم کے پھندے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا۔ ع

شراب سیخ پر ڈالی، کباب شیشے میں

کشمیری پنڈتوں نے اِسی کردار کا مظاہرہ ۱۹۷۷ء میں بھی کیا۔ اُنھوں نے نیشنل کانفرنس اور اپنے نسب کی عظیم خاتون۔ اندرا گاندھی کی کانگریس کا ساتھ دینے کی بجائے جنتا پارٹی کا ساتھ دیا۔ جس میں ایک طرف جن سنگھ کے عناصر شامل تھے اور دوسری طرف مولوی فاروق کے بکرے۔ بہرکیف۔ رام چند کاک کی فرعونیت جواہر لال کی کشمیر دوستی کے آگے جھک گئی۔ کشمیر میں صورتِ حال نے پلٹا کھایا۔ قبائلی حملہ آور چڑھ آئے۔ اپنے آپ کو پنڈتوں کا دھرم رکھشک کہنے والے مہاراجہ رات کی تاریکی میں ان بے چاروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر دُم دبا کر جموں بھاگ گئے۔ اُس وقت سارے مُلک میں اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے ساتھ کُھلم کُھلا ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ لیکن کشمیریوں کی قومی روایات سامنے آئیں۔ نیشنل کانفرنسی قیادت کا نظریاتی استحکام آڑے آیا اور ہم نے سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی سلامتی کے لیے اقدامات کیے۔ ہم نے اُن کے تیرتھ اُٹھا کر پلا

کی حفاظت کو اولین ترجیح دی۔ تولہ مولہ ہے جہاں راگنی دیوی یا کھیر بھوانی کا مشہور استھاپن واقع ہے۔ قبائلیوں کے ڈر کی وجہ سے وہاں کے پنڈت، پجاری اور مہنت تک بھاگ گئے تھے۔ وہاں کے مسلمانوں نے استھاپن کی حفاظت اپنے متبرک مقام کی طرح کی۔ اسی طرح ہم نے دوسرے مندروں اور تیرتھوں کی حفاظت کے لیے کڑے انتظامات کیے۔ چنانچہ ہماری تحویل میں کسی پنڈت کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ یہ اس قدر شاندار کارنامہ ہے کہ اس سے کشمیر کے اتحاد اور اعتماد کی ایک نئی جوت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری آئندہ نسلیں اس پر فخر سے سر اونچا کریں گی۔ جس وقت کشمیری پنڈتوں پر اجل اور قضا کی شمشیریں لہرا رہی تھیں اُس وقت یہاں مہاراجہ یا ہندوستان کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ صرف اُنھیں اپنے مسلم ہم وطنوں کی خیر سگالی اور جذبۂ محبت کی سپر بچائے ہوئے تھی۔ یہ معجزہ ایسا فرحت بخش تھا کہ برصغیر کے شعلوں کو دیکھنے والے مہاتما گاندھی کی جلتی ہوئی آنکھوں میں بھی اس سے ٹھنڈک پڑ گئی اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھے "مجھے کشمیر سے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔" روشنی کی اس کرن میں روغن کشمیری رواداری کی روایات نے ڈالا تھا۔ لیکن کشمیری پنڈتوں نے ازراہِ نوازش اس کا سہرا میرے سر باندھ لیا۔ ان دنوں جب میں پنڈت علاقوں میں جاتا تھا تو مجھے خاص طور پر سادہ و معصوم پنڈت خواتین سے ایسے فقروں پر شکر گذاری کا ایسا اثر دیکھنے کو ملتا جسے میں اپنی حقیر خدمات کے نہایت ہی قیمتی انعامات میں شمار کرتا ہوں۔ کچھ پنڈت دوست تو یہاں تک غلو کر گئے کہ مجھے وشنو کا اوتار قرار دینے لگے۔ جس نے اُن کی رکھشا کے لیے ستی سر کشمیر میں پھر جنم لیا تھا۔

میں نے اگر کشمیری پنڈتوں کے لیے کچھ کیا تھا تو یہ کوئی اترانے کی بات نہ تھی۔ یہ میرے قومی مزاج، ہماری تحریک کے آدرشوں اور خود میرے ذاتی کردار کے مطابقت

رکھتا تھا۔ میں نے ہی تو ۱۹۳۱ء کے فسادات میں ایک پنڈت خاتون کے مردہ جسم کو کئی دن کے بعد شمشان گھاٹ پہنچانے کے لیے جان جوکھم میں ڈالی تھی اور میں نے ہی تو جناح صاحب سے تقسیمِ ملک سے بہت پہلے کہا تھا کہ کشمیر میں دو قومی نظریے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مسلم لیگ ریاست سے باہر جو چاہے کرے۔ ریاستی عوام نیشنل کانفرنس کے پرچم تلے باہم شیر و شکر رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے چنانچہ جب ۱۹۴۴ء میں ہم نے پرتاپ باغ سرینگر میں جناح صاحب کے خیر مقدم میں جلسہ منعقد کیا تو وہاں استقبالیہ جلسے میں سپاس نامہ پیش کرنے کے لیے ہمارے ایک پنڈت ساتھی کلم صاحب کو ہی چنا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب ہم نے کشمیر میں زرعی اصلاحات نافذ کیں تو بدقسمتی سے اُس کی زد میں جموں کے راجپوتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈت جاگیردار بھی آئے۔ اس زد میں مسلم جاگیردار اور چک دار بھی آئے۔ لیکن اپنی آبادی کے تناسب سے کشمیری پنڈتوں کو دربار میں قرب اور اپنی "خدماتِ فائقہ" کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی جاگیریں وغیرہ ملی تھیں۔ لیکن یہ زمانے کی منطق اور تاریخ کا فتویٰ تھا۔ اس میں کسی تعصب کا کوئی سوال نہ تھا۔ مگر کشمیری پنڈتوں نے اسے عقل و استدلال کی عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ذاتی مفادات اور طبقاتی تعصب کی ترازو سے تولا۔

اس مرحلہ پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کشمیری پنڈت ظلم و ناانصافی کے اس نظام کی بقاء کے لیے بہت پہلے سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب کشمیر میں غریب کاشتکاروں کی حالتِ زار کا چرچا برطانوی ہند میں ہونے لگا تو دلی کی حکومت کے مشورے سے کشمیر میں مسٹر ونگیٹ کو بندوبست آراضی کے لیے سیٹلمنٹ کمشنر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں پنڈتوں نے اپنی مصاحبت اور سرکار نوازی کے عوض حاصل کر لی تھیں لہٰذا اُنھوں نے اس اچھے ارادوں والے

انگریز آفیسر کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ اُسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر مستعفی ہو کر جانا پڑا اور اس طرح کشمیری پنڈتوں کے خصوصی مفادات پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ ان کی شکایات میں چونکہ وزن نہ تھا اور اُن کے استدلال میں کاٹ نہ تھی اس لیے وہ کھلم کھلا بحث و مباحثے کے بدلے کانا پھوسی اور کھسر پھسر کی مہم چلانے لگے۔ دہلی میں جا کر اُنھوں نے اپنے ہندو مذہب کی دُہائی دینا شروع کر دی۔ حالانکہ اُن کے اسلاف نے اپنی کشمیر نوازی کے افتخار میں اپنے لیے سرکاری فرمان کے وزن سے "کشمیری پنڈت" کی امتیازی لکیر کھنچوا دی تھی۔ اُنھوں نے دہلی کے فرقہ پرست ذہنیت کے چند طاقتور حلقوں کو اُکسانے کے لیے ہمارے خلاف صرف یہی نہیں کہا کہ ہم فرقہ پرست ہیں بلکہ تحریکِ حریت کے آغاز کے وقت تراشا ہوا یہ الزام پھر تازہ کر دیا کہ ہم اشتراکی بالشویک اور روسی ایجنٹ ہیں۔ وہ کشمیر کو بھول گئے اور فرقہ واری کے پیمانے سے معاملات کو جانچنے لگے۔ بدقسمتی سے دہلی کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی۔ جن کے دل اسی سم اور تال پر دھڑکتے تھے۔ چنانچہ کشمیر سے لے کر دہلی تک ایک اکھنڈ پاٹھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیری پنڈت پھر مغلوں کے زمانے کی طرح اپنے عوام سے کٹ کر کسی اور کے اشارے پر ناچنے لگے۔ در قبیلے کے ایک اور چشم و چراغ درگا پرشاد در نے اپنے بزرگوں کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے کارِ خاص میں مہارت حاصل کر لی اور وہ کشمیر کی عوامی تحریک کے جگر میں خنجر کی طرح پیوست کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۳ء کے المیے میں اس کھسر پھسر کا بھی ایک عنصر شامل رہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ پاکستان کے ساتھ ساز باز کا الزام جس شیخ محمد عبداللہ پر عائد کیا جاتا ہے وہ جب ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو گلمرگ میں گرفتار ہوا تو اس کی پارٹی صرف تین کشمیری پنڈت افسروں پر مشتمل تھی۔ لیکن مجھے یہ

اطمینان حاصل رہا کہ ہمارے ساتھ پنڈت کیشپ بندھو اور جانکی ناتھ گکرو نے ضرور کچھ سال جیل میں گذار دیئے اگرچہ ہمیں اُن کی غالب اکثریت امریکی، پاکستانی اور چینی ایجنٹ کہہ کر پکارتی تھی۔

کشمیری پنڈت ہندوستان میں پچھلے زمانے سے ہی اپنی قابلیت کی دھاک بٹھاتے آئے تھے۔ کشمیری شاعر بلبن دکن گیا تو وہاں کا راج کوی بن گیا۔ رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت موتی لال نہرو اور بیسوں کشمیری پنڈتوں کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آج بھی سارا ملک اُن کی قابلیتوں کی جولانگاہ ہے۔ اُنھیں ہماری وزارتِ خارجہ، مرکزی سکریٹریٹ، فوج اور دوسری اہم سروسوں، پرائیویٹ کمپنیوں اور پریس میں اہم مقام حاصل ہے اور یہ ہندوستان کے شہریوں کی حیثیت سے اُن کا حق ہے۔ دہلی اور جموں میں اُنھوں نے اپنی ہاؤسنگ کالونیاں اور محلے آباد کیے ہیں۔ بہت سے کشمیری پنڈتوں کے تو سرینگر، جموں اور دہلی میں بیک وقت مکانات ہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ اپنی برادری سے باہر رشتے ناطے نہ کرتے تھے۔ مگر اب وہ غیر ریاستیوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اُن کے سارے ملک میں تعلقات ہیں اور رسوخ ہے اور ہم کشمیریوں کو اُن کے کارناموں پر فخر ہے۔ کشمیر میں جمہوری نظام کی برکتوں کے لحاظ سے آزادی کے ثمرات اُن طبقوں اور جاتیوں میں بھی تقسیم کیے جا رہے ہیں جو تاریخ کی اندھی منطق کے سبب پیچھے رہ گئے تھے۔ چنانچہ اُن میں کشمیر کے دیہاتیوں کے علاوہ گوجر، بکر وال، جموں کنڈی میں بسنے والے ہریجن اور لداخ اور کرگل کے پسماندہ باشندے وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ کشمیری پنڈت صاحبان کو پہلے خاص حالات کی وجہ سے ان معاملات میں اگر اجارہ نہیں تو بھی غلبہ حاصل

تھا۔ اس لیے اُنھیں صورتِ حال سے کوفت ہو رہی ہے۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اب بھی ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اپنی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ موجود اور مُتقرر ہیں۔ اور تو اور جموں کے کچھ باشندے وہاں اُن کی بالادستی پر ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سارے مُلک میں جتنی اُن کی مانگ اور کھپت ہے ریاست کے کسی دوسرے طبقے کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ تیسرے ریاست میں جتنے مرکزی دفاتر ہیں اُن میں جو تقرریاں ہوتی ہیں اُن میں کشمیری پنڈتوں کا تناسب ساٹھ سے ستر فی صد تک ہے حالانکہ اُن کی آبادی کا اوسط دو ڈھائی فیصد سے زیادہ تک نہیں پہنچتا۔ اِن حالات میں اگر کشمیری پنڈت صاحبان اپنے بلا شک و شبہ بے اندازہ ذرائع اور ملک گیر اثر و رسوخ اور خاص طور پر صحافتی حلقوں میں اپنے اثر و نفوذ سے طوفان بپا کرتے رہتے ہیں تو اُن کے باقی برادرانِ وطن کو اس پر جائز طور گلہ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات کی منطق کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی اکثریت اپنی ریاست کے جغرافیائی مفادات کے تقاضوں اور اس کی ہیئت ترکیبی کی مصلحتوں پر بھی نظر رکھیں اور صرف دلی کے ایوانوں میں جاگزیں نوکر شاہی کو ہی اپنا قبلہ و کعبہ تصور نہ کریں۔ کشمیری پنڈت ریاست کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں اور باقی ملک کے ساتھ اس کے جذباتی رشتوں کو کمزور بنانے کی بجائے ان کے درمیان ایک مضبوط پل کا کام کر سکتے ہیں۔ کشمیریوں نے دو قومی نظریے کو ٹھکرا کر اپنے کشمیری پنڈت بھائیوں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اُن پر تاریخ نے یہ ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو نہ جھٹکیں جس طرح وہ خود ظلم اور ناانصافی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اُسی طرح اُن کے دوسرے ہم وطن بھی ظلم و ناانصافی سے نالاں ہیں۔ جواہر لال اور اندرا گاندھی کے ملک میں جہاں

کشمیری پنڈت اقتدار کی چوٹیوں پر کمندیں ڈالے ہوئے ہیں اُن کی رسائی کشمیریوں کے لیے فیض و برکت کا سرچشمہ ہونا چاہیے۔ بغض و شرارت کا ذریعہ نہیں۔ ملک کے بڑے دھارے میں اُن کی ممتاز حیثیت اس قدر نُمایاں ہے کہ چند ہی سال پہلے ایک وقت وہ تقریباً سارے اہم مناصب پر فائز تھے۔ کشمیر کے چھوٹے دائرے میں بھی اُنھیں کشمیریوں نے محبت، شفقت اور پیار دیا ہے اور اپنے جذبات کی صداقت اور سنگینی کا مظاہرہ انتہائی آزمائش کے وقت بھی کیا ہے جب اُنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو ظالموں کے روپ میں دیکھ کر اُن کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔ لیکن قدرت کسی مُتوازن نظام میں اونچ نیچ کے خلاف ہے۔ ریاست میں وہ اونچ نیچ کی فضا جو صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے۔ تیزی سے ہموار ہو رہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے باوجود کشمیری پنڈت اپنی خوبیوں کی وجہ سے آگے آگے رہیں گے۔ کشمیر کے گلدستے کا روپ کشمیری پنڈت کے لالہ احمر جیسے چہرے کی رنگت، اور اُس کی مہذب شخصیت کی مہک کے بغیر ادھورا ہے۔ لیکن اُسے بھی جاگیرداری تصورات کی سطح سے اُٹھ کر آگے آنا ہوگا۔ اُن کی سوچ کا محور ہمیشہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں رہی ہیں اور اُنھیں حکمرانوں کی خدمت اور جاسوسی ——— میں سکون ملتا رہا ہے۔ نئی جمہوری برادری میں وہ کارکن نہیں بلکہ برابر سے بھی ایک آنچ زیادہ کے شریک و شامل ہیں۔ اُن میں اتنی لوچ اور لچک ضرور موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے تقاضوں کے قالب میں ڈھال کر اپنی امتیازی شان برقرار رکھیں اُنھیں صرف بات کا بتنگڑ بنا کر یہاں دلی کے جاسوسوں اور کشمیریوں کے پانچویں کالم کا رول، جو وہ برسہا برس سے ادا کرتے ہیں، چھوڑ کر اپنے دوسرے کشمیری بھائیوں کے دُکھ درد کا ہمدم اور ہمدرد بننا چاہیے۔ جنھوں

نے فرقہ وارانہ برادری کے لیے خود اپنے ہم مذہبوں کا جگرداری سے مقابلہ کیا۔
مولانا روم کے اس شعر کا مخاطب شاید وہی ہیں۔ ؎

تو برائے وصل کردن، آمدی
نے برائے فصل کردن، آمدی



محمد یوسف ٹینگ شیخ صاحب کو مسودہ دکھا رہے ہیں۔



شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہؒ کی ایک یادگار تصویر۔



شگفتہ موڈ میں۔



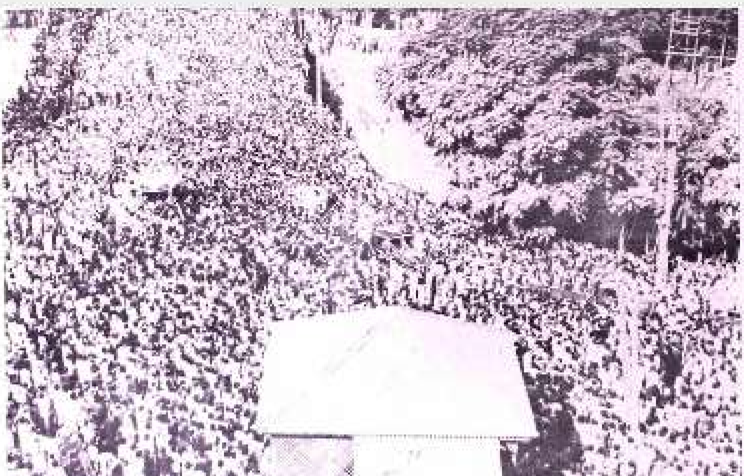
خواب ابد میں:
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے



صدر جمہوریہ شیر کشمیر کے جسد خاکی پر پھول نچھاور کرتے ہوئے

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ شیر کشمیر کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے۔





تواریخ کشمیر کا سب سے بڑا المیہ۔
شیر کشمیر کے جنازے میں دس لاکھ سوگواروں نے آنکھیں اشک بار الوداع کہی۔

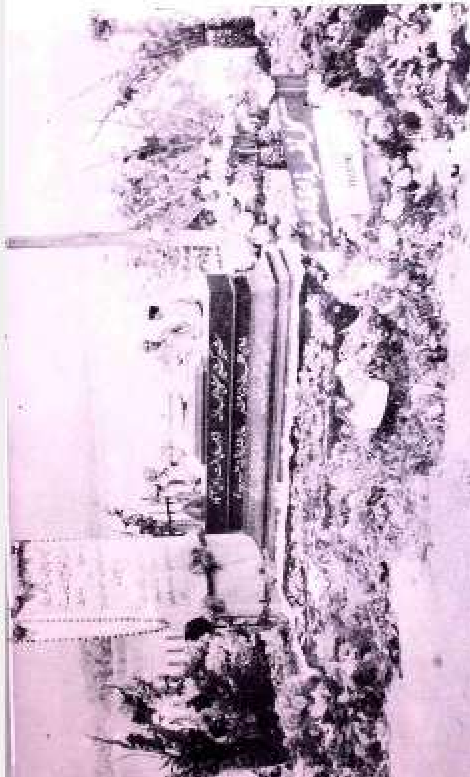
ضمیمہ جات

(ا) قومیتوں کا حق خود ارادیت

(ب) کشمیر جدید کی جانب

(ج) پیغام اور پروگرام

(د) میرا پیغام اور ہے .....



زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

ضمیمہ (ل)

قومیتوں کا حقِ خود ارادیت

آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس ہندوستان کے موجودہ سیاسی تعطل و جمود کو مستقبل کے لیے ایک خطرۂ عظیم تصور کرتی ہے۔ چونکہ مستقبل حال سے بدتر حالات کا حامل ہوتا ہے۔ زمانہ بعد از جنگ کی ملوکانہ اقتصادی اور سیاسی تباہی سے جس سے ہندوستان کو لامحال دوچار ہونا پڑے گا ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کے لوگوں کی غلامی کا مسئلہ باقی ہندوستانی باشندوں کی غلامی سے وابستہ ہے۔ اس لیے ہم اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ جب کہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کو آزاد کرتے ہوئے اپنے مقصد مکمل آزادی کے نزدیک پہنچائے گی اور غیر ملکی حاکمیت کی وجہ سے پیدا شدہ مصائب کا خاتمہ کرے گی جن کا سامنا عوام کو مشترکہ طور پر کرنا پڑا ہے۔ آج کروڑوں امن پسند انسان جن کو ملوکیت کی جنگ کی ہولناکیوں نے تباہ کر رکھا ہے دنیا میں امن و آزادی کے سورج کے طلوع کے منتظر ہیں۔

آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس اس رائے کو دہراتی ہے کہ صرف چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی آزادی سے ہی دنیا میں مستقبل اور ابدی امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ ایسی کوئی کمیٹی جس میں آزاد ہندوستان کے قومی نمائندے شامل نہ ہوں، بین الاقوامی نمائندہ کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ بہر حال ہمارا پختہ یقین ہے کہ غیر متحدہ لوگوں کو آزادی ایک ناگہانی عطیہ کے طور پر نہیں مل سکتی اس کو اتحادی تدابیر اور محنت سے حاصل کرنا ہوگا۔ آج تک ہندوستان میں قومی اتحاد کے بارے میں متعدد مرتبہ کوشش کی گئی۔ لیکن وہ سب کی سب ناکام ثابت ہوئیں۔ شملہ کانفرنس کے حالیہ واقعات نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں متحد ہو کر ہی طاقت حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی قوموں کو متحد کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری انڈین نیشنل کانگریس کے فرائض میں شامل ہے جس کی روایات ہندوستانی سیاست میں مشعل نمائی کر رہی ہے۔ لازم ہے کہ ہم لوگ اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی میں یہ توقع باندھ لیں کہ مستقبل کا لائحہ عمل تلاش کرنے کے لیے کانگریس وہ پالیسی اختیار کرے گی جو ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ ماضی کے تجربات نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اقوام خصوصاً مسلمانوں اور اقلیات کا اعتماد محض رعایات کا اعلان کرنے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے نا ہی اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعاون حاصل کیا ہے۔ ہم یعنی نیشنل کانفرنس اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر انڈین نیشنل کانگریس کو یہ کہنے کی جرأت کرتی ہے کہ وہ اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کرکے اس سوال پر چھان بین کرنے کے جذبہ کے تحت نئے سرے سے غور کرے کہ مسلمان باوجود آزادی کے غیر متزلزل خواہش رکھنے کے اور باوجود اس کے کہ برگزیدہ مسلمان شخصیتیں کانگریس کے اندر موجود تھیں۔ اور ہیں من حیثیت القوم کانگریس سے کیوں کر علیحدہ ہیں؟ نیز ہم کانگریس کو مشورہ دیتے